سلسلہ تاریخ اہل حدیث ۵

بوستانِ حدیث

محمد اسحاق بھٹی رحمۃ اللہ علیہ

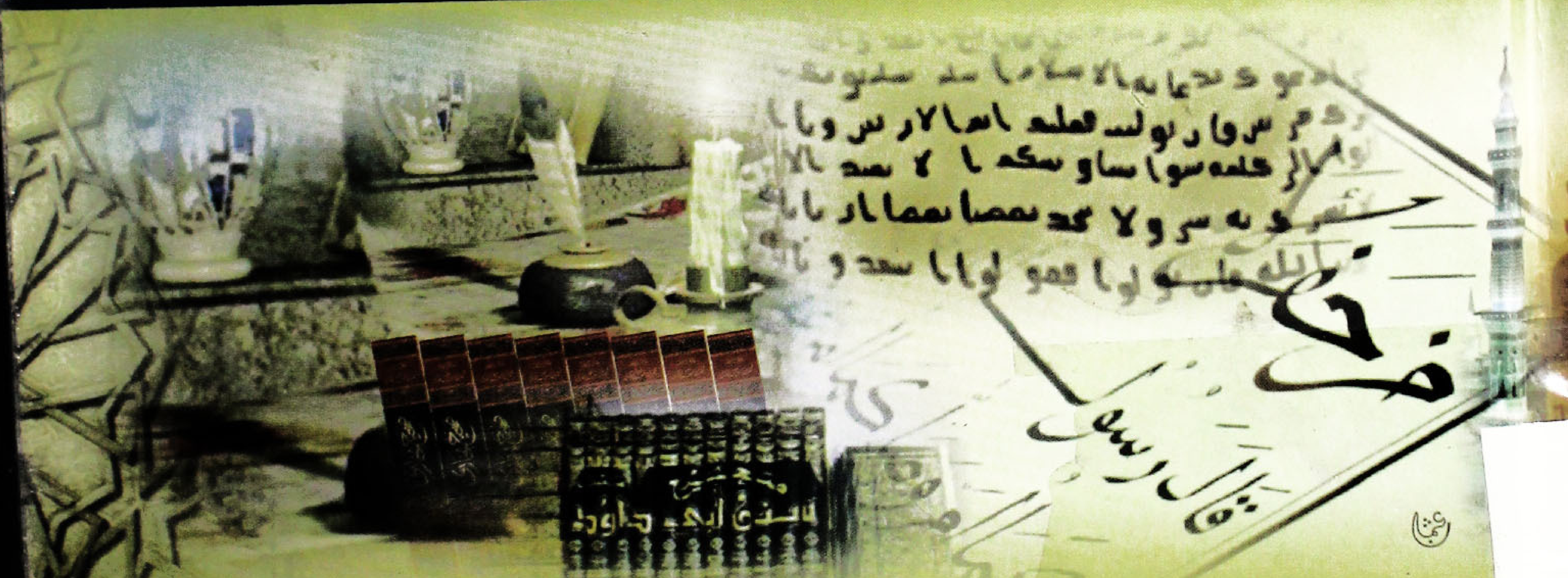

مکتبہ قدوسیہ

Marfat.com

سلسلہ تاریخ اہل حدیث ۵

بوستانِ حدیث

محمد اسحاق بھٹی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبہ قدوسیہ

Marfat.com

خوبصورت اور معیاری مطبوعات

کتاب وسنت
کی
نشرواشاعت
کے لیے
کوشاں

297-9924
ب 3771
141509

© اس کتاب کے
جملہ حقوق اشاعت محفوظ ہیں

اهتمام طباعت
ابوبکر قدوسی

اشاعت ـــــ ۲۰۱۸ء

مکتبہ قدوسیہ
قدوسیہ اسلامک پریس

رحمان مارکیٹ ⊙ غزنی سٹریٹ ⊙ اردو بازار ⊙ لاہور پاکستان
Tel: +92-42-37230585
Cell: +92-321-4460487
maktaba_quddusia@yahoo.com

Marfat.com

فہرست

❀ عرضِ ناشر ---------- ۹

❀ قلم وقرطاس ---------- ۱۱

شاہ عبدالعزیز، شاہ اسماعیل شہید اور شاہ محمد اسحاق دہلوی رحمہم اللہ کے چار تلامذہ کرام

❀ مولانا امین اللہ نگرنہسوی ---------- ۵۹

❀ بابا طفیل محمد ---------- ۶۰

❀ مولانا عبدالحق بنارسی ---------- ۶۲

❀ سید سراج احمد سہسوانی ---------- ۶۵

حضرت میاں سیّد نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے بائیس تلامذہ کرام

❀ مولانا غلام رسول قلعوی ---------- ۷۱

❀ مولانا بدیع الزمان لکھنوی ---------- ۷۹

❀ مولانا علیم الدین حسین نگرنہسوی عظیم آبادی ---------- ۸۰

❀ مولانا رحیم بخش لاہوری ---------- ۸۲

❀ مولانا احمد سورتی ---------- ۸۴

❀ مولانا عبدالباری نگرنہسوی عظیم آبادی ---------- ۸۶

❀ حکیم عبدالمجید دہلوی ---------- ۸۷

❀ سید مصطفےٰ ٹونکی ---------- ۸۸

❀ حکیم نصیر الحق عظیم آبادی ---------- ۸۹

❀ مولانا عبدالرحمٰن بڈھیمالوی ---------- ۹۰

Marfat.com

❀ مولانا ابو سعید محمد حسین بٹالوی -------------------- ۹۶
❀ مولانا ابو داؤد عبداللہ بابر خانوی -------------------- ۱۰۵
❀ مولانا نور محمد موکلوی -------------------- ۱۱۰
❀ مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی -------------------- ۱۱۲
❀ مولانا ابو المکارم محمد علی مئوی -------------------- ۱۱۶
❀ مولانا نور احمد ڈیانوی -------------------- ۱۱۸
❀ مولانا فضل حسین بہاری -------------------- ۱۱۹
❀ مولانا محمد یوسف بگھیلوی فیروز پوری -------------------- ۱۲۱
❀ مولانا لیاقت حسین امواوی -------------------- ۱۲۲
❀ مولانا عبدالحق ملتانی -------------------- ۱۲۵
❀ حکیم ابو تراب عبدالحق امرتسری -------------------- ۱۳۰
❀ مولانا عبدالحکیم جیوری -------------------- ۱۳۲

باسٹھ مرحومین خدام حدیث

❀ حافظ محمد غوث خان پوری -------------------- ۱۳۵
❀ مولانا سید محمد شاہ -------------------- ۱۴۰
❀ حافظ عبدالمنان وزیر آبادی -------------------- ۱۴۲
❀ مولانا عبداللہ (ساکن دہلی ڈھانی) -------------------- ۱۵۳
❀ مولانا فیض اللہ خاں بھوجیانی -------------------- ۱۵۶
❀ حافظ محمد میر محمدی -------------------- ۱۶۳
❀ مولانا محمد جونا گڑھی دہلوی -------------------- ۱۶۸
❀ مولانا عبدالرحیم بھوجیانی رحمانی -------------------- ۱۷۹
❀ مولانا عبدالرحمٰن بھوجیانی -------------------- ۱۸۲
❀ مولانا ابو الحسنات عبداللہ بھوجیانی -------------------- ۱۹۰
❀ مولوی حبیب اللہ کلرک امرتسری -------------------- ۱۹۶

Marfat.com

❀ مولانا عبدالغفار غزنوی ---------- ۱۹۹
❀ مولانا دین محمد وفائی ---------- ۲۰۱
❀ حافظ محمد سلیمان بھوجیانی رحمانی ---------- ۲۱۱
❀ مولانا عبدالحکیم بڈھیمالوی ---------- ۲۱۴
❀ علامہ حسین میر کاشمیری ---------- ۲۱۷
❀ خواجہ عبدالمجید علی گڑھی ---------- ۲۲۱
❀ مولانا عبدالغنی بڈھیمالوی ---------- ۲۲۸
❀ علامہ خلیل عرب ---------- ۲۳۳
❀ مولانا ملک عبدالعزیز ملتانی ---------- ۲۳۶
❀ مولانا اشرف الحق محمود ملتانی ---------- ۲۴۱
❀ قاضی عبدالرحیم ---------- ۲۴۴
❀ مولانا خدا بخش حدّاد بھوجیانی ---------- ۲۴۹
❀ مولانا سید ممتاز محمد علی ---------- ۲۵۲
❀ مولانا امتیاز علی عرشی ---------- ۲۵۷
❀ مولانا محمد اقبال رحمانی ---------- ۲۶۴
❀ مولانا سید اسماعیل سلفی رائیڈرگی ---------- ۲۶۷
❀ مولانا محمد کنگن پوری ---------- ۲۷۳
❀ مولانا عبداللہ ثانی امرتسری ---------- ۲۷۶
❀ مولانا سید اقبال حسین ---------- ۲۷۹
❀ شیخ عبدالرشید صدیقی ---------- ۲۸۱
❀ مولانا چراغ دین نور پوری ---------- ۲۸۷
❀ مولانا الٰہی بخش شجاع آبادی ---------- ۲۹۷
❀ ملک حسن علی جامعی شرق پوری ---------- ۳۰۰
❀ مولانا محمد داؤد راز دہلوی ---------- ۳۱۷
❀ قاری عبدالحکم کرم الجلیلی ---------- ۳۲۵

Marfat.com

❀ حکیم محمد حنیف امرتسری ---------- ۳۲۸
❀ مولانا معراج دین ---------- ۳۳۱
❀ قاری محمد یحیٰ بھوجیانی ---------- ۳۴۱
❀ قاری نعیم الحق نعیم ---------- ۳۴۴
❀ مولانا عبدالوہاب حنیف بلتستانی ---------- ۳۷۸
❀ مولانا فضل کریم عاصم ---------- ۳۸۵
❀ حافظ عبدالمنان ---------- ۳۸۸
❀ مفتی عبدالعزیز اعظمی عمری ---------- ۳۹۰
❀ مولانا محمد حسین شیخوپوری ---------- ۳۹۵
❀ مولانا شمس الحق ملتانی ---------- ۴۱۸
❀ مفتی اللہ بخش ملتانی ---------- ۴۲۱
❀ مولانا مختار احمد ندوی ---------- ۴۲۵
❀ قاضی عبدالباقی قدسی ---------- ۴۲۹
❀ حافظ محمد یحیٰ عزیز میر محمدی ---------- ۴۴۰
❀ مولانا محمد یحیٰ گوندلوی ---------- ۴۴۷
❀ علی ارشد چودھری ---------- ۴۵۰
❀ مولانا محمد رئیس ندوی ---------- ۴۵۹
❀ مولانا محمد عباس اختر ---------- ۴۸۷
❀ حافظ عبدالرزاق سعیدی ---------- ۴۹۰
❀ مولانا محمد ابراہیم ترمنی احمد پوری ---------- ۴۹۳
❀ حافظ محمد دین ---------- ۴۹۷
❀ مولانا محمود احمد غضنفر ---------- ۵۰۲
❀ مولانا عبدالحمید رحمانی ---------- ۵۰۶
❀ مولانا بشیر احمد اعوان ---------- ۵۱۰
❀ مولانا حکیم محمد اکبر فاروقی ---------- ۵۱۳

Marfat.com

❀ مولانا ثناء اللہ مجاہد فیروز پوری ---------- ۵۱۶

پینتیس موجودین خدام حدیث

❀ قاری محمد رمضان ---------- ۵۲۱
❀ مولانا محمد مستقیم سلفی ---------- ۵۲۵
❀ حافظ عبدالکبیر علوی ---------- ۵۳۲
❀ حافظ محمد الیاس اثری ---------- ۵۳۴
❀ حافظ عبدالعلیم علوی ---------- ۵۳۸
❀ صوفی گلزار احمد ---------- ۵۴۰
❀ حکیم محمد ابراہیم طارق ایم اے ---------- ۵۴۳
❀ پروفیسر ڈاکٹر محمد عبداللہ قاضی ---------- ۵۴۷
❀ مولانا محمد ھود ---------- ۵۵۱
❀ مولانا ابوحمزہ عبدالحمید المری ---------- ۵۵۵
❀ مولانا عبیداللہ اظہر ---------- ۵۶۰
❀ مولانا محمد اکرم مدنی ---------- ۵۶۵
❀ مولانا ابویحییٰ محمد زکریا زاہد ---------- ۵۶۹
❀ مولانا حبیب الرحمٰن خلیق ---------- ۵۷۳
❀ مولانا عبدالوہاب خلجی ---------- ۵۷۷
❀ حافظ محمد شریف ---------- ۵۸۱
❀ مفتی عبدالحنان زاہد ---------- ۵۸۵
❀ مولانا فاروق احمد قصوری ---------- ۵۸۷
❀ پروفیسر ڈاکٹر سعید احمد چنیوٹی ---------- ۵۹۲
❀ مولانا محمد ادریس سلفی ---------- ۵۹۸
❀ حافظ محمد عبداللہ رفیق ---------- ۶۰۱
❀ مولانا محمد انس سلفی ---------- ۶۰۴

Marfat.com

❀ مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری ---------- ۶۰۷
❀ حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی ---------- ۶۲۴
❀ مولانا محمد احسن سلفی ---------- ۶۲۸
❀ مولانا ندیم شہباز ---------- ۶۳۵
❀ مولانا لیاقت علی باجوہ فیروز پوری ---------- ۶۳۷
❀ ڈاکٹر عتیق الرحمٰن ---------- ۶۴۰
❀ مولانا عبدالحلیم علوی ---------- ۶۴۳
❀ ڈاکٹر حافظ حسن مدنی ---------- ۶۴۴
❀ حافظ ابوبکر عتیق ---------- ۶۵۰
❀ حافظ محمد اسلم شاہدروی ---------- ۶۵۸
❀ حافظ ڈاکٹر عبدالرزاق ظہیر ---------- ۶۶۱
❀ قاری عزیز احمد راشد ---------- ۶۶۴
❀ قاری ذکاء اللہ حافظ آبادی ---------- ۶۶۷

تذکرۂ خاص

❀ سعید احمد بھٹی مرحوم ---------- ۶۷۱

❀❀❀❀

Marfat.com

عرضِ ناشر

مولانا محمد اسحاق بھٹی سربرآوردہ علماءِ اہل حدیث میں سے تھے۔ درس و تدریس اور وعظ وتقریر ان کا میدان نہیں تھا لیکن قلم کے وہ شہسوار تھے۔ اس میدان میں ان کا قلم اس شان سے دوڑتا کہ کوئی ان کی برابری نہ کرپاتا۔ شخصیات کے کارہائے نمایاں کا بیان اور خاکہ نگاری ان کا خاص موضوع تھا۔ اُنھوں نے بے شمار افراد کو طاق نسیاں سے نکال کر رونق محفل بنادیا اور آج وہ خود ہمارے درمیان نہیں۔ علم وادب کی وہ شمع بجھ چکی ہے لیکن اس کی روشنی ماند نہیں پڑی۔ ان کی تحریریں زندہ و جاوید تحریریں ہیں۔ جوان کے قارئین کے لیے معلومات کا بہت بڑا خزینہ ہیں۔ یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ پاک و ہند کی تاریخ کا کوئی طالب علم جو علمی ادبی و دینی شخصیات کے کارناموں پر لکھنا چاہتا ہو، وہ جناب اسحاق بھٹی مرحوم کی تحریروں سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ قدیم علماء کے حالات کے لیے ان کی عدیم النظیر تصنیف ''فقہاء پاک و ہند'' اور جدید دور کے اصحابِ علم وکمال کے سوانح اور تذکرے کے لیے بھٹی صاحب کی دیگر کتب مراجع کی حیثیت رکھتی ہیں۔

شخصیت نگاری اور تاریخ نویسی میں محترم المقام جناب مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ مولانا عارف جاوید محمدی حفظہ اللہ جمعیۃ احیاء التراث کویت سے منسلک ہیں۔ ان کی وجہ شہرت بلکہ ان کی شناخت علماء اہل حدیث کی تاریخ اور ان کے کارہائے نمایاں سے دلچسپی ہے۔ مرحوم بھٹی صاحب کا بھی یہی ذوق تھا اور الحمدللہ ہمیں بھی اپنے اکابر سے یہی محبت ورثے میں ملی ہے۔ چنانچہ جب محترم عارف جاوید صاحب نے یہ پروگرام بنایا کہ برصغیر میں اہل حدیث کی خدمات کے حوالے سے کچھ کام کیا جائے تو اُنھوں نے محترم بھٹی صاحب سے اپنی خواہش کا اظہار کیا اور ہمیں یہ سعادت حاصل ہوئی کہ ہم محترم بھٹی صاحب کے اس تاریخی کارنامے کو منظر عام پر لائے۔ اس سلسلے کی اوّلین کتاب ''برصغیر میں اہل حدیث کی آمد'' تھی اور آخری کتاب اس وقت آپ ملاحظہ فرمارہے ہیں ''بوستانِ حدیث''۔ محترم بھٹی صاحب اہل حدیث کی خدمات قرآن وحدیث کے اس سلسلے کو ''بوستانِ حدیث'' پر تمام کرچکے تھے۔ اس کے بعد ان کا ارادہ اہل حدیث کی سیاسی خدمات کا احاطہ کرنا تھا لیکن وقت موعود آ گیا اور یہ کتاب ان کی زندگی کی آخری کتاب ثابت ہوئی۔

جناب بھٹی صاحب کی بعض کتابیں ہنوز منتظر اشاعت ہیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کے برادر اصغر مرحوم سعید احمد بھٹی نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔ لیکن بدقسمتی کہ وہ بھی مؤرخہ ۱۱ مئی ۲۰۱۷ء کو وفات پاگئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ سادہ مزاج نیک اطوار اور مخلص شخص تھے۔ اُمید ہے ان کے سعادت مند فرزند

Marfat.com

عزیزی حافظ حسان سعید اپنے بزرگوں کا یہ مشن جاری رکھیں گے اور ہم مرحوم بھٹی صاحب کی غیر مطبوعہ تحریروں کی طباعت سے اسلاف اہل حدیث اور علمی و دیگر ادبی شخصیات کے کارناموں سے روشناس ہوتے رہیں گے۔

اب ایک نظر اس سلسلے کی طرف ڈالیے جسے ہم نے ''سلسلہ تاریخ اہل حدیث'' کا نام دیا۔

۱۔ برصغیر میں اہل حدیث کی آمد ۲۔ اہل حدیث خدامِ قرآن ۳۔ دبستانِ حدیث

۴۔ گلستانِ حدیث ۵۔ چمنستانِ حدیث ۶۔ بوستانِ حدیث

اس سلسلے کی اوّلین کتاب ''برصغیر میں اہل حدیث کی آمد'' میں تاریخی اعتبار سے ثابت کیا گیا ہے کہ اہل حدیث ایک نظریئے اور فکر کا نام ہے اور قدامت کے اعتبار سے اس فکری تحریک کا تعلق اس دور سے ہے جب بعثت نبوی کی ساعت سعید رونما ہوئی۔ پھر تاریخی حوالوں سے اصحابِ رسول کی اس خطے میں آمد کا ذکر ہے۔ اور کتاب کے دوسرے حصے میں اہل حدیث کی فکر اور نظریئے کا تفصیل سے بیان ہے۔ اپنے موضوع پر یہ کتاب حرفِ آخر ہے اور اس قابل ہے کہ اسے اہل حدیث مدارس کی ابتدائی کلاسوں کے نصاب کا حصہ بنایا جائے۔ اور اگر کوئی شخص یہ سوال پوچھے کہ آسان الفاظ میں اہل حدیث کے مسلک کی وضاحت کی جائے تو اس سوال کا یہ کتاب بہترین جواب دیتی ہے۔ اس سلسلے کی کتب کی ترتیب ایک سی ہی ہے جیسا کہ آپ ''بوستانِ حدیث'' میں بھی ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔ یہ کتب علماء اہل حدیث کی خدمات حدیث کے بیان میں ہیں۔ علماء کے سوانحی خاکے اور ان کے کارناموں کا بیان ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ ''سلسلہ تاریخ اہل حدیث'' ہمارے بے حد قابل احترام حضرت بھٹی صاحب رحمہ اللہ کے لیے صدقہ جاریہ بنائے اور ان کے لیے توشہ آخرت ہو۔ محترم عارف جاوید محمدی حفظہ اللہ کے ہم شکر گزار ہیں کہ ان کی خصوصی دلچسپی سے یہ عظیم کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ جمعية احياء التراث الاسلامی لجنة القارة الهنديه کے مدیر محترم الشیخ خالد فلاح المطیری حفظہ اللہ بھی شکریہ کے مستحق ہیں کہ علماءِ اہل حدیث برصغیر کی جہد و مساعی سے ان کی بھی دلچسپی ہے اور اُنھوں نے اس کام کی ترتیب و تدوین میں خصوصی سرپرستی فرمائی۔ مولانا عبدالخالق محمد صادق نے ان کتب کے آغاز میں جامع اور مفصل علمی مقدمے تحریر کیے جو حدیث اور علمائے اہل حدیث سے ان کی محبت کی علامت ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ شکر بجالاتے ہیں کہ جس نے خدمت حدیث رسول کریم ﷺ کی یہ سعادت ہمارے نصیب میں فرمائی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے والد گرامی حضرت مولانا عبدالخالق قدوسی رحمہ اللہ کے لیے یہ سلسلہ تاریخ اہل حدیث بلندی درجات کا ذریعہ بنائے کہ ان کی آغوش شفقت میں ہمیں علماء اہل حدیث سے محبت کی گھٹی ملی۔ رحمه الله رحمة واسعة

عمر فاروق قدوسی
یکم نومبر، ۲۰۱۷ء

Marfat.com

قلم وقرطاس

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسان کو اظہار مافی الضمیر کے لئے دوقسم کے وسائل و ذرائع (زبان وقلم) سے نوازا ہے یعنی ایک خطابت اور دوسرا صحافت۔ جیسا کہ علامہ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ثُمَّ تَأَمَّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَى الْإِنْسَانِ بِالْبَيَانَيْنِ :اَلْبَيَانِ النُّطْقِيْ وَ الْبَيَانِ الْخَطِّيْ)) (مفتاح دارالسعادة)

اسی لئے قلم کو دوزبانوں میں سے ایک کہا جاتا ہے جیسا کہ ابوالحسنین کا قول ہے:

((أَنَّهٗ قَالَ :اَلْقَلَمُ أَحَدُ اللِّسَانَيْنِ)) (غرائب الإغتراب ۱/ ۷۴)

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس طرح تقریر وخطابت کا دائرہ بہت وسیع اور انتہائی اثر انگیز ہے، اسی طرح تحریر وکتابت اور تصنیف وتالیف کا زمانہ بہت وسیع اور نفوذ پذیر ہے۔ جیسا کہ بعض ادباء کا قول ہے:

((وَمِنَ الْمَعْلُوْمِ أَنَّ الْبَيَانَ ، بَيَانَانِ إِثْنَانِ :بَيَانُ اللِّسَانِ وَ بَيَانُ الْبَنَانِ . وَمِنْ فَضْلِ بَيَانِ الْبَنَانِ أَنَّ مَا تُثْبِتُهُ الْأَقْلَامُ بَاقٍ مَعَ الْأَيَّامِ . وَبَيَانُ اللِّسَانِ تُدْرِسُهُ الْأَعْوَامُ)) (ذكر العاقل و تنبيه الغافل ۱/ ۰۲)

''بیان اور اظہار مافی الضمیر کی دوقسمیں ہیں، زبان اور قلم، اور قلم کو زبان (یعنی کتابت وخطابت) پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ قلم کے نقوش ان مٹ اور دیرپا ہوتے ہیں، جبکہ خطباء کے کلمات اور اثر انگیز خطابات رفتہ رفتہ طاق نسیان بن جاتے اور سہو وذہول کا شکار ہو جاتے ہیں۔''

کسی شاعر نے خوب کہا ہے:

((يَلُوْحُ الْخَطُّ فِيْ الْقِرْطَاسِ دَهْراً وَكَاتِبُهٗ رَمِيْمٌ فِيْ التُّرَابِ))

''نوشتہء قلم مدت مدید تک سینہء قرطاس کی زینت بنا رہتا ہے، جبکہ تحریر کنندہ کا جسد خاکی پس مرگ خاک میں مل چکا ہوتا ہے۔''

اور قلم ہی علوم ومعارف کو اور تاریخ امم کو محفوظ کرنے کا ذریعہ ہے:

((لَوْلَا الْمَحَابِرُ وَالْأَقْلَامُ لَانْطَمَسَتْ مِنَ الْأَنَامِ رُسُوْمُ الْعِلْمِ وَالْأَدَبِ))

''اگر قلم ودوات موجود نہ ہوتے تو علم وادب کے آثار مٹ چکے ہوتے۔''

Marfat.com

آج دنیا میں تمام علوم وفنون کے متعلق معلومات کتابوں کی شکل میں محفوظ ہیں اور افادۂ عام وخاص کے لئے لائبریریوں کا وجود ہے تو یہ قلم ہی کے ثمرات ونتائج ہیں۔ عصر حاضر میں ٹیکنالوجی کی زبردست ترقی اور معلومات کو محفوظ کرنے کے نئے وسائل اور اسالیب وطرق دریافت ہونے کے باوجود انسان کتابوں سے بے نیاز اور قلم وقرطاس سے مستغنی نہیں ہوسکتا ہے۔

مؤرخ اہل حدیث مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمۃ اللہ علیہ نے خدمت اسلام اور اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے قلم وقرطاس کو ذریعہ بنایا اور تصنیف وتالیف کا میدان اختیار کیا جیسا کہ وہ خود فرمایا کرتے تھے: ''قلم میرا ہتھیار ہے اور قرطاس میرا میدان۔'' ''میں قلم کا مزدور ہوں۔'' اس لیے مناسب ہوگا کہ ہم مؤرخ اہل حدیث کے حسن انتخاب کے پیش نظر قلم وقرطاس کی عظمت ورفعت اور خدمت علم کے لیے ان کی ضرورت و اہمیت کا بالاختصار ذکر کریں اور اللہ تعالیٰ کی اس نعمت عظمیٰ کی تاریخی حیثیت اور افادیت پر روشنی ڈالیں۔ وباللہ التوفیق.

قلم کی عظمت واہمیت

قلم کی اہمیت اور قدر ومنزلت کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات میں سب سے پہلے قلم کو تخلیق کیا: چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا:

((إِنَّ أَوَّلَ مَاخَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمُ ، فَقَالَ لَهُ أُكْتُبْ ، قَالَ :رَبِّ وَمَا ذَا أَكْتُبُ ؟قَالَ: أُكْتُبْ مَقَادِيْرَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّى تَقُوْمَ السَّاعَةُ)) (سنن ابو داؤد)

مذکورہ حدیث پاک سے قلم کی فضیلت واہمیت کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ قلم وقرطاس اور لوح وقلم کا رشتہ وپیوند ابتدائے آفرینش ہی سے قائم ہے اور دونوں باہم لازم وملزوم ہیں۔

یہ حقیقت بھی آشکارا ہوتی ہے کہ قلم کی تاریخ انسانی تاریخ سے اقدم اور پرانی ہے اور کتابت تقدیر اس کا نقش اولین ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کی طرف پہلی وحی میں بھی بنی نوع انسان پر اپنے احسان عظیم یعنی بذریعہ قلم تعلیم کا ذکر کیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ـ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ـ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾

(العلق: ۳تا ۵)

''(اے محمد ﷺ) پڑھیے! آپ کا رب بڑے کرم والا ہے۔ جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا

Marfat.com

اور انسان کو وہ علوم سکھائے جن سے وہ آشنا نہیں تھا۔"

علامہ قرطبی رحمہ اللہ آیت مبارکہ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

((......﴿الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ ......یَعْنِیْ الْخَطَّ وَالْکِتَابَةَ أَیْ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ الْخَطَّ بِالْقَلَمِ .))

"اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے کہ اس نے انسان کو قلم کے ساتھ خط و کتابت کا فن سکھایا۔"

اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہے:

((اَلْقَلَمُ نِعْمَةٌ مِنَ اللّٰهِ تَعَالَى عَظِيْمَةٌ ، لَوْ لَا ذٰلِكَ لَمْ يَقُمْ دِيْنٌ ، وَلَمْ يَصْلُحْ عَيْشٌ .)) (تفسیر القرطبی)

"قلم اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان نعمت ہے اور اگر قلم نہ ہوتا تو دین حق کے آثار مٹ جاتے اور زندگی بے لطف ہو جاتی۔"

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں (القلم) کے نام پر ایک سورت نازل کر کے اور اس میں قلم کی قسم اٹھا کر اس کی قدر و منزلت کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ القلم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿نٓ ۚ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ﴾

"ن۔ قسم ہے قلم کی اور اس کی جو اہل قلم لکھتے ہیں۔"

ابو الفتح البستی نے کیا خوب کہا ہے:

((كَفَى قَلَمُ الْكُتَّابِ مَجْدًا وَرِفْعَةً مَدَى الدَّهْرِ أَنَّ اللّٰهَ أَقْسَمَ بِالْقَلَمِ))

"قلم کی تابندہ و پائندہ رفعت و عظمت کے لئے یہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قسم اٹھا کر اس کی شان بلند کی ہے۔"

نبی اکرم ﷺ نے جنگ بدر کے موقعہ پر جب فدیہ لے کر قیدیوں کو رہا کرنے کا فیصلہ کیا تو جن قیدیوں کے پاس دینے کے لئے فدیہ نہیں تھا لیکن وہ فن کتابت سے آشنا تھے تو آپ نے انہیں بطور فدیہ یہ ذمہ داری سونپی تھی کہ وہ دس دس مسلمانوں کو خط و کتابت کی تعلیم دیں۔ جس سے بخوبی واضح ہے کہ رسول اکرم ﷺ اس فن کو کس قدر اہم اور ضروری خیال کرتے تھے اور اس سے صاحب قلم کی عظمت بھی عیاں ہوتی ہے۔ نیز ان لوگوں کے لئے لمحۂ فکریہ ہے جن کو قلم تو عطا ہوا لیکن انہوں نے اسے کند کر ڈالا یا اپنے قلم سے لکھنے کی بجائے ازار بند ڈالنے کا کام لیتے ہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی کیا قدر کی ہے؟ اس سے کس قدر استفادہ کیا اور اس کے ذریعے عباد و بلاد کی اصلاح کے لئے کیا سعی و کوشش کی ہے؟

Marfat.com

حضرت سعید بن العاص رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((مَنْ لَمْ يَكْتُبْ فَيَمِينُهُ يُسْرَى))

''جو شخص لکھتا نہیں اس کا دایاں ہاتھ بھی بائیں کی مانند ہے۔''

اور معن بن زائدہ رحمہ اللہ کہتے ہیں:

((إِذَا لَمْ تَكْتُبِ الْيَدُ فَهِيَ رِجْلٌ))

''جو ہاتھ لکھ نہیں سکتا، وہ پاؤں ہی کی طرح ہوتا ہے۔''

قلم گوید کہ من شاہ جہانم

چاردانگ عالم میں قلم کی فرماں روائی ہے، حکومت اور انتظام سلطنت کا انحصار اور دارومدار بھی اسی پر ہے۔ اسی لیے تو ملوک یونان میں سے کسی کا قول ہے:

((أَمْرُ الدِّيْنِ وَالدُّنْيَا فَوْقَ شَيْئَيْنِ: قَلَمٌ وَ سَيْفٌ ، وَالسَّيْفُ تَحْتَ الْقَلَمِ))

''دین و دنیا کے معاملات کا انحصار دو چیزوں یعنی قلم اور تلوار پر ہے لیکن تلوار قلم کے تابع ہے۔''

لہٰذا اے صاحب قلم! سوچ سمجھ کر قلم اٹھایا کرو کیونکہ قلم بندوق سے زیادہ خطرناک ہے، بندوق بردار شخص کی غلطی سے ایک جان چلی جاتی ہے جب کہ قلم کار کی غلطی سے جنگیں بپا ہوتی اور نسلیں تباہ ہوتی ہیں۔ قلم کی معمولی سی لغزش سے تخت سے تختہ اور محرم سے مجرم بن جاتا ہے۔ اس کو حرکت دیتے وقت خیال رکھنا کہ اس کی نوک بہت تیز ہوتی ہے۔ کہیں چبھ نہ جائے دیکھنا باریک ہے نوک قلم۔

عباسی خلیفہ مأمون الرشید نے کہا ہے:

((لِلّٰهِ دَرُّ الْقَلَمِ كَيْفَ يَحُوْكُ وَشْيَ الْمَمْلَكَةِ))

''قلم امور سلطنت کو مرتب اور منظّم کرنے والا ہے۔''

سلطنت کو قلمرو بھی کہا جاتا ہے۔ وزارتیں بھی اسی کے نام سے منسوب ہوتی ہیں یعنی یہ فلان وزیر کا قلمدان ہے اور فلان نے وزارت تعلیم کا قلمدان سنبھال لیا وغیرہ۔ اور قلم ہی وہ گوہر آبدار اور حقیقت ثابتہ ہے جو علم و ادب اور دین و شریعت کا محافظ، فیصلہ جات اور اہم دستاویزات کو قلمبند کرنے اور تاریخ امم اور اہم دستاویزات کو محفوظ کرنے کا ذریعہ ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے:

((اَلْخَطُّ نِصْفُ الْعِلْمِ، كُلُّ عِلْمٍ لَيْسَ فِيْ قِرْطَاسٍ ضَاعَ))

''تحریر و کتابت آدھا علم ہے اور وہ تمام معلومات جو حوالۂ قرطاس نہ کی جائیں، ضائع ہو جاتی ہیں۔''

Marfat.com

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((قَیِّدُوا الْعِلْمَ بِالْکِتَابِ))

’’علم کو کتابت کے ذریعے قید (یعنی محفوظ) کرو۔‘‘

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے:

((خَیْرُ مَا قُیِّدَ بِهِ الْعِلْمُ الْکِتَابُ))

’’علم کو محفوظ کرنے کا سب سے بہترین ذریعہ کتابت وتحریر ہے۔‘‘

اور حضرت امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((إِعْلَمُوْا رَحِمَکُمُ اللّٰهُ أَنَّ هٰذَا الْعِلْمَ یَنِدُّ کَمَا تَنِدُّ الْإِبِلُ فَاجْعَلُوا الْکُتُبَ لَهُ حُمَاةً وَالْأَقْلَامَ عَلَیْهِ رُعَاةً))

’’اللہ آپ پہ رحم کرے! بخوبی جان لیجئے کہ یہ علم اس طرح بھاگ جاتا ہے، جس طرح آوارہ اونٹ فرار ہو جاتا ہے، لہٰذا کتابوں کو علم کی پناہ گاہ اور قلم اس کا محافظ بنایئے۔‘‘

قلم نے اس جہاں میں علم کی شمع جلائی ہے — قلم نے اس جہاں میں بزم حکمت کی سجائی ہے
قلم ہی نے تو محکوموں کو آزادی دلائی ہے — قسم قرآن میں اس کی میرے اللہ نے کھائی ہے

اور ابو حفص اندلسی کا قول ہے:

((مَا أَعْجَبَ شَأْنَ الْقَلَمِ، یَشْرَبُ ظُلْمَةً وَیَلْفَظُ نُوْرًا)) (جواهر الأدب)

’’قلم کا معاملہ بھی عجیب ہے جو سیاہی پیتا اور روشنائی پھیلاتا ہے۔‘‘

آغا شورش کاشمیری قلم کی عظمت واہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

صفحۂ کاغذ پہ جب موتی لٹاتا ہے قلم — ندرت افکار کے جوہر دکھاتا ہے قلم
آنکھ کی جھپکی میں ہو جاتا ہے تیغ بے پناہ — آن واحد میں حریفوں کو جھکاتا ہے قلم
آندھیوں کا سیل بن کر عرصۂ پیکار میں — زلزلوں کے روپ میں محلوں کو ڈھاتا ہے قلم
دوستوں کے حق کا پشتیبان اپنے زور پر — دشمنوں پہ دشنہ و خنجر چلاتا ہے قلم
برق بن کر لوٹتا ہے خرمن اغیار پر — دوستوں کے نام کا ڈنکا بجاتا ہے قلم
حافظ وخیام وسعدی، غالب واقبال ومیر — ماضیء مرحوم میں ان سے ملاتا ہے قلم
شاعری میں اس قائم ہے خم گیسو کی آبرو — نثر میں اعجاز کے تیور دکھاتا ہے قلم

Marfat.com

قطع کرنی پڑتی ہیں فکر ونظر کی وادیاں
تب کہیں شورش میرے قابو میں آتا ہے قلم

قلم کی اقسام:

علامہ ابن العربی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:
((أَلْاَقْلَامُ فِی الْأَصْلِ ثَلَاثَةٌ ......))
''قلم کی تین قسمیں ہیں۔''

قسم اوّل:......سب سے اشرف وافضل قلم جسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سب سے پہلے پیدا کیا اور اسے تقدیر کائنات لکھنے کا حکم دیا۔

جیسا کہ حدیث پاک میں ہے:
((إِنَّ أَوَّلَ مَاخَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَم فَقَالَ لَهُ: أُكْتُبْ ، قَالَ يَارَبِّ وَمَا أَكْتُبُ ؟قَالَ: أُكْتُبْ مَقَادِيْرَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ))
''بے شک اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا اور اسے لکھنے کا حکم دیا تو قلم نے عرض کیا: اے میرے رب: میں کیا لکھوں؟ تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: قیامت تک کے لئے ہر چیز کی تقدیر قلم بند کردو۔''

اور اسی قلم کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:
((رُفِعَتِ الْاَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ))
''(تقدیر لکھنے والے) قلم اٹھالئے گئے ہیں اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں۔'' [1]

قسم دوم:......وہ قلم جو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو عطا کیے جن کے ساتھ وہ وحی الٰہی کے احکام اور مخلوق کے اعمال واحوال لکھتے ہیں، اسی قلم کو قلم تکلیف بھی کہا جاتا ہے (یعنی مکلفین کے معاملات اور اعمال لکھنے والا قلم) جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِيْنَ ـ كِرَاماً كَاتِبِيْنَ ـ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ﴾
(الإنفطار: ۱۰،۱۱،۱۲)

''بے شک تم پر نگران مقرر ہیں، ایسے معزز کاتب جو تمہارے ہر فعل کو جانتے ہیں۔''
﴿أَمْ يَحْسَبُوْنَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُم بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ﴾
(الزخرف: ۸۰)

[1] مسند احمد: ۲۸۰٤ ـ وصححه الأرناؤط ـ ترمذی: ۲۵۱٦ ـ وصححه الألبانی

Marfat.com

”کیا انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم ان کی راز کی باتیں اور سرگوشیاں سنتے نہیں؟ ہم سب کچھ سن رہے ہیں اور ہمارے فرشتے ان کے پاس ہی لکھ رہے ہیں۔“

یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے ساتھ دو فرشتے مقرر کیے ہیں جو اس کے اعمال لکھنے پر مأمور ہیں، دائیں جانب والا حسنات اور بائیں طرف والا سیئات کا اندراج کرتا ہے۔

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ صَاحِبَ الشِّمَالِ لَيَرْفَعُ الْقَلَمَ سِتَّ سَاعَاتٍ عَنِ الْعَبْدِ الْمُسْلِمِ الْمُخْطِئِ أَوِ الْمُسِيءِ ، فَإِنْ نَدِمَ وَاسْتَغْفَرَ مِنْهَا أَلْقَاهَا وَ إِلَّا كُتِبَتْ وَاحِدَةً)) ❶

”بے شک بائیں جانب والا فرشتہ (یعنی گناہوں کا اندراج کرنے والا) غلطی یا گناہ کا ارتکاب کرنے والے گنہگار مسلمان سے چھ گھڑیوں تک اپنا قلم روکے رکھتا ہے اگر تو وہ اپنے کیے پہ نادم ہو اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لے تو وہ اس گناہ کو درج ہی نہیں کرتا، اور اگر توبہ و استغفار نہ کرے تو اس کے عمل نامے میں ایک گناہ لکھ دیتا ہے۔“

اور اسی قلم کے بارے میں ارشاد نبوی ہے:

((عَنْ أُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ :رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثَةٍ :عَنِ النَّائِمِ حَتَّى يَسْتَيْقِظَ ، وَعَنِ الْغُلَامِ حَتَّى يَحْتَلِمَ وَعَنِ الْمَجْنُوْنِ حَتَّى يُفِيْقَ .)) ❷

ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”تین قسم کے لوگوں سے قلم اٹھا لیا گیا ہے۔ (یعنی ان کے اعمال نہیں لکھے جاتے): ۱: سویا ہوا شخص جب تک بیدار نہیں ہوتا ۲: بچہ جب تک بالغ نہیں ہوتا ۳: مجنون جب تک ہوش میں نہیں آتا۔“

قسم سوم:...... عام قلم جس کے ذریعہ لوگ اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے، اپنے معاملات کو احاطہ تحریر میں لاتے اور اپنی معلومات کو سپرد قلم کرتے، اپنی یادداشتیں محفوظ کرتے اور نامہ نگاری ونقشہ نویسی کرتے ہیں۔

اور اسی کے بارے ابودلف نے کہا ہے:

((اَلْقَلَمُ :صَائِغُ الْكَلَامِ ، مُفَرِّغُ مَا يَجْمَعُهُ الْعِلْمُ)) ❸

---

❶ المعجم الكبير للطبراني ح:٧٦٦٧ و السلسلة الصحيحة للالباني ح:١٢٠٩

❷ صحيح ابن حبان ح:١٤٢ . ❸ ادب الكتاب للصولى ١/ ٦ .

Marfat.com

یعنی قلم کلام آور اور حافظہ میں جمع شدہ معلومات کو سینۂ قرطاس کی زینت بنانے والا ہے۔"
کسی نے خوب کہا ہے:

اِنَّ الْکِتَابَۃَ رَأْسُ کُلِّ صِنَاعَۃٍ
وَبِھَا تَتِمُّ جَوَامِعُ الْأَعْمَالِ

"تحریر و کتابت ہر صنعت و ہنر کی اساس و بنیاد ہے اور اسی کے ذریعے تمام معاملات بخوبی اپنے انجام واختتام کو پہنچتے ہیں۔"

علامہ ابن القیم نے (التبیان فی أقسام القرآن میں) قلم کی حسب مراتب تقسیم کرتے ہوئے بارہ (۱۲) اقسام بیان کی ہیں مثلاً:

۱: سب سے افضل اور اعلیٰ قسم قلم تقدیر ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے پیدا کیا اور اسی کی قسم کھائی ہے۔

۲: قلم وحی (جس کے ذریعہ احکام وحی لکھے جاتے ہیں اور انبیاء و رسل علیہم السلام کی طرف ارسال کے جاتے ہیں۔

۳: قلم تکلیف (وہ قلم جو کراما کاتبین کے پاس ہیں)

۴: علمائے دین اور فتوی نویسوں (مفتیان دین) کا قلم

۵: حکمرانوں اور بادشاہوں کے نائب (سیکرٹری حضرات) کا قلم۔

۶: قلم حساب (ملکوں کے بجٹ، حساب و کتاب اور جمع و خرچ کی تفاصیل لکھنے والے قلم۔

۷: قلم شہادات: معاملات میں گواہوں کی تفاصیل اور بیانات قلمبند کرنے کے لئے استعمال ہونے والا قلم۔

۸: قلم تعبیر: خوابوں کی تعبیر اور منامات کی توضیح و تشریح لکھنے والے قلم۔

۹: قلم تاریخ: دنیا میں رونما ہونے والے وقائع و احداث، اقوام و امم کے طرز حیات اور زمان و مکان کی تحدید اور عروج و زوال کے اسباب قلمبند کرنے کے لئے مستعمل قلم۔

۱۰: قلم لغت: لغت نویسی اور کسی بھی زبان کے قواعد و ضوابط، گرامر اور ادبی نگارشات اور فنی محاسن لکھنے والے قلم۔

۱۱: دین اسلام کے مخالفین، ملحدین اور معاندین کا افکار باطلہ کی تردید اور دین اسلام کے دفاع میں استعمال ہونے والے قلم۔

۱۲: اسلام اور مسلمانوں کے خلاف لکھنے والے، دین حق کو بدنام کرنے والے اور حسد و بغض کی وجہ سے اہل

Marfat.com

اسلام کے خلاف استعمال ہونے والے قلم خواہ وہ صاحب قلم دشمنان اسلام ہوں یا ان کے زرخرید غلام و آلہء کار ہوں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ تقسیم متداخل ہے یعنی یہ تمام اقسام علامہ ابن العربی کی بیان کردہ تین قسموں کے تحت مندرج ہیں۔

قلم کی ساخت اور بناوٹ

قلم کی تعریف:

((اَلْقَلَمُ :مَا یُبْرَی مِنْ شَجَرَةٍ أَوْ قَصْبَةٍ لِلْكِتَابَةِ))

''تحریر و کتابت کے لئے درخت یا سرکنڈے کی تراشیدہ شاخ کو قلم کہا جاتا ہے۔''

اور بعض نے اس کی تعریف یوں کی ہے:

((اَلْقَلَمُ :أَدَاةُ الْكِتَابَةِ بِهَا یُعَبِّرُ الشَّخْصُ عَمَّا فِیْ نَفْسِهِ ، وَعَنْ طَرِیْقِهَا یُكْتَبُ الْعِلْمُ وَیُنْشَرُ))

''قلم لکھنے کا وہ آلہ ہے جس کے ذریعے کوئی شخص اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتا ہے اور اسی کے ذریعے معلومات کو احاطہء تحریر میں لایا جاتا اور ان کی نشر و اشاعت کی جاتی ہے۔''

وجہ تسمیہ:

((سُمِیَّ الْقَلَمُ قَلَمًا لِأَنَّهُ یُقْلَمُ أَیْ یُقْطَعُ))

قلم کو قلم اس لئے کہا جاتا ہے کہ: اسے آگے سے ٹک دیا جاتا یعنی کاٹا جاتا ہے اور (تقلیم الأظفار) بھی اسی سے ماخوذ ہے۔ کہا جاتا ہے:

((قَلَّمْتُ ظُفْرِیْ أَیْ قَطَعْتُهُ وَ سَوَّیْتُهُ))

''میں نے اپنا ناخن تراشا اور برابر کیا۔ اور (قَلَمٌ) فَعَلٌ کے وزن پر مَفْعُوْلٌ کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے یعنی (مَقْلُوْمٌ) تراشیدہ یا جسے نوک پر ٹک دیا گیا ہو اور اس کی جمع (اَقلام) آتی ہے۔

قلم تقدیر اور قلم تکلیف کی ساخت و بناوٹ اور ہیئت و کیفیت تو ہمیں معلوم نہیں لیکن ان کے وجود اور کارکردگی پر ہمارا ایمان و یقین ہے۔ ہم اس عنوان کے تحت اہل جہان میں متعارف اور متداول قلم اور مختلف ادوار میں اس کے ارتقائی مراحل اور تطورات بالا اختصار روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْ أَنَّمَا فِی الْأَرْضِ مِن شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ یَمُدُّهُ مِن بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَزِیزٌ حَكِیمٌ﴾ (لقمان :)

Marfat.com

''زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر (دوات بن جائے) جسے مزید سات سمندر روشنائی مہیا کریں تب بھی اللہ تعالیٰ کے تعریفی کلمات ختم نہیں ہو سکتے۔''

آیت مبارکہ میں درختوں سے قلم کی ساخت اور بناوٹ کا ذکر کیا گیا ہے۔

قلم کہتا ہے میں جنگل کی جڑ ہوں
ہاتھ میں پکڑو تو سونے کی لڑ ہوں

ابتدائی طور پر لکھنے کے لئے پرندوں کے پر بھی بطور قلم استعمال ہوتے تھے، اسی طرح لکڑی، بانس اور سرکنڈے کے قلموں کا رواج عام رہا، قلم رصاص وجود میں آیا، پھر لوہے کی نب والے قلم میں سیاہی بھر کے اس سے لکھا جانے لگا، بال پوائنٹ قلم وجود میں آئے، پھر ٹائپ رائٹر ایجاد ہوا اور آج کل کمپیوٹر سے کمپوزنگ کا کام لیا جاتا ہے یہ سب قلم ہی کی اقسام ہیں جو ارتقائی مراحل سے گزری ہیں۔

آیت کریمہ سے یہ بھی واضح ہے کہ کتابت کے چار ارکان ہیں:

۱: قلم
۲: دوات (سیاہی)
۳: قرطاس (کاغذ وغیرہ)
۴: کاتب

جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿قُل لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَاداً لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَن تَنفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدا﴾ (الکھف : ۹)

''(اے پیغمبر) فرما دیجیے! اگر میرے رب کے (تعریفی) کلمات لکھنے کی غرض سے سارا سمندر روشنائی بن جائے تو سمندر ختم ہو جائے لیکن میرے رب کے (تعریفی) کلمات ختم نہ ہوں بلکہ ہم اتنی ہی روشنائی اور لے آئیں تو بھی وہ کفایت نہ کرے۔''

نیز فرمایا:

﴿نٓ۔ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ﴾

''ن۔ قسم ہے قلم کی اور اس کی جو اہل قلم لکھتے ہیں۔''

قرطاس:

((مَا يُكْتَبُ فِيهِ مِنْ وَرَقٍ وَنَحْوِهِ .))

''کاغذ یا اس کی مانند دیگر اشیاء جن پر لکھا جاتا ہے قرطاس کہلاتی ہیں۔''

(مثلاً درختوں کے پتے، لکڑی کی تختیاں، پتھر کی سلیٹیں اور کپڑا اور چمڑا وغیرہ) ارشاد باری تعالیٰ ہے:

Marfat.com

﴿وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَاباً فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ﴾ (الأنعام : ۷)

''اور (اے پیغمبر!) اگر ہم آپ پر کوئی کاغذ میں لکھی ہوئی کتاب بھی اتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے، تب بھی جنھوں نے حق کا انکار کیا ہے وہ یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔''

اور اس کی جمع قراطیس آتی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿تَجْعَلُونَهُ قَرَاطِيسَ تُبْدُونَهَا وَتُخْفُونَ كَثِيراً﴾ (الأنعام : ۹۱)

قلم ایک مقدس امانت ہے:

قلم اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے، یہ ایک سچائی اور حقیقت کا نام ہے اور قلم سے رشتہ استوار کر کے انسان قلم کار بن جاتا ہے۔ اور حقیقی قلم کار آبروئے قلم کا محافظ اور حق وصداقت کا پاسباں اور ملک وملت کا خیر خواہ اور مخلوق کا ہمدرد ہوتا ہے، وہ بنی نوع انسان کو سود وزیاں سے آگاہ کرنا اپنا فرض منصبی خیال کرتا ہے۔ اسکی حیثیت میر کارواں اور رہبر وراہنما کی ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر صاحب قلم کو خواہ وہ مصنف ومؤلف ہو یا مؤرخ و وقائع نگار ہو یا صحافی و جرنلسٹ، وہ مقالہ نویس ہو یا کالم نگار، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ قلم اٹھانے سے پہلے قلم کی عظمت کو جانے اور اسے یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ قلم وہ مقدس امانت ہے جس کی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قسم کھائی ہے، لہٰذا اس کے کچھ آداب اور تقاضے ہیں، اس کی کچھ ذمہ داریاں اور فرائض ہیں۔ صاحب قلم آبروئے قلم کا امین ہوتا ہے۔ اس کے لئے افراط وتفریط اور جانبدارانہ رویہ اختیار کرنے سے گریز کرنا بے حد ضروری ہے اور اسے ہمیشہ یہ فکر دامن گیر ہونی چاہیے کہ......

میں لکھ کر ہو سکوں گا سرخرو کیا؟
قلم کیا ہے؟ اور آبروئے قلم کیا؟

قلم کار نوک قلم سے نکلے ہوئے ایک ایک حرف کے بارے میں مسئول اور جواب دہ ہے۔ قیامت کے دن اس کی تحریریں یا تو اس کی کامرانی اور سعادت مندی کا باعث ہوں گی یا ناکامی اور بدبختی کا سبب بنیں گی۔ اگر تو اس نے آبروئے قلم کا پاس کیا ہوگا اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عطا کردہ اس صلاحیت کو انسانیت کی فلاح وبہبود اور پیغام حق لوگوں تک پہنچانے کیلئے، نیکی پھیلانے اور برائی کو مٹانے کے لئے استعمال کیا ہوگا تو روز محشر یہ صاحب قلم شاداں وفرحاں اور اپنے کارکردگی پہ نازاں ہوگا اور اگر اس نے آبروئے قلم کو نیلام کیا ہوگا اور اسے لوگوں کو بلیک میل کرنے، حقائق کو مسخ کرنے اور گمراہی پھیلانے اور فحاشی وبے حیائی فروغ دینے

Marfat.com

کے لئے استعمال کیا ہوگا تو ایسا سیاہ بخت اور سوختہ نصیب میدان محشر میں نادم و پشیمان ہوگا، اور اپنے گناہوں کے ساتھ ان لوگوں کے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھائے گا جو اس کی وجہ سے گمراہی اور برائی و بے رہروی کا شکار ہوئے ہونگے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَّعَ أَثْقَالِهِمْ وَلَيُسْأَلُنَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَمَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ﴾ (العنکبوت : ۱۳)

''وہ یقیناً اپنے (گناہوں کے) بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے گناہوں کے ساتھ دوسرے (دوسروں کے گناہوں کے) بوجھ بھی اور دنیا میں جو کچھ غلط بیانی کرتے تھے قیامت کے دن ان سے اس کے بارے میں ضرور باز پرس ہوگی۔''

اور سورہ النحل میں فرمایا:

﴿لِيَحْمِلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُم بِغَيْرِ عِلْمٍ أَلَا سَاءَ مَا يَزِرُونَ﴾ (النحل : ۲۵)

''تاکہ قیامت کے دن وہ اپنے مکمل بوجھ بھی اٹھائیں اور ان لوگوں کے بوجھ بھی جنہیں وہ جہالت کی وجہ سے گمراہ کرتے رہے۔ خبردار! جو بوجھ وہ اٹھا رہے ہیں بہت ہی برا ہے۔''

لہٰذا قلم و زبان کے استعمال سے قبل انسان کو ہزار بار سوچنا چاہیے۔ بالخصوص ایسے دور میں جب آزادی صحافت کے نام پر زبان و قلم بے لگام اور اصول و ضوابط کی پابندی سے بے نیاز ہو چکے ہوں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ: نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ ، تَسْلِيمَ الْخَاصَّةِ ، وَ فُشُوَّ التِّجَارَةِ حَتَّى تُعِينَ الْمَرْأَةُ زَوْجَهَا عَلَى التِّجَارَةِ ، وَ قَطْعَ الْأَرْحَامِ ، وَ شَهَادَةَ الزُّوْرِ ، وَكِتْمَانَ شَهَادَةِ الْحَقِّ ، وَ ظُهُوْرَ الْقَلَمِ .)) ❶

''قرب قیامت کے وقت لوگ صرف جان پہچان والوں کو سلام کہیں گے، تجارت عام ہوگی حتی کہ بیوی بھی تجارت میں شوہر کا ہاتھ بٹائے گی، قطع رحمی عام ہو جائے گی، جھوٹی گواہی کا رواج عام ہوگا اور سچی گواہی کو چھپایا جائے گا، اور قلم کی کارروائی عام ہوگی۔''

حدیث پاک میں ''ظہور قلم'' کے الفاظ سے جہاں تصنیف و تالیف کے عام ہونے اور مکتبات کی کثرت کی پیشین گوئی کی گئی ہے وہاں قیامت سے پہلے بد عملی کی وجہ سے عام ہونے والے غیر پسندیدہ امور میں

❶ رواہ احمد: ح ۳۸۷۰ و ابن ماجہ بسند صحیح

۱۶۱۵۸۱

Marfat.com

"ظہور قلم" کا تذکرہ قلم کی بے اعتدالی و بے رہروی، اس کے غلط استعمال اور اس کی حرمت کو پامال کرنے کے عمل کو بھی غیر سنجیدہ اور ناپسندیدہ عمل قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا قلم کو حرکت دینے سے پہلے ملحوظ خاطر رہے کہ......

وَمَا مِنْ كَاتِبٍ إِلَّا سَيَفْنَى
وَيَبْقَى الدَّهْرَ مَا كَتَبَتْ يَدَاهُ
فَلَا تَكْتُبْ بِكَفِّكَ غَيْرَ شَيْءٍ
يَسُرُّكَ فِي الْقِيَامَةِ أَنْ تَرَاهُ

"ہر قلم کار فنا ہو جائے گا، اور اس کے ہاتھوں سے رقم شدہ تحریر ہمیشہ کے لئے باقی رہے گی، لہٰذا اپنے ہاتھوں سے صرف وہی کچھ سپرد قلم کرو جسے دیکھ کر قیامت کے دن آپ کو خوشی نصیب ہو۔"

وَمَا مِنْ كَاتِبٍ إِلَّا سَتَبْقَى
كِتَابَتُهُ وَإِنْ بَلِيَتْ يَدَاهُ
فَلَا تَنْسَخْ بِخَطِّكَ غَيْرَ عِلْمٍ
يَسُرُّكَ فِي الْعَوَاقِبِ أَنْ تَرَاهُ

"ہر کاتب کی تحریر باقی رہتی ہے گرچہ وہ خود خاک میں ہی کیوں نہ مل چکا ہو چناں چہ اپنے ہاتھ سے وہی کچھ سپرد قلم کرو جس کے نتائج و ثمرات دیکھ کر آپ کو خوشی حاصل ہو۔

مبارک ہے وہ قلم جس نے قرآن کریم کے نورانی حروف زینت قرطاس کیے۔ وہ قلم جو حدیث مصطفےٰ ﷺ کے در ثمین سینۂ کاغذ پہ بکھیرتا ہے۔"

وہ قلم جس نے سیرت النبی ﷺ کے حسین تذکروں سے فضائے عالم کو معطر کیا۔ خوشا! وہ قلم جو وحی الٰہی کا ترجمان ہے۔ وہ قلم جو حق کا پاسبان ہے۔ لائق ستائش ہے وہ قلم جو اسلام کی تابندہ و درخشندہ تاریخ کا امین ہے۔ وہ قلم جو نیکی پھیلائے اور برائی کو مٹائے، لوگوں کے حقوق کا تحفظ کرے، اور معاشرے میں تہذیب و اخلاق کی روشنی پھیلائے اور علم و آگہی کی شمع جلائے۔ آفرین اس قلم پر جو دین حق کا دفاع کرے، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں کو بے نقاب کرے، اسلام کے خلاف منفی پروپیگنڈے کا بھرپور طریقے سے رد کرے اور اہل جہاں کو حقائق سے آگاہ کرے۔ ایسے قلم کو تھامنے والے آبروئے قلم کے امین، اہل جہاں کے خیر خواہ اور اقوام و ملل کی تاریخ کے محافظ ہوتے ہیں۔ قومیں ان پر ناز کرتی ہیں۔ اور تاریخ میں ان کا نام جلی حروف لکھا جاتا ہے۔

نفرین صد نفرین! قلم کے ان سوداگروں اور بیوپاریوں پر جو جی حضوری، خوشامد اور چاپلوسی، یا ذاتی مفاد

Marfat.com

اور چند ٹکوں کے حصول کے لئے یا گروہی تعصب یا ذاتی انا کی خاطر لوگوں کی پگڑیاں اچھالتے اور ان کو بلیک میل کرتے ہیں، حقائق مسخ کرتے، تاریخ میں تحریف کرتے، انصاف کو بیچتے، فتوی فروشی کرتے لوگوں کے حقوق پر ڈاکے ڈالتے، فحاشی کو فروغ دیتے، تہذیب واخلاق کا قتل عام کرتے گمراہی پھیلاتے اور معاشرے میں فساد مچاتے ہیں اور سنسنی پھیلاتے ہیں۔ قلم ان کی نازیبا حرکتوں پہ نوحہ کناں ہے اور ان کی ریشہ دوانیوں سے معاشرے کا ہر فرد پریشان ہے۔ آبروئے قلم کو نیلام کرنے والے ایسے عناصر ننگ صحافت اور انسانیت کے دشمن ہیں۔ ایسے ہی قلمکاروں کی وجہ سے زرد صحافت اور لفافہ صحافیوں کی اصطلاحیں سننے میں آتی رہتی ہیں۔

کسی نے سچ کہا ہے:

اگر ہم بھی قلم کی آبرو نیلام کرجاتے
تو پھر حالات کے مارے ہوئے انسان کدھر جاتے

قلم فروشی ایک بہت بڑا عیب ہے۔ آغا شورش کاشمیری لکھتے ہیں:

''میرے نزدیک قلم فروشی عصمت فروشی سے کم نہیں، بلکہ اس سے بھی قبیح اور مکروہ ہے۔ قدرت نے قلم اس لئے نہیں دیا کہ بیچا جائے، اس سے بہتر ہے کہ ہاتھ شل ہو جائیں، زبان اس لئے نہیں بخشی کہ مرہون غیر ہو، ایسی زبان پر فالج گرجائے تو خدا کا احسان ہے۔'' (بحوالہ موت سے واپسی ص ۳۵)

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ایسے اصحاب قلم کی مذمت کی ہے جو قلم کی حرمت کو پامال کرتے اور دنیوی مفاد کی خاطر حقائق کو بدل دیتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَـٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ﴾

(البقرہ: ۷۹)

''ہلاکت ہے اُن لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں اور کہتے یہ ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے (آئی) ہے تاکہ اس کے عوض تھوڑی سی قیمت (یعنی دنیوی منفعت) حاصل کریں، ان پر افسوس ہے اس لئے کہ (بے اصل باتیں) اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں اور (پھر) ان پر افسوس ہے اس لئے کہ ایسے کام کرتے ہیں۔''

وہ قلم کار جو قلم جیسی نعمت کو اصلاح کی بجائے فساد اور فحاشی کا پرچار کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں اور نسل نو کی بربادی کا سبب بنتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وعید اپنے پیش نگاہ رکھنی چاہیے:

Marfat.com

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ (النور : ۱۹)

''بے شک جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ مومنوں میں بے حیائی پھیلے ان کو دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہوگا اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''

قلم کے آداب اور تقاضے

ا:خلوص نیت:

صاحب قلم کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی بھی موضوع پر خامہ فرسائی سے پہلے اپنی نیت میں اخلاص پیدا کرے۔یعنی اپنے دل میں مصمم ارادہ کرے کہ اس کا یہ عمل محض اللہ کی رضا اور مخلوق کی بہبود و فلاح کی غرض سے ہے۔کیونکہ خلوص نیت اعمال کی قبولیت اور حصول برکت کا موجب ہے اور نیت کا خلل بے برکتی اور بگاڑ کا سبب بنتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((إنما الأعمال بالنيات))

''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔''

مؤرخ اہل حدیث رحمہ اللہ اسی خوبی کو اپنے مشن میں کامیابی کا سبب قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اگر آئینہ قلب صاف ہو اور نیت زنگ آلود نہ ہو چکی ہو تو قدم خود بخود کامرانی کی طرف بڑھنے لگتے ہیں، اور مستقبل کی راہ بہت جلد متعین ہو جاتی ہے۔'' (نقوش عظمت رفتہ ص ۲۶۶)

۲:حق گوئی و بے باکی:

حقائق سے آگاہی اور باطل کی سرکوبی اس قلم کا تقاضا اور ذمہ داری ہے جس کی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قسم کھائی ہے۔اور حقیقی وسچا قلمکار وہی ہے کہ جس کا ضمیر زندہ ہو اور وہ کسی لالچ یا دباؤ میں آکر نہ حقائق کو مسخ کرے اور نہ انہیں توڑ موڑ کر پیش کرے، بلکہ رزم ہو یا بزم وہ ہر حال حق وصداقت کا پاسبان ہو اور آبروئے قلم کا امین ثابت ہو۔اور اس کا یہ شعار ہو:

اپنے بھی خفا مجھ سے ، بیگانے بھی نا خوش
کہ میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

Marfat.com

۳: منصف مزاجی:

قلم کا تقاضا یہ بھی ہے اس مقدس امانت کو بروئے کار لاتے وقت عدل وانصاف سے کام لیا جائے اور تعصب و جانبداری سے مکمل اجتناب اور گریز کیا جائے کیونکہ اس کی نگارشات اقوام وملل کے کردار کا تعین کرتے اور وقائع واحداث کے بارے میں معلومات کو محفوظ کرنے کا ذریعہ ہیں۔کسی شخصیت کے ساتھ ذاتی روابط ،یا کسی مذہبی یا سیاسی جماعت کے ساتھ وابستگی قلم کے جھکاؤ اور حقائق کو تبدیل کرنے کا موجب اور سبب نہ بنے۔ بدقسمتی سے یہ وبا آج کل عام ہے، اہل حدیث اکابرین جو کہ برصغیر میں اٹھنے والی ہر تحریک کے روح رواں اور ہمیشہ ہراول دستے میں پیش پیش رہے ہیں خواہ وہ تحریک خلافت ہو یا تحریک آزادی قیام پاکستان کی تحریک ،تحریک ختم نبوت ہو یا تحریک نفاذ نظام مصطفے (ﷺ) یا تحفظ ناموس رسالت کی تحریک ہو یا تحریک تحفظ حرمین شریفین اہل حدیث اکابرین آپ کو قیادت کرتے ہوئے نظر آئیں گے،لیکن جب مؤرخ کا قلم تعصب آلود ہوتا ہے تو تحریک آزادی پر خامہ فرسائی کرتے وقت اکابرین اہل حدیث علمائے صادقپور اور سیدین شہیدین رحمہم اللہ اور دیگر علمائے اہل حدیث کو نظر انداز کرجاتا ہے،تحریک ختم نبوت کی تاریخ قلمبند کرتے ان اکابرین اہل حدیث کا ذکر تک نہیں کرتا جنہوں نے سب سے پہلے فتنہ قادیانیت کے خلاف آواز اٹھائی اوراس کے خلاف جہاد کیا اورانہیں کے ساتھ مباہلہ کے نتیجے میں قادیانی متنبّی اپنے کیفر کردار کو پہنچا یعنی حضرت العلام مولانا محمد حسین بٹالوی، شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری ،مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی ،مولانا محمد حنیف ندوی ،علامہ احسان الٰہی ظہیر، مناظر اسلام حافظ عبد القادر روپڑی اور حافظ محمد ابراہیم کمیر پوری اور مؤرخ اہل حدیث مولانا محمد اسحاق بھٹی اور دیگر علمائے اہل حدیث رحمہم اللہ تعالیٰ ،اور علامہ ساجد میر حفظہ اللہ اوران کے رفقائے کرام۔اور کسی نے سچ کہا ہے:

چھوڑا نہ تعصب نے مؤرخ کا قلم بھی
گاندھی ہے کتابوں میں آزاد نہیں ہے

مؤرخ اہل حدیث تاریخ نویسی کے متعلق اپنا نقطہء نظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”تاریخ کا ایک بنیادی اصول ہے کہ اس کے واقعات ایک خاص انداز اور رفتار سے اپنا سفر طے کرتے ہیں، اس میں خلل ڈالنا اوراسے بدل کر اپنی مرضی کے مطابق چلانے کی سعی کرنا اس کے مزاج وفطرت کے قطعا منافی ہے۔“(ہفت اقلیم ص ۳۶۶)

یہی وجہ ہے کہ مسلکی طور پر اہل حدیث ہونے کے باوجود تاریخ نویسی کے دوران انہوں نے دیگر مسالک کے اکابرین کی جہود ومساعی کا کھلے دل اعتراف کیا اوران کی خدمات کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے

Marfat.com

اور اس سلسلے میں کسی قسم کے مسلکی تعصب یا بخل سے کام نہیں لیا۔

اور یہی قرانی تعلیمات ہیں، ارشاد باری تعالیٰ:

﴿وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ﴾ (الأنعام : ۱۵۲)

''جب بات کرو تو انصاف کی کہو، خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار کا ہی کیوں نہ ہو۔''

نیز فرمایا:

﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾ (المائدہ : ۸)

''کسی قوم کی دشمنی تمہیں نا انصافی کرنے پر برانگیختہ نہ کرے، عدل کرو یہ قرین تقویٰ ہے: اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، یقیناً اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے اچھی طرح باخبر ہے۔''

۴: تحقیق و جستجو:

یہ کام محنت اور ریاضت کا متقاضی ہے۔ اور صاحب قلم کے فرائض منصبی میں شامل ہے کہ وہ جو بھی لکھے پوری تحقیق و ذمہ داری سے اس طرح لکھے کہ مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔ بلا تحقیق ہر سنی سنائی بات کو آگے نقل کر دینا بہت بڑا عیب ہے اور ناقل کی قدر و قیمت کو کم کر دیتا ہے۔ لوگوں کا اس پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔

حضرت بھٹی صاحب کے نزدیک مصنف میں ان اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے:

''معلومات کی جستجو، مطالعہ کا شوق، اپنے موضوع سے متعلق واقعات کی فراہمی، اور ہر اہم بات کا حوالہ دینے کا التزام، محنت اور دلجمعی سے کام کرنے کی عادت، اور قلم کی روانی۔''

(گلستان حدیث ص ۵۸۲)

مؤرخ اہل حدیث:

مؤرخ اہل حدیث، ذہبی دوراں، آبروئے قلم و قرطاس اور تحریک آزادی کے عظیم سپاہی مولانا محمد اسحاق بھٹی بن میاں عبدالمجید رحمہما اللہ وہ نابغہء روزگار اور عبقری شخصیت تھے جنہیں اللہ تعالیٰ بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا، اوائل عمری میں ان کے دل میں کسب کمال اور کارہائے نمایاں سرانجام دینے کا جذبہء صادقہ موجزن تھا، وہ حصول علم کے ساتھ ساتھ نوعمری میں ہی تحریک آزادی کے سرگرم کارکن کے طور پر ہمیشہ پیش پیش رہے حتی کہ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔

نقوش عظمت رفتہ میں لکھتے ہیں:

''میں سولہ سترہ سال کی عمر میں درس نظامی کے مروجہ نصاب سے فارغ ہو گیا تھا۔''

(نقوش ص ۱۷۱)

Marfat.com

انہوں نے جس دلچسپی اور کامل رغبت کے ساتھ علم حاصل کیا اور اپنے عالی مرتبت اساتذہ و مشائخ سے استفادہ کیا، اس کا اندازہ ان کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے، فرماتے ہیں:

''چند طلبا (بخاری شریف) کی عبارت تیز پڑھتے تھے اور اللہ کی مہربانی سے بالکل صحیح پڑھتے تھے۔ ان میں مولانا محی الدین لکھوی، مولوی محمد افضل، حافظ محمد زکریا اور ان سطور کا راقم عاجز شامل تھے۔ بحمد اللہ ہم چاروں کا یا یوں کہیے کہ ''رفقاء اربعہ'' کا اسلوب قراءت حضرت استاذ گرامی کے مزاج عالی کے عین مطابق تھا اور ہمیں یہ شرف حاصل تھا کہ حضرت ممدوح ہم پر خوش تھے۔''

(تذکرہ مولانا محی الدین لکھوی ص ۱۸۰)

دینی واخلاقی تربیت:

اپنے دادا مرحوم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''وہ ہر چھوٹی بڑی بات کا خیال رکھتے تھے۔ ایک دفعہ میں چارپائی پہ بیٹھا پاؤں ہلا رہا تھا، انہوں نے دیکھا تو فرمایا: پاؤں نہیں ہلانے چاہئیں، اس طرح آدمی برا لگتا ہے۔ یہ بات چھوٹی عمر میں میرے ذہن میں ایسی پیوست ہوئی کہ میں نے چارپائی پر بیٹھے ہوئے کبھی ایسی حرکت نہیں کی۔ نیز فرماتے ہیں: ''مجھے انہوں نے نصیحت فرمائی کہ اپنے سے بڑے سے کھڑے ہو کر مصافحہ کرو۔ بیٹھے بیٹھے مصافحے کے لئے اس کی طرف ہاتھ نہ بڑھاؤ۔ ایسا کرنا بڑے کی بے ادبی ہے۔''

مزید لکھتے ہیں:

''میرے دادا مرحوم مجھے پرانے بزرگوں کے واقعات سنایا کرتے اور انبیاء علیہم السلام کے قصے بیان فرمایا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے قرآن مجید پڑھایا، پنجابی اور اردو کی بعض کتابیں پڑھائیں۔ مجھے وہ بار بار بعض اہل علم کی خدمت میں لے کر گئے۔ میرے لیے نیک لوگوں سے دعائیں کروائیں اور خود کیں ...... وہ نماز فجر سے قبل مسجد میں جاتے اور مجھے بھی جگاتے اور اپنے ساتھ لے کر جاتے۔ بسا اوقات فجر کی اذان مجھ سے کہلواتے۔ اسی تربیت کی وجہ سے مجھے فجر سے پہلے جاگنے کی عادت پڑی۔ میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ روزانہ فجر کی نماز سے پہلے قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہوں اور قرآن مجید پڑھ کر نماز کے لئے گھر سے نکلتا ہوں۔''

(گزر گئی گزران ص ۴۲)

بھٹی صاحب کے نواسے محمد نعمان اسحاق لکھتے ہیں:

''تہجد کی نماز کے بعد اللہ کے حضور ایسی گڑگڑا کر، زاروقطار آنسوؤں کے ساتھ دعا مانگتے کہ اکثر

Marfat.com

ساتھ والے کمرے میں سوئے ہوئے مجھ سمیت گھر کے تمام افراد جاگ جاتے ۔ دعا اس قدر عاجزی سے مانگتے کہ اگر کوئی سن لے تو اسے دعا کی قبولیت کا یقین ہو جائے ۔ اس دعا میں خاندان کے ایک ایک فرد کا نام لیتے اور ساتھ اگر کسی دوست یا ہمسائے نے کوئی مشکل بتائی ہوتی تو اس کو بھی شامل کرتے اور اپنی بخشش کا بھی سوال کرتے ۔''

(ماہنامہ ترجمان الحدیث، اشاعت خاص، ص۳۰۴)

ذوق مطالعہ:

مؤرخ اہل حدیث رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

''شعور کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیفات ''تذکرہ'' اور ''ترجمان القرآن'' کا مطالعہ کرلیا تھا۔ ''الہلال'' کا فائل مجھے مولانا عبیداللہ احرار مرحوم نے تحفے کے طور پر دیا تھا، وہ پورا پڑھ لیا تھا۔ ''البلاغ'' بھی اول سے آخر تک دیکھ لیا تھا۔''

نیز فرماتے ہیں:

''طالب علمی دور میں درسی کتابوں کے علاوہ جو کتابیں میں نے پڑھیں، ان میں مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی رحمہ اللہ کی کتابیں بھی شامل ہیں ۔ یہ تاریخی ناول ہیں ...... مولانا احمد علی رحمہ اللہ کے رسائل، ہندوؤں کی بعض کتابیں ۔ اس وقت میرے مطالعہ کی رفتار اوسطاً دو سو صفحات روزانہ تھی ۔ ہمارے محلے سے متصل سرکاری باغ تھا جس میں والیٔ فرید کوٹ کی کوٹھی بھی تھی ۔ اکثر صبح میں اس باغ میں چلا جاتا اور شام تک وہاں بیٹھا پڑھتا رہتا ۔ اس زمانے میں پڑھنے کا بہت شوق تھا اور میری دلچسپی کا اصل موضوع اسلامی تاریخ تھا۔'' (گزر گئی گزران ص ۱۰۷، ۱۰۸)

حضرت بھٹی رحمہ اللہ کی عزیزہ محترمہ قدیسہ سعید بیان کرتی ہیں:

''کبھی کبھار ہماری امی جی (یعنی بھٹی صاحب کی زوجۂ محترمہ) جو کہ ایک ان پڑھ اور سادہ خاتون تھیں، ان کے ہمہ وقت اس لکھنے پڑھنے کے عمل کو اپنی سوتن کا درجہ بھی قرار دے دیتیں اور کہتیں کہ لوگ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے گھر کو وقت دیتے ہیں اور آپ نے اپنے آپ کو پہلے سے بھی زیادہ مصروف کرلیا ہے اور ابو جی جب گھر میں کتابیں لے کر آتے تو امی جان کہتیں: ''جو کتابیں گھر میں موجود ہیں، کیا انہیں پڑھ لیا ہے کہ اور خرید لائے ہو؟''

(ترجمان الحدیث: ص ۳۰۸)

حضرت بھٹی صاحب کے بھتیجے حافظ محمد حسان سعید (جو کہ مہذب و شائستہ اور با صلاحیت نوجوان ہیں،

Marfat.com

اور آجکل وہ ایم ۔فل کر رہے ہیں) بیان کرتے ہیں:

''۲۱ دسمبر ۲۰۱۵ء (یعنی مؤرخ اہل حدیث کی زندگی کا آخری دن) کو علی الصبح راقم اور محمد نعمان اسحاق (بھٹی صاحب کے نواسے) ہسپتال جانے کے لئے گھر سے نکلے تو میرے والد گرامی کا فون آیا کہ ''ابو جی'' کہہ رہے ہیں کہ مطالعے کیلئے میری دو کتابیں (تذکرہ مولانا محی الدین لکھوی رحمہ اللہ اور برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش) لیتے آنا۔ چنانچہ ہم نے ناشتے کے ساتھ ان کتابوں کو بھی رکھ لیا......''

جس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ لکھنا اور پڑھنا کس طرح ان کی طبیعت ثانیہ بن چکا تھا۔ زندگی کے آخری دن بھی قدرے افاقہ محسوس ہوا تو ذوق مطالعہ چمک اٹھا۔ اسے کہتے ہیں وقت کی قدر اور جذبۂ عمل پیہم۔

قوت حافظہ:

ہمارے ممدوح حضرت بھٹی رحمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے بے پناہ قوت حافظہ سے نوازا تھا۔ برسوں پرانی یادیں اور واقعات و مشاہدات ان کی یادداشت میں محفوظ اور لوح دماغ پر منقوش تھے۔ حافظہ قوی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ یومیہ ڈائری لکھنے کا بھی اہتمام کیا کرتے تھے

دورۂ کویت کے دوران انہوں نے راقم الحروف کی رہائش گاہ پر قیام کیا تھا، اس دوران جہاں مجھے ان کی خدمت کرنے کی سعادت اور میزبانی کا شرف حاصل ہوا، وہاں اس عبقری اور ہر دلعزیز شخصیت کے یومیہ معمولات کا قریب سے مشاہدہ کرنے کا بھی موقعہ میسر آیا۔

آپ انتہائی ملنسار، خوش طبع و با اخلاق، شگفتہ مزاج، ہمہ وقت چہرے پر تبسم اور لبوں پہ مسکراہٹ سجائے ہوئے، گفتگو کرتے تو معلومات کے دریا بہاتے اور علوم و معارف کے خزینے لوٹاتے، تواضع و انکساری کا پیکر، طبیعت میں انتہائی سادگی اور تکلف سے گریزاں، مطالعہ کتب کے شیدائی اور معلومات جمع کرنے کے لئے حریص، شب زندہ دار اور نمازوں کے پابند، باقاعدگی سے قرآن پاک کی تلاوت اور لمبی اور پر خشوع دعا کا اہتمام کرتے، ہمیشہ کلمہ خیر کہتے اور دوسرے کے محاسن بیان کرنے میں خوشی محسوس کرتے اور کسی پر بے جا تنقید اور غیبت سے نفور تھے۔ ان کے لباس کی طرح ان کی غذا بھی بہت سادہ تھی۔ عمومی طور کھانے کے وقت ہماری محفل جمتی تھی جس میں مہمان گرامی کے علاوہ برادر مکرم ابوعمر عبدالغفور صاحب، ملک جاوید صاحب، حافظ عبد الرؤف، شیخ انور سلفی صاحب اور بھائی جسیم الدین اور بھائی صبوح اصغر موجود ہوتے اور میر محفل حضرت بھٹی صاحب رحمہ اللہ ہوتے۔ سبھی ان کے لطائف علمیہ اور تاریخی معلومات پر مبنی گفتگو سے مستفید و محظوظ ہوتے۔ آہ!

Marfat.com

وہ دن وہ محفلیں وہ شگفتہ مزاج لوگ
موج زمانہ لے گئی جانے کیا کیا ساتھ

دن بھر مختلف شخصیات سے ملاقات اور مختلف مقامات کی سیر کر کے جب واپس لوٹتے تو کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنی ڈائری لکھتے اور جن لوگوں سے ملاقات ہوتی ان کا نام و پتہ اور حلیہ وخدوخال نوٹ کرتے بعض اوقات کسی کے نام میں اشتباہ ہوتا تو مجھ سے دریافت کر کے اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیتے۔

میرزا ادیب بھٹی صاحب کے حافظہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مولانا اسحاق بھٹی کا حافظہ بہت اچھا ہے۔وہ اپنے ذہن میں ماضی کی یادوں کی ایک وسیع دنیا آباد کیے ہوئے ہیں۔جب انہیں کسی خاص شخصیت کے کسی پہلو سے متعلق خاص باتیں لکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو انہیں ان یادوں کو ذہن کے پردوں سے نکال کر قلم کی نوک تک پہنچانے میں کسی قسم کی دقت پیش نہیں آتی۔'' (بزم ارجمنداں ص ۱۵)

مؤرخ اہل حدیث رحمہ اللہ کا اپنا بیان ہے:

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ بیان واقعہ میں میری یادداشت نے میرے قلم کے ساتھ پورا تعاون کیا ہے۔کسی مقام پر دونوں میں اختلاف رونما نہیں ہوا،اور کسی بات کو حوالہ قرطاس کرنے میں کسی نوع کی پریشانی میں مبتلا نہیں ہونا پڑا۔الحمد لله علی ذلك حمدا کثیرا۔''

(نقوش عظمت رفتہ:ص ۹)

قلم وقرطاس سے وابستگی:

بھٹی صاحب رحمہ اللہ نے حصول علم سے فراغت کے بعد تدریس بھی کی،خطابت بھی،سیاسی سرگرمیوں میں بھی بھرپور حصہ لیا حتی کہ اپنے علاقے میں پرجا منڈل کے جنرل سیکرٹری بھی بنے اور تحریک آزادی میں بھی بھرپور حصہ لیا حتی کہ اس سلسلے میں چودہ پندرہ سال کی عمر میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔لیکن فن تصنیف وتالیف کو انہوں نے اپنا اصل ہدف اور مقصد حیات بنایا۔انہوں نے جو بھی کارنامہ سرانجام دیا، اللہ کی توفیق کے بعد یہ ان کی ذاتی کاوش ہے،اور ان کی رغبت ودلچسپی کا نتیجہ ہے۔

عزیزہ قدیسہ سعید نے بجا لکھا ہے:

''ابو جی (سیلف میڈ) شخصیت تھے۔خاندان میں نہ تو کوئی علمی وادبی گھرانہ نظر آتا ہے اور نہ ہی معاشی طور پر مضبوط۔پھر بھی ایک ایسا شخص جو اپنی مدد آپ کے تحت ایک ادارے،ایک تنظیم اور ایک انجمن کی حیثیت اختیار کر گیا ہو،کسی اعجاز سے کم نہیں۔بلاشبہ ان کے انتقال سے تاریخ کا

Marfat.com

ایک باب بند ہو گیا ہے۔"(ترجمان الحدیث۔اشاعت خاص۔ص۳۱۲)

از تب و تا بم نصیب خود بگیر
بعد ازیں نا ید چو من مرد فقیر

سنہ ۲۰۰۹ء میں مؤرخ اہل حدیث رحمہ اللہ نے (گزرگئی گزران) کے نام سے اپنی آپ بیتی قلمبند کی، اس میں لکھتے ہیں:

"میں ساٹھ سال سے قلم وقرطاس کے شعبے سے وابستہ ہوں۔"......اور حساب کیا جائے تو (تحریر کردہ) صفحات کی تعداد پچاس ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔"(گزرگئی گزران ص۲۶۳)

یعنی ستر سال تک ان کا قلم رواں اپنی جولانیاں دکھاتا اور ادب پارے بکھیرتا رہا ہے۔

صاحب قلم لکھتے وقت عمومی طور پر اپنی تین انگلیوں سے قلم کو تھامتا ہے (انگوٹھا، انگشت شہادت اور اس کے ساتھ والی انگلی) بقول شاعر:

قَدْ رَفَدَتِ الْخِنْصَرَانِ وَسَدَّدَتْ
ثَلَاثَ نَوَاحِيهِ الثَّلَاثُ الْأَنَامِلُ

دونوں چھوٹی انگلیاں سہارا دیتی ہیں اور باقی تین انگلیاں (یعنی انگوٹھا اور اس کے ساتھ والی دو انگلیاں) قلم کو تین اطراف سے گھیر لیتی ہیں۔" دم واپسیں بھی حضرت بھٹی صاحب رحمہ اللہ کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں ایسی حالت میں تھیں جیسے دم تحریر صاحب قلم کی ہوتی ہیں۔

چنانچہ مولانا محمد سلیم چنیوٹی لکھتے ہیں:

"جب مرحوم کی وفات کا سنا تو ان کے گھر پہنچے، انہیں غسل وکفن دینے کی سعادت بھی نصیب ہوئی، راقم نے نوٹ کیا کہ ان کے داہنے ہاتھ کا انگوٹھا انگشت شہادت کے ساتھ اس طرح جڑا ہوا تھا۔ایسے لگا کہ اب بھی کچھ لکھتے معلوم ہو رہے تھے۔بعد از غسل مخدوم گرامی کا چہرہ کھل اٹھا، میں نے اپنی جیب سے کنگھی نکالی اور ان کے سر اور ریش مبارک کو کنگھی سے سنوارا۔"

(ترجمان الحدیث اشاعت خاص ص:۱۹۴)

یہ حقیقت ہے کہ اصحاب ذوق ہی ایسے امور پر خصوصی توجہ دیتے ہیں جبکہ عام لوگوں کا دھیان اس طرف کم ہی جاتا ہے۔

۱۹۸۸ء میں جب راقم الحروف عالم اسلام کی عظیم دانش گاہ (الجامعة الاسلامية بالمدينة المنورة) مدینہ یونیورسٹی سعودی عرب میں زیر تعلیم تھا، اسی دوران محدث دوراں علامہ ناصر الدین البانی

Marfat.com

رحمہ اللہ کی مدینہ طیبہ میں آمد ہوئی تو ان کے اعزاز میں محدث مدینہ فضیلۃ الشیخ عبدالحسن حمد العباد حفظہ اللہ کے رہائش گاہ پر ایک علمی مجلس اور عشائیے کا اہتمام کیا گیا، جس میں راقم کو بھی اپنے فاضل دوست شیخ الحدیث مولانا عبدالرحمٰن ضیاء حفظہ اللہ کی معیت میں شرکت کرنے کی سعادت نصیب ہوئی مجلس کے اختتام پر جب شرکائے مجلس مہمان گرامی علامہ البانی رحمہ اللہ سے مصافحہ کر کے رخصت ہو رہے تھے تو اس دوران مولانا ضیاء صاحب نے علامہ البانی رحمہ اللہ سے ایک حدیث کے بارے میں سوال کیا کہ آپ نے ثنائی نماز میں تورک کے سلسلے میں سنن النسائی کی ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے، لیکن وہ حدیث مجھے سنن نسائی میں نہیں ملی، تو شیخ محترم نے جواب دیا (لعله فی الکبری) پھر مولانا ضیاء صاحب نے مصافحہ کیا اور اچھی طرح حضرت البانی کے دائیں ہاتھ کو ٹٹولا، اور واپسی پہ مجھے فرمانے لگے: ''میں نے سنا تھا کہ گھڑی سازوں کی شہادت والی انگلی کا سرا باقی انگلیوں کی نسبت قدرے باریک ہوتا ہے کیونکہ گھڑی کے باریک پرزوں کی وہ اسی کے ساتھ اصلاح کرتے ہیں، چنانچہ میں نے علامہ البانی کی شہادت والی انگلی کو ٹٹول کر دیکھا تو واقعی ایسے پایا۔'' کیونکہ شیخ البانی رحمہ اللہ علمی مشاغل کے ساتھ کسب معاش کے لئے گھڑی سازی کا کام بھی کرتے تھے، اسی لئے انہیں (ساعاتی) یعنی گھڑی ساز بھی کہا جاتا ہے۔ یہ بات میرے وہم گمان میں بھی نہیں تھی جبکہ شیخ الحدیث مولانا عبدالرحمٰن ضیاء حفظہ اللہ نے اسے بطور خاص نوٹ کیا تھا۔

مؤرخ اہل حدیث کے اشہب قلم کا میدان

مؤرخ اہل حدیث رحمۃ اللہ علیہ نے اگرچہ تفسیر، حدیث، فقہ، لغت، سیر و سوانح تمام موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے جیسا کہ انہوں نے اپنی تصانیف کے بارے میں لکھا ہے:

''میری اب تک کی تحریری خدمات (چھ) اقسام پر منقسم ہیں:

۱: تصانیف و تراجم

۲: اخباری مضامین و مقالات

۳: اخباری اداریے اور شذرات

۴: بیشمار کتابوں پر تبصرے

۵: بہت سی کتابوں پر مقدمات

۶: ریڈیائی تقریریں'' (گزر گئی گزران ص: ۲۶۳)

لیکن سوانحی خاکہ نگاری اور شخصیات کا تعارف ان کی خصوصی دلچسپی کا موضوع رہا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''اصل بات یہ ہے کہ میں پرانا آدمی ہوں اور پرانے لوگوں سے تعلقات قائم کرنے اور قائم

Marfat.com

رکھنے کا عادی ہوں۔ان کی باتیں بڑے غور سے سنتا ہوں اور پھر انہیں یاد رکھنا ضروری سمجھتا ہوں،ان کی صحبت ورفاقت میں بیتے ہوئے لمحات کو زندگی کی قیمتی متاع قرار دیتا ہوں۔یہی وجہ ہے کہ پرانے لوگوں کے بہت سے واقعات میری لوح ذہن پر مرتسم ہیں،جن کو بیان کرنے میں بے حد خوشی محسوس کرتا ہوں۔'' (ہفت اقلیم ص:۹۸)

اس کا سبب بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''اس فقیر کے نزدیک علمائے کرام کے حالات اوران کی مساعیءعلمیہ کو قلمبند کرنا خدمت دین کا ایک اہم ذریعہ ہے،جس کی انجام دہی میں یہ عاصی اپنی دانست میں نیک نیتی سے مشغول ہے۔ یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی بارگاہ اقدس میں اس کا بہترین صلہ عطا فرمائے گا۔''

(چمنستان حدیث ص:۴۷)

مزید لکھتے ہیں:

''میں نے اپنی تصانیف میں اب تک ہزاروں لوگوں کے حالات بیان کردیے ہیں۔کم وبیش تین ہزار افراد کے واقعات زندگی تو فقہائے ہند کی دس جلدوں میں ضبط تحریر میں آگئے ہیں،باقی کتابوں میں جن حضرات کے متعلق لکھا گیا وہ اس کے علاوہ ہیں۔

اخبار''الاعتصام'' کے پندرہ سولہ سال پر محیط دور ادارت میں بھی،اور اس کے بعد بھی بے شمار بزرگوں کے متعلق لکھا۔اسی طرح ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ماہنامہ ''المعارف'' کی ادارت کے طویل زمانے میں بہت سے لوگوں پر لکھا۔دیگر رسائل وجرائد میں بھی لکھا۔''

اسلوب نگارش

اپنے اسلوب نگارش کے متعلق لکھتے ہیں:

''یہ حقیقت بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ ایک ہی فہم وفکر اور ایک ہی انداز واسلوب کے اتنی تعداد کے افراد کے حالات الگ الگ طریقوں سے اسالیب بدل بدل کر عہدہ برآ ہونا بہت مشکل مراحل سے گزرنے کے مترادف ہے۔میں نے ہر شخصیت کے لیے الگ الگ پیرایہ بیان اختیار کرنے کی کوشش کی ہے اور قارئین کرام اندازہ کریں گے کہ بحمد اللہ اس کوشش میں کامیاب رہا ہوں۔'' (کاروان سلف ص:۱۳)......

بقول داغ دہلوی مرحوم ....

خط ان کا بہت خوب، عبارت بہت اچھی

Marfat.com

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

حضرت بھٹی صاحب کو اپنے دور کے ایسے اساطین علم و ادب اور عبقری شخصیات سے تعلق خاطر رہا ہے اور ان اصحاب علم و فضل سے کسب فیض کرنے کا موقعہ میسر آیا ہے جو اپنے عہد کے یگانہء روزگار اور نابغہء عصر شخصیات تھیں۔ان جلیل القدر علما و زعمائے قوم اور آبروئے قلم و قرطاس حضرات میں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ سید محمد داؤد غزنوی، شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی، محدث دوراں حافظ محمد گوندلوی، متکلم اسلام مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانوی اور پروفیسر سید محمد ابوبکر غزنوی رحمہم اللہ کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔بھٹی صاحب رحمہ اللہ کا بیان ہے:

''میرے قلم کی تربیت اور طرز نگارش کی پرورش اللہ کے فضل سے ایسے ماحول میں ہوئی ہے کہ اپنی جماعت کے کسی عالم اور مصنف کی مخالفت و تنقید کے مکروہ فعل میں نہ کبھی ملوث ہوا ہے اور نہ ان شاء اللہ ہوگا۔'' (گزر گئی گزران ص:۲۶۳)

میری زبان و قلم سے کسی کا نہ دل دکھے
شکوہ نہ کسی کو ہو زیر آسمان مجھ سے

برصغیر کے ایک منفرد خاکہ نگار:

ان کی خاکہ نگاری میں انفرادیت کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ جس شخصیت کے بارے میں قلم اٹھاتے ہیں حتی الامکان اس کے بارے میں تفصیل کے ساتھ معلومات فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس شخصیت کا حلیہ و خدوخال، عادات و اخلاق علمی قابلیت، خاندانی پس منظر، جس علاقے سے تعلق کو اس کے جغرافیائی محل وقوع اور اس دور کے مذہبی و سیاسی حالات، اس بستی یا شہر یا علاقے کا موجودہ نقشہ اور تسمیہء حدیثہ حتی کہ اس شخصیت کا طرز تکلم اور لہجہء گفتگو تک بیان کر دیتے ہیں۔جس سے ان کی نگارشات کا قاری خود کو شریک مجلس محسوس کرنے لگتا ہے۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیان اور

مثال کے طور پر: ۱۹۴۶ء امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ کے ساتھ چار افراد (شیخ الحدیث مولانا محمد عبدہ الفلاح، مولانا معین الدین لکھوی، قاضی عبیداللہ اور مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہم اللہ) پر مشتمل وفد کی صورت میں اپنی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''مولانا کمرے میں داخل ہوئے اور فرمایا: ''السلام علیکم'' اس واقعہ کو پچاس برس سے زیادہ عرصہ گزر چکا

Marfat.com

ہے۔لیکن یہ منظراب بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔مولانا نے انگوٹھے والی براؤن رنگ کے چمڑے کی چپل پہن رکھی تھی جو عام طور پر اس زمانے میں گھر میں پہنی جاتی تھی۔اب اس چپل کا رواج نہیں رہا۔سر پر اونچی دیوار کی سیاہ رنگ کی ٹوپی، سفید کھدر کا قدرے تنگ پائینچے کا پاجامہ، سفید کھدر کی بغیر کالر کے قمیص جس کے بٹن کھدر کے دھاگوں کو اکٹھا کر کے بنائے گئے تھے۔اوپر کا بٹن کھلا ہوا اور آستینیں کہنیوں تک چڑھائی ہوئی۔ ہم ایک دم کھڑے ہو گئے...... مصافحہ کرنے کے بعد مولانا نے فرمایا: ''تشریف رکھیے۔''ہم اسی طرح صوفوں پر بیٹھ گئے جس طرح ان کی آمد سے پہلے بیٹھے تھے۔مولانا نے چپل اتاری اور آلتی پالتی مار کر دیوان پر بیٹھ گئے۔''اس کے بعد ملاقات کی تفصیل ذکر کرتے ہیں جو بزم ارجمنداں میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں...... ملاقات کی تفاصیل کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ جب ہم خدمت عالی میں حاضر ہونے کا مدعا بیان کر چکے: ''مولانا محمد عبدہ کے پاس چھتری تھی، مولانا نے وہ چھتری پکڑی اور اس کی موٹھ کو انگشت شہادت سے گھماتے ہوئے ارشاد فرمایا...... '' پھر مولانا کی طویل گفتگو نقل فرماتے ہیں، جس میں یہ بھی ذکر ہے کہ مولانا نے دو تین مرتبہ آپ سے بات شروع کی اور کرو پر ختم کی۔ نیز لکھتے ہیں: ''یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ اس سے پہلے میں ''سلہٹ'' کو جو بکسر سین ہے بفتحہ سین پڑھتا تھا اور بولتا تھا۔مولانا کی زبان سے سنا تو معلوم ہوا کہ لفظ سلہٹ سین کے کسرے کے ساتھ ہے۔مولانا ''فرقہ وارانہ'' اور ''ذمہ وارانہ'' کو (واؤ سے) بولتے تھے۔اس سے پہلے میں یہ لفظ ''فرقہ دارانہ'' اور ذمہ دارانہ'' (دال سے) بولتا تھا۔مولانا داؤد غزنوی بھی واؤ سے بولتے تھے...... نیز فرماتے ہیں: ''تمام گفتگو کے دوران میری نظریں مولانا کے چہرے پر جمی رہیں اور میں ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتا اور لب ولہجے کا جائزہ لیتا رہا۔جی چاہتا تھا کہ مولانا باتیں کرتے رہیں اور ہم سنتے رہیں۔انہوں نے گھڑی دیکھی تو باتیں کرتے ہوئے پینتالیس منٹ ہو چکے تھے...... فرمایا: ''آٹھ بجے کیبنٹ میٹنگ ہے، اب اجازت چاہتا ہوں۔'' یہ کہہ کر چھتری رکھ دی جو پینتالیس منٹ تک ان کی انگلیوں میں گھومتی رہی تھی اور کھڑے ہو گئے۔ہم سوا پانچ بجے مولانا کے کمرے میں داخل ہوئے تھے، چھ بجے باہر نکلے۔'' میں نے مولانا کے بارے میں اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جہاں بے پناہ فہم و فراست اور حسن بیان سے نوازا ہے، وہاں شکل وصورت کی نعمت بھی فراوانی سے عطا کی ہے اور بڑے پیار سے ان کا ہیولا تیار کیا ہے۔معلوم ہوتا ہے حافظ نے یہ شعر انہی کے لیے کہا تھا:

نصاب حسن در حد کمال است
زکوتم دہ کہ مسکین و فقیرم

قارئین کرام! دوران ملاقات اس وقت ایسی باریک بینی سے تمام امور پر توجہ دینا اور پھر تمام چیزوں کو

Marfat.com

یاد رکھنا اصحاب ذوق ہی کا کام ہے۔

چند سوانحی خاکے:

اپنے والد گرامی میاں عبدالمجید رحمہ اللہ کی خاکہ نگاری کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرے والد کا نام جیسا کہ سلسلۂ نسب میں بتایا گیا، عبدالمجید تھا۔ انہوں نے تقریباً ۹۰ برس کی عمر کو پہنچ کر ۱۸ ستمبر ۱۹۸۸ء کو وفات پائی، اس حساب سے وہ ۱۸۹۸ء کے قریب پیدا ہوئے۔ نکلتا ہوا قد، کسرتی جسم، گول چہرہ، موزوں نقش و نگار، کھلی پیشانی، تہبند اور قمیص زیب تن، سر پر ململ کی پگڑی۔ یہ تھے میرے والد محترم۔'' (گزر گئی گزران ص:۵۳)

محدث دوراں حافظ عبداللہ روپڑی رحمہ اللہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میانہ قد، لاغر اندام، تیز آنکھیں، کھلی پیشانی، گھنی اور بڑی ڈاڑھی جس کے سیاہ بالوں میں سفید بالوں کی آمیزش بھی ہوگئی تھی، سرخی مائل گندمی رنگ، خاموش طبع اور نیچی نگاہ۔ یہ تھے حضرت مولانا حافظ عبداللہ روپڑی رحمۃ اللہ علیہ۔'' (بزم ارجمنداں ص:۲۵۹)

شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کی خاکہ نگاری اس طرح کرتے ہیں:

''شام کو مولانا اپنی قیام گاہ سے باہر نکلے۔ لمبا کوٹ، سفید لٹھے کی شلوار، سلک کا بہترین عمامہ، پورا قد، لبوں پہ مسکراہٹ، خوب صورت اور گورے چٹے، سامنے کے اوپر والے چار دانتوں کے دائیں بائیں جانب کے دونوں دانتوں جن کو اردو میں کچلیاں کہتے ہیں، پر سونے کے خول چڑھے ہوئے۔ لوگ سلام کے لئے ان کی طرف بڑھے، انہوں نے مسکراتے ہوئے سب سے مصافحہ کیا۔'' (بزم ارجمنداں ص:۱۴۱)

مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ کا سراپا بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''انجمن اصلاح المسلمین کے اجلاس کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے مولانا ابراہیم سیالکوٹی کو اچھی طرح دیکھا، ان کی مجلس میں بیٹھنے کا شرف حاصل کیا اور بہت ہی قریب سے ان کی باتیں سننے کی سعادت سے بہرہ مند ہوا۔ گورے رنگ میں سرخی کی آمیزش، نہایت متوازن چہرہ نہ بالکل گول نہ لمبوترا، تیکھے نقوش، موٹی موٹی چمکدار آنکھیں، کھلی پیشانی، چوڑا سینہ، پورا قد، متناسب جسم، صاف ستھرا لباس، رعب دار آواز، عالمانہ لہجہ، پروقار طرز گفتگو، منکسرانہ اسلوب کلام اور جاذب نظر شخصیت کے مالک۔'' (قافلۂ حدیث ص:۹۵)

Marfat.com

سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کا حلیہ:

''میانہ قد، گول چہرہ، سرخ گندمی رنگ، کشادہ پیشانی، ناک نقشہ جاذب نظر، آنکھوں میں چمک، آواز میں کھنک، صاف ستھرا لباس اور بے حد نفاست پسند۔'' (قافلہء حدیث ص:۱۴۹)

موقع محل کی مناسبت سے الفاظ کا استعمال اور اشعار کا انتخاب فن تصنیف کے محاسن میں سے ہے۔اور یہ خوبی ہم نے امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد اور شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری کے بعد حضرت بھٹی صاحب رحمہم اللہ کی تحریروں میں دیکھی ہے۔مثال کے طور پر: ۱۹۶۱ء میں ادارہ الاعتصام میں حضرت علامہ احسان الٰہی ظہیر کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ایک دن دوپہر کے وقت نیچے اتر رہا تھا کہ سیڑھیوں میں ایک نوجوان سامنے آیا جو اوپر کو جا رہا تھا۔کھنکھناتے ہوئے لہجے میں اس نوجوان نے کہا السلام علیکم۔میں اخبار الاعتصام میں اسحاق صاحب سے ملنا چاہتا ہوں''۔میں نے سلام کا جواب دے کر اسی وقت پیچھے کو مڑتے ہوئے کہا: ''آیئے پہلے آپ کو اسحاق صاحب سے ملاتے ہیں، پھر کوئی اور کام کریں گے۔اس نوجوان کو میں اپنے کمرے میں لے گیا۔ستواں چہرہ، اونچی ناک نکھرا ہوا گندمی رنگ، چمک دار آنکھوں پر سنہری کمانی کی نظر کی عینک، میانہ قد، چہرے پر ہلکے سے چھوٹے چھوٹے بال، کشادہ پیشانی، سر پر قراقلی ٹوپی، سفید پاجامے اور بوسکی کی قمیص میں ملبوس، بہت اچھی صحت۔''

عرض کیا اسحاق حاضر ہے۔فرمایئے کیا ارشاد ہے؟

کہا سیالکوٹ کا رہنے والا ہوں۔مدینہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا ہوں .... یہ تھے ''اس وقت کے حافظ احسان الٰہی ظہیر جو اس کے کئی سال بعد علامہ احسان الٰہی ظہیر ہوئے'' اس کے بعد ۱۲۶ صفحات پر پھیلے ہوئے علامہ صاحب کا تذکرہ کرنے بعد آخر میں لکھتے: ''اب آخر میں جی چاہتا ہے کہ اپنی گزارشات کو ختم کرتے ہوئے احسان الٰہی ظہیر کی بہشتی روح کو مخاطب کر کے فارسی کا یہ شعر پڑھا جائے اور اس مرحوم سے معذرت کر لی جائے کہ اے شہید راہ حق۔۔!میرا ناتواں قلم کوشش کے باوجود تیرے حالات کی پوری تفصیل اپنی گرفت میں نہیں لا سکا:

خم زلف و رخت را شرح دادن
شبے باید دراز و ماہتابے

(ہفت اقلیم ص ۲۵۹)

تصانیف وتراجم:

مؤرخ اہل حدیث کی مطبوعہ شدہ تصنیف و تالیفات کی تعداد (۴۰) ہے اور کئی کتابیں مکمل ہیں لیکن

Marfat.com

ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکی۔ایک محتاط اندازے کے مطابق ان کے قلم گوہر بار سے تقریباً ستر ہزار (۷۰۰۰۰) صفحات کا سینہ معلومات کے حسین مرقع سے مزین ہوا ہے۔ان کے رشحات قلم کی میسر شدہ فہرست کچھ یوں ہے:

۱: فہرست ابن الندیم کا ترجمہ اور حواشی ۹۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔یہ ترجمہ ۱۹۶۹ء میں پہلی بار طبع ہوا۔اور اس کتاب کے آغاز میں یہ مصرع تحریر شدہ ہے۔(بِبُکَاءِ الْاَقْلَامِ تَبْتَسِمُ الْکُتُبُ) قلموں کے رونے سے کتابیں مسکراتی ہیں۔

۲: برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ (اس کتاب میں سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد (۶۸۶ھ) سے سلطان اورنگ زیب عالم گیر کے عہد (۱۱۱۸ھ) تک کی فقہی کاوشوں کا تذکرہ کیا گیا ہے یہ کتاب چار سو (۴۰۰) سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔یہ کتاب پہلی بار جون ۱۹۷۳ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے شائع ہوئی۔

۳: فقہائے ہند (یہ کتاب دس جلدوں پر مشتمل ہے اس میں پہلی صدی ہجری سے تیرہویں صدی ہجری تک فقہائے ہند کے علمی کارناموں کا ذکر ہے) اور ہر جلد کے شروع میں فاضل مصنف نے ایک جامع علمی اور معلوماتی مقدمہ لکھا ہے جو اس دور کے ہمہ گونہ احوال کا عکاس ہے۔

۱:......فقہائے ہند کی جلد اول: ۳۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں پہلی صدی ہجری سے آٹھویں صدی ہجری تک کے علما و فقہا کے تراجم مذکور ہیں۔یہ جلد پہلی مرتبہ ۱۹۷۴ء میں طبع ہوئی۔

۲:......فقہائے ہند کی جلد دوم: اس کے (۲۶۴) صفحات ہیں۔اس جلد میں نویں صدی ہجری کے فقہائے کرام کے تراجم و احوال ذکر کیے گئے ہیں۔یہ کتاب ۱۹۷۵ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔

۳:......فقہائے ہند جلد سوم: صفحات کی تعداد (۴۰۰) ہے، اس میں دسویں صدی ہجری تک کے فقہائے ہند کا ذکر ہے۔سن اشاعت ۱۹۷۶ء ہے

۴:......فقہائے ہند جلد چہارم (حصہ دوم): صفحات کی تعداد (۴۱۶) ہے اور سال طباعت (۱۹۷۸ء) ہے۔ان دو جلدوں میں گیارھویں صدی ہجری تک کے فقہائے ہند کا ذکر ہے۔

۵:......فقہائے ہند جلد پنجم (حصہ اول): صفحات کی تعداد (۳۵۲) سال طباعت ۱۹۷۹ء

۶:......فقہائے ہند جلد پنجم (حصہ دوم): صفحات کی تعداد (۴۲۸) سال طباعت ۱۹۸۱ء، اس جلد کے دونوں حصوں میں بارہویں صدی ہجری کے فقہاء کا تذکرہ ہے۔

۷:......فقہائے پاک و ہند (جلد اوّل) صفحات: ۳۴۴ سال طباعت ۱۹۸۲ء

Marfat.com

۹:......فقہائے پاک وہند (جلددوم) صفحات:۲۷۰ سال طباعت۱۹۸۴ء

۱۰:......فقہائے پاک وہند (جلدسوم) صفحات:۴۵۲ سال طباعت۱۹۸۹ء ان تین جلدوں میں تیرھویں صدی ھ کے فقہاء کے تراجم مذکور ہیں۔

فقہائے ہند کا دوسرا ایڈیشن :......نئی کمپوزنگ کے ساتھ فقہائے ہند کے دوسرے ایڈیشن اس کی دس جلدوں کو تین ضخیم جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔جلد اول میں (اول تا سوم :صفحات کی تعداد:۷۲۲) جلد دوم میں (چہارم اور پنجم اور صفحات :۱۰۳۶) جلد سوم (جلد پنجم سے دہم تک) :اس میں تیرہویں صدی ہجری کے فقہائے پاک وہند کے تراجم واحوال ذکر کیے گئے ہیں۔اس کے صفحات کی تعداد (۷۱۲) ہے۔

یہ ایڈیشن ۲۰۱۳ء میں (محمد اسحاق بھٹی ریسرچ انسٹیٹیوٹ بہ اشتراک دارالنوادر الحمد مارکیٹ اردو بازار لاہور) نے شائع کیا۔

۴: برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش۔اس میں (۲۵) صحابہ کرامؓ ،(۴۲) تابعین اور (۱۸) تبع تابعین رحمہم اللہ کا تذکرہ ہے جن کا برصغیر میں ورود مسعود ہوا۔اور اس کے صفحات کی تعداد (۲۲۴) ہے۔یہ کتاب ۱۹۸۹ء میں طبع ہوئی۔

۵: ارمغان حنیف (متکلم اسلام مولانا محمد حنیف ندوی کی سوانح حیات)صفحات :۳۷۲ اور سال طباعت ۱۹۸۹ء ہے۔

۶: قصوری خاندان : تین شخصیات (مولانا عبد القادر قصوری اور ان کے فرزندان مولانا محی الدین احمد قصوری اور میاں محمود علی قصوری) کے حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں اور صفحات کی تعداد ہے : (۲۰۸) یہ کتاب پہلی بار ۱۹۹۴ء میں مکتبہ تعلیمات اسلامیہ ماموں کانجن نے شائع کی۔

۷: نقوش عظمت رفتہ (اس میں سید داؤد غزنوی اور حضرت العلام محدث گوندلوی رحمہم اللہ سمیت (۲۱) مقتدر شخصیات کا تذکرہ ہے۔۶۴۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۱۹۹۷ء مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور نے شائع کی۔

۸: میاں فضل حق : سابق ناظم اعلی مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان و سابق صدر جامعہ سلفیہ فیصل آباد کے سوانح حیات :صفحات:۲۴۴۔سال طباعت ۱۹۹۷ء۔

۹: ''حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ'' یہ کتاب ایک مصری عالم محمد حسین ہیکل کی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ صفحات (۶۲۰) طبع ۱۹۹۸ء

۱۰: بزم ارجمنداں : اس میں مولانا ابو الکلام آزاد اور شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری سمیت (۱۹)

Marfat.com

شخصیات کا ذکر ہے،اس کے صفحات کی تعداد۶۳۲ ہے۔یہ کتاب مارچ ۱۹۹۹ء میں مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور نے شائع کی۔

۱۱: لسان القرآن (جلد سوم) یہ کتاب مولانا محمد حنیف ندوی رحمہ اللہ کی کتاب (لسان القرآن) کا تتمہ ہے اور (د،ر،ز) تین حروف کی تفسیر پر مشتمل ہے۔یہ کتاب ۱۹۹۹ء میں مکتبہ علم وعرفان لاہور نے شائع کی۔

۱۲: چہرہ نبوت قرآن کے آئینے میں۔یہ کتاب تیس ابواب پر مشتمل ہے۔شروع کے (۱۹) ابواب مولانا محمد حنیف ندوی رحمہ اللہ کے مرتب کردہ ہیں اور باقی (۱۱) ابواب بھٹی صاحب رحمہ اللہ نے حضرت ندوی کے طرز پر مکمل کیے ہیں۔اس کے صفحات ۳۲۶ ہیں اور ۱۹۹۹ء میں مکتبہ علم وعرفان لاہور نے شائع کی۔

۱۳: لشکر اسامہ کی روانگی یہ پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی کی کتاب (جیش اسامہ) کا ترجمہ ہے اور اس کے صفحات کی تعداد: ۱۲۶ ہے۔اسے ۱۹۹۹ء میں مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور نے شائع کیا۔

۱۴: کاروان سلف میں شخصیات کی تعداد (۲۲) اور صفحات: ۵۱۰۔سال طباعت: ۱۹۹۹ء ناشر: مکتبہ اسلامیہ فیصل آباد۔

۱۵: مولانا ابوالکلام آزاد ایک نابغہ روزگار شخصیت: بزم ارجمنداں میں بھٹی صاحب نے امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد کے بارے میں ایک مفصل مضمون لکھا ہے۔اس کی اہمیت کے پیش نظر ۲۰۰۱ء میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ (ہندوستان) نے اسے ایک مستقل کتاب کی شکل میں شائع کردیا ہے جو ۱۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

۱۶: اسلام کی بیٹیاں: اس کتاب میں نبی اکرم کی ازواج مطہرات، صحابیات، تابعیات، رضی اللہ عنہن اور ہندوستان کے مغلیہ دور اور مختلف ملکوں سے تعلق رکھنے والی بہت سی خواتین کے حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں۔اس کے صفحات ۶۵۰ ہیں۔یہ کتاب ۲۰۰۱ء میں مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور نے شائع کی۔

۱۷: قافلہ حدیث: اس ۲۶ شخصیات کے سوانح حیات مذکور ہیں اور صفحات کی تعداد: ۶۴۵ سال طباعت ۲۰۰۳ء ناشر: مکتبہ قدوسیہ اردو بازار

۱۸: برصغیر میں اہل حدیث کی آمد: یہ کتاب (۲۰) ابواب اور ۳۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ناشر: مکتبہ قدوسیہ لاہور سال اشاعت: ۲۰۰۴ء

۱۹: اہل حدیث خدام قرآن میں (۱۸۵) شخصیات کا ذکر ہے اور صفحات کی تعداد: (۶۹۶) ناشر: مکتبہ قدوسیہ لاہور سال اشاعت: ۲۰۰۶ء

۲۰: صوفی محمد عبداللہ (رحمہ اللہ): یہ کتاب ولی کامل امیر المجاہدین حضرت صوفی محمد عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ بانی

Marfat.com

جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن کے مفصل سوانح حیات پر مشتمل ہے اور اس کے صفحات کی تعداد: ۴۴۶۔ ناشر: المکتبۃ السلفیۃ شیش محل روڈ لاہور نے ۲۰۰۶ء میں شائع کی۔

۲۱: میاں عبدالعزیز مالواڈہ: صفحات ۶۰۰۔ ناشر: سرائے اردو بازار لاہور سن طباعت: دسمبر ۲۰۰۶ء

۲۲: قاضی محمد سلیمان منصور پوری: (سیرت النبی پر شہرہ ءآفاق کتاب (رحمۃ للعالمین) کے مصنف کے مفصل حالات زندگی پر مشتمل ہے اور اس کے صفحات: ۴۵۰ ناشر: المکتبۃ السلفیۃ شیش محل روڈ لاہور نے ۲۰۰۷ء میں شائع کی۔

۲۳: ارمغان حدیث: یہ کتاب ایک سو احادیث کا مجموعہ ہے جو اخلاقیات اور معاملات سے تعلق رکھتی ہیں اور اسکے (۲۷۲) صفحات ہیں۔ یہ کتاب ۲۰۰۸ء میں طارق اکیڈمی فیصل آباد نے شائع کی۔

۲۴: دبستان حدیث: اس میں (۶۰) خدام حدیث کے حالات زندگی مذکور ہیں اور اس کے صفحات (۶۷۳) سال طباعت: ۲۰۰۸ء۔ ناشر: مکتبہ قدوسیہ لاہور

۲۵: ہفت اقلیم: اس میں (۷) سات شخصیات کے سوانح حیات مذکور ہیں اور اس کے صفحات کی تعداد: (۵۰۲) ناشر: مکتبہ قدوسیہ لاہور۔ سال طباعت: ۲۰۰۹ء

۲۶: گلستان حدیث: اس کتاب میں شخصیات کی تعداد (۸۴) اور صفحات کی تعداد: (۵۵۹) ناشر: مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور۔ سال طباعت: ۲۰۱۱ء

۲۷: گزرگئی گزران: مؤرخ اہل حدیث رحمہ اللہ کی مفصل داستان حیات۔ صفحات (۴۴۶) ۲۰۱۱ء میں سرائے اردو بازار لاہور نے شائع کی۔

۲۸: مولانا احمد دین گکھڑوی: مناظر اسلام مولانا احمد دین رحمہ اللہ کے احوال و واقعات پر مشتمل پہلی کاوش ہے: صفحات (۲۴۷) اور پہلی بار ۲۰۱۱ء میں مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور نے شائع کی۔ اور اس کا دوسرا ایڈیشن چند اضافوں کے ساتھ (۳۵۸) صفحات پر مشتمل ۲۰۱۵ء میں دار ابی الطیب گوجرانوالہ نے شائع کیا۔

۲۹: برصغیر میں اہل حدیث کی اولیات اس کے صفحات کی تعداد (۱۸۲) ہے۔ ستمبر ۲۰۱۲ء میں دار ابی الطیب گوجرانوالہ نے شائع کی۔

۳۰: استقبالیہ اور صدارتی خطبات: ۱۹۴۸ء سے لے کر مرکزی جمعیۃ اہل حدیث پاکستان کے مرکزی اجتماعات اور کانفرنسوں میں پیش کئے جانے صدارتی اور استقبالی خطبات کا مجموعہ ہے۔ اس کے صفحات (۳۶۸) ناشر: المکتبۃ السلفیۃ شیش محل روڈ لاہور۔ سال اشاعت: فروری ۲۰۱۲ء

Marfat.com

۳۱: تذکرہ مولانا غلام رسول قلعوی اور اس کے صفحات: (۵۲۸) ناشر: مولانا غلام رسول ویلفیئر سوسائٹی قلعہ میہاں سنگھ۔۲۰۱۲ء میں طبع ہوئی۔

۳۲: برصغیر میں اہل حدیث کی سرگزشت: صفحات کی تعداد (۳۴۴) اشاعت اول فروری ۲۰۱۲ء ناشر: المکتبۃ السلفیۃ شیش محل روڈ لاہور۔

۳۳: روپڑی علمائے اہل حدیث: صفحات ۳۵۰ سال اشاعت: مارچ ۲۰۱۳ء ناشر: محدث روپڑی اکیڈمی جامع القدس چوک دال گراں لاہور۔

۳۴: چمنستان حدیث: یہ کتاب سلسلہ تاریخ اہل حدیث کی پانچویں کتاب ہے اس میں سید میاں نذیر حسین محدث رحمہ اللہ کے (۱۵) نامور تلامذہ کے علاوہ (۳۳) مرحومین علمائے حدیث اور پچاس سے زیادہ موجودین خدام حدیث کے تعارفی احوال مذکور ہیں یعنی ایک سو خدام حدیث کے تذکار پر مشتمل ہے۔ صفحات کی تعداد بڑے سائز کے (۸۰۵) ہے مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور نے مئی ۲۰۱۵ء میں شائع کی۔

۳۵: تذکرہ مولانا محی الدین لکھوی: صفحات (۴۵۷) ناشر: مکتبہ اسلامیہ غزنی سٹریٹ لاہور نے ۲۰۱۵ء میں شائع کی۔

۳۶: ترجمہ ریاض الصالحین: ریاض الصالحین علامہ یحییٰ بن شرف نووی کی معروف تالیف ہے جس میں انہوں نے زندگی سے متعلقہ تمام اعمال کے فضائل سے متعلق صحیح احادیث کو جمع کیا ہے۔ یہ ترجمہ دو جلدوں پر مشتمل ہے پہلی جلد ترجمہ و حواشی سمیت (۴۵۹) صفحات پر اور دوسری جلد (۴۱۱) صفحات پر مشتمل ہے۔

۳۷: بوستان حدیث: اس عظیم الشان مجموعے میں ۱۲۰ ذی وقار علماے کرام کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

۳۸: محفل دانشمنداں (یہ کتاب ۲۲ شخصیات کے تراجم کا مجموعہ ہے) صفحات ۳۲۰ سن اشاعت ۲۰۱۶ء، ناشر: محمد اسحاق بھٹی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ حضرت بھٹی صاحب کی وفات کے بعد ان کے بھائی محمد سعید بھٹی مرحوم نے یہ کتاب شائع کی تھی۔

۳۹: المعارف: ادارہ ثقافت اسلامیہ کا ماہنامہ مجلّہ ہے۔ مؤرخ اہل حدیث رحمۃ اللہ علیہ بائیس (۲۲) سال تک اس کے ایڈیٹر رہے، اس دوران اس خالص علمی اور تحقیقی ماہنامے کا اداریہ لکھتے رہے اور اس میں "ایک حدیث" کے عنوان سے ان کا ایک مستقل مضمون شائع ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ کتابوں پر تبصرے اور مقالہ جات بھی لکھتے رہے۔ اپنی سرگزشت گزر گئی گزران کے ص ۲۴۶ پر لکھتے ہیں:

"المعارف کے مضامین زیادہ نہیں تو تین ہزار صفحات (۳۰۰۰) کے پس وپیش ضرور ہوں گے۔"

Marfat.com

۴۰: اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے لئے مقالات: پنجاب یونیورسٹی کے ''اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے لئے میں نے تیس، بتیس مقالات لکھے جو اس کی مختلف جلدوں میں چھپے۔'' (گزر گئی گزران ص: ۲۴۹)

۴۱: ادارہ ثقافت اسلامیہ میں خدمات سرانجام دینے کے دوران حضرت بھٹی صاحب نے کئی کتابوں کو بڑی محنت سے ایڈٹ کیا اور ان پر بڑے علمی اور معلومات افزا مقدمات بھی لکھے مثلاً:

۱:......اردو نثر کے ارتقاء میں علما کا حصہ از ڈاکٹر محمد ایوب قادری۔

۲:......شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ اور ان کی علمی خدمات: یہ محترمہ ڈاکٹر ثریا ڈار (سابق چیئر مین شعبہ عربی اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور) کا پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ ہے۔ جسے بھٹی صاحب نے ایڈٹ کیا، اس کی عربی و فارسی عبارتوں کا ترجمہ کیا اور اس پر مقدمہ بھی لکھا۔ یہ مقالہ (۳۲۵) صفحات پر مشتمل ہے اور ادارہ ثقافت اسلامیہ نے ۱۹۹۱ء میں شائع کیا۔

۳:......شروح صحیح بخاری: یہ محترمہ غزالہ حامد کا (ایم۔اے) کا مقالہ ہے جسے بھٹی صاحب رحمہ اللہ نے ایڈٹ کیا اور اس کی عربی و فارسی کی غیر مترجم عبارتوں کا ترجمہ کیا نیز ان شروحات کو بھی ذکر کیا جو مقالہ نگار نے ذکر نہیں کی تھیں اور اس پر ایک علمی نوعیت کا مقدمہ لکھا۔ اس کے صفحات کی تعداد (۱۷۵) اور ادارہ ثقافت اسلامیہ نے ۱۹۹۱ء میں اسے شائع کیا۔

۴:......پیغمبر انسانیت (صلی اللہ علیہ وسلم): یہ نبی اکرم کی سیرت طیبہ پر سید محمد جعفر شاہ پھلواری کی تصنیف ہے جسے بھٹی صاحب رحمہ اللہ نے ایڈٹ کیا اور اس کی عربی و فارسی کی غیر مترجم عبارتوں کا ترجمہ کیا، اور اس پر مقدمہ بھی لکھا۔ اس کے (۵۵۰) صفحات ہے۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ نے ۱۹۷۵ء میں اسے شائع کیا۔

۵:......فقہ عمر (رضی اللہ عنہ) مترجم ابویحییٰ امام خاں نوشہروی: اس پر نظر ثانی کی اور اس کی ایڈیٹنگ کی۔ اس کے صفحات کی تعداد (۴۰۰) ادارہ ثقافت اسلامیہ نے ۱۹۷۵ء میں اسے شائع کیا۔

یہ وہ تابندہ نقوش و آثار، تاریخی دستاویزات اور خدام حدیث کے تذکار دلنشین کے گلدستہ ہائے خوشنما ہیں جو مؤرخ اہل حدیث کی حسین یادیں، ان کے علمی مآثر اور ان کی ستر سالہ خامہ فرسائی کی کمائی ہیں۔

تلك الآثار تدل علينا

فانظروا بعدنا الى الآثار

''سورج ہوں زندگی کی رمق چھوڑ جاؤں گا میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جاؤں گا۔''

Marfat.com

خوشخبری:......(دار ابی الطیب للنشر والتوزیع)گل روڈ حمید کالونی گوجرانوالہ جو کہ لجنة القارة الھندیة (کویت) کے رئیس فضیلۃ الشیخ ابوخالد فلاح خالد المطیری حفظہ اللہ کی سرپرستی اور محترم شیخ عارف جاوید محمدی صاحب کی نگرانی میں قائم ہوا ہے اور اس کے اغراض و مقاصد اکابرین اہل حدیث کی علمی تراث کا احیاء اور نشر واشاعت ہے۔اس کی نسبت بھی اسی لئے ابوالطیب نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ کی طرف ہے۔

اس ادارہ نے حضرت بھٹی صاحب کا وہ تمام تحریری مواد جو ابھی تک کتابی شکل میں شائع نہیں ہوا،لیکن مختلف جرائد ورسائل اور اخبارات میں مضامین ،اداریے ،خطوط ،اور تبصرہ کتب کے طور پر شائع ہوتا رہا ہے ،اسے جمع کر کے کتابی صورت طبع کرنے کا پروگرام بنایا ہے ،اور اس سلسلے میں کافی حد تک کام ہو چکا ہے ۔یقیناً یہ ایک نہایت ہی عمدہ کاوش ہے اللہ تعالیٰ محترم حافظ شاہد محمود اوران کے رفقاء کواس منصوبے کی تکمیل کی توفیق عطا کرے ۔نیز اسی ادارے نے مؤرخ اہل حدیث کی یادگار کے طور پر ’’مولانا محمد اسحاق بھٹی ریسرچ سنٹر‘‘ کے نام سے ایک شعبہ بھی قائم کیا ہے۔

مؤرخ اہل حدیث کی خدمت میں خراج تحسین:

بھٹی صاحب رحمہ اللہ نے تاریخ اہل حدیث اور علمائے اہل حدیث کے تراجم وسوانح قلم بند کرنے کے لئے جوسعی وکوشش اور محنت کی ہے۔وہ عدیم النظیر اور عظیم الشان کارنامہ ہے۔اس نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ محنت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت و الفت ڈال دی ہے اور انہیں ہردلعزیز شخصیت بنادیا ہے۔اور یہ سچ ہے کہ

کسب کمال کن

عزیز جہاں شوی

چنانچہ بھٹی صاحب کی زندگی میں بہت سے اصحاب قلم نے ان کی خدمات جلیلہ پر انہیں خراج تحسین پیش کیا اور مختلف جرائد ورسائل میں مضامین لکھ کر ان کی خدمات کو سراہا ہے۔دورہ کویت کے موقع پر شیخ صلاح الدین مقبول احمد نے کویت کے عربی مجلّہ (امتی) میں عربی زبان میں بھٹی صاحب کے متعلق تعارفی مضمون لکھا اور شیخ محمد انور سلفی نے اردو میں ان پر ایک تعارفی مضمون لکھا جو ’’مؤرخ اہل حدیث مولانا محمد اسحاق بھٹی ‘‘کے عنوان سے دوقسطوں میں کویت ٹائمز میں شائع ہوا تھا۔لیکن ان کے بعض خوشہ چین اور عقیدت مند قلمکاروں نے کتابی شکل میں بھی ان کے احوال وخدمات کوان کی زندگی میں ہی سپرد قلم کردیا تھا۔مثلا

Marfat.com

۱: محمد اسحاق بھٹی کی خاکہ نگاری: یہ مقالہ (اسلامیہ کالج برائے خواتین) کی ایک خاتون پروفیسر فوزیہ سحر کا ایم۔فل کا مقالہ ہے۔جو انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔فل کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے پروفیسر ڈاکٹر ضیاء الحسن کی زیرنگرانی لکھا اور مقالہ نگار کو ۲۰۰۶ء میں اس پر ڈگری دی گئی۔ یہ مقالہ چھپ چکا ہے۔

۲: محمد اسحاق بھٹی فقہائے ہند کے تناظر میں: یہ مقالہ پروفیسر محمد انس سرور نے ۲۰۱۲ء میں پروفیسر ڈاکٹر حماد لکھوی کے زیر اشراف لکھا اور پنجاب یونیورسٹی سے اس پر ڈگری حاصل کی۔

۳: محمد اسحاق بھٹی حیات و خدمات: بھٹی صاحب رحمہ اللہ کے متعلق یہ کتاب ہمارے فاضل دوست اور معروف صاحب قلم مولانا محمد رمضان یوسف سلفی مرحوم نے ترتیب دی۔جو (۲۴۰) صفحات پر مشتمل ہے۔اور اس میں انہوں نے بھٹی صاحب کی جملہ تصانیف و تراجم پر نہایت جامع تبصرہ کیا ہے۔شیخ الحدیث مولانا محمد علی جانباز مرحوم کے ادارہ جامعہ ابراہیمیہ سیالکوٹ کی طرف سے یہ کتاب طبع ہوئی۔

رفتید و لے نہ از دل ما:

مؤرخ اہل حدیث مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ کی وفات کے بعد بہت سے قلمکار، صحافی و کالم نگاروں نے ان کے بارے میں اپنے اپنے تاثرات کا اظہار کیا، پاکستان اور ہندوستان اور دیگر ممالک کے احباب نے مختلف جرائد و رسائل اور اخباری کالموں میں ان کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا ہے ہفت روزہ اہل حدیث ، الاعتصام ،ہندوستان کے جریدہ پندرہ روزہ ترجمان دہلی ، ماہنامہ نوائے اسلام دہلی ،پندرہ روزہ ترجمان جدید نئی دہلی اور دیگر اخبار و رسائل میں اور سوشل میڈیا پر بہت سے اہل قلم نے ان کے بارے میں اظہار خیال کیا۔

اشاعت خاص:......بعض جرائد و مجلات نے حضرت بھٹی صاحب رحمہ اللہ کے بارے میں خصوصی نمبر بھی شائع کیے ہیں۔مثلا

۱: عظیم علمی دانش گاہ جامعہ سلفیہ کے علمی و ادبی شاہکار ''ماہنامہ ترجمان الحدیث'' نے مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ کی حیات و خدمات پر اشاعت خاص کے نام سے (۳۵۳) صفحات پر مشتمل ایک ضخیم نمبر شائع کیا ہے۔جس میں مؤرخ اہل حدیث کے بارے میں بہت سے معلوماتی مضامین کو جمع کر دیا گیا ہے جو کہ ایک جامع اور تاریخی دستاویز ہے۔

۲: ہفت روزہ نوید ضیاء: جو کہ مولانا محمد ابرار ظہیر کی ادارت میں گوجرانوالہ سے شائع ہوتا ہے۔نوید ضیاء کا

Marfat.com

۲۵ جنوری تا ۲/فروری ۲۰۱۶ء کا شمارہ مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ کے سلسلے میں ''اشاعت خاص'' کے طور پر شائع ہوا۔ یہ اخباری سائز کے ۲۶ صفحات پر مشتمل اور نہایت قیمتی معلومات کا مرقع ہے۔ بالخصوص اس میں شائع شدہ بھٹی صاحب مرحوم کا انٹرویو نہایت ہی معلوماتی ہے۔

۳: مجلّہ "الاِتــحــاد" بمبئی نے اپریل اور مئی ۲۰۱۶ء کا شمارہ ''علامہ محمد اسحاق بھٹی'' نمبر کے نام سے شائع کیا ہے۔ اسکے (۱۳۶) صفحات ہیں۔

۴: ارمغان مولانا محمد اسحاق حنیف: مؤلف: حمید اللہ خان عزیز، صفحات کی تعداد ۹۴۸، سن اشاعت: مارچ ۲۰۰۷ء، ناشر: دارابی الطیب گوجرانوالہ۔

تمغہ ہائے حسن کارکردگی

تاریخ اہل حدیث مرتب کرنے اور دین حق کے لیے اکابرین اہل حدیث کی جہود و مساعی سے لوگوں کو متعارف کروانے اور نوجوان نسل کو اپنے اسلاف کی درخشندہ و تابندہ تاریخ سے روشناس کروانے کے سلسلے میں حضرت بھٹی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات لاجواب اور بے مثال ہیں۔ اس میدان میں کوئی ان کا ہم پلہ نہیں۔ جماعت اہل حدیث کو اپنے عظیم سپوت اور اپنے دور کی عبقری شخصیت پر ناز ہے۔

قیس سا اٹھا نہ پھر کوئی بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے قبیلے کا سدا ایک ہی شخص

زندہ قومیں اور فعال جماعتیں اور تنظیمیں اپنے افراد کی حسن کارکردگی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اور کارہائے نمایاں سرانجام دینے والوں کی حوصلہ افزائی اور تشجیع کرتی ہیں۔ مؤرخ اہل حدیث کی خدمات کے اعتراف میں مختلف اداروں اور تنظیموں نے انہیں تمغہ حسن کارکردگی اور اعزازات سے نوازا اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔ مثلاً:

۱:......۱۲ راگست ۲۰۰۵ء کو مرکز الحرمین الاسلامی (فیصل آباد) کی طرف سے بھٹی صاحب کی تصنیفی خدمات پر انہیں خراج تحسین اور شیلڈ پیش کی گئی۔

۲:......۱۴ راگست ۲۰۰۵ء کو گجرات کے صوفی ریسٹورنٹ کے ہال میں ان کے اعزاز میں تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ اور حافظ عبدالستار عاصم (لندن) اور ان کے رفقاء کی طرف سے بھٹی صاحب کی خدمت میں شیلڈ پیش کی گئی۔

۳:......۲۷ رمئی ۲۰۰۶ء کو مرکز ابن الخطاب الہ آباد (ضلع قصور) میں ان کے اعزاز میں تقریب منعقد

Marfat.com

کی گئی اور انہیں حسن کارکردگی شیلڈ پیش کی گئی

۴:......۱۴/ اگست ۲۰۰۷ء کو ہندوستان کے ممتاز عالم دین ڈاکٹر عبدالرحمٰن الفریوائی کی طرف سے انہیں ایوارڈ دینے کے لئے دعوت دی گئی لیکن ویزہ نہ مل سکا۔ بہرحال سعودی عرب میں آپ کو اس اعزاز سے نوازا گیا۔

۵:......۱۶/ اگست ۲۰۰۸ء کو مرکزی جمعیۃ اہل حدیث پاکستان کے مرکزی دفتر ۱۰۶ راوی روڈ لاہور میں ان کے اعزاز میں تقریب کا اہتمام کیا گیا اور انہیں اعزازی شیلڈ پیش کی گئی۔

۶:......۱۱/ جولائی ۲۰۰۹ء کو ہمدرد ہال (لاہور) میں ان کے اعزاز میں تقریب منعقد کی گئی اور حافظ احمد شاکر اور ان کے صاحبزادگان (شاکرین) کی طرف سے انہیں شیلڈ پیش کی گئی۔

۷:......۱۱/ اپریل ۲۰۱۵ء کو جامعہ محمدیہ مرکز اہل حدیث (لیاقت پور ضلع رحیم یار خاں) میں آپ کے اعزاز میں تقریب کا اہتمام کیا گیا اور آپ کی خدمت میں شیلڈ پیش کی گئی۔

۸:......۳/ مئی ۲۰۱۵ء کو اہل حدیث کی مرکزی دانش گاہ جامعہ سلفیہ فیصل آباد میں آپ کے اعزاز میں تقریب کا اہتمام کیا گیا اور آپ کی خدمت میں شیلڈ پیش کی گئی۔

۹:...... جولائی ۲۰۱۵ء میں پیغام ٹی۔وی کی طرف سے آپ کو شیلڈ سے نوازا گیا۔

۱۰:...... ۱۵/ ستمبر ۲۰۱۵ء کو آزاد کشمیر میں ضلع نیلم کے ''آٹھ مقام'' پر سیرت کانفرنس کے موقعہ پر بھٹی صاحب کو مدعو کیا گیا اور ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں شیلڈ پیش کی گئی۔

۵: مرکز دعوۃ الجالیات (کویت) اور مؤرخ اہل حدیث: مرکز دعوۃ الجالیات (جماعت اہل حدیث۔ کویت) ایک خالص دینی اور دعوتی ادارہ ہے جو جمعیۃ احیاء التراث الاسلامی کے پلیٹ فارم پر وزارۃ الأوقاف والشئون الاسلامیۃ (کویت) کے ساتھ تنسیق کے مطابق تیس سال (1984ء) سے سرزمین کویت پر اردو زبان میں تبلیغی و دعوتی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ مرکز کے رئیس شیخ عارف جاوید محمدی اور ان کے رفقا علما و مشائخ و احباب کرام، (راقم الحروف (عبدالخالق مدنی)، ڈاکٹر حافظ محمد اسحاق زاہد، جناب عبداللہ شاد (ناظم) حافظ ابوبکر عتیق، حافظ سید حبیب اللہ بخاری، حافظ محمد شفیق شاہد اور دیگر احباب کرام خطبات جمعہ، دروس، لٹریچر کی اشاعت و دیگر وسائل و ذرائع بروئے کار لاتے ہوئے تبلیغ دین کی ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔ بیرونی علمائے کرام کو خطابات و دروس کے لئے دعوت دینا اور ان سے استفادہ کرنا مرکز کی دعوتی سرگرمیوں میں شامل ہے۔ چنانچہ اس غرض سے بہت سے جید علمائے کرام اور مشائخ عظام

Marfat.com

مرکز کی دعوت پر تبلیغ و دعوت کے سلسلے میں کویت کا دورہ کر چکے ہیں۔جن میں شیخ العرب والعجم سید بدیع الدین راشدی، شیخ القرآن مولانا محمد حسین شیخوپوری، نمونہء سلف حافظ محمد یحی عزیز میر محمدی، مؤرخ اہل حدیث مولانا محمد اسحاق بھٹی، مولانا عبد السلام رحمانی، ڈاکٹر رضاء اللہ مبارکپوری، مولانا عطاء الرحمٰن شیخوپوری رحمہم اللہ اور مولانا عبداللہ ناصر رحمانی، شیخ الحدیث مولانا حافظ ثناء اللہ مدنی، شیخ الحدیث مولانا محمد اسرئیل ندوی، محقق اہل حدیث مولانا ارشاد الحق اثری، شیخ الحدیث حافظ عبد الستار حماد، شیخ الحدیث حافظ مسعود عالم، ڈاکٹر وصی اللہ محمد عباس، مفتی عبد الحنان زاہد، پروفیسر محمد یسین ظفر، شیخ الحدیث محمد عباس انجم، شیخ الحدیث مولانا انیس الرحمٰن، حافظ محمد سلیمان میرٹھی، مولانا عبد السلام مدنی، مولانا شہاب الدین مدنی، مولانا عبد المنان سلفی، قاری صہیب احمد میر محمدی، سید ضیاء اللہ شاہ بخاری، ڈاکٹر عبد اللطیف کندی، ڈاکٹر نعیم الرحمٰن و دیگر علماے کرام حفظہم اللہ شامل ہیں۔

تاریخ اہل حدیث:

لجنة القارة الهنديه (جمعية احياء التراث الاسلامی) اور مرکز دعوۃ الجالیات (کویت) کی فرمائش پر بھٹی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ اہل حدیث مرتب کی اور اس سلسلے میں: (۱: برصغیر میں اہل حدیث کی آمد ۲: اہل حدیث خدام قرآن ۳: دبستان حدیث ۴: گلستان حدیث ۵: چمنستان حدیث ۶: بوستان حدیث ۷: مولانا احمد دین گکھڑوی ۸: برصغیر میں اہل حدیث کی اولیات) تصنیف کیں۔

مؤرخ اہل حدیث کا لقب اور شیلڈ:

محترم بھٹی صاحب رحمۃ اللہ علیہ یکم جولائی ۲۰۰۸ء کو شام سات بجے مرکز دعوۃ الجالیات کی دعوت پر کویت تشریف لائے اور ۱۵/ جولائی ۲۰۰۸ء تک کویت میں قیام پذیر رہے۔اس دوران انہوں نے دروس و محاضرات کے علاوہ کئی علمی شخصیات سے ملاقاتیں بھی کیں۔انہوں نے ۳/ جولائی کو مرکز دعوۃ الجالیات کے ماہانہ اجتماع سے خطاب کیا جو کہ ہر انگریزی مہینے کی پہلی جمعرات کو نماز عشاء کے بعد جمعیۃ احیاء التراث الاسلامی کے کانفرنس ہال میں منعقد ہوتا ہے) اور اسی اجلاس میں انہیں مورخ اہل حدیث کا لقب دیا گیا اور شیلڈ بھی پیش کی گئی۔یہ شیلڈ مرکز دعوۃ الجالیات کی طرف سے جمعیۃ احیاء التراث الاسلامی کے چیئرمین/فضیلۃ الشیخ طارق العیسی حفظہ اللہ نے پیش کی۔

مرکز دعوۃ الجالیات کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ۵/ مارچ سنہ ۲۰۰۹ء کے ماہانہ اجتماع (قرطبہ) میں مرکز کی جانب سے ممتاز عالم دین مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ کو علم حدیث اور مسلک اہل حدیث کے دفاع

Marfat.com

کے لیے ان کی علمی کاوشوں پر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ''محقق اہل حدیث'' کا لقب دیا گیا اور اعزازی شیلڈ بھی پیش کی گئی۔

مضمون نگاری کے فنی محاسن:

حضرت بھٹی صاحب کے انداز تحریر پر تبصرہ کرتے ہوئے میرزا ادیب لکھتے ہیں:

''ان کا انداز بیان رواں دواں ہوتا ہے۔ جس موضوع پر کوئی بات لکھ دیتے ہیں، یوں لگتا ہے یہ بات اپنے مناسب مقام پر ہی آئی ہے۔ دلچسپ پیرایہ بیان اختیار کرتے ہیں۔ پھر انہیں یہ ہنر بھی آتا ہے کہ جہاں کہیں محسوس کرتے ہیں کہ ان کی تحریر دیر ہضم ہونے لگی ہے تو جھٹ لطیفے کا چورن استعمال میں لا کر اسے زود ہضم بنا دیتے ہیں۔ ان کی شگفتگیء خاطر ان کی ہر تحریر میں نمایاں ہوتی ہے۔'' (بزم ارجمنداں ص ۱۵)

عمومی طور پر کوئی بھی مقالہ یا مضمون یا تصنیف تین بنیادی اجزاء پر مشتمل ہوتی ہے۔ مقدمہ (آغاز)، موضوع اور خاتمہ۔ ان اجزاء کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان میں رنگ بھرنا اور موضوع کی اہمیت، تفاصیل اور خلاصہ دیانتداری کے ساتھ عام فہم اسلوب میں قارئین کے سامنے پیش کرنا اور انہیں صحیح واقعات وحقائق سے آگاہ کرنا فن تصنیف وتالیف کے محاسن میں سے ہے۔

حضرت بھٹی صاحب کے مضامین اور سوانحی خاکوں کا مطالعہ کرنے والے قارئین بخوبی محسوس کرتے ہیں کہ آپ بلند پایہ علمی شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی نزاکتوں اور رسم الخط اور املا کی لطافتوں سے کس قدر شناسا اور آگاہ تھے۔

راقم الحروف نے بھٹی صاحب کی کتاب ''برصغیر میں اہل حدیث کی آمد'' پر نظر ثانی یا بتعبیر احسن پروف ریڈنگ کے دوران حضرت کے املا کردہ لفظ ''علما'' کے آگے ہمزہ ڈال کر ''علماء'' اور لفظ ''رائے'' پر ہمزہ کا اضافہ کر کے ''رائے'' بنا دیا تو انہوں نے از راہ شفقت اصلاح فرماتے ہوئے راقم الحروف کے نام اپنے گرامی نامہ میں لکھا: ''آپ نے ''علما'' کے آگے ہمزہ ڈال کر ''علماء'' اور ''رائے'' وغیرہ الفاظ پر ہمزہ ڈال کر ''رائے'' بنا دیا ہے۔ میں اس پر آپ کا شکر گزار ہوں۔ لیکن اب یہ سلسلہ متروک ہے۔ رسم الخط اور املا کے موضوع پر اب کتابیں چھپ چکی ہیں۔ علمائے کرام، زعمائے کرام کو اب ''علماے کرام'' ''زعماے کرام'' بغیر ہمزہ کے لکھا جاتا ہے۔ اسی طرح علما، فقہا، زعما کے آگے ہمزہ نہیں ڈالا جاتا۔ اسی طرح لفظ (چھ) کو (چھے) تحریر کیا جاتا ہے۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی مجلس ترقی ادب، جامعہ ملیہ دہلی، اردو مرکزی

Marfat.com

سائنس بورڈ، انجمن ترقی اردو وغیرہ اداروں میں اسی طرح لکھا جاتا ہے۔مولانا ابوالکلام آزاد، مولوی ڈاکٹر عبدالحق بابائے اردو، مولانا غلام رسول مہر اور مالک رام اس کا التزام کرتے تھے۔ہمارے ملک کے مشہور مصنف وادیب ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری بھی اسی کا تتبع کرتے ہیں، میرا تعلق بھی املا کے اسی مکتب فکر سے ہے۔'' (مکتوب بتاریخ ۲۰۰۲/۳/۹ء)

ان کا ابتدائیہ "براعة الاستهلال" کی عمدہ مثال ان کا مضمون معلومات کا مرقع اور اردو ادب کا شاہکار اور ان کا اختتام مسك الختام ہوتا ہے۔

گزرگئی گزران:

غرض نقشے کز ما یاد ماند
کہ ہستی را نمی بینم بقائے

بھٹی صاحب کی خودنوشت سرگزشت ''گزرگئی گزران'' پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر عبدالجبار شاکر مرحوم لکھتے ہیں:

''بھٹی صاحب نے گزرگئی گزران میں تجربات کا تنوع، مشاہدات کی گہرائی، واقعات کا استحضار، حافظے کی نعمت، اظہار کی قدرت، اسلوب کی ندرت اور دین کی حمیت جیسی اقدار وخصائص کو پیش کرکے ادبیات اردو کے دامن میں ایک مستقل معیار کی حامل آپ بیتی کا اضافہ کیا ہے۔'' (گزرگئی گزران ص۲۰)

مؤرخ اہل حدیث اپنی آپ بیتی کا آغاز اپنے شجرہ نسب سے کرتے ہیں: میرا مختصر سلسلہء نسب جو مجھے میرے دادا مرحوم نے بتایا تھا وہ یہ ہے: محمد اسحاق بن عبدالمجید، بن دوست محمد عرف دسوندی بن منصور بن خزانہ بن جیوا۔''

اس کے بعد اپنی طویل داستان حیات حوالہ قرطاس کرتے ہیں جو اس کتاب کے (۴۴۶) صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔اور مسک الختام کے طور پر لکھتے ہیں:''میں اپنی داستان حیات کے نقطہء اختتام تک پہنچ گیا ہوں۔میری تاریخ پیدائش ۱۵۔مارچ ۱۹۲۵ء ہے۔اس حساب سے عیسوی سال کے مطابق میرا کاروان حیات آج تک (تادم تحریر ۱۰۔مارچ ۲۰۰۹ء) پانچ دن کم ۸۴ برس کا لمبا سفر طے کرچکا ہے۔۔میں نے گذشتہ صفحات میں اپنے طویل لیل ونہار میں بیتے ہوئے، وہ واقعات بیان کرنے کی کوشش کی ہے، جو قلم کی رفتار کے ساتھ میرے ذہن میں آتے گئے۔

Marfat.com

میں ان کو گزر گئی گزران سے تعبیر کرتا ہوں۔بہت سے واقعات میری بعض کتابوں میں بعض شخصیات کے ضمن میں بیان کیے جا چکے ہیں۔مثلا ارمغان حنیف میں،نقوش عظمت رفتہ میں،بزم ارجمنداں میں، قافلہء حدیث اور کاروان سلف یاہفت اقلیم اور دیگر تصانیف میں ......اور آخر میں مسک الختام کے طور پر حسن خاتمہ کی دعا کے ساتھ اپنی سوانح عمری کا اختتام کرتے ہوئے رقم طراز ہیں":اب میں قرآن کے ان دعائیہ الفاظ کے ساتھ آپ سے رخصت ہوتا ہوں:

﴿فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ أَنتَ وَلِيِّي فِي الدُّنُيَا وَالآخِرَةِ تَوَفَّنِي مُسْلِماً وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالحينَ﴾ (یوسف : ۱۰۱) ۱۰۔مارچ ۲۰۰۹ء

اس تحریر کے ۶ سال گیارہ دن بعد ستر (۷۰) سال کی طویل مدت تک خامہ فرسائی کرنے اور علوم و معارف کو سینہء قرطاس کی زینت بنانے کے بعد قضاء وقدر کے دستور الٰہی کے مطابق قلم رک گیا اور تاریخ کا ایک باب بند ہوگیا۔بقول حضرت مصلح نوشہروی......

زندگی بخشی ہزاروں علم کے آفاق کو
موت نے چھوڑا نہیں پر حضرت اسحاق کو

اور ہم اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کی وسعتوں کے پیش نظر پرامید ہیں کہ اس ارحم الراحمین نے اپنے بندے کی التجا و دعا کو شرف قبولیت عطا کر کے حسن خاتمہ کی سعادت سے بہرہ ور کیا ہے۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کی قبر کو جنت کا باغیچہ بنائے اور انہیں فردوس بریں کا وارث بنائے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

وفات:

۲۲/دسمبر سنہ ۲۰۱۵ء بمطابق ۱۰۔ربیع الاوّل سنہ ۱۴۳۷ھ بروز منگل اذان فجر کے وقت ۹۰ سال ۶ ماہ اور سات دن کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔حضرت بھٹی صاحب اپنی زندگی کے آخری ایام میں علیل ہوئے تو انہیں علاج کی غرض سے میو ہسپتال لاہور میں داخل کروایا گیا۔

جہاں ان کی تیمارداری کے لیے ان کے چھوٹے بھائی محمد سعید بھٹی اور لاڈلے اور فرمانبردار بھتیجے حافظ محمد حسان سعید ہمہ وقت ان کی خدمت میں موجود رہے۔اور یہ حقیقت ہے بھائی محمد سعید اور ان کے اہل خانہ نے حضرت بھٹی صاحب کی بہت خدمت کی ہے۔حضرت بھٹی صاحب کی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ان کو اللہ تعالیٰ نے دو بیٹیاں عطا کی ہیں جو اپنے اپنے گھروں میں خوش وخرم زندگی بسر کر رہی ہیں۔الحمد للہ۔

Marfat.com

حضرت بھٹی صاحب کے پاس ان کے چھوٹے بھائی محمد سعید بھٹی اور ان کے اہل خانہ ہیں۔ یہ سارا خاندان بھٹی صاحب کو ''ابو جی'' کہہ کر پکارتے ہیں۔ ان کی خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے حضرت بھٹی صاحب لکھتے ہیں: ''اگر کوئی میرا حقیقی بیٹا ہوتا تو شاید میری اتنی خدمت نہ کرسکتا جو سعید اور اس کے بیوی بچوں نے کی اور کررہے ہیں۔ میری اتنی ڈانٹ بھی وہ برداشت نہ کرسکتا جو یہ کررہے ہیں۔'' (گزر گئی گزران ص: ۴۶۰) یہی خاندان حضرت بھٹی کے عادات و خصال، طرز زندگی اور بودوباش اور کے مراسم اور تعلقات اور معاملات کے بارے میں سب سے زیادہ واقف و آگاہ ہے۔ اور یہی لوگ ان کے ورثاء ولواحقین ہیں، انہی کے پاس ان کی قیمتی معلومات کا مجموعہ، ڈائری اور ان کی محفوظ کردہ یادداشتیں ہیں۔ انہی کے قبضہ میں مؤرخ اہل حدیث کی غیر مطبوعہ تصانیف اور مقالات ہیں۔ اللہ تعالیٰ بھائی سعید بھٹی صاحب اور ان کے لائق فرزند گرامی کو توفیق مرحمت فرمائے کہ وہ ان قیمتی جواہر پاروں کو منظر عام پر لاسکیں اور افادہ عام کے لیے انہیں شائع کرسکیں۔ حافظ محمد حسان سعید کا بیان ہے:

''۲۲/ دسمبر ۲۰۱۵ء بروز منگل جب فجر کی اذان شروع ہوئی تو ڈاکٹرز چیک اپ کررہے تھے، کہ اسی دوران ٹھیک ۵:۳۰ صبح ابو جی ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئے۔ إنا لله و إنا إليه راجعون.''

سَبِيلُ الْمَوْتِ غَايَةُ كُلِّ حَيٍّ وَأَعْيَادَوَاءُ الْمَوْتِ كُلَّ طَبِيبٍ

''اک مسافر تھا یاں آکے ٹھہرا ہوا اپنی منزل کو آخر روانہ ہوا۔

((اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَهُ وَارْحَمْهُ وَعَافِهِ وَاعْفُ عَنْهُ ، وَاَكْرِمْ نُزُلَهُ وَوَسِّعْ مُدْخَلَهُ ، وَاغْسِلْهُ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ ، وَنَقِّهِ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا نَقَّيْتَ الثَّوْبَ الْاَبْيَضَ مِنَ الدَّنَسِ ، وَاَبْدِلْهُ دَارًا خَيْرًا مِّنْ دَارِهِ ، وَاَهْلاً خَيْرًا مِّنْ اَهْلِهِ وَزَوْجًا خَيْرًا مِّنْ زَوْجِهِ ، وَاَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ ، وَاَعِذْهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ عَذَابِ النَّارِ .)) [مسلم]

''یا الٰہی! اس (اپنے بندے محمد اسحاق بھٹی) کے گناہ بخش دے اور اس پر رحم کر اور اس کو عافیت دے اور اس کو معاف کردے، اور اس کی اچھی مہمانی کر اور اس کی قبر کو کشادہ کردے، اور اس (کے گناہوں) کو (بخشش کے) پانی، برف اور اَولوں سے دھو ڈال، اور اس کو گناہوں سے اس طرح پاک کردے جیسا کہ سفید کپڑے کو تو میل سے صاف کرتا ہے، اور اس کو اس کے دنیا کے گھر سے بہتر گھر اور اس کے یہاں کے گھر والوں سے بہتر گھر والے اور اس کے یہاں کے جوڑے سے بہتر جوڑا، وہاں (آخرت میں) عطا کر، اور اس کو جنت میں داخل کر اور اس کو قبر کے عذاب اور جہنم کے عذاب سے پناہ دے۔''

Marfat.com

نماز جنازہ اور تدفین:

مؤرخ اہل حدیث رحمہ اللہ کی نماز جنازہ تین مرتبہ ادا کی گئی۔ پہلی مرتبہ آپ کی نماز جنازہ وفات کے روز (۲۲/ دسمبر) کو دو بجے دوپہر ناصر باغ لاہور میں ادا کی گئی۔ جس میں کثیر تعداد میں علما وطلبا اور مذہبی وسیاسی رہنما اور زندگی کے مختلف شعبہ جات سے تعلق رکھنے والے ہزاروں افراد نے شرکت کی اور نماز جنازہ کی امامت لکھوی خاندان کے چشم و چراغ پروفیسر ڈاکٹر حماد لکھوی نے کی۔ دوسری نماز جنازہ ناصر باغ میں ہی حافظ احمد شاکر صاحب نے پڑھائی۔ پھر آپ کے جسد خاکی کو تدفین کے لئے ان کے آبائی گاؤں منصور پور ڈھیسیاں (ضلع فیصل آباد) لے جایا گیا جہاں دوسری مرتبہ آپ کی نماز جنازہ ادا کی گئی جس کی امامت شیخ الحدیث مولانا حافظ مسعود عالم حفظہ اللہ نے کروائی، اور منصور پور ڈھیسیاں کے قبرستان میں انہیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے:

تودۂ خاک کو مت جانیو! تربت مری
میری مرقد میرے احباب کے سینے ہوں گے

دنیا کے مختلف ممالک میں حضرت بھٹی صاحب کے تعلق داروں اور عقیدت مندوں نے ان کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی۔ کویت میں مرکز دعوۃ الجالیات کے زیر اہتمام ان کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی جس میں کثیر تعداد میں احباب نے شرکت کی اور مرحوم کے لئے بخشش کی دعا کی۔

کچھ یادیں، کچھ باتیں:

راقم السطور کا زمانہ طالب علمی سے ہی مؤرخ اہل حدیث رحمہ اللہ سے عقیدت مندانہ تعلق رہا ہے۔ ۱۹۸۱ء میں حصول تعلیم کے لئے جامعہ سلفیہ فیصل آباد میں داخل ہوا تو اس وقت جامعہ سلفیہ کے مدیر مکتبہ مولانا اشرف جاوید حفظہ اللہ تھے اور ان کا رہائشی کمرہ جامعہ کے ہاسٹل میں ہمارے پڑوس میں تھا۔ اس لیے ان کے پاس جب مہمان علما کرام تشریف لاتے تو ہمیں ان کی خدمت کرنے کی سعادت میسر آتی۔ ان ذی وقار علمائے کرام میں مولانا محمد حنیف ندوی اور حضرت بھٹی صاحب رحمہما اللہ بھی تھے۔ یہ دونوں بزرگ شخصیات ایک ساتھ ہی جامعہ میں تشریف لاتے اور ہم مولانا اشرف جاوید صاحب کے حکم پر شوق سے ان کی خدمت بجالاتے۔ اور یہ تعلق ہمیشہ قائم رہا بلکہ زیادہ مستحکم ہوتا گیا۔ راقم جب بھی چھٹی پر پاکستان جاتا تو بھٹی صاحب سے ملاقات تو اپنے فرائض میں شمار کرتا۔ ان کی رہائش گاہ پر ان کی خدمت میں حاضری ہوتی اور ان کی پرخلوص ضیافت سے لطف اندوز ہونے اور علمی لطائف سے مستفید ہونے کا موقعہ آتا۔ میرے چچا جان محمد ابراہیم صاحب اور برادر مکرم شیخ الحدیث مولانا عبدالرشید ضیاء صاحب عموماً میرے ہمراہ ہوا کرتے تھے۔ راقم حضرت

Marfat.com

بھٹی صاحب سے پندونصائح اور توجیہات قیمہ کی اپیل اور نیک دعاؤں کی درخواست کے ساتھ ساتھ ان سے آٹوگراف کیلئے بھی درخواست کرتا اور وہ اپنے مبارک قلم سے چند کلمات نصیحت تحریر کر کے ان کے نیچے اپنے دستخط اور تاریخ درج کر دیتے۔گزشتہ سفر میں ان کی یادگار تحریر نذر قارئین کرنا چاہتا ہوں:

''عزیز مکرم! مولانا عبدالخالق مدنی کے لئے اپنی طرف سے عرض ہے۔

ہوش و حواس تاب و تواں داغ جا چکے

اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

عمر کی اس منزل میں ہیں کہ معلوم نہیں ڈور کب کٹ جائے۔دعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھنا۔''

عرض گزار

محمد اسحاق بھٹی۔''

لجنة القارة الهنديه (جمعية احياء التراث الاسلامی) اور مرکز دعوة الجاليات (کویت) کے مشروع (سلسلہ تاریخ اہل حدیث) کی زیر نظر کتاب ''بوستان حدیث'' (جو اس وقت قارئین کے پیش خدمت ہے) کی تکمیل کے بعد بھٹی صاحب نے مجھے اس پر مقدمہ لکھنے کا حکم دیا۔لیکن افسوس! ان کی زندگی میں اس حکم کی تعمیل نہ ہوسکی۔اب اللہ کی توفیق سے تعمیل ارشاد کرتے ہوئے یہ چند صفحات سپرد قلم کیے ہیں۔وما توفيقی الا بالله۔

قارئین! سے گزارش ہے اب ہمارے محسن ومربی کی سرپرستی اور ان سطور پر نظر ثانی کی شفقت تو میسر نہیں۔لہٰذا تحریر میں کسی بھی قسم کی فروگذاشت سے صرف نظر کرتے ہوئے مصنف ذی وقار (رحمہ اللہ) اور راقم کو اپنی خصوصی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

أَيَــا قَــارِئـاً خَــطِّیْ سَأَلْتُكَ دَعْوَةً ‏ ‏ ‏ ‏ اِلَـى الـلّٰـهِ فِـیْ عَبْدٍمُقِرٍّ بِذَنْبِـهِ

عَسَـاهُ يُسَـامِـحُنِیْ وَيَغْفِرُ زَلَّتِیْ ‏ ‏ ‏ ‏ وَيَـرْزُقُـنِـیْ رِزْقـاً مُـقِيْماً بِأَهْلِهِ

<u>شکر و سپاس:</u>

(سلسلہ تاریخ اہل حدیث) کے چھٹے مجموعہ ''بوستان حدیث'' کی اشاعت کے موقع پر ہم اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاتے ہیں کہ اس نے مؤرخ اہل حدیث رحمہ اللہ کو اس کی تکمیل کی توفیق مرحمت فرمائی اور دعا گو ہیں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنے بندے محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ کی اس خدمت کو شرف قبولیت عطا کرے،اور ان کے لئے صدقہ ء جاریہ بنائے۔اس منصوبے (تاریخ اہل حدیث) کی سرپرستی کرنے والے لجنة القارة الهندية (کویت) کے رئیس

Marfat.com

فضیلۃ الشیخ ابو خالد فلاح خالد المطیری حفظہ اللہ اور اس مشروع کے نگران محترم شیخ عارف جاوید محمدی رئیس مرکز دعوۃ الجالیات کے بھی شکر گزار ہیں کہ انہوں اس معاملہ میں خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔اللہ تعالیٰ تمام حضرات کو جزائے خیر عطا کرے اور اس منصوبے کو اسلام اور مسلمانوں کے لئے نفع مند بنائے۔آمین

کتبہ

خادم العلم والعلماء

عبدالخالق بن محمد صادق المدنی

کویت۔١٠/١٠/٢٠١٦ء

❀❀❀❀

Marfat.com

شاہ عبدالعزیز، شاہ اسماعیل شہید اور شاہ محمد اسحاق دہلوی کے چار تلامذہ کرام

Marfat.com

Marfat.com

مولانا امین اللہ نگر نہسوی

(وفات ۴۔فروری ۱۸۱۸ء)

مولانا امین اللہ کے والد کا نام سلیم اللہ تھا۔ وہ انصارِ عرب سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اجداد میں جو بزرگ سب سے پہلے ہندوستان آئے، ان کا نام علیم اللہ دردائی انصاری تھا۔

مولانا امین اللہ نے تعلیم کا آغاز اپنے والد گرامی سے کیا۔ پھر دہلی گئے۔ اس زمانے کے دہلی شہر میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث کا غلغلۂ درس بلند تھا، مولانا امین اللہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے اکتساب فیض کیا۔

مولانا ممدوح کثیر الدرس اور رفیع المرتبت عالم تھے۔ وہ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں صدر مدرس کے طور پر خدمت انجام دیتے رہے۔

وہ مصنف و محشی بھی تھے۔ ان کی قلمی کاوشوں میں قصیدہ عظمیٰ، حاشیہ میر زاہد، حاشیہ شرح مواقف اور حاشیہ مسلم الثبوت شامل ہیں۔

مولانا امین اللہ نگر نہسوی عظیم آبادی نے ۲۷۔ ربیع الاول ۱۲۳۳ھ (۴۔فروری ۱۸۱۸ء) کو کلکتہ میں وفات پائی۔ [1]

❀❀❀❀

[1] ملاحظہ ہو عبدالرقیب حقانی کی تصنیف ''ارض بہار اور مسلمان'' ص: ۴۲۱۔

Marfat.com

بابا طفیل محمد

(وفات ۱۸۴۶ء)

دہلی کا ایک راجپوت خاندان اس وقت دہلی سے نکلا جب مغل حکومت کے آخری دور میں وہاں کے حالات بہت بگڑ گئے تھے۔ ان لوگوں نے ہندوستان کے شمال مغربی حصے کی طرف رخ کیا اور چلتے چلتے جہلم اور چناب کی وادیوں میں جا پہنچے۔ یہاں کچھ عرصہ قیام کیا۔ پھر وہاں سے نکل کر سیالکوٹ اور اس کے مضافات میں چلے گئے۔ وہاں ان کی برادری کے کچھ لوگ پہلے سے آباد تھے، جن سے ان کے قریبی مراسم پیدا ہو گئے۔ چوں کہ یہ شریف النفس اور اچھی عادات کے حامل لوگ تھے، اس لیے اس نواح کی آبادیوں میں ان کا اثر ورسوخ کافی بڑھ گیا اور مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں انھیں احترام کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔

وہاں کے ایک راجپوت کا نام جتندر سنگھ (یا جوگندر سنگھ) تھا جو اس علاقے کا معزز شخص تھا۔ اس کا ان کے پاس آنا جانا ہوا تو اس نے ان کی شریفانہ عادات سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا اور اس کی وجہ سے اور بھی بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔

دہلی کے اس خاندان میں ایک شخص طفیل محمد پیدا ہوئے جو زاہد و عابد بھی تھے اور اسلامی علوم وفنون میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ وہ مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور سید احمد شہید کی تحریک جہاد سے متاثر تھے۔ ایک وقت آیا کہ وہ اپنے اہل وعیال اور دیگر متعلقین کے ساتھ سیالکوٹ سے نکلے اور راولپنڈی کے قریب ایک مقام کوری دلال میں اقامت گزیں ہو گئے۔ اس سے کچھ عرصے بعد بال بچوں کو وہاں چھوڑا اور خود جماعت مجاہدین میں شمولیت کے لیے علاقہ ہزارہ میں چلے گئے۔ ان کے ساتھ کچھ عرصہ سکھوں سے نبرد آزما رہے۔ پھر اپنے اہل وعیال کو ساتھ لے کر خان پور آئے۔ وہاں اپنے نیک اطوار فرزند عبداللہ کو ان کی نگرانی پر مامور کیا اور خود مجاہدین کی جماعت میں جا شامل ہوئے۔

۶۔ مئی ۱۸۳۱ء (۲۴۔ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ) کو سانحۂ بالاکوٹ پیش آیا تو طفیل محمد زخمی ہو کر گھر آ گئے اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ ایک بڑا زخم پیشانی اور کنپٹی کے قریب تھا، جس میں شگاف پڑ گیا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ زخم تو مندمل ہو گیا، لیکن ہڈی میں سوراخ رہ گیا۔ اس میں تھوڑی سی ہوا گزرتی تو سوراخ کی وجہ سے سیٹی کی آواز آنے لگتی۔ ان کی عمر اب کچھ بڑھ گئی تھی اور لوگ انھیں ''بابا طفیل محمد'' کہنے لگے تھے اور ان کے جاننے والے چھوٹے بڑے سب لوگ انھیں اسی طرح پکارتے تھے۔

Marfat.com

بالاکوٹ سے واپسی کے بعد وہ چند سال خان پور رہے۔ اس اثنا میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور کچھ لوگوں نے ان سے اکتساب علم کیا۔ گھر کے معاشی معاملات سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ سلسلہ ان کے بیٹے میاں عبداللہ کے سپرد تھا۔ ان کی اچھی خاصی زمین تھی اور ٹھیک ٹھاک گزر بسر ہو رہی تھی۔

۱۸۳۶ء (۱۲۵۲ھ) میں کسی کو بتائے بغیر بابا طفیل محمد گھر سے نکلے اور عازم حجاز ہو گئے۔ لیکن لوگ یہی سمجھتے رہے کہ اپنے پرانے رشتے داروں اور دوستوں سے ملنے کے لیے کہیں گئے ہیں، کسی روز واپس آ جائیں گے۔ ایک مدت گزر گئی، نہ وہ آئے اور نہ ان کے متعلق کسی سے کچھ پتا چل سکا۔ گھر والے مایوس ہو کر بیٹھ گئے...... لیکن ادھر بابا طفیل محمد چلتے چلتے ۱۸۳۷ء میں مکہ مکرمہ پہنچ گئے اور فریضہ حج ادا کر کے مدینہ منورہ چلے گئے۔ اس طرح کچھ عرصہ حرمین شریفین میں سکونت پذیر رہے۔

بعد ازاں وہاں سے نکلے اور علاقۂ نجد کو روانہ ہو گئے۔ اس زمانے میں نہ سڑکیں تھیں نہ موٹریں چلتی تھیں۔ پیدل یا اونٹوں پر سفر کیا جاتا تھا۔ عرب کا ریتلا علاقہ اور دور تک پھیلا ہوا صحرا۔ یہ پیدل چلتے چلتے شیخ محمد بن عبدالوہاب کے مرکز دعوت ''درعیہ'' جا پہنچے۔ وہاں ان کی ملاقات آل شیخ کے جلیل القدر عالم شیخ عبدالرحمٰن سے ہوئی، جو شیخ حسن کے بیٹے اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کے پوتے تھے۔ ان دنوں وہ وہاں کے قاضی القضاۃ تھے جو اپنی نو سالہ جلاوطنی کے بعد کچھ مدت پہلے مصر سے درعیہ پہنچے تھے۔

بابا طفیل محمد کو وہاں شیخ ہندی کہا جاتا تھا۔ تقریباً چھے سال یہ وہاں رہے۔ اس طویل مدت میں انھوں نے قاضی القضاۃ شیخ عبدالرحمٰن اور ان کے نامور فرزند شیخ عبداللطیف سے خوب استفادہ کیا۔

کم و بیش چھے سال کے بعد وہ درعیہ سے روانہ ہوئے اور عراق، ایران، بلوچستان سے ہوتے ہوئے ۱۸۴۴ء (۱۲۶۰ھ) میں واپس وطن پہنچے۔ واپسی پر بغداد، اہواز، شیراز، کرمان، زاہدان وغیرہ مقامات کی سیاحت بھی کی۔

بابا طفیل محمد نے نہایت جفاکشی کی زندگی بسر کی۔ وہ مجاہد فی سبیل اللہ بھی تھے اور عالم دین بھی۔ سیر و سیاحت، طویل اسفار، تعلیم و تدریس اور اللہ کی راہ میں کفار سے جہاد ان کے دل پسند مشاغل تھے اور وہ مضبوط اعصاب کے مالک بزرگ تھے۔

ان کی وطن واپسی ان کے اہل خانہ اور متعلقین کے لیے بے حد تعجب کا باعث تھی۔ اب وہ بہت کم زور ہو گئے تھے اور دور دراز کے طویل سفروں نے انھیں نڈھال کر دیا تھا۔ وطن واپس آ کر وہ دو سال زندہ رہے۔ ۱۸۴۶ء (۱۲۶۲ھ) میں وفات پا گئے۔ [1]

---

[1] ان کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو ''تذکرہ علمائے خان پور'' صفحہ: ۲۵۵ تا ۲۶۰۔ یہ کتاب قاضی عبداللہ علیگ خان پوری کی تصنیف ہے اور مکتبہ سلفیہ لاہور کی طرف سے ۱۹۸۵ء (۱۴۰۵ھ) میں شائع ہوئی۔ ناشر ہیں مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی۔

Marfat.com

مولانا عبدالحق بنارسی

(وفات ۲۱- جون ۱۸۶۰ء)

مولانا عبدالحق عثمانی بنارسی اپنے دور کے مشہور علماء میں سے تھے۔ والد کا اسم گرامی مولانا فضل اللہ عثمانی تھا۔ یہ دراصل ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ایک قصبے نیوتن کے باشندے تھے جو ضلع اناؤ میں واقع ہے۔ وہاں کی سکونت ترک کر کے بنارس میں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔

مولانا عبدالحق بنارسی کی ولادت ۱۲۰۶ھ (۱۷۹۲ء) کو نیوتن میں ہوئی اور اپنے والد گرامی مولانا فضل اللہ اور چند دیگر علما سے بعض درسی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں عازمِ دہلی ہوئے۔ وہاں حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی، مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی اور مولانا عبدالحئی بڑھانوی سے حدیث وفقہ اور دیگر علوم کی تکمیل کی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مکہ مکرمہ کا قصد کیا اور حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ وہاں کے علماء سے بعض فقہی مسائل میں مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ یہ مسلکِ اہل حدیث کے پابند اور کتاب وسنت پر عامل تھے، لیکن اس زمانے کے مکہ مکرمہ کے علمائے کرام متعدد مسائل میں ان سے مختلف رائے رکھتے تھے۔ اس اختلاف نے زیادہ شدت اختیار کر لی تو وہاں کی حکومت نے انھیں گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا۔ پھر کچھ مدت بعد رہا ہوئے تو واپس ہندوستان آ گئے۔

دوسری مرتبہ سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید کے قافلے کے ساتھ حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔ یہ قافلہ سات سو ترپن (۷۵۳) افراد پر مشتمل تھا، جس میں بہت سے علما وزعما شامل تھے۔ بعض خواتین بھی اس قافلے میں شریک تھیں۔ یہ قافلہ ۲۸۔ شعبان ۱۲۳۷ھ (۲۱۔ مئی ۱۸۲۲ء) کو مکہ معظمہ میں داخل ہوا۔

مولانا عبدالحق عثمانی حج کے بعد جب مدینہ منورہ پہنچے تو اپنی عادت کے مطابق فقہی نوعیت کے بعض مختلف فیہ مسائل میں وہاں کے علما سے پھر بحثیں شروع ہو گئیں۔ اس زمانے میں مدینہ منورہ میں شیخ محمد سعید اسلمی مدراسی فروکش تھے۔ یہ ان کے ہم وطن تھے۔ انھوں نے وہاں کے قاضی سے ان کی شکایت کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا ممدوح مدینہ منورہ سے نکلے اور ایک مقام ''جُریدہ'' جا پہنچے۔ وہاں سے ایک قافلے کے ساتھ ''جدہ'' گئے اور جدہ سے یمن کا عزم کیا۔ وہاں قاضی محمد بن شوکانی، قاضی عبدالرحمٰن بھکلی، شیخ عبداللہ بن محمد بن اسماعیل امیر یمانی اور شیخ محمد عابد سندھی سے ملاقات کی۔ یہ تمام حضرات اپنے دور کے جلیل القدر علما

Marfat.com

اور نامور بزرگ تھے۔ ان سب سے سند و اجازہ حاصل کیا۔ یہ ۱۲۳۸ھ کا واقعہ ہے۔ بعد ازاں ''مُخا'' آئے اور پھر ہندوستان پہنچے۔

اس زمانے میں سفرِ حج نہایت مشکل تھا۔ آمد و رفت کی سہولتیں بالکل میسر نہ تھیں اور بہت کم لوگ یہ سعادت حاصل کر پاتے تھے لیکن اس کے باوجود مولانا عبدالحق عثمانی بنارسی نے سات مرتبہ سفرِ حجاز کیا اور سات حج کیے۔ ان کا حجازِ مقدس کا ساتواں سفر آخری سفر تھا اور اس سفر میں منیٰ کے مقام پر وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مولانا عبدالحق عثمانی نے مدینہ منورہ سے امام شوکانی کی خدمت میں حاضری کے لیے صنعا (یمن) کا عزم کیا تو راستہ بہت دشوار تھا۔ کہیں سمندری سفر تھا اور کہیں برّی۔ اثنائے راہ میں کثرتِ باراں نے بھی قدم قدم پر رکاوٹ پیدا کی۔ بالآخر وہ صنعا پہنچے۔ وہاں ایک مکان میں مقیم ہو کر امام شوکانی کی خدمت میں ایک مکتوب ارسال کیا۔ انھوں نے اپنے ہاں ان کو طلب فرمایا اور عزت و اکرام سے پیش آئے۔ عمر دریافت فرمائی کہ کتنی ہے اور علمی کوائف پوچھے۔ پھر اپنی تصنیفات عنایت کیں اور ان کے مطالعے کا حکم دیا۔ انھوں نے ان کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ اسی دوران کر لیا۔ ہفتے میں دو دن سوموار اور جمعرات کو امام شوکانی کی زیارت کا شرف حاصل ہوتا اور ان سے سماعِ علم کرتے۔ امام انتہائی توجہ اور انہماک سے پڑھاتے اور مشکل مسائل کی عقدہ کشائی کرتے۔ اسی اثنا میں مولانا بیمار پڑ گئے اور کافی عرصے تک بخار میں مبتلا رہے۔ صحت یاب ہوئے تو امام ممدوح کی خدمت میں حاضری دی۔ وہ اس وقت صنعا سے کہیں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ بہ درجہ غایت شفقت سے پیش آئے۔ یہ جمعۃ المبارک کا دن تھا اور تاریخ ۱۰۔ جمادی الاخریٰ ۱۲۳۸ھ (۲۲-فروری ۱۸۲۳ء) تھی۔ اپنے مبارک ہاتھ سے انھوں نے سند و اجازہ لکھ کر دی، جسے وہ "اتحاف الاکابر فی اسناد الدفاتر" کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ سند کو نقل کرنے کے لیے فرمایا، اس کے الفاظ یہ ہیں:

بسم الله الرحمن الرحيم: الحمد لله يقول محمد بن علي الشوكاني غفر الله لهما حامدا لله تعالىٰ و مصليا على رسوله و آله و صحبه، انى قد اجزت الشيخ العلامة ابا الفضل عبدالحق بن الشيخ العلامة محمد فضل الله المحمدى الهندى كثر الله فوائده بمنه و كرمه و نفع بمعارفه ما اشتمل عليه هذا الثبت الذى جمعته و سميته. "اتحاف الاكابر باسناد الدفاتر" فليرو عنى ما اشتمل عليه من كتب الاسلام على اختلاف انواعها كما يراه فيه و هو اهل لما هنالك و لم اشترط عليه شرطا فهو اجل من

Marfat.com

ذلك و اعلى و اخذت عليه ان يصل بالدعوة المستقلة فى حياتى و بعد مماتى ...... حررته يوم الجمعة بتاريخ عاشر جمادى الاخرى سنة ١٢٣٨ من الهجرة النبوية على صاحبها افضل الصلوة و التحية.

شیخ محمد بن عابد سندھی نے بھی ان کو سند واجازہ سے مفتخر فرمایا۔ سبل السلام کے مصنف شہیر کے پوتے شیخ عبداللہ یمانی نے بھی اپنے حلقہ درس میں بیٹھنے کی اجازت دی۔

شیخ ممدوح سے صحیح بخاری، قرآن مجید کی تفسیر جامع البیان اور بعض دیگر اہم کتابوں کے کچھ حصے تبرکاً پڑھے اور سند عطا ہوئی۔ قاضی عبدالرحمٰن بن احمد بن حسن بھکلی نے بھی ان کو سند واجازہ سے سرفراز کیا۔

یہ تمام حضرات اپنے وقت کے جید علما اور بہت بڑے ائمہ دین تھے۔ مولانا عبدالحق نہایت خوش قسمت اور بلند بخت عالم تھے کہ ان حضرات سے انھیں شرفِ لقا کے مواقع میسر آئے اور ان سے سعادتِ سند واجازہ حاصل ہوئی۔

مولانا عبدالحق عثمانی بنارسی مسائلِ فقہ میں درجۂ اجتہاد پر فائز تھے۔ وہ کسی خاص امام کے مقلد نہ تھے، بلکہ نصوصِ کتاب وسنت پر عامل تھے۔ ان کے دور میں برصغیر کے علما وعوام زیادہ تر تقلید کے حامی تھے اور مولانا ممدوح کا نقطۂ نظر متعدد مسائل میں ان سے مختلف تھا، اسی لیے اجتہاد وتقلید کے موضوع پر علمائے احناف اور ان کے درمیان مباحثوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس ضمن میں انھوں نے کچھ کتابیں بھی تصنیف کیں جن میں "الدر الفريد فى المنع عن التقليد" زیادہ مشہور ہے۔

بنارس میں ان کا اپنا حلقہ درس بھی قائم تھا۔ ان کے تلامذہ میں قاضی محمد مچھلی شہری، سید جلال الدین بنارسی، سید سعید الدین احمد، سید حمید الدین احمد اور سید شہید الدین کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

مولانا ممدوح نے حالتِ احرام میں ٢۔ ذی الحجہ ١٢٧٦ھ (٢١- جون ١٨٦٠ء) کو ستر سال کی عمر میں منیٰ کے مقام پر داعیِ اجل کو لبیک کہا اور جمعۃ المبارک کی رات کو مسجد خیف کے دروازے کے قریب دفن کیے گئے۔

❀❀❀❀

Marfat.com

سید سراج احمد سہسوانی

(وفات ۹- اپریل ۱۸۶۳ء)

اس کتاب میں سہوان کے متعدد علماء کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ قدیم دور کا یہ قصبہ ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ضلع بدایوں میں علم وعمل کے اعتبار سے نہایت اہم مقام رہا ہے۔ یہاں کے خاندان سادات میں بے شمار علما وصلحا اور اطبا وحکما کا ظہور ہوا، جنھوں نے اپنے گوناگوں کارناموں کی وجہ سے بے حد شہرت پائی۔ ان بزرگانِ ذی شان کے ایک اہم رکن مولانا سید سراج احمد نقوی تھے جو ہر مروجہ فن میں مہارت رکھتے تھے۔ تحریر وتقریر اور مجلسی گفتگو میں اپنے عہد کی عدیم المثال شخصیت تھے۔ ان کا اسلوب کلام ان کی بے پناہ ذکاوت کا ثبوت بہم پہنچاتا تھا۔ دینی معاملات میں ان پر جسارت کا رنگ غالب تھا۔ اس کتاب میں ان کے دو بیٹوں (سید عبدالباری نقوی اور سید عبدالباقی نقوی) اور ایک پوتے (سید اعجاز احمد معجز نقوی) کا تذکرہ مرقوم ہے جو آئندہ صفحات میں خوانندگانِ محترم کے مطالعہ میں آئے گا۔

سید سراج احمد نقوی جرأت مند اور حاضر جواب عالم تھے۔ انھوں نے ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۶ء) میں اس عالم آب وگل میں پہلا سانس لیا اور اس زمانے کے مختلف حضرات سے ابتدائی اور متوسط درجے کی کتابیں پڑھیں۔ اس وقت دہلی میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے تلمیذ اور جانشین حضرت شاہ محمد اسحاق کی مسندِ درس آراستہ تھی۔ سید سراج احمد نقوی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صحاح ستہ کا قراءتاً وسماعاً ان سے درس لیا اور سند حاصل کی۔ بعد ازاں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث کے ایک اور معروف شاگرد مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے بابِ علم پر دستک دی اور جامع ترمذی سنا کران کی سند سے مفتخر ہوئے۔

سید سراج احمد نقوی کے ایک بھائی سید اولاد احمد نقوی تھے جو ان سے تقریباً تین سال بڑے تھے۔ دونوں بھائی ذہانت وزرانت میں مشہور تھے اور دونوں کا بعض علوم کی تحصیل میں اشتراک رہا تھا۔

ان دونوں بھائیوں کی ذہانت کا ایک عجیب وغریب واقعہ ''حیات العلماء'' میں مذکور ہے۔ دونوں بھائی ایک استاذ سے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ جیسا کہ ابھی عرض کیا سید اولاد احمد عمر میں سید سراج احمد سے تین سال بڑے تھے۔ اب یہ واقعہ ''حیات العلماء'' کے فاضل مصنف سید عبدالباقی نقوی کے الفاظ میں سنیے جو سید سراج احمد نقوی کے حیرت انگیز فہم کے بارے میں مشہور ہے۔ لکھتے ہیں:

Marfat.com

''بہ زمانہ تعلیم ابتدائی کسی صاحب نے آپ سے کوئی صیغۂ صرفی امتحاناً پوچھا۔ اس کا جواب باصواب دے دیا۔ پھر حضرت سائل نے دریافت کیا کہ یہ کس باب سے ہے۔ اس کے جواب میں کچھ تامّل ہوا۔ اس موقع پر قریب مگر آپ کی نظر سے غائب بڑے بھائی (سید اولاد احمد نقوی) آپ کے استاد کے پاؤں آہستہ آہستہ داب رہے تھے، لیکن کان اس طرف لگے تھے۔ جب آپ کو (جواب سے) متامّل پایا تو بہ کنایۂ لطیفہ استاد کے پاؤں پر (ذرہ) زور سے ہاتھ مارے، جس کی آواز بلند ہو کر آپ کے کان تک پہنچی اور ذہنِ رسا جوابِ سائل میں کامیاب ہو گیا۔ فرمایا کہ باب ضــرب یضــرب سے ہے۔ حضرت استاد خاموش پڑے ہوئے یہ تمام واقعہ سن رہے تھے۔ یہ عجیب فطانت دیکھ کر (ان سے) ضبط نہ ہوا اور دفعۃً اٹھ کر بیٹھ گئے اور دونوں نوعمر (بھائیوں) کی ذکاوت و جودتِ ذہن کی دیر تک تحسین و آفرین کی۔ یہ اور اس قسم کے اکثر واقعات آپ کی قوتِ ادراک و سرعتِ فہم کے متعلق وطن وغیرہ میں زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ ❶

قوتِ فہم اور حدتِ فکر کا اندازہ کیجیے کہ ضرب کی آواز کان میں پڑی تو فوراً پتا چل گیا کہ یہ باب ضرب یضرب ہے۔ سمجھانے والے بھائی کی دانشمندی پر بھی غور فرمایئے کہ انھوں نے کس طرح چھوٹے بھائی (سراج احمد) کو سوال کا جواب سمجھانے کی کوشش کی۔ پھر استاد کو بھی دیکھیے کہ وہ پاؤں کی ضرب سے اصل حقیقت کی تہہ تک پہنچ گئے اور اٹھ کر دونوں بھائیوں کو داد دی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد سید سراج احمد نقوی نے تدریسی خدمات بھی سرانجام دیں اور مناظرے و مباحثے میں بھی بڑا نام پایا۔ ہر مجمعے میں کھل کر بات کرتے اور بلا جھجک صاف الفاظ میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت فرماتے۔ اس کی چند مثالیں ذیل میں درج کی جا رہی ہیں۔

☆......ایک مرتبہ لکھنؤ میں ایک مجلس میں تشریف فرما تھے، جس میں شیعہ اہل علم کی اکثریت تھی۔ ایک شیعہ مجتہد بڑے رعب داب کے ساتھ آئے اور تقریر شروع کی۔ اصحاب ثلاثہ (حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم) کے متعلق فرمایا کہ شیعہ ان پر جو الزامات عائد کرتے اور انھیں مطعون ٹھہراتے ہیں اس سے کلیۃً انکار نہیں ہو سکتا۔ کوئی عمارت بے بنیاد بلند نہیں ہوتی۔ ان سے متعلق مشہور واقعات اگر سب کے سب مبنی بر حقیقت نہیں ہیں تو کوئی نہ کوئی تو صحیح ہوں گے۔ یہ ممکن نہیں کہ تمام واقعات غلط ہوں۔ بقول شاعر ؎

❶ حیات العلماء ص ۴۴-۴۵۔

Marfat.com

تانبا شد چیز کے مردم نہ گوید چیزہا

مجتہد صاحب کی یہ تقریر کافی دیر جاری رہی اور ان کے ہم مسلک حضرات کی طرف سے انھیں خوب داد ملی ...... یہ رنگ دیکھ کر سید سراج احمد بہ آوازِ بلند مجتہد صاحب سے مخاطب ہوئے اور کہا بجا فرمایا پیر و مرشد تا نباشد چیز کے مردم نہ گوید چیزہا۔

مشرکین نے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں جو ہزاروں شریک و سہیم بنا رکھے ہیں، ان سب کا انکار کہاں تک ہوسکتا ہے، کچھ اصل تو ضرور ہے: تا نباشد چیز کے مردم نہ گوید چیزہا۔

نبی ﷺ اور دیگر انبیاے کرام علیہم السلام کو مخالفین کی طرف سے جو شعبدہ باز، کاہن اور جادوگر وغیرہ کہا جاتا تھا وہ سب کچھ بے شک صحیح نہ ہو، کچھ تو صحیح ہوگا۔ (نعوذ باللہ) تا نباشد چیز کے مردم نہ گوید چیزہا۔

خوارج نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جو کافر اور بے دین کہا یہ صحیح نہیں تو ضعیف الایمان اور عاصی تو ضرور ہوں گے۔ تا نباشد چیز کے مردم نہ گوید چیزہا۔

ان کی اس تقریر نے ایسا رنگ باندھا کہ تمام علمائے شیعہ کے چہرے فق ہو گئے۔ مجتہد صاحب حیران رہ گئے اور محفل میں سناٹا چھا گیا۔

یہ شاہانِ اودھ کا زمانہ تھا اور شیعہ کی حکومت تھی۔ وزیرِ سلطنت علی نقی خان تھے جو مشہور شیعہ تھے۔ انھوں نے سید سراج احمد سے کہا: ''مولانا اب بہت ہوگئی۔ آپ کی فصاحت و بلاغت اور حاضر جوابی کے متعلق جو کچھ سنا تھا صحیح ثابت ہوا۔''

سید صاحب نے فرمایا: شرعی معاملات کا تعلق ممکنات سے نہیں ہے۔ مجتہد صاحب نے ممکنات کا سہارا لیا، جس کا مجھے مجبوراً طنزاً اس انداز سے جواب دینا پڑا۔ ورنہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تو ان غلط عقاید سے کوسوں دور ہوتا ہے۔

☆...... ایک مرتبہ اودھ کی بادشاہ بیگم نے کسی وجہ سے ناراض ہو کر ایک محلے کے تمام مکانات منہدم کرنے کا حکم دیا۔ اودھ کے کلکٹر میر محمد دین خاں اور ان کے چھوٹے بھائی اودھ کی فوج کے کپتان میر فدا حسن خاں کے مکانات بھی اسی محلے میں تھے۔ کسی کو اس سلسلے میں بادشاہ بیگم سے بات کرنے کی جرأت نہ تھی۔ یہ نہایت پریشان کن معاملہ تھا۔ سید سراج احمد نقوی نے اس کے متعلق وزیرِ سلطنت علی نقی خاں سے بھی بات کی اور بادشاہ بیگم سے بھی ملے اور اس تکلیف دہ مسئلے پر گفتگو کی تو وہ ان کے طرزِ کلام اور طلاقت لسانی سے اس قدر متاثر ہوئی کہ مسئلہ حل ہوگیا اور مکانات کے انہدام کا حکم واپس لے لیا گیا۔

☆...... سید سراج احمد نقوی کے لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں مولانا فضل حق خیر آبادی وہاں گئے تو دونوں کی

Marfat.com

ملاقات ہوئی۔ مولانا خیر آبادی منطق وفلسفہ میں خاص شہرت رکھتے تھے، اس موضوع پر دونوں کی گفتگو کا سلسلہ چلا۔ مولانا اسماعیل شہید دہلوی کے مولانا خیر آبادی شدید مخالف تھے۔ دورانِ گفتگو میں انھوں نے کہا کہ مولانا اسماعیل جس چیز کو حلال کہیں میں اسے حرام اور جسے وہ حرام کہیں میں اسے حلال ثابت کرسکتا ہوں۔ سید صاحب نے فرمایا مولانا اسماعیل نے ماں، بہن، بیٹی کو حرام اور بیوی کو حلال فرمایا ہے۔ آپ اس سلسلے میں کیا ارشاد فرمائیں گے؟

سید صاحب ممدوح اہل بدعت کے ساتھ بحث ومناظرے کا خاص ملکہ رکھتے تھے۔ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے وہ دلائل کا انبار لگادیتے اور کسی کو ان کے سامنے ٹھہرنے کی ہمت نہ ہوتی۔

☆...... مولانا اسماعیل شہید کے نقطۂ فکر کے سید سراج احمد سخت حامی تھے۔ مولانا فضل رسول بدایونی نے مولانا شہید کی کتاب تقویۃ الایمان کی تردید میں احقاق الحق کے نام سے کتاب لکھی۔ اس وقت سید سراج احمد لکھنؤ میں تھے۔ یہ کتاب ان کی نظر سے گزری تو بعض اہل حق کی خواہش پر انھوں نے اس کے جواب میں سراج الایمان کے نام سے کتاب تصنیف کی۔ یہ کتاب لکھنؤ سے شائع کی گئی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ علمائے سہسوان کی تصانیف میں پہلی کتاب یہی ''سراج الایمان'' ہے جو زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی اور اپنے باب میں لاجواب سمجھی گئی۔ ❶

☆...... ایک وقت آیا کہ حکومت اودھ کے ذمہ دار حضرات نے اصرار کر کے سید سراج احمد نقوی کو قصبہ کاکوری کا جو اس وقت ضلع لکھنؤ میں واقع تھا، تحصیل دار بنا دیا۔ پانچ چھے سال وہ اس منصب پر فائز رہے۔ حکومت بھی ان کے کام سے مطمئن تھی اور وہاں کے عوام بھی ان کے طرزِ عمل سے بہت خوش تھے۔ اس زمانے کے حکومتی قوانین سے متعلق انھیں پوری مہارت حاصل تھی اور ان کے فیصلے بالکل صحیح ہوتے تھے۔ ان کی اصابت رائے کا سب کو اعتراف تھا۔ حکومت کے بڑے بڑے اہل کار اور وکلاء اکثر اہم امور میں ان سے مشورہ کرتے اور اس مشورے پر عمل پیرا ہوتے۔

☆...... ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے ایک سال بعد ۱۸۵۸ء میں وہ اپنے وطن سہسوان آ گئے تھے۔ وہاں دو سال وکالت کرتے رہے۔ پھر تمام امور سے منقطع ہو کر وعظ وتبلیغ اور مطالعہ کتب کو اپنا معمول قرار دے لیا۔ شرک و بدعت کی تردید اور توحید وسنت کی اشاعت ان کا اصل موضوع تھا۔ بس اسی میں مصروف رہتے۔

اس جلیل القدر عالم نے صرف ۴۷ سال کی عمر پائی۔ ۱۹- شوال ۱۲۷۹ھ (۹- اپریل ۱۸۶۳ء) کو سہسوان میں فوت ہوئے۔ ❷

---

❶ حیات العلماء، ص: ۴۹۔

❷ تفصیل کے لیے دیکھیے: حیات العلماء، ص: ۴۳ تا ۵۲۔

Marfat.com

حضرت میاں سیّد نذیر حسین دہلوی
کے بائیس تلامذہ کرام

Marfat.com

Marfat.com

مولانا غلام رسول قلعوی

(وفات ۴۔ مارچ ۱۸۷۴ء)

صوبہ پنجاب میں لا تعداد علمائے دین پیدا ہوئے جنھوں نے تصنیف و تالیف اور وعظ و تدریس کی صورت میں بے حد خدمات سرانجام دیں۔ ان عظیم الشان حضرات میں ایک مشہور عالم مولانا غلام رسول تھے، جو ضلع گوجراں والا کے قصبہ قلعہ میہاں سنگھ میں قیام فرماتے تھے،اوران کے مسکن کی نسبت سے انھیں مولانا غلام رسول قلعوی کہا جاتا تھا۔ ان کا سال ولادت ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۳ء) تھا۔ ان کا خاندان کئی پشتوں سے علم و عمل میں خاص شہرت رکھتا تھا۔

مولانا غلام رسول قلعوی نے اپنے عہد کے متعدد اساتذہ سے اخذ علم کیا۔ ایک دور آیا کہ حضرت مولانا سید عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ سے ان کی ملاقات ہوئی۔ دونوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اور روحانیت کی دولت سے بہرۂ وافر عطا فرمایا تھا۔ اس بنا پر دونوں میں قلبی محبت اور گہرے روابط کا رشتہ قائم ہو گیا۔ دونوں بزرگ اولیاء اللہ تھے۔

دونوں نے باہم مشورہ کر کے علم حدیث پڑھنے کا عزم کیا۔ یہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے کی بات ہے۔ اس وقت دہلی میں حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ کی مسندِ تدریس حدیث آراستہ تھی۔ دونوں بزرگ امرتسر سے دہلی کو روانہ ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نہ پختہ سڑکیں تھیں، نہ موٹریں تھیں، نہ ریل وغیرہ کا کوئی تصور تھا۔ انھوں نے بذریعہ یکہ گرد و غبار والی کچی راہ پر امرتسر سے دہلی تک کا سفر آٹھ دن میں طے کیا اور حضرت میاں صاحب سے حدیث کی کتابیں پڑھنا شروع کیں۔ [1]

مولانا غلام رسول بہت بڑے واعظ تھے اور نہایت موثر وعظ کہتے تھے۔ دہلی تک ان کے مواعظ کی دھوم تھی۔ دہلی کے لوگوں کو ان کی آمد کی اطلاع ہوئی تو وعظ کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ ایک دن لال قلعے سے ایک مغل شہزادہ حضرت میاں سید نذیر حسین کی خدمت میں آیا اور عرض گزار ہوا کہ وعظ کے لیے مولانا غلام رسول صاحب کو قلعے بھیجا جائے۔ درخواست منظور ہوئی اور مولانا نے قلعہ معلّٰی جا کر وعظ کیا۔ اس وعظ میں خود حضرت میاں صاحب نے بھی شرکت فرمائی اور بہت سے لوگ مولانا کا وعظ سننے کے لیے لال قلعے

[1] حضرت مولانا سید عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ کے تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب ''فقہائے ہند'' جلد ۹۔

Marfat.com

گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بے حد موثر اور دل نشیں وعظ تھا۔

مولانا عبداللہ غزنوی اور مولانا غلام رسول قلعوی دہلی ہی میں تھے کہ ۱۶۔ رمضان ۱۲۷۳ھ (۱۱۔ مئی ۱۸۵۷ء) کو جنگ آزادی شروع ہوگئی، جسے انگریزوں نے فتح کے بعد ''غدر'' کے نام سے موسوم کیا۔ اس جنگ کا آغاز میرٹھ سے ہوا تھا۔ میرٹھ سے یہ جنگ دہلی پہنچی اور اس کے بعد بہت جلد پورے ملک میں پھیل گئی۔ اس زمانے میں دہلی شہر انتہائی بدامنی کی لپیٹ میں تھا اور چاروں طرف گولیاں چل رہی تھیں۔ حضرت میاں سید نذیر حسین کی جس مسجد میں مولانا عبداللہ غزنوی اور مولانا غلام رسول علم حدیث کے حصول کے لیے اقامت گزین تھے، وہاں مسلسل بندوق کی گولیاں آ کر گرتی تھیں اور ہیبت ناک آوازیں کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ مولانا عبداللہ غزنوی جو مولانا غلام رسول کو عبداللہ کہہ کر پکارا کرتے تھے، حیران ہو کر ان سے پوچھتے:

''عبداللہ یہ کیا ہو رہا ہے؟''

مولانا غلام رسول حدیث کی کتابیں پڑھ کر واپس اپنے گاؤں آئے تو انگریزی حکومت نے انھیں گرفتار کرلیا۔ گرفتاری کے بعد انھیں لاہور لا کمشنر منٹگمری کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ وہ انھیں دیکھ کر بڑا متاثر ہوا اور کرسی پر بٹھایا۔ کمشنر نے کہا ہم آپ کو ضمانت پر رہا کرنا چاہتے ہیں...... آپ کا کوئی ضامن ہے جو آپ کی ضمانت دے؟

فرمایا: ''ہاں''

پوچھا: ''کون؟''

آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا: ''میرا ضامن اللہ تعالیٰ ہے''

کمشنر نے کہا:

''اچھا! ہم آپ کو اسی کی ضمانت پر رہا کرتے ہیں۔''

اس سے کچھ عرصے بعد انھیں اپنے گاؤں (قلعہ میہاں سنگھ) میں نظر بند کر دیا گیا اور وعظ پر پابندی لگا دی گئی۔ کافی عرصہ نظر بند رہے۔ نہ کہیں جانے کی اجازت تھی، نہ وعظ و نصیحت کی۔ یعنی زبان بندی بھی تھی اور نظر بندی بھی۔ بعد ازاں حالات کچھ معمول پر آئے تو نظر بندی بھی ختم کر دی گئی اور وعظ کہنے کی اجازت بھی دے دی گئی۔

حضرت میاں سید نذیر حسین رحمہ اللہ نے ان کی سند پر لکھا تھا کہ مولوی عبداللہ المعروف غلام رسول نہایت ذہین وِطباع، بے حد نیک اور بلند اخلاق و عالی کردار شخص ہیں۔ یہ سند ماہ ربیع الثانی ۱۲۷۹ھ (اکتوبر ۱۸۶۲ء) کو تحریر فرمائی گئی۔ یعنی سال تعلیم سے چھے سال بعد اس کا اجرا ہوا۔

Marfat.com

اس سے نو دس سال بعد ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۲ء) کو انھوں نے حج بیت اللہ کیا۔

مولانا غلام رسول کا اپنے گاؤں میں سلسلۂ درس جاری تھا۔ بہت سے حضرات نے ان سے حصول علم کیا۔ طلبا کی تعداد ہمیشہ اوسطاً پچیس رہی۔ ان کے کھانے کا انتظام مولانا کے گھر میں ہوتا تھا۔ وہ مستجاب الدعوات بزرگ تھے۔ ان کی باتوں کے اثرات اور قبولیت دعا کے حیرت انگیز واقعات ان کے سوانح نگار نے بھی بیان کیے ہیں اور عام لوگوں سے بھی سننے میں آئے ہیں۔ ان بہت سے واقعات میں چند واقعات یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

☆...... ایک دن مولانا غلام رسول لاہور میں وعظ فرما رہے تھے۔ دو گورے عیسائی، چند سکھ اور ہندو بھی مجلس وعظ میں موجود تھے۔ وعظ میں انھوں نے سورہ مریم کی چند آیات تلاوت کیں اور حبشہ کے بادشاہ ہرقل کے دربار میں قریش مکہ کی سفارت کا ذکر کیا۔ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ سے ہرقل نے جس انداز سے بات کی تھی، اس کا تذکرہ فرمایا اور کلمۂ شہادت کے بارے میں بتایا تو ساتھ ہی اس طرح زور دار اور پرکشش آواز میں کلمہ شہادت پڑھا کہ سننے والوں میں ایک تہلکہ بپا ہو گیا اور ہندو، مسلمان، گورے عیسائی اور سکھ شدت تاثر سے تڑپ اٹھے۔ اس وعظ میں جتنے غیر مسلم موجود تھے، سب مسلمان ہو گئے۔

☆...... لاہور ہی کا واقعہ ہے کہ مولانا ممدوح فجر کی نماز سے فارغ ہو کر وضو کرنے کی جگہ پر بیٹھے تھے کہ ایک سکھ عورت ''واہگرو واہگر'' کہتی ہوئی وہاں سے گزر رہی تھی۔ مولانا نے فرمایا ''وحدہ وحدہ'' کہو۔ اس عورت کی زبان پر اسی وقت ''واہگرو واہگرو'' کی بجائے ''وحدہ وحدہ'' کے الفاظ جاری ہو گئے۔ اسی طرح کہتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی۔ گھر والوں نے اسے سمجھایا بھی اور مارا پیٹا بھی، مگر وہ باز نہ آئی اور مسلمان ہو گئی۔

☆...... ایک مرتبہ ضلع گجرات (پنجاب) میں کہیں سفر پر جا رہے تھے کہ ایک سکھ ادھر سے آیا اور اس نے ان سے پوچھا ''ڈنگا'' کا راستہ کون سا ہے؟ فرمایا: ''بھائی مجھے ڈنگوں کا راستہ تو آتا نہیں، البتہ سیدھوں کا معلوم ہے۔'' اس نے کہا ''سیدھوں ہی کا بتا دو...... فرمایا: ''سیدھوں کا راستہ ہے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔'' ادھر مولانا کی زبان سے یہ کلمہ نکلا اور ادھر سکھ کی زبان سے بھی جاری ہو گیا اور اس نے اسلام قبول کر لیا۔

''ڈنگا'' ایک گاؤں کا نام ہے، لیکن پنجابی میں ''ڈنگا'' ٹیڑھے کو کہتے ہیں جس کے مقابلے میں ''سیدھا'' بولا جاتا ہے۔

☆...... موضع کھبکی (ضلع گوجراں والا) کے حکیم نبی بخش کا بیان ہے کہ انھیں ایک گاؤں میں ایک مریض کے علاج کی غرض سے جانا پڑا جو مالخولیا میں مبتلا تھا اور اسے طبیب لا علاج قرار دے چکے تھے۔ حکیم

Marfat.com

صاحب مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واقعہ بیان کیا۔ مولانا نے فرمایا علاج کرو، اللہ تعالیٰ شافی ہے، مریض ان شاء اللہ شفایاب ہوگا۔ حکیم صاحب نے اس کا علاج شروع کیا اور اللہ کی مہربانی سے ایک ہی دن کے علاج سے آدھی بیماری ختم ہوگئی۔ دوسرے دن بالکل تندرست ہوگیا۔ حکیم صاحب بڑے بامذاق تھے اور مولانا ان کی باتوں سے خوش ہوتے تھے۔ وہ مولانا کے پاس آئے، مریض کی صحت یابی کی اطلاع دی اور عرض کیا کہ وہ مریض تو صحت یاب ہوگیا۔ اگر کوئی ایسا ہی مریض اور آ گیا تو پھر کیا ہوگا؟

فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تمھارے علاج سے ہمیشہ ایسے مریضوں کو صحت عطا فرمائے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس مرض کے جتنے بھی مریض ان کے پاس آئے، اللہ نے انھیں صحت عطا فرمائی۔

☆...... ضلع گورداس پور (مشرقی پنجاب) کے ایک ہندو مہنت کا نام کاہن داس تھا۔ وہ اپنے چند عقیدت مندوں کے ساتھ ایک مرتبہ موضع ''کالو والی'' آیا جو قلعہ میہاں سنگھ کے قریب ایک گاؤں ہے۔ مہنت نے لوگوں سے پوچھا کہ یہاں سے قلعہ میہاں سنگھ کتنے فاصلے پر ہے؟ بتایا گیا کہ تین کوس کے فاصلے پر ہے (موجودہ حساب کے مطابق پانچ کلومیٹر کہنا چاہیے) مہنت نے کہا سنا ہے وہاں مولوی غلام رسول رہتے ہیں جو بہت بڑے عالم اور صوفی ہیں۔ میرے دل میں اسلام کے بارے میں کچھ سوالات پیدا ہو رہے ہیں، میں ان سے ان سوالات کے جواب پوچھنا چاہتا ہوں۔

لوگوں نے بتایا کہ ان کے پاس کئی پنڈت اور غیر مسلم عالم بحث و مباحثہ کے لیے آئے اور مسلمان ہو گئے۔ آپ وہاں نہ جائیں۔ لیکن مہنت صاحب نے ان کی بات نہیں مانی اور وہ مولانا کے پاس پہنچ گئے۔ جاتے ہی سوال کیا ''اسلام کیا چیز ہے؟''

فرمایا: ''پہلی چیز ہے کلمہ پڑھنا''...... پھر کلمہ پڑھ کر سنایا...... کلمہ اس انداز سے پڑھا کہ سنتے ہی مہنت نے ان کے ساتھ پڑھنا شروع کر دیا اور مسلمان ہوگیا...... اس کے بعد دو سال وہ مولانا کی خدمت میں قلعہ میہاں سنگھ رہے اور ان سے اسلامی تعلیم حاصل کی۔

☆...... ضلع سیالکوٹ کے موضع ''بڈھا گورایہ'' کے نمبردار کا نام ''پیغم'' تھا۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا جو خوب صورت جوان اور خوش آواز تھا۔ وہ بیمار ہوگیا۔ متعدد طبیبوں سے علاج کرایا گیا، لیکن افاقہ نہ ہوا اور اطباء نے اسے لاعلاج قرار دے دیا۔ اتفاقاً ایک مرتبہ اس نواح میں مولانا غلام رسول تشریف لے گئے تو نمبردار اپنے بیمار بیٹے کو لے کر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مولانا دیکھنے کے لیے اس کے قریب ہوئے تو اس نے کہا ''السلام علیکم'' مولانا نے نام پوچھا تو اس نے جو نام بتایا، نمبردار نے کہا یہ میرے

Marfat.com

بیٹے کا نام نہیں ہے۔ مولانا سمجھ گئے کہ اسے جن کا عارضہ ہے۔ جن حاضر ہی تھا۔ مولانا نے اس سے پکڑنے کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا ''حضرت میں اپنے بادشاہ کا مامور ہوں۔ ایک دن ہمارا گزر ان کے کنوئیں پر سے ہوا۔ ہم وہاں ٹھہر گئے۔ یہ نوجوان ''گادھی'' پر بیٹھا بیلوں کے ذریعے کنوئیں سے پانی نکال کر اپنی کھیتی سیراب کر رہا تھا۔ سحری کا وقت تھا۔ اس نے نہایت خوش الحانی سے چند اشعار پڑھے۔ اس کی خوب صورت شکل اور دلکش آواز کی وجہ سے ہمارے بادشاہ کی بیٹی اس پر عاشق ہوگئی۔ بادشاہ کو غیرت آئی۔ اس نے مجھے حکم دیا کہ اسے پکڑ لو اور اس کا بدن سکھا سکھا کر اس کی جان نکالو۔ اس روز سے میں نے اسے پکڑ رکھا ہے۔''

مولانا نے پوچھا: ''تمھارا بادشاہ اس وقت کہاں ہے؟''

اس نے جواب دیا: ''اس وقت وہ کشمیر میں ہے۔''

مولانا نے اسے حاضر کیا اور فرمایا: ''اسے چھوڑ دو۔''

اس پر مولانا اور بادشاہ کے درمیان چند باتیں ہوئی۔ بالآخر وہ اسے چھوڑنے پر رضا مند ہوگیا اور چھوڑ دیا۔

☆......موضع دلاور چیمہ (ضلع گوجراں والا) کے ایک بڑے زمیندار اور دولت مند سکھ کا نوجوان بیٹا مولانا غلام رسول کا وعظ سن کر مسلمان ہوگیا اور اس کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ اس سکھ نے دلاور چیمہ اور علی پور میں اعلان کرا دیا کہ کوئی پنڈت یا گرنتھی قلعہ میہاں سنگھ والے مولوی صاحب سے بحث کر کے ان کو شکست دے دے اور میرے بیٹے کو دوبارہ سکھ مذہب قبول کرنے پر آمادہ کر دے، تو میں اسے کئی ایکڑ زمین اور پانچ سو نقد روپے دوں گا (پانچ سو روپے اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔ آج کل کے لاکھوں کے برابر)۔ علی پور کے ایک پنڈت نے یہ اعلان سنا تو لالچ میں آکر مولانا سے بحث کرنے پر تیار ہوگیا۔ سکھ زمیندار نے پانچ سو روپے نقد جمع کرا دیے، زمین کے لیے دستاویز لکھ دی اور پنڈت کو لے کر قلعہ میہاں سنگھ کو روانہ ہوگیا۔ اور بھی بہت سے لوگ جن میں غیر مسلم بھی تھے اور مسلمان بھی بحث سننے اور اس کا نتیجہ معلوم کرنے کی غرض سے ان کے ساتھ چل پڑے۔

یہ لوگ قلعہ میہاں سنگھ پہنچے تو مولانا غلام رسول اپنے بالاخانے میں تشریف فرما تھے اور ایک طالب علم کو شیخ سعدی کی کتاب بوستاں کا وہ سبق پڑھا رہے تھے، جس میں رسول اللہ ﷺ کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ پنڈت نے آتے ہی مولانا سے اسلام کے کسی حکم کے متعلق سوال کیا۔ فرمایا تشریف رکھیے۔ آپ کی تشریف آوری سے بہت خوشی ہوئی۔ طالب علم کے سبق سے فارغ ہو جاؤں تو آپ سے بات ہوگی۔ جو جی چاہے سوال کریں، میں ان شاء اللہ بڑی مسرت سے آپ کے ہر سوال کا جواب دوں گا۔ یہ الفاظ کہہ کر اس شعر کی

Marfat.com

طرف ذہن منتقل ہوا۔

دریں بحر جز مرد راعی نرفت
گم آں شد کہ دنبال داعی نرفت

یعنی اس دریا میں مرد کے سوا کوئی چرواہا نہیں گیا۔ گمراہ وہ ہوا، جو صحیح بات کی دعوت دینے والے کے پیچھے نہ گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شعر پڑھتے ہی مولانا کا اسلوبِ کلام بدل گیا اور مجلس کا انداز کچھ اور ہی رنگ اختیار کر گیا۔ ان کی گفتگو میں اللہ نے ایسی تاثیر بھر دی کہ سامعین یوں محسوس کر رہے تھے کہ در و دیوار سے کلمہ شہادت کی آوازیں آ رہی ہیں۔ پنڈت اور اس کے ساتھی بے جان تصویر بنے ہوئے مولانا کا منہ تک رہے تھے اور سب کی زبانیں گنگ تھیں۔

ناگہاں پنڈت نے شور مچانا شروع کر دیا: ''مجھے یہاں سے لے چلو، مجھے یہاں سے لے چلو۔'' کچھ لوگوں نے پنڈت کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کیا اور بڑی مشکل سے بالا خانے سے نیچے اتارا۔ پنڈت پر مدہوشی طاری تھی۔ جب وہ کچھ ہوش میں آیا تو اس سکھ زمیندار نے جو اسے لے کر گیا تھا اور اس کے ساتھیوں نے اس سے پوچھا کہ تم بڑی شان اور ادعا کے ساتھ وہاں گئے تھے، لیکن جاتے ہی خاموش ہو گئے اور کوئی بات کیے بغیر لوٹ آئے، اس کی کیا وجہ ہے؟

پنڈت نے جواب دیا: میں اسلام کے خلاف اکیس اعتراض سوچ کر گیا تھا جو میرے نزدیک بڑے مضبوط تھے اور مجھے یقین تھا کہ مولوی صاحب ان میں سے کسی اعتراض کا جواب نہیں دے سکیں گے، لیکن ان کے سامنے جاتے ہی تمام باتیں ذہن سے نکل گئیں۔ ان کی گفتگو میں کچھ ایسا جادو بھرا تھا کہ خود میرے دل میں ایک کہرام سا بپا ہو گیا۔ ان کے مذہب کی سچائی میرے دل میں پیوست ہونے لگی اور یوں محسوس ہونے لگا کہ میرا مذہب صحیح نہیں ہے، ان کا مذہب صحیح ہے۔ مولوی صاحب کی طرف سے ایک روشنی میری طرف بڑھ رہی تھی اور میرے مذہب کے آثار میرے دل سے مٹنا شروع ہو گئے تھے۔ چند ثانیے اور ان کے سامنے بیٹھا رہتا تو کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو جاتا۔

اس کے بعد بہت سے لوگوں نے اس پنڈت کو مولانا کی خدمت میں لے جانے اور ان سے بحث و مناظرے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ نہیں مانے اور صاف لفظوں میں کہا کہ میں ہرگز مولانا غلام رسول سے بحث یا مناظرہ نہیں کروں گا۔

☆......ایک دفعہ مولانا غلام رسول اپنی گھوڑی پر سوار کہیں جا رہے تھے۔ اثنائے راہ میں وہ کچھ پڑھ رہے تھے کہ پڑھتے پڑھتے ان پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ اللہ کے خوف سے کانپنے لگے اور حالت دگرگوں ہو

Marfat.com

گئی اور گھوڑی کی باگ ہاتھ سے گر گئی۔ ادھر سے ایک ہندو چودھری بھی گھوڑی پر آ رہا تھا۔ اس نے مولانا سے کہا: ''میاں گھوڑی والے گھوڑی کی باگ سنبھالو۔''

فرمایا: ''سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن نفس بڑا سرکش ہے، مانتا نہیں۔''

ہندو نے پوچھا: ''کیا کہتا ہے؟''

فرمایا: ''لا الہ الا اللہ کے معنیٰ کما حقہ نہیں مانتا''...... اس کے بعد اس لہجے سے کلمہ پڑھا کہ اس سے متاثر ہو کر ہندو چودھری بھی کلمہ پڑھنے لگا اور مسلمان ہو گیا۔ مولانا نے اس کا نام عبداللہ رکھا۔

مولانا ممدوح کے وعظ اور ان کی گفتگو سے بے شمار غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا، جس کا ذکر پہلی دفعہ ان کے بڑے بیٹے مولانا عبدالقادر نے اپنی کتاب ''سوانح عمری مولانا غلام رسول'' میں کیا۔ یہ کتاب مختلف اوقات میں چھپ چکی ہے۔

جس طرح حضرت مرحوم کی زندگی کے واقعات تعجب انگیز ہیں، اسی طرح ان کی وفات کا واقعہ بھی تعجب انگیز اور قابل رشک ہے۔ ان کی مسجد میں ایک حافظ صاحب رہتے تھے۔ وہ موذن بھی تھے اور گاؤں کے بچوں کو قرآن مجید بھی پڑھاتے تھے۔ ایک روز خلاف معمول مولانا مرحوم ان کے حجرے میں تشریف لے گئے۔ اس دن قمری حساب سے مولانا کی عمر کے ۶۳ سال پورے ہونے میں ایک دن باقی تھا۔ حافظ صاحب بے حد متقی اور پابند شرح بزرگ تھے۔ مولانا نے ان سے فرمایا کہ حافظ صاحب جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، مجھ پر اللہ کا یہ خاص فضل رہا ہے کہ دانستہ کسی ایسے عمل کا ارتکاب نہیں ہوا جو خلاف سنت ہو، اور کوئی ایسا عمل اللہ کی مہربانی سے ترک نہیں ہوا، جو مطابقِ سنت ہو۔ اب آخری سنت رہ گئی، اللہ تعالیٰ وہ بھی نصیب فرما دے تو زہے قسمت۔ جس وقت انھوں نے یہ بات فرمائی، انھیں کوئی تکلیف نہ تھی۔ بہت اچھی صحت تھی اور وہ ہشاش بشاش تھے۔ فرمایا: ''رسول اللہ ﷺ کی عمر مبارک پورے ۶۳ سال کی ہوئی ہے اور میری عمر کل ۶۳ سال کی ہو جائے گی۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ کو کیا منظور ہے۔

اتفاق سے دوسرے روز ساہی وال سے دو مہمان آئے۔ مولانا نے نماز ظہر سے قبل اپنے بڑے بیٹے مولوی عبدالقادر سے فرمایا کہ قطب الدین درویش کو ساتھ لے کر گھر جاؤ اور وہاں سے پسوانے کے لیے دانے (گندم) اٹھوا کر خراس پر لے جاؤ۔

اس کے بعد ظہر کی اذان ہوئی۔ مولانا نے خود جماعت کرائی۔ نماز کے بعد ساہی وال سے آنے والے دونوں مہمانوں کو اپنے ساتھ لے کر حجرے میں تشریف لے گئے۔ اس وقت بالکل تندرست تھے۔ کسی قسم کی کوئی بیماری یا نقاہت وغیرہ نہ تھی۔ مہمانوں کو تلقین کرنا شروع کی۔ پہلے مولوی فضل الدین صاحب کو کلمے کا

Marfat.com

ذکر کرایا۔ ایک بار کلمے کی ضرب دی۔ دوسری بار ضرب دے رہے تھے کہ روح مبارک جسد عنصری سے پرواز کر گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

یہ صورت حال بالکل اچانک پیش آئی تھی۔ مہمان اسے دیکھ کر گھبرا گئے۔ مولوی فضل الدین جلدی سے باہر آئے اور مولانا کے بھائی حکیم غلام محمد سے کہا کہ مولوی صاحب کو کچھ ہو گیا ہے۔ وہ طبیب حاذق تھے۔ انھوں نے دیکھتے ہی فرمایا: ''مولوی صاحب وفات پا گئے ہیں۔''

یہ خبر اسی وقت گاؤں میں اور پھر جلد ہی ارد گرد کے دیہات میں پہنچ گئی۔ تھوڑی دیر میں بے شمار لوگ جمع ہو گئے۔ متعدد طبیب بھی آ گئے۔ اطبا نے کہا کہ مولانا کی موت واقع نہیں ہوئی، انھیں سکتہ ہو گیا ہے، رمی لگائی جائے تو ٹھیک ہو جائیں گے۔ لیکن حکیم غلام محمد یہی کہتے رہے کہ مولوی صاحب وفات پا چکے ہیں۔

حکیم غلام محمد نے طبیبوں اور وہاں موجود لوگوں کو بتایا کہ ہمارے خاندان میں یہی معاملہ چلا آ رہا ہے۔ ان کے والد مولوی رحیم بخش بحالت تندرستی نماز پڑھتے ہوئے سجدے میں فوت ہوئے۔ دادا صاحب نظام الدین خادم نے حالت رکوع میں وفات پائی۔ یہی معاملہ مولوی صاحب کو پیش آنا تھا جو آ گیا۔

مولانا غلام رسول جمعرات کو ظہر اور عصر کے درمیان فوت ہوئے تھے۔ جمعۃ المبارک کے دن انھیں دفن کیا گیا۔ جنازے میں لاتعداد لوگ شامل تھے۔

اللہ اللہ! کس قدر پاک باز تھے وہ لوگ کہ مولانا غلام رسول کے والد مکرم مولوی رحیم بخش نے بارگاہِ الٰہی میں زمین پر پیشانی رکھ کر حالت سجدہ میں اللہ کے حضور حاضری دی۔ جد امجد حافظ نظام الدین خادم نے اللہ کے دربار میں جھکتے ہوئے رکوع کی حالت میں اپنی جان جاں آفرین کے سپرد کی، اور بیٹے اور پوتے (مولانا غلام رسول) نے کلمہ طیبہ پڑھتے اور پڑھاتے ہوئے وفات پائی، اور ان کی یہ دعا قبول اور تمنا پوری ہوئی کہ ٹھیک ۶۳ سال میں یعنی نبی ﷺ کی عمر کو پہنچ کر اس دنیائے فانی سے کوچ کیا۔

اللہ نے ان کو ہمیشہ اپنے سایۂ عاطفت میں رکھا اور جو دعا انھوں نے کی اسے شرف قبول حاصل ہوا۔ ان کی آخری دعا بھی قبول ہوئی اور یہ تمنا بر آئی کہ ٹھیک ۶۳ سال عمر پا کر فوت ہوئے۔ قمری حساب سے ان کی تاریخ وفات ۱۵۔ محرم ۱۲۹۱ ہجری اور عیسوی حساب سے ۴۔ مارچ ۱۸۷۴ء تھی۔ اللہ ان کو اور ان کے آبا و اجداد کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے اخلاف کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق سے نوازے۔ [1]

[1] میں نے ان کے حالات میں ''تذکرہ مولانا غلام رسول قلعوی'' کے نام سے مستقل کتاب لکھی ہے جو ۵۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ان کے، ان کے خاندان، ان کے شاگردوں اور ہم عصروں کے تفصیل سے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب فروری ۲۰۱۲ء کو ''مولانا غلام رسول ویلفیئر سوسائٹی قلعہ میہاں سنگھ ضلع گوجراں والا'' کی طرف سے شائع کی گئی۔

Marfat.com

مولانا بدیع الزمان لکھنوی

(وفات ۱۸۸۷ء)

مولانا بدیع الزمان بن مسیح الزمان بن نور محمد لکھنوی کا شمار اپنے عہد کے معروف فضلا میں ہوتا تھا۔ ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴ء) میں پیدا ہوئے اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی، مولانا محمد زمان سہارن پوری اور مولانا محمد عباس پشاوری سے تعلیم حاصل کی۔ سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی کے رفیق خاص مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے ہاتھ پر بیعت کی جنھیں معرکہ بالا کوٹ کے بعد جماعت مجاہدین کا امیر بنایا گیا تھا۔ ایک عرصے تک ایک بزرگ سید محمد قاسم کو بیری کی مصاحبت میں بھی رہے۔

پھر ایک وقت آیا کہ ارضِ حجاز کے لیے شدِ رحال کیا اور حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ وہاں شیخ محمد بن عبدالرحمٰن سہارن پوری سے اخذ علم حدیث کیا اور واپس ہندوستان آئے۔ یہاں حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے حلقۂ تلامذہ میں شمولیت کی اور ان سے علوم حدیث حاصل کیے اور سند و اجازہ سے مفتخر ہوئے۔

بعد ازاں عازمِ بھوپال ہوئے اور حضرت نواب صدیق حسن خاں کے دربارِ علم میں پہنچے۔ وہاں طویل مدت تک ان کا قیام رہا۔ پھر وہاں سے نکلے اور حیدر آباد (دکن) تشریف لے گئے۔

تقلید شخصی کے ناقد تھے اور اپنے اس موقف پر سختی سے قائم تھے۔ براہِ راست قرآن و حدیث پر عامل تھے اور لوگوں کو اسی کی تلقین کرتے تھے۔

مولانا بدیع الزمان کئی کتابوں کے مصنف اور مترجم تھے۔ ان کی تصانیف میں سبیکۃ الذھب الابریز، فتح المنان فی لغات القرآن، الایقان فی قصص القرآن، ریاض الجنۃ شامل ہیں۔ نیز ایک رسالہ استواء علی العرش اور ایک رسالہ علم غیب کی تحقیق کے موضوع پر لکھا۔ انھوں نے جامع ترمذی کا ترجمہ بھی کیا جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ مولانا بدیع الزمان لکھنوی نے ۱۳۰۴ھ (۱۸۸۷ء) میں وفات پائی۔ [1]

❀❀❀❀

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۸ صفحہ ۹۹،۱۰۰

Marfat.com

مولانا علیم الدین حسین نگرنہسوی عظیم آبادی

(وفات ۲۶۔ ستمبر ۱۸۸۸ء)

مولانا علیم الدین حسین نگرنہسوی کا نسب نامہ جو نزہۃ الخواطر میں لکھا ہے، یہ ہے: علیم الدین حسین بن تصدق حسین بن عبداللہ بن غلام بدر بن سلیم اللہ انصاری نگرنہسوی عظیم آبادی۔

مولانا علیم الدین ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) میں پیدا ہوئے۔ [1] ابتدا میں اپنے علاقے کے اساتذہ سے تحصیل علم کی۔ پھر لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں علوم حکمیہ مفتی نعمت اللہ لکھنوی سے پڑھے۔ بعد ازاں دہلی کا قصد کیا۔ دہلی میں فقہ اور اصول فقہ کی تحصیل مفتی صدر الدین آزردہ سے کی۔ کتب حدیث حضرت میاں سید نذیر حسین سے پڑھیں اور سند لی۔ علم طب کے لیے مولانا نعمت اللہ لکھنوی اور حکیم صحت الدولہ کی خدمت میں گئے اور ان سے بڑی محنت اور شوق سے اس فن کی کتابیں پڑھیں۔

تمام مروجہ علوم اور علم طب سے فارغ ہو کر دس سال کے بعد وطن واپس آئے۔ ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۶ء) میں حج بیت اللہ کیا۔

اپنے دور کے بہت بڑے عالم، مشہور مدرس اور ماہر طبیب تھے۔ عمر بھر درس و تدریس میں مشغول رہے۔ بے شمار لوگوں نے ان سے تحصیل علم کی۔ وسیع العلم، کثیر المطالعہ، شیریں مقال، صاحب تقویٰ، نہایت متدین، ایثار پیشہ اور سادہ مزاج عالم تھے۔ غیر اسلامی رسوم و رواج کے شدید مخالف تھے۔ قرآن و حدیث کے مبلغ اور بہت اچھے واعظ اور خطیب، لاتعداد لوگوں نے ان سے اخذِ فیض کیا اور ان کے قرب و تعلق کی وجہ سے راہِ حق پر قدم زن ہوئے۔ تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ مندرجہ ذیل کتابیں ان کی تصانیف میں شامل ہیں:

۱۔ قرآن مجید کے بعض اجزا کی تفسیر

۲۔ ایھاالناس بتوفیق احادیث اللباس

۳۔ فیصلة العلیم فی دفع البھتان العظیم

۴۔ اھتداء الاحناف فی اقتداء اصحاب الخلاف

---

[1] ''ارض بہار اور مسلمان'' میں عبدالرقیب حقانی نے ۱۲۶۱ھ لکھا ہے۔

Marfat.com

۵۔ فیضان العلیم علی قلب سلیم

٦۔ سلم الافلاك (علم ہیئت کے موضوع پر)

مولانا علیم الدین نگرنہسوی جمعۃ المبارک کے روز ۲۰۔ محرم ۱۳۰۶ھ (۲۶۔ ستمبر ۱۸۸۸ء) کو فوت ہوئے۔ ان کے ایک شاگرد مولوی عبدالغنی لعل پوری نے ان کی تاریخ اشعار میں بیان کی۔ ❶

❀❀❀❀

❶ ''نزہۃ الخواطر'' ج ۸ ص ۳۵۵۔ ''ارض بہار اور مسلمان'' ص ۴۲۰۔

Marfat.com

مولانا رحیم بخش لاہوری

(وفات ۲۹ جولائی ۱۸۹۶ء)

مولانا رحیم بخش دراصل ضلع فیروز پور کی تحصیل زیرہ کے ایک گاؤں ملوال کے رہنے والے تھے۔ والد کا نام عبداللہ تھا اور ککے زئی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے گاؤں میں سید احمد شہید کی جماعت کے ایک فرد مولوی حیدر علی نے سکونت اختیار کر لی تھی، جن سے مولانا رحیم بخش کے بڑے بھائی حافظ محمد اسماعیل نے بیعت کی۔ خود مولانا رحیم بخش نے ابتدائی تعلیم انہی مولوی حیدر علی سے پائی۔ ملوال کے پٹھان مولوی حیدر علی کا بے حد احترام کرتے تھے۔ مولانا رحیم بخش فرماتے ہیں:

> ”میں نے ایسا کوئی عالم متبع سنت و شریعت نہیں دیکھا...... اس خاک سار پر مولوی صاحب کے بڑے احسان ہیں۔ جو کچھ میں نے پڑھا ہے، اس میں ان کی مدد رہی ہے۔ افغانانِ ملوال سلطان خاں صاحب، سکندر خاں صاحب، جمال الدین خاں صاحب آپ (مولوی حیدر علی) کی بڑی عزت کرتے۔ اس عاجز کے برادر حافظ محمد اسماعیل صاحب بجائے خلیفہ کے تھے۔“ ❶

ابتدائی تعلیم کے بعد مولانا رحیم بخش گھر سے نکلے اور مختلف مشہور اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، جن میں مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مولانا عبدالحق خیر آبادی، حضرت حافظ محمد لکھوی اور حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی شامل ہیں۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد لاہور آئے اور پھر اسی شہر کو اپنا مسکن بنا لیا۔ یہیں شادی کی اور لاہوری کی نسبت سے شہرت پائی۔ چینیاں والی مسجد کے امام و خطیب مقرر کیے گئے۔ یہاں انھوں نے ”اسلام کی کتاب“ چودہ جلدوں میں مکمل کی۔ اسلام کی کتاب پہلا حصہ، اسلام کی کتاب دوسرا حصہ، اسلام کی کتاب تیسرا حصہ۔ اس طرح یہ سلسلہ چودہ حصوں تک چلتا ہے اور یہ بہت بڑی دینی خدمت ہے جو انھوں نے سرانجام دی۔ کسی زمانے میں یہ کتاب بہت پڑھی جاتی تھی۔ گھروں میں بچوں اور بچیوں کو باقاعدہ پڑھائی جاتی تھی۔ علما بھی اس سے استفادہ کرتے اور تقریروں میں اس کے حوالے دیتے تھے۔ اس کے بعض حصوں میں برصغیر کے مختلف حکمرانوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے اور ان کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ بعض ریاستوں کا ذکر بھی ہے۔

❶ سرگزشت مجاہدین تصنیف غلام رسول مہر ص ۵۴۶ بحوالہ اسلام کی دسویں کتاب مصنفہ مولانا رحیم بخش: ص ۲۵۲۔

Marfat.com

کتاب نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات ہے۔

مولانا رحیم بخش لاہوری خاموش طبع اور منکسر المزاج تھے۔ مسلکی جھگڑوں سے دامن کشاں رہتے اور اپنی بات مثبت انداز میں کرتے۔ صبح و شام مسجد میں قرآن و حدیث کا درس دیتے اور طلبا ان سے تعلیم حاصل کرتے۔ کسی شاگرد سے کوئی کام کراتے تو اس کا معاوضہ ادا کرتے۔ ۱۸۔ صفر ۱۳۱۴ھ (۲۹۔ جولائی ۱۸۹۶ء) کو فوت ہوئے۔ ان کی وفات سے کئی سال بعد اس مسجد کی خطابت و امامت کے منصب پر مولانا عبدالواحد غزنوی کو فائز کیا گیا۔

مولانا رحیم بخش کی نرینہ اولاد دو بیٹے تھے۔ مولانا عبدالرحیم اور مولوی عبدالرحمٰن۔ عبدالرحمٰن نے اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) میں ایف اے تک تعلیم پائی اور محکمہ انہار میں ضلع دار کے عہدے پر فائز ہوئے۔ عین عالمِ جوانی میں وفات پائی۔

مولانا عبدالرحیم ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے اور اپنے والد سے تعلیم حاصل کی۔ قرآن، حدیث اور تاریخ سے خاص طور پر شغف تھا۔ اپنے والد کی تصانیف اور دوسری دینی کتابوں کی اشاعت کے لیے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا، جس کا نام ''عبدالرحیم عبدالرحمٰن تاجران کتب لاہور'' رکھا۔ اس زمانے کے لاہور میں کتابوں کی اشاعت کا مرکز کشمیری بازار تھا۔ یہ ادارہ بھی کشمیری بازار میں قائم کیا گیا تھا۔

پھر ۱۹۱۴ء کے آخر یا ۱۹۱۵ء کے شروع میں مولانا عبدالرحیم سرحد پار مرکزِ مجاہدین میں چلے گئے اور وہاں ان کا عرفی نام محمد بشیر رکھا گیا۔ اصل نام عبدالرحیم لوگوں کے ذہن سے نکل گیا اور وہ مولانا محمد بشیر کے نام سے مشہور ہوئے۔ جماعتِ مجاہدین میں انھوں نے بہت کام کیا اور ان کی شہرت دور دور تک پہنچی۔ اس مردِ مجاہد کو ایک شخص عبدالحلیم نے اواخر اکتوبر ۱۹۳۴ء کی رات کو مرکزِ مجاہدین چمرکنڈ میں شہید کر دیا۔

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا احمد سورتی

(وفات ۱۰۔ جنوری ۱۸۹۸ء)

حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے شاگردانِ ذی منزلت کی کل تعداد کو قلم کے دائرے میں لانا اور پھر کاغذ پر ان سب کے حسنِ اعمال کے نقش ونگار بیان کرنا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں۔

سرسید احمد خاں مرحوم اپنی مشہور تصنیف ''آثار الصنادید'' میں میاں صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''زبدۂ اہل کمال، اسوۂ ارباب فضل و افضال مولوی نذیر حسین صاحب بہت صاحبِ استعداد ہیں، خصوصاً فقہ میں ایسی استعدادِ کامل بہم پہنچائی ہے کہ اپنے نظائر وقرائن سے گویا سبقت لے گئے ہیں۔ روایت کشی میں آج بے نظیر ہیں۔''

ان کے تلامذہ کی تعداد سیکڑوں نہیں، ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ ایک بزرگ حافظ محمد حسین کے مطابق ''میاں صاحب کے شاگردوں کی تعداد کم سے کم بیس ہزار ہوگی اور معتقدین کی تعداد ۸۰ لاکھ تک بیان کی جاتی ہے۔''

مولانا تلطف حسین عظیم آبادی پچیس چھبیس برس سفر وحضر میں حضرت میاں صاحب کی خدمت میں رہے۔ ان کے بقول ''ایک رجسٹر میں تین برس تک ان کے شاگردوں کے نام لکھنے کا انتظام کیا گیا۔ اس رجسٹر میں بارہ ہزار طلبا کے نام درج ہوئے تھے۔'' اس کے علاوہ اور رجسٹر بھی تھے، جن میں طلبا کے نام درج تھے۔

ان کے بہت سے تلامذہ کے مفصل حالات ملتے ہیں اور بے شمار کے نہایت مختصر۔ لیکن بہت بڑی اکثریت کے حالات بالکل نہیں ملتے۔ جن حضرات کے بہت مختصر حالات کا ہمیں علم ہو سکا، ان میں ایک بزرگ مولانا احمد بن محمد بن ہاشم لونتی سامرودی ہیں جو علوم عربیہ کے ماہرین میں سے تھے۔ وہ ۹۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۵ھ یکم مئی ۱۸۷۹ء) کو پیدا ہوئے۔ تحصیل علم اپنے والد مکرم مولانا محمد بن ہاشم سورتی (متوفی ۲۳۔ شعبان ۱۳۱۵ھ) سے کی جو حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد تھے۔ [1] والد گرامی سے تحصیل علم کے بعد دہلی کے لیے شدِ رحال کیا اور حضرت میاں سید نذیر حسین کے حلقۂ درس میں پہنچے۔ ان سے کتب حدیث پڑھیں اور سندِ اجازہ سے مشرف ہوئے۔ بعد ازاں اپنے مسکن واپس تشریف لائے اور درس و تدریس

[1] ان کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب ''گلستانِ حدیث'' ص: ۹۹، ۱۰۰۔

Marfat.com

کی مسند بچھائی۔ پھر تمام عمر اسی عمل خیر میں بسر کر دی۔ بہت سے علما وطلبا نے ان سے کسبِ علم کیا اور پھر آگے انھوں نے لاتعداد لوگوں کو تعلیم دی۔

مولانا احمد سورتی ہفتے کے روز ۱۷۔ شعبان ۱۳۱۵ھ (۱۰۔ جنوری ۱۸۹۸ء) کو اس دنیاے فانی سے رخصت ہوئے اور عالم آخرت کی راہ لی۔ ❶

❀❀❀❀

❶ نزہتہ الخواطر: ج ۸ص ۴۴، (طبع ملتان ۱۹۹۳ء)

Marfat.com

مولانا عبدالباری نگرنہسوی عظیم آبادی

(وفات ۱۹۰۰ء)

ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے: عبدالباری بن تلطف حسین بن روشن علی بن حسین علی بن لطف علی بن حبیب اللہ بن علی اکبر بن کمال الدین بکری نگرنہسوی عظیم آبادی۔ ضلع پٹنہ (صوبہ بہار ہندوستان) کے قریہ نگر نہسہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم عظیم آباد (پٹنہ) میں حاصل کی۔ پھر لکھنؤ گئے۔ اس وقت لکھنؤ میں مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی کی مسندِ درس آراستہ تھی، اس میں شامل ہوئے۔ نہایت ذکی، فطین، تیز ذہن اور سریع الحفظ تھے۔ مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی لکھنوی سے علومِ حکمیہ پڑھے۔ ان علوم کی تحصیل میں اپنے تمام اقران سے زود فہم تھے۔

لکھنؤ ہی میں حکیم عبدالعلی بن ابراہیم لکھنوی سے فنِ طب کی تعلیم حاصل کی۔

ان علوم سے فارغ ہو کر دہلی کو روانہ ہوئے۔ وہاں حضرت میاں سید نذیر حسین کے بابِ علم پر حاضری دی۔ ان سے کتبِ حدیث پڑھیں اور سند لی۔

بعد ازاں اپنے وطن تشریف لائے اور عظیم آباد (پٹنہ) میں مطب جاری کیا۔ اس نواح کے مشہور طبیب تھے۔ نمازِ مغرب کے بعد روزانہ قرآنِ مجید کا درس دیتے۔ لوگوں کو وعظ ونصیحت کرتے اور ان کی اصلاح کے لیے کوشاں رہتے۔

۱۳۱۸ھ (۱۹۰۰ء) میں مرضِ استسقاء سے وفات پائی۔ [1]

❀❀❀❀

[1] "نزہۃ الخواطر" ج ۸، ص: ۲۲۸، ۲۲۹، "ارض بہار اور مسلمان" ص: ۴۳۳۔

Marfat.com

حکیم عبدالمجید دہلوی

(وفات ۳۰۔ جون ۱۹۰۱ء)

حکیم عبدالمجید بن محمود بن صادق بن شریف شریفی دہلوی۔

حکیم عبدالمجید علومِ دینیہ میں مرتبۂ فضیلت پر فائز تھے۔ حکیم اجمل خاں کے بڑے بھائی تھے۔ عربی اور فارسی کے جید علماء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ احادیث کی تمام کتابیں حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی سے پڑھیں۔ علم طب کی تکمیل اپنے والدِ مکرم حکیم محمود سے کی اور ہندوستان کے مایہ ناز طبیب گردانے گئے۔ وہ عالم قرآن و حدیث بھی تھے اور ماہرِ فنِ طب بھی۔ نہایت ذہین اور ذکی تھے۔ قوتِ ادراک بے حد تیز تھی۔ ۱۳۰۶ھ (۱۸۸۹ء) میں انھوں نے دہلی میں مدرسہ طبیہ جاری کیا اور اس میں علم طب کی تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اس فن میں مہارت کی وجہ سے انگریزی حکومت کی طرف سے انھیں حاذق الملک کا خطاب عطا کیا گیا۔ ان کے قائم کردہ مدرسہ طبیہ میں بے شمار لوگوں نے علم طب حاصل کیا۔ اس مدرسے کے اساتذہ میں ان کے چھوٹے بھائی حکیم اجمل خاں بھی شامل تھے۔

حکیم عبدالمجید دہلوی علما وطلبا کو فن طب کے ساتھ دینی علوم کی تعلیم بھی دیتے تھے اور وہ اپنے دور کے ہندوستان کی رفیع الصدر شخصیت تھے۔

انھوں نے ۲۳۔ ربیع الاول ۱۳۱۹ھ (۳۰۔ جون ۱۹۰۱ء) کو وفات پائی۔ [1]

❀❀❀❀

---

[1] ''نزہۃ الخواطر'' ج ۸، (مطبوعہ ملتان) ص ۳۳۰۔

Marfat.com

سید مصطفیٰ ٹونکی

(وفات ۱۵۔ نومبر ۱۹۰۲ء)

سید صاحب موصوف کا نسب نامہ یہ ہے: سید مصطفیٰ بن یوسف بن یعقوب بن ابراہیم بن عرفان حسنی بریلوی ثم ٹونکی۔ بہت بڑے عالم، شرف النفس، صاحبِ عفت، پیکر ولایت وجلالت تھے۔ ٹونک میں ولادت ہوئی، وہیں تربیت پائی۔ پہلے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر تھوڑا عرصہ مولوی عبدالغفور نحوی ٹونکی سے عربی پڑھتے رہے۔

بعد ازاں تحصیل علم کے لیے گھر سے نکلے اور مختلف مقامات کے چکر لگائے۔ مولانا سید امیر احمد سہسوانی اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھنوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے حضور زانوے شاگردی تہ کیے۔ بعد ازاں حضرت میاں سید نذیر حسین کے حلقۂ درس کا رخ کیا۔ ان سے اخذِ علمِ حدیث اور مستحقِ سند واجازہ قرار پائے۔

تحصیل علم کے بعد واپس وطن آئے اور مسندِ درس بچھائی۔ کافی عرصہ طلبا کو مستفید فرماتے رہے۔ پھر حرمین شریفین کو روانہ ہوئے اور حج بیت اللہ کیا۔ ایک سال وہاں قیام رہا۔ کشادہ دل، سخی اور فراخ دست تھے۔ اللہ کے خوف سے اکثر ان پر گریہ طاری رہتا۔ سادہ زندگی بسر کرتے۔ اس دور کے فقہا وصوفیا کے لباس نہ پہنتے۔ عام لوگوں کا سا لباس زیب تن کرتے۔ عقیدہ وعمل کے اعتبار سے فرمانِ پیغمبر ﷺ کا صحیح ترین نمونہ تھے۔

مولانا محمد نعیم بن مولانا عبدالحئ لکھنوی متصلب قسم کے حنفی تھے۔ وہ اپنے اس تصلب اور تشدد کے باوجود ان کا نہایت احترام کرتے اور ان کے ورع وتقویٰ کی بنا پر انھیں بے حد اکرام کی نگاہ سے دیکھتے۔

بلاشبہ وہ عمل وکردار اور اتقا ونجابت میں منفرد مقام رکھتے تھے اور عبادات ومعاملات میں یگانہ حیثیت کے مالک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت کا جذبہ راسخ کر دیا تھا اور ہر شخص انھیں مستحقِ تکریم گردانتا تھا۔ نیکی اور حسنات کے کتنے ہی خصائل ان کی ذات میں اللہ نے جمع فرما دیے تھے۔

عبادت الٰہی کے ساتھ ساتھ تواضع، انکسار، لوگوں سے حسنِ سلوک ان کا ہر وقت کا معمول تھا۔ انھیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رشد وہدایت کے تمام اوصاف بارگاہِ خداوندی سے انھیں بخش دیے گئے ہیں۔ ہر شخص کو شفقت کی نگاہ سے دیکھتے اور اس کی بہتری ان کے پیش نگاہ رہتی۔

اس سراپا علم وعمل نے بدھ کے روز ۲۵۔ شعبان ۱۳۲۰ھ (۱۵۔ نومبر ۱۹۰۲ء) کو وفات پائی۔ [1]

[1] نزہۃ الخواطر: ج ۸ ص ۵۰۳، ۵۰۴۔

Marfat.com

حکیم نصیر الحق عظیم آبادی

(وفات ۱۹۱۰ء)

حکیم نصیر الحق عظیم آبادی کے والد گرامی کا نام محمد حسین عظیم آبادی تھا۔ حکیم صاحب عظیم آباد (پٹنہ) میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ یوں تو تمام علوم میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے لیکن علم طب میں بالخصوص ان کی مہارت مسلمہ تھی۔ علوم دینیہ حضرت حافظ عبداللہ غازی پوری، قاضی بشیر الدین عثمانی قنوجی اور مولانا عبدالحی لکھنوی سے حاصل کیے۔ بعد ازاں دہلی کا سفر کیا اور حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ سے اکتسابِ علمِ حدیث کیا۔ وہیں حکیم عبدالمجید دہلوی سے فنِ طب کی تکمیل کی۔ اب یہ پورے عالمِ دین بھی تھے اور مشہور طبیب بھی۔

دہلی سے اپنے وطن کو مراجعت فرمائی اور لوگوں کے علاج معالجہ میں مشغول ہوئے۔ اس باب میں بہت جلد انھیں مرجع خلائق کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ میں شفا رکھی تھی۔ ماہر نبّاض تھے اور علاج بھی صحیح ہوتا تھا۔

انھوں نے ۱۳۲۸ھ (۱۹۱۰ء) میں وفات پائی۔

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا عبدالرحمٰن بڈھیمالوی

(وفات ۱۹۱۸ء)

مشرقی پنجاب کے ضلع فیروز پور کی تحصیل مکتسر میں ایک چھوٹے سے گاؤں کا نام بڈھیمال تھا۔ یہ گاؤں علماء کا مرکز اور صلحاء کا مسکن تھا۔ پنجاب کے تدریسی حلقوں میں یوں تو قیام پاکستان سے پہلے بھی یہاں کے اہل علم کسی حد تک متعارف تھے، لیکن قیام پاکستان کے بعد تو ان کا حلقۂ تعارف بہت بڑھ گیا اور بے شمار مدارس وجامعات میں یہ لوگ بہ طور مدرس خدمات سرانجام دینے لگے۔ اس سلسلے میں مرحومین میں سے حافظ عبداللہ بڈھیمالوی، حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی، مولانا رضی اللہ بڈھیمالوی، قاضی محمد اسلم سیف فیروز پوری، مولانا محمد علی شیخ الحدیث جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن، حافظ محمد بن حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اور موجودین کی فہرست میں مولانا عیش محمد، حافظ عبدالعزیز علوی شیخ الحدیث جامعہ سلفیہ فیصل آباد، مولانا عبدالعلیم مدرس دارالقرآن والحدیث فیصل آباد، قاری محمود الحسن بن حافظ عبداللہ بڈھیمالوی شامل ہیں۔ مدارس وجامعات کے علاوہ سکولوں اور کالجوں میں بھی آبائی طور پر اس گاؤں سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگ خدمتِ تدریس میں مشغول ہیں۔ مولانا عبدالرحمٰن بڈھیمالوی اسی گاؤں کے مکین تھے جن کی وفات پر تقریباً ایک صدی کا طویل عرصہ بیت چکا ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اس گاؤں کو آباد کرنے والے شخص کا نام میاں شمس الدین تھا جو اعوان برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا شجرۂ نسب اعوانوں کے بزرگ قطب شاہ سے گزرتا ہوا محمد بن حنفیہ کی وساطت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ اس گاؤں کے آباد ہونے سے پیشتر یہاں ایک پرانا درخت تھا۔ جس کا نام ''مال'' تھا۔ اس کی طوالتِ عمر کی بنا پر اسے ''بوڑھی مال'' کہا جانے لگا۔ پھر یہاں آبادی ہوئی اور اس جگہ نے گاؤں کی شکل اختیار کی تو اس پرانے درخت کے نام سے اس کا نام ''بڈھیمال'' پڑ گیا۔

یہ بارانی علاقہ تھا اور چاروں طرف ریت کے ٹیلے دکھائی دیتے تھے۔ فصلوں کا دارومدار برسات پر تھا۔ برسات ہوتی تو گندم وغیرہ بوئی جاتی تھی۔ یہاں کے لوگ سال میں تین چار مہینے کام کرتے تھے اور وہ مہینے تھے فصل کی بوائی اور کٹائی کے۔ فصل یہاں بالعموم اچھی ہوتی تھی یعنی گھر بیٹھے من وسلویٰ وافر مقدار میں مل جاتا تھا اور لوگ خوش حال تھے۔ نیک اور شائقین علم بھی۔

Marfat.com

ضلع فیروز پور ہی میں ''لکھوکے'' گاؤں تھا جس میں بہت سے جلیل القدر علما پیدا ہوئے، جنھوں نے درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور تقویٰ وصالحیت میں بڑی شہرت پائی اور لا تعداد لوگ ان کے حلقہ تلمذ وارادت میں آئے۔ بڈھیمال کے بھی متعدد افراد نے ان سے اخذِ فیض کیا۔

بڈھیمال گاؤں کے بانی میاں شمس الدین کے تین بیٹے تھے اور وہ تھے میاں محمود، میاں حمید اور میاں فرید۔ اس سے آگے میاں فرید کے دو بیٹے تھے۔ ایک امام الدین جولا ولد فوت ہوئے اور دوسرے فانی نظام الدین۔

اب آگے چلیے۔ نظام الدین کے بھی دو بیٹے تھے، ایک یہی زیب عنوان مولانا عبدالرحمٰن بڈھیمالوی اور دوسرے تھے محمد سلیمان۔

مولانا عبدالرحمٰن ۱۸۸۱ء میں بمقام بڈھیمال پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی، لیکن کس استاذ سے کیا پڑھا؟ اس کا کچھ پتا نہیں، جہاں اس وقت مولانا عبدالرحمٰن لکھوی بن حافظ محمد لکھوی کا سلسلۂ تدریس جاری تھا۔ وہاں انھوں نے تعلیم تو بے شک حاصل کی، لیکن کس عمر میں لکھوکے پہنچے، کتنا عرصہ وہاں رہے اور کس استاذ سے کون کون سی کتابیں پڑھیں؟ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

لکھوکے سے واپس گھر آئے تو دہلی جا کر مزید تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ دل میں ابھرا۔ والد سے اجازت مانگی تو انھوں نے دہلی جانے کی اجازت نہیں دی، اس لیے کہ یہ ان کے اکیلے بیٹے تھے اور بیٹے کی جدائی باپ کے لیے بہت مشکل تھی۔ اب انھوں نے اپنے دوست اور ساتھی (حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کے والد) مولانا کریم بخش سے بات کی اور بغیر کسی کو بتائے دہلی جا پہنچے۔ [1]

کہا جاتا ہے کہ دہلی جا کر انھوں نے حضرت میاں سید نذیر حسین کے دائرۂ شاگردی میں شرکت کی اور حسن سعید کے بقول ان سے ''خوب استفادہ کیا۔'' دہلی سے تعلیم حاصل کر کے اپنے گاؤں بڈھیمال واپس آئے تو وہاں انھوں نے تین کام شروع کیے۔

۱۔ مدرسہ رحمانیہ کے نام سے مدرسہ جاری کر کے درس وتدریس کا آغاز کیا۔ اس مدرسے میں جو حضرات ان کے حلقۂ شاگردی میں شامل ہوئے، ان میں مقامی طلبا بھی تھے اور بیرونی بھی۔ مقامی طلبا میں مولانا عبدالغنی، مولانا قدرت اللہ اور مولانا عطاء اللہ کے اسمائے گرامی کا ذکر کیا جاتا ہے۔ حافظ عبداللہ اس

[1] مولانا کریم بخش اپنے دور کے بہت اچھے مدرس اور عالم تھے۔ کچھ عرصہ ارائیاں والا (ریاست فرید کوٹ) میں طلباء کو پڑھاتے بھی رہے تھے۔ حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کے والد تھے۔ لیکن ان کے حالات بھی پردۂ اخفا میں ہیں۔ ان کے اساتذہ کا بھی کوئی علم نہیں۔

Marfat.com

وقت بہت کم عمر تھے، لیکن وہ بھی ان سے قاعدہ سپارہ پڑھتے رہے۔ بیرونی طلبا میں ملتان کے مولانا عبدالعزیز ملک کا نام آتا ہے، جن کے حالات اس کتاب (بوستان حدیث) میں بیان کیے گئے ہیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے اپنے شہر ملتان میں درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری کیا اور مناظرات وخطابت میں بھی شہرت پائی۔ چند کتابیں بھی تصنیف کیں۔ موضع ڈھانی ریاست بیکا پیر کے مولانا عبداللہ صاحب کا شمار بھی مولانا عبدالرحمٰن کے شاگردوں کی جماعت میں کیا جاتا ہے۔ یہ مولانا عبداللہ امجد کے تایا اور دارالعلوم تقویۃ الاسلام لاہور کے سیکرٹری محمد حسن سعید کے نانا تھے۔ انھوں نے صرف ۳۳ برس عمر پائی۔ اپنے علاقے کے ممتاز عالم تھے۔ مولانا عبداللہ امجد کا نام انھی کے نام پر عبداللہ رکھا گیا تھا۔ بڈھیمال میں ان کے کئی قریبی رشتے دار اقامت گزیں تھے۔ ممکن ہے مندرجہ بالا مقامی اور بیرونی طلبا کے علاوہ بھی مولانا عبدالرحمٰن بڈھیمالوی سے کچھ لوگوں نے استفادہ کیا ہو۔ بیرونی طلبا کا کھانا مولانا ممدوح کے گھر میں تیار کیا جاتا تھا۔

۲۔ مولانا عبدالرحمٰن اپنے گاؤں میں امامت وخطابت کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے۔

۳۔ ان کے والد نظام الدین گاؤں کے نمبردار تھے، لیکن وہ بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو گئے تھے، اس لیے انھوں نے نمبرداری کا سلسلہ اپنے اس عالم بیٹے مولانا عبدالرحمٰن کے سپرد کر دیا تھا۔

مولانا عبدالرحمٰن بڈھیمالوی خوب صورت اور صحت مند جوان تھے۔ وہ خوش لباس اور خوش گفتار عالم تھے اور شیریں زبان اور موثر طرزِ کلام کے مالک۔ ان کی تقریر سے لوگ بے حد متاثر ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ بارات کے ساتھ کسی گاؤں میں گئے۔ گاؤں میں سکھوں کی اکثریت تھی۔ مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی اور چھوٹی سی مسجد تھی۔ جمعے کا دن تھا اور مسجد میں جمعہ نہیں پڑھا جا سکتا تھا۔ مسجد کے باہر درختوں کے سائے میں جمعہ پڑھنے کا انتظام کیا گیا۔ مولانا عبدالرحمٰن نے خطبہ شروع کیا تو سکھ بھی خاصی تعداد میں وعظ سننے کے لیے آ گئے۔

ایک تو مولانا کی شکل وشباہت اور جوانی نے ان سکھ حاضرین کو متاثر کیا، دوسرے اس دور کے مطابق ان کے لباس کا ان پر اثر پڑا۔ پھر جس انداز سے انھوں نے وعظ کیا اور اس ماحول کی روشنی میں قرآن وحدیث کے معاشرتی اصول بیان کیے، اس پر تو وہ عش عش کر اُٹھے۔ علاوہ ازیں چوں کہ وہ اپنے گاؤں کے نمبردار تھے اور اچھی خاصی زمینوں کے مالک تھے، اس لیے سکھ ان کی باتیں سن کر اور ان سے مل کر نہایت خوش ہوئے۔

مولانا عبدالرحمٰن کی شادی ان کے ننھیال (کوٹ کپورہ) میں ہوئی تھی۔ صرف ایک بیٹی پیدا ہوئی، وہ بھی صغرسنی میں وفات پا گئی تھی۔ ان کے والد نظام الدین نے دوسری شادی کرنے کے لیے کہا، لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ ان کی والدہ چوں کہ بہت عرصہ پہلے وفات پا چکی تھیں۔ اس لیے انھوں نے اصرار کر کے والد کو

Marfat.com

دوسری شادی پر آمادہ کرلیا اور انھوں نے شادی کرلی۔ جس سے ایک بیٹا محمد سلیمان پیدا ہوا۔ محمد سلیمان نمبردار بھی خوب صورت طویل قامت جوان تھے۔ گولا پھینکنے میں ریاست فرید کوٹ اور ضلع فیروز پور میں کوئی ان کا مدمقابل نہ تھا۔ خوش اخلاق اور ملنسار شخص۔ اپنے بڑے بھائی مولانا عبدالرحمٰن سے بتیس تینتیس سال چھوٹے۔ علاقے میں اثر تھا۔ تقسیم ملک کے زمانے میں اپنے رشتے داروں کے ساتھ چک نمبر ۳۶ نزد ستیانہ بنگلہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہیں وفات پائی۔

یورپ کی پہلی جنگ عظیم جولائی ۱۹۱۴ء میں شروع اور اکتوبر ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی تھی۔ اس جنگ میں انگریزی حکومت نے اپنے محکوم ملک ہندوستان میں جبری بھرتی کا حکم جاری کردیا تھا اور ہر ضلعے کا ڈپٹی کمشنر انگریز ہوتا تھا اور وہ گاؤں کے نمبردار کو حکم دیتا تھا کہ جنگ میں جانے اور دشمن سے لڑنے کے لیے اپنے گاؤں سے ایک یا دو جوانوں کو بھرتی کرایا جائے۔ ضلع فیروز پور کا انگریز ڈپٹی کمشنر بڑا سخت مزاج تھا، وہ بھی دیہات سے نمبرداروں کو بلا کر یہی حکم دیتا تھا۔ مولانا عبدالرحمٰن اپنے گاؤں بڈھیمال کے نمبردار تھے، انہیں بھی بلایا گیا۔ وہ ڈپٹی کمشنر کے سامنے پیش ہوئے تو انھیں دیکھ کر وہ بڑا متاثر ہوا، عزت سے بٹھایا اور نرم الفاظ میں کہا مولانا آپ بھی کوئی آدمی بھرتی کرائیں۔ مولانا نے جواب دیا: میں اپنے بوڑھے باپ کا ایک ہی بیٹا ہوں اور حاضر ہوں، مجھے بھرتی کرلیجیے۔ ڈپٹی کمشنر خاموش ہوگیا اور بڑے احترام سے مولانا کو رخصت کیا۔

۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہوئی تو اس کے بعد تقریباً ساری دنیا میں طاعون کی بیماری پھیل گئی اور لاکھوں آدمی مرگئے۔ ہندوستان بھی اس بیماری کی زد میں تھا۔ مولانا عبدالرحمٰن بڈھیمالوی نے اسی بیماری سے ۱۹۱۸ء میں انتقال کیا۔ وہ ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔ کل ۳۷ برس عمر پائی اور عین عالم جوانی میں سفر آخرت اختیار کیا۔

مولانا عبدالرحمٰن بڈھیمالوی کے ایک دوست اور قریبی رشتے دار میاں قادر بخش مرحوم تھے۔ جو حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی کے والد اور حافظ عبدالعزیز علوی شیخ الحدیث جامعہ سلفیہ کے دادا تھے۔ وہ پنجابی کے شاعر تھے اور پنجابی نظم میں انھوں نے مولانا عبدالرحمٰن کے حالات لکھے تھے جو کتابی شکل میں قیام پاکستان سے بہت عرصہ پہلے شائع ہوئے تھے۔ میں نے وہ کتاب پڑھی تھی، لیکن اب نایاب ہے میاں قادر بخش کی وفات قیام پاکستان کے بعد ہوئی۔ بڈھیمال کے بہت سے لوگ جنھوں نے مولانا عبدالرحمٰن کو دیکھا اور ان سے علم حاصل کیا، چک نمبر ۳۶ آئے۔ ان میں علمائے دین بھی تھے جو ان کے قریبی رشتے دار تھے، لیکن کسی نے اتنے بڑے عالم کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ یہ چند سطور جو قارئین کے علم میں آئیں، ان میں سے بعض باتیں میں مختلف لوگوں سے سن چکا تھا اور بعض برادر عزیز حسن سعید سیکرٹری دارالعلوم تقویۃ الاسلام لاہور نے لکھ کر دیں۔ میں نے مولانا کے بارے میں کسی صاحب سے سنا تھا کہ انھوں نے دہلی جا کر حضرت سید میاں

Marfat.com

نذیر حسین رحمہ اللہ سے استفادہ کیا تھا اور حسن سعید نے بھی لکھا ہے کہ انھوں نے میاں صاحب سے ''خوب استفادہ کیا۔''

بات یہ ہے کہ حضرت میاں صاحب نے ۱۳۔اکتوبر ۱۹۰۲ء کو رحلت فرمائی اور مولانا عبدالرحمٰن بڈھیمالوی کی ولادت ۱۸۸۱ء میں ہوئی۔ اس حساب سے حضرت میاں صاحب کی وفات کے وقت ان کی عمر اکیس برس کی تھی۔ وہ اپنے گاؤں میں بھی پڑھتے رہے، لکھوکے میں بھی تعلیم حاصل کی۔ اگر ۱۷ برس کی عمر میں بھی وہ دہلی گئے ہوں تو یہ تقریباً ۱۸۹۸ء بنتا ہے۔ حضرت میاں صاحب کی وفات سے چار ساڑھے چار سال قبل۔ میاں صاحب وفات سے کئی سال پہلے مرض ضیق النفس میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اس بیماری کی وجہ سے ان کے لیے مسلسل پڑھانا مشکل ہو گیا تھا۔ جسمانی کمزوری کافی بڑھ گئی تھی۔ ثقل سماع کا عارضہ بھی لاحق ہو گیا تھا۔ لیکن کتبِ حدیث پڑھانے کی کوشش بہرحال کرتے اور اس میں سکون محسوس فرماتے تھے۔ حضرت میاں صاحب کی خدمت میں جب مولانا عبدالرحمٰن بڈھیمالوی حاضر ہوئے تو یہ حضرت کی زندگی کا آخری دور تھا۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں انھوں نے حضرت میاں صاحب سے کچھ سننے کا شرف تو شاید حاصل کیا ہو، لیکن ''خوب استفادہ کیا'' والی بات قرین صحت نہیں۔

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ حضرت میاں صاحب کی سوانح عمری "الحیات والممات" (مصنفہ مولانا فضل حسن بہاری) میں ضلع فیروز پور سے تعلق رکھنے والے ان کے جن شاگردوں کے نام لکھے گئے ہیں، ان میں مولانا عبدالرحمٰن کا نام درج نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ یہ فہرست نامکمل ہے تو بھی واقعات کی روشنی میں مولانا عبدالرحمٰن بڈھیمالوی کا حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی سے مستفید ہونے کا معاملہ مشکوک معلوم ہوتا ہے۔ اس سلسلے کا کوئی ریکارڈ کسی کے پاس نہیں ہے، اس لیے حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔

ہمارے ہاں علمائے کرام کے بہت قریبی رشتے دار بھی ان کے حالات قلم بند کرنے میں تساہل سے کام لیتے ہیں۔ انھی مولانا عبدالرحمٰن بڈھیمالوی کے شاگردوں کی فہرست میں موضع ڈھانی ریاست بیکانیر کے عالم دین مولانا عبداللہ کا نام آیا ہے، جنھوں نے صرف ۳۳ برس کی عمر میں وفات پائی۔ وہ اپنے دور کے نامور عالم تھے اور مولانا عبداللہ امجد کے تایا اور حسن سعید کے نانا تھے۔ ان کے والد کا نام نور جمال تھا اور دو چچا تھے جن میں سے ایک کا نام جلال الدین اور ایک کا عنایت اللہ تھا۔ یہ تینوں بھائی قیام پاکستان کے بعد فوت ہوئے ان کے بیٹے اور پوتے پڑھے لکھے ہیں اور ان میں سے بعض نے اپنے بزرگوں کو اچھی طرح دیکھا۔ لیکن یہ لوگ مولانا عبداللہ کے تھوڑے بہت حالات لکھ نہیں سکے۔

یہ علمائے کرام صدیوں پہلے کے راویانِ حدیث اور فقہا کے حالات تو کچھ نہ کچھ جانتے ہیں اور بیان بھی

Marfat.com

کرتے ہیں لیکن اپنے عظیم القدر اساتذہ اور قریبی رشتے دار علما کے بارے میں انہیں کچھ پتا نہیں کہ کہاں پیدا ہوئے، کب پیدا ہوئے، کن حضرات سے تعلیم حاصل کی اور کب کی اور کب وفات پائی اور کہاں پائی۔ نہ عالم بیٹے کو عالم باپ کے متعلق کچھ علم ہے اور نہ عالم بھتیجوں، بھانجوں کو عالم چچاؤں اور ماموؤں کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات حاصل ہیں۔

میں عام طور پر کہا کرتا ہوں اور میں نے کہیں لکھا بھی ہے کہ بریلوی حضرات میں سے کوئی پیر صاحب یا عالم دین فوت ہو جائیں تو چالیسویں پر ان صاحب کے حالات میں کتاب آ جاتی ہے اور چالیسویں میں شامل ہونے والے لوگ کتاب خرید لیتے ہیں اور چند گھنٹوں میں کتاب ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی تازہ مثال یہ ہے کہ ۶۔ مارچ ۲۰۱۴ء کو ہمارے ایک بریلوی عالم دوست میاں محمد عالم مختار حق نے وفات پائی۔ ۱۳۔ اپریل ۲۰۱۴ء کو ان کا چالیسواں تھا اور اس موقعے پر ان کے حالات میں کتاب آ گئی اور ان کے صاحب زادے میاں محبوب عالم ۱۴۔ اپریل ۲۰۱۴ء کو گھر آ کر مجھے کتاب دے گئے۔

یہ کتاب ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے اور مختلف حضرات کے مضامین کا بہت اچھا مجموعہ ہے۔ اس میں ایک مختصر سا مضمون اس فقیر کا بھی ہے۔

محمد عالم مختار حق بریلوی مسلک کے حامل تھے، لیکن حضرت مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی پر ان کے بہت اچھے مضامین شائع ہوئے۔ ہفت روزہ الاعتصام کے ''مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نمبر'' (مطبوعہ مارچ ۲۰۰۵ء) میں۔ ان کا مضمون قابل مطالعہ ہے۔ یہ مولانا ابوالکلام آزاد کے مداح اور مولانا غلام رسول مہر کے عقیدت مند تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد سے متعلق کافی کچھ لکھا اور مولانا غلام رسول مہر کے ان کے نام سینکڑوں خطوط تھے، جن میں سے کتنے ہی خطوط کتابی صورت میں چھپ گئے ہیں۔ جب کہ مولانا آزاد اور مولانا مہر دونوں اہل حدیث تھے۔

بات اہل حدیث علمائے کرام کے حالات کے بارے میں ہو رہی تھی۔ اہل علم کو چاہیے کہ اپنے بزرگوں کی علمی سرگرمیاں اور ان کے واقعاتِ حیات معرضِ تحریر میں لانے کی کوشش فرمائیں۔

(یہ سطور ۲۵۔ اپریل ۲۰۱۴ء کو لکھی گئیں۔)

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا ابوسعید محمد حسین بٹالوی

(وفات ۲۹-جنوری ۱۹۲۰ء)

برصغیر میں بے شمار علمائے دین کا ظہور ہوا، جن میں ایک جلیل المرتبت عالم حضرت مولانا ابوسعید محمد حسین بٹالوی ہیں۔ موجودہ جغرافیائی اعتبار سے وہ ہندوستانی پنجاب کے ضلع گورداس پور کے شہر بٹالہ میں ۱۷۔محرم ۱۲۵۶ھ (۱۹- مارچ ۱۸۴۰ء) کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام رحیم بخش اور دادا کا ذوق محمد تھا۔ ان کے اسلاف کا تعلق ہندوؤں کے کائستھ گروہ سے تھا۔ ان سے چند پشت پہلے ان کے کوئی بزرگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے اور پھر ان لوگوں نے اسلام کی تبلیغ واشاعت کو اپنا مقصد حیات قرار دے لیا۔

تحصیل علم کا آغاز:

مولانا محمد حسین بٹالوی نے حصولِ علم کا آغاز اپنے علاقے کے علما سے کیا۔ مختلف علوم کی کتابیں پڑھ چکے تو گھر سے نکلے اور دہلی، لکھنؤ، علی گڑھ وغیرہ کے اصحاب علم کی خدمت میں پہنچے اور ان کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیے۔ اس وقت دہلی میں مفتی صدر الدین آزردہ مرحوم کے اسلوبِ تدریس کا بڑا شہرہ تھا۔ وہ دہلی میں پانچویں مغل حکمران شہاب الدین شاہ جہان کے جاری کردہ مدرسہ دار البقا میں اپنے عہد کے مغل بادشاہ کی طرف سے خدمت درس انجام دینے پر مامور تھے۔ مولانا محمد حسین بٹالوی نے ان سے استفادہ کیا۔ مولانا نور الحسن کاندھلوی کے سلسلۂ درس کو بھی اس زمانے میں بڑی اہمیت حاصل تھی، مولانا بٹالوی ان سے بھی اخذِ فیض کرتے رہے۔ ان حضرات کے علاوہ بھی وہ بعض اساتذہ سے مستفید ہوئے۔

حضرت میاں صاحب کی خدمت میں:

بعد ازاں حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے آستانۂ فضیلت پر حاضری دی اور ان سے مشکوٰۃ شریف، مؤطا امام مالک اور صحاح ستہ کی تکمیل کی۔ یعنی حدیث کی تمام کتابیں حضرت میاں صاحب مرحوم سے پڑھیں۔ مولانا ممدوح کو اللہ تعالیٰ نے فہم وذکاوت اور تفقہ فی الدین کی نعمت سے خوب نوازا تھا۔ وہ ایک مدت تک حضرت میاں صاحب کے حلقۂ درس میں رہے اور ان کے علم وفضل اور طریقِ اصلاح اور حسنِ اعمال سے بے حد فیض یاب ہوئے۔ ان سے سندِ فراغ لے کر واپس اپنے وطن تشریف لائے۔

Marfat.com

آغازِ کار:

اب انھوں نے بہ یک وقت چار کام شروع کیے۔ وہ کام یہ تھے:

☆......درس و تدریس

☆......تصنیف و تالیف

☆......تذکیر و موعظت ......اور

☆......اپنے استاذِ جلیل حضرت میاں صاحب کی طرح روزانہ فجر کی نماز کے بعد درس قرآن۔

حالات کے مطابق ان کا اچھا خاصہ حلقۂ تدریس تھا، جس میں بہت سے علما وطلبا نے شرکت کی اور تحصیل علم میں مشغول ہوئے۔ اس کے اثرات دور دور تک پھیلے اور بہترین نتائج نکلے۔

تصانیف:

تصنیف و تالیف میں بھی ان کا دائرۂ کار وسیع تھا۔ ہر دور کے کچھ تقاضے اور کچھ مسائل ہوتے ہیں، جن کا اظہار ضروری ہوتا ہے۔ ان حالات کی روشنی میں انھوں نے جو کتابیں تصنیف کیں، ان میں حسب ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱- منح الباری فی ترجیح صحیح البخاری

۲- اسلامی عقاید

۳- الاقتصاد فی بیان الاعتقاد: یہ کتاب صفاتِ باری تعالیٰ سے متعلق ہے۔

۴- البیان فی رد البرہان: اس میں اجتہاد و تقلید کو موضوع بحث ٹھہرایا گیا ہے۔

۵- المفاتیح فی بحث التراویح

۶- ہدایۃ الرب لاباحۃ الضب

۷- سجدۂ تعظیم

۸- الاقتصاد فی حکم الشہادۃ والمیلاد

۹- کشف الاستار عن وجہ الاظہار

۱۰- البرہان الساطع

۱۱- المشروع فی ذکر الاقتداء بالمخالفین فی الفروع

۱۲- کتب صحاح پر حواشی

۱۳- صحیح بخاری کی کتاب الصلوٰۃ، کتاب المغازی، کتاب التفسیر پر حواشی

Marfat.com

۱۴- الاقتصاد فی مسائل الجہاد

۱۵- مشکوٰۃ کے نصف اول پر تعلیق و حاشیہ

مولانا بٹالوی کثیر المطالعہ اور کثیر العلم عالم تھے۔ ان کا تمام وقت پڑھنے، پڑھانے اور تحریر و کتابت میں گزرتا تھا اور ہر آن اپنے آپ کو مصروف رکھتے تھے۔ ان کی بہت سی تحریریں چھپ گئیں اور ان کی وفات کے وقت بہت سی تحریریں مسودوں کی صورت میں ان کے گھر میں موجود تھیں۔ ایسے مسودات بھی کتابی اور مضامین کی شکل میں موجود تھے، جن کو کسی نام اور عنوان سے موسوم نہیں کیا گیا تھا۔ معلوم نہیں ان کی وفات کے بعد ان مسودات کا کیا ہوا۔ وہ تیز قلم مصنف اور عظیم محقق تھے۔ ان کی تحریر میں بڑا زور تھا۔ کتاب و سنت کی ترجمانی اور اسلاف کے نقطۂ نظر کی وضاحت ان کا شب و روز کا مشغلہ تھا۔

مجلّہ اشاعۃ السنۃ کا اجرا:

مولانا محمد حسین بٹالوی کے عمل و حرکت کا ایک لائق تذکرہ پہلو یہ ہے کہ انھوں نے "اشاعۃ السنۃ" کے نام سے ایک مجلّہ جاری فرمایا۔ نزھۃ الخواطر کے فاضل مصنف کے بقول ان کا ہدفِ تنقید اور نشانہ تردید حسب ذیل لوگ تھے:

۱- اہل بدعت

۲- مرزا غلام احمد قادیانی

۳- سر سید احمد خاں اور ان کی نیچریت

۴- عبداللہ چکڑالوی اور منکرین حدیث

۵- مقلدین ❶

تقلید کے سلسلے میں نزہۃ الخواطر کے مصنفِ شہیر نے مولانا بٹالوی کو سخت متعصب قرار دیا ہے جو خود فاضل مصنف کے تعصب کی دلیل ہے۔

مولانا بٹالوی پر حضراتِ احناف کئی قسم کے الزامات عائد کرتے ہیں اور ان سے متعلق گفتگو کرتے وقت بالعموم حدِّ اعتدال سے باہر نکل جاتے ہیں۔ ان کے الزامات کا خود ان کے بزرگانِ کرام کی تحریروں کے حوالوں اور عمل کی روشنی میں جواب دیا جا سکتا ہے، لیکن یہ فقیر سب حضرات کا احترام کرنے کا عادی ہے، اس لیے ان لوگوں کی سطح پر نہیں آنا چاہتا۔

❶ نزہۃ الخواطر: ج ۸، ص ۴۵۱ (از سید عبدالحی حسنی لکھنوی)

Marfat.com

انیسوی صدی عیسوی کا نصف آخر:

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ انیسویں صدی کے نصف آخر کا زمانہ برصغیر کی جماعت اہل حدیث کے لیے نہایت اذیت ناک زمانہ تھا۔ اس زمانے میں ۱۸۶۴ء سے لے کر ۱۸۷۱ء تک اہل حدیث پر وہابی مقدمات کے نام سے بغاوت کے پانچ مقدمات قائم کیے گئے۔

☆...... پہلا مقدمہ بغاوت انبالہ تھا۔ اس میں گیارہ آدمی گرفتار ہوئے۔ ان کی جائدادیں ضبط ہوئیں۔ پہلے انھیں پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ پھر زنجیروں میں جکڑ کر کالا پانی (جزائر انڈیمان) بھیجا گیا۔

☆...... دوسرا مقدمہ بغاوت عظیم آباد (پٹنہ) کا تھا۔ اس میں تین علمائے کرام کو گرفتار کیا گیا۔ ان کی بھی تمام منقولہ وغیر منقولہ جائداد ضبط ہوئی اور ہتھکڑیاں اور بیڑیاں لگا کر کالا پانی بھیجے گئے۔

☆...... تیسرا وہابی مقدمۂ بغاوت مالدہ (بنگال) میں قائم ہوا۔ اس میں گرفتار شدگان کو بھی وہی سزا دی گئی جو پہلے دو مقدمات کے ملزموں کو دی گئی تھی۔

☆...... چوتھا وہابی مقدمہ بغاوت راج محل میں قائم کیا گیا۔ سزا ان ملزموں کی بھی وہی تھی۔

☆...... پانچواں مقدمۂ بغاوت پھر عظیم آباد (پٹنہ) میں قائم ہوا۔ سزا وہی۔ اہل حدیث یا وہابی علما پر یہ مقدمات انگریزی حکومت نے قائم کیے۔ اس قسم کے مقدمات میں اللہ کی مہربانی سے انگریزی حکومت نے کسی حنفی عالم کو گرفتار نہیں فرمایا۔ حنفی علمائے کرام بالخصوص لدھیانوی حضرات اس وقت تحریر وتقریر کی صورت میں اہل حدیث حضرات کی شدید مخالفت فرما رہے تھے اور ان کو مساجد سے نکالنے کے فتوے جاری کرنے کے عملِ خیر میں مصروف تھے۔ یعنی وہابیوں کی مخالفت کے نام سے بفضلِ خدا ان کی طرف سے انگریزی حکومت کی حمایت کا سلسلہ جاری تھا۔ شاید اس لیے کہ ان کے نزدیک نصاریٰ وہابیوں سے بہتر تھے۔

علمائے احناف نے مولانا محمد حسین بٹالوی کو اس لیے ہدفِ تنقید قرار دیا کہ وہ تقلید وغیرہ کے مخالف تھے اور آٹھ تراویح، آمین بالجہر، رفع الیدین وغیرہ جیسے مسائل پر عمل کی تلقین کرتے تھے۔ یہ تلقین چوں کہ احادیث رسول ﷺ کے مطابق تھی، اس لیے احناف کے نزدیک ناقابل عمل تھی۔

اس وقت امرتسر سے ایک ماہانہ رسالہ ''سفیر ہندوستان'' کے نام سے جاری تھا۔ مولانا بٹالوی نے اس رسالے میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرنا شروع کی۔ بعد ازاں مئی ۱۸۷۷ء سے مئی ۱۸۷۸ء تک پورا ایک سال مولانا کے مضامین کا یہ سلسلہ ضمیمہ اخبار ''سفیر ہندوستان'' اور ''تتمہ سفیر ہند'' کے نام سے شائع ہوتا رہا۔ اس کے اخراجات خود مولانا بٹالوی ادا کرتے تھے۔ [1]

---

(1) ملاحظہ ہو مضمون مولانا عبدالخالق قدوسی شہید، ہفت روزہ الاعتصام ۱۱- جون ۱۹۷۱ء

Marfat.com

اشاعت کتاب وسنت کے لیے مولانا بٹالوی نے "اشاعة السنة" کے نام سے ایک انجمن بنائی تھی۔ جون ۱۸۷۸ء میں اسی نام سے انھوں نے ایک ماہانہ رسالہ جاری کر دیا۔ ابتدا میں اس کی حیثیت ایک اشتہار کی تھی، لیکن بعد میں اس رسالے نے بڑی شہرت پائی اور اس میں چکڑالویوں، قادیانیوں، نیچریوں، تقلید شخصی کے حامیوں اور اہل بدعت کے خلاف بے شمار علمی اور تحقیقی مضامین شائع ہوئے۔

"اشاعة السنة" کے اغراض ومقاصد:

مولانا ممدوح "اشاعة السنة" کے اغراض ومقاصد بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''اس رسالے کی اشاعت ان لوگوں کی طرف سے ہے جو تحقیق وتقلید میں حدِّ اعتدال پر ہیں۔ نہ مقلدین زمانۂ حال جیسے مقلد ہیں کہ جو کچھ پہلے علماء نے کہا ہے، اسی لکیر کے فقیر ہو رہیں۔ اپنے فہم وعقل کو دلائل (کتاب وسنت) کے سمجھنے میں دخل نہ دیں۔ نہ نیچریہ جیسے محقق ہیں کہ اپنی تحقیق کے سامنے خدا و رسول ﷺ کی بھی نہ سنیں اور ان کی تقلید سے بھی انکاری ہو بیٹھیں۔ لہٰذا دونوں فریق کی افراط وتفریط کی اصلاح اس رسالے کے بانیوں کا مقصد ہے اور اس کے اجرا سے صرف یہی غرض وغایت ہے۔'' [1]

مولانا الطاف حسین حالی برصغیر کے مسلمانوں کی علمی اور ادبی زندگی کے مشہور کردار تھے۔ وہ سرسید کے مداحین کے زمرے میں شامل تھے، ''حیات جاوید'' کے نام سے انھوں نے سرسید کی سوانح عمری لکھی۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ سرسید کے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کے خلاف ہندوستان میں جو رسالے شائع ہوئے، مولانا محمد حسین بٹالوی کا رسالہ ''اشاعة السنة'' انھی میں شامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''تہذیب الاخلاق'' کے توڑ پر خاص خاص اخبار اور رسالے جاری ہوئے۔ کان پور سے ''نور الآفاق''، ''نور الانوار''، مراد آباد سے ''لوح محفوظ'' اور آگرے سے ''تیرھویں صدی'' شائع ہوئے۔ ''امداد الآفاق''، ''شہابِ ثاقب'' اور ''تائید الاسلام'' وغیرہ اضلاعِ شمال مغرب سے اور اشاعة السنہ پنجاب سے شائع ہوئے۔ [2]

خود سرسید نے بھی اپنے رسالے ''تہذیب الاخلاق'' (پرچہ اول ۱۲۹۶ھ) میں دلچسپ انداز میں ''اشاعة السنة'' کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مولوی ابوسعید محمد حسین صاحب لاہوری ہر مہینے ایک رسالہ نکالتے ہیں۔ یہ رسالہ دراصل انھوں نے اپنے چھوٹے بھائیوں کی خدمت گزاری کے لیے نکالا تھا۔ یعنی اس زمانے میں، جن کو وہابی کہتے ہیں، وہ دو فرقوں میں منقسم ہو گئے ہیں۔ ایک وہابی مقلد، دوسرے وہابی غیر مقلد، جو اپنے

---

1. ملاحظہ ہو مضمون مولانا عبدالخالق قدوسی ہفت روزہ الاعتصام ۱۱۔ جون ۱۹۷۱ء۔
2. حیات جاوید: صفحہ ۵۳۴.

Marfat.com

تیئں موحد یا اہل حدیث کے نام سے موسوم ہونا پسند کرتے ہیں اور جو لوگ بدعتی کہلاتے ہیں وہ پہلے فرقے کو چھوٹے بھائی اور دوسرے فرقے کو بڑے بھائی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔''

رسالہ ''اشاعۃ السنۃ'' کے اجرا کی وجہ اختصار کے ساتھ گزشتہ سطور میں عرض کر دی گئی ہے، لیکن بعض حضرات نے جو علمی میدان میں مولانا بٹالوی کا مقابلہ نہ کر سکے، یہ شوشہ چھوڑا کہ اس رسالے کا مقصدِ اجرا وہابیوں کو انگریزی حکومت کے قریب کرنا تھا۔ یہ شکست خوردہ ذہنوں کا مولانا پر صریح بہتان ہے۔

جہاد کے متعلق مولانا کا نقطۂ نظر:

پھر یہ بھی کہا گیا کہ مولانا نے جہاد کو منسوخ قرار دیا ہے۔ یہ بھی سراسر غلط ہے۔ مولانا کے ایک رسالے کا نام ''الاقتصاد فی مسائل الجہاد'' ہے۔ مولانا نے نہ مجلّہ اشاعۃ السنۃ میں جہاد کے خلاف کوئی مضمون لکھا، نہ ''الاقتصاد فی مسائل الجہاد'' میں جہاد کو منسوخ قرار دیا۔

جہاد کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں:

''مذہبی جہاد نہ اس غرض سے شروع ہے کہ کافروں کو دنیا میں کفر کی سزا دیں اور نہ اس غرض سے ہے کہ ان کو جبراً مسلمان بنائیں، اس جہاد سے غرض جو خدا اور رسول ﷺ کے کلام سے سمجھ میں آتی ہے، یہ ہے کہ مسلمانوں کو مخالفینِ مذہب کی مزاحمت سے بچائیں اور خدا کی عبادت (جو مخلوق کی پیدائش اور رسولوں علیہم السلام کی بعثت سے مقصودِ خداوندی ہے) کا راستہ صاف کریں اور اس راستے سے روکنے والوں کو راستے سے ہٹا دیں۔''[1]

عیسائیت کی تردید:

جب انگریز ہندوستان آئے تو وہ اپنے ساتھ پادریوں اور عیسائی مبلغوں کو بھی لے کر آئے۔ ان کا مقصد اس ملک میں عیسائیت کی نشر و اشاعت تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اس ملک میں عیسائی مذہب پھیلے گا تو عیسائی حکومت (جو انگریزوں کی حکومت ہے) مضبوط ہوگی۔ اس کے لیے انھوں نے یہاں کے تعلیم یافتہ لوگوں سے (جن میں ہندو، مسلمان اور سکھ وغیرہ سب شامل تھے) ذاتی رابطے کر کے تعلقات استوار کیے اور انھیں مالی لالچ اور ملازمتوں کا جھانسا دے کر عیسائی بنانے کی کوشش کی، جس میں وہ کسی حد تک کامیاب ہوئے۔ مسلمان علما سے انگریز اور دیسی پادریوں کے مختلف مقامات پر مناظرے بھی ہوئے۔ ایک دوسرے کے خلاف بہت سی کتابیں بھی لکھی گئیں۔ مولانا محمد حسین بٹالوی بھی عیسائیت کے خلاف میدان میں اترے اور مجلّہ ''اشاعۃ السنۃ'' میں مضامین لکھے۔

---

[1] الاقتصاد فی مسائل الجہاد: ص ۹ بحوالہ ''الاعتصام'' ۱۸۔ جون ۱۹۷۱ء۔

Marfat.com

مرزا غلام احمد قادیانی کے خلاف فتوائے تکفیر:

مولانا بٹالوی مرحوم و مغفور کا ایک عظیم الشان کارنامہ مرزا غلام احمد قادیانی پر فتوائے تکفیر ہے۔ مرزا قادیانی نے اپنے رسالے ”فتح اسلام“ میں مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا تو مسلمانوں میں ایک شور بپا ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی ایک اور کتاب ”توضیح مرام“ میں نبوت کا دعویٰ کیا تو اس کے خلاف مزید اشتعال کی کیفیت پیدا ہوئی۔ پھر اس کا ایک اور رسالہ ”ازالۂ اوہام“ لوگوں کے سامنے آیا تو سلسلۂ مخالفت بہت بڑھ گیا۔

یہ صورتِ حال مسلمانوں کے لیے بے حد تشویش ناک تھی، جسے کوئی مسلمان برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ مولانا بٹالوی کا مرزا غلام احمد قادیانی سے مناظرہ ہوا، لیکن مرزا صاحب درمیان ہی میں بھاگ گئے۔ اب مولانا نے ایک استفتا ترتیب دیا۔

مولانا رقم فرماتے ہیں:

”اس استفتا کا جواب بقیۃ السلف، حجۃ الخلف، شیخنا و شیخ الکل حضرت مولانا سید محمد نذیر حسین صاحب محدث دہلوی متع اللہ المسلمین بطول حیاتہ سے حاصل کیا اور پھر ایک خاص سفر از دہلی تا بقریب کلکتہ و بھوپال وغیرہ اختیار کر کے اکثر مشہور بلادِ ہندوستان کے علما و فضلاء مختلف مذاہب کا توافق رائے حاصل کیا۔ پھر لاہور پہنچ کر اس استفتاء اور اس کے جواب کو رسالے کی صورت میں چھپوا کر دور دراز مقاماتِ ہندوستان و پنجاب میں جہاں خاک ساز خود نہیں پہنچا تھا، متداول کیا اور اس پر ان مقامات کے سکناء کی شہادات و تائیدات کو مرتب کرایا۔ فتوے پر مکمل اتفاق علمائے ہندوستان و پنجاب کا ہو چکا تھا۔ مگر اس کی اشاعتِ عام میں اس وجہ سے توقف و التوا ہوا کہ اگر قادیانی کو ان باتوں کی نسبت جن کو علمائے وقت نے کفر و ضلالت قادیانی پر دلیل ٹھہرایا ہے، کچھ عذر ہو تو اس کو مجمع علما میں پیش کرے اور ان میں وہ مباحثہ کرنا چاہتا ہے تو کرے اور اس معاملۂ تکفیر و تضلیل کو جو بہ اتفاقِ علما اس کے لیے تیار کیا گیا ہے، کسی حیلے سے ٹلا سکتا ہے تو ٹلا دے یعنی ان باتوں کا اپنی تصانیف میں پایا نہ جانا یا اگر وہ ان میں موجود ہیں تو ان کا موجب کفر و ضلالت نہ ہونا ثابت کر دے۔ آخری دفعہ اس امر کی طرف اس کو جواب فیصلہ آسمانی میں بلایا گیا اور اس جواب کو چھاپ کر اس کے پاس بھیجا گیا اور انتظارِ مدتِ جواب تک اشاعتِ فتویٰ ملتوی کیا گیا مگر پھر اس نے اس طرف رخ نہ کیا اور مباحثے کا نام لینا بھی چھوڑ دیا۔ لہٰذا اس فتوے کا اب عام اہلِ اسلام میں مشتہر کرنا ضروری سمجھا گیا۔ ❶

❶ علمائے اسلام کا اولین متفقہ فتویٰ (از مولانا محمد حسین بٹالوی) ص ۹، ۱۰۔

Marfat.com

مباحثہ سے گریز:

مولانا بٹالوی کے نزدیک مرزا غلام احمد کی کتاب ''آسمانی فیصلہ'' دراصل ''شیطانی فیصلہ'' ہے۔اس نے مولانا سے مباحثہ کرنے اور ان کے سامنے آنے سے ہمیشہ گریز کیا۔ وہ لاہور پہنچا تو مولانا اس کے تعاقب میں لاہور آئے۔ سیالکوٹ گیا تو مولانا نے سیالکوٹ کا رخ کیا۔مولانا نے ہر مقام پر اس کا پیچھا کیا اور ہر جگہ اسے مناظرے اور مباحثے کی دعوت دی، لیکن وہ میدان میں نہیں آیا بلکہ بقول مولانا ممدوح ''جہاں خاک سار پہنچا وہاں سے فوراً بھاگا۔''

بہت بڑا جہاد:

ہر وہ کوشش جو اسلام کی برتری کے لیے کی جائے جہاد ہے۔ وہ مالی ایثار ہو، جان کی قربانی ہو، اسلام کی تبلیغ کے لیے بھاگ دوڑ ہو، احکام دین کی حفاظت کے لیے جدوجہد ہو، حالات کے مطابق یہ جہاد ہے۔مرزا قادیانی کا دعواے نبوت بہت بڑا فتنہ تھا۔مولانا محمد حسین بٹالوی نے اس کے خلاف کفر کا فتویٰ مرتب کر کے اپنے خرچ پر پورے ہندوستان کا دورہ کیا اور دو سو کے قریب علما سے خود ملاقات کر کے اس پر دستخط ثبت کرائے اور مہریں لگوائیں۔ جن حضرات کے پاس کسی وجہ سے خود نہیں پہنچ سکے وہاں اپنے آدمی بھیج کر دستخط کروائے۔اس زمانے میں یہ بہت بڑا جہاد تھا جو انھوں نے مالی، علمی اور جسمانی صورت میں کیا۔ملک کے کسی عالم دین نے کسی اہم مسئلے میں اتنی جدوجہد نہیں کی جو انھوں نے انفرادی طور پر کی۔

انبیا علیہم السلام کے سوا کوئی شخص معصوم نہیں۔ ائمہ کرام رحمہم اللہ سے بھی بعض مسائل میں غلطی کا صدور ہو جاتا ہے۔علما بھی لغزش کے مرتکب ہو جاتے ہیں، مولانا محمد حسین بٹالوی سے بھی بہ حیثیت انسان کوئی نہ کوئی فکری یا عملی لغزش کا ارتکاب ہوا ہو گا، لیکن مرزا قادیانی کے خلاف انھوں نے جو تگ و دو کی، وہ اس ملک میں ان کا وہ اولین اور بہت بڑا جہاد تھا، جس کی وجہ سے ہم گناہ گاروں کو یقین ہے کہ بارگاہِ الٰہی سے ان کی سب لغزشیں معاف فرما دی گئیں اور تحفظِ ختم نبوت کے بدلے میں انھیں جنت الفردوس میں داخل فرما دیا گیا۔اس جدوجہد میں ان کا کوئی دنیوی مفاد نہیں تھا۔ انگریزی حکومت مرزا غلام احمد قادیانی کی حامی تھی، جب کہ مولانا بٹالوی اس کی شدید مخالفت کر رہے تھے۔اس طرح وہ انگریزی حکومت کے مدِ مقابل تھے۔

یہ فتویٰ مولانا نے اسی زمانے میں شائع کر دیا تھا، جس پر کلکتہ، ڈھاکہ، اعظم گڑھ، لکھنو، دہلی، پٹنہ، مظفر پور، امرتسر، گورداس پور، لدھیانہ، سہارن پور، بنارس، دیوبند، لاہور، راولپنڈی، پشاور، جہلم، گجرات، سیالکوٹ وغیرہ ملک کے تمام صوبوں کے تمام اضلاع کے دو سو کے قریب اصحابِ علم کے دستخط ثبت ہیں۔

Marfat.com

سرسید احمد خاں:

سرسید احمد خاں اور مولانا محمد حسین بٹالوی میں معاصرت کا تعلق تھا۔ بلاشبہ سرسید اپنے دور کی مشہور شخصیت تھے۔ اب بھی ان کی بڑی شہرت ہے۔ ان کے بعض کام بہت اچھے تھے اور بعض سراسر خلافِ اسلام تھے۔ مثلاً مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ان کی کوششیں قابلِ تعریف ہیں۔ ان کی تصانیف میں سے ''آثار الصنادید'' اور ''اسباب بغاوت ہند'' بہت اچھی کتابیں ہیں۔ لیکن معجزات کے سلسلے میں ان کا نقطۂ نظر بالکل غلط ہے۔ اللہ اور رسول ﷺ کے فرامین سے قطعی طور پر ہٹا ہوا۔ ان کی ایسی بعض اور باتیں بھی ہیں انہی امور کی وجہ سے مولانا بٹالوی نے ان کی مخالفت کی اور دیگر علما نے بھی ان سے اختلاف کیا اور سخت الفاظ میں ان کی تردید کی۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ کو کیا منظور ہے، لیکن بہ ظاہر معاملہ یہی ہے کہ سرسید کے بعض نقطۂ نظر کا شریعت سے کوئی تعلق نہ تھا۔

خدمتِ تدریس وخطابت:

مولانا بٹالوی کی سکونت زیادہ تر لاہور میں رہی۔ ان کے زمانے میں اہلِ حدیث کی لاہور میں دو ہی مسجدیں تھیں۔ چینیاں والی مسجد اور لسوڑے والی مسجد۔ مولانا بٹالوی لسوڑے والی مسجد میں خطبۂ جمعہ بھی ارشاد فرماتے تھے، نمازِ فجر کے بعد درسِ قرآن بھی دیتے تھے، تدریس کا سلسلہ بھی یہاں جاری رکھتے تھے اور ان کا مجلّہ ''اشاعۃ السنۃ'' بھی یہیں سے جاری ہوتا تھا۔ اس لیے انھیں ''لاہوری'' کی نسبت سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

مسجد چینیاں والی میں امامت وخطابت کا فریضہ اس وقت حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی سرانجام دیتے تھے جن کا انتقال ۱۹۳۰ء میں ہوا۔ ان کے حالات بھی اس کتاب میں موجود ہیں۔ لیکن اس مسجد میں بھی مولانا بٹالوی کی آمد و رفت رہتی تھی۔ یہاں کچھ عرصہ وہ طلباء کو فریضہ تدریس بھی انجام دیتے رہے۔

وفات:

مولانا بٹالوی نے ۸۰ سال عمر پا کر ۲۹۔ جنوری ۱۹۲۰ء (۸۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۸ھ) کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔ نماز جنازہ ان کے وطن بٹالہ میں حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری نے پڑھائی۔

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا ابو داؤد عبداللہ بابر خانوی

(وفات ۱۹۲۱ء)

ضلع قصور کی تحصیل چونیاں میں ایک گاؤں کا نام بابر خانی ہے جو ٹھینگ موڑ اور راجو وال کے درمیان قصور دیپال پور روڈ پر واقع ہے۔ عرفِ عام میں اس گاؤں کو بابر کھائی (یا ببر کھائی) کہا جاتا ہے۔ اس گاؤں کی وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ بہت عرصہ پہلے ''بابر خاں'' نام کا ایک شخص اس نواح میں آیا اور اس نے یہ گاؤں آباد کیا، جسے اس کے نام کی مناسبت سے بابر خانی کہا جانے لگا۔ اس گاؤں کو کم و بیش دو سو سال سے اہل حدیث کے مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔

آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پیشتر اس گاؤں کے ایک زمیندار گھرانے میں ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام والدین نے عبداللہ رکھا۔ عبداللہ کے والد کا نام احمد اور دادا کا خیر الدین تھا۔ اس وقت یہ گھرانا علم کی دولت سے محروم تھا۔ عبداللہ کا تذکرہ ''حضرت مولانا ابو داؤد عبداللہ'' کے عنوان سے مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروز پوری نے اپنی کتاب ''الفیوض المحمدیہ'' میں کیا ہے۔

عبداللہ کی تاریخ ولادت کا علم نہیں ہو سکا۔ جو کچھ معلوم ہوا وہ یہ ہے کہ ہوش سنبھالتے ہی انھیں حصولِ علم کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ ناظرہ قرآن مجید سمیت اردو کی چند ابتدائی کتابیں اپنے گاؤں کے امام مسجد سے پڑھیں۔ اس وقت کے پنجاب میں حضرت حافظ محمد لکھوی کی بڑی شہرت تھی اور ان کے مدرسے اور طریق تعلیم سے لوگ بہت متاثر تھے۔ دور دراز علاقوں کے شائقینِ علم موضع لکھو کے جا کر اس مدرسے کے اساتذہ سے اخذِ فیض کرتے تھے۔ مولانا ابو داؤد عبداللہ نے بھی حضرت حافظ محمد لکھوی کے حلقۂ شاگردی میں شمولیت کی اور ابتدا سے لے کر انتہا تک مروّجہ علوم و فنون کی تمام کتابیں ان سے پڑھیں اور سندِ فراغ لی۔

حضرت حافظ محمد لکھوی سے انھیں حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی اور مدرسہ غزنویہ کا پتا چلا تو ان سے مستفیض ہونے کے لیے امرتسر چلے گئے۔ وہاں امام صاحب اور ان کے برادرِ صغیر مولانا سید عبدالرحیم غزنوی سے صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن نسائی اور ابن ماجہ وغیرہ کتبِ حدیث کا دوبارہ درس لیا۔ ان کتابوں کی تکمیل کے بعد مولانا عبدالرحیم غزنوی سے درخواست کی کہ وہ ان کی سندِ تکمیل حضرت امام عبدالجبار صاحب

Marfat.com

سے لکھوا دیں، چنانچہ لائق شاگرد کی خواہش اور اپنے عالم و فاضل بھائی کی سفارش پر امام صاحب نے ان کو سند عطا فرمائی۔ یہ سند انھوں نے ۷۔شوال ۱۳۰۹ھ کو اپنے دست مبارک سے تحریر فرمائی۔ اس کے آخر میں ''عبدالجبار عفی عنہ بقلمہ'' کے الفاظ رقم کیے۔

عیسوی حساب سے یہ ۲۹-اپریل ۱۸۹۲ء بنتا ہے اور جمعرات کا دن۔ سند کے ساتھ ان کے سر پر دستارِ فضیلت بھی باندھی گئی۔ تقریباً دو سال وہ امرتسر کے مدرسہ غزنویہ میں تحصیل علم کرتے رہے۔

امرتسر سے مولانا ابوداؤد عبداللہ بابر خانوی نے دہلی کا عزم کیا اور حضرت میاں سید نذیر حسین رحمہ اللہ کے بابِ عالی پر حاضری دی۔ ان سے صحیح بخاری پڑھی اور صحیح مسلم کا ایک ربع پڑھا۔ بعض اجزا سنن اربع اور دار قطنی کے پڑھے اور مشکوٰۃ شریف پڑھی۔ ایک سال وہ حضرت میاں صاحب کے حلقۂ شاگردی میں شامل رہے۔ شوال ۱۳۱۰ھ کو انھوں نے میں صاحب سے سندِ حدیث لی۔ عیسوی لحاظ سے یہ مئی ۱۸۹۳ء ہوا۔

مولانا ممدوح حضرت نواب صدیق حسن خان صاحب کی کتابوں کا نہایت شوق سے مطالعہ کرتے تھے اور ان کے ساتھ ان کی خط کتابت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ عالم حدیث اور متبع کتاب و سنت ہونے کی وجہ سے نواب صاحب ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ بسا اوقات اپنی کتابیں انھیں تحفۃً بھی ارسال فرما دیتے تھے۔

مولانا عبداللہ بابر خانوی بھوپال بھی گئے۔ وہاں اس وقت حضرت شیخ محمد بن حسین انصاری قیام فرما تھے۔ شیخ ممدوح سے انھوں نے صحیح بخاری، صحیح مسلم، مؤطا امام مالک اور بعض دیگر کتبِ حدیث پڑھیں اور ان سے حصولِ سند کی سعادت سے مفتخر ہوئے۔

قیامِ دہلی کے زمانے میں انھوں نے حضرت میاں صاحب کی ہدایت کے مطابق حکیم عبدالمجید سے علم طب پڑھا۔ حکیم صاحب ممدوح حضرت میاں صاحب کے شاگرد تھے۔ میاں صاحب سے انھوں نے کتبِ حدیث پڑھی تھیں۔

مولانا عبداللہ بابر خانوی دو سال حکیم عبدالمجید کے دائرۂ شاگردی میں رہے۔ اس فن کی عربی اور فارسی کتابوں پر انھیں عبور حاصل تھا اور ان کا شمار اپنے دور کے مشہور اور بڑے اطبا میں ہوتا تھا۔ اس علم میں مہارت کی وجہ سے انھیں دہلی کے ایک بیرسٹریٹ لا محمد اسماعیل خاں کی طرف سے چاندی کا تمغہ بھی ملا تھا، جس پر مندرجہ ذیل الفاظ کندہ تھے:

۷۸۶

تمغہ مدرسہ طبیہ دہلی

حکیم محمد عبداللہ ساکن ببر کھائی ضلع لاہور

Marfat.com

عطیہ جناب محمد اسماعیل خاں صاحب بار ایٹ لاء دہلی

حکیم عبدالمجید نے جو حکیم اجمل خاں کے بڑے بھائی تھے، مولانا عبداللہ کو ۱۳۱۱ھ میں عربی زبان میں لکھی ہوئی سند دی۔ اس کے آخر میں یہ الفاظ تھے:

العبد

ابوسعید حکیم عبدالمجید عفی عنہ بقلم خود

حکیم محمد اجمل خاں بھی اسی مدرسے میں علم طب پڑھاتے تھے اور وہ مولانا عبداللہ کی ذہانت وعلمیت اور فنِ طب میں ان کی مہارت سے بہت متاثر تھے۔ ایک دفعہ حکیم اجمل خاں صاحب نواب بہاول پور کی دعوت پر بہاول پور گئے تو واپس دہلی جا کر انھوں نے مولانا کو خط لکھا کہ میں نے نواب صاحب سے آپ کی سفارش کی ہے۔ آپ اپنے خاندان سمیت بہاول پور چلے جائیں۔ کاشت کاری کے لیے آپ کو جتنے رقبے کی ضرورت ہو، وہ آپ کو دے دیں گے۔ لیکن مولانا نے وہاں جانے سے معذرت کر دی اور حکیم صاحب کو خط لکھا کہ میں دنیوی مفاد کا خواہاں نہیں ہوں، روکھی سوکھی کھا کر اللہ کے دین کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

فارغ التحصیل ہو کر مولانا اپنے گاؤں آ گئے اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ بعد ازاں گھلن ہٹھاڑ (تحصیل چونیاں ضلع قصور) کے لوگ اصرار کر کے انھیں اپنے ہاں لے گئے۔ یہاں انھوں نے مدرسہ جاری کیا، لیکن بعض لوگوں نے ایسا رویہ اختیار کیا کہ مدرسہ جاری نہ رہ سکا اور وہ پتوکی (شہر) تشریف لے آئے۔ وہاں خطبہ جمعۃ المبارک ارشاد فرمانے لگے اور گزر اوقات کے لیے اپنے بیٹے محمد داؤد کے نام سے ''مطب داؤدی'' کھول لیا۔

اس زمانے میں بہاول پور کے نواب نے ''مدرسہ صادقیہ'' جاری کیا تھا جس کا تعلق ریاست کے محکمہ اوقاف سے تھا۔ نواب صاحب کی حکیم اجمل خاں سے خط و کتابت رہتی تھی۔ ایک خط میں نواب صاحب نے حکیم صاحب سے مدرسے کے لیے ایک تجربہ کار مدرس بھجوانے کی درخواست کی۔ حکیم صاحب نے نواب صاحب کو مولانا ابوداؤد عبداللہ بابر خانوی کی اطلاع دی اور تدریس کے سلسلے میں ان کے تجربے اور قابلیت کی وضاحت کی۔ اس طرح مولانا ممدوح بہ طور مدرس بہاول پور کے مدرسہ صادقیہ میں خدمت انجام دینے لگے۔ ان کا مشاہرہ پچیس روپے مقرر تھا۔ وہ چوں کہ اس عہد کے ایک بڑے عالم اور منجھے ہوئے مدرس تھے۔ محنت سے پڑھاتے تھے، طلبا ان کے طریق تدریس سے خوش تھے اور محکمہ اوقاف کی مجلس انتظامیہ بھی جو اس مدرسے کی دیکھ بھال کر رہی تھی، مولانا کے کام سے مطمئن تھی، اس لیے یکم فروری 1915ء کو ان کا مشاہرہ تیس روپے کر

دیا گیا

Marfat.com

مولانا ممدوح کو تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ حدیث کی عربی کتابوں کی تصحیح میں بھی مہارت رکھتے تھے، اس لیے مطبع مجتبائی دہلی اور مطبع علیمی لاہور سے تصحیح اور حواشی کے لیے بالعموم کتابیں ان کے پاس آتی رہتی تھیں۔

مولانا کی تصانیف وحواشی کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱- حواشی بخاری شریف: مولانا ابو داؤد عبداللہ بابر خانوی نے صحیح بخاری پر مبسوط حواشی تحریر فرمائے تھے جو مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوئے۔ مولانا محمد اسماعیل بابر خانوی بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے مولانا عبداللہ کے حواشی والا صحیح بخاری کا مطبوعہ نسخہ دیکھا ہے۔ کاش کہیں سے یہ نسخہ مل جائے اور اسے کوئی ادارہ شائع کر دے۔

۲- حواشی زرادی: علم صرف کی مشہور اور اہم کتابوں میں سے ایک کتاب زرادی ہے جو محمد شاہ تغلق کے عہد کے عالم مولانا فخر الدین زرادی سامانوی ثم دہلوی کی تصنیف ہے۔ مولانا موصوف نے ۷۴۸ھ میں وفات پائی۔ یہ کتاب درس نظامی میں شامل ہے اور مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ مولانا عبداللہ بابر خانوی نے مطبع علیمی لاہور کی فرمائش پر فارسی زبان میں اس پر حواشی لکھے جو اس کی مطبوعہ کتاب پر شائع ہوئے۔

۳- حاشیہ نخبۃ الفکر: فنِ اصول حدیث سے متعلق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی یہ نہایت عمدہ کتاب ہے جو درس نظامی کا ضروری حصہ ہے اور اسے با قاعدہ پڑھایا جاتا ہے۔ مولانا ابو داؤد عبداللہ بابر خانوی نے اس پر حواشی تحریر فرمائے۔

۴- حکایت عجیبہ مع لطیفۂ غریبہ: یہ عربی زبان میں علم طب سے متعلق ان کی غیر مطبوعہ کتاب تھی جو ضائع ہوگئی۔

۵- عجالہ ضادیہ: فنِ قراءت میں حرف ''ضاد'' کی ادائیگی کے بارے میں ایک رسالہ

۶- فلاح آخرت: پنجابی نظم میں یہ چھوٹا سا رسالہ نماز اور اس میں پڑھی جانے والی دعاؤں کے بارے میں ہے۔ لیکن غیر مطبوعہ ہے۔

مولانا ابو داؤد عبداللہ کا کتب خانہ ہر فن کی بہت سی کتابوں پر مشتمل تھا۔ ایک مرتبہ حضرت حافظ عبداللہ روپڑی بابر خانی تشریف لے گئے تو یہ کتب خانہ دیکھ کر نہایت تعجب کا اظہار کیا اور جب بعض کتابوں پر ان کے قلمی حواشی پڑھے تو مزید حیرانی ہوئی اور فرمایا افسوس ہے ہم اتنے بڑے عالم کی زیارت سے محروم رہے۔ یہ کتب خانہ حضرت حافظ عبداللہ روپڑی کی خدمت میں پیش کر دیا گیا تھا۔

مولانا عبداللہ کی وفات کا سانحہ بڑا دردناک ہے۔ بہاول پور میں ایک کھتری نے بربنائے حسد دودھ

Marfat.com

میں زہر ملا کر انھیں پلا دیا تھا، جس کی وجہ سے وہ مسلسل بیمار رہنے لگے۔ بیماری کی وجہ سے ملازمت چھوڑ دی اور اپنے گاؤں واپس آ گئے۔ تھوڑے عرصے کے بعد عالم جوانی میں وفات پا گئے۔ یہ حادثہ ۱۹۲۱ء (۱۳۴۰ھ) کو پیش آیا۔

ان کے ایک ہی فرزند تھے جن کا نام مولانا محمد داؤد تھا۔ ان کی ولادت ۱۹۰۵ء میں ہوئی۔ انھوں نے علوم متداولہ کی تعلیم اپنے والد مکرم سے حاصل کی۔ انگریزی، بہاول پور کے ایک کالج میں پڑھی۔ انگریزی، عربی، فارسی، اردو میں مہارت رکھتے تھے۔ کچھ عرصہ ریاست بہاول پور کی فوج میں کسی بڑے عہدے پر فائز رہے۔ بعد ازاں خرابی صحت کی بنا پر اپنے آبائی گاؤں آ گئے اور اپنی موروثی زمین میں کاشت کاری کرنے لگے۔ دینی اور علمی خدمت کا موقع نہیں ملا۔ ۱۴۔ جون ۱۹۶۵ء (۱۴-صفر ۱۳۸۵ھ) کو ان کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ❶

❀❀❀❀

❶ الفیوض المحمدیہ: صفحہ ۲۴۷ تا ۲۶۱۔

Marfat.com

مولانا نور محمد موکلوی

(وفات ۱۹۲۶ء)

گزشتہ صفحات میں مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروز پوری کا نام کئی مرتبہ آیا ہے۔ ان کی تصنیف ''الفیوض المحمدیہ'' کے حوالے بھی مختلف مقامات میں خوانندگانِ محترم کی نظر سے گزرے۔ زیب عنوان بزرگ سے متعلق معلومات بھی اسی کتاب سے حاصل ہوئیں۔

مولانا نور محمد موکلوی کے سلسلۂ نسب کے جن حضرات کے نام ''الفیوض المحمدیہ'' میں مرقوم ہیں، وہ سب قاری، حکیم، اور حفاظ قرآن ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

نور محمد بن حکیم محمد بخش بن قاری نور الفتاح بن قاری حافظ مفتی حکیم شرف الدین بن قاری حکیم محمود خاں بن حکیم قاری محمد فاضل بن قاری حافظ حکیم محمد جیون۔

مولانا نور محمد ۱۸۶۶ء کے آس پاس موضع موکل ضلع قصور میں پیدا ہوئے۔ ان کے آبا و اجداد علم و صالحیت کے اعتبار سے اپنے علاقے میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ ان حضرات کی کوشش سے اس نواح میں اسلام کی بڑی اشاعت ہوئی اور بے شمار غیر مسلموں نے ان کے وعظوں سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا۔ بالخصوص مولانا نور محمد کے والد حکیم محمد بخش کے ہاتھ پر بہت سے لوگ مسلمان ہوئے۔ یہ خاندان لکھوی علمائے کرام سے متاثر تھا اور انہی سے انھوں نے فیض پایا تھا۔

مولانا نور محمد موکلوی نہایت ذہین تھے اور حصولِ علم کا انھیں بڑا شوق تھا۔ چنانچہ چودہ سال کی عمر میں عربی، فارسی، اردو کی بہت سی درسی کتابیں پڑھ لی تھیں۔ پھر دہلی چلے گئے، وہاں حکیم بہاء الدین مدرس مدرسہ فتح پوری، حکیم غیاث الدین دہلوی اور بعض دیگر اطبا سے طب کی کتابیں پڑھیں۔ عربی ادبیات، فقہ، اصول فقہ اور منطق و فلسفہ وغیرہ مروّجہ علوم مولانا محمد اسحاق رام پوری، مولانا عبداللہ ٹونکی، مولانا عبدالرب اور مولانا قادر علی مدرس مدرسہ حسین بخش وغیرہ سے حاصل کیے۔ وہیں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل (جسے اب عربی فاضل کہا جاتا ہے) کا امتحان نمایاں پوزیشن میں پاس کیا۔

اس کے بعد وہ ''تفسیر حقانی'' کے مصنف مولانا عبدالحق صاحب کی خدمت میں گئے۔ ان سے تفسیر کا کچھ حصہ پڑھا اور سند لی۔ پھر حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے حلقۂ شاگردی میں شامل ہوئے۔ ان

Marfat.com

سے حدیث کی بعض کتابیں پڑھیں اور مستحق سند قرار پائے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے وطن تشریف لائے اور درس و تدریس اور وعظ و نصیحت کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی ''نوری شفاخانہ'' کے نام سے مطب کھول لیا۔ وہ جدی پشتی طبیب تھے اور فنِ طبابت میں مہارت رکھتے تھے۔ غربا کا مفت علاج کرتے اور ان سے محبت سے پیش آتے۔

تحریر سے بھی دلچسپی تھی اور اپنے دور کے بعض رسائل و جرائد میں ان کے مضامین کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ''نور القمر'' کے نام سے ایک رسالہ نکلتا تھا، اس میں باقاعدہ لکھتے تھے۔ زبدۃ الحکماء حکیم احمد علی خاں کا ایک ماہنامہ رسالہ ''تکمیل الطب'' تھا، اس کے سب ایڈیٹر رہے۔ اللہ نے بہت سی خصوصیات ان کی ذات میں جمع فرما دی تھیں۔ وہ ایک ماہر طبیب تھے، باعمل عالم تھے، بلند اخلاق، عالی ہمت اور خوش گفتار شخص تھے۔ اردو، عربی، فارسی اور پنجابی کے شاعر تھے۔ حضرت حافظ محمد لکھوی کے شاگرد اور ان کے فرزندِ گرامی مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے مرید تھے۔

عربی، فارسی اور پنجابی اشعار میں انھوں نے حافظ محمد لکھوی اور مولانا محی الدین لکھوی کی تاریخ ہائے وفات نکالیں۔

ان کی علمی قابلیت کی وجہ سے حضرت حافظ محمد لکھوی نے اپنی چھوٹی بیٹی ان کے عقد میں دے دی تھی۔

مولانا حکیم نور محمد موکلوی نے تقریباً ستر (۷۰) برس کی عمر پا کر ۱۹۲۶ء کے لگ بھگ داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور موضع موکل نزد ریلوے اسٹیشن بستی قطب شاہ میں دفن کیے گئے۔ [1]

❀❀❀❀

[1] ''الفیوض المحمدیہ'' (مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروز پوری) ص ۲۳۰ تا ۲۳۲۔

Marfat.com

مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی

(وفات دسمبر ۱۹۲۶ء)

برصغیر کے مشہور مصنف اور اسلامی تاریخ کے ممتاز ناول نگار عبدالحلیم شرر ماہ رجب ۱۲۷۶ھ (فروری ۱۸۶۰ء) کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے: عبدالحلیم بن تفضّل حسین بن محمد بن نظام الدین بن معزالدین عباسی کرسوی لکھنوی۔

عبدالحلیم شرر آٹھ نو سال کی عمر میں اپنے نانا کے پاس کلکتے چلے گئے تھے۔ ان کے والد بھی اس وقت وہیں تھے۔ تعلیم کا آغاز والد سے کیا اور ان سے ابتدائی درسی کتابیں پڑھیں جو اس زمانے کے دینی مدارس میں پڑھائی جاتی تھیں۔ بعد ازاں شیعہ عالم مرزا محمد علی لکھنوی سے حمد اللہ کی شرح سلّم تک کتبِ درسیہ پڑھیں۔ پھر واپس لکھنؤ آ گئے۔ لکھنؤ میں اس وقت مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے حلقۂ درس کی بڑی شہرت تھی، اس میں شریک ہوئے اور باقی تمام کتابوں کی تکمیل انہی سے کی۔ فنون ادب عربی شیعہ مدرس مفتی عباس علی تستری سے پڑھے۔ معقولات کی تکمیل کے بعد ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۱ء) دہلی میں کا قصد کیا۔ علوم حدیث کی تدریس میں اس وقت حضرت میاں سید نذیر حسین کا بڑا شہرہ تھا۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ مختلف ملکوں کے بہت سے تشنگانِ علومِ حدیث ان کی خدمت میں کھنچے آتے اور حدیث اور علوم حدیث میں ان سے استفادہ کرتے، عبدالحلیم شرر نے بھی ادھر کا رخ کیا اور اس قبلہ گاہ عالم حدیث کے درس میں پہنچے۔ ڈھائی سال ان کی خدمت میں رہے، ان سے کتب حدیث کا درس لیا اور مستحق سند قرار پائے۔

خود ہی رقم طراز ہیں:

[حضرت میاں صاحب کے] مدرسے میں قیام کرتے ہی بخاری شریف کے سبق میں شامل ہو گیا جو صبح کو کچھ دن چڑھے سے شروع ہوتا اور یہی وہاں کا معرکہ آرا سبق تھا، جس میں مختلف عقائد اور خیال کے چالیس پچاس طلبا شریک ہوئے اور احادیث سے جو فقہی مسائل اخذ کیے جاتے ہیں اور مسالکِ فقہائے سلف کے متعلق بحث ہوتی۔ سخت دو قدح ہوتا اور میاں صاحب اپنے تبحر علمی سے سب کو قائل کر کے ثابت کر دیتے کہ بخاری کا مذہب صحیح ہے۔ میں دو ڈھائی سال میاں صاحب کے مدرسے میں رہا۔ پوری بخاری ختم کی، جس کا سلسلہ سال بھر رہا۔ صحیح مسلم،

Marfat.com

ابوداؤد، نسائی اور موطا امام مالک دوسرے اوقات میں ختم ہوئیں۔ ماہِ مبارک رمضان میں تفسیر جلالین پڑھی۔ سبق کے علاوہ طلبا میں باہم ہمیشہ مناظرہ ہوتا رہتا اور احادیث اور رجال پر نظر وسیع ہوتی جاتی۔"

مولانا عبدالحلیم شرر کا اب تعلیمی سفر ختم ہوا۔ اس سفر کے اختتام کے بعد انھوں نے درس وتدریس کو مرکزِ توجہ نہیں ٹھہرایا بلکہ قلم وقرطاس سے دوستی پیدا کی اور پھر زندگی کے آخری دم تک اس سے رفاقت اختیار کیے رکھی۔ کسی لمحے نہ قلم نے ان کا ساتھ چھوڑا، نہ انھوں نے اس سے جدا ہونا گوارا کیا۔

ان کی شہرت تو بے شک ناول نگار کی ہوئی لیکن ان کے قلم کا دائرہ صرف ناول نگاری تک محدود نہیں رہا۔ انھوں نے دیگر صنفِ تحریر میں بھی جدوجہد کی۔ نبی ﷺ کی سیرت لکھی، تاریخ اسلام کو موضوعِ تحریر بنایا، میدان صحافت میں اترے، مضامین لکھے، مختلف موضوعات پر گراں مایہ مقالے سپردِ قلم کیے۔ وہ عربی کے نامور عالم تھے، عربی کی کئی اہم علمی اور تاریخی کتابوں کے اردو میں ترجمے کیے۔ وہ کسی موضوع میں بند نہ تھے۔ ان کے قلم کی ہمہ گیری اور ان کے فکر کی بوقلمونی نے خوب رنگ باندھا اور ہر میدانِ تحریر میں اپنے جوہر دکھائے۔ وہ اردو کے شاعر بھی تھے، لیکن ان کا شعری سرمایہ بہت کم ہے اور جو ہے اس سے بھی لوگ زیادہ آگاہ نہیں ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ مولانا عبدالحلیم شرر کو اردو میں لکھنے اور پڑھنے سے دلچسپی کیسے پیدا ہوئی اور انھوں نے کیوں اور کب یہ محاذ سنبھالا؟

چند الفاظ میں اس سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ زندگی کے ابتدائی دور ہی میں اپنے نانا کے پاس مٹیا برج کلکتہ میں رہنے لگے تھے، جہاں انگریزوں نے اودھ کے نواب واجد علی شاہ کو لکھنؤ سے جلاوطن کر کے بھیجا تھا۔ اب واجد علی شاہ کا دربار لکھنؤ کی طرح وہاں بھی ادیبوں اور شاعروں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ شرر نے اسی ماحول میں ہوش سنبھالا اور ان کے دل میں اردو لکھنے پڑھنے کے ذوق نے کروٹ لی۔ پھر جب واجد علی شاہ کی اس بزم کا شیرازہ بکھر گیا تو وہ اپنے آبائی مسکن لکھنؤ واپس آ گئے اور مستقل طور پر تحریر و کتابت کو اپنا مشغلہ قرار دے لیا۔

واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس سلسلے کا آغاز دہلی کے زمانۂ طالب علمی میں حضرت میاں سید نذیر حسین کے مدرسے میں کیا اور مولانا تلطف حسین کے کہنے سے شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدی کی کتاب "التوحید" کو اردو کے قالب میں ڈھالا۔ یہ ان کی وہ کاوش تھی جو اصل عربی متن کے ساتھ ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۲ء) میں مطبع فاروقی دہلی میں چھپی۔ لیکن اس ترجمے نے وہ شہرت نہیں پائی جو ان کی دوسری کتابوں

Marfat.com

کے حصے میں آئی۔

اس کے بعد ان کا کلکِ ہنر آشنا سطحِ کاغذ پر رواں ہوگیا۔ اب اس کی رفتار بھی روز بروز بڑھتی گئی اور نگارشات کی رنگا رنگی میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ان کا اصل موضوع اسلامی تاریخ تھا اور اس موضوع میں انھوں نے جو تنوع پیدا کیا، وہ انہی کا حصہ تھا۔

پہلے ان کی صحافت کی طرف آیے۔ وہ ایک عرصے تک لکھنؤ کے ''اودھ اخبار'' میں لکھتے رہے۔ خود انھوں نے بھی مختلف اوقات میں چار اخبار جاری کیے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے۔ اس نقطۂ نظر کی اشاعت کے لیے ''اتحاد'' کے نام سے اخبار جاری کیا۔ ان کا ایک بہت مشہور اخبار ''دل گداز'' تھا جو طویل مدت تک جاری رہا۔ ایک اور اخبار جو انھوں نے جاری کیا، اس کا نام ''محشر'' تھا۔ خواتین سے متعلق ایک رسالہ ''پردۂ عصمت'' جاری کیا۔ صحافت کے میدان میں ان کی کاوشوں نے بڑی شہرت پائی اور ان کے جاری کردہ رسائل و جرائد کو بہت پڑھا گیا۔

ان کے ناولوں میں ملک العزیز ورجنا، فلورا فلورنڈا، قیس و لبنیٰ، حسن انجلینا، فردوس بریں، مقدس نازنین، منصور موہنا مشہور ناول ہیں۔ ان سطور کے راقم نے سب سے پہلے ان کا ناول ملک العزیز ورجنا پڑھا، پھر حسن انجلینا اور پھر فلورا فلورنڈا پڑھے۔ اس کے بعد ان کے تقریباً تمام ناول بڑی دلچسپی پڑھے۔ یہ تقسیم ملک سے بہت پہلے طالب علمی کے زمانے کی بات ہے۔ ان ناولوں کے علاوہ کسی کا ناول پڑھنے کو جی نہیں چاہا۔

تاریخی کتابوں میں سے تاریخ سندھ، تاریخ سسلی، فتح اسپین، تاریخ بغداد، تاریخ اسلام، تاریخ حروبِ صلیبیہ، صقلیہ میں اسلام وغیرہ کتابوں کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔

سوانح عمریاں بھی انھوں نے لکھیں۔ ان میں نبی ﷺ کی سیرت طیبہ دو جلدوں میں، ابوبکر، شبلی، جنید بغدادی مشہور سوانح عمریاں ہیں۔ جو ان کے قلم سے نکلیں۔

سید سلیمان ندوی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مرحوم اخلاق کے لحاظ سے باوضع، خاکسار، پابند اوقات اور ملنسار تھے۔ چھوٹوں سے ملنے میں ان کی عزت اور تعظیم اور ان کے کارناموں کی قدر شناسی میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے تھے...... ان کی کتابوں کی بڑی مانگ تھی اور تمام مطبع والے بے پوچھے گچھے ان کی کتابیں چھاپتے رہے، مگر انھوں نے کبھی کوئی باز پرس نہ کی۔ مرحوم رات کو جاگ کر کام کرنے کے عادی تھے۔ چنانچہ رات کا کھانا ایک بجے کھا کر سوتے تھے۔'' [1]

[1] یادِ رفتگاں: ص ۸۲.

Marfat.com

مولانا ابوعلی اثری مرحوم کی ایک کتاب ''چند رجال حدیث'' ہمارے دوست جناب ضیاء اللہ کھوکھر نے اپنے ادارے ''ندوۃ المحدثین'' گوجراں والا کی طرف سے شائع کی ہے، اس میں ایک مضمون بعنوان ''مولانا عبدالحلیم شرر'' بھی شامل ہے۔ اس میں مصنف مرحوم رقم طراز ہیں:

''مولانا عبدالحلیم شرر مسلکاً اہل حدیث تھے'' اور ان کو اس مسلک سے اتنا شغف تھا کہ ان سے جو بھی ملنے جاتا اس سے اپنے مسلک کے مطابق نماز پڑھواتے۔'' اسے بتاتے کہ قرآن وحدیث کے مطابق یہی مسلک ہے۔

مولانا ممدوح اردو کے ادیب، عربی کے فاضل، فارسی کے ماہر، انگریزی اور فرنچ زبانوں سے آشنا تھے۔ وہ یورپ کا سفر بھی کر آئے تھے۔ [1]

اس جلیل القدر مصنف ومورخ نے اواخر دسمبر ۱۹۲۶ء میں وفات پائی۔

❀❀❀❀

[1] نزہۃ الخواطر: ج ۸، ص ۲۴۴، ۲۴۵۔ چند رجال حدیث: ص ۸۱ تا ۸۹۔ یادرفتگان: ص ۸۰ تا ۸۳.

Marfat.com

مولانا ابوالمکارم محمد علی مئوی

(وفات ۲۶- اکتوبر ۱۹۳۳ء)

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے مختلف مقامات میں بے شمار علمائے کرام پیدا ہوئے۔ لاتعداد دیہات و قصبات اور بلاد و امصار میں انھوں نے مدارس قائم کیے اور اللہ کے دین کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ ان مقامات میں ایک شہر کا نام مئو ناتھ بھنجن ہے۔ اس شہر میں علوم دینیہ کی خوب نشر و اشاعت ہوئی اور اس کے دیہات میں بھی علم کی ترویج کا درجہ غایت اہتمام کیا گیا۔ مئو کے اصحاب علم میں ایک عالم دین مولانا ابو المکارم محمد علی تھے جن کا سال ولادت ۱۳۰۸ھ (۱۸۹۱ء) ہے۔ والد کا نام محمد فیض اللہ تھا۔ ابتدا میں مختلف اساتذہ سے کچھ کتابیں پڑھنے کے بعد حضرت حافظ عبداللہ غازی پوری سے اخذِ فیض کیا۔ اس وقت حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے درسِ حدیث کی شہرت ملکی اور غیر ملکی حلقوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ مولانا ابوالمکارم نے ان کے دائرۂ تلامذہ میں بھی شرکت کی اور سند و اجازۂ حدیث کا شرف حاصل کیا۔ درسی علوم متداولہ سے فراغت پائی تو حکیم عبدالحفیظ دہلوی سے فنِ طب پڑھا اور حکیم حاذق کے مرتبے کو پہنچے۔

کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے تکمیل تعلیم کے بعد کہیں ملازمت وغیرہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ پڑھنے پڑھانے اور لکھنے سے تعلق جوڑا اور اسی کو مقصدِ حیات قرار دے لیا۔ مساجدِ اہل حدیث کی تعمیر میں بھی سرگرم ہوئے۔

ایک حنفی عالم نے نماز میں زیر ناف ہاتھ باندھنے کے مسئلے پر ایک رسالہ لکھا۔ مولانا ابو المکارم محمد علی مئوی نے اس کے جواب میں ایک رسالہ تحریر فرمایا اور ”المجن المحمدیہ“ اس کا نام رکھا۔ اس زمانے میں نواب صدیق حسن خاں کی طرف سے اہل علم کی قدر دانی کا سلسلہ جاری تھا۔ نواب صاحب نے مولانا محمد علی کا یہ رسالہ پڑھا تو ان کا تیس روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس دور میں تیس روپے کی بڑی اہمیت تھی۔ ویسے بھی وظیفہ ایک بہت بڑا انعام ہوتا ہے۔ یہ تو ایک روپیہ بھی گراں مایہ شے ہے۔

مولانا ابوالمکارم محمد علی مئوی علم حدیث میں عمیق نگاہ رکھتے تھے اور اللہ کی مہربانی سے اس پر عامل بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد مسائل میں علمائے احناف سے ان کے تحریری مباحث جاری رہے۔ مولانا ظہیر الحسن شوق نیموی سے بالخصوص ان کی ٹکر رہی۔

Marfat.com

مولانا ابوالمکارم کی چھوٹی بڑی کل تصانیف کی تعداد پچیس تک پہنچتی ہے۔ ان میں عربی، اردو دونوں زبانوں کی تصانیف شامل ہیں۔ ان کتابوں میں دیہات میں جمعہ پڑھنے، نماز میں رفع یدین کرنے، مولود و قیام کی تردید اور دیگر موضوعات سے متعلق کتابیں ہیں۔

مولانا ممدوح نے لوگوں کو علمی دولت بھی عطا کی اور مال و زر سے بھی ان کی مدد کرتے رہے۔ مختلف مقامات میں انھوں نے اہل حدیث حضرات کے لیے کئی مسجدیں تعمیر کرائیں۔

انھوں نے ۷- رجب ۱۳۵۲ھ (۲۶- اکتوبر ۱۹۳۳ء) کو وفات پائی۔ اللھم اغفرله و ارحمه و عافه و اعف عنه ۔ ❶

مولانا ابوالنعمان عبدالرحمٰن اعظمی نے ان کے مندرجہ ذیل مادہ ہائے تاریخ وفات نکالے۔

(۱) بتاریخ الحق ۱۳۵۲ھ

(۲) صاحب فضل ابوالمکارم ۱۳۵۲ھ

(۳) ایں محمد علی معظم حال ۱۳۵۲ھ

(۴) کرد طے عمر خود بنعمت و فضل

(۵) منہدم شد اساس ہمت و فضل ❷ ۱۹۳۳ء

❀❀❀❀

❶ نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۴۷۴، تراجم علمائے حدیث ہند: ص ۴۲۳ تا ۴۲۶.

❷ تراجم علمائے حدیث ہند ص ۴۲۴.

Marfat.com

مولانا نور احمد ڈیانوی

(تاریخ وفات نامعلوم)

مولانا نور احمد بن گوہر علی بن مہر علی تیمی قریشی ڈیانوی اپنے عہد کے شیخ، عالم اور محدث تھے۔ علمائے صالحین میں شمار کیے جاتے تھے۔ ۹۔ ذی الحجہ ۱۲۶۵ھ (۲۶-اکتوبر ۱۸۴۹ء) کو عظیم آباد (پٹنہ صوبہ بہار) میں پیدا ہوئے۔ مختصرات کی تعلیم مولانا عبدالحکیم شیخ پوری سے پائی اور باقی کتب درسیہ مولانا لطف علی بہاری سے پڑھیں۔ ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) کو حج وزیارت کا شرف حاصل کیا اور وہاں شافعی المسلک عالم سید احمد بن زینی دحلان مکی سے سندِ حدیث لی۔ پھر واپس ہندوستان آئے تو حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی سے وابستگی اختیار کی اور ان سے اخذِ فیض کیا اور سند حاصل کی۔ مولانا احمد علی سہارن پوری سے بھی حصولِ علم کا موقع ملا۔ شیخ حسین بن محسن یمانی کی شاگردی میں رہنے کی سعادت بھی حاصل کی۔ ذکی، سریع الادراک، عالی ہمت اور صاحبِ جلال عالم تھے۔ افسوس ہے ان کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

Marfat.com

مولانا فضل حسین بہاری

(تاریخ وفات نا معلوم)

علم وعلما کے اعتبار سے برصغیر (پاک و ہند اور بنگلہ دیش) کا علاقہ نہایت پر ثروت علاقہ ہے۔ اس علاقے میں اس قدر اصحاب علم عالم وجود میں آئے کہ لا تعدو لا تحصی۔ انھیں گنتی شمار میں لانا ممکن نہیں۔ ان کی خدمات کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ تصنیف و تالیف، درس و تدریس، وعظ و خطابت غرض ہر شعبے میں انھوں نے تگ و تاز کی، اور اللہ و رسول ﷺ کے احکام کو پھیلانے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ لیکن اس طائفہ مقدسہ میں سے بے شمار لوگوں کے حالات سے ہم بے خبر ہیں۔ ان میں ایک بزرگ یہی مولانا فضل حسین بہاری ہیں، جنھوں نے حضرت میاں نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ کے سوانح حیات ''الحیات بعد الممات'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب میں قلم بند کیے۔ انھوں نے حضرت مرحوم کے سیکڑوں شاگردوں کے نام اور کام سے ہمیں مطلع فرمایا۔ ان کے اساتذہ کرام کی تفصیل بیان فرمائی، لیکن خود ان کے حالات سے ہم بے خبر ہیں۔ میں نے ان کے واقعاتِ زندگی تلاش کرنے کی بڑی کوشش کی، لیکن کہیں سے نہیں ملے۔ میرا مطالعہ محدود ہے، ممکن ہے کسی اور دوست کی نظر ان کے حالات تک پہنچ جائے۔

انھوں نے اپنا ذکر ''الحیات بعد الممات'' میں حضرت میاں صاحب کے ان شاگردوں کی فہرست میں کیا ہے جو صوبہ بہار کے ضلع پٹنہ سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن چند الفاظ میں .... فرماتے ہیں:

> ''خاکسار سوانح نگار فضل حسین ساکن مہدانواں ضلع پٹنہ، متوطن مظفر پور جس کا نام تاریخی غلام منعم (۱۲۷۱ھ) ہے۔ تاریخ ولادت ۲۷۔ محرم ۱۲۷۱ھ مطابق ۲۰۔ اکتوبر ۱۸۵۴ء ہے اور جس نے اس سوانح نگاری کے سوا ذی شعور ہونے سے لے کر اس وقت تک کوئی کار خیر نہیں کیا۔'' [1]
>
> (اس سے آگے تین شعر ہیں)

''الحیات بعد الممات'' پہلی دفعہ دہلی میں شائع ہوئی تھی اور نایاب تھی۔ دوسری دفعہ قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۵۹ء (۱۳۷۹ھ) میں مکتبہ شعیب کراچی نے چھوٹے سائز پر شائع کی جو ۷۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

---

[1] الحیات بعد الممات: (ناشر: مکتبہ شعیب حدیث منزل، کراچی، ۱۳۷۹ھ-۱۹۵۹ء) صفحہ ۲۶۶

Marfat.com

اگرچہ اس میں کتابت اور پروف ریڈنگ کی غلطیاں ہیں، لیکن غنیمت ہے کہ کتاب شائع ہوگئی۔ غلطیاں ہر کتاب میں رہ جاتی ہیں۔ خود میری تقریباً ہر کتاب میں قارئین حضرات بہت سی غلطیوں کی نشان دہی کرتے ہیں اور غلطیاں دیکھ کر سخت ذہنی کوفت ہوتی ہے۔

میں دراصل عرض یہ کر رہا تھا کہ حضرت میاں صاحب کے شاگرد اور ان کے سوانح نگار مولانا فضل حسین بہاری کے حالات مجھے کہیں سے نہیں ملے۔ بس ان کی تاریخ ولادت ملی ہے جو خود انہی نے لکھی ہے۔ تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا محمد یوسف بگھیلوی فیروز پوری

(تاریخ وفات نامعلوم)

مشرقی پنجاب کے ضلع فیروز پور کی تحصیل زیرہ میں متعدد علمائے کرام موجود تھے، جنھوں نے بالخصوص تدریسی شکل میں بے حد خدمات سرانجام دیں۔ ان میں ایک عالم دین مولانا محمد یوسف تھے جو موضع ''بگھیلے والا'' کے رہنے والے تھے۔ نہایت صالح اور عالی کردار بزرگ۔ جس طرح دیگر بے شمار علمائے کرام کے حالات پردۂ خفا میں ہیں، اسی طرح ان کے حالات سے بھی ہم بے خبر ہیں۔ اس نواح کے شائقینِ علم تحصیل علم کے لیے زیادہ تر لکھوکے کا قصد کرتے تھے۔ وہاں سے آگے کی منزل امرتسر کا مدرسہ غزنویہ ہوتا تھا۔ خیال یہ ہے کہ مولانا محمد یوسف بگھیلوی فیروز پوری نے بھی لکھوی اور غزنوی علما سے کسبِ علم کیا ہوگا۔ لیکن یہ یقینی امر ہے کہ وہ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے بقول وہ ''حضرت شیخ الکل مولانا سید محمد نذیر حسین دہلوی قدس اللہ روحہ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے جن کی فقہ متداول اور فقہ الحدیث پر وسیع اور گہری نظر کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ''فتاویٰ نذیریہ'' میں بھی آپ کے بعض فتاویٰ موجود ہیں جو حضرت میاں صاحب کے تصدیق فرمودہ ہیں۔''

حضرت میاں صاحب کے تذکرہ نگار مولانا فضل حسین بہاری کے بقول ''مولوی محمد یوسف بن ابراہیم بگھیلوی قبل از غدر'' کے شاگرد ہیں۔ (الحیات بعد الممات: صفحہ ۶۸۹ مطبوعہ کراچی)

ان کے بعض شاگردوں سے میری جان پہچان رہی ہے۔ افسوس ہے بہت سے علمائے کرام کے حالات نہ کوئی اہل علم لکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ وہ خود لکھنے یا لکھانے پر آمادہ ہوتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی تصنیفی یا تدریسی مساعی تو کچھ نہ کچھ ہمارے سامنے ہوتی ہیں، لیکن ان کے دیگر بنیادی حالات سے ہم بالکل بے خبر ہوتے ہیں۔ یہ فقیر اپنے طور پر حضراتِ علما کے واقعاتِ حیات محفوظ کرنے کی سعی کر رہا ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ اس نیک مقصد میں کامیابی عطا فرمائے۔

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا لیاقت حسین امواوی

(وفات ۲۳-ستمبر ۱۹۳۷ء)

موجودہ دور کے ہندوستان کے اٹھائیس صوبوں میں سے ایک صوبہ بہار ہے۔ اس صوبے کے مختلف مقامات میں لاتعداد علمائے کرام عالم وجود میں آئے، جن میں اہل حدیث علما کا سلسلہ لا تُعدّ و لا تحصیٰ کا سا ہے۔ بیسویں صدی عیسوی کے بہاری علما میں حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی اور ان کے شاگردانِ گرامی میں سے مولانا شمس الحق ڈیانوی، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، مولانا ابومحمد ابراہیم آروی، سید علی نعمت پھلواروی، مولانا فضل حسین بہاری، مولانا تلطف حسین بہاری اور دیگر ان گنت حضرات لائقِ تذکرہ ہیں، جن کے حالات یہ فقیر اپنی مختلف تصانیف میں بیان کر چکا ہے۔

ان سے قبل انیسویں صدی کے کثیر التعداد علمائے حدیث میں سے مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی، مولانا احمد اللہ عظیم آبادی، مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی وغیرہ بے حد قابلِ تکریم اصحابِ علم ہیں، جنھیں آزادیٔ برصغیر کے لیے نہایت اذیت ناک حالات سے گزرنا پڑا اور انھیں جزائر انڈمان (کالے پانیوں) کی شدید ترین سزائیں دی گئیں۔ ان کا تذکرہ بھی اس خاک نشین کی بعض کتابوں میں مرقوم ہے۔

اب بھی اس صوبے کے بے شمار بلاد و امصار اور قصبات و دیہات میں علمائے حدیث بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں اور ان کے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے وسیع مراکز قائم ہیں۔ ہندوستان کی حدود سے باہر متعدد اسلامی ممالک بلکہ یورپ و افریقہ کے بعض ملکوں میں بھی اس صوبے کے اہل علم کسی نہ کسی انداز میں تبلیغ دین کی اہم خدمت سرانجام دے رہے ہیں اور ان میں سے کتنے ہی بزرگوں اور دوستوں کے واقعاتِ حیات اس عاجز کے ذریعے سے خوانندگانِ کرام کے مطالعہ میں آچکے ہیں۔

صاحبِ ترجمہ مولانا لیاقت حسین امواوی کا تعلقِ سکونت بھی اسی صوبہ بہار سے تھا۔ ان کا مختصر سلسلۂ نسب یہ ہے: لیاقت حسین بن سعادت حسین بن محمد حافظ بن عبدالکریم۔ یہ آخر الذکر بزرگ یعنی شیخ عبدالکریم دہلی کے قریب صوبہ ہریانہ کے ایک مقام کے رہنے والے تھے۔ پھر حالات ایسے پیدا ہوئے کہ وہ وہاں سے نکلے اور صوبہ بہار کے علاقہ مظفر پور میں جا آباد ہوئے۔ وہاں ان کے بیٹے محمد حافظ نے جنگل صاف کر کے ''اموا'' نام کی بستی آباد کی۔ ان کے بیٹے سعادت حسین اس بستی کے امام اور دینی پیشوا تھے۔ لیکن سخت قسم کے

Marfat.com

حنفی تھے اور ایک پیر کے مرید تھے۔

ان کے بیٹے لیاقت حسین کی ولادت ۱۸۶۵ء میں بمقام اموا (ضلع شیوہر) میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے گھر کے قریب ایک بزرگ قربان میاں سے حاصل کی۔ اردو اور فارسی کی کتابیں امواکلاں کے ایک ہندو کائستھ سے پڑھیں۔ دینی علوم کی تحصیل کے لیے مدرسہ جامع العلوم مظفر پور کے بانی مولانا شاہ احمد اللہ کی خدمت میں گئے۔ ان سے عربی زبان وادب، تفسیر وحدیث، فقہ واصول اور دیگر علوم شرعیہ کا درس لیا۔ اب ان کی علمی صلاحیتیں اجاگر ہوگئی تھیں اور اس سلسلے کی بہت سی کتابیں انھوں نے باقاعدہ پڑھ لی تھیں۔

اسی اثنا میں انھیں مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کا پتا چلا جو حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی سے تعلیم حاصل کر کے رحیم آباد میں اپنے والد کے جاری کردہ مدرسے میں طلبا کو تعلیم دے رہے تھے۔ لیاقت حسین نے اپنے استاذ محترم مولانا احمد اللہ شاہ صاحب سے اجازت لی اور رحیم آباد جا کر مولانا عبدالعزیز سے تحصیل علم کرنے لگے۔ لیاقت حسین حنفی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اسی مسلک پر عامل تھے۔ مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کی خدمت میں گئے تو وہاں نماز پڑھنے کا سلسلہ کچھ اور طرح کا تھا۔ اب انھوں نے اپنے استاذ مکرم مولانا احمد اللہ صاحب کی طرف رجوع کیا اور مسائل کی وضاحت طلب کی تو انھوں نے فرمایا کہ صحیح مسئلہ وہی ہے جس پر مولانا عبدالعزیز عمل کرتے ہیں، آپ بھی اسی پر عمل کریں۔ چنانچہ انھیں اطمینان ہوگیا اور مسلکِ اہل حدیث پر عامل ہوگئے۔

مولانا لیاقت حسین نہایت صابر وشاکر، مستقل مزاج، محقق اور جرأت مند شخص تھے۔ وہ مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی سے تحصیل علم کے بعد گھر آئے تو بدعات کی مخالفت اور ان رسوم ورواج کی جو ان کے ہاں رائج تھیں، تردید کرنا شروع کی اور اسی طرح نماز پڑھنے لگے، جس طرح نماز پڑھنے کا نبی ﷺ نے حکم دیا ہے۔ اس پر باپ بیٹے کے درمیان اختلاف پیدا ہوگیا اور انھیں گھر سے نکال دیا گیا۔ اب وہ دیہات میں جاتے اور لوگوں کو کتاب وسنت کے احکام بتاتے اور ان پر عمل کی تلقین فرماتے۔ ایک مرتبہ آئے اور سلام کیا تو والد نے سلام کے جواب میں جوتے مارنا شروع کر دیے۔ ان کے چچا نے بھائی کو اس سے روکنے کی کوشش کی تو سعادت مند بیٹے نے عرض کیا کہ والد محترم کی یہ سختی میرے لیے دعاے خیر کا درجہ رکھتی ہے اور ان شاء اللہ یہ دخولِ جنت کا ذریعہ ثابت ہوگی۔ بہر کیف کئی سال یہ سلسلہ جاری رہا اور گھر سے اخراج کے اس زمانے میں انھوں نے دیہات وقصبات میں جا کر اسلام کی خوب تبلیغ کی۔ بعض مقامات پر انھوں نے اس اثنا میں تدریسی خدمات بھی سرانجام دیں۔

باپ کی سختی کا لوگوں پر اثر یہ ہوا کہ بیٹے کا جو باپ کے ہاتھوں تکلیف اٹھا رہا ہے، موقف صحیح ہے اور دین کے سلسلے میں اس کا نقطۂ نظر درست ہے۔ کتنے ہی لوگوں نے اسی سختی کی وجہ سے کتاب وسنت پر عمل کرنا شروع کر دیا اور توحید کی صحیح راہ اپنالی۔

Marfat.com

اب دیکھیے حالات بدلتے ہیں اور مولانا لیاقت حسین کے والد سعادت حسین بھی توحید کی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔ ہوا یہ کہ سعادت حسین صاحب کے پیر صاحب ان کے گاؤں ''اموا'' آئے اور ان کے مکان پر قیام پذیر ہوئے۔ ان کے قریب کے گاؤں میں بھی ایک پیر صاحب آئے تھے۔ ان پیر صاحب نے سعادت حسین صاحب کے پیر کے نام ایک خط بھیجا، جس میں بعض ''راز کی باتیں'' لکھی گئی تھیں۔ جب قاصد خط لے کر آیا، اس وقت پیر صاحب اتفاق سے گھر پر نہیں تھے، کہیں گئے ہوئے تھے۔ سعادت حسین صاحب نے خط وصول کیا اور اسے پڑھنے لگے۔ اتنے میں پیر صاحب بھی آ گئے۔ انھوں نے ان کو خط پڑھتے دیکھا تو سخت خفگی کا اظہار کیا اور فتویٰ دیا کہ جو شخص کسی کا خط پڑھے، اس کی بیوی کو طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ یہ عجیب وغریب فتویٰ سن کر سعادت حسین سخت پریشان ہوئے۔ اتنے میں حسنِ اتفاق سے ان کے بیٹے مولانا لیاقت حسین بھی آ گئے۔ انھوں نے بیٹے سے پوچھا: ''لیاقت! تم یہ بتاؤ کہ کسی کا خط پڑھنے سے بیوی کو طلاق واقع ہو جاتی ہے؟''

بیٹے نے جواب دیا: ''ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

پیر صاحب نے کہا: ''مسئلہ اسی طرح ہے، جس طرح میں نے کہا ہے۔ یعنی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔''

انھوں نے اس فتوے کی دلیل طلب کی اور بحث کا سلسلہ آگے بڑھا تو پیر صاحب لاجواب ہو کر وہاں سے نکل گئے۔ اب سعادت حسین صاحب کی آنکھیں کھلیں۔ انھیں لیاقت حسین کے نقطۂ نظر کی صحت کا پتا چلا اور پیری مریدی کے جھوٹ کا علم ہوا تو وہ عامل بالحدیث ہو گئے۔

مولانا لیاقت حسین امواوی تمام عمر توحید وسنت کی اشاعت میں مشغول رہے۔ بدعات اور پیری مریدی سے کنارہ کش ہونے کے بعد سعادت حسین صاحب نے بھی تبلیغ توحید کو اپنا مقصدِ حیات قرار دے لیا۔ مولانا ممدوح نے زمین خریدی اور اس میں مدرسہ جاری کیا۔ اموا اور اس کے اردگرد کے دیہات کے لوگ ان کے ساتھ تھے۔ انھوں نے ان کی بے حد مدد کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تبلیغ دین کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ انھوں نے نیپال میں بھی دورے شروع کیے اور ان کے وعظ وتقریر کی وجہ سے وہاں کے بے شمار لوگوں نے مسلکِ اہل حدیث اختیار کیا اور عاملِ کتاب وسنت ہوئے۔ ابتدا میں انھیں بے شک کچھ تکلیفوں کا سامنا رہا تھا، لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے تمام تکلیفیں رفع فرما دیں اور وہ بلا کسی قسم کی رکاوٹ کے کتاب وسنت کی اشاعت اور درس وتدریس کے ذریعے تبلیغ دین میں سرگرم عمل رہے۔ پتا چلا ہے کہ جس کارِ خیر کا انھوں نے آغاز فرمایا تھا، وہ اللہ کی مہربانی سے باقاعدہ جاری ہے اور اب ان کے پڑپوتے مولانا رضوان سلفی یہ دینی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ مولانا لیاقت حسین امواوی نے ۲۳۔ ستمبر ۱۹۳۷ء کو سفرِ آخرت اختیار کیا اور ان کے گاؤں اموا کے قبرستان میں انھیں دفن کیا گیا۔

اللھم اغفرله و ارحمه و عافه و اعف عنه.

Marfat.com

مولانا عبدالحق ملتانی

(وفات ۱۹۴۵ء)

ملتان شہر کے گزشتہ صدی کے مشہور علمائے کرام میں مولانا عبدالحق ملتانی کا اسم گرامی بڑا نمایاں رہا ہے۔ وہ اپنے عہد کے نامور محدث، ممتاز مفتی، ژرف نگاہ فقیہ، لاجواب خطیب، ماہرِ فنِ تدریس اور راسخ العلم عالم دین تھے۔ ان کا مختصر سلسلۂ نسب یہ ہے۔ عبدالحق بن سلطان محمود بن فرید الدین آفریدی افغانی۔۔۔ یہ خاندان افغانستان کے آفریدی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا اور ان کے کوئی بزرگ وہیں سے ملتان آئے اور محلّہ قالین بافاں میں سکونت پذیر ہوئے۔

عبدالحق کی ولادت اسی محلے میں ۱۸۷۰ء (۱۲۸۵ھ) میں ہوئی۔ ان کے والد گرامی مولانا سلطان محمود افغانی کا شمار اپنے زمانے کے جلیل القدر علما و مدرسین میں ہوتا تھا۔ ملتان کے ایک صاحبِ علم بزرگ جناب عبدالمجید خاں ساجد کو مولانا عبدالحق افغانی کے تربیت یافتہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ان کی عمر ۸۷ سال کے لگ بھگ ہے۔ مولانا کے بارے میں انھوں نے حافظ ریاض احمد عاقب (مدرس مرکز ابن قاسم الاسلامی) کو بتایا کہ ۱۹۳۱ء میں وہ اپنے والد محترم محمد ابراہیم خاں کے ساتھ مسجد اہل حدیث میں گئے۔ وہاں انھوں نے مولانا عبدالحق کو دیکھا: کشادہ پیشانی، نورانی چہرہ، آنکھوں میں سرمہ، سفید گھنی ریش مبارک، سر پر سفید عمامہ، سرخ و سفید رنگ، باریک ہونٹ، پنڈلی تک شلوار، قرن اوّل کی پُر وقار اور بارعب شخصیت معلوم ہوتے تھے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ مولانا کے پوتے مولانا انیس الحق افغانی شکل و شباہت میں ان سے کچھ ملتے جلتے ہیں۔

یہاں یہ بتانا شاید مناسب ہوگا کہ جناب عبدالمجید خاں ساجد صاحب کے والدِ گرامی محمد ابراہیم خاں اردو اور پنجابی کے شاعر تھے اور مولانا سلطان محمود اور مولانا عبدالحق کے مواعظ سے متاثر ہو کر عامل بالحدیث ہوئے تھے۔ ان کے خاندان کے لوگ اب بھی مولانا کے خاندان سے عقیدت و ارادت کا علاقہ رکھتے ہیں۔

مولانا عبدالحق ملتانی کے والد مکرم مولانا سلطان محمود خاں کا اپنی مسجد واقع محلّہ قالین بافاں میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ دیگر طلبا کے ساتھ ان کے دونوں بیٹے عبدالعزیز اور عبدالحق بھی ان سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ انھوں نے اس زمانے کے درسیات کی تمام متداول کتابیں خاص ترتیب کے ساتھ والدِ ذی اکرام سے پڑھیں۔ جب وہ مروّجہ طالب علمی کے مراحل طے کر چکے تو والد نے ان کو دہلی حضرت میاں

Marfat.com

سید نذیر حسین کی خدمت میں بھیج دیا تاکہ وہ ان سے حدیث اور دیگر علوم میں استفادہ کریں۔ حضرت میاں صاحب کی خدمت میں مختلف مقامات سے استفتا کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ بعض استفتا وہ اپنے لائق شاگردوں کے حوالے کر دیتے تھے اور وہ ان کے جواب لکھ کر نیچے اپنا نام لکھتے اور تصدیق کے لیے حضرت میاں صاحب کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ مولانا عبدالحق چوں کہ طالب علمی کے زمانے میں کتبِ حدیث وفقہ پر گہری نظر رکھتے تھے، اس لیے انھیں بھی استفتا کے جواب کے لیے حکم دیا جاتا تھا۔ وہ استفتا اور ان کے جواب ''فتاویٰ نذیریہ'' میں موجود ہیں۔ ان میں سے بعض پر ۱۳۱۷ھ اور بعض پر ۱۳۱۸ھ کی تاریخ مرقوم ہے۔

حضرت میاں صاحب نے ۱۳۲۰ھ میں وفات پائی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مولانا عبدالحق ملتانی میاں صاحب کے آخری دور میں دہلی پہنچے اور ان کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ حضرت میاں صاحب کے وہ لائق شاگرد تھے اور فتویٰ نویسی کے بارے میں میاں صاحب اپنے اس شاگرد پر اعتماد کرتے تھے، اور یہ بہت بڑا اعزاز تھا جو نوجوان شاگرد کو دنیا کے رفیع المرتبت محدث واستاذ کی طرف سے حاصل ہوا۔ مولانا کے ہاتھ کے لکھے ہوئے چند فتوے حافظ ریاض احمد عاقب کے پاس موجود ہیں۔

حضرت میاں صاحب سے استفادے کے بعد مولانا عبدالحق واپس ملتان آئے اور درس وتدریس میں مشغول ہو گئے اور طلبا کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا، جس کے نتیجے میں ملتان اور اس کے دور ونزدیک علاقوں میں صدائے توحید پورے زور سے گونجنے لگی۔ وہ توحید کی نعمت سے محروم قبر پرستی اور مزار پرستی کا علاقہ تھا، جس کے آثار واثرات وہاں اب بھی نمایاں ہیں۔

مولانا عبدالحق ملتانی سے جن حضرات نے تحصیل علم کی ان کی صحیح تعداد سے مطلع ہونا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے، تاہم جن بزرگانِ گرامی قدر کا پتا چل سکا ہے، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

مولانا شرف الدین محدث دہلوی، مولانا عبدالحق ہاشمی مکی، مولانا سلطان محمود جلال پوری، مولانا فیض الرحمٰن ثوری، مناظر اسلام مولانا عبدالعزیز ملک ملتانی، مولانا عبدالاحد خاں چنگوانی، مولانا عبدالعزیز سعیدی، مولانا الٰہی بخش شجاع آبادی، مولانا عبدالعزیز عالم گیری، مولانا عبدالحق ملتانی کے صاحب زادے مولانا شمس الحق اور مولانا شرف الحق محمود، شیخ عبدالرشید صدیقی، مولانا فیض اللہ ملتانی اور دیگر بہت سے حضرات۔

اس زمانے میں ملتان اور اس کے قرب وجوار میں نہ سڑکیں تھیں اور نہ راستے ہم وار تھے۔ چاروں طرف صحرا اور جنگل۔ لوگ یا پیدل سفر کرتے تھے یا اونٹوں، گھوڑوں اور بیل گاڑیوں پر۔ لیکن مولانا عبدالحق تبلیغ کے لیے شہر سے باہر جاتے اور مختلف مقامات پر وعظ فرماتے، جس سے لوگ نہایت متاثر ہوتے اور کتاب وسنت کے احکام کو مدارِ عمل ٹھہراتے۔

Marfat.com

مولانا عبدالحق مسجد میں درسِ قرآن بھی باقاعدہ دیتے تھے۔ ان کے والد مکرم مولانا سلطان محمود خاں افغانی نے آغازِ قرآن سے درس کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ وہ اپنے درس کو کتابی صورت دینے کے لیے اسے فارسی زبان میں منتقل کرتے تھے۔ ان کے بعد مولانا عبدالحق ملتانی نے بھی یہ سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۹۴۵ء میں انھوں نے وفات پائی تو ان کے بڑے صاحب زادے مولانا شمس الحق نے ان کا تتبع کیا اور تینوں حضرات کی یہ مبارک کوشش تکمیل کو پہنچی اور پورے قرآن کی فارسی تفسیر مکمل ہوگئی۔ لیکن پتا چلا ہے کہ ان کے اخلاف نے اپنے اسلاف علمائے کرام کے نہ مسودے محفوظ کیے ہیں، نہ ان کے کتب خانے کی حفاظت کو ضروری سمجھا ہے۔ ہم لوگ اس قسم کے اخلاف کے لیے دعا ہی کر سکتے ہیں، لیکن اس فقیر کے خیال میں اس معاملے میں شاید کسی کی دعا بھی قبول نہ ہوگی۔ خدا کرے میرا خیال غلط ثابت ہو۔

مولانا عبدالحق ملتانی کے زمانۂ تدریس میں ایک مدرسہ مولانا عبدالتواب ملتانی کا ان کے محلے قدیر آباد میں جاری تھا۔ یہ بھی ملتان کا کامیاب مدرسہ تھا۔ مولانا عبدالتواب ملتانی خود خدمت تدریس انجام دیتے تھے۔ اس مدرسے میں بھی بہت سے اہل علم نے اکتسابِ فیض کیا۔

مولانا عبدالتواب ملتانی نے مکتبہ سلفیہ کے نام سے ملتان میں اشاعتِ کتب کا سلسلہ بھی جاری کیا تھا اور عربی اردو کی بہت سی اہم کتابیں شائع کی تھیں۔ [1]

مولانا عبدالحق اور مولانا عبدالتواب کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ ان دونوں نے مل کر ملتان کے ایک مرکزی مقام عام خاص باغ میں آج سے ایک سو تین سال قبل ۱۹۱۰ء میں جامعہ دارالحدیث محمدیہ کی بنیاد رکھی۔ یہ دارالعلوم وہاں ایک صدی سے زیادہ مدت سے جاری ہے اور بہترین انداز سے چل رہا ہے۔ اس کے اساتذہ کرام سے بے شمار علما وطلبا نے استفادہ کیا اور کر رہے ہیں۔

مولانا عبدالحق ملتانی کے ارادت مند جناب عبدالمجید ساجد، جن کا ذکر گزشتہ سطور میں قارئین نے پڑھا، بیان کرتے ہیں کہ مولانا کی مسجد میں ایک پست قامت سانولے رنگ کا شخص مقیم تھا، وہ ہر وقت مسجد کی خدمت میں مصروف رہتا تھا، اس کا نام اسرار تھا۔ ایک مرتبہ ہم نے مولانا موصوف کی مسجد میں رات بسر کی۔ میں رات کے بارہ بجے بیدار ہوا تو دیکھا کہ اسرار مسجد میں نہ تھا۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے نکلا تو وہ سخت سردی میں ننگے بدن باہر کھڑا تھا۔ صرف کمر سے پنڈلی تک چھوٹا سا کپڑا لپیٹا ہوا تھا۔ ہم سردی کی وجہ سے مسجد کے اندر لحاف اوڑھے پڑے تھے اور وہ ننگے بدن مسجد کے صحن میں کھڑا تھا۔ میں سخت حیران ہوا۔ پوچھنے پر پتا

[1] مولانا عبدالتواب ملتانی کے حالات میں نے اپنی دو کتابوں میں لکھے ہیں: ''برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن'' میں اور ''گلستانِ حدیث'' میں۔

Marfat.com

چلا کہ وہ جن تھا جو مولانا عبدالحق ملتانی سے اکتسابِ علم کر رہا تھا۔ مولانا کی وفات کے بعد وہ کبھی نظر نہ آیا۔

مولانا عبدالحق ملتانی کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ملتان کی جماعت اہل حدیث کو منظّم و متحرک کرنے کے لیے انھوں نے ۱۹۱۰ء میں انجمن اہل حدیث قائم کی۔ اس انجمن میں ملتان کی جماعت کے بہت سے تجارت پیشہ اور اصحاب ثروت لوگ شامل تھے۔ انھوں نے متفقہ طور پر اس کے صدر مولانا ممدوح کو بنایا۔ وہ اپنی وفات (۱۹۴۵ء) تک اس منصب پر فائز رہے۔ انجمن اہل حدیث کے سالانہ تبلیغی جلسے بھی منعقد کیے جاتے تھے، جن کی صدارت مولانا فرماتے تھے۔ ان جلسوں میں متحدہ ہندوستان کے جلیل القدر علما شریک ہوتے اور تقریریں کرتے تھے۔ ان علما کی فہرست میں مولانا ابو القاسم سیف بنارسی، مولانا محمد جونا گڑھی دہلوی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد علی لکھوی، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی، مولانا عبدالحق ہاشمی، مولانا محمد اسماعیل سلفی جیسے مشاہیر اصحابِ علم کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ سالانہ جلسہ تین دن جاری رہتا تھا اور ملتان اور اس کے دور و نزدیک کے بے شمار لوگ علما کی تقریریں سننے کے لیے آتے اور کتاب و سنت پر عمل پیرا ہونے کا عہد کرتے۔ بدعات سے تائب ہوتے اور اللہ و رسول (ﷺ) کی اطاعت کو ضروری ٹھہراتے۔

۱۹۲۶ء میں حجاز فتح کرنے کے بعد سلطان عبدالعزیز (ابن سعود) نے قبہ جات کے انہدام کا سلسلہ شروع کیا اور قرآن و حدیث کی روشنی میں توحید خالص کا پرچم لہرایا تو ہندوستان کے اہل بدعت نے تقریری اور تحریری صورت میں اس کے خلاف ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔ ملتان چوں کہ بدعات اور قبور پرستی کا گڑھ تھا، وہاں مزید ہنگامہ آرائی ہوئی۔ اس موقعے پر مولانا عبدالحق ملتانی اور ان کے رفقا نے مولانا ظفر علی خاں اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو ملتان آنے کی دعوت دی۔ یہ حضرات انہدام قبہ جات کے سلسلے میں سلطان ابن سعود کے حامی تھے۔ انھوں نے اس موضوع پر زوردار تقریریں کیں اور لوگوں کو اصل حقیقت کا پتا چلا۔

مولانا عبدالحق ملتانی اور ان کے قابل احترام رفقا کی مساعیِ جلیلہ سے ملتان میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے دو سالانہ جلسے ہوئے۔ ایک ۹، ۱۰، ۱۱۔ اپریل ۱۹۲۰ء کو مولانا عبدالرحمٰن ممبر کونسل ریاست بہاول پور کی صدارت میں، دوسرا ۲۴، ۲۵، ۲۶۔ مارچ ۱۹۲۹ء کو مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کی صدارت میں۔ ان جلسوں میں برصغیر کی جماعت اہل حدیث کے بہت سے جلیل القدر علما نے شرکت کی اور تقریریں فرمائیں۔

اس زمانے میں عیسائیوں کے پادری عبدالحق کی ہندوستان کے مذہبی حلقوں میں بڑی شہرت تھی۔ وہ اپنے مذہب کا بہت بڑا مبلغ اور مناظر تھا۔ ۱۹۲۹ء کے آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے جلسے میں حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم و مغفور سے اس کا مناظرہ ہوا۔ مناظرے میں اس نے شکست کھائی اور اس کے نتیجے

Marfat.com

میں خاصی تعداد میں عیسائی مسلمان ہو گئے۔

اب مولانا عبدالحق ملتانی کے سفرِ آخرت کے متعلق سنیے۔ انھوں نے ۱۹۴۵ء میں وفات پائی۔ لاتعداد لوگوں نے ان کے جنازے میں شرکت کی۔ علما وصوفیا اور عوام کا ایک جمِ غفیر تھا جو حضرت مرحوم کے جنازے میں شریک تھا۔ مزاروں کے جن گدی نشینوں اور پیروں کی مولانا وعظ وتقریر میں ہمیشہ مخالفت کرتے رہے، وہ بھی اپنے مریدوں کے ساتھ ان کے جنازے میں شامل تھے۔

حافظ ریاض احمد عاقب مولانا کے عقیدت مند جناب عبدالمجید خاں ساجد کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ مولانا کی میت کو جنازگاہ میں لایا گیا تو پیر صدر الدین گیلانی گدی نشین دربار موسیٰ پاک شہید کا ایک مرید دوڑتا ہوا آیا اور کہا پیر صاحب جنازے میں شامل ہونے کے لیے آرہے ہیں۔ عبدالمجید ساجد کہتے ہیں کہ میں نے پہلی بار پیر صاحب کو دیکھا، وہ بیساکھیوں کے سہارے آرہے تھے اور دو مرید انھیں دائیں اور بائیں بازوؤں سے پکڑے ہوئے تھے۔ پیر صاحب جنازہ گاہ میں تشریف لاتے ہی مولانا کے جسدِ خاکی کے قریب پہنچے اور فرمایا: مولانا کے چہرے کا دیدار کرایا جائے۔ چہرے سے کپڑا اٹھایا گیا تو پیر صاحب نے رندھی ہوئی آواز میں سرائیکی زبان میں یہ الفاظ کہے:

''اللہ دا باہنا توحید پرست اج دنیا تو رخصت تھی گئے۔''

(اللہ کا بندہ توحید پرست آج دنیا سے رخصت ہو گیا)

یہ کہہ کر پیر صاحب نے مولانا کا ماتھا چوما۔

مولانا عمر بھر شرک و بدعات کی تردید اور گدی نشینوں اور قبر پرستوں کے خلاف وعظ فرماتے رہے۔ لیکن اس کے باوجود پیر صاحب نے ان کو بے حد احترام کے مستحق گردانا۔

اللهم اغفرله و ارحمه و عافه و اعف عنه.

افسوس ہے آج مولانا کے خاندان کے حالات بہت بدلے ہوئے ہیں۔ کوئی ان کے کتب خانے کی بھی ٹھیک طور سے حفاظت کرنے والا نہیں ہے۔ ان کے تھوڑے بہت واقعاتِ حیات بھی ان کے اخلاف میں سے کسی نے نہیں لکھے۔ ان کے ایک پوتے ڈاکٹر محمد ادریس زبیر ایک پڑھے لکھے اور فاضل علمی شخصیت ہیں۔ اسلام آباد میں مقیم ہیں اور وہاں اپنی بساط سے بڑھ کر دین کی خدمت میں مصروف ہیں۔ عالمی شہرت یافتہ معروف مبلّغہ فرحت ہاشمی کے وہ شوہر ہیں۔

مولانا عبدالحق ملتانی کے بڑے بھائی مولانا عبدالعزیز ملتانی تھے جو ان کے ساتھ ہی تعلیم کے لیے حضرت میاں صاحب کی خدمت میں گئے تھے۔ وہ سند لے کر واپس ملتان آئے تو عالم جوانی میں وفات پا گئے۔

Marfat.com

حکیم ابوتراب عبدالحق امرتسری

(وفات ۲۱- اگست ۱۹۵۱ء)

مولانا حکیم ابوتراب عبدالحق امرتسری کا شمار اپنے عہد کے مشہور علما میں ہوتا تھا۔ وہ ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) میں موضع خواص پور میں پیدا ہوئے جو موجودہ جغرافیائی لحاظ سے مشرقی پنجاب (ہندوستان) کے ضلع گورداس پور کا ایک گاؤں ہے۔ والد کا اسم گرامی عبدالعزیز تھا۔ ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی اور انہی سے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر امرتسر جا کر مولانا غلام العلیؒ کے قائم کردہ مدرسہ تائید الاسلام میں داخل ہوئے اور کافی عرصہ وہاں کے اساتذہ سے اکتساب علم کرتے رہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہاں انھوں نے کس عالم سے حصول فیض کیا۔ اس مدرسے میں طویل مدت تک مشہور اہل حدیث عالم اور رئیسِ امرتسر مولانا احمد اللہ صاحب کا سلسلۂ تدریس جاری رہا، ممکن ہے انھوں نے وہاں ان سے بھی استفادہ کیا ہو۔

امرتسر سے وہ عازم سہارن پور ہوئے اور وہاں کی مشہور درس گاہ مظاہر علوم میں داخلہ لیا اور ایک عرصے تک وہاں کے اساتذہ سے تحصیل علم کا سلسلہ جاری رکھا۔ لیکن یہاں بھی کچھ پتا نہیں کہ کن علمائے کرام کے سامنے زانوے شاگردی تہہ کیے۔

سہارن پور سے کان پور کا قصد فرمایا۔ وہاں مولانا احمد حسن کان پوری سے بعض درسی کتابیں پڑھیں۔

کان پور سے فراغت کے بعد دہلی کو روانہ ہوئے اور حضرت میاں سید نذیر حسین محدث کی خدمت میں حاضری دی۔ ان سے کتبِ حدیث پڑھنے کی سعادت سے بہرہ مند ہوئے اور سندِ حدیث لی۔

قیام دہلی کے زمانے میں حکیم اجمل خاں مرحوم اور ان کے بھائی واصل خاں سے فنِ طب کی کتابیں پڑھیں۔ وہیں ایک اور مشہور طبیب حکیم نور محمد دہلوی سے علمِ طب میں مستفید ہوئے۔

یہ تمام علوم پڑھنے کے بعد وہ امرتسر آئے اور یہاں تدریس کا سلسلہ بھی شروع کیا اور طبابت کا بھی اور یہ دونوں کام وہ باقاعدگی اور مستعدی سے انجام دینے لگے اور ان میں کامیاب رہے۔

امرتسر متحدہ پنجاب کا وہ شہر تھا، جس میں بہت سے ممتاز علمائے دین، متعدد نامور سیاست دان، بے شمار ادیب اور کتنے ہی معروف خطیب پیدا ہوئے۔ مختلف مذاہب و مسالک کے کئی رسائل و جرائد بھی اس شہر سے شائع ہوتے تھے، جن کا حلقۂ اشاعت بہت وسیع تھا۔

Marfat.com

مولانا حکیم ابوتراب عبدالحق نے بھی ۱۹۱۵ء میں امرتسر سے ''اہل سنت والجماعت'' کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا جو عرصۂ دراز تک جاری رہا۔

امرتسر میں انھوں نے طبیہ کالج کی بھی بنیاد رکھی، جس میں بہت سے لوگوں نے علم طب حاصل کیا اور اس میں شہرت پائی۔

قیامِ پاکستان کے بعد وہ ۱۹۴۷ء میں امرتسر سے لاہور آ گئے اور ریلوے روڈ پر امرت دھارا بلڈنگ میں اپنا مطب قائم کیا، جس میں ان کے صاحب زادے حکیم شمس الحق خدمت انجام دیتے تھے۔ جو لوگوں سے میل جول رکھتے تھے اور اپنے فن میں کامل تھے۔ مولانا حکیم ابوتراب عبدالحق امرتسری نے ۲۳- ذیقعد ۱۳۷۰ھ (مطابق ۲۱- اگست ۱۹۵۱ء) کو وفات پائی۔ [1]

مجھے مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی رفاقت میں ایک مرتبہ لاہور میں ان کی زیارت کا موقع ملا۔ یہ ان کی دنیوی زندگی کا آخری دور تھا اور ان کا حلیہ کچھ اس طرح کا میرے ذہن میں آ رہا ہے: نکھرا ہوا گندمی رنگ، گول چہرہ، موٹی آنکھیں، جن پر نظر کی عینک چڑھی ہوئی تھی۔ سرخ مہندی لگی ہوئی داڑھی۔

وہ امرتسر کی ایک علمی نشانی تھے اور گئے دور کے ایک خاص انداز کا وقار ان کی شخصیت میں نمایاں تھا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور اس کی بارگاہ میں ان کی نیکیوں کو شرفِ قبول حاصل ہو۔

❀❀❀❀

[1] نزہۃ الخواطر: ج ۸، ص ۲۳۷۔۔ نقوش کا ''لاہور نمبر'': ص ۹۳۶.

Marfat.com

مولانا عبدالحکیم جیوری

(وفات ۲۹۔مارچ ۱۹۷۲ء)

مولانا عبدالحکیم جیوری کا شمار حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں ہوتا تھا۔ ۱۸۷۸ء کے لگ بھگ ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ضلع بلند شہر کے ایک قصبے جیور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی دور کے حالات کا پتا نہیں چل سکا۔ صرف یہ معلوم ہوسکا ہے کہ حضرت میاں صاحب کے شاگرد تھے اور حضرت مولانا شرف الدین دہلوی کے ساتھ حضرت میاں صاحب سے مسند حدیث حاصل کی تھی۔ جن حضرات نے حضرت میاں صاحب کو غسل دیا اور آپ کی تجہیز و تکفین میں حصہ لیا، ان میں مولانا عبدالحکیم جیوری بھی شامل تھے۔ حکیم محمد اسرائیل ندوی میواتی کے بقول انھوں نے تمام عمر تبلیغ دین اور وعظ و نصیحت میں گزاری۔ علاقہ میوات میں ان کے تبلیغی دوروں کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور ہر اہل حدیث گاؤں میں کئی کئی دن قیام فرماتے تھے۔ حکیم محمد اسرائیل ندوی کے گاؤں موضع جھانڈہ تحصیل پتھین ضلع فرید آباد (علاقہ میوات) میں بہ سلسلہ امامت وخطابت پانچ سال اقامت گزیں رہے۔ نہایت نیک اور خدا ترس عالم تھے۔ ہمیشہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں مصروف رہے۔ اس موضوع پر موثر وعظ کہتے تھے اور لوگ شوق سے ان کا وعظ سنتے تھے۔ کچھ عرصہ مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے مبلغ کی حیثیت سے بھی خدمات سرانجام دیں۔

حکیم محمد اسرائیل ندوی لکھتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے بعد گھوڑے پر سفر کرتے اور دریوں کی تجارت کیا کرتے تھے۔ حکیم صاحب نے ان کو صحاح ستہ اور مؤطا امام مالک کے اطراف سنا کر سند و اجازۂ حدیث لی۔ حضرت میاں صاحب کے شاگرد ہونے کے سبب اور بھی متعدد علمائے کرام ان سے حصول سند سے مفتخر ہوئے۔

عمر کے آخری دور میں علی گڑھ میں سکونت پذیر ہوگئے تھے اور وہاں کی موتی مسجد میں بہ طور امام وخطیب ان کا تقرر عمل میں آ گیا تھا۔ تقریباً ۹۵ برس کی عمر پا کر ۲۹۔جنوری ۱۹۷۲ء (۱۳۔صفر ۱۳۹۲ھ) کو سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔ [1]

❀❀❀❀

[1] تراجم علمائے اہل حدیث میوات، مصنف: حکیم محمد اسرائیل ندوی) حاشیہ ص ۱۱۲۔

Marfat.com

باسٹھ مرحومین
خدام حدیث

Marfat.com

Marfat.com

حافظ محمد غوث خان پوری

(وفات ۳۰۔ جون ۱۹۰۷ء)

حافظ محمد غوث کے والد گرامی کا نام محمد محسن تھا۔ اعوان برادری سے تعلق رکھتے تھے اور دراصل علاقہ تلہ گنگ کے رہنے والے تھے۔ ان کے جدّ امجد کو خان پور کے راجے تحصیل علم کے لیے معلم کی حیثیت سے خان پور لے آئے تھے اور گزارے کے لیے انھیں کچھ زمین دے دی تھی، جسے وہ خود ہی کاشت کرتے تھے۔ خان پور میں سکونت کی وجہ سے وہ خان پوری کہلائے۔ ان کے حالات ''تذکرہ علمائے خان پور'' میں ان کے نواسے قاضی عبداللہ ایم اے علیگ نے بیان کیے ہیں اور یہ کتاب مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے جولائی ۱۹۸۵ء (شوال ۱۴۰۵ھ) میں شائع کی تھی۔ یہ مضمون اسی کتاب سے اخذ کیا گیا ہے۔

حافظ محمد غوث کے والد عابد و زاہد اور تہجد گزار بزرگ تھے۔ اپنی زمین پر ہل چلانے جاتے تو قرآن شریف، مصلّی اور پانی کا کوزہ ساتھ لے جاتے۔ کام سے فراغت پاتے تو وہیں قرآن شریف کی تلاوت شروع کر دیتے اور نماز کا وقت ہوتا تو نماز ادا فرماتے۔

تحصیل علم:

حفظ قرآن کے بعد حافظ محمد غوث نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے گھر سے نکلے اور مختلف اساتذہ سے اکتساب علم کیا۔ اس سے آگے ان کے تذکرہ نویس کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''دوسرے اساتذہ کا تو علم نہیں ہو سکا لیکن یہ امر یقینی ہے کہ آپ مولانا رشید احمد گنگوہی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ آپ کی زندگی کے آخری ایام میں ایک مرتبہ ایک وفد گنگوہ سے آپ کے پاس پہنچا اور استدعا کی کہ آپ مولانا گنگوہی مرحوم کی مسند پر جلوہ افروز ہونے کے لیے ہمارے ساتھ چلیں، کیوں کہ مولانا مرحوم کے تلامذہ میں سے ان کی مسند تدریس سنبھالنے کے لیے آپ کے سوا کوئی باقی نہیں رہا۔ ہم اسی غرض کے لیے حاضر خدمت ہوئے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ گنگوہ تشریف لے چلیں۔ آپ نے کہا: اگر مجھے صحت اجازت دیتی تو میں ضرور آپ کے ساتھ چلا جاتا لیکن میں معذور ہوں اور بوجہ علالت تعمیل ارشاد کے قابل نہیں، لہٰذا وہ ان کے ساتھ نہ جا سکے اور وہ لوگ بے نیل مرام واپس ہوئے۔'' [1]

---

[1] تذکرہ علمائے خان پور: ص ۲۴۲۔

Marfat.com

یہاں یہ یاد رہے کہ مولانا رشید احمد گنگوہی ۸- جمادی الاخریٰ ۱۳۲۳ھ کو فوت ہوئے اور اس سے گیارہ مہینے بعد ۱۹- جمادی الاولیٰ ۱۳۲۴ھ کو حافظ محمد غوث خان پوری نے وفات پائی۔ مولانا گنگوہی کے خلفا و تلامذہ کی فہرست بہت وسیع ہے جن میں مولانا خلیل احمد سہارن پوری (متوفی ۱۷- ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ)، مولانا محمود حسن دیوبندی (متوفی ۲۸- ربیع الاول ۱۳۳۹ھ)، مولانا حسین احمد مدنی (متوفی ۳- جمادی الاولی ۱۳۷۷ھ) اور دیگر بہت سے حضرات کے نام آتے ہیں اور پھر آگے ان کے تلامذہ کا طویل سلسلہ چلتا ہے، ممکن ہے ان کی وفات کے بعد خاص گنگوہ میں ان کا کوئی قابلِ ذکر شاگرد موجود نہ رہا ہو، اس لیے ان کی نظر حافظ صاحب پر پڑی۔ حافظ صاحب بھی استاذ کی وفات کے تھوڑا عرصہ بعد وفات پا گئے۔

اکبرالہ آبادی سے ملاقات:

اکبرالہ آبادی جو مشہور شاعر تھے، حافظ محمد غوث خان پوری کے ہم جماعت رہے تھے۔ ایک مرتبہ وہ راجا جہاں داد خاں مرحوم سے ملاقات کے لیے خان پور آئے۔ دورانِ گفتگو میں انھوں نے راجا صاحب سے پوچھا کہ خان پور کے حافظ محمد غوث صاحب ہمارے ہم جماعت تھے، ان کے متعلق آپ کچھ بتا سکتے ہیں؟

راجا صاحب نے جواب دیا: وہ یہاں موجود ہیں۔ انھیں ابھی بلا لیتے ہیں۔ اکبرالہ آبادی مرحوم نے کہا میں خود انھیں ملنے جاؤں گا۔

اس کے بعد راجا صاحب نے ایک ملازم ان کے ساتھ کر دیا جو انھیں حافظ صاحب کے مکان پر لے گیا۔ مکان کے قریب پہنچے تو حافظ صاحب باہر کھڑے تھے۔ دونوں پرانے دوست ایک دوسرے کو دیکھ کر نہایت خوش ہوئے اور بے حد اشتیاق سے ملے۔ فرطِ جذبات سے دونوں کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

گرفتاری اور قید:

ان دنوں مذہبی حلقوں میں انگریزوں کی حکومت کو کافرانہ حکومت سمجھا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں حافظ محمد غوث خان پوری کا نقطۂ نظر بھی یہی تھا اور وہ مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور سید احمد شہید رائے بریلوی کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے، جس کی وجہ سے انگریزی حکومت کے زیرِ عتاب تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ کچھ عرصہ تو ہندوستان کی مختلف جیلوں میں قید رہے۔ بعد ازاں (ان کے بھانجے قاضی محمد اعظم رئیس ایبٹ آباد کے بقول) اسیرِ مالٹا بھی رہے۔ پھر رہا ہوئے تو وطن تشریف لے آئے۔

عرائض نویسی:

حافظ صاحب کچھ عرصہ ایبٹ آباد میں عرائض نویسی کرتے رہے۔ وہ ایک دن میں چار عرضیاں لکھتے تھے اور ایک عرضی کا ایک آنہ اجرت لیتے تھے۔ چار عرضیاں لکھ کر چار آنے کما لیتے تو فرماتے بس یہی کافی ہے اور

Marfat.com

بستہ باندھ کر چلے جاتے۔ پھر گھر یا مسجد میں جا کر تلاوتِ قرآن میں مشغول ہو جاتے۔

نہایت ایثار پیشہ اور صابر و شاکر بزرگ تھے۔ سستا زمانہ تھا۔ لوگ سادگی پسند تھے اور سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ تکلفات کی کسی معاملے میں کسی کو عادت نہ تھی۔

حافظ صاحب خوش نویس اور صاحبِ علم تھے اور ان دنوں تعلیم یافتہ لوگوں کی کمی تھی۔ اس لیے سرکاری طور پر انھیں ڈپٹی (ای-اے-سی) کے عہدے پر فائز کرنے کی تجویز کی گئی۔ حافظ صاحب کو اس تجویز کا علم ہوا تو فرمایا ہم تو اس کافر حکومت کو اپنے ملک سے نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں، اس کی ملازمت ہرگز نہیں کریں گے۔ ملازمت کے لیے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ ضروری تھا۔ فوراً ڈاکٹر کے پاس پہنچے اور کہا مہربانی کر کے آپ لکھ دیں کہ یہ شخص ملازمت کے قابل نہیں۔

وہ فرمایا کرتے تھے کہ فریادیوں کی درخواستیں لکھنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن سرکاری ملازمت میں خلافِ اسلام کام کرنے کا اندیشہ ہے اور خطرہ ہے کہ کوئی فیصلہ شرعی احکام کے الٹ ہو جائے، لہٰذا میں ملازمت نہیں کروں گا۔ اب انھوں نے عرائض نویسی کا سلسلہ بھی ختم کر دیا اور ایبٹ آباد کی سکونت ترک کر کے خان پور آ گئے۔ یہاں انھیں ملازمت وغیرہ کا کوئی خطرہ نہ تھا اور عرائض نویسی کا معاملہ بھی نہ تھا۔

مسجد کے لیے آمدنی کا ذریعہ:

حافظ صاحب کے قیام ایبٹ آباد کے زمانے میں ضلع ہزارہ کا پہلا بندوبست اراضی ۱۸۷۲ء میں ہوا۔ عملۂ بندوبست میں قاضی محمد میر عالم سکندر پوری ڈپٹی کے عہدے پر متمکن تھے، جو ایک علم دوست شخص تھے اور حافظ محمد غوث کے ارادت مند تھے۔ حافظ صاحب کی کوشش اور قاضی صاحب کی امداد سے ایبٹ آباد کی جامع مسجد کے قریب اچھا خاصا رقبہ مسجد کے نام اندراج کر دیا گیا تاکہ یہ مسجد کی آبادی کا سبب بنے اور اس سے مسجد کے اخراجات پورے ہوتے رہیں۔ چنانچہ وہاں مکانات بھی تعمیر ہوئے اور دکانیں بھی بنائی گئیں جو اب بھی مسجد کی مجلس انتظامیہ کی تحویل میں ہیں اور ان کی آمدنی مسجد پر صرف ہوتی ہے۔ یہ حافظ صاحب کے لیے بھی صدقۂ جاریہ ہے اور قاضی صاحب کے لیے بھی۔

حافظ صاحب عابد و زاہد اور شب زندہ دار تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت نہایت عمدہ انداز میں کرتے۔ ایک مرتبہ راولپنڈی کے بعض حضرات نے ان سے عرض کیا کہ آپ ایک رکوع ریکارڈ کرا دیں تو اسے بہت سے لوگ سنیں گے اور خوش ہوں گے، لیکن انھوں نے اس سے انکار کر دیا۔

ان کے نواسے ''تذکرہ علمائے خان پور'' کے مصنف قاضی عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ میں بچپن میں رات کو اپنی نانی کے ہاں سویا کرتا تھا۔ رات کے وقت جب بھی میری آنکھ کھلتی میں اپنے نانا کو مصلے پر کھڑے

Marfat.com

تلاوتِ قرآن کرتے دیکھتا۔

حضرت عبداللہ غزنوی کی خدمت میں:

صلحا و علما سے ملاقات کا انھیں ہمیشہ شوق رہا۔ اس کے لیے انھیں طویل سفر بھی کرنا پڑے۔ پتا چلا کہ غزنی میں ایک نہایت پاک باز بزرگ مولانا عبداللہ غزنوی فروکش ہیں اور حصول فیض کے لیے دور دراز سے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ حافظ صاحب بھی اپنے وطن سے روانہ ہوئے اور حضرت عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ کی خدمت میں پہنچے۔ کچھ عرصہ وہاں رہے اور ان سے اخذِ فیض کیا۔

تقسیم اوقات:

حافظ صاحب کے نواسے قاضی عبداللہ کے بقول وہ فجر کی نماز کے لیے مسجد جاتے تو نماز کے بعد اشراق تک اَوراد و وظائف میں مصروف رہتے۔ اشراق پڑھ کر طلبا کو پڑھانے میں مشغول ہو جاتے۔ اس سے فارغ ہو کر گھر تشریف لاتے۔ ضروری سودا سلف خریدنے خود ہی بازار جاتے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر تھوڑی دیر قیلولہ کرتے۔ پھر ظہر سے قبل مسجد تشریف لے جاتے اور نمازِ عصر تک وہیں رہتے۔ عصر پڑھ کر گھر آتے اور عشاء کی نماز سے پیشتر اپنی صاحب زادی (والدہ قاضی عبداللہ) کے پاس آتے اور اس سے خیر خیریت پوچھتے، پھر مسجد چلے جاتے اور عشاء کی نماز تک وہاں رہتے۔ نماز کے بعد کھانا کھا کر سو جاتے۔ تھوڑی دیر بعد اٹھتے اور نماز تہجد پڑھتے۔ پھر نماز فجر کے لیے مسجد چلے جاتے۔ یہ تھے ان کے روزانہ کے معمولات اور تقسیم اوقات۔

تقویٰ و صالحیت کی برکت:

حافظ صاحب کی زمین تو تھوڑی تھی، لیکن ان کے تقویٰ و صالحیت کی بنا پر سال بھر کا غلہ اس سے پیدا ہو جاتا۔ دالیں، سبزی، کپاس وغیرہ ہر شے با افراط اس سے پیدا ہوتی تھی۔ کسی چیز کی کبھی کمی نہیں ہوئی۔ ایک گھوڑا بھی رکھا تھا۔ بھینس بھی ہمیشہ گھر میں رہتی تھی اور گھی، دودھ، لسی وغیرہ وافر مقدار میں میسر آ جاتے تھے۔

جنات کے دو واقعات:

حافظ صاحب قرآن مجید پڑھتے تو جنات بھی بڑے شوق سے قرآن سنتے اور ان کے مال و متاع کی نگرانی کرتے۔ کوئی شخص ان کی کوئی چیز چوری کرتا تو اسے سزا دیتے۔ اس قسم کے دو واقعات بحوالہ "تذکرہ علمائے خان پور" ملاحظہ ہوں۔

۱- محلے کی ایک عورت ان کے گھر میں کام کاج کرتی تھی۔ وہ کپڑے بھی دھو دیا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ کپڑے دھونے والا کچھ صابن بچ گیا تو واپس نہ کیا اور اپنے گھر لے گئی۔ رات کو وہ حافظ صاحب کے مکان کے ایک کمرے میں سوتی تھی۔ اس رات بھی وہیں سوئی، صبح ہو گئی اور سورج نکل آیا لیکن وہ

Marfat.com

کمرے سے باہر نہ آئی۔ کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر آواز دی گئی تو اس نے بتایا کہ میرا سر چارپائی کی ''داون'' میں پھنسا ہوا ہے اور میں اٹھ نہیں سکتی۔ دروازہ اکھاڑ کر دیکھا گیا تو واقعی اس کا سر اس رسی میں پھنسا ہوا تھا۔ اسے باہر نکالا گیا تو اپنے جرم کا اقرار کیا اور کہا کہ یہ غلطی مجھ سے سرزد ہوئی جس کی وجہ سے تمام رات جنات مجھے لکڑی کے تختوں سے پیٹتے رہے اور کہتے رہے کہ تم نے حافظ صاحب کا صابن کیوں چوری کیا ہے۔ پھر انھوں نے سر داون میں پھنسا دیا۔

قاضی عبداللہ صاحب فرماتے ہیں: ''راقم الحروف نے اس عورت کی پیٹھ پر تختوں کی ضرب کے بہت سے سرخ نشانات خود دیکھے تھے۔'' ❶

۲- حافظ صاحب کے ایک طالب علم نے ان کے قلم دان میں سے ایک چاقو چرا لیا۔ اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ صبح کو داون کی رسی کھول کر اسے چھوڑ دیا گیا۔

جن لوگوں کو جنّ کی پکڑ کا عارضہ لاحق ہو جاتا، وہ حافظ صاحب کے پاس آتے۔ وہ جنّ سے صرف یہی کہتے کہ اس بے چارے کو تم کیوں تنگ کرتے ہو، اسے چھوڑ دو اور چلے جاؤ۔ بس اتنا کہنے سے جنّ چلا جاتا اور مریض کی تکلیف رفع ہو جاتی۔

وفات:

حافظ صاحب کچھ عرصے سے بیمار تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے آخری دن عصر کی نماز پڑھنے کے لیے وضو کیا۔ وضو کر کے لیٹے لیٹے نماز پڑھنا شروع کی۔ دورانِ نماز حالت کچھ دگرگوں ہو گئی۔ ان کے برادرِ صغیر حافظ عبدالرحمٰن نے جو نمازِ عصر پڑھ کر بیٹھے تھے، ان کی حالت بدلی ہوئی دیکھی تو حافظ صاحب کو مخاطب کر کے کہا: من ربك؟ انھوں نے جواب دیا: ربی الله۔ پھر روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ انا لله و انا الیه راجعون

ان کی وفات ۳۰- جون ۱۹۰۷ء (۱۹- جمادی الاولیٰ ۱۳۲۴ھ) کو راولپنڈی میں ہوئی اور وہیں دفن کیے گئے۔

اللّٰهم اغفرله و ارحمه و عافه و اعف عنه.

❁❁❁❁

---

❶ تذکرہ علمائے خان پور: ص ۲۴۶، ۲۴۷۔

Marfat.com

مولانا سید محمد شاہ

(وفات ۱۹۰۹ء)

اپریل ۱۹۲۰ء کے ہفت روزہ ''اہل حدیث'' (امرتسر) کے صفحہ ۵ پر مولانا سید محمد شاہ بن سید بہادر شاہ (ساکن لدھا سنگھ والا تحصیل چونیاں ضلع قصور) کے حالات میں ان کے بھائی سید احمد شاہ صاحب کا مضمون شائع ہوا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ شاہ صاحب ممدوح ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ صرف ونحو کی کتابیں مولوی عبدالسلام صاحب (موضع فتح محمدی) سے پڑھیں۔ بعد ازاں مولوی ابو اسحاق محمد ابراہیم بیگ پوری سے علم حدیث پڑھا اور انھی سے سندِ حدیث لی۔ بیگ پور میں تحصیل علم کے زمانے میں نہ وہ عام لوگوں سے باتیں کرتے تھے، نہ مسجد سے باہر نکلتے، نہ کسی سے کوئی سوال کرتے۔ ہر وقت پڑھنے میں مصروف رہتے تھے۔ ان کی اس قسم کی عادات سے لوگوں میں یہ بات مشہور ہوگئی تھی کہ ان کا تعلق جنّات سے ہے۔ پھر ایک مرتبہ ان کے والدین ان سے ملنے آئے تو لوگوں کا یہ شبہ دور ہوا اور وہ انھیں انسانی مخلوق سمجھنے لگے۔

انھوں نے لدھا سنگھ والا (گاؤں) میں بڑے شوق اور محنت سے علم حاصل کیا اور حصولِ علم کے بعد وہاں سے چلے گئے۔ پھر ایک عرصے کے بعد آئے تو دیکھا کہ مسجد ویران ہے، مسلمانوں کی دینی حالت خراب ہے اور وہ شرک و بدعات کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اس صورتِ حال سے انھیں نہایت افسوس ہوا۔ انھوں نے مسجد دوبارہ آباد کرنے کا عزم کیا۔ بچوں کو قرآن پڑھانے لگے۔ جمعہ و جماعت کا باقاعدہ اہتمام کیا اور مسجد آباد ہوگئی۔

وہ دیہاتی طرز کے خوش کلام واعظ تھے۔ اخلاقِ حسنہ کے مالک، سب سے اچھی طرح ملنے والے۔ گفتگو کا اسلوب میٹھا۔ ایک مرتبہ اس علاقے کا تھانے دار وہاں آیا اور ان کی خوش خلقی اور نرم کلامی سے بہت متاثر ہوا۔ کہا: مولوی صاحب آپ سید اور عالم ہیں اور پرہیز گار بھی ہیں۔ ہماری پشت پر اپنا دستِ مبارک پھیر دیں تو اللہ تعالیٰ ہمارے گناہ معاف فرما دے۔ شاہ صاحب نے جواب دیا: مجھے ڈر لگتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ ہمارا ہاتھ جل جائے۔

پھر تھانے دار نے کہا: ہمارے لڑکوں کو تعلیم دیا کریں۔ آپ کو معقول تنخواہ دی جائے گی۔ فرمایا: آپ لڑکوں کو یہاں بھیج دیں، جیسے دوسرے بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں، وہ بھی کریں۔

Marfat.com

شاہ صاحب اپنے ہاتھ سے زراعت کر کے روزی کماتے تھے۔ کسی سے کوئی چیز نہیں مانگتے تھے۔ متوکل علی اللہ تھے۔ طلبا کو عربی اور فارسی کی کتابیں پڑھاتے اور نبی ﷺ کی حدیثِ مبارکہ کا درس دیتے۔ سخی اور جودتِ طبع کے مالک تھے۔

ایک مرتبہ انھوں نے اپنی زمین سے پیدا شدہ غلے کا خود عشر دیا اور مستحقین کو خیرات کی۔ اس کی اطلاع ان کے والد کو ہوئی تو انھوں نے خفگی کا اظہار کیا اور کہا ہم عشر دیا کریں گے، تم نہ دیا کرو۔ اس کے بعد اس قسم کی فصل نہ ہوئی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ اس کا عام لوگوں کو پتا چلا تو وہ بھی عشر دینے اور خیرات کرنے لگے۔

اس عالی کردار اور خوش اطوار عالم نے صرف پچیس برس عمر پائی۔ ۱۹۰۹ء میں وفات پا گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

افسوس ہے نہ ان کے اس سے زیادہ حالات معلوم ہوئے ہیں اور نہ ان کے دونوں استادوں مولوی عبدالسلام اور مولوی ابو اسحاق محمد ابراہیم کے احوالِ زندگی کا پتا چل سکا ہے۔ معلوم نہیں کتنے ایسے علمائے کرام ہوں گے جو اپنے زمانے میں تو شہرت رکھتے تھے لیکن اس کے بعد ان کے واقعاتِ حیات پردۂ اخفا میں چلے گئے۔

❀❀❀❀

Marfat.com

حافظ عبدالمنان وزیر آبادی

(وفات ۱۸- جولائی ۱۹۱۶ء)

حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی مرحوم و مغفور نے عجیب و غریب حالات میں زندگی کا آغاز کیا۔ اعوان برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ موضع کرولی تحصیل پنڈ دادن خاں (ضلع جہلم) میں ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۱ء) کو پیدا ہوئے۔ سات سال کی عمر ہوئی تو سکول میں داخل کرا دیے گئے۔ سکول میں دوسرا سال تھا اور عمر نو سال کی تھی کہ آنکھوں سے پانی اترنا شروع ہو گیا، جسے مرضِ ''نزول الماء'' کہا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں نظر بند ہو گئی۔ بارہ سال کی عمر ہوئی تو والدہ وفات پا گئیں۔ اب وہ حصولِ علم کے لیے گھر سے نکلے اور دریائے جہلم کے کنارے ایک گاؤں کا نام احمد آباد ہے، وہاں چلے گئے۔ اس گاؤں میں مولانا قادر بخش سے علم صرف کی دو ابتدائی کتابیں (صرف بہائی اور صرف میر) پڑھیں۔

احمد آباد سے بھلوال کا قصد کیا۔ وہاں سید فاضل شاہ سے فقہ کی کنز الدقائق اور قدوری پڑھیں۔ وہاں سے موضع سروچہ پہنچے۔ سروچہ میں مولانا برہان الدین حطاروی سے صرف و نحو کی اوسط اور انتہائی درجوں کی کتابیں مراح الارواح، شرح مائۃ عامل، ہدایت النحو، کافیہ، شافیہ اور شرح ملا جامی پڑھیں۔ علم منطق کے چند رسالے بھی ان سے پڑھے۔

اس کے بعد ضلع بنوں کے موضع ''چکی شیخ'' کو روانہ ہوئے۔ وہاں مولانا قل احمد (یا گل احمد) سے ملا حسن اور خیالی وغیرہ مشکل تریں کتابیں مکمل کیں۔ نابینا ہونے کے باوجود پندرہ سال کی عمر میں انھوں نے معقولات کی تقریباً تمام درسی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ یہ ان کی بے پناہ ذہانت کی دلیل ہے۔

اب آگے چلیے اور دیکھیے کہ ان کی حیاتِ مستعار کی گاڑی کن کن منزلوں سے گزرتی اور کس طرح آگے بڑھتی ہے۔

مذکورہ بالا کتابیں پڑھنے کے بعد ان کے دل میں حج بیت اللہ کے شوق نے کروٹ لی اور وہ کالا باغ گئے۔ اس زمانے میں اس نواح کے لوگ کالا باغ سے بذریعہ کشتی کراچی جایا کرتے تھے۔ حافظ صاحب کا بھی یہی ارادہ تھا۔ کالا باغ وہ دو مہینے ایک مسجد میں مقیم رہے۔ اس اثنا میں ایک دن صبح کے وقت وضو کے لیے دریا پر گئے تو پاؤں پھسل گیا اور دریا میں گر گئے اور دریا کا پانی انھیں بہا کرلے گیا۔ آگے چل کر پانی نے ان کو

Marfat.com

کنارے پر پھینک دیا۔ کچھ ہوش آیا اور اٹھ کر روانہ ہوئے تو مرغ کی آواز کانوں میں پڑی۔ خیال گزرا کہ یہاں کوئی بستی ہے، جہاں سے مرغ کی آواز آ رہی ہے۔ تھوڑا آگے بڑھے تو ایک دیوار سے ٹکرائے۔ حسنِ اتفاق سے یہ اسی مسجد کی دیوار تھی، جس میں وہ قیام فرماتے تھے اور جس سے نکل کر دریا پر وضو کرنے گئے تھے۔

دو مہینے کے بعد وہاں سے بذریعہ کشتی سندھ کی طرف روانہ ہوئے۔ ڈیرہ اسماعیل خاں سے تقریباً پچاس میل دور تھے کہ کشتی بھنور میں پھنس گئی۔ حافظ صاحب نے دعا کی یا اللہ ہم لوگوں کو اس مشکل سے نجات دلا۔ یہ دعا سن کر ایک پشاوری پٹھان نے انھیں چپت ماری اور کہا ایسے موقع پر پیر صاحب کو پکارنا چاہیے۔ یہ اللہ کے بس کا کام نہیں، پیر کا کام ہے۔ (نعوذ باللہ) بہر کیف اللہ تعالیٰ نے کشتی کو بھنور سے نکال دیا اور وہ بخیر و عافیت سندھ پہنچ گئے۔ وہاں کے ایک مقام پر شیخ مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے خاندان کے ایک بزرگ پیر محفوظ اللہ فروکش تھے۔ کچھ دن ان کے ہاں قیام رہا۔

پیر محفوظ اللہ نے اپنے بیٹوں کی تعلیم کے لیے ایک عالم کی خدمات حاصل کی تھیں۔ وہ واقعی عالم دین تھے۔ لیکن ایک دن نحو کی کتاب کافیہ پڑھا رہے تھے کہ ایک عبارت کی غلط تشریح کی۔ حافظ صاحب نے یہ غلطی سنی تو ان سے کوئی نحوی سوال کیا، جس کا وہ صحیح جواب نہ دے سکے۔ پیر صاحب بھی وہیں تھے۔ انھوں نے حافظ صاحب سے کہا کہ بچوں کو یہ سبق آپ پڑھائیں۔ حافظ صاحب کے طریق تدریس پر پیر صاحب بہت خوش ہوئے اور تعجب بھی کیا کہ اس چھوٹی عمر میں نابینا ہونے کے باوجود اللہ نے ان کو بڑی قابلیت سے نوازا ہے۔ اب پیر محفوظ اللہ نے حافظ صاحب کو اپنے بیٹوں کا باقاعدہ معلم مقرر کر دیا۔

کچھ دنوں کے بعد پیر صاحب انھیں میر مراد علی والیٔ خیر پور کے پاس لے گئے۔ ان کے دربار سے معقولات کے ایک عالم مولوی عبداللہ کشمیری وابستہ تھے جو شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے حافظ صاحب سے امتحاناً چند سوالات پوچھے۔ حافظ صاحب نے ان کے صحیح جواب دیے، جس سے وہ بہت خوش ہوئے۔ نواب میر مراد علی خاں علم اور علما دوست تھے، اس لیے وہ حافظ صاحب کا بہت احترام کرتے تھے۔ انھوں نے سواری کے لیے حافظ صاحب کو ایک اونٹنی دی اور ایک یا دو خادم ان کے لیے مقرر کر دیے۔ حافظ صاحب ایک سال ان کے پاس رہے۔ پھر ان سے حج بیت اللہ کے لیے جانے کی اجازت طلب کی۔ نواب صاحب نے اس نیک کام کے لیے حافظ صاحب کو پانچ سو روپے اور ایک بیش قیمت خلعت دے کر روانہ کیا اور وہ کراچی جا کر بحری جہاز پر سوار ہو گئے۔ یہ جہاز کراچی سے بمبئی جا رہا تھا اور بمبئی سے دوسرے جہاز پر سوار ہو کر حافظ صاحب جدّے جانا چاہتے تھے۔

جہاز میں ملتان کا رہنے والا ایک شخص جس کا نام احمد علی تھا، حافظ صاحب کا رفیقِ سفر بن گیا۔ اسے معلوم

Marfat.com

تھا کہ ان کے پاس پانچ سو روپے کی رقم ہے۔ اس نے یہ روپے جہاز ہی میں چوری کر لیے۔ جہاز بمبئی پہنچا تو حافظ صاحب نے اس کی اطلاع پولیس والوں کو دی۔ پولیس والوں نے الٹا حافظ صاحب کو گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا۔ تین دن وہ حوالات میں رہے۔ چوتھی رات نماز تہجد کے لیے اٹھے تو غم ناک اور افسردہ لہجے میں عربی کا یہ شعر پڑھا:

صبت علی مصائب لو انہا
صبت علی الایام صرن لیالی

''مجھ پر ایسی مصیبتیں آ پڑی ہیں کہ اگر وہ دنوں پر آتیں تو دن راتیں ہو جاتے۔''

حوالات کے محافظ نے یہ شعر سنا تو نہایت متاثر ہوا۔ اس نے حافظ صاحب سے اصل بات پوچھی تو حافظ صاحب نے اسے حقیقت بتائی اور اس نے حافظ صاحب کو بے گناہ سمجھ کر حوالات سے نکال دیا۔

اب حافظ صاحب بمبئی سے چلے اور شہر سورت کو روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک اور شہر آیا جس کا نام ''دمن'' تھا، وہاں رات بسر کی۔ صبح کو آگے چل پڑے اور اکلھڑہ کے مقام پر پہنچے۔ وہ شیعہ حضرات کا مسکن تھا۔ انھیں پتا چلا کہ حافظ صاحب سنی ہیں تو انھیں وہاں رات نہیں رہنے دیا، گاؤں سے نکال دیا۔ حافظ صاحب کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ برسات کا موسم تھا اور بوندا باندی ہو رہی تھی۔ یہ تینوں شہر سے ایک میل باہر ایک سنسان سڑک پر لیٹ گئے۔ رات کو ریاست سکھ چین کا نواب اپنے قافلے کے ساتھ ادھر سے گزر رہا تھا کہ اندھیری رات میں ان میں سے ایک شخص دوسرے کے پاؤں کی ٹھوکر سے گر پڑا۔ وہاں حافظ صاحب اور ان کے ساتھی لیٹے ہوئے تھے۔ قافلہ والوں نے ان کو چور سمجھا۔ شور ہوا تو نواب صاحب بھی آ گئے اور وہ لوگ حافظ صاحب اور ان کے دونوں ساتھیوں کو پکڑ کر لے گئے۔ صبح کو نواب صاحب نے حکم دیا کہ رات کو جو تین آدمی گرفتاری کیے گئے تھے، انھیں پیش کیا جائے۔ جب یہ گرفتار شدگان نواب کی کچہری میں پہنچے تو وہاں ایک عالم وعظ کر رہا تھا۔ اثنائے وعظ میں اس کی ایک نحوی غلطی پر حافظ صاحب نے اسے ٹوکا۔ نواب کو جب معلوم ہوا کہ یہ شخص نابینا ہونے کے باوجود عالم فاضل ہے تو ان تینوں کو چھوڑ دیا اور پچاس روپے سفر خرچ دے کر انھیں احترام کے ساتھ روانہ کیا۔ یہ تینوں سورت شہر پہنچ گئے۔

سورت میں ان کی بعض اہل علم حضرات سے ملاقات ہوئی۔ ایک دن مسجد میں ایک عالم سے کسی مسئلے کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی کہ انھیں پتا چلا حافظ صاحب غیر مقلد ہیں۔ انھوں نے ان کو مسجد سے نکال دیا۔ چنانچہ وہ وہاں سے ایک بستی میں آ گئے، جس کا نام ''راندھیر'' ہے۔ راندھیر کے ایک سیٹھ اسماعیل نے مدرسہ جاری کیا تھا۔ حافظ صاحب اس مدرسے میں آ گئے۔ سیٹھ صاحب نے بھی انھیں غیر مقلد ہونے کی وجہ

Marfat.com

سے مدرسے سے نکال دیا۔ اب وہ سمندر کے کنارے ایک گاؤں میں چلے گئے، جس کا نام ''بہاؤ نگر'' تھا۔ وہاں وہ ایک مسجد میں ٹھہرے۔ یہ جمعے کا دن تھا۔ حافظ صاحب نے جمعہ پڑھایا۔ ان کی تقریر سے لوگ بہت خوش ہوئے اور بڑی عزت سے پیش آئے، لیکن ان کی غیر مقلدیت نے یہاں بھی اپنا ہاتھ دکھایا اور لوگوں نے ان کو مسجد سے نکال دیا۔ اب ایک حجام جس کا نام عثمان تھا، انھیں اپنے گھر لے گیا اور ایک مہینا ان کو اپنے پاس رکھا۔

اس بستی میں بے شمار بچھو تھے جو سخت زہریلے تھے اور بڑے بڑے تھے، جسے کاٹتے وہ مشکل ہی سے زندہ رہ سکتا تھا۔ ایک شخص کو بچھو نے کاٹا۔ اسے حافظ صاحب کے پاس لایا گیا۔ انھوں نے بسم اللہ پڑھ کر لعاب لگایا اور اس کا درد ختم ہو گیا۔ اس کے بعد سب لوگ ان کا احترام کرنے لگے۔

ایک دن حافظ صاحب صبح کی نماز ایک ندی کنارے پڑھا رہے تھے۔ ان کے دو ساتھی ان کے مقتدی تھے۔ نماز میں وہ اس خوش الحانی سے قرآن پڑھ رہے تھے کہ بہت سے لوگ وضو کر کے نماز میں شامل ہو گئے۔ سلام پھیرا تو بتایا گیا کہ مقتدیوں کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہے۔ یہاں اللہ نے حافظ صاحب کو بڑی تکریم سے نوازا۔ ایک دن یہاں کے رئیس نے ان سے کہا کہ اس کا ماموں عربی پڑھنا چاہتا ہے، وہ اسے عربی پڑھا دیا کریں، لیکن حافظ صاحب نے کسی وجہ سے انکار کر دیا۔ وہ رئیس ان سے خفا ہو گیا اور انھیں وہاں سے نکال دیا۔ ابھی وہ دور نہیں گئے تھے کہ کچھ لوگ ان کے پیچھے دوڑے جو ایک شخص کو ڈولی میں اٹھائے ہوئے لا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ اسے بچھو نے کاٹا ہے۔ حافظ صاحب نے اسے دم کیا اور وہ اللہ کے فضل سے تندرست ہو گیا۔ پھر وہ لوگ منت سماجت کر کے حافظ صاحب کو واپس لے گئے۔ اب یہ لوگ حافظ صاحب کا بے حد احترام کرنے لگے۔ ان کے پاس کافی روپے بھی جمع ہو گئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے وہاں سے حج بیت اللہ کا قصد کیا۔

سورت کا ایک تاجر اللہ رکھا بھی حافظ صاحب کے ساتھ حج بیت اللہ کے لیے تیار ہو گیا۔ یہ دونوں سورت سے بمبئی پہنچے اور بمبئی سے بحری جہاز پر سوار ہوئے۔ گیارھویں دن جدہ کی بندرگاہ پر اترے۔ وہاں سے دو دن میں مکہ مکرمہ پہنچے۔ مکہ مکرمہ جا کر حافظ صاحب انتہائی خوش ہوئے۔ عمرہ کیا اور حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ فریضہ حج ادا کر کے وہ مدینہ منورہ جانا چاہتے تھے۔ چند روز کے بعد کچھ لوگوں کے ساتھ مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے۔ وہ حاجیوں کے لیے نہایت خطرناک دور تھا۔ بدو راستے میں مسافروں کو لوٹ لیتے تھے اور قتل بھی کر دیتے تھے۔ حافظ صاحب کے قافلے کو بھی حملہ کر کے لوٹ لیا گیا۔ کچھ لوگ قتل بھی ہو گئے۔ یہ حادثہ مکے سے دو منزل کے فاصلے پر پیش آیا تھا۔ وہاں سے یہ لوگ واپس مکہ مکرمہ آ گئے۔

Marfat.com

کئی روز کے بعد ایک شخص چودھری نصر اللہ خاں ایک بڑے قافلے کے ساتھ مدینہ کو روانہ ہونے لگے تو حافظ صاحب کو بھی اپنے ساتھ لے گئے اور خیر خیریت سے وہاں پہنچ گئے۔ دس دن مدینہ منورہ رہے۔ پھر واپس مکہ مکرمہ آئے۔ مکہ مکرمہ سے جدے آئے۔ جدے سے جہاز پر سوار ہوتے وقت حافظ صاحب سمندر میں گر گئے۔ ملاحوں نے جلدی سے پکڑ کر انھیں سمندر سے باہر نکالا اور جہاز پر سوار کیا۔ چند روز میں بمبئی آ گئے۔ اس وقت حافظ صاحب کی عمر سترہ (۱۷) برس کی تھی۔

بمبئی میں ایک شخص مولوی نظام الدین تھے جو مدرسہ حمیدیہ کے بانی مولانا حمید الدین کے بھائی تھے۔ نہایت مخلص اور ملنسار بزرگ۔ حافظ صاحب کا قیام انھی مولوی نظام الدین کے ہاں رہا۔ بمبئی سے حیدر آباد (دکن) چلے گئے۔ وہاں وہ سر سالار جنگ کے مہمان تھے۔ چند روز کے بعد حیدر آباد سے مدراس کو روانہ آئے۔ مدراس سے مالا بار کا عزم کیا۔ مالا بار میں وہ سیٹھ ابوبکر کے مکان پر ٹھہرے۔ وہاں کے لوگ زیادہ تر چاول کھاتے تھے، لیکن حافظ صاحب کے لیے گندم کی روٹی پکائی جاتی تھی۔ ایک روز حافظ صاحب بالا خانے میں بیٹھے تھے کہ بھیک مانگنے والے دو پنجابی برہمن آئے جو پنجابی کے شعر پڑھ کر مانگ رہے تھے۔ حافظ صاحب نے ان برہمنوں کو اپنے پاس بلایا اور ان سے پنجابی زبان میں باتیں کرنے لگے اور پنجاب کے حالات پوچھنے لگے۔ سیٹھ ابوبکر نے محسوس کیا کہ حافظ صاحب کا دل اپنے وطن پنجاب جانے کے لیے بے قرار ہے۔ انھوں نے بڑے احترام کے ساتھ انھیں اپنے ہاں سے روانہ کیا۔

مدراس میں حافظ صاحب کی متعدد علمائے کرام سے ملاقات ہوئی۔ ان میں ایک عالم دین مولانا عبدالشکور محلہ مچھلی بندر والے تھے جو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالرحمٰن پانی پتی، مولانا بشارت اللہ کابلی، مولانا ہدایت اللہ مدراسی اور مولانا عبدالحق بنارسی سے ملاقات کا موقع ملا۔ مولانا عبدالحق بنارسی اپنے عہد کے بہت بڑے عالم تھے اور علامہ محمد بن علی شوکانی کے شاگرد تھے۔ حافظ صاحب نے ان سے استفادہ کیا اور سند لی۔ [1]

مولانا عبدالحق بنارسی نے حضرت نواب صدیق حسن خاں کے نام ایک خط لکھ کر حافظ صاحب کو دیا کہ انھیں بھوپال کے مدرسے میں بہ طور معلم مقرر کیا جائے۔ حافظ صاحب سے انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ جو علوم آپ نے پڑھے ہیں، وہ اصل مقصود نہیں، اصل مقصود علمِ حدیث ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے صحیح ترین تعلق علم حدیث ہی سے پیدا ہوتا ہے۔

ایک دن حافظ صاحب ایک مسجد میں بیٹھے تھے، جہاں مولانا محمد سہارن پوری طلبا کو پڑھاتے تھے۔

[1] مولانا عبدالحق بنارسی کا تذکرہ اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں کیا جا چکا ہے۔

Marfat.com

لوگوں نے دیکھا کہ مسجد کی چھت سے ایک عجیب سی شکل کا جانور آیا، جس کا طول وعرض انگوٹھے کے برابر تھا۔ اس کا تعاقب کیا گیا تو وہ غائب ہو گیا۔ مولانا محمد سہارن پوری نے فرمایا یہ جن ہے جو کبھی کبھی مسائل دریافت کرنے کے لیے آتا ہے۔ آپ لوگوں کا شور سن کر غائب ہو گیا۔ اس کا نام عبدالجبار ہے اور جبل عرفات میں رہتا ہے۔ مجھ سے اس نے تین مرتبہ صحیح بخاری پڑھی ہے۔ جنات کے بعض مقدمات کے تصفیے کے لیے بھی یہ کئی بار آیا ہے۔

بمبئی میں حافظ صاحب کی ملاقات ایک شخص سلیمان شریف یمنی سے ہوئی۔ اسے پوری صحیح بخاری حفظ تھی۔ حافظ صاحب کو مولانا عبدالحق بنارسی نے علم حدیث پڑھنے کی تاکید فرمائی تھی۔ اس کے بعد ان کی ملاقات چند دیگر علمائے حدیث سے ہوئی تو علم حدیث پڑھنے کا شوق مزید بڑھ گیا۔ مولانا سلیمان یمنی نے حافظ صاحب کو حدیث کی کتاب مشارق الانوار دی، جو دو ہزار سے زیادہ احادیث کا مجموعہ ہے۔ حافظ صاحب نے اسے اکتالیس روز میں حفظ کر لیا، حالاں کہ وہ اسے حفظ کرنے پر روزانہ ایک گھنٹا صرف کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے صرف اکتالیس گھنٹوں میں اس ضخیم کتاب کو زبانی یاد کر لیا۔

دورانِ حفظ میں حافظ صاحب کو تین مرتبہ نبی ﷺ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ ایک مرتبہ نبی ﷺ نے اپنا لعاب مبارک ان کے منہ میں ڈالا۔ دوسری مرتبہ انھیں اپنے سینۂ بابرکت سے لگایا۔ تیسری مرتبہ زیارت کا سبب یہ ہوا کہ حافظ صاحب نے کسی معاملے میں ایک نومسلم کو ڈانٹا تو نبی ﷺ نے خواب میں فرمایا:

((فلا تغضب علیه و ارفق به فانه حدیث عهد بجاهلية .))

”اس پر ناراض نہ ہو، اس سے نرمی کا برتاؤ کرو، کیوں کہ یہ ابھی نیا نیا دائرۂ جاہلیت سے نکلا ہے۔“

علم حدیث حاصل کرنے کے شوق میں حافظ صاحب جونا گڑھ گئے۔ وہاں ایک عالم مولانا سلیمان جونا گڑھی قیام فرماتے تھے۔ ان کی خدمت میں حاضری دی۔ اس وقت حافظ صاحب کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ کچھ عرصہ وہاں رہے اور مولانا سلیمان سے استفادہ کیا۔ پھر وہاں سے رخصت ہو گئے۔ اس وقت یہ تین آدمی تھے۔

سومنات کے قریب ایک جگہ ”کلاں پور“ ہے۔ وہاں شہر کے باہر ایک بہت بڑے گنبد والی مسجد تھی۔ رات کو یہ تینوں اس مسجد میں پہنچے تو ساتھیوں نے دیکھا کہ ایک شخص جو مسجد کے گنبد جتنے ہی لمبے ہیں، سفید چادر پر نماز پڑھ رہے ہیں۔ حافظ صاحب اس شخص سے کچھ باتیں کرنا چاہتے تھے، لیکن ان کے دونوں رفقائے سفر خوف زدہ ہو گئے اور انھوں نے وہاں سے چلنے پر اصرار کیا۔ حافظ صاحب کو ان کا ساتھ دینا پڑا۔ وہ اس مسجد میں رات نہیں رہے اور چل پڑے۔

Marfat.com

اس کے بعد بذریعہ بحری جہاز بمبئی آئے۔ وہاں ایک عرب عالم دین سے ملاقات ہوئی۔ وہ تاجر تھا اور اس کا اپنا بحری جہاز تھا۔ اس نے حافظ صاحب سے عرب جانے کے لیے کہا۔ حافظ صاحب تیار ہو گئے، لیکن اس عرب عالم کو جہاز کے لیے کسی اور جگہ کا سامان مل گیا جسے لاد کر اس نے ادھر کا رخ کر لیا۔ مگر حافظ صاحب بمبئی ہی میں رہے اور محلہ ناگ پاڑہ کی مسجد میں درس دینے اور بچوں کو قرآن پڑھانے لگے۔

ان دنوں حافظ صاحب بمبئی کے مختلف علاقوں میں وعظ کیا کرتے تھے۔ گوجراں والا کے مولانا علاء الدین بھی وہیں تھے، جو مولانا غلام رسول قلعوی کے شاگرد تھے۔ وہ بھی وعظ فرمایا کرتے تھے۔ حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں مجھے کچھ فخر سا ہو گیا تھا کہ میں بہت بڑا عالم ہوں۔ چنانچہ ایک دن ان سے ایک شخص نے کہا کہ حافظ صاحب کچھ اور علم پڑھ لو تو فرمایا میں کافی کچھ پڑھ چکا ہوں۔ دوسرے دن وہی شخص اصول فقہ کی ابتدائی کتاب ''اصول شاشی'' لایا اور کہا یہ کتاب وہ انھیں پڑھا دیا کریں۔ حافظ صاحب نے اسے پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ دورانِ سبق میں کسی مسئلے کے متعلق سوال کرتا اور حافظ صاحب اس کا جواب دیتے۔ ایک دن اس نے کچھ ایسے سوال کیے کہ حافظ صاحب ان کا جواب نہ دے سکے۔ اب حافظ صاحب سے اس نے کہا آپ کے پڑھنے کا وقت ہے، کچھ اور پڑھ لیں۔

اس شخص کے کہنے سے حافظ صاحب کو اپنی علمی کمی کا احساس ہوا تو مزید تعلیم کے لیے دہلی کو روانہ ہوئے۔ راستے میں ناگ پور شہر آیا، دو مہینے وہاں رہے اور وعظوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ بڑی عزت افزائی ہوئی۔ ان کے وعظ کے دوران ہی میں ایک ہندو پہلوان نے قبولِ اسلام کا اعلان کیا۔ ناگ پور سے چلے تو راستے میں ایک جگہ رات گزاری۔ وہاں ایک لمبے بالوں والے شخص نے ان کے بیگ میں ہاتھ ڈالا۔ حافظ صاحب نے اسے پکڑ لیا اور اپنے ساتھی کو جگایا۔ اس نے اسی شخص کی پگڑی سے اس کو باندھ دیا۔ اس سے بار بار پوچھا کہ تم کون ہو اور کہاں کے رہنے والے ہو؟ لیکن نہ اس نے کسی سوال کا جواب دیا اور نہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی۔ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ یہ اسی طرح اسے بندھا ہوا چھوڑ کر اپنے اگلے سفر پر روانہ ہو گئے۔

حافظ صاحب کی اگلی منزل جبل پور تھی۔ وہاں ایک عالم مولانا نصر اللہ صاحب قیام فرما تھے۔ کچھ دن ان کے پاس رہے۔

جبل پور سے بھوپال کو روانہ ہوئے۔ بھوپال کا معاملہ یہ تھا کہ کوئی شخص ٹکٹ کے بغیر شہر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ حافظ صاحب کئی دن شہر سے باہر ایک سرائے میں مقیم رہے۔ پھر کسی طرح شہر میں چلے گئے۔ وہاں ایک بہت بڑی مسجد تھی، جس میں مولانا عبدالجبار ناگ پوری ترجمۂ قرآن پڑھاتے تھے اور طلبا خاصی

Marfat.com

تعداد میں ان سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ایک روز حافظ صاحب کو علم نحو کے کسی مسئلے کے متعلق مولانا عبدالجبار سے بات کرنے کا موقع ملا تو انھیں پتا چلا کہ حافظ صاحب عالم دین ہیں، چنانچہ وہ انھیں ریاست بھوپال کے مدار المہام (یا وزیر اعظم) مولانا جمال الدین صاحب کے پاس لے گئے۔ گفتگو ہوئی تو وہ حافظ صاحب کی علمی قابلیت سے بہت متاثر ہوئے۔ پچیس روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا اور ایک آدمی خدمت کے لیے دیا۔ اس وقت بھوپال کو علما کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ والیہ بھوپال بیگم شاہ جہان سے نواب صدیق حسن خاں کی شادی پر چند روز ہی گزرے تھے۔ مولانا عبدالحی بڈھانوی کے فرزند گرامی مفتی عبدالقیوم بھی وہیں تھے جو حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی کے داماد تھے۔ حافظ صاحب ایک سال بھوپال رہے۔ وہاں ان کی ملاقات نواب صدیق حسن خاں سے ہوئی جنھوں نے ان سے بڑے احترام سے باتیں کیں۔

بھوپال سے حافظ صاحب دہلی کو روانہ ہوئے۔ دوران سفر کان پور پہنچے تو وہاں مولانا شہید الدین صاحب سے ملے۔ انھوں نے حضرت میاں سید نذیر حسین کے نام سفارشی خط دیا۔ حافظ صاحب دہلی جا کر حضرت میاں صاحب کے حلقۂ درس میں شریک ہو گئے اور ان سے علمِ حدیث پڑھنے لگے۔ صحاح ستہ کی سند حافظ صاحب نے حضرت میاں صاحب سے لی۔

حصولِ سند کے بعد دہلی سے وطن کو روانہ ہوئے۔ راستے میں میرٹھ شہر گئے تو وہاں مولانا محمد قاسم صاحب سے ملے۔ ان کے پاس صحیح بخاری کا قلمی نسخہ تھا جو وہ لکھ کر علما کو عنایت فرماتے تھے۔ اس کے لیے حافظ صاحب نے حضرت میاں صاحب سے مولانا محمد قاسم کے نام سفارشی رقعہ لیا تھا۔ یہ رقعہ انھوں نے مولانا کو دیا اور انھیں صحیح بخاری کا قلمی نسخہ مل گیا۔

وہاں سے حافظ صاحب انبالے گئے اور انبالہ سے نابھہ پہنچے۔ وہاں ریاست نابھہ کے وکیل عبدالرحیم صاحب کے ہاں قیام رہا۔ کچھ دن گجرات (پنجاب) ٹھہرے۔ وہاں کے بعض علماء سے مسئلہ تقلید پر بحثیں ہوئیں۔ دہلی سے چل کر تین مہینے کے بعد وہ اپنے گاؤں گرولی (ضلع جہلم) پہنچے۔ وہاں اس نواح کے اصحاب علم مولانا غلام نبی، مولانا قل احمد اور مولانا غلام حسین وغیرہ سے تقلید شخصی پر بالعموم سلسلۂ گفتگو جاری رہتا۔

کچھ دن وہ اپنے گاؤں رہے۔ پھر لاہور آئے اور ایک سال مسجد چینیاں والی میں درس دیتے رہے۔ لاہور سے امرتسر گئے۔ وہاں دو سال حضرت عبداللہ غزنوی کے حلقۂ درس میں شامل رہے۔ وہاں مولانا حبیب اللہ پشاوری اور قاری عبدالعلی سے بعض مسائل پر گفتگو رہتی تھی۔ وہیں مولانا غلام رسول قلعوی سے ملاقات ہوئی۔ حافظ صاحب کے بقول ”وہ بہت متواضع اور متخشع تھے۔“ امرتسر میں ان کی بہت سے اہل علم بزرگوں سے ملاقاتیں ہوئیں، جن میں مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی اور مولانا عبدالرحمٰن بناری شامل ہیں۔

Marfat.com

حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ انھوں نے مولانا غلام رسول قلعوی کی وفات کے بعد خواب دیکھا کہ "وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر میرے قریب آئے اور میرے منہ سے شہد کا چشمہ جاری ہو گیا، جس سے مولانا صاحب نے سیرابی حاصل کی لیکن ان کی پیاس نہ بجھی۔" اس خواب سے حافظ صاحب پریشان تھے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کی تعبیر کیا ہے۔ لیکن جلد ہی تعبیر سامنے آ گئی۔ مولانا غلام رسول قلعوی کے دونوں ہاتھ جو انھوں نے حافظ صاحب کی طرف پھیلائے تھے، وہ دراصل ان کے دونوں صاحب زادے مولانا عبدالقادر اور مولانا عبدالعزیز تھے، جنھوں نے وزیر آباد جا کر حضرت حافظ صاحب سے تحصیل علم کا سلسلہ شروع کیا اور شہد سے مراد علم دین تھا، جس کے متعلق حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ "میں نے ایک دفعہ خواب میں مولانا سید نذیر حسین صاحب کو دیکھا کہ مجھے سخت پیاس لگی ہے اور میاں صاحب نے اپنا منہ میرے منہ پر رکھ دیا۔ ان کے منہ سے شہد کا چشمہ جاری ہوا اور میں اس سے سیراب ہوتا رہا۔"

حافظ صاحب فرماتے ہیں: انھی دنوں مجھے ایک اور خواب آیا۔ خواب سے پہلے ایک واقعہ سنیے: امرتسر میں ان دنوں مسئلہ صفات باری پر مباحثے ہو رہے تھے۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی معیت انسان کے ساتھ بالذات ہوتی ہے اور بعض کہتے تھے کہ بالعلم ہوتی ہے۔ حافظ صاحب فرماتے ہیں: "ایک دن میں نے خواب میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھا۔ آپ ﷺ کے دائیں بائیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تشریف فرما ہیں۔ نبی ﷺ کے سامنے مولانا عبداللہ غزنوی اور میاں سید نذیر حسین بیٹھے ہیں۔ میں نے معیت کے بارے میں پوچھا تو نبی ﷺ نے فرمایا: "معیت سے مراد معیت بالعلم ہے، بالذات نہیں ہے۔"

امرتسر سے حافظ صاحب بمباں والا (ضلع سیالکوٹ) تشریف لے گئے اور پھر وہاں سے وزیر آباد آئے اور وزیر آباد میں مدرسہ جاری کر کے درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ بیالیس برس وہاں خدمات سرانجام دیں۔ شروع شروع میں بہت تکلیفیں برداشت کرنا پڑیں۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں جو حضرت حافظ صاحب کے عالم و فاضل نواسے مولانا عبدالمجید سوہدروی نے اپنی تصنیف "استاذ پنجاب" میں بیان کی ہیں:

حافظ صاحب متوکل علی اللہ تھے۔ کسی قسم کی تکلیف کا کسی سے اظہار نہیں کرتے تھے۔ طلبا کا کھانا ان کے گھر میں تیار ہوتا تھا۔ مہمانوں کی آمد و رفت بھی رہتی تھی۔ حافظ صاحب کا تمام وقت تدریس میں گزرتا تھا۔ آمدنی کی کوئی صورت نہ تھی۔

☆...... ایک دن گھر سے پیغام آیا کہ رات کے لیے آٹا نہیں ہے۔ حضرت حافظ صاحب بیٹھے تھے کہ چٹھی رساں نے ایک خط دیا جس میں لکھا تھا کہ آج دوپہر کو وزیر آباد ریلوے اسٹیشن پر آپ مجھے ضرور ملیں۔

Marfat.com

میں ٹرین پر وہاں سے گزروں گا۔ خط پر کسی کا نام اور پتا نہیں تھا۔ حافظ صاحب وقتِ مقررہ پر اسٹیشن پہنچے تو ایک شخص آیا۔ اس نے حافظ صاحب کو سلام کیا اور اچھی خاصی رقم ان کو پیش کی۔ پوچھنے پر اپنا نام نہیں بتایا اور ریل پر سوار ہو کر چلتا بنا۔

☆...... ایک مرتبہ رمضان شریف میں قرآن مجید کا ترجمہ ختم ہوا اور ساتھ ہی طلبا نے کہا کہ آج آٹا ختم ہو گیا ہے۔ اس سے دو گھنٹے بعد ہرکارہ آیا اور پچیس روپے کا منی آرڈر حافظ صاحب کو دیا جو جزائر انڈیمان سے کسی نے بھیجا تھا۔

☆...... ایک بزرگ مولوی مولا بخش بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت حافظ صاحب کی خدمت میں حاضر تھا اور طلبا کا آٹا وغیرہ ختم ہو چکا تھا۔ اتنے میں وہ اٹھے اور تھوڑی دیر کے بعد تشریف لائے۔ دو کاغذ مجھے دیے اور فرمایا ایک شخص یہ دے کر چلا گیا ہے۔ دیکھو یہ کیا ہے۔ میں نے دیکھا تو وہ نوٹوں کی صورت میں بیس روپے تھے۔ جن کی حیثیت اس زمانے میں اچھی خاصی رقم کی تھی۔ [1]

پھر آہستہ آہستہ سب معاملات ٹھیک ہو گئے۔ ۱۹۰۷ء میں حافظ صاحب نے اپنے ایک شاگرد مولانا سلطان احمد ساکن نت ضلع گوجراں والا سے پنجابی نظم میں اپنی سوانح عمری خود لکھوائی اور یہ بھی لکھوایا کہ "تینتیس (۳۳) سال میں ساٹھ مرتبہ صحاح ستہ پڑھا چکا ہوں۔" اس کے بعد نو سال زندہ رہے اور کتبِ حدیث باقاعدہ پڑھاتے رہے۔ ان سے بے شمار علما و طلبا نے تعلیم حاصل کی۔ ان حضرات میں مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی، حضرت حافظ محمد گوندلوی، مولانا محمد علی لکھوی، مولانا عطاء اللہ لکھوی، قاضی عبدالرحیم قاضی کوٹی، مولانا عبداللہ کھپیاں والی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، میاں محمد باقر، مولانا عبدالقادر قلعوی، مولانا عبدالعزیز قلعوی، شیخ احمد دمشقی (شامی)، شیخ علی نجدی، مولانا عبداللہ یاغستانی، مولانا عبدالحمید سوہدروی، مولانا عمر دین وزیر آبادی اور دیگر لاتعداد لوگ شامل ہیں، جن میں برصغیر کے علاوہ عرب ملکوں کے طلبا کے نام بھی مرقوم ہیں۔

حضرت حافظ صاحب کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ فجر کی نماز کے بعد قرآن کا ترجمہ پڑھاتے۔ اس کے بعد صحیح بخاری، صحیح مسلم اور حدیث کی دوسری کتابیں پڑھاتے۔ یہ سلسلہ دوپہر تک چلتا۔ کھانا کھا کر ظہر کی نماز پڑھتے اور پھر عصر تک مختلف اسباق پڑھاتے۔ عصر کے بعد بھی تدریس ہوتی۔ کبھی کبھی تفسیر قرآن پڑھاتے۔ مغرب کے بعد مسجد میں وظائف و اوراد کا سلسلہ چلتا۔ عشا کے قریب گھر جا کر کھانا کھاتے اور عشا کے بعد جلد سو جاتے۔

[1] ملاحظہ ہو "استاذ پنجاب" (از مولانا عبدالمجید سوہدروی) ص ۱۰۵، ۱۰۶۔

Marfat.com

مشکوٰۃ شریف ہر طالب علم کو الگ الگ پڑھاتے۔ پھر حدیث کی دوسری کتابیں طلبا کی اکٹھی جماعت کو پڑھاتے۔ اکثر چھے مہینوں میں صحیح بخاری ختم کرا دیتے۔

۱۶- رمضان المبارک ۱۳۳۴ھ (۱۸- جولائی ۱۹۱۶ء) کو منگل کے روز غروبِ آفتاب سے قبل ۶۷ برس عمر پا کر سفرِ آخرت اختیار فرمایا۔

انا للّٰہ و انا الیه راجعون.

حضرت حافظ صاحب کا تذکرہ سید عبدالحی حسنی نے بھی کیا ہے۔ ❶

❀❀❀❀

❶ دیکھیے: نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۳۳۱، ۳۳۲.

Marfat.com

مولانا عبداللہ (ساکن دہلی ڈھانی)

(وفات ۱۹۱۸ء)

مشرقی پنجاب کے ضلع فیروز پور کی تحصیل مکتسر میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، جس میں متعدد مشہور علمائے کرام پیدا ہوئے۔ علماء کی اس جماعت میں حافظ عبداللہ بڈھیمالوی، حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی اور دیگر بہت سے حضرات شامل ہیں اور ان کے حالات یہ فقیر اپنی مختلف کتابوں میں لکھ چکا ہے جو قارئین کرام کے مطالعہ میں آئے۔

وہیں ایک بزرگ میاں امام الدین سکونت پذیر تھے، جن کی نرینہ اولاد تین بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے میاں نور جمال، ان سے چھوٹے میاں جلال الدین اور سب سے چھوٹے میاں عنایت اللہ۔

آگے میاں نور جمال کی نرینہ اولاد دو بیٹے ہوئے۔ ایک یہی زیب عنوان مولانا عبداللہ اور ان سے چھوٹے مولوی محمد...... عبداللہ بمقام بڈھیمال ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے اور درس نظامی کی پوری تعلیم انھوں نے مولانا عبدالرحمٰن بڈھیمالوی سے ان کے قائم کردہ مدرسہ رحمانیہ میں حاصل کی، جن کا تذکرہ گزشتہ سطور میں خوانندگانِ محترم کے مطالعہ میں آیا۔ مولانا عبداللہ نہایت ذہین اور معاملہ فہم تھے۔

میاں امام الدین اور ان کے بیٹوں کا پیشہ کاشت کاری تھا، لیکن بڈھیمال میں ان کا ذاتی رقبہ نہ تھا۔ ہندوستان کی ریاست بیکانیر میں آبادکاری کا سلسلہ شروع ہوا تو میاں امام الدین اپنے تینوں بیٹوں اور پوتے (مولانا عبداللہ) سمیت بڈھیمال سے نقل مکانی کر کے ریاست بیکانیر چلے گئے اور وہاں موضع دہلی ڈھانی خدا بخش میں سکونت اختیار کی اور سرکاری رقبہ آباد کر کے اس کے حقوق ملکیت حاصل کیے۔

مولانا عبداللہ کا وہ بھرپور جوانی کا زمانہ تھا۔ زمینوں کی آبادکاری میں انھوں نے اپنے والد گرامی میاں نور جمال اور چچا میاں جلال الدین کے ساتھ بہت محنت کی اور اس سلسلے میں اگر کسی سرکاری اہل کار سے ملنے کی ضرورت پیش آتی تو وہ یہ خدمت بھی انجام دیتے۔

۱۹۱۰ء کے لگ بھگ ان کی شادی اپنے ماموں میاں قاسم دین کی بیٹی سے کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ) میں ہوئی۔ میاں قاسم دین نہایت صالح بزرگ تھے۔ ان کی وفات تقسیم ملک کے بعد ہمارے موجودہ گاؤں چک نمبر ۵۳ گ ب ڈھیسیاں (تحصیل جڑاں والا ضلع فیصل آباد) میں ہوئی۔

جس زمانے میں یہ لوگ ریاست بیکانیر گئے تھے، اس زمانے میں اہل حدیث کی تعداد وہاں بہت کم تھی اور جس گاؤں (دہلی ڈھانی) میں یہ سکونت پذیر ہوئے، اس گاؤں میں کوئی اہل حدیث نہ تھا، البتہ احناف کی

Marfat.com

وہاں دو مسجدیں تھیں اور ان مسجدوں کے امام علم سے کوئی خاص تعلق نہ رکھتے تھے۔

مولانا عبداللہ اور ان کے والد اور چچا اپنی زمینوں میں کام کرتے تھے اور جب نماز کا وقت ہوتا وہیں ایک درخت کے سائے میں نماز پڑھ لیتے۔ احناف کی دونوں مسجدوں کے امام چوں کہ زیادہ علم نہ رکھتے، اس لیے نماز عیدین، نماز جمعہ اور جنازہ وغیرہ وہاں مولانا عبداللہ ہی پڑھاتے تھے۔ پھر تھوڑے عرصے کے بعد انھوں نے بھی گاؤں میں مسجد تعمیر کر لی تھی اور قرآن مجید کے درس کا سلسلہ بھی اس میں جاری ہوگیا تھا، اس لیے اس مسجد کی رونق کافی بڑھ گئی تھی۔ مسئلے مسائل پوچھنے والے مقامی لوگ بھی مولانا ممدوح کی خدمت میں آتے اور قرب وجوار کے دیہات کے رہنے والوں کا مرجع بھی وہی تھے۔

اس خاندان کی قاضی محمد سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ سے قریبی رشتے داری تھی اور وہ پنجاب کی سب سے بڑی ریاست پٹیالہ کے سیشن جج تھے۔ علم وفضل میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو خوب نوازا تھا اور ان کی شہرت پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ ان کی ایک بڑی صفت یہ تھی کہ وہ قرابت داروں سے میل جول قائم رکھتے تھے۔ وہ ڈھانی بھی تشریف لے جایا کرتے تھے، لوگوں کو اس کا پتا چل جاتا تو وہ نہایت احترام سے ان کی خدمت میں حاضری دیتے اور مختلف مسائل ان سے دریافت کیے جاتے۔ اردگرد کے مقامات میں رہنے والے علمائے کرام بھی بلا امتیاز مذہب ومسلک ان کے پاس آتے اور استفادہ کرتے۔

مولانا عبداللہ بہت اچھے واعظ اور مقرر تھے۔ نرمی اور تحمل سے بات کرتے اور لوگ بڑے شوق سے ان کی گفتگو سنتے۔

اب مولانا عبداللہ صاحب کی وفات کے متعلق سنیے!

یہ تو پہلے بتایا جاچکا ہے کہ وہ مولانا عبدالرحمٰن بڈھیمالوی کے شاگرد تھے اور انھوں نے مروّجہ علوم انھی سے بڈھیمال میں حاصل کیے تھے۔ دوسری جنگ عظیم اکتوبر ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی تھی۔ اس کے اختتام کے بعد دنیا کے بہت بڑے حصے میں طاعون کی بیماری پھیل گئی تھی، جس سے لاکھوں لوگ موت کی گرفت میں آ گئے تھے۔ مولانا عبدالرحمٰن بڈھیمالوی نے بھی اسی بیماری سے وفات پائی تھی۔

مولانا عبداللہ کو اپنے اس استاذ محترم کی بیماری کا پتا چلا تو وہ اپنے گاؤں (ڈھانی) سے ان کی عیادت کے لیے بڈھیمال پہنچے، لیکن اس وقت مولانا عبدالرحمٰن بڈھیمالوی فوت ہوچکے تھے اور ان کی میت قبرستان لے جائی جاچکی تھی۔ مولانا عبداللہ قبرستان گئے اور تدفین کے بعد واپس آ گئے۔

مولانا عبدالرحمٰن بڈھیمالوی نے وہاں مدرسہ رحمانیہ قائم کیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد اب کوئی مدرس اس مدرسے میں نہیں تھا۔ بڈھیمال کے لوگ مولانا عبداللہ سے اصرار کرنے لگے کہ آپ یہاں آجایئے اور اپنے استاذ کی مسند درس پر بیٹھ کر طلبا کو تعلیم دیجیے۔ لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مولانا عبداللہ بڈھیمال ہی

Marfat.com

میں تھے کہ ان پر مرض طاعون کا حملہ ہوگیا۔ حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کے والد گرامی مولانا کریم بخش (جو مولانا عبداللہ کے پھوپھا تھے) ان کو بیماری کی حالت میں بڈھیمال سے ڈھانی لے گئے اور اس سے چند روز بعد اپنے گاؤں ڈھانی میں ۳۳ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کے پسماندگان میں ایک بیوہ تھی۔ ایک چار سالہ بیٹی تھی۔ والدین تھے، دادا تھے اور ایک اٹھارہ سال کے بھائی مولوی محمد، جو قیام پاکستان کے بعد چک نمبر ۳۶ میں فوت ہوئے۔

مولانا عبداللہ کی وہ چار سالہ بیٹی جوان ہوئی تو اس کی شادی میاں جلال دین کے بیٹے مولوی عبدالرشید سے ہوئی اور وہ ہمارے عزیز بھائی محمد حسن سعید (سیکرٹری دارالعلوم تقویۃ الاسلام لاہور) کی والدہ تھیں۔

مولانا عبداللہ کی وفات کے پندرہ سال بعد میاں جلال الدین کے بڑے بیٹے مولوی عبدالعزیز کو اللہ تعالیٰ نے ۱۹۳۵ء کے آس پاس بیٹا عطا فرمایا تو میاں جلال الدین کے والد مکرم میاں امام الدین کو اس کا نام رکھنے کے لیے کہا گیا۔ انھوں نے فرمایا: میری رائے تو یہ ہے کہ اس کا نام میرے پوتے عبداللہ والا نام ہی رکھا جائے۔ چنانچہ یہی نام رکھا گیا اور یہ وہی عبداللہ ہیں، جنھیں شیخ الحدیث مولانا عبداللہ امجد کہا جاتا ہے۔ یہ پنجاب کے مختلف مدارس میں پڑھاتے رہے ہیں۔ اب کئی سال سے مرکز دعوۃ السّلفیہ ستیانہ بنگلہ میں بہ طور شیخ الحدیث خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ قرآن وحدیث اور دیگر علوم متداولہ میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان کی حیثیت اب استاذ الاساتذہ کی ہے۔ جناب محمد حسن سعید صاحب کے یہ تایا زاد بھائی ہیں۔ ان کے اور محمد حسن سعید کے دادا میاں جلال الدین میری والدہ مرحومہ کے حقیقی ماموں تھے اور حضرت مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی میری والدہ کے خالہ زاد بھائی تھے۔

تقسیم ملک کے بعد بڈھیمال کے لوگ ہمارے گاؤں چک نمبر ۵۳ گ ب ڈھیسیاں اور جڑاں والا شہر سے سترہ اٹھارہ کلومیٹر کے فاصلے پر چک نمبر ۳۶ میں جا بسے تھے۔ مولانا عبداللہ امجد اور محمد حسن سعید کے آباواجداد بھی ریاست بیکانیر کے گاؤں دہلی ڈھانی سے نقل مکانی کر کے چک نمبر ۳۶ چلے گئے تھے۔

اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کا حامی وناصر ہو اور ہمیں بھی اپنے سایۂ رحمت میں رکھے، آمین یارب العالمین۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ مولانا عبدالرحمٰن بڈھیمالوی کے حالات بھی کہیں سے نہیں مل رہے تھے اور مولانا عبداللہ کے بارے میں بھی چند باتوں کے سوا کچھ معلوم نہ تھا، تاہم میں ان کا تذکرہ ضرور کرنا چاہتا تھا، برادر عزیز محمد حسن سعید کا شکر گزار ہوں کہ اس باب میں انھوں نے میری مدد کی اور منطق کی زبان میں عدم سے وجود بہرحال بہتر ہے کے مطابق کچھ نہ کچھ لکھ لیا گیا۔ تحقیق کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوا، امید ہے کوئی صاحب ان بزرگوں کے مفصل حالات تحریر فرمائیں گے۔

Marfat.com

مولانا فیض اللہ خاں بھوجیانی

(وفات ۱۹۲۵ء)

ضلع امرتسر کی تحصیل ترنتارن میں ایک گاؤں ''بھوجیاں'' تھا۔ آج کل کے حساب کے مطابق یہ گاؤں امرتسر سے تقریباً بیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس گاؤں میں بہت سے علما وصلحا قیام پذیر تھے اور وہ اس نواح میں اہل حدیث جماعت کا مشہور مرکز تھا۔ یہاں ایک جلیل القدر عالم دین مولانا فیض اللہ خاں اقامت فرما تھے۔ وہ دراصل قریب کے گاؤں ''پنجوڑ'' (PUNJWAR) کے رہنے والے تھے اور وہیں سے موضع بھوجیاں تشریف لائے تھے۔ ان کے والد کا نام جمال الدین خاں اور دادا کا خلیل احمد خاں تھا۔

مولانا فیض اللہ خاں کی تاریخ ولادت کا یقینی طور پر تو علم نہیں ہوسکا لیکن اندازہ کیا جاتا ہے کہ وہ ۱۸۷۰ء کے قریب پیدا ہوئے۔ ان کے والد جمال الدین کی تعلیم زیادہ نہ تھی۔ لیکن وہ اپنے گاؤں پنجوڑ کی ایک مسجد کے امام تھے اور گاؤں میں عزت وتکریم کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ مولانا فیض اللہ خاں نے قرآن مجید سمیت ابتدائی دینی تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی۔

انھیں دینیات کی پوری تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا، لیکن اس کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اسی اثنا میں پتا چلا کہ افغانستان کے علاقہ غزنی سے امرتسر میں چند بہت بڑے علما آئے ہیں اور انھوں نے وہاں مدرسہ جاری کیا ہے، جس میں پنجاب کے مختلف مقامات کے طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ تعلیم کے علاوہ غزنی کے ان علماء کا صالحیت اور تقویٰ شعاری میں بھی بڑا مقام ہے۔ لوگ ان کی خدمت میں جاتے اور فیض حاصل کرتے ہیں۔ اس قسم کی باتیں سن کر مولانا فیض اللہ خاں بہت خوش ہوئے اور حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے والد میاں صدر الدین حسن کے ساتھ امرتسر گئے اور علمائے غزنویہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ غزنوی گھرانے کے بڑے بزرگ حضرت مولانا سید عبداللہ غزنوی تو ان کے وہاں جانے سے پہلے وفات پاچکے تھے لیکن ان کے بارہ بیٹے تھے جو علم وفضل میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ ان میں سے بڑے بیٹے مولانا محمد غزنوی تھے۔ ان کا بھی انتقال ہوگیا تھا۔ ان سے چھوٹے مولانا عبداللہ تھے، یعنی عبداللہ بن عبداللہ۔ عالی مرتبت باپ کی طرح علم وتقویٰ کی نعمت سے مزین۔ مولانا فیض اللہ خاں نے ان کے حلقۂ درس میں شرکت کی اور قرآن وحدیث اور دیگر علوم مروجہ کی تحصیل میں کوشاں ہوئے۔ کچھ عرصے کے بعد وہ بھی

Marfat.com

رحلت فرما گئے تو ان کی مسند پر ان کے چھوٹے بھائی حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی متمکن ہوئے جو نہایت متقی اور جید عالم تھے۔ اپنے عالی قدر باپ اور بھائیوں کی طرح حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے لائق ترین شاگرد۔ مولانا فیض اللہ خاں نے ان سے خوب فیض پایا اور تمام علوم دینیہ کی تحصیل کی۔ ان کے علم و معرفت اور تقویٰ و پرہیز گاری کی وجہ سے لوگ انھیں امام صاحب کہا کرتے تھے۔ یہ حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے والد ذی شان تھے۔

حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کی روایت کے مطابق ایک دفعہ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی امرتسر تشریف لائے تو حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی کی سفارش سے انھوں نے مولانا فیض اللہ خاں کو تدریس حدیث کی زبانی اجازت مرحمت فرمائی۔ اسی طرح حضرت شیخ حسین بن محسن انصاری یمنی جو حضرت نواب سید صدیق حسن خاں کی دعوت پر تدریس حدیث کے لیے یمن سے بھوپال آئے تھے، ایک مرتبہ امرتسر تشریف لائے تو مولانا فیض اللہ خاں نے ان سے تحریری سندِ حدیث لی۔ [1]

امرتسر کے مدرسہ غزنویہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا فیض اللہ صاحب واپس اپنے گاؤں پنجوڑ آ گئے، لیکن بھوجیاں کیسے پہنچے اور کیوں پہنچے؟ یہ ایک سوال ہے۔ آیے اس کا جواب سنیے!

امرتسر کی تحصیل اجنالا میں ایک گاؤں ''محمد منداں والا'' تھا۔ وہاں ایک عالم دین مولانا خدا بخش رہتے تھے۔ وہ ماضی قریب کے مشہور واعظ حافظ عبداللہ شیخوپوری مرحوم کے دادا تھے۔ مولانا خدا بخش کے والد کا نام مولانا محمد اسماعیل تھا۔ حضرت امام سید عبدالجبار غزنوی کے شاگرد اور مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے مرید تھے۔ انھوں نے اپنے مرشد مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے حالات میں پنجابی نظم میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے۔ اس رسالے کے علاوہ بھی انھوں نے مختلف موضوعات سے متعلق پنجابی نظم میں چھوٹے چھوٹے کئی رسالے لکھے۔ وہ پنجابی کے بہت اچھے شاعر اور بہت اچھے واعظ تھے۔ کتاب و سنت کی روشنی میں وعظ کہتے تھے۔ لوگ ان کا وعظ شوق سے سنتے اور متاثر ہوتے تھے۔ وہ دیہات میں جاتے، کسی مسجد میں قیام فرماتے اور وعظ شروع کر دیتے۔ دیہات کے زیادہ تر لوگوں نے جو مسلکِ توحید اختیار کیا اور براہِ راست قرآن و حدیث کو اپنا معمول ٹھہرایا، وہ انھی حضرات کی کوشش کا نتیجہ ہے جو آسان زبان میں لوگوں کی سمجھ کے مطابق اپنی بات ان تک پہنچاتے تھے۔

ایک مرتبہ مولانا خدا بخش بھوجیاں گئے۔ اس وقت بھوجیاں میں اہل حدیث کی تعداد بہت کم تھی۔ مولانا نے ایک مکان کی چھت پر وعظ شروع کر دیا۔ وعظ سے متاثر ہو کر کچھ لوگوں نے مسلک اہل حدیث اختیار کیا

[1] تذکرہ علمائے بھوجیاں (از مولانا عبدالعظیم انصاری مطبوعہ ۱۹۸۴ء، ص ۱۰۵

Marfat.com

اور کچھ مخالفت پر اتر آئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بات مناظرے تک جا پہنچی۔ اس وقت امرتسر کے ہال بازار میں ایک مسجد کو مولوی جان محمد والی مسجد کہا جاتا تھا۔ اس مسجد کے خطیب ایک مشہور حنفی عالم بابا رسل تھے۔ وہ منطق اور علم کلام میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ اردو بولتے تھے اور فاضل بزرگ تھے۔ بھوجیاں کے حنفی حضرات امرتسر گئے اور مولانا خدا بخش سے مناظرے کے لیے انھیں لے آئے۔ مناظرہ شروع ہو گیا۔ بے شمار لوگ مناظرہ سن رہے تھے۔ بابا رسل اردو بولتے اور منطقیانہ باتیں کرتے تھے۔ جو لوگوں کی سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ ادھر مولانا خدا بخش خالص پنجابی میں گفتگو کرتے تھے، جسے لوگ پوری طرح سمجھ رہے تھے اور خوش ہوتے تھے۔

ایک مرتبہ بابا رسل نے اپنی باری میں منطق کی کلی اور جزی کی بحث چھیڑ دی جسے عوام بالکل نہ سمجھ سکے۔ ان کی جزی و کلی کی بات ختم ہوئی تو مولانا خدا بخش اپنی باری پر کھڑے ہوئے۔ فرمایا: لوگو! بابا رسل کے کوٹھے تو میں نے ڈھا دیے ہیں، اب ان کی صرف ایک کلی رہ گئی ہے، یہ بے چاری کب تک باقی رہے گی، وہ ابھی ختم ہو جائے گی۔

یہ ایک عام سی بات تھی جو لوگوں کے ذہن میں اتر گئی۔ واہ واہ کی آوازیں بلند ہونے لگیں اور لوگوں نے اعلان کر دیا کہ مولوی خدا بخش جیت گئے اور بابا رسل ہار گئے۔ مناظرہ ختم ہو گیا اور بابا رسل امرتسر چلے گئے۔

یہ مناظرہ دراصل بھوجیاں میں مسلک اہل حدیث کی مقبولیت کا اعلان تھا۔ جن لوگوں نے یہ مسلک قبول کیا، ان میں وارث اور پارس نام کے دو بھائی بھی تھے۔ وہ خاصی زمینوں کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنی زمین میں ایک مسجد تعمیر کرائی اور مولانا فیض اللہ خاں کو موضع پنجوڑ سے بھوجیاں لے آئے۔ رہائش کے لیے مکان بھی تعمیر کرا دیا اور کچھ زرعی زمین بھی مولانا کے نام ہبہ کر دی۔ اب انھوں نے مستقل طور پر بھوجیاں میں سکونت اختیار کر لی اور یہ گاؤں اس نواح میں قرآن و حدیث کی اشاعت کا مرکز بن گیا، جس سے ہزاروں لوگوں نے روحانی اور دینی فوائد حاصل کیے۔

وعظ و تقریر کا سلسلہ تو اب باقاعدہ طور سے جاری ہو ہی گیا تھا، لیکن اس کے ساتھ مولانا نے دینی مدرسہ بھی جاری کر دیا، جس کا نام ''مدرسہ فیض الاسلام'' رکھا گیا۔ اس مدرسے کی وجہ سے گاؤں کی شہرت بہت بڑھ گئی اور یہاں مقامی اور بیرونی طلباء تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ابتدا میں مولانا فیض اللہ اکیلے تعلیم دیتے تھے۔ پھر اور اساتذہ کی خدمات بھی حاصل کر لی گئیں۔

قد و قامت، شکل و شباہت، علم و عمل اور بات چیت کے اعتبار سے مولانا کا لوگوں پر بہت اثر تھا۔ اگر گاؤں میں کسی سلسلے میں جھگڑا پیدا ہو جاتا تو لوگ مولانا کی طرف رجوع کرتے اور مولانا جو فیصلہ فرما دیتے، اس پر عمل کیا جاتا۔ اس صورت حال سے بعض لوگ مولانا سے حسد بھی کرنے لگے تھے اور ان کے اتباع

Marfat.com

کتاب وسنت کو بھی ہدفِ تنقید ٹھہرایا گیا۔ لیکن اللہ کی مہربانی سے سب معاملات احسن طریقے سے سلجھتے گئے اور کتاب وسنت کی نشر واشاعت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ ان کا جاری کردہ مدرسہ بھی ترقی کی منزلیں طے کرتا گیا اور ان کے شاگردوں کی تعداد اللہ کی مہربانی سے بڑھتی گئی۔

مولانا ممدوح جہاں جید عالم، نامور واعظ اور ممتاز مدرس تھے، وہاں تقویٰ اور نیکی کی نعمتِ بے بہا سے بھی اللہ نے ان کو خوب نوازا تھا اور وہ مستجاب الدعوات بزرگ تھے۔ یہاں اس کی صرف دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں جو مولانا عبدالعظیم انصاری کی کتاب ''تذکرہ علمائے بھوجیاں'' (مطبوعہ ۱۹۸۴ء) میں مندرج ہیں:

۱۔ بھوجیاں کے قریب کے گاؤں موضع بھاؤوال کے ایک شخص حاجی محمد ابراہیم بیان کرتے ہیں کہ ان کے باغ میں اعلیٰ قسم کے آم کا درخت تھا۔ اس نے پھل دینا چھوڑ دیا تو ہمیں بڑی پریشانی ہوئی۔ ایک دن مولانا فیض اللہ ہمارے گاؤں تشریف لائے تو ہم نے ان سے اس کا ذکر کیا۔ مولانا باغ میں گئے اور آم کے درخت کے پاس کھڑے ہو کر کچھ پڑھتے رہے اور اس پر ہاتھ بھی پھیرتے رہے۔ اس کے بعد وہ دوبارہ پھل دینے لگا اور پہلے سے بھی زیادہ۔

۲۔ مولانا عبدالعظیم انصاری اپنے والد محترم کے حوالے سے لکھتے ہیں: ایک مرتبہ بھوجیاں میں مولانا فیض اللہ خاں کے ہاں کوئی تقریب تھی، جس میں ان کے تعلق دار اور تلامذہ وغیرہ بھی کافی تعداد میں شامل تھے اور غزنوی خاندان کے بزرگ حضرت امام سید عبدالجبار غزنوی، مولانا عبدالواحد غزنوی اور مولانا عبدالرحیم غزنوی بھی شریک تھے۔ [1]

ان دنوں بارش نہ ہونے کی وجہ سے لوگ قحط اور خشک سالی کی زد میں تھے۔ اس مجلس میں مولانا فیض اللہ خاں کے ایک ارادت مند میاں الحمد للہ بھی موجود تھے۔ بٹالہ ضلع گورداس پور کے رہنے والے تھے۔ ان کا نام تو امام الدین تھا لیکن ان کا تکیہ کلام الحمد للہ تھا۔ غمی شادی کی جو بات سنتے قدرے بلند آواز سے کہتے: الحمدللہ۔ انھوں نے مولانا فیض اللہ خاں سے عرض کیا کہ بارش نہ ہونے کے سبب لوگ سخت پریشان ہیں۔ دعا کیجیے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کی بارش برسائے، قحط ختم ہو۔ مولانا نے اسی وقت اللہ کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھائے۔ غزنوی علمائے کرام بھی دعا میں مشغول ہو گئے۔ نہایت عجز وعاجزی سے کافی دیر دعا کا سلسلہ جاری

---

[1] مولانا فیض اللہ بھوجیانی نے غزنوی خاندان سے رشتے داری بھی قائم کر لی۔ انھوں نے اپنی ایک بیٹی کی شادی مولانا عبدالرحیم غزنوی کے فرزند گرامی حافظ محمد زکریا غزنوی سے کر دی۔ مولانا عبدالرحیم غزنوی منڈی صادق گنج (ضلع بہاول نگر) چلے گئے اور انھیں وہاں کی شاہی مسجد کے خطیب مقرر کر دیا۔ ان کے خاندان نے وہیں سکونت اختیار کر لی۔ والد کی وفات کے بعد ان کے بیٹے حافظ محمد زکریا غزنوی ان کے جانشین ہوئے اور وہیں ۳۰۔ دسمبر ۱۹۸۰ء کو ان کی وفات ہوئی۔ (ان کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو میری کتاب ''گلستانِ حدیث'')

Marfat.com

رہا۔ دعا ختم ہوئی تو آسمان پر بادل نمودار ہوئے۔ تھوڑی دیر میں گھٹا چھا گئی اور بارش برسنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے جل تھل ہو گیا۔

اس مجلس میں ایک نوجوان بھی بیٹھا تھا جو میاں الحمد للہ کے ساتھ آیا تھا۔ وہ پنجابی کا شاعر تھا۔ اس نے اس صورت حال سے متاثر ہو کر اس مجلس میں فی البدیہہ اشعار پڑھے۔

بھوجیاں والے مولویاں دی میں کی صفت سناواں
تے غزنی والے علماواں دے صدقے صدقے جاواں
موسم خشک تے گرمی ڈھاڈی، تڑپن لوگ بے چارے
سخت ضرورت بارش ہووے، پھر دے مارے مارے
غزنی والے عالم فاضل ، نال ہوئے ہمراہی
سبھے دل دعاواں کر دے ، رو رو کر دے زاری
مولا رحمت کر دے اپنی تیری شان نیاری
کیتی ختم دعا جد اوہناں ، گھٹاں برس دیاں آیاں
چارے طرفوں جل تھل ہوئے ، رب دیاں بے پروائیاں
غزنی تے بھوجیانی عالم کڈیاں شاناں والے
خالی ہتھ خدا نہ موڑے وڈے بختاں والے
روز قیامت ساتھ اوہناں دا بخشیں یارب سائیں
اتھاں نال اٹھائیں سانوں جنت وچ پہنچائیں

مولانا فیض اللہ خاں عابد وزاہد، تہجد گزار، مہمان نواز، مشفق، بلند اخلاق، جرأت مند اور عالی ہمت عالم تھے۔

ان کے زمانے میں سرحد پار کے مجاہدین کی مدد کرنا بہت مشکل تھا۔ ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی اور مجاہدین آزادیٔ وطن کے لیے انگریزوں سے برسرِ پیکار رہتے تھے۔ جن لوگوں کے بارے میں انگریزی حکومت کو مجاہدین کی امداد کا شبہ پڑ جاتا، انھیں سخت سزا دی جاتی، لیکن اس کے باوجود اہل حدیث علمائے کرام کسی نہ کسی طرح ان کی مالی امداد کرتے تھے، اور اہل حدیث عوام وخواص ہی ان کے اصل معاون تھے۔ صوفی عبداللہ صاحب بالعموم مولانا کی خدمت میں آیا کرتے تھے اور مولانا ان کی وساطت سے مجاہدین کو چندہ بھجواتے تھے۔ آزادیٔ وطن کے بعد صوفی صاحب اپنی مجلسوں میں مولانا کی اعانت کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔

مولانا فیض اللہ خاں بھوجیانی کا اصل میدانِ عمل وعظ وتقریر اور درس وتدریس تھا، اس لیے وہ تصنیف

Marfat.com

وتالیف کی طرف توجہ مبذول نہیں فرما سکے، بس بعض مسائل سے متعلق چھوٹے چھوٹے چند رسالے لکھے، بعض فتاوے بھی تحریر فرمائے جو دست بردِ زمانہ کی نذر ہو گئے۔

ایک رسالہ ''کیفیت مناظرہ جھپال کلاں ضلع امرتسر'' کے نام سے شائع کیا۔ یہ مناظرہ ۲۴۔ جولائی ۱۹۲۴ء کو احناف اور اہل حدیث کے درمیان ہوا تھا۔ اہل حدیث کی طرف سے مناظر تھے سید عبدالرحیم لکھوی، مولانا محمد یوسف بکھیلوی، مولانا حافظ عبداللہ امرتسری اور مولانا فیض اللہ خاں بھوجیاں۔ احناف کی طرف سے جن اہل علم کو مناظر مقرر کیا گیا تھا، ان کے اسمائے گرامی تھے۔ مولانا احمد مختار میرٹھی، مولانا جمال الدین لاہوری اور بعض دیگر حضرات۔ موضوعِ مناظرہ چار مسائل تھے۔ (۱) استمداد از اولیا (۲) سماع موتی (۳) آمین بالجہر (۴) فاتحہ خلف الامام۔

اس رسالے میں دونوں طرف کے دلائل تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ آخر میں ثالث کا فیصلہ درج ہے کہ اہل حدیث اپنے دلائل میں کامیاب ہیں۔ احناف ان کے دلائل کا جواب نہیں دے سکے۔ اس رسالے کا ایک نسخہ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے پاس تھا۔ اب معلوم نہیں ان کی لائبریری میں موجود ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ مولانا فیض اللہ خاں کی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ کوئی تحریر کہیں نہیں ہے۔

اب مولانا ممدوح کی وفات کے متعلق سنیے!

وہ کچھ دنوں سے صاحب فراش تھے اور بیماری کافی بڑھ گئی تھی۔ جس دن انتقال ہوا، اس دن مولانا کے بڑے بیٹے مولانا عبدالرحمٰن عصر کی نماز پڑھ کر مسجد سے آئے تو والدِ گرامی کے پیچھے چار پائی پر بیٹھ گئے۔ مولانا نے ان سے ٹیک لگائی۔ اسی حالت میں عصر کی نماز پڑھی۔ مغرب کی نماز تک حالت قدرے بہتر معلوم ہوتی تھی۔ جو لوگ وہاں بیٹھے تھے، انھیں پند و نصیحت فرماتے رہے۔ مغرب کی نماز کا وقت ہوا تو حاضرین سے فرمایا: سب لوگ مسجد میں جا کر نماز پڑھو۔ چنانچہ لوگ مسجد میں چلے گئے۔ مولانا عبدالرحمٰن نے امامت کرائی۔ نماز کے بعد بہت سے احباب و رفقاء اور عقیدت مند مولانا کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ ان کے اہل خانہ بھی موجود تھے اور بڑے بیٹے مولانا عبدالرحمٰن بھی حاضر تھے۔ سب حاضرین نے آپ سے سلام اور مصافحہ کیا اور معافی کی درخواست کی۔

اس کے بعد آپ نے سب حاضرین کو وصیت فرمائی کہ میرے بعد توحید و سنت پر قائم رہنا اور آپس میں اتفاق و اتحاد قائم رکھنا۔ کسی قسم کا انتشار یا خلفشار نہ پیدا ہونے دینا۔ اور بھی بہت سے نصیحت آموز کلمات ارشاد فرمائے۔

اسی دوران ان کے ایک شاگرد مولانا عبدالرحمٰن بن حاجی شمس الدین حاضر ہوئے اور بلند آواز سے کہا:

Marfat.com

السلام علیکم۔

مولانا نے جواب میں وعلیکم السلام کہا اور اس کے ساتھ ہی روح جسد عنصری سے پرواز کرگئی اور آپ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا کی وفات ۱۹۲۵ء کو ہوئی، لیکن ۱۹۲۵ء کے کس مہینے اور کس تاریخ کو ہوئی، اس کا علم نہیں ہوسکا۔

مولانا کا واقعہ ارتحال نہایت الم ناک تھا۔ لوگوں نے اس پر بے حد حزن وملال کا اظہار کیا۔ الٰھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ

جب غسل دے کر مولانا کا جنازہ اٹھایا گیا تو آسمان پر بادل چھا گئے اور بونداباندی شروع ہوگئی جو تدفین تک جاری رہی۔

جنازے میں بھوجیاں اور اس کے مضافات کے ہزاروں لوگوں نے شرکت کی۔

ان کی وفات کے بعد ان کی نرینہ اولاد تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑے مولانا عبدالرحمٰن جو باپ کے جانشین ہوئے۔ ان سے چھوٹے مولانا عبداللہ اور ان سے چھوٹے مولانا عبدالرحیم۔ تینوں رفیع القدر علمائے دین تھے اور تینوں کو اگست ۱۹۴۷ء میں سکھوں نے شہید کردیا تھا۔ ان کے حالات ان شا اللہ کتاب کے آئندہ صفحات میں بیان ہوں گے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں بھوجیاں میں ہزاروں لوگوں کو شہید کردیا گیا تھا۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مولانا عبدالعظیم انصاری کی تصنیف ''تذکرہ علمائے بھوجیاں'')

❀❀❀❀

Marfat.com

حافظ محمد میر محمدی

(وفات ۱۹۴۰ء)

ضلع قصور کا ایک مشہور گاؤں ''میر محمد'' ہے جو راجہ جنگ ریلوے اسٹیشن سے بجانب مشرق دو اڑھائی میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ حافظ محمد یحییٰ مرحوم کا آبائی تعلق اسی گاؤں سے تھا۔ انھوں نے قرآن وحدیث کی تبلیغ واشاعت کو اپنی زندگی کا اصل مقصد قرار دے لیا تھا اور اس کے لیے ضلع قصور کے ایک گاؤں بنگا بلوچاں کو اپنا مرکز بنالیا تھا۔ وہ جلیل القدر عالم اور نہایت موثر وعظ کہتے تھے۔ ان کا تذکرہ میں نے اپنی ایک کتاب ''برصغیر کے اہل حدیث خدامِ قرآن'' میں بھی کیا ہے اور اس کتاب (بوستانِ حدیث) میں بھی کیا ہے۔ انھوں نے یکم اور ۲۔ نومبر ۲۰۰۸ء کی درمیانی شب کو انتقال کیا اور بنگا بلوچاں میں ان کے قائم کردہ دارالعلوم اور مرکز تبلیغ میں ان کی نمازِ جنازہ مولانا عتیق اللہ سلفی نے پڑھائی، جس میں ہزاروں لوگ شریک تھے۔ اس مرکز میں حافظ صاحب مرحوم کے بھانجے قاری محمد ابراہیم، قاری صہیب احمد اور قاری سلمان احمد خدمت تدریس انجام دیتے ہیں۔ ان اخوانِ ثلاثہ کے علاوہ اور بھی متعدد فاضل مدرسین وہاں درس وتدریس کا فریضہ سرانجام دینے میں مشغول ہیں۔

حافظ محمد یحییٰ میر محمدی کے والد گرامی کا نام حافظ محمد عظیم تھا لیکن وہ حافظ محمد کے نام سے معروف تھے۔ یہ راجپوت خاندان ہے جو صدیوں سے موضع میر محمد میں آباد ہے۔ حافظ محمد کے والد کا نام نواب خاں، چچا کا مستقیم خاں اور دادا کا روشن خان تھا۔ ان میں سے عامل بالحدیث ہونے کا اعلان سب سے پہلے مستقیم خاں نے اور پھر حافظ محمد صاحب کے والد نواب خاں نے کیا۔ یہ لوگ غزنوی اور لکھوی خاندان سے متاثر تھے۔ عمل بالحدیث کا معاملہ چوں کہ اس وقت اس گاؤں اور اس کے قرب وجوار میں بالکل نیا تھا، اس لیے ابتدا میں ان کی بہت مخالفت ہوئی۔ پھر آہستہ آہستہ حالات بدلے اور بے شمار لوگ ان کے ہم نوا و ہم مسلک ہو گئے۔

نواب خاں کے تین بیٹے تھے۔ بڑے سر بلند خاں، ان کے چھوٹے محمد عظیم خاں (جنھیں حافظ محمد کہا جاتا تھا) اور سب سے چھوٹے دوست محمد خاں۔ مؤخر الذکر دونوں حافظِ قرآن تھے اور بہت سی صلاحیتوں کے مالک۔ ان سطور میں حافظ محمد صاحب کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ مجھے ان کی زیارت کا شرف حاصل ہے۔ لمبا قد، نہ بہت دبلے پتلے، نہ فربہ، گورا رنگ، خاموش طبع، موٹی آنکھیں، کشادہ پیشانی، تقویٰ وصالحیت کے سانچے

Marfat.com

میں ڈھلے ہوئے۔ نرم کلام اور شیریں گفتار۔ حضرت مولانا فیض اللہ بھوجیانی کے داماد تھے۔

حافظ صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں ہی میں حاصل کی۔ اس کے بعد امرتسر گئے اور حضرت الامام سعید عبدالجبار غزنوی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور تحصیل علم کی، لیکن وہاں پوری تعلیم حاصل نہیں کر سکے۔ اس وقت ضلع فیروز پور کے ایک گاؤں موضع لکھو میں جو دریائے بیاس کے کنارے واقع تھا، ایک بزرگ سید محبوب شاہ سکونت پذیر تھے جو عبادت و زہد اور فضل وصلاح میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ وہ حضرت مولانا محی الدین، عبدالرحمٰن لکھوی اور حضرت امام سید عبدالجبار غزنوی کے فیض یافتہ تھے، حافظ محمد صاحب میر محمدی ان کی خدمت میں گئے اور ان کے حلقۂ ارادت سے وابستہ ہوئے۔

حافظ صاحب کا زیادہ تر رجحان وظائف واوراد اور تصوف وسلوک کی طرف تھا۔ ان کے زمانے کے ایک بزرگ مولوی کمال الدین تھے جو ضلع فیروز پور موضع چھینبیاں والی کے رہنے والے تھے۔ مولوی صاحب ممدوح ڈوگر برادری کے فرد تھے۔ زمیندار تھے اور نہایت صالح اور صاحبِ کمال بزرگ۔ حافظ صاحب نے ان سے بھی اخذِ فیض کیا۔ رحمہا اللہ تعالیٰ

اس فقیر کو بھی ابتدائی عمر میں عابد وزاہد حضرات کی خدمت میں حاضر ہونے کی عادت تھی۔ سب سے پہلے چھوٹی عمر میں مجھے میرے دادا میاں محمد مرحوم نے حضرت شاہ محمد شریف گھڑیالوی کی خدمت میں پیش کیا اور میں نے ان کی بیعت کی۔ وہ وفات پا گئے تو میرے استاذِ مکرم حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے (میری طالب علمی کے زمانے میں) مولانا کمال الدین ڈوگر (ساکن چھینبیاں والی) کے حلقۂ بیعت میں شامل کرایا۔ مولانا کمال الدین اس وقت بہت لاغر ہو چکے تھے اور عمر کے آخری دور میں تھے۔ مستجاب الدعوات اور مجسمۂ عجز وانکسار۔

ان سطور میں اصل مقصد حضرت حافظ محمد میر محمدی رحمہ اللہ سے متعلق چند گزارشات پیش کرنا ہے۔ وہ اوصافِ حمیدہ کے مالک اور بیشرفت ونجابت اور اخلاق حسنہ کے پیکرِ متحرک تھے۔ مولانا عبدالعظیم انصاری نے اپنی کتاب ''تذکرہ علمائے بھوجیاں'' میں لکھا ہے کہ وہ نہایت وسیع القلب اور عالی کردار بزرگ تھے۔ اپنی زمین کے خود ہی کاشت کار تھے۔ وہ کھیتوں میں جاتے۔ اگر ان کے کھیت سے کوئی شخص بلا اجازت چارہ وغیرہ کاٹ رہا ہوتا تو اسے دور سے دیکھ کر کسی اور طرف نکل جاتے تاکہ اسے شرمندگی نہ ہو۔ وہ چارہ اٹھا کر چلا جاتا تو پھر اپنے کھیت کی طرف آتے۔

جس طرح حضرت حافظ صاحب انسانوں کے ہم درد تھے، اسی طرح حیوانوں پر بھی ہم دردی کا اظہار فرماتے۔ وہ کاشت کاری کے زمانے میں بیل جوت کر ہل چلاتے تو عام لوگوں کی طرح انھیں ڈنڈا نہیں

Marfat.com

مارتے تھے بلکہ کپڑا مار کر انھیں ہانکتے۔ بیلوں کو وہ تکلیف نہیں دینا چاہتے تھے۔ ان سے شفقت اور رحم کا سلوک کرتے تھے۔ اندازہ فرمایئے جو شخص حیوانوں کے لیے اس قدر رحم دل ہو، انسانوں کے لیے اس کی رحم دلی کا کیا حال ہوگا۔

مولانا عبدالعظیم انصاری حضرت حافظ صاحب کے فرزند گرامی مولوی محمد یعقوب کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ عوام میں حضرت کی کئی کرامتیں مشہور ہیں۔ لیکن ہم انھیں اس لیے بیان نہیں کرتے کہ اسے خودستائی نہ سمجھ لیا جائے۔ پھر انصاری صاحب کے اصرار پر انھوں نے ایک واقعہ بیان کیا اور وہ واقعہ یہ ہے کہ موضع میر محمد کے ایک شخص محمد شفیع کہتے ہیں کہ وہ موضع رکھاں والا کے مڈل سکول میں پڑھتے تھے اور روزانہ پیدل اپنے گاؤں میر محمد سے رکھا والا جاتے تھے۔ ایک روز وہ گھر سے سکول کے لیے روانہ ہوئے تو دیکھا کہ ان کے آگے حافظ صاحب تیز تیز قدم جا رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کا مقصد رکھاں والا ریلوے اسٹیشن سے گاڑی پر سوار ہو کر براستہ فیروز پور، موضع لکھو میں اپنے روحانی استاذ سید محبوب شاہ کی خدمت میں جانا ہے۔ گاڑی آنے کا وقت قریب تھا، اس لیے محمد شفیع نے ان سے کہا: آپ گاڑی پر سوار نہیں ہو سکیں گے۔ فرمایا: تم میرے پیچھے پیچھے اس طرح چلتے آؤ کہ جب دایاں قدم اٹھاؤ تو کہو اللہ اور بائیں قدم پر کہو ھو۔ یعنی اللہ اللہ کہتے ہوئے تیز تیز چلو اور میرے ساتھ کوئی بات نہ کرو، ابھی یہ بات ہوئی تھی کہ اسی وقت راجہ جنگ اسٹیشن سے گاڑی سے وسل دیا۔ محمد شفیع نے کہا: حافظ صاحب گاڑی تو آ گئی۔ فرمایا: باتیں نہ کرو۔ بس چلتے آؤ۔ ابھی رکھاں والا اسٹیشن آدھ میل کے فاصلے پر تھا کہ گاڑی ان کے پاس سے گزر گئی۔ شفیع نے پھر کہا: حافظ صاحب! گاڑی نکل گئی۔ حافظ صاحب نے ان کو پھر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ابھی رکھاں والا اسٹیشن ان سے ایک فرلانگ دور تھا کہ گاڑی وہاں سے چل پڑی۔ محمد شفیع نے سکول جانا تھا۔ اس لیے وہ سکول کی طرف ہو گیا لیکن وہ پیچھے کو گردن گھما کر حافظ صاحب کو دیکھتا رہا کہ وہ گاڑی نکل جانے کے باوجود اسی رفتار سے اسٹیشن کی طرف جا رہے ہیں۔ پھر اچانک عجیب واقعہ ہوا کہ تھوڑی دور جا کر گاڑی رک گئی اور واپس اسٹیشن کی طرف آنے لگی۔ اتنی دیر میں حافظ صاحب اسٹیشن پر پہنچ گئے اور ٹکٹ لے کر گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی روانہ ہو گئی، یہ محمد شفیع کا چشم دید واقعہ ہے جو اس نے حافظ صاحب کے صاحب زادے مولوی محمد یعقوب کو بتایا اور محمد یعقوب نے عبدالعظیم انصاری سے بیان کیا۔ اس قسم کے اور بھی متعدد واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔ [1]

مولانا عبدالعظیم انصاری مرحوم اسی کتاب (تذکرہ علمائے بھوجیاں) میں قاری محمد صدیق استاذ مدرسہ

---

[1] تذکرہ علمائے بھوجیاں ص ۲۵۳، ۲۵۴۔ یہ کتاب ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی تھی۔

Marfat.com

حفظ القرآن فریدیہ قصور کے والدِ ماجد کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ حافظ محمد صاحب اپنے مویشی رات کو کھیت کے باڑے میں چھوڑ آتے تھے۔ مویشی جن میں بیل، بھینسیں اور گائیں وغیرہ ہوتی تھیں، رات کو اکیلے باہر رہتے اور کوئی نقصان نہ ہوتا جب کہ اور لوگوں کے مویشی گاؤں اکثر چوری ہو جاتے تھے۔

ایک دفعہ حافظ محمد صاحب کے باڑے سے بھی علاقے کا ایک مشہور چور ان کی بھینس چوری کر کے لے گیا۔ جب لوگوں نے اس کا نام لے کر حافظ صاحب کو بتایا تو کسی قسم کی پریشانی کا اظہار نہیں کیا بلکہ فرمایا میں نے اسے معاف کر دیا۔ ادھر یہ ہوا کہ جس شخص نے بھینس چوری کی تھی وہ سخت اذیت میں مبتلا ہو گیا۔ جب تکلیف مزید بڑھ گئی تو لوگوں نے کہا تم نے ایک بہت بڑے بزرگ کی بھینس چوری کی ہے۔ یہ اس کی بددعا کا نتیجہ ہے۔ اب گھر والوں نے اسے چارپائی پر ڈالا اور اٹھا کر میر محمد آئے۔ ساتھ بھینس بھی لیتے آئے۔ عجب منظر تھا۔ آگے چارپائی اور پیچھے بھینس چلی آ رہی ہے اور ساتھ کتنے ہی لوگ ہیں۔ اس طرح وہ حافظ صاحب کی خدمت میں آئے اور انھیں بھینس دے کر منت سماجت کرنے لگے کہ اس کے لیے دعا کیجیے کہ اسے آرام آ جائے۔

حافظ صاحب نے فرمایا: میں نے تو اسے اسی روز معاف کر دیا تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے اللہ نے معاف نہیں کیا۔ پھر اس کے لیے دعا کی اور وہ صحت یاب ہو گیا۔ [1]

اسی قسم کا ایک واقعہ حافظ محمد یحییٰ میر محمدی مرحوم نے اپنے چچا حافظ دوست محمد (متوفی مئی ۱۹۷۲ء) کے متعلق سنایا۔

وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ علاقے میں چوری کی وارداتیں زیادہ شروع ہو گئیں تو ان کے بھائی مولوی محمد یعقوب مویشیوں کو کھیت سے گھر لے آئے۔ اس سے قبل رات کو تمام مویشی کھیت ہی میں ہوتے تھے۔ ان کے چچا حافظ دوست مرحوم نے کہا: آج مویشی گھر کیوں لے آئے ہو؟

جواب دیا: چوری کی کئی وارداتیں ہو چکی ہیں، اس لیے حفاظت کے لیے گھر لے آیا ہوں۔

فرمایا: کسی قسم کا فکر نہ کرو، مویشی رات کو کھیت ہی میں رہنے دو، ان شاء اللہ کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

ایک دن حافظ دوست محمد مرحوم کو راجہ جنگ ریلوے اسٹیشن پر اس علاقے کا ایک مشہور چور ملا۔ وہ بار بار نہایت عاجزی سے جھک جھک کر حافظ صاحب کو سلام کرتا اور ان کی منت خوشامد کرتا تھا۔ حافظ صاحب نے اس سے پوچھا کیا بات ہے تم آج اس قدر انکسار کا اظہار کیوں کر رہے ہو؟

وہ کہنے لگا حافظ صاحب! ہم نے کئی بار آپ کے مویشی چوری کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ

---

[1] تذکرہ علمائے بھوجیاں ص ۲۵۵۔

Marfat.com

ہو سکے۔ جب مویشیوں کے قریب پہنچے اندھے ہو گئے۔ جب وہاں سے واپس ہوئے تو بینائی عود کر آئی۔ آخر ہم نے آپ کے مویشی چوری کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور سوچ لیا کہ آپ جیسے بزرگوں کی حفاظت اللہ کرتا ہے۔ ❶

بہر حال حافظ محمد صاحب میر محمدی مرحوم اور ان کے خاندان کے لوگوں کو جہاں تک یہ گناہ گار جانتا ہے، نہایت صالح اور تقویٰ شعار لوگ ہیں۔ موجودہ حضرات (قاری محمد ابراہیم اور قاری صہیب احمد) کے علاوہ جن حضرات کی زیارت کا مجھے شرف حاصل ہوا، وہ ہیں حافظ محمد صاحب (جن کے حالات کا قارئین نے مطالعہ کیا) حافظ دوست محمد، حافظ عبدالواحد، مولوی محمد داؤد، مولوی محمد یعقوب اور حافظ محمد یحییٰ صاحب۔ حافظ صاحب کے ساتھ تو میں نے سفر بھی کیا اور ان سے دارالعلوم تقویۃ الاسلام لاہور میں کافی عرصہ رفاقت رہی۔ یہ اس وقت دارالعلوم میں تعلیم حاصل کرتے تھے جب کہ اسی بلڈنگ میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کا دفتر تھا اور میں اس کا آفس سیکرٹری تھا۔

حضرت حافظ محمد میر محمدی نے ١٩٤٠ء میں اپنے آبائی مسکن میر محمد میں وفات پائی۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ اس خاندان کے وفات شدگان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور زندوں کو اپنے سایۂ رحمت میں رکھے اور انھیں کتاب و سنت کی خدمت کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

❁❁❁❁

❶ تذکرہ علمائے بھوجیاں ص ٢٥٦۔

Marfat.com

مولانا محمد جونا گڑھی دہلوی

(وفات مارچ ۱۹۴۱ء)

متحدہ ہندوستان کی جماعت اہل حدیث کے رفیع القدر علما میں حضرت مولانا محمد جونا گڑھی دہلوی رحمہ اللہ کا اسم گرامی خاص طور پر لائق تذکرہ ہے۔ ۱۹۳۵ء میں جب کہ میری عمر صرف دس سال کی تھی، ایک دن اپنے وطن کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ) میں لوگوں سے سنا کہ آج نماز عشا کے بعد مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا محمد جونا گڑھی دہلوی فیروز پور آئیں گے اور تقریر کریں گے۔ فیروز پور وہاں سے ۴۵ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ جلسہ سننے کے لیے لوگ بس پر سوار ہوئے تو میں بھی بس میں بیٹھ گیا۔ پہلے مولانا ثناء اللہ امرتسری نے تقریر کی۔ پھر مولانا جونا گڑھی تقریر کے لیے سٹیج پر آئے۔ نکلتا ہوا قد، بھرا ہوا گداز جسم، سرخ وسفید رنگ، گھنی سیاہ ڈاڑھی، زور دار اور پُر جوش مقرر۔ یہ ان کی پہلی اور آخری تقریر تھی جو میں نے سنی۔ اس کے بعد ان کی زیارت کا شرف حاصل نہیں ہوا۔

اللہ نے ان کی ذات میں بہت سی خوبیاں جمع فرما دی تھیں۔ وہ خطیب بھی تھے اور مناظر بھی، مصنف بھی تھے اور مترجم بھی، معلم بھی تھے اور محقق بھی، خوش گفتار بھی تھے اور عابد شب بیدار بھی۔ وہ کثیر المطالعہ عالم تھے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ چلتا پھرتا کتب خانہ تھے۔ ان کا اندازِ خطابت اور اسلوب تقریر بڑا پُر تاثیر تھا۔ وہ جوش اور جذبے کے ساتھ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے تھے۔ ہر معاملے میں کتاب وسنت کے دائرے میں رہتے تھے اور اسی کو اپنا مقصدِ حیات قرار دے رکھا تھا۔ اظہارِ حق میں بے خوف اور اعلائے کلمۃ اللہ میں جرأت مند!

ان کی زندگی مسلک اہل حدیث اور جماعتِ اہل حدیث کی خدمت میں گزری۔ کہیں تقریر میں اس مسلک کی حقانیت ثابت کر رہے ہیں اور کہیں مناظرے میں اس کی صداقت کی وضاحت کی جا رہی ہے۔ اس سے فارغ ہوتے ہیں تو مسندِ درس پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس سے فرصت پاتے ہیں تو تصنیف و تالیف کو مرکزِ التفات ٹھہرا لیتے ہیں۔ اس فریضے کی انجام دہی سے کچھ وقت بچتا ہے تو کسی عربی کتاب کے ترجمے کی طرف عنانِ توجہ مبذول ہو جاتی ہے۔ وہ مضطرب دل لے کر دنیا میں آئے تھے اور اسلام کے لیے خدمت گزار ذہن ان کو بارگاہِ الٰہی کی طرف سے تفویض کیا گیا تھا۔

اب آیئے آئندہ سطور میں ان کے احوالِ زندگی معرضِ بیان میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔

Marfat.com

ولادت اور نشو ونما:

مولانا محمد جونا گڑھی کی ولادت ۱۸۹۰ء میں (سابق صوبہ بمبئی اور) موجودہ صوبہ گجرات میں ضلع کاٹھیا واڑ کے شہر جونا گڑھ میں ہوئی۔ اس علاقے کو متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اچھی خاصی ریاست کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ میمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو مال دار اور تجارت پیشہ خاندان تھا۔ ان کے والد کا نام محمد ابراہیم تھا جو اپنے علاقے اور خاندان کے نیک کردار بزرگ تھے۔ مولانا محمد جونا گڑھی نے جس ماحول میں نشو ونما پائی، اس میں صالحیت تو تھی لیکن تحصیل علم کا رواج نہ تھا۔ وہ لوگ تجارت کرتے تھے اور اس میں کامیاب تھے۔ مولانا نے وہاں کے ایک شخص مولانا عبداللہ جونا گڑھی سے تعلیم حاصل کرنا شروع کی اور پھر جلد ہی خاندانی رواج کے مطابق کاروبار میں مصروف ہو گئے۔ ان کا کام عطر فروشی تھا۔ یہ بہت اچھا کام اور آمدنی کا معقول ذریعہ تھا۔

شادی:

مولانا ممدوح جوانی کی منزل کو پہنچے تو ان کی شادی کر دی گئی۔ ان کی اہلیہ کا نام امینہ بی بی تھا جو میمن خاندان کی نیک سیرت اور صالحہ خاتون تھیں۔ مولانا تجارت کرتے تھے اور نہایت مطمئن تھے۔ بچے کی ولادت ہوئی تو مزید اطمینان ہوا اور گھر میں مسرت کے سائے لہرانے لگے۔ لیکن مسرت کا یہ دور بہت محدود رہا اور جلد ہی بچہ وفات پا گیا، جس سے سب کو بے حد افسوس ہوا۔ اس کے بعد دوسرا بچہ پیدا ہوا، لیکن حالتِ زچگی میں بیوی بھی فوت ہو گئیں اور بچہ بھی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ یہ انتہائی الم ناک حادثہ تھا، جس سے وہ دو چار ہوئے۔

دہلی کو روانگی اور تحصیل علم:

اب ان کی عمر بائیس تیئس سال کی ہو گئی تھی اور عمر کی نسبت سے علم بہت کم تھا۔ بیوی کی وفات کے بعد دل میں تحصیل علم کا جذبہ ابھرا اور بغیر کسی کو بتائے گھر سے نکلے اور دہلی جا پہنچے۔ یہ ۱۹۱۳ء کی بات ہے۔ دہلی شہر اس وقت علم وعلما کے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا اور اسلامی تہذیب کا گہوارہ تھا۔ سب سے پہلے وہ مدرسہ امینیہ گئے اور وہاں کے اساتذہ کی خدمت میں زانوئے ادب تہہ کیے اور مختلف علوم کی کتابیں ان سے پڑھیں۔

بعد ازاں حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے تلمیذِ رشید مولانا عبدالوہاب دہلوی کے قائم کردہ تعلیمی ادارے "مدرسہ دار الکتب والسنہ" میں جا ڈیرے ڈالے۔ وہاں خود مولانا عبدالوہاب صاحب طلبا کو علوم متداولہ کی تعلیم دیتے تھے۔ مولانا محمد جونا گڑھی نے تفسیر، حدیث، فقہ واصول اور معانی و بیان وغیرہ کی کتابیں انہی سے پڑھیں اور خوب فیض پایا۔

ان دنوں دہلی کے پھاٹک حبش خاں میں حضرت میاں صاحب کے دو شاگردوں مولانا عبدالرحیم غزنوی

Marfat.com

اور مولانا عبدالرشید کی تدریسی سرگرمیوں کی بڑی شہرت تھی، مولانا جوناگڑھی نے ان کے آستانۂ فضیلت پر حاضری دی اور ان سے اخذِ علم کیا۔ اس طرح انھوں نے دہلی ہی میں تعلیم حاصل کی اور حضرت میاں صاحب کے شاگردانِ ذی وقار سے فیض یاب ہوئے۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا جو اس عالم جلیل کے حصے میں آیا۔

مولانا جوناگڑھی بہت ذہین اور علم کے انتہائی شائق تھے۔ انھوں نے ان تمام علومِ نقلیہ و عقلیہ کی تحصیل کی، جو ان کے عہد طالب علمی میں پڑھائے جاتے تھے۔

مدرسہ محمدیہ کا قیام:

تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا محمد جوناگڑھی نے عملی زندگی میں قدم رکھا اور دہلی ہی کو اپنا مرکز خدمت قرار دیا۔ وہ اجمیری گیٹ کی مسجد اہل حدیث میں سکونت پذیر ہوئے اور ''مدرسہ محمدیہ'' کے نام سے تدریسی ادارہ قائم کیا۔ مولانا ممدوح کے علاوہ اس مدرسے میں بعض دیگر اساتذہ بھی خدمتِ تدریس انجام دیتے تھے۔ اپنی وفات (۱۹۴۱ء) تک وہ اس مدرسے سے وابستہ رہے اور بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا، جن میں مولانا سید تقریظ احمد سہسوانی اور مولانا عبدالرشید کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ مولانا جوناگڑھی کے سانحۂ ارتحال کے بعد یہ دونوں حضرات مدرسہ محمدیہ میں بہ طور مدرس خدمات انجام دیتے رہے۔ مولانا سید تقریظ احمد سہسوانی نے دہلی کے مشہور مدرسے ''ریاض العلوم'' میں بھی ایک عرصے تک مسندِ درس آراستہ کیے رکھی۔ مولانا سہسوانی کو درس و تدریس میں بھی خاص امتیاز حاصل تھا اور تحریر و نگارش میں بھی اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔

میدانِ صحافت میں:

اجمیری گیٹ کے مدرسہ محمدیہ ہی میں مولانا محمد جوناگڑھی نے قلم و قرطاس سے رابطہ پیدا کیا اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہوئے۔ یہیں صحافتی میدان میں اترے اور ''گلدستہ محمدیہ'' کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا۔ یہی ماہنامہ آگے چل کر ۱۹۲۱ء میں پندرہ روزہ ''اخبار محمدی'' کی شکل اختیار کر گیا۔ ''اخبار محمدی'' کے ذریعے مولانا نے کتاب و سنت کی بے حد خدمت کی۔ زبان و انداز اور علمی اعتبار سے اس رسالے نے بڑی شہرت پائی اور اس سے لوگوں نے بہت استفادہ کیا۔ اس رسالے میں مسلکی نوعیت کے مضامین بھی لکھے جاتے تھے اور قارئین کے لیے تاریخی مواد بھی مہیا کیا جاتا تھا۔ وہ اس سے کتاب و سنت کے مسائل بھی سیکھتے تھے، صاف ستھری اردو زبان سے بھی آشنا ہوتے تھے اور طرزِ نگارش سے بھی آگاہی حاصل کرتے تھے۔

خطابت:

مولانا جوناگڑھی اپنے دور کے معروف خطیب اور خوش کلام مقرر تھے۔ مسلسل گھنٹوں تقریر کرتے اور کسی

Marfat.com

قسم کی تکان محسوس نہ کرتے۔توحید اور اتباع سنت ان کا اصل موضوع تھا۔قرآن و حدیث کی روشنی میں اس موضوع کی دل نشیں اسلوب میں وضاحت فرماتے۔تمام ہندوستان میں ان کی خطابت کی دھوم تھی اور سامعین ہمہ تن گوش ہو کر ان کے ارشادات سنتے تھے۔تقریر کے وقت خود مقرر عالی قدر پر بھی والہانہ کیفیت طاری ہو جاتی۔ وہ قرآن و حدیث کی محبت میں ڈوب کر زبان کو حرکت دیتے، جس سے لوگ بے حد متاثر ہوتے۔ لاتعداد لوگوں نے ان کی تقریریں سن کر بدعات سے توبہ کی اور کتاب وسنت کے دائرے میں داخل ہوئے۔

مناظرات:

مولانا کا زمانہ متحدہ ہندوستان کا زمانہ تھا، جس میں ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی، سکھ، اچھوت، مرزائی وغیرہ جیسے بے شمار مذاہب کے لوگ آباد تھے اور ان کے آپس میں مناظرے اور مباحثے ہوتے رہتے تھے۔ پھر مسلمانوں کے درمیان بھی مناظروں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔لوگ دیکھتے تھے کہ کہیں شیعہ حضرات کی اہل حدیث سے بحثیں ہو رہی ہیں، کہیں اہل حدیث اور احناف کے درمیان کسی نہ کسی مسئلے پر میدان سجا ہوا ہے اور کہیں دیوبندی اور بریلوی ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں۔اس طرح مختلف مقامات میں علم کی کشتی اور تحقیق کا دنگل جاری رہتا تھا۔مولانا محمد جونا گڑھی جہاں تقریر و خطابت میں منفرد حیثیت رکھتے تھے، وہاں مناظرے میں بھی ان کا ایک مقام تھا۔

ان کے مناظروں کی روداد میں صوبہ یوپی کے شہر میرٹھ کے ایک مناظرے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ مناظرہ ۱۹۴۰ء میں مولانا ثناء اللہ امرتسری کے زیر صدارت ''قراءۃ فاتحہ خلف الامام'' کے موضوع پر ایک حنفی عالمِ دین سے ہوا تھا۔اس کا ذکر مولانا جونا گڑھی نے اپنی ایک کتاب ''مناظرہ محمدی'' میں کیا ہے۔

ایک مناظرہ راج کوٹ میں اور ایک مناظرہ مشرقی پنجاب کے ضلع ہوشیار پور کے گاؤں ''اوان'' میں مولانا نظام الدین عرف ملا ملتانی سے ہونا قرار پایا تھا۔موضوع مناظرہ تھا ''غیر اللہ کے نام سے نذر و نیاز دینا اور منت ماننا جائز ہے یا ناجائز؟'' نیز یہ موضوع بھی تھا کہ ''بڑے پیر شیخ عبدالقادر جیلانی کے نام کا وظیفہ پڑھنا کیسا ہے؟''

چند معاصرین:

مولانا محمد جونا گڑھی نے بھرپور زندگی بسر کی۔ان کے زمانے کا برصغیر علمی اعتبار سے نہایت پر ثروت اور بے حد بارونق تھا۔ ان کے معاصرین کی فہرست بہت وسیع ہے، جس میں اہل حدیث بھی شامل ہیں اور احناف بھی۔اہل حدیث میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالقاسم بنارسی، مولانا محمد سورتی، علامہ خلیل عرب، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، قاضی محمد سلیمان سلمان منصور

Marfat.com

پوری، حاجی محمد صالح دہلوی، حافظ حمید اللہ دہلوی، شیخ عطاء الرحمٰن دہلوی، مولانا عبداللہ الکافی، مولانا عبداللہ الباقی، مولانا محمد یونس دہلوی ایسے بہت سے ممتاز علمائے کرام شامل ہیں، اور احناف میں سے حضرت مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی جیسی شہرہ آفاق شخصیات کے اسمائے گرامی سامنے آتے ہیں۔

تصانیف:

خطابت وتقریر اور درس وتدریس کے علاوہ مولانا محمد جونا گڑھی بہت سی کتابوں کے مصنف اور مترجم بھی تھے۔ ان کی تمام تصانیف اور تراجم میں ''محمدی'' کا لفظ آتا ہے اور یہ چھوٹی بڑی ۸۲ کتابیں ہیں۔ جو موضوع اور مندرجات کے اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

آیئے پہلے تصانیف کا تذکرہ کرتے ہیں:

(۱) درایت محمدی: ہدایہ پر تبصرہ — پہلی دفعہ ۱۹۲۷ء میں چھپی

(۲) زکوٰۃ محمدی: مطلب نام سے ظاہر ہے۔ — پہلی دفعہ ۱۹۲۷ء میں چھپی

(۳) ہدایت محمدی: ہدایہ پر تبصرہ بر تبصرہ۔ — ۱۹۲۸ء میں تیسری مرتبہ چھپی

(۴) برات محمدی: خواجہ حسن نظامی کی تردید میں — ۱۹۳۱ء میں تیسری مرتبہ چھپی

(۵) انعام محمدی: فلسفۂ عید اور مسائل عید پر مشتمل — ۱۹۳۱ء میں نویں مرتبہ چھپی

(۶) اذان محمدی: سحری کے وقت کی اذان کے بارے میں۔ — ۱۹۳۱ء میں دوسری مرتبہ چھپی

(۷) رحمت محمدی: بالجبر گناہ کے بارے میں — ۱۹۳۴ء میں دوسری مرتبہ

(۸) مملکت محمدی: سلطان ابن سعود کی تائید میں — ۱۹۳۴ء میں دوسری مرتبہ

(۹) تعویذ محمدی: مولوی احمد علی بریلوی کی تردید میں — ۱۹۳۴ء میں چھپی

(۱۰) جماعت محمدی: نماز جمعہ وعیدین میں عورتوں کی شرکت کے بارے میں ۱۹۳۵ء میں دوسری مرتبہ چھپی

(۱۱) فرمان محمدی: زیارت قبور کا مسنون طریقہ — ۱۹۳۵ء میں دوسری مرتبہ چھپی

(۱۲) سراج محمدی: اخبار ''الفقیہ'' (امرتسر) کی تردید میں — ۱۹۳۶ء میں چھپی

(۱۳) مشکوٰۃ محمدی: شرک وبدعت اور غیر اسلامی رسوم کی تردید میں — ۱۹۳۶ء میں چھپی

(۱۴) شمع محمدی: مخالف حدیث فقہی مسائل — ۱۹۳۷ء میں تیسری مرتبہ چھپی

(۱۵) تحفۂ محمدی: عید قربان اور اس کی شرعی حیثیت — ۱۹۳۷ء میں چوتھی مرتبہ چھپی

(۱۶) ارشاد محمدی: مولانا تھانوی کی الاقتصاد کے متعلق — ۱۹۳۷ء میں چھپی

Marfat.com

(۱۷) مقالہ محمدی: دارالحدیث رحمانیہ دہلی کے ۱۷ویں اجلاس میں خطبہ صدارت ۱۹۳۷ء

(۱۸) نور محمدی: قوالی اور باجے گانے کی تردید میں ۱۹۳۸ء

(۱۹) نکاح محمدی: غائب شدہ شوہر کی بیوی کے نکاح اور مجلس واحد کی طلاق ثلاثہ ۱۹۳۸ء

(۲۰) ملت محمدی: ایک مقلد عالم کی ایک کتاب کی تردید میں ۱۹۳۸ء

(۲۱) اربعین محمدی: چالیس احادیث نبوی کے حفظ اور اس کی فضیلت ۱۹۳۸ء میں دوسری مرتبہ چھپی

(۲۲) صیام محمدی: رمضان میں تراویح اور اعتکاف وغیرہ کے متعلق ۱۹۳۸ء میں چوتھی مرتبہ چھپی

(۲۳) نماز محمدی: اپنے گھر یا سفر میں نماز کے احکام ۱۹۳۸ء

(۲۴) حج محمدی: حج وعمرہ کے مسائل میں ۱۹۳۸ء میں دوسری مرتبہ

(۲۵) نصیحت محمدی: ایک رسالے ''محرم الحرام'' کی تردید میں ۱۹۳۸ء میں دوسری مرتبہ

(۲۶) سلام محمدی: جنوبی ہند کے ایک شخص کے بعض افکار کے جواب میں ۱۹۳۹ء

(۲۷) ریحان محمدی: واقعہ کربلا اور تعزیہ کی شرعی حیثیت ۱۹۳۹ء میں چھٹی مرتبہ

(۲۸) ذمہ محمدی: شرک وبدعت کی تردید میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے ملفوظات ۱۹۴۰ء

(۲۹) غنیہ محمدی: ذمہ محمدی کا دوسرا حصہ ۱۹۴۰ء

(۳۰) توحید محمدی: قبروں کو پختہ بنانے کی تردید ۱۹۴۰ء۔ چوتھی مرتبہ

(۳۱) ثوبان محمدی: نذرو نیاز اور قبروں پر چادر چڑھانے کے متعلق ۱۹۴۰ء۔ دوسری مرتبہ

(۳۲) صراط محمدی: کربلا و تعزیہ کی حقیقت ۱۹۴۰ء۔ دوسری مرتبہ

(۳۳) لؤلؤ محمدی: محمد نام رکھنے کے جواز سے متعلق ۱۹۴۰ء

(۳۴) صمصام محمدی: توحید کے اثبات اور شرک کی تردید میں ۱۹۴۰ء

(۳۵) تائید محمدی: تقلید شخصی کے بارے میں ۱۹۴۰ء۔ دوسری مرتبہ

(۳۶) ضرب محمدی: ۱۵۰ سوالوں کا مجموعہ ۱۹۴۰ء۔ تیسری مرتبہ

(۳۷) آئینہ محمدی: امت مسلمہ کی پوشاک اور شکل وصورت وغیرہ کا بیان ۱۹۴۵ء۔ چوتھی مرتبہ

(۳۸) عقائد محمدی: عقائد کے بیان میں ایک عربی رسالے کا ترجمہ ۱۹۴۵ء

(۳۹) سنت محمدی: ایک عربی رسالے کا ترجمہ جس میں سینے پر ہاتھ باندھنے کا مفصل تذکرہ ہے۔ ۱۹۴۵ء۔ تیسری مرتبہ

(۴۰) دلائل محمدی: کئی اجزا میں شائع شدہ......نمازیوں کو مسجد سے نہ نکالنے کا بیان ۱۹۴۵ء۔ چھٹی مرتبہ

(۴۱) عقیدۂ محمدی: دوسرے کتابچوں کے ساتھ یہ انگریزی میں مترجم ہے ۱۹۴۵ء میں گیارہویں مرتبہ

Marfat.com

(۴۲) صلوۃ محمدی: اس میں نماز کے مسائل بیان کیے گئے ہیں ۱۹۴۶ء۔نویں مرتبہ

(۴۳) معراج محمدی: معراج کے جسمانی یا روحانی ہونے کے بارے میں ۱۹۴۶ء۔تیسری مرتبہ

(۴۴) درود محمدی: عرس اور چہلم وغیرہ کی تردید میں ۱۹۵۰ء۔دوسری مرتبہ

(۴۵) میلاد محمدی: قرآن وحدیث اور فقہ کی رو سے مروجہ میلاد کی تردید ۱۹۵۰ء۔چھٹی مرتبہ

(۴۶) حیات محمدی: اس مسئلے کا بیان کہ رسول اللہ ﷺ عالم الغیب نہ تھے ۱۹۵۰ء۔ساتویں مرتبہ

(۴۷) درۂ محمدی: فرقہ بندی سے متعلق سوالات کا جواب ۱۹۷۰ء میں پانچویں مرتبہ چھپی

(۴۸) طریق محمدی: تقلید شخصی کے اثرات کا بیان ۱۹۷۲ء

(۴۹) حقوق محمدی (۵۰) رکوع محمدی (۵۱) شہادت محمدی (۵۲) صدائے محمدی

(۵۳) ظفر محمدی (۵۴) ظل محمدی (۵۵) عصائے محمدی (۵۶) عید محمدی

(۵۷) پیغام محمدی (۵۸) فتوی محمدی (۵۹) قبلہ محمدی (۶۰) گلدستہ محمدی

(۶۱) قربانی محمدی (۶۲) اشعار محمدی (۶۳) انصار محمدی (۶۴) وضوء محمدی

(۶۵) وظیفہ محمدی (۶۶) انصار محمدی (۶۷) مولود محمدی (۶۸) حرمت محمدی

(۶۹) فتح محمدی (۷۰) فیصلہ محمدی (۷۱) حقیقت محمدی (۷۲) امام محمدی

ان کتابوں کے علاوہ نمبروں کی ترتیب سے مولانا جوناگڑھی کی مندرجہ ذیل کتابیں ہیں:

(۷۳) مولانا کے خطباتِ جمعہ کا عالمانہ مجموعہ یعنی خطبات محمدی۔

(۷۴) سنت محمدی، مشہور محدث شیخ محمد حیات سندھی کی عربی تصنیف فتح الغفور فی وضع الایدی علی الصدور کا اردو ترجمہ

(۷۵) برہان محمدی: قاضی القضاۃ شیخ تقی الدین سبکی کے رسالہ جزء رفع الیدین کا اردو ترجمہ

(۷۶) سیرت محمدی: امام ابوجعفر ابن جریر طبری (۲۲۴-۳۱۰ھ) کی ''خلاصۃ السیر'' کا اردو ترجمہ

(۷۷) امام محمدی: علامہ خطیب بغدادی کی مشہور تصنیف ''تاریخ بغداد'' کے ایک حصے کا اردو ترجمہ۔ اس میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مختصر حالات اور ان کے بارے میں ان کے ہم عصر ائمۂ مجتہدین کی آرا کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

(۷۸) فضائل محمدی: خطیب بغدادی کی قابل قدر تصنیف ''شرف اصحاب الحدیث'' کا اردو ترجمہ۔

(۷۹) ایمان محمدی: حضرت امام ابوبکر البیہقی کی مختصر شعب الایمان کا اردو ترجمہ

(۸۰) عقائد محمدی: امام احمد بن حنبل کی ''کتاب السنۃ'' یا عقیدہ اہل السنۃ کا سلیس اردو ترجمہ

Marfat.com

(۸۱) تفسیر محمدی: تفسیر ابن کثیر کا اردو ترجمہ جو چار جلدوں پر مشتمل ہے اور بہت سے ناشروں نے اسے بے شمار مرتبہ شائع کیا۔ اس کا جدید ایڈیشن تحقیق اور تخریج کے ساتھ مکتبہ قدوسیہ کی طرف سے اور انگریزی ترجمہ ادارہ دار السلام کی طرف سے معرضِ اشاعت میں آیا۔

(۸۲) دین محمدی: یہ حضرت امام ابن قیم (۶۹۱ھ-۷۵۱ھ مطابق ۱۲۹۲ء-۱۳۵۰ء) کی مشہور وعظیم کتاب ''اعلام الموقعین'' کا اردو ترجمہ ہے۔ اس ترجمے کا آغاز انھوں نے ۱۹۳۴ء میں کیا تھا جو ۱۹۳۸ء میں اختتام کو پہنچا۔ پہلے یہ ترجمہ پندرہ روزہ ''اخبار محمدی'' میں چھپتا رہا۔ پھر کتابی صورت میں چھپا۔

اس ترجمے کی اطلاع پا کر مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء-۱۹۵۸ء) نے مولانا محمد جونا گڑھی کو یکے بعد دیگرے دو مکتوب ارسال فرمائے، جن میں ان کی اس خدمت پر نہایت مسرت کا اظہار فرمایا۔ مندرجہ ذیل سطور میں دونوں مکتوب درج کیے جا رہے ہیں:

پہلا مکتوب حسب ذیل ہے:

حبی فی اللّٰہ

السلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ

مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے حافظ ابن قیم کی اعلام الموقعین کا اردو میں ترجمہ کیا، مجھے اس خبر سے نہایت خوشی ہوئی۔ عرصہ ہوا میں نے بعض عزیزوں کو جو ترجمے کے کام سے دلچسپی رکھتے ہیں، اس کام پر لگایا تھا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور شیخ الاسلام ابن قیم کی مصنفات اردو میں منتقل کریں۔ چناں چہ منتخب کتابوں میں اعلام بھی تھی، لیکن کتاب ضخیم ہے، اس لیے اس کی نوبت نہ آئی، مختصرات شائع ہوگئیں۔ اب آپ اس طرف متوجہ ہوئے ہیں تو میں کہوں گا، آپ نے ایک نہایت موزوں کتاب ترجمے کے لیے منتخب کی ہے۔ اللّٰہ تعالیٰ آپ کو مزید توفیق کار عطا فرمائے۔

مباحث فقہ وحدیث میں متاخرین کا کافی ذخیرہ موجود ہے، لیکن اس سے بہتر اور اصلح کوئی کتاب نہیں۔ اسے اردو میں منتقل کر دینا اس گوشے کی تمام ضروریات بہ یک وقت پوری کر دیتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اس کی ضرورت انگریزی تعلیم یافتہ طبقے کے لیے ہے۔ اس طبقے میں بہت سے لوگ مذہبی ذوق سے آشنا ہو چکے ہیں، لیکن صحیح مسلک کی خبر نہیں رکھتے اور عربی سے نا آشنا ہونے کی وجہ سے براہِ راست مطالعہ نہیں کر سکتے۔ اگر اعلام اردو میں شائع ہوگئی تو ان کی فہم وبصیرت کے لیے کافی مواد مہیا ہو جائے گا۔ میں نہایت خوش ہوں گا، اگر اس ترجمے کی اشاعت میں آپ کو کچھ مدد دے سکوں۔

ابوالکلام۔ کان اللّٰہ لہ

از کلکتہ

Marfat.com

اب حضرت مولانا آزاد کا دوسرا مکتوب ملاحظہ ہو جو انھوں نے اعلام الموقعین کا ترجمہ پڑھ کر فاضل مترجم کے نام ارسال فرمایا۔ یہ مکتوب ۱۶۔ مارچ ۱۹۳۶ء کا ارسال فرمودہ ہے۔

حبی فی اللہ...... السلام علیکم

اعلام الموقعین کا ترجمہ دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی۔ مباحثِ فقہ و حدیث اور حکمت تشریع اسلامی میں متاخرین کی کوئی کتاب اس درجہ محققانہ اور نافع نہیں ہے، جس درجے کی یہ کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ اس مفید خدمت دینی پر متوجہ ہوئے۔ میں ان تمام لوگوں کو جو مذہبی معلومات کا شوق رکھتے ہیں اور اصل عربی کتاب کا مطالعہ نہیں کر سکتے مشورہ دوں گا کہ اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں۔ چوں کہ اسلام کے اندرونی مذاہب و مشارب کی پیچیدگیوں سے عموماً مسلمان باخبر نہیں ہیں، اس لیے بسا اوقات ان کا مذہبی شغف غلط راہوں میں ضائع ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ ان پر واضح کر دے گا کہ حکمت و دانش کی حقیقی راہ کن لوگوں کی راہ ہے؟ کتاب و سنت کی یا اصحاب جدل و خلاف کی؟ خود صاحب اعلام اپنے قصیدہ نونیہ میں کیا خوب فرماتے ہیں:

العلم قال اللہ و قال رسولہ
قال الصحابة هم اولوا العرفان
ما العلم تصبك للخلاف سفاهة
بین الرسول و بین رأی فلان

"یعنی علم دین وہی ہے جو قرآن و حدیث میں ہے، جو معرفت خداوندی میں ڈوبے ہوئے فیضان صحبت رسول کے فیض یافتہ صحابہ کرام کی زبان سے ظاہر ہوا ہے، کسی کی رائے کو سنت و حدیث سے ٹکرانا، رائے کے غلبے کے لیے دلیل قائم کرنا اور جہالت کا ثبوت دیتے ہوئے رائے کے جھنڈے خلاف حدیث بلند کرنے کا نام علم دین نہیں۔"

ضرورت تھی کہ اس کتاب کا ترجمہ کتاب کی شکل میں شائع کیا جاتا۔ موجودہ صورت حال کا یہ نہایت افسوس ناک منظر ہے کہ اس طرح کی قیمتی اور ضروری خدمات پر اہل خیر و استطاعت کو توجہ نہیں۔ مجھے امید ہے کہ بہت جلد ایسے حالات فراہم ہو جائیں گے کہ آپ اس کو شائع کر سکیں۔ یہ بھی آپ نے خوب کیا کہ حافظ عماد الدین ابن کثیر کی تفسیر کا ترجمہ شائع کر دیا۔ متاخرین کے ذخیرۂ تفسیر میں یہ سب سے بہتر تفسیر ہے۔ امید ہے کہ اصحاب خیر و استطاعت اس کام میں بھی آپ کے مساعد و مددگار رہوں گے۔

ابوالکلام...... کان اللہ لہ

کلکتہ ۱۹۳۶/۳/۱۶ء

Marfat.com

یہ بہت بڑا علمی ذخیرہ ہے جو حضرت مولانا محمد جونا گڑھی دہلوی کی طرف سے ہمیں ملا۔ اس ذخیرے میں تمام ضروری مسائل کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ ممکن ہے ان کی تصانیف کی یہ فہرست مکمل نہ ہو، کچھ اور کتابیں بھی ہوں جو ہمارے علم میں نہ آئی ہوں۔ جن کتابوں کا پتا چل سکا ہے، ان کے نام چند لفظی تعارف کے ساتھ یہاں لکھ دیے گئے ہیں۔ یہ کتابیں بہت چھپیں اور بہت پڑھی گئیں۔

وفات:

مولانا جونا گڑھی مستقل طور پر دہلی ہی میں سکونت پذیر تھے، لیکن اپنے آبائی وطن جونا گڑھ بھی ان کی آمد و رفت رہتی تھی۔ ۱۹۴۱ء کے شروع میں وہ حسب معمول جونا گڑھ گئے۔ وہاں کئی دن رہنے کا پروگرام تھا۔ وہ ان کا آبائی مسکن تھا۔ جتنا عرصہ قیام فرماتے جمعہ و جماعت کا سلسلہ انہی کے سپرد ہوتا۔ دہلی سے جاتے ہوئے ''اخبار محمدی'' کی ذمہ داری اپنے شاگرد رشید مولانا سید تقریظ احمد سہوانی کو سونپ گئے تھے۔ جونا گڑھ ہی میں ان پر دل کا حملہ ہوا۔ اور وہ مارچ ۱۹۴۱ء میں وفات پا گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

اولاد:

مولانا موصوف کی مختلف اوقات میں چار شادیاں ہوئیں۔ ان کی پہلی شادی جونا گڑھ میں اپنے رشتے داروں میں ہوئی تھی اور جیسا کہ اس مضمون کی ابتدائی سطور میں بتایا گیا ان کی یہ اہلیہ جلد ہی انتقال کر گئی تھیں اور ان کے انتقال کے بعد مولانا دہلی چلے گئے تھے۔

دوسری شادی دہلی میں ہوئی۔ اس خاتون کی نرینہ اولاد چار بیٹے تھے۔ محمد محمود، محمد مسلم، محمد حمید اور محمد اسلم۔ یہ لوگ قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد اوکاڑہ آ گئے تھے۔ محمد مسلم کی شادی کراچی میں ہوئی اور انھوں نے وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہیں وفات پائی۔ محمد محمود میمن کچھ عرصہ اپنے بہنوئی عبدالقادر ہالائی کے ہاں نارائن گنج (ڈھاکہ) میں کام کرتے رہے۔ ہالائی صاحب کا پٹ سن کا کاروبار تھا۔ ۱۹۵۶ء میں محمود صاحب لاہور آ گئے اور انھیں ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے مینجر مقرر کر لیا گیا۔ میں اس وقت اس اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ لاہور ہی میں ان کی شادی ہوئی۔ اس کے بعد وہ کراچی چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے بچے کراچی میں مقیم ہیں اور ماشاء اللہ ٹھیک ٹھاک ہیں۔ محمد اسلم نے اوکاڑہ میں وفات پائی۔ محمد حمید کی شادی اوکاڑہ میں ہوئی اور وہ اپنے بچوں سمیت اوکاڑہ میں مقیم ہیں۔

مولانا جونا گڑھی کی ایک بیٹی کی شادی ۱۹۴۲ء میں مولانا معین الدین لکھوی سے ہوئی تھی۔ وہ ۱۱۔ستمبر ۱۹۸۴ء کو اوکاڑہ میں وفات پا گئیں۔ مولانا معین الدین لکھوی کی نرینہ اولاد تین بیٹے ہیں اور تینوں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ بڑے بیٹے کا نام بارک اللہ ہے اور وہ ایم اے اقتصادیات ہیں۔ ان سے چھوٹے ڈاکٹر زعیم

Marfat.com

الدین عابد اور سب سے چھوٹے ڈاکٹر عظیم الدین زاہد ہیں۔ یہ دونوں امراضِ قلب کے ماہر ڈاکٹر ہیں۔ تینوں بیٹے ماشاءاللہ ملنسار، عالی کردار اور بلند اخلاق ہیں۔

مولانا جوناگڑھی کی تیسری شادی جوناگڑھ میں ہوئی تھی۔ ان کی اس بیوی کے بیٹوں میں سے ایک بیٹے مولانا محمد سلیمان جوناگڑھی تھے۔ انھوں نے کراچی میں مولانا حافظ عبدالستار دہلوی سے تعلیم حاصل کی۔ ان کا شمار کراچی کے مشہور خطبا و مدرسین میں ہوتا تھا۔ انھوں نے ۲۳۔ مارچ ۱۹۹۷ء کو کراچی میں اچانک وفات پائی۔ انا لله و انا اليه راجعون

مولانا محمد سلیمان کے بیٹے مولانا عبداللہ اور مولانا عبدالوکیل درس و تدریس اور تقریر و خطابت میں بڑی شہرت رکھتے ہیں۔

مولانا محمد سلیمان جوناگڑھی کے ایک بھائی مولانا حامد جوناگڑھی ہیں۔ انھوں نے اپنے آبائی شہر جوناگڑھ ہی میں سکونت اختیار کیے رکھی اور وعظ و خطابت اور درس و تدریس کا سلسلہ وہیں جاری رکھا۔ اس طرح مولانا محمد جوناگڑھی کی اولاد میں سے بعض حضرات پاکستان میں بھی دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور ہندوستان میں بھی۔

مولانا جوناگڑھی کی چوتھی بیوی کا تعلق بنگال سے تھا۔ وہ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے ایک بنگالی شاگرد مولانا عبدالرحیم محمدی مرحوم کی بیٹی تھیں۔ اس بیوی سے ان کی ایک بیٹی ام کلثوم تھیں، جن کی شادی پروفیسر ڈاکٹر مجیب الرحمٰن سے ہوئی جو بہت سالوں سے امریکہ میں مقیم ہیں۔

اللہ ان سب حضرات کا حامی و ناصر ہو۔ آمین۔

(یہ سطور ۲۱۔ جون ۲۰۱۳ء کو لکھی گئیں۔)

Marfat.com

مولانا عبدالرحیم بھوجیانی رحمانی

(شہادت ۱۶۔اگست ۱۹۴۷ء)

حضرت مولانا فیض اللہ خاں بھوجیانی کے تیسرے اور سب سے چھوٹے صاحب زادے کا نام مولانا عبدالرحیم تھا۔ ان کی کنیت ابو العباس اور تخلص مظفر تھا۔ ۱۹۱۸ء میں ان کی ولادت ہوئی۔ بچپن ہی میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے تھے۔ موضع جھبال کے سکول میں مڈل تک تعلیم حاصل کی۔ قرآن مجید مع ترجمہ، صرف ونحو کی بعض کتابیں، بلوغ المرام، مشکوٰۃ شریف اور بعض دیگر درسی کتابیں اپنے بھائیوں مولانا عبدالرحمٰن اور مولانا عبداللہ سے اپنے خاندانی مدرسہ فیض الاسلام میں پڑھیں۔

اس کے بعد لکھوکے کا عزم کیا اور حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ وہاں ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء دو سال قیام رہا۔ دورانِ تعلیم ہی میں ۱۹۳۶ء کو رائے ونڈ (ضلع قصور) میں ایک بزرگ حاجی عبداللہ خاں کی دختر نیک اختر سے ان کی شادی ہوئی۔ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء میں دو سال مدرسہ غزنویہ امرتسر میں حضرت مولانا نیک محمد اور مولانا محمد حسین ہزاروی کے حلقۂ شاگردی میں رہے۔ ان اساتذہ گرامی سے علم حدیث، اصول حدیث وفقہ اور علم کلام وغیرہ کی بعض کتابیں پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

پھر دہلی کے لیے شدِ رحال کیا اور وہاں دارالحدیث رحمانیہ میں داخلہ لیا۔ ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء دو سال وہاں رہے اور اس اثنا میں شیخ الحدیث مولانا احمد اللہ پرتاپ گڑھی دہلوی، مولانا نذیر احمد رحمانی اور دیگر اساتذہ اکرام سے اکتسابِ علم کیا۔ دارالحدیث رحمانیہ سے سند فراغت لے کر واپس اپنے وطن بھوجیاں آئے اور ۱۹۴۱ء میں مدرسہ فیض الاسلام کی مسند درس پر متمکن ہوئے۔ صرف ایک سال اس مدرسے میں تدریس کی۔ پھر مدرسہ غزنویہ کے ارکانِ انتظامیہ کی دعوت پر امرتسر تشریف لے گئے۔ ان کے برادرِ کبیر مولانا عبداللہ بھی وہیں تھے۔ چھے سال مدرسہ غزنویہ میں خدمت تدریس انجام دی۔ اگست ۱۹۴۷ء میں اپنے بھائیوں کے ساتھ بھوجیاں میں تھے کہ تقسیم ملک کے نتیجے میں فسادات کے ہولناک جھکڑ چلنے لگے۔ اس اثنا میں سکھوں نے بھوجیاں پر کئی بار حملہ کیا، لیکن ہر بار شکست کھائی۔ بالآخر ۱۶۔اگست ۱۹۴۷ء کو پولیس اور فوج کی مدد سے طلوعِ آفتاب سے قبل اچانک آتشیں اسلحہ کے ساتھ حملہ کیا گیا، جس سے ہزاروں مسلمان شہید ہو گئے۔ مولانا عبدالرحیم بھوجیانی بھی اس حملے میں جامِ شہادت نوش کر گئے۔ شہادت کے وقت ان کی عمر صرف انتیس (۲۹) برس کی

Marfat.com

تھی۔شوہر کی شہادت کے بعد ان کی اہلیہ اپنے ایک کم سن بیٹے محمد عباس اور دو بیٹیوں کو لے کر گھر سے نکلیں۔ وہ موضع جھبال کے اس کیمپ میں جانا چاہتی تھیں، جس میں مختلف دیہات کے مسلمان پاکستان آنے کے لیے جمع ہو رہے تھے۔جن چند لوگوں کے ساتھ وہ جارہی تھیں، ان کا بیان ہے کہ راستے میں اس عفیفہ کو سکھوں نے گھیر لیا اور کھینچ کر اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی، لیکن اس پاک باز خاتون نے سخت مزاحمت کی، اور ایک سکھ کے منہ پر زور سے تھپڑ رسید کیا، جس کی وجہ سے غصے میں آ کر اس نے ماں کے سامنے ننھے بچے (عباس) کو قتل کر دیا اور پھر اس خاتون کی گردن پر تلوار کا وار کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا، لیکن دونوں بچیاں کسی طرح جھبال کے کیمپ میں پہنچ گئیں اور پاکستان آ گئیں۔ یہاں آ کر ان کی ملاقات اپنے رشتے داروں سے ہوگئی، جوانی کو پہنچیں تو ان کی شادی قریبی رشتے داروں میں کر دی گئی۔

مولانا عبدالعظیم انصاری اپنی کتاب ''تذکرہ علمائے بھوجیاں'' میں لکھتے ہیں کہ مولانا عبدالرحیم سے ان کے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔انھوں نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ والدین نے ''میرا نام اللہ داد رکھا تھا، جب مولانا عبدالرحیم سے دوستانہ تعلقات استوار ہوئے تو ان کی تجویز پر ان کا ہم وزن نام عبدالعظیم رکھا گیا۔اب بچپن کے نام کو کوئی نہیں جانتا۔''

مولانا عبدالرحیم بھوجیانی ایک علمی گھرانے کے فرد تھے، اس لیے ان میں شرف ومجد کے تمام اوصاف پائے جاتے تھے۔ افسوس ہے ان کے دوست عبدالعظیم بھی دنیا سے رخصت ہوگئے، جنھوں نے اپنی خوب صورت تحریر کے ذریعے ہمیں مولانا عبدالرحیم اور ان کے خاندان کے اکابر واصاغر سے متعارف کرایا اور اس کے ساتھ موضع بھوجیاں اور اس علاقے کے بے شمار علما وزعما کے حالات سے لوگوں کو باخبر کیا۔ رحمھم اللہ تعالیٰ

اب ذیل میں مولانا عبدالرحیم بھوجیانی کے چند شاگردوں کے نام:

مولانا عبداللہ میرپوری۔	مولانا محمد رفیق مدن پوری۔فیصل آباد
مولانا محمد یوسف۔راجووال	مولانا محمد علی تبسم۔چونیاں
مولانا عبدالرحمٰن۔پٹیالہ	مولانا محمد وزیر کشمیری۔
مولانا عبدالحمید شرف	مولانا حافظ بشیر احمد بھوجیانی
مولانا حافظ محمد یحییٰ میر محمدی	

ان کے علاوہ اور بہت سے حضرات۔

آخر میں ایک مرثیہ ملاحظہ ہو جو اردو اور پنجابی کے شاعر جناب شریف انجم قصوری نے مولانا عبدالعظیم انصاری کی فرمائش پر لکھا اور انھوں نے اسے اپنی کتاب ''تذکرہ علمائے بھوجیاں'' میں شائع کیا۔اس کا عنوان ہے:

Marfat.com

محترمہ صفیہ

اہلیہ مولانا عبدالرحیم شہید

اے صفیہ اے شہید پاک خو — خاندانِ بھوجیاں کی آبرو
سر کٹایا دین وملت کے لیے — درگہ حق میں ہوئی تو سرخرو!
تیری عفت تیری عصمت کی قسم — تیری غیرت ہے ہماری آرزو
اے سراپا پیکر شرم و حیا — رشک حورانِ بہشت اے نیک خو
تجھ کو جب بالجبر لے جانے لگے — رو سیاہ ، ملعون ، بدطنیت عدو
اپنی عزت کی حفاظت کے لیے — شیر بن کر ڈٹ گئی میداں میں تو
اک طمانچے سے ترے تھرا گیا — کفر کا بدبخت وحشی کینہ خو
روز خندق وہ صفیہ کا عمل — جس نے مارا چوب خیمہ سے عدو
تو نے دہرایا اسی سنت کو پھر — یاد تھا تجھ کو بھی حکم جاھدوا
طیش سے بل کھا کے اٹھا بدقماش — اور بڑھا تلوار لے کے فتنہ جو
بڑھ کے ظالم نے کیا تجھ کو شہید — شاہد حق ہوگیا تیرا لہو
رحمتِ حق کا ہوا تجھ پر نزول — اے شہید راہ حق لاتقنطوا
کیا ہوا جو تو تھی بے گور و کفن — ہے نوید اللہ کی لاتحزنوا
تیری جرأت تیری غیرت کی قسم — تو سدا مہکے گی مثل رنگ و بو
وہ ترا لختِ جگر عباس بھی — خاک اور خوں سے کیا جس نے وضو
ساتھ ہی تیرے گیا فردوس میں — تاکہ گھبرائے نہ تنہائی سے تو
گلشن فردوس میں شاداں ہو تم — ہو گئی پوری تمھاری آرزو
تیرے خوں سے چھٹ گئی ظلمت کی شب — روشنی سورج کی پھیلی چار سو
صبح آزادی کا ہے نور و ظہور — ہے درخشاں قریہ قریہ کو بہ کو

ہے دعا انجم خدائے پاک سے
روز محشر سرخرو ہو اور نیک خو

Marfat.com

مولانا عبدالرحمٰن بھوجیانی

(شہادت ۱۶۔اگست ۱۹۴۷ء)

کتاب کے گزشتہ صفحات میں خوانندگانِ محترم حضرت مولانا فیض اللہ خاں کے حالات کا مطالعہ کر چکے ہیں، ان میں بتایا گیا ہے کہ مولانا کی نرینہ اولاد تین بیٹے تھے اور تینوں علمائے دین تھے۔ وہ تھے مولانا عبدالرحمٰن، مولانا عبداللہ اور مولانا عبدالرحیم۔ تینوں کو تقسیم ملک کے زمانے میں ایک ہی دن اگست ۱۹۴۷ء میں ان کے گاؤں موضع بھوجیاں (تحصیل ترنتارن ضلع امرتسر) میں سکھوں نے شہید کر دیا تھا۔ ان کے علاوہ بھی اس گاؤں میں ہزاروں مسلمانوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ ان لوگوں کی شہادت کی تفصیل مولانا عبدالعظیم انصاری نے اپنی ایک تصنیف ''تذکرہ علمائے بھوجیاں'' (مطبوعہ ۱۹۸۴ء) میں بیان کی ہے۔ یہ مضمون اسی کتاب کی مدد سے لکھا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

مولانا عبدالرحمٰن ۹۹۔۱۸۹۸ء میں بمقام بھوجیاں پیدا ہوئے۔ یہ مولانا فیض اللہ خاں (متوفی ۱۹۲۵ء) کے بڑے بیٹے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد گرامی سے گھر میں حاصل کی۔ اس کے بعد منڈی صادق گنج (ضلع بہاول نگر) چلے گئے۔ وہاں مولانا عبدالرحیم غزنوی بن حضرت سید عبداللہ غزنوی صاحب کا سلسلہ تدریس وخطابت جاری تھا۔ ان سے انھوں نے پوری مروّجہ تعلیم حاصل کی۔ [1]

مولانا عبدالرحمٰن بھوجیانی بچپن ہی سے نہایت ذہین، روشن دماغ اور شرافت ونجابت کے اوصاف سے متصف تھے۔ تقویٰ وصالحیت کے حامل خاندان کے متقی وصالح فرزند۔

تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے گاؤں بھوجیاں آئے اور اپنے والد ماجد کے جاری کردہ مدرسہ فیض الاسلام میں تدریسی خدمات سرانجام دینے لگے۔ پوری زندگی اپنے گاؤں میں گزاری اور اسی مدرسے میں درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔

قرآن مجید کا ترجمہ وتفسیر، کتبِ حدیث وہ خود پڑھاتے تھے۔ ابتدائی درسی کتابوں کی تدریس بھی انھوں نے اپنے ذمے لے لی تھی۔ تدریس کے وقت ان کے لیے صاف ستھرا کپڑا بچھا دیا جاتا تھا۔ سردیوں

[1] مولانا فیض اللہ خاں کی ایک بیٹی کی شادی مولانا عبدالرحیم غزنوی کے فرزند گرامی حافظ محمد زکریا غزنوی (متوفی ۳۰۔دسمبر ۱۹۸۰ء) سے ہوئی تھی۔

Marfat.com

کے موسم میں اس پر روئی دار گدّا رکھا جاتا تھا۔ وہ نہایت وقار سے مسند درس پر بیٹھتے اور کامل اہتمام سے پڑھاتے تھے۔ طلبا پر شفقت فرماتے اور ان کی ضروریات کا خیال رکھتے۔ کھانے کا وقت ہوتا تو بارہا ایسا ہوا کہ گھر سے اپنا کھانا منگوایا اور طلبا کے ساتھ مل کر کھایا۔ گوشت یا کوئی میٹھی چیز گھر میں پکتی تو اس میں طلبا کا حصہ ضرور ہوتا اور اسے مشفقانہ انداز میں طلبا کو پیش کیا جاتا۔

ان کے چھوٹے بھائی مولانا عبداللہ بھوجیانی جب حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کی دعوت پر مدرسہ محمدیہ گوجراں والا چلے گئے تو وہ انھیں واپس بھوجیاں آنے اور اپنے آبائی مدرسے میں خدمت انجام دینے کے لیے کوشش کرتے رہے۔ بالآخر وہ واپس آ گئے اور مدرسے کی رونق بڑھ گئی۔ دونوں بھائی مشہور عالم اور لائق مدرس تھے اور نہایت محنت اور دلجمعی سے پڑھاتے تھے۔

پھر ایک وقت آیا کہ امرتسر کے مدرسہ غزنویہ میں قابل مدرس کی ضرورت پیش آئی تو مدرسے کے مہتمم مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی نظر انتخاب مولانا عبداللہ بھوجیانی پر پڑی اور وہ انھیں مدرسہ غزنویہ میں لے گئے۔ اب مولانا عبدالرحمٰن بھوجیانی مدرسہ فیض الاسلام کے تنہا مدرس تھے۔ ان کے عقیدت مند جو مختلف مقامات کے رہنے والے تھے، انھیں بسا اوقات اپنے ہاں لے جاتے اور پھر بعض دفعہ کئی کئی دن اس سفر میں گزر جاتے، اس طرح طلباء کی تعلیم میں تعطل بھی پیدا ہو جاتا۔

عادات وفضائل اور عبادت وریاضت میں اپنی مثال آپ تھے۔ مہمان نواز اور ہم دردِ خلائق۔ قرآن مجید کی تلاوت بہ کثرت کرتے۔ چلتے پھرتے مسنون دعائیں اور درود شریف پڑھتے رہتے۔ نماز نہایت خشوع وخضوع سے پڑھتے۔ شب بے داری اور تہجد گزاری ان کا معمول تھا۔ نفلی روزے کثرت سے رکھتے۔ سائل کو خالی ہاتھ واپس نہ کرتے۔ مہمان کو دیکھ کر اور مل کر خوش ہوتے اور اپنی استطاعت کے مطابق اس کی خدمت فرماتے۔ نرم کلام اور شیریں زبان عالم تھے۔ چلتے ہوئے اِدھر اُدھر نہ دیکھتے۔ نظر نیچے کر کے سیدھے چلتے۔

نہایت امین اور دیانت دار تھے، روپے پیسے کے سلسلے میں بے حد محتاط۔ مولانا عبدالعظیم انصاری ان کے شاگرد تھے، انھوں نے بھوجیاں میں ان سے استفادہ کیا تھا، وہ بیان کرتے ہیں کہ صوبہ سندھ کے بعض مقامات میں مولانا کے متعدد شاگرد اور عقیدت مند سکونت پذیر تھے جو انھیں بلاتے اور پھر کئی دن اپنے ہاں ٹھہراتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا ممدوح ان لوگوں کی دعوت پر سندھ جانے کے لیے تیار ہوئے تو مولانا داؤد غزنوی نے ان سے مدرسہ غزنویہ کے لیے بعض لوگوں سے تعاون کے لیے کہا۔ مولانا عبدالعظیم انصاری اپنے متعلق فرماتے ہیں کہ میں ان دنوں ''سندھ میں جیمس آباد کے قریب چک نمبر ۳۲۳ میں مقیم تھا۔'' لوگوں نے مدرسہ غزنویہ کے لیے انھیں کافی رقم دی اور ''میں نے اپنے تعلق تلمذ کی بنا پر بہترین کپڑے کا ایک جوڑا (مولانا

Marfat.com

عبدالرحمٰن) کی خدمت میں پیش کیا اور عرض کیا کہ یہ آپ کے لیے حقیر سا نذرانہ ہے۔''

واپس آ کر مولانا عبدالرحمٰن نے مولانا داؤد غزنوی کو وہ رقم دی جو لوگوں نے مدرسے کے لیے دی تھی اور ساتھ ہی وہ کپڑا دیا جو ان کو مولانا عبدالعظیم انصاری نے دیا تھا۔ مولانا غزنوی نے پوچھا: یہ کپڑے کیسے ہیں؟

جواب دیا: یہ کپڑے میرے ایک شاگرد نے مجھے دیے تھے لیکن میں چوں کہ مدرسے کے لیے تعاون کی غرض سے گیا تھا۔ اس لیے یہ کپڑے بھی مدرسے کے ہیں۔

مولانا غزنوی ان کے یہ الفاظ سن کر بہت متاثر ہوئے اور فرمایا یہ کپڑے آپ کو آپ کے شاگرد نے دیے ہیں اور آپ کے ہیں۔ مدرسے کا اس میں کوئی حق نہیں۔ بڑی مشکل سے اصرار کر کے یہ کپڑے انھیں دیے گئے۔

مولانا بہت سی خصوصیات کے مالک تھے۔ مولانا عبدالعظیم انصاری بیان کرتے ہیں کہ ان میں ایک خصوصیت سنجیدہ مزاح کی تھی۔ وہ بھوجیاں میں ان کے دائرہ شاگردی میں رہے تھے۔ لکھتے ہیں کہ ایک روز مولانا شام سے پہلے سیر کے لیے باہر نکلے تو انھیں بھی ساتھ لے گئے۔ ادھر میاں نورالدین بھی درانتی ہاتھ میں پکڑے کھیتوں کو جا رہے تھے۔ مولانا نے ان کو دیکھ کر کہا: ''میاں صاحب چارہ جوئی کو جا رہے ہیں۔'' چارہ جوئی کا لفظ مقدمات کی پیروی کے سلسلے میں بولا جاتا ہے۔ لیکن مولانا نے یہ لفظ مویشیوں کی غذا کے مضمون میں استعمال کیا۔ میاں صاحب واقعی اپنی بھینس کے لیے چارہ لینے جا رہے تھے۔ [1]

مولانا عبدالرحمٰن بھوجیانی کو اپنے گاؤں اور اس کے قرب و جوار میں بہ درجہ غایت احترام کا مقام حاصل تھا۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو جو مولانا عبدالعظیم انصاری کی کتاب ''تذکرہ علمائے بھوجیاں'' کے حوالے سے یہاں درج کی جاتی ہے۔

ایک دفعہ علاقے کا تھانے دار کسی مقدمے کی تفتیش کے سلسلے میں بھوجیاں آیا۔ لوگوں نے معاملے کی صورتِ حال بتاتے ہوئے اس سے کہا کہ اس موقعے پر ہمارے مولوی صاحب بھی موجود تھے۔ آپ ان سے بھی دریافت کر سکتے ہیں۔ تھانے دار نے مولانا کو بلا بھیجا۔ اس دوران ایک آدمی جلدی سے اٹھا اور گھر سے ایک نیا اور عمدہ پلنگ، اس پر بچھانے کے لیے نئی چادر اور تکیہ لے آیا۔ تھانے دار نے حیران ہو کر پوچھا: یہ اہتمام کس لیے کر رہے ہو؟

لوگوں نے کہا: ہمارے مولوی صاحب آ رہے ہیں۔ انھیں اس پلنگ پر بٹھایا جائے گا۔

---

[1] میاں نورالدین بھوجیانی، نہایت متقی بزرگ تھے۔ حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی کے مرید تھے اور مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے سسر تقسیم ملک کے بعد گوندلاں والا (ضلع گوجراں والا) میں آ گئے تھے، وہیں فوت ہوئے۔

Marfat.com

اتنے میں مولانا بھی تشریف لے آئے۔ انھیں دیکھ کر سب لوگ کھڑے ہو گئے۔ تھانے دار یہ منظر دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ اس نے بھی آگے بڑھ کر مولانا کو سلام کیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔ انھیں عزت سے بٹھایا اور احترام سے پیش آیا۔

گاؤں میں نکاح شادی کے موقعے پر زیادہ تر مولانا ہی کو بلایا جاتا اور نکاح مسجد میں پڑھا جاتا تھا۔ مولانا پہلے دولھا سے کلمہ سنتے اور نماز کے متعلق دریافت کرتے اور اس کی پابندی کی تلقین فرماتے۔

ایک دفعہ ایک بارات گاؤں میں آئی۔ سورج نکلنے کے بعد جب مسجد میں نکاح کے لیے آئے تو مولانا نے ان سے دریافت فرمایا ''فجر کی نماز پڑھی ہے یا نہیں؟'' وہ لوگ حیلے بہانے کرنے لگے تو فرمایا پہلے نماز پڑھو، پھر نکاح ہوگا۔ چنانچہ سب نے وضو کیا اور نماز پڑھی۔ پھر نکاح ہوا۔

مولانا کے تذکارِ حسنہ میں ان کے حج بیت اللہ کا تذکرہ نہایت ضروری ہے۔ انھوں نے کئی حج کیے۔ حج بیت اللہ کے اس بابرکت سفر میں اپنے بعض رفقا کو بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ اگر کوئی کہتا کہ میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے تو فرماتے کہ کوئی بات نہیں تم تیار ہو جاؤ، اللہ مسبب الاسباب ہے، وہ اس نیک کام کی تکمیل کے لیے کوئی سبب پیدا فرمادے گا۔ چنانچہ وہ بہ خوشی تیار ہو جاتا اور اللہ کی مدد اور مولانا کی دعاؤں سے اس پُر سعادت سفر کی تمام منزلیں بہ آسانی طے ہو جاتیں۔

ایک دفعہ حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہونے لگے تو اپنے ایک شاگرد مولوی عبداللہ ریاستی سے کہا تم بھی حج کا ارادہ کرو۔ اس نے عرض کیا میرے پاس تو صرف پندرہ بیس روپے ہیں، میں آپ کے ساتھ کیسے جا سکتا ہوں۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کوئی انتظام کر دے گا۔ چنانچہ مولوی عبداللہ ریاستی ان کے ساتھ حج کے لیے روانہ ہو گئے۔ اتنے لمبے سفر میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی اور تمام ارکان حج آسانی کے ساتھ ادا ہو گئے۔

مولانا عبدالعظیم انصاری بیان کرتے ہیں کہ صوبہ سندھ کے شہر حیدر آباد تک وہ بھی مولانا کے ساتھ گئے۔ ملتان پہنچے تو ریلوے اسٹیشن پر مولانا عبدالتواب ملتانی محدث وہاں موجود تھے، انھیں کسی طرح مولانا عبدالرحمٰن بھوجیانی کی آمد کا پتا چل گیا تھا۔ وہ گھر سے بہت سا کھانا پکوا کر اور پھل فروٹ لے کر اسٹیشن پر پہنچے۔ بڑی تکریم سے ملے اور کھانے پینے کی چیزیں مولانا کی خدمت میں پیش کیں۔

مولانا عبدالرحمٰن بھوجیانی کے شاگردوں میں ایک شاگرد صاحب زادہ ظہور علی صاحب حنفی المسلک تھے اور جامع مسجد حنفیہ نقشبندیہ شیش محل روڈ، لاہور کے خطیب تھے۔ وہ چار پانچ سال بہ طور طالب علم مولانا ممدوح کی خدمت میں بھوجیاں رہے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد لاہور آ گئے تھے۔ حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے پاس ان کی آمد و رفت رہتی تھی۔ بڑے متواضع اور منکسر المزاج تھے۔ مولانا عبدالعظیم انصاری کی

Marfat.com

کتاب ''تذکرہ علمائے بھوجیاں'' پر انھوں نے مقدمہ لکھا تھا۔اور بھی متعدد حضرات نے اس کتاب پر مقدمے لکھے ہیں لیکن میں یہاں ان کا مقدمہ درج کر رہا ہوں، اس سے مولانا عبدالرحمٰن اور ان کے خاندان کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوں گی اور موضع بھوجیاں کا بھی پتا چلے گا کہ وہ کس قسم کا گاؤں تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''کہنے کو تو بھوجیاں ایک گاؤں کا نام ہے، لیکن اس خاک میں اتنے ان مول قیمتی خزانے اور لعل وگہر مدفون ہیں جن کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔

''ایک زمانے میں یہ سرزمین علوم وفنون کا مرکز اور رشد وہدایت کا منبع رہی ہے۔ حضرت مولانا فیض اللہ خاں رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے فرزندانِ ذوی الاحترام کی بدولت اس خطے میں قرآن وحکمت کی روشنی پھیلی اور توحید وسنت کا غلغلہ بلند ہوا، اور عوام قعرِ ضلالت کی تاریکیوں سے نکل کر نورِ ہدایت کے جادۂ مستقیم پر گامزن ہوئے۔ اس ناچیز کو بھی ان کے فیوض وبرکات سے متمتع ہونے کا شرف اور ان کی کفش برداری کی سعادت حاصل رہی ہے۔

ہماری رہائش موضع جھبال ضلع امرتسر میں تھی جو موضع بھوجیاں کے مغرب کی جانب دواڑھائی میل پر واقع تھا۔ مولانا عبدالرحیم بھوجیانی اور میں جھبال کے مڈل سکول میں اکھٹے زیرِ تعلیم تھے۔ وہ بچپن ہی سے نہایت سنجیدہ، شیریں کلام، مہذب ومؤدب اور شرافت و وجاہت کے پیکر تھے۔ ان کے خوبصورت چہرے پر متانت اور دلآویزی کی وجہ سے سب ان کے گرویدہ تھے اور علمی خاندان کے چشم وچراغ ہونے کی بدولت ان کا بے حد احترام کرتے۔ ان کی نیک عادات واطوار اور بلند اخلاق سے متاثر ہو کر میرے ان سے دوستانہ تعلقات استوار ہوگئے اور میرا موضع بھوجیاں میں آنا جانا ہوگیا۔ انھی کی ترغیب پر میں ان کے والد گرامی حضرت مولانا فیض اللہ کے جاری کردہ مدرسہ فیض الاسلام میں داخل ہوگیا۔ ابتدائی درسی کتابیں ان کے برادرِ بزرگ حضرت مولانا عبدالرحمٰن شہید سے پڑھیں اور قرآن مجید کا ترجمہ میاں رکن الدین رحمۃ اللہ علیہ سے مکمل کیا، جو حضرات علمائے بھوجیاں کی مصاحبت اور مجالست اختیار کرنے کے خاطر اپنے گھربار اور عزیز واقارب کو چھوڑ کر مسجد میں ڈیرہ ڈال چکے تھے۔

چار پانچ سال موضع بھوجیاں میں ان خدارسیدہ ہستیوں کی صحبت کیمیائے اثر میں گزارے ہوئے آج بھی لوحِ قلب پر نقش ہیں اور ان بزرگوں کی صحبت اور مجالس کی حاضری کا ایک ایک لمحہ یاد ہے۔ وہ دور لد گیا، وہ زمانہ گزر گیا، اور وقت بیت گیا۔ اب تو ''چراغِ رخ زیبا'' لے کر بھی ڈھونڈنے سے وہ پاک باز لوگ نظر نہیں آتے۔ اب شاید کوئی یقین ہی نہ کرے کہ اس قسم کے فرشتہ خصلت انسان بھی ہوگزرے ہیں۔

وہ نفوسِ قدسیہ اور ارواحِ ذکیہ جو عنداللہ راضیۃً مرضیۃً کے مقامات رفیع پر متمکن ہیں، میرا قلم عاجز اور

Marfat.com

زبان قاصر ہے کہ ان کے اوصافِ حمیدہ، اطوارِ محمودہ اور اخلاقِ کریمانہ کا حصر کر سکے۔

وہ نہ صرف علم و فضل کے لحاظ سے بحرِ ذخار اور اپنے امثال و اقران میں ممتاز تھے، عزم و ثبات، تقویٰ و پارسائی، شجاعت و شہامت، بسالت و بطالت، اور شرف و مجد میں بھی یگانہ تھے۔

ان کی خوبیوں اور ان کے اوصاف کا احصاء مجھ ایسے گناہ گار کے بس کی بات نہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ وہ اپنے زمانے کے ''ولی کامل'' تھے تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ عبادت میں خشوع و خضوع اور حضورِ قلب، حلال کی طلب اور حرام سے اجتناب، دنیا کے مال سے بے رغبتی اور بے اعتنائی، اپنوں سے صلہ رحمی، عوام سے محبت، سب کی بھلائی کی خواہش، تواضع و انکسار، مہمانوں سے حسن سلوک، نادار اور ناتوانوں کی دست گیری، کردار میں پختگی، گفتار میں صداقت، رفتار میں وقار، آنکھوں میں حیا، دل ہر وقت خوفِ خدا سے لرزیدہ، عاداتِ ذمیمہ اور خصائل رذیلہ سے دل کبیدہ۔ ان اوصاف کا حامل ولی نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا ولایت اس کے ماوراء شے ہے؟

حضرت مولانا فیض اللہ خاں کے ابنائے ثلاثہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن، مولانا عبداللہ اور مولانا عبدالرحیم رحمہم اللہ بلند اوصاف اور بلند کردار بزرگ تھے۔ چوں کہ مجھے زیادہ تر حضرت الشیخ استاذی المکرّم مولانا عبدالرحمٰن کی خدمت میں حاضری کا موقع میسر رہا ہے۔ اس لیے میں چند واقعات جو ان کی سیرت سے وابستہ ہیں، ذکر کرنا چاہتا ہوں جن سے ان کی زندگی کا ایک اور روشن پہلو نمایاں ہوتا ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن نہایت متقی، پرہیز گار اور خشیت الٰہی کے پیکر تھے۔ ذکر الٰہی سے ہر وقت زبان تر رہتی۔ بڑے ہی باحیا، تہجد گزار اور شب زندہ دار تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت کا بے حد شوق تھا۔ آپ صاحب کرامت ولی اللہ تھے۔ اس سلسلے میں چند واقعات عرض کرتا ہوں جن کا میں خود شاہد ہوں:

☆ آپ کی شخصیت بڑی وجیہ تھی۔ جس مجلس میں جاتے لوگوں پر ایک نادیدہ ہیبت چھا جاتی۔ آپ جو فرماتے لوگ بطوع قلب قبول کرتے۔

☆ دیہات میں اکثر زمینداروں کی آپس میں لڑائیاں اور جھگڑے چلتے رہتے ہیں۔ اگر گاؤں میں کبھی لڑائی ہو جاتی اور آپ کو اطلاع پہنچتی تو آپ فوراً جائے واردات پر پہنچتے۔ فریقین جب دُور سے آپ کو تشریف لاتے دیکھتے تو فوراً لڑائی چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں میں گھس جاتے۔ اس طرح جدال و قتال سے محفوظ رہتے۔

☆ آپ کی گاؤں میں کچھ زرعی زمین تھی۔ فصل کو پانی لگانے کے لیے رات کے وقت ایک دفعہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ میں نے کسّی اپنے کاندھے پر رکھی ہوئی تھی، اور ان کے آگے آگے چل رہا تھا۔

Marfat.com

اندھیرے کی وجہ سے خوف زدہ تھا لیکن خاموشی سے چل رہا تھا۔ حضرت صاحب اچانک فرمانے لگے: ظہور ڈرتے کیوں ہو؟ میں تمھارے ساتھ ہوں اور ہمارے ساتھ اللہ ہے۔ میں حیران ہوا کہ اللہ نے میری دلی کیفیت کا اظہار ان سے کر دیا۔ ان کے یہ فقرہ کہنے کے بعد میرا تمام خوف اور ڈر جاتا رہا۔

☆ ایک بار موضع باٹھ کا نمبردار جس کا نام شاید چودھری اللہ بخش تھا۔ اپنی گھوڑی لے کر حضرت کو اپنے گاؤں لے جانے کے لیے آیا۔ اس سفر میں یہ ناچیز بھی ان کے ساتھ تھا۔ راستے میں ایک گاؤں سے گزر رہے تھے کہ گاؤں کے چوک میں ناچ گانے کی ایک محفل قائم تھی اور طوائفیں ناچ رہی تھیں۔ بہت سے سکھ چاروں طرف بیٹھے محظوظ ہو رہے تھے۔ ہم جب قریب پہنچے تو آپ نے فرمایا۔ یہ ان کی ہلاکت کا سامان ہو رہا ہے۔ شام کو جب ہم واپس ہوئے اور اس مقام سے گزرے تو وہاں پانچ چھے سکھوں کی لاشیں پڑی تھیں جن کے خون سے زمین سرخ ہو رہی تھی۔ ہمارے جانے کے بعد ان کی آپس میں زبردست لڑائی ہوئی جس کا یہ نتیجہ تھا۔ گاؤں پر سکوتِ مرگ طاری تھا۔ اس طرح اس مردِ مومن کی زبان سے نکلی ہوئی بات پوری ہو کر رہی۔

☆ مولانا عبداللہ ریاستی جو آپ کے چہیتے شاگرد تھے۔ فرماتے ہیں: ایک بار حضرت حج کو جاتے ہوئے مجھے بھی ساتھ لے گئے حالاں کہ مجھے معلوم تھا کہ آپ کے پاس اتنی رقم نہیں کہ جو ہم دونوں کو کفایت کر سکے لیکن دورانِ حج میں حیران ہوا کہ آپ بڑی فراخ دلی سے خرچ کر رہے ہیں۔ کتابیں، کپڑے اور دیگر اشیاء خرید رہے ہیں، اور روزمرہ کا خرچ اس کے علاوہ ہے۔ میں بڑا متعجب تھا کہ یہ رقم کہاں سے آ رہی ہے۔ اس کے بعد بھی واپسی تک اسی طرح خرچ کرتے رہے اور دورانِ سفر کسی قسم کی دقت محسوس نہ ہوئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ دستِ غیب سے آپ کو یہ وسعت حاصل ہوئی ہے۔

☆ آپ کی آمدنی کا کوئی معقول ذریعہ نہیں تھا اور اکثر مہمان آتے رہتے، آپ فراخ دلی سے ان کی مہمان نوازی کرتے، اس کے علاوہ، مدرسے کے طلباء کی ضروریات بھی پوری کرتے۔

☆ گاؤں میں کسی محلے سے گزرتے تو عورتیں راستہ چھوڑ کر ایک طرف ہو جاتیں اور لوگ آپ کو دیکھ کر احتراماً کھڑے ہو جاتے۔ سفر میں بھی اکثر ایسا ہوتا کہ راستے میں سکھ بھی کھڑے ہو کر آپ کو سلام کرتے۔ غرض یہ کہ حضرت علیہ الرحمہ کی زندگی ایک سچے اور حقیقی مسلمان کی زندگی تھی۔

مولانا ظہور علی کے ارشادات ختم ہوئے۔

حضرت مولانا عبدالرحمٰن کو تقسیم ملک کے زمانے میں ۱۶۔ اگست ۱۹۴۷ء (۲۶۔ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ) کو جمعۃ المبارک کے روز سکھوں نے شہید کر دیا۔

Marfat.com

مولانا علیہ الرحمہ سے بے شمار علماو طلبا نے تحصیل علم کی، اس خوش نصیب جماعت میں مندرجہ ذیل حضرات شامل ہیں:

مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی۔

مولانا عبدالرحمٰن انصاری بھوجیانی۔

مولانا خدا بخش حداد۔

مولانا غلام الدین آف مان ضلع گوجراں والا۔

حافظ محمد سلیمان بھوجیانی۔

مولانا عبدالعظیم انصاری۔

مولانا ظہور الٰہی (سابق خطیب مسجد حنفیہ موہنی روڈ، لاہور)۔

مولانا عبدالرحیم بھوجیانی رحمانی (مولانا کے چھوٹے بھائی)۔

حافظ بشیر احمد بھوجیانی (مولانا کے فرزند گرامی)۔

مولانا محمد داؤد انصاری بھوجیانی۔

حافظ فضل کریم بھوجیانی۔

مولانا محمد داؤد ارشد (تقسیم ملک کے بعد میاں چنوں چلے گئے تھے)۔

مولانا عبدالرحیم بن حافظ محمد زکریا غزنوی (منڈی صادق گنج ضلع بہاول نگر)۔

مولانا عبدالرحمٰن از ہرجیس آباد (صوبہ سندھ)۔

مولانا عبدالقادر کسیلوی۔

حاجی محمد ادریس بھوجیانی (ٹوبہ ٹیک سنگھ)۔

مولانا عبدالرشید بھوجیانی بن مولانا عبداللہ بھوجیانی شہید۔

مولانا اللہ داد بھوجیانی۔

حافظ محمد ابراہیم باقی پوری۔

مولانا حکیم عبدالعزیز خاں بھوجیانی۔

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا ابوالحسنات عبداللہ بھوجیانی

(شہادت ۱۶۔اگست ۱۹۴۷ء)

۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء کے آخر تک (چار سال) حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کا قیام بہ طور خطیب و مدرس کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ) میں رہا۔اس اثنا میں ان سے بے شمار لوگوں نے استفادہ کیا۔ یہ فقیر بھی اپنی محدود سمجھ کے مطابق ان سے اخذِ فیض کرتا رہا۔مولانا ممدوح کے ہاں علمائے کرام کی آمدورفت جاری رہتی تھی۔غالباً ۱۹۳۵ء کی بات ہے کہ ان کے آبائی وطن بھوجیاں سے ایک عالم دین ان سے ملاقات کے لیے آئے۔ یہ منظر مجھے اچھی طرح یاد ہے۔سردیوں کا مہینا تھا۔مولانا کے گھر کے دروازے کے باہر کھلی جگہ پر دھوپ میں تین چار چار پائیاں رکھی گئی تھیں۔ایک چار پائی پر سفید کھیس بچھایا گیا اور اس پر تکیہ رکھا گیا، اس چار پائی پر جس شخص کو نہایت احترام سے بٹھایا گیا، ان کا حلیہ کچھ اس قسم کا تھا۔نکلتا ہوا قد، نکھرا ہوا رنگ، گول چہرہ، کھلی پیشانی، موٹی آنکھیں۔ کلے والا سفید عمامہ۔ ان کا اسم گرامی تھا مولانا ابوالحسنات عبداللہ بھوجیانی۔حضرت مولانا فیض اللہ خاں بھوجیانی کے منجھلے فرزند اور مولانا عبدالرحمٰن بھوجیانی کے چھوٹے بھائی۔ میں نے ان کو پہلی اور آخری مرتبہ اسی مجلس میں دیکھا۔

مولانا ممدوح بمقام (ضلع امرتسر) جولائی ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد مکرم سے بھوجیاں کے مدرسہ فیض الاسلام میں حاصل کی۔ پھر لکھوکے جا کر استاذِ پنجاب حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے حضور زانوئے شاگردی تہہ کیے اور ان سے استفادہ کیا۔

لکھوکے سے ضلع بہاول نگر کے مشہور قصبہ منڈی صادق گنج پہنچے۔ وہاں مولانا عبدالرحیم غزنوی بن حضرت سید عبداللہ غزنوی کا سلسلہ درس جاری تھا، ان سے کتب حدیث پڑھیں۔

یہاں یہ یاد رہے کہ حضرت سید عبداللہ غزنوی کے ایک فرزند گرامی کا نام مولانا عبدالرحیم غزنوی تھا، جنھیں تحصیل علم کے بعد سابق ریاست بہاول پور کے حکمران نے منڈی صادق گنج کی شاہی مسجد کے خطیب مقرر کر دیا تھا۔ انھیں خاصا زرعی رقبہ بھی دے دیا تھا اور یہ رقبہ ان کے نام رجسٹری کر دیا گیا تھا۔ وہ حکمران مولانا عبدالرحیم غزنوی کا انتہائی احترام کرتا تھا۔مولانا نے وہاں دینی مدرسہ بھی جاری کر لیا تھا، اس مدرسے میں جن طلبا نے ان سے تعلیم حاصل کی ان میں مولانا عبداللہ بھوجیانی بھی شامل تھے۔

Marfat.com

مولانا عبدالرحیم غزنوی سے اخذِ فیض کے بعد مولانا عبداللہ بھوجیانی نے امرتسر کا عزم کیا اور وہاں مدرسہ غزنویہ میں داخلہ لیا۔ اس مدرسے میں انھوں نے حضرت مولانا نیک محمد سے دوبارہ کتب حدیث پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔

علوم دینی سے فراغت کے بعد وہ لکھنؤ گئے اور وہاں کے طبیہ کالج میں علم طب پڑھا اور فنِ جراحی سیکھا۔ اور اس کی سند لی۔ کچھ عرصہ وہ طبابت کرتے بھی رہے۔ پھر طبابت کا سلسلہ ترک کر دیا اور اپنے والد مکرم اور برادر کبیر مولانا عبدالرحمٰن بھوجیانی کے ساتھ اپنے آبائی مدرسہ فیض الاسلام میں فریضہ تدریس کی انجام دہی میں مشغول ہو گئے۔ وہاں ایک اور مدرس کی خدمات بھی حاصل کر لی گئی تھیں۔ وہ تھے مولانا انیس الحق لکھنوی، انھیں خاص طور پر لکھنؤ سے بلایا گیا تھا۔ وہ طلبا کو فلسفہ و منطق یعنی معقولات کی تعلیم دیتے۔ خود مولانا عبدالرحمٰن اور مولانا عبداللہ بھی ان سے کتبِ معقولات پڑھتے رہے۔

کسی زمانے میں پنجاب کی جماعت کے امیر حضرت سید محمد شریف گھڑیالوی کو منتخب کیا گیا تھا اور اس انتخاب کے فوراً بعد گوجراں والا میں مدرسہ محمدیہ کے نام سے ایک مرکزی درس گاہ کا قیام عمل میں لایا گیا تھا، حس کی زمام اہتمام حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کے ہاتھ میں تھی۔ اس مدرسے میں تدریس کے لیے مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ کچھ عرصے کے بعد مولانا بھوجیانی کا تقرر بھی بہ طور مدرس کیا گیا تھا، لیکن پھر حالات ایسے پیدا ہوئے کہ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی انجمن اصلاح المسلمین کوٹ کپورہ کی دعوت پر وہاں چلے گئے اور مولانا عبداللہ بھوجیانی کو ان کے برادرِ کبیر مولانا عبدالرحمٰن بھوجیانی نے اپنے والد مکرم کے جاری کردہ مدرسہ فیض الاسلام میں تدریس کے لیے بھوجیاں آنے پر مجبور کیا تو وہاں چلے گئے اور بڑے بھائی کی رفاقت میں فریضہ تدریس انجام دینے لگے۔

۱۹۳۶ء میں مولانا ممدوح کے چھوٹے بھائی مولانا عبدالرحیم بھوجیانی کی شادی کے موقعے پر حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی بھی بھوجیاں تشریف لے گئے تھے۔ مولانا غزنوی اس زمانے میں چینیاں والی مسجد لاہور کے خطیب تھے اور مدرسہ غزنویہ امرتسر کے مہتمم۔ علاوہ ازیں ان کی حیثیت سیاسی رہنما کی بھی تھی اور ان کا زیادہ تر وقت انگریزی حکومت کے خلاف سیاسی مصروفیات میں گزرتا تھا۔ انھوں نے بھوجیاں کے اس سفر میں مولانا عبداللہ صاحب کو مدرسہ غزنویہ میں بہ طور استاذ تشریف لے جانے کی دعوت دی اور وہ مولانا غزنوی کی دعوت پر امرتسر مدرسہ غزنویہ میں چلے گئے۔

مولانا عبداللہ بھوجیانی اپنے عہد کے جلیل المرتبت مدرس تھے۔ علوم متداولہ کے تمام پہلوؤں پر عبور رکھتے تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، عربی ادبیات، صرف ونحو، معانی وبیان اور دیگر فنون کی کتابیں انھوں نے ماہر

Marfat.com

اساتذہ سے بڑی محنت سے پڑھی تھیں اور وہ ان کی تدریس میں مہارت رکھتے تھے نیز مولانا داؤد غزنوی کے ارشاد کے مطابق وہ مدرسے کے انتظامی معاملات کی دیکھ بھال میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ طلبا ان کے طریقِ تدریس سے بہت خوش تھے۔

۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک دس گیارہ سال مولانا عبداللہ بھوجیانی مدرسہ غزنویہ (امرتسر) میں خدمت تدریس سرانجام دیتے رہے، بہ الفاظ دیگر یوں سمجھیے کہ حیاتِ مستعار کے آخری وقت تک اسی مدرسے میں طلبائے علم کو قرآن وحدیث اور اس کے متعلقات کی تعلیم ان کا شب وروز کا مشغلہ رہا۔ اس کے سوا ان کا کسی کام سے کوئی علاقہ نہ تھا۔

پھر ایک نہایت ناخوش گوار وقت آیا کہ ۱۹۴۷ء کے آغاز میں امرتسر میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے درمیان فسادات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اسی اثنا میں مدارس کی سالانہ تعطیلات یعنی رمضان المبارک سے پہلے مولانا عبداللہ صاحب اپنے گاؤں بھوجیاں چلے گئے۔ تقسیم ملک اور قیام پاکستان کا اعلان ہوا تو فسادات کا دائرہ وسیع ہوگیا، جس کے خونی اثرات نے دیہات کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بھوجیاں گاؤں میں چوں کہ مسلمان بہت بڑی اکثریت میں آباد تھے، اس لیے اردگرد کے دیہات کے لوگوں نے اسے محفوظ مقام سمجھ کر ادھر کا رخ کیا اور کثیر تعداد میں لوگ یہاں جمع ہوگئے۔ سکھوں نے اس گاؤں پر بار بار حملے کیے لیکن ناکام رہے۔ اخوان ثلاثہ یعنی مولانا عبدالرحمٰن، مولانا عبداللہ اور مولانا عبدالرحیم خود میدان میں موجود تھے اور ان کی وجہ سے لوگوں کے حوصلے بلند تھے، لیکن حالات لحہ بہ لحہ خراب ہو رہے تھے۔ بعض لوگوں نے مولانا عبداللہ اور ان کے بھائیوں کو وہاں سے نکل جانے کے لیے کہا، لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ پھر اس گاؤں پر تین طاقتوں نے بیک وقت علی الصبح اچانک حملہ کردیا اور وہ طاقتیں تھیں۔ (۱) اردگرد کے سکھ (۲) ملٹری اور (۳) پولیس۔ اس سہ طاقتی اور چارطرفی ناگہانی حملے سے ہزاروں مسلمان جامِ شہادت نوش کرگئے۔ مولانا عبداللہ اور ان کے دونوں بھائی مولانا عبدالرحمٰن اور مولانا عبدالرحیم بھی اس حملے میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا عبدالرحمٰن بھوجیانی کا تذکرہ خوانندگانِ محترم گزشتہ صفحات میں پڑھ چکے۔۔۔ ان کے چھوٹے بھائی مولانا عبداللہ بھوجیانی کی شہادت کے موقعے پر جو ان کی اہلیہ اور اولاد کے ساتھ گزری اب اس کے متعلق سنیے!

شہادت کے وقت مولانا عبداللہ بھوجیانی کی اولاد چار بیٹیاں تھیں اور تین بیٹے۔ مولانا کی اہلیہ محترمہ نے ان بیٹوں اور بیٹیوں کو کسی طرح اس مقتل سے نکالا اور گرتی پڑتی اس کیمپ میں پہنچ گئیں، جس میں بھوجیاں سے دواڑھائی میل کے فاصلے پر موضع جھبال میں مسلمان جمع ہو رہے تھے۔ پھر بڑی مصیبتوں اور تکلیفوں کی

Marfat.com

حالت میں ایک بڑے قافلے کے ساتھ پاکستان پہنچیں۔ یہاں ضلع قصور کے ایک گاؤں موضع بھوئے آصل میں مولانا عبداللہ بھوجیانی کے چچازاد بھائی حافظ محمد سلیمان بھوجیانی پہلے سے قیام پذیر تھے، وہ مولانا عبداللہ صاحب کے برادرِ نسبتی تھے اور بھوئے آصل کی مسجد کے خطیب تھے، مولانا کی اہلیہ ۱۹۵۴ء تک موضع بھوئے آصل میں رہیں۔ پھر گوجراں والا چلی گئی تھیں وہاں انھوں نے خود اور ان کی بیٹیوں نے لوگوں کے کپڑے سینے سلانے کا کام شروع کردیا تھا۔ اس طرح گزرِ اوقات ہوتی رہی۔

مولانا مرحوم کی اہلیہ نہایت سلیقہ شعار اور صابرہ وشاکرہ خاتون تھیں۔ ان نامساعد حالات میں بچوں کو کچھ نہ کچھ تعلیم دلائی اور بہتر انداز سے ان کی تربیت کی۔

اب مولانا کی نرینہ اولاد کے متعلق چند باتیں۔

مولوی عبدالرشید ان کے بڑے بیٹے تھے جو ۱۹۲۹ء میں بمقام بھوجیاں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے خاندانی ''مدرسہ فیض الاسلام'' میں حاصل کی۔ پھر درس نظامی کی تکمیل کے لیے مختلف مدارس کے چکر لگائے، جن میں دارالعلوم تقویۃ الاسلام غزنویہ امرتسر، مدرسہ محمدیہ گوجراں والا، جامعہ محمدیہ لکھوکے (ضلع فیروز پور)، دارالحدیث رحمانیہ دہلی شامل ہیں۔ اساتذہ میں حضرت مولانا نیک محمد، مولانا محمد حسین ہزاروی، والد محترم عبداللہ بھوجیانی، عم مکرم مولانا عبدالرحیم بھوجیانی رحمانی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا محمد داؤد انصاری، مولانا عبدالرحمٰن لکھوی، مولانا محمد عبداللہ گوجراں والا اور مولانا عبیدالرحمٰن رحمانی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ افسوس ہے وہ باقاعدگی سے کہیں تعلیم نہ حاصل کرسکے۔ علم طب بھی پڑھا، کچھ عرصہ طبابت کرتے رہے۔ آخر میں کوٹ رادھا کشن (ضلع قصور) میں آڑھت کا کام بھی کیا۔ ملنسار اور متواضع، خاندانی شرافت اور اخلاق حسنہ کے مالک۔ کوٹ رادھا کشن میں وفات پائی۔

مولانا مرحوم کے دوسرے بیٹے عمر فاروق خاں تھے۔ ۱۲۔ جون ۱۹۳۳ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ بھوجیاں کے قریب موضع جھبال کے سکول میں چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے کہ ملک تقسیم ہوگیا۔ کچھ عرصہ پریشانی میں گزرا۔ پھر لاہور میں میٹرک پاس کرنے کے بعد واپڈا کے محکمے میں ملازمت کرلی۔ اپنے بزرگوں کی طرح دینی تعلیم نہ حاصل کرسکے۔ مستقل طور پر قصور میں رہائش اختیار کرلی تھی، وہیں وفات پائی۔

مولانا عبداللہ بھوجیانی کے تیسرے بیٹے قاری محمد یحییٰ بھوجیانی تھے، وہ باقاعدہ عالم دین تھے۔ ان کا تذکرہ آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمایئے۔ ۳۔ نومبر ۱۹۹۷ء کو فوت ہوئے۔

یہاں مولانا عبداللہ بھوجیانی کے تلامذہ کرام کے بارے میں بھی سنتے جایئے۔ ان کی صحیح تعداد کا تو علم

Marfat.com

نہیں ہوسکا، لیکن مولانا عبدالعظیم انصاری نے اپنی کتاب ''تذکرہ علمائے بھوجیاں'' میں ان کے ۱۰۴ تلامذہ کے نام لکھے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ ''میں نے بہت کوشش کی کہ ان کے [شاگردوں] کے مکمل اعداد وشمار معلوم کرسکوں مگر افسوس ہے کامیاب نہ ہوسکا۔'' بہرحال جو نامکمل فہرست انھوں نے اپنی کتاب میں درج کی ہے اس میں بڑی بڑی شخصیات شامل ہیں۔ چند حضرات یہ ہیں۔ افسوس یہ بھی وفات پاچکے ہیں۔

شیخ الحدیث مولانا محمد عبداللہ	گوجراں والا
مولانا محمد اسحاق چیمہ۔	فیصل آباد
شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف	راجووال
مولانا عبدالعزیز سعیدی	منکیرہ
مولانا حافظ محمد ادریس کیلانی	کیلیاں والا
مولانا محمد سلیمان کیلانی	کیلیاں والا
حافظ محمد ابراہیم کمیرپوری	پتوکی ضلع گوجراں والا
مولانا محمد حسین حصاری	جوہرآباد
مولانا عتیق اللہ بن میاں محمد باقر	جھوک دادو
مولانا عبدالعظیم انصاری	قصور
مولانا محمد داؤد ارشد	میاں چنوں
مولانا سیف الرحمٰن الفلاح	اوکاڑہ
حافظ محمد یحییٰ میرمحمدی	بنگلا بلوچاں ضلع قصور

ان سطور کی تحریر کے وقت تک جہاں تک مجھے معلوم ہے، مولانا موصوف کے شاگردوں میں سے صرف ہمارے دوست مولانا ابوبکر صدیق سلفی (خطیب جامع مسجد اہل حدیث احاطہ تھانیدار مصری شاہ لاہور) حیات ہیں۔ اللہ ان کی زندگی دراز فرمائے۔

مولانا عبداللہ بھوجیانی کا اصل میدانِ عمل درس وتدریس تھا اور ان کی تمام زندگی اسی میدان میں تگ وتاز کرتے ہوئے گزری۔ تصنیف وتالیف کی طرف وہ توجہ نہ فرماسکے۔ ان کے صرف ایک غیر مطبوعہ رسالے کا پتا چلا ہے جو استاذ مکرم حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے پاس محفوظ تھا۔ اس غیر مطبوعہ رسالے کا نام ''فاتحہ خلف الامام'' ہے۔ حضرت استاذ کو یہ رسالہ جیمس آباد (سندھ) کے حکیم فضل دین مرحوم نے دیا تھا۔ دراصل یہ رسالہ ایک حنفی المسلک سندھی عالم کی تحریر کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ جس میں نماز میں سورۃ فاتحہ

Marfat.com

کے عدم وجوب کے موضوع پر بحث کی گئی تھی۔

مولانا عبداللہ بھوجیانی شہید کا یہ رسالہ اپنے موضوع کا نہایت مدلل رسالہ ہے۔ استاذ محترم مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے یہ رسالہ ”تذکرہ علمائے بھوجیاں“ کے مصنف مولانا عبدالعظیم انصاری نے لے لیا تھا۔ وہ یہ رسالہ شائع کرنا چاہتے تھے لیکن افسوس ہے شائع نہ کر سکے، مولانا عبدالعظیم انصاری بھی ۲۷۔ دسمبر ۲۰۰۲ء کو وفات پا گئے۔ معلوم نہیں مولانا عبداللہ صاحب کا یہ قلمی رسالہ اب انصاری صاحب کے گھر کسی کے پاس ہے یا نہیں ہے۔

(یہ سطور ۸۔ مئی ۲۰۱۴ء کو لکھی گئیں)

❀❀❀❀

Marfat.com

مولوی حبیب اللہ کلرک امرتسری

(وفات ۸۔ مارچ ۱۹۴۸ء)

پورا قد، معتدل جسم، گورا رنگ، کشادہ سینہ، چوڑا چہرہ، موٹی آنکھیں، کھلی پیشانی، چھوٹی کالی ڈاڑھی، شلوار قمیص میں ملبوس، تیز گفتار اور خوش مزاج۔ یہ تھے اس وقت کے مولوی حبیب اللہ کلرک، جب تقسیم ملک سے دو یا تین سال قبل میں نے انھیں اپنے وطن کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ مشرقی پنجاب) کی انجمن اصلاح المسلمین کے سالانہ جلسے میں تقریر کرتے ہوئے دیکھا۔

حبیب اللہ کلرک سری نگر (کشمیر) کے محلّہ زینہ کدول میں ۱۸۹۸ء کے آخر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام خواجہ مختار شاہ اور دادا کا خواجہ احمد شاہ تھا۔ یہ لوگ کشمیری شالیں بناتے اور اخروٹ کی لکڑی کے کاری گر تھے اور اس کاروبار کے سلسلے میں ہندوستان کے مختلف علاقوں بنگال، بہار، یوپی، حیدر آباد دکن اور پنجاب کے شہروں میں ان کی آمد ورفت رہتی تھی۔ موسمِ سرما میں کشمیر کی وادی برف سے ڈھک جاتی تھی اور وہاں آنے جانے اور سفر کرنے کے راستے بند ہو جاتے تھے، جس کی وجہ سے کاروبار بند ہو جاتا تھا، چنانچہ یہ سرد موسم میں امرتسر آجاتے تھے اور وہاں سے ہندوستان کے علاقوں میں آنے جانے اور کاروبار کرنے میں آسانی رہتی۔ پھر آہستہ آہستہ بے شمار کشمیری مستقل طور سے امرتسر آگئے، جن میں حبیب اللہ کلرک کے آباواجداد بھی شامل تھے۔

حبیب اللہ آٹھ سال کے تھے کہ والد وفات پاگئے اور گھر کے مالی معاملات بالکل بدل گئے۔ والدہ نہایت نیک خاتون تھیں اور علم وعمل سے دلچسپی رکھتی تھیں۔ انھوں نے بیٹے کو سکول میں داخل کرادیا اور انھوں نے گورنمنٹ ہائی سکول (امرتسر) سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا۔ اب کاروبار کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔

حبیب اللہ ۱۹۱۸ء میں محکمہ انہار کے امرتسر دفتر میں بہ طور کلرک ملازم ہو گئے۔ امرتسر علمائے دین کا شہر تھا اور اس میں بہت سے دینی مدارس جاری تھے۔ حبیب اللہ نے دینی تعلیم بھی حاصل کرلی اور وہ اپنے دفتر کی مسجد میں خطبہ جمعہ بھی دینے لگے اور دفتری اوقات میں ظہر اور عصر کی نمازیں پڑھانا بھی اپنا معمول بنالیا۔ انھیں کلرک ہونے کی وجہ سے بابو حبیب اللہ کہا جاتا تھا اور خطیب وامام ہونے کے باعث مولوی حبیب اللہ کہا جانے لگا۔ دینیات کی زیادہ تر تعلیم انھوں نے مولانا مفتی محمد حسن مرحوم ومغفور سے حاصل کی۔

امرتسر میں حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری سے حبیب اللہ کلرک کی محلے داری تھی، برادری بھی

Marfat.com

ایک تھی اور کچھ رشتے داری بھی تھی۔ مولانا جامع مسجد اہل حدیث کے خطیب تھے ان کا ہفت روزہ اخبار ''اہلحدیث'' بھی جاری تھا اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ مختلف مذاہب کے لوگوں سے ان کے مناظرے بھی ہوتے تھے۔ مرزائیوں سے بالخصوص ان کی تحریری اور تقریری بحثیں رہتی تھیں۔ حبیب اللہ کلرک ان سے بے حد متاثر ہوئے اور ان سے استفادہ کرنے لگے۔ ان کی کتابوں کا مطالعہ انھوں نے اپنے لیے ضروری قرار دے لیا۔ بالخصوص مرزائیت کی مخالفت میں مولانا کی تحریروں کا ان پر بہت اثر ہوا۔ اس موضوع پر انھوں نے اخبار ''اہل حدیث'' میں مضامین بھی لکھنا شروع کر دیے۔

مولانا ثناء اللہ صاحب نے جن حضرات کی فنِ مناظرہ میں خاص طور پر تربیت کی ان میں مولوی حبیب اللہ کلرک اور مولوی عبداللہ معمار کے نام بھی شامل ہیں۔ مناظروں میں یہ دونوں مولانا کے ساتھ رہتے تھے، بالخصوص مرزائیوں سے جس انداز میں مولانا گفتگو کرتے اور جس اسلوب میں ان کے اعتراضات کا جواب دیتے اور ان کو اپنی گرفت میں لاتے، اس سے ان کی معلومات میں اضافہ ہوتا اور یہ اس سے استفادہ کرتے۔ مناظرے میں حاضر جوابی ضروری ہے اور مولانا ثناء اللہ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے اس صفت سے خوب نوازا تھا، مولانا کی تربیت کی بنا پر حبیب اللہ کلرک کو بھی اس سے بہرۂ وافر حاصل ہوا۔

مولوی حبیب اللہ کلرک نے مرزائی مبلغوں سے مناظرے بھی کیے اور مرزائیت کے خلاف عوامی جلسوں میں تقریریں بھی کرتے رہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے مرزائیت کی مخالفت میں کتابیں بھی لکھیں اور اخبارات میں مضامین بھی لکھے۔

ان کی تصنیف کردہ اس موضوع کی کتابوں میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں۔

(۱) حضرت مسیح کا حج کرنا اور مرزا قادیانی کا حج کے بغیر مرنا۔ (۲) مرزا قادیانی کی کہانی، مرزا اور مرزائیوں کی زبانی۔ (۳) مراق مرزا۔ (۴) مرزائیت کی تردید بہ طرز جدید۔ (۵) حضرت مسیح کی قبر کشمیر میں نہیں۔ (۶) عمرِ مرزا۔ (۷) نزولِ مسیح۔ (۸) مرزا قادیانی مثیل مسیح نہیں۔ (۹) مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کی قرآن دانی۔ (۱۰) حضرت عیسیٰ کا رفع اور آمد ثانی (۱۱) مرزا غلام احمد رئیس قادیان اور اس کے بارہ نشان۔ (۱۲) مرزا غلام احمد کی کذب بیانی۔ (۱۳) سلسلہ بہائیہ وفرقہ مرزائیہ (۱۴) اختلافِ مرزا۔ (۱۵) معجزہ اور مسمریزم میں فرق۔

مولوی حبیب اللہ کلرک نے ۱۹۲۴ء میں قلم پکڑا اور لکھنا شروع کیا۔ ان کی تحریریں مختلف اخبارات وجرائد میں بھی شائع ہوتی رہیں۔ جن میں ہفت روزہ اہل حدیث امرتسر اور ماہنامہ شمس اسلام بھیرہ شامل ہیں۔

تحریک پاکستان کے زمانے میں امرتسر میں فسادات شروع ہوئے تو سکھوں نے مولوی حبیب اللہ کلرک

Marfat.com

کا کتب خانہ جلا دیا تھا۔ قیام پاکستان کا اعلان ہوا تو وہ اپنے اہل وعیال سمیت لاہور آ گئے۔ پھر کچھ عرصہ بھیرہ میں مقیم رہے۔ اس کے بعد سرگودھا چلے گئے، وہیں ۸۔ مارچ ۱۹۴۸ء کو بہ قائمیٔ ہوش وحواس بلند آواز سے کلمۂ طیبہ پڑھتے ہوئے ان کا انتقال ہوا۔ اس کے آٹھ دن بعد وہیں حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری نے وفات پائی۔ دونوں بزرگ سرگودھا کے بڑے قبرستان میں دفن ہیں اور دونوں کی کچی قبریں قریب قریب ہیں۔

اللھم اغفرلھم وارحمھم وعافھم واعف عنھم

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا عبدالغفار غزنوی

(وفات ۱۹۴۹ء)

یہ حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی کے بیٹے اور مولانا محمد داؤد غزنوی کے چھوٹے بھائی تھے۔ دیگر غزنوی علمائے کرام کی طرح ان کے حالات بھی کہیں مرقوم نہیں۔ مجھے ایک ہی مرتبہ ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا اور ان کے ساتھ تھوڑا سا سفر کرنے کی سعادت بھی میسر آئی۔

مولانا عبدالغفار غزنوی کی تاریخ ولادت کا علم نہیں ہو سکا۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ انھوں نے تعلیم اپنے آبائی مدرسہ غزنویہ سے حاصل کی اور وہیں کے اساتذہ سے کی۔ میں نے ان کی کوئی تقریر نہیں سنی، لیکن جن حضرات کو ان کی تقریریں سننے کا موقع ملا، ان کا بیان ہے کہ وہ بہت اچھی تقریر کرتے تھے بلکہ بعض لوگوں کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ وہ اپنے بڑے بھائی مولانا سید محمد داؤد غزنوی سے بھی اچھی اور موثر تقریر کرتے تھے۔ ان کا سیاسی تعلق مجلس احرار سے تھا۔ انھوں نے زیادہ شہرت نہیں پائی۔

اب سنیے مجھے ان کی زیارت اور ان کے ساتھ تھوڑا سا سفر کرنے کا موقع کیسے اور کب ملا۔ ۱۹۴۵ء میں میں مرکز الاسلام میں خدمت تدریس انجام دیتا تھا۔ اس سال کے آخر میں ملک میں انتخابات کا دنگل شروع ہوا تو بے شمار لوگ اس اکھاڑے میں اترے۔ ایک دن دوپہر کے وقت ہم لوگ دھوپ میں بیٹھے تھے کہ ایک کار ہمارے قریب آ کر رکی۔ مولانا محی الدین لکھوی بھی وہیں تھے۔ اس کار سے چار آدمی باہر نکلے۔ دو فیروز پور کے مولانا عبیداللہ احرار اور خان عبدالعظیم خاں۔ تیسرے موضع کوٹلی تحصیل چونیاں کے مولانا عبدالرحیم کوٹلوی۔ ان تینوں کا سیاسی تعلق مجلس احرار سے تھا اور ہماری بہت مدت سے ان حضرات سے جان پہچان تھی۔ چوتھے شخص کو ہم نے پہلی مرتبہ دیکھا۔ نکلتا ہوا قد، کسرتی سا جسم، گورے چٹے خوب صورت، تیکھی ناک، موٹی چمک دار آنکھیں، کشادہ پیشانی، ترشی ہوئی ڈاڑھی سفید اور سیاہ بالوں کا مجموعہ۔ سر پر قراقلی ٹوپی، سفید کھدر کی قمیص اور سفید کھدر کا کھلے پائینچے کا پاجامہ پہنے ہوئے۔ اس کے اوپر اوورکوٹ جو اس زمانے میں بالعموم سردی سے بچاؤ کے لیے پہنا جاتا تھا۔ اب کئی سال سے اس کا رواج نہیں رہا۔ مولانا عبیداللہ احرار نے تعارف کراتے ہوئے کہا: یہ ہیں حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے چھوٹے بھائی مولانا عبدالغفار غزنوی۔ یہ تحصیل چونیاں سے کانگرس کے ٹکٹ پر انتخاب لڑ رہے ہیں، ان کے مقابلے میں میاں افتخار الدین ہیں جو

Marfat.com

چند مہینے قبل پنجاب کانگرس کی صدارت سے استعفا دے کر مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے۔ ان کو مولانا داؤد غزنوی نے بھیجا ہے اور فرمایا ہے کہ تحصیل چونیاں میں لکھوی حضرات کا خاص اثر ہے، اس لیے اس حلقے میں جا کر ان کی مدد کی جائے۔

اس وقت مولانا معین الدین لکھوی مرکز الاسلام میں نہیں تھے، کہیں باہر گئے تھے۔ مولانا عبیداللہ احرار اور خان عبدالعظیم خاں تو تین بجے کی ٹرین سے فیروز پور چلے گئے۔ میرا اور مولانا محی الدین لکھوی کا مولانا عبدالغفار غزنوی اور مولانا عبدالرحیم کوٹلوی کے ساتھ جانے کا پروگرام طے پایا اور ہم نے چند روز اس حلقے کے مختلف مقامات کے چکر لگائے۔ لیکن وہ دور مسلم لیگ کا تھا۔ پورے پنجاب میں کانگرس کے ٹکٹ پر صرف ایک مسلمان کامیاب ہوئے تھے اور وہ تھے حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی۔

تقسیم ملک کے بعد مولانا عبدالغفار غزنوی لائل پور (فیصل آباد) چلے گئے تھے۔ وہاں انھوں نے کوئی کاروبار شروع کر دیا تھا...... ۱۹۴۹ء میں فوت ہوئے۔ وفات کے مہینے اور تاریخ کا علم نہیں ہو سکا۔ غالباً ان کی نرینہ اولاد ایک ہی بیٹے تھے، ان کا نام میرے خیال میں مسعود تھا۔ وہ جرمنی چلے گئے تھے۔ شاید وہاں کسی یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ انگریزی میں ان کی تصانیف بھی تھیں، غالباً فلسفے کے کسی پہلو پر۔۔۔! بڑے لائق اور معقول اہل علم تھے۔ میرے ساتھ ان کے اچھے مراسم تھے۔ لاہور آتے تو مجھے ملنے کی کوشش کرتے۔ ملاقات کے لیے دو تین دفعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ بھی گئے۔ بہت عرصے سے ان کے متعلق کچھ پتا نہیں کہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا دین محمد وفائی

(وفات ۱۱۔اپریل ۱۹۵۰ء)

پہلی صدی ہجری ہی میں پاکستان کے صوبہ سندھ کو برصغیر میں اسلام کے مرکز کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی اور یہاں خالص اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آ گیا تھا۔ پھر مختلف اوقات میں اس خطہ ارض میں مسلمانوں کی متعدد حکومتیں قائم ہوئیں اور ان کے حکمرانوں نے اپنے صاف ستھرے کردار کی وجہ سے بے حد شہرت پائی۔

یہاں علما و صلحا بھی بہت بڑی تعداد میں پیدا ہوئے جن کے علمی اور تحقیقی کارناموں سے بے شمار لوگوں نے استفادہ کیا اور استفادے کا یہ سلسلہ اللہ کے فضل سے اب تک جاری ہے اور ان شاء اللہ جاری رہے گا۔ جو چیز ایک مرتبہ معرض اشاعت میں آ گئی اور کاغذ پر مرتسم ہوگئی، اس کے اثرات کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ باقی رہتے ہیں اور آئندہ نسلیں اپنی قابلیت وفہم کے مطابق اس سے فیض یاب ہوتی رہتی ہیں۔

تاریخ نے کبھی انجماد کا لبادہ نہیں اوڑھا اور یہ کبھی لوگوں کی نظر سے اوجھل نہیں رہی۔ ہر دور میں اس کے آثار نمایاں رہے ہیں اور لوگ ان آثار کی روشنی میں اپنے سفر کی منزلیں طے کرتے رہے ہیں۔ سندھ کے اصحابِ علم اور اربابِ فضیلت کے آثار سے بھی لوگوں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ ان کی تدریس سے مستفید ہوئے، ان کی تصانیف سے اخذِ فیض کیا اور ان کی صالحیت سے اپنا دامن طلب بھرا۔

مولانا وفائی کی شخصیت:

بیسویں صدی کے علمائے سندھ میں مولانا دین محمد وفائی کی شخصیت صفحاتِ تاریخ میں ابھری ہوئی نظر آتی ہے۔ انھوں نے اگرچہ اردو زبان میں بھی تصنیفی خدمات سرانجام دیں، لیکن سندھی زبان میں ان کی علمی سرگرمیوں کا دائرہ دور تک پھیلا ہوا ہے اور بہت سے موضوعات کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ قرآن و حدیث، فقہ و کلام، تاریخ و رجال، صحافت اور سیاست، درس و تدریس ہر میدانِ عمل میں وہ سرگرم رہے اور ان کی قابلیت کے جوہر ان کے عہد کے چھوٹے بڑے ہر ذی شعور نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ لیکن ہمارے سکہ بند علما میں سے سندھ یا پنجاب کے کسی عالم نے ان کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔

مستقل کتاب کی ترتیب:

۱۹۹۲ء میں ان کی وفات کو بیالیس برس ہو گئے تھے۔ اس موقع پر ممتاز مصنف اور نامور محقق ڈاکٹر

Marfat.com

ابوسلمان شاہ جہان پوری نے ''مولانا دین محمد وفائی'' کے نام سے مستقل کتاب مرتب کی جو ۳۲۴ صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہ کتاب مولانا دین محمد وفائی سے متعلق مختلف اصحاب علم کے مضامین کا پُراز معلومات مجموعہ ہے۔ وہ حضرات ہیں پیر علی محمد راشدی، مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی، پیر حسام الدین راشدی، مولانا غلام محمد گرامی، مولانا اللہ ورایہ بروہی، مولانا محمد نور مرشد کی، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، پروفیسر رحمت فرخ آبادی، مولانا وفائی کے فرزند گرامی جناب علی نواز وفائی، خود ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری اور دیگر متعدد حضرات۔ فاضل مرتب ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری کی اس کتاب میں مولانا وفائی کے بارے میں چودہ مضامین ہیں۔ بعض مضامین اردو میں ہیں اور بعض کا سندھی زبان سے اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ خود ڈاکٹر صاحب نے بھی چند سندھی مضامین کو اردو میں منتقل کیا ہے۔

حلیہ اور ذہانت:

مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی اپنے مضمون میں مولانا دین محمد وفائی کے بارے میں فرماتے ہیں:

''جن لوگوں نے مولانا وفائی کو دیکھا ہے، ان سے ملے ہیں اور باتیں کی ہیں اور ان کی تحریروں کا مطالعہ کیا ہے، انھیں اندازہ ہوگا کہ مولانا کیسے خوش شکل، خوش لباس، خوش گفتار اور مہذب انسان اور کتنے بڑے عالم اور کیسے فاضل شخص تھے، البتہ جن لوگوں نے مولانا کو نہیں دیکھا، انھیں سندھ کے بڑے ادیب اور مورخ سید حسام الدین راشدی کے بیان سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ شکل و صورت میں کیسے اور کتنے بڑے ادیب اور کن خوبیوں کی حامل شخصیت تھے۔''

راشدی مرحوم نے لکھا ہے:

''مہندی لگی ہوئی سرخ ڈاڑھی، روشن آنکھیں، کشادہ پیشانی، دل کش ناک نقشہ، بیضوی چہرہ، نہ زیادہ لمبا نہ بالکل گول، کھلتا ہوا گندمی رنگ، متوسط قد، مضبوط کاٹھی، سادہ لباس۔ سندھ کے اکابر اہل علم میں سے تھے۔ فارسی اور اردو پر عبور تھا۔ سندھی ان کی مادری زبان تھی اور اس پر ان کی مہارت مسلم تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی یہ قلم ہاتھ میں لیا تو کتنے ہی اخبار نکالے، کتنے ہی رسالے لکھے۔ سندھ میں تاریخ کے امام تھے۔ حافظہ آخر وقت تک غضب کا تھا۔ سندھ کی تاریخ پر عبور تھا اور مشاہیر کے سوانح حیات اور ان کی ولادت اور وفات کی تاریخیں تک زبانی یاد تھیں۔'' [1]

اہل حدیث کے علم بردار:

پیر حسام الدین راشدی نے مولانا دین محمد وفائی مرحوم کے جو خصائص و امتیازات بیان کیے ہیں، ان

[1] مولانا دین محمد وفائی صفحہ ۱۰۳۔

Marfat.com

میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ صوبہ سندھ میں ''اہل حدیث کے علم بردار تھے۔'' ان کے الفاظ یہ ہیں:

''حضرت مولانا دین محمد وفائی تاریخ سندھ کے امام تھے۔ سندھ کی تاریخ اور مشاہیر سندھ کے حالاتِ زندگی سے لے کر ان کی تواریخ ولادت و وفات تک انھیں از بر تھیں۔ وہ سندھ میں اہل حدیث مکتبِ فکر کے سربر آوردہ عالم اور اس مسلک کے علم بردار تھے۔'' ❶

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے مولانا دین محمد وفائی کے سیاسی اور مذہبی نقطہ نظر کے بارے میں وضاحت سے لکھا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

''وہ ذوقِ تمسک بالکتاب والسنہ سے سرشار تھے۔ توحید خالص کے والہ وشیدا تھے۔ شرک و بدعت کے سخت مخالف تھے اور فکر وعمل کے ہر دائرے میں صاحبِ مقام رسالت و خاتمِ سلسلۂ نبوت (ﷺ) کی سیرت و سنت اور آپ ﷺ کے اولیں فیض یافتگان و جماعتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حیاتِ طیبہ کو اپنے لیے معیار و اسوہ سمجھتے تھے۔ یہ چیز ان کے عقائد و اعمال کے اہم خصائص سے تعلق رکھتی ہے۔ عام لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اہل حدیث تھے۔''

''پیر حسام الدین راشدی مرحوم اور دوسرے واقفانِ حال نے ان کے مسلک کے لیے انہی عام لفظوں کا سہارا لیا ہے۔ پیر صاحب مرحوم نے سندھ میں انھیں اہل حدیث کا امام لکھا ہے۔ بلاشبہ وہ عقیدہ وعمل کے لحاظ سے اہل حدیث تھے۔'' ❷

اب آیے مولانا دین محمد وفائی کی ابتدائی زندگی اور ان کی تعلیم وتربیت سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو انھوں نے خود بیان کی ہیں اور مرتب کتاب ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے یہ معلومات صفحہ ۲۱ سے صفحہ ۲۶ تک درج کی ہیں۔ مولانا وفائی کا تعلق بھٹی برادری سے تھا اور وہ کئی پشتوں سے علم وعمل سے وابستہ تھے۔

خاندان اور تحصیل علم:

دین محمد وفائی ولد خلیفہ حکیم گل محمد ولد حکیم مولوی میر محمد ولد حکیم محمد صالح قوم بھٹی۔ ۲۷۔ رمضان المبارک ۱۳۱۱ھ (۱۸۹۴ء) کو موضع کھھی عرف نبی آباد میں پیدا ہوئے جو تعلقہ گڑھی یاسین ضلع سکھر (صوبہ سندھ) کا ایک قصبہ ہے۔

فارسی کی ابتدائی کتابیں ''پند نامہ عطار'' تک اپنے والد مرحوم سے پڑھیں۔ بہ مشکل نو برس کی عمر تھی کہ شفقتِ پدری کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور حالت یتیمی میں اپنی والدہ کی آغوشِ شفقت میں پرورش پائی۔ پھر

❶ مولانا دین محمد وفائی صفحہ ۸۶۔ ❷ مولانا دین محمد وفائی صفحہ ۲۱۴۔

Marfat.com

فارسی کا سارا نصاب جو اس وقت پڑھایا جاتا تھا، سکندر نامہ نظامی اور بہارِ دانش و انشا خلیفہ وغیرہ اپنے عزیز میاں حاجی محمد اسلم مرحوم سے مکمل کیا۔ ۱۳۲۴ھ (۱۹۰۶ء) میں عربی پڑھنا شروع کی، لیکن بعض وجوہ سے اس میں رکاوٹ پیدا ہوگئی۔ پھر آخر ۱۳۲۵ھ (۱۹۰۸ء) سے لے کر ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۲ء) تک پانچ سالوں میں گوٹھ سونی جتوئی تعلقہ لاڑکانہ میں عربی کی تمام درسی کتب منطق کبریٰ کے رسالوں ملا جلال میر زاہد سمیت ختم کر کے تحصیلِ علم سے فراغت پائی۔ یہ کتابیں مولانا ابوالفیض غلام عمر جتوئی سے پڑھیں۔ اس وقت ان کی عمر انیس برس کی تھی۔ اسی دوران میں والدہ محترمہ نے سکھر کے رشتے داروں میں ان کی شادی کر دی۔ لیکن صرف ایک سال بعد ان کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔

درس و تدریس:

تحصیلِ علم کے بعد استاذِ گرامی کے حکم سے ان ہی کے مدرسے میں درس و تدریس میں مصروف ہوگئے۔ دو سال یہ خدمت انجام دی۔ اس اثنا میں انھیں استاذ الاساتذہ حضرت حاجی حسن اللہ پاٹائی کی صحبت سے بہت فیض حاصل ہوا۔ فقہی تحقیقات کا بھی ذوق پیدا ہوا۔ علاوہ ازیں ان سے دلائل الخیرات، حزب البحر اور قصیدہ کے اجازت نامے عطا ہوئے۔ حاجی حسن اللہ کو دلائل الخیرات کی اجازت شیخ عبدالحق مہاجر مکی سے تھی اور حزب البحر کی اجازت کا سلسلہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے وابستہ تھا۔ (یہ سطور مولانا وفائی نے یکم رجب ۱۳۵۳ھ (۱۱۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء) کو تحریر فرمائی تھیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"ان وظائف میں حزب البحر کا ورد آج تک صبح و شام رہتا ہے۔"

۱۳۳۲ھ (۱۹۱۴ء) میں رانی پور کے جیلانی پیر صاحبان کے صاحب زادوں کی تعلیم کے لیے مولانا وفائی کا تقرر ہوا۔ لیکن یہ سلسلہ دو سال چلا، ۱۹۱۶ء میں اس سے سبک دوش ہوگئے۔ انہی دنوں سکھر میں دوسری شادی ہوئی، جس سے اللہ تعالیٰ نے اولاد عطا فرمائی۔

رانی پور سے آمد کے فوراً بعد ٹلاہ شریف تعلقہ "لیدریا" میں پیر سید امام الدین راشدی کے فرزند کی تعلیم کے لیے دعوت آئی اور یہ وہاں تشریف لے گئے۔ پیر صاحب کی صحبت ان کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتی تھی۔ اسی زمانے میں انھیں حضرت پیر سید رشد اللہ صاحب العلم (جھنڈا والے) سے بار بار شرفِ ملاقات کے مواقع حاصل ہوتے رہے، جو ان کے لیے بے حساب روحانی فیوض کے حصول کا موجب ثابت ہوئے۔ اس ضمن میں خود مولانا وفائی کے الفاظ ہیں:

"جن کے فیض صحبت اور انوارِ اقدس سے خاک سار کی امیدوں کا دامن مالا مال ہوتا رہا۔ الحمد لله على ذلك"

Marfat.com

سید رشد اللہ راشدی کی صحبت کے اثرات:

سید رشد اللہ صاحب راشدی ہمارے ماضی قریب کے دو مشہور سندھی عالموں سید محبّ اللہ شاہ راشدی اور سید بدیع الدین راشدی کے دادا تھے، وہ اپنے عہد کے نہایت صالح اور صاحبِ تقویٰ بزرگ تھے اور ہر معاملے میں قرآن وحدیث پر عامل تھے۔ معلوم ہوتا ہے مولانا دین محمد وفائی نے انھی کی صحبت سے اثر پذیر ہو کر قرآن وحدیث کے احکام کو مرکزِ عمل ٹھہرانے کا عزم کیا اور پھر اپنے انداز سے اس کی تبلیغ کرتے رہے۔

میدان سیاست میں:

واقعات کی رفتار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا درس و تدریس کا سلسلہ یہیں ختم ہو گیا اور اس کے بعد حالات نے ایسی کروٹ لی کہ وہ صحافت، تصنیف و تالیف اور سیاست کے میدان میں آ گئے اور یہ اس دور کے ضروری کام تھے جو انھوں نے شروع کیے۔ آئندہ سطور میں ان کی اس سہ گونہ تگ و تاز کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۹۱۸ء میں یورپ کی پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی اور اس کے معاً بعد ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت کا آغاز ہوا تو مولانا دین محمد وفائی نے اس میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا اور اس کی وجہ سے ٹلاہ شریف کے پیر سید امام الدین راشدی کے فرزند کی خدمتِ تدریس سے علیحدگی اختیار کی۔ اسی زمانے میں انگریزی حکومت کے ایما پر فیض الکریم نامی ایک مرزائی نے ترکی خلافت کے باغی شریف حسین کے دفاع اور خلافت ترکیہ کے خلاف ''تحقیق الخلافہ'' کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی کرایا گیا۔ یہ رسالہ ہزاروں کی تعداد میں انگریزی حکومت کی طرف سے کراچی کے ڈیلی گزٹ پریس میں چھپوایا گیا۔ اس رسالے پر شکار پور کے دو بھائیوں (نبی بخش اسسٹنٹ کمشنر اور عبدالقادر ڈپٹی کلکٹر لاڑکانہ) نے مکر و فریب سے کام لے کر بعض علما اور سجادہ نشینوں کے دستخط کرا لیے۔ اس رسالے کی اشاعت کا مقصد یہ تھا کہ ترکی کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کی ہمدردیاں ختم کی جائیں اور شریف مکہ کا (جو ترکی خلافت کا باغی اور انگریزوں کا طرف دار تھا) دفاع کیا جائے۔

مولانا دین محمد وفائی کے دل میں اس رسالے کی تردید کا خیال پیدا ہوا تو انھوں نے شیخ عبدالحق مالک اخبار ''الحق'' سکھر کی رفاقت میں اس کے خلاف تحریک شروع کی اور مولانا تاج محمود امروٹی کے پاس کچھ عرصہ امروٹ شریف میں قیام کیا اور ''اظہار الکرامہ'' کے نام سے ''تحقیق الخلافہ'' کے رد میں رسالہ لکھا، جسے مارچ ۱۹۲۰ء میں لاڑکانہ خلافت کانفرنس کے موقع پر چھاپ کر تقسیم کیا گیا۔ اس کانفرنس میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی اور مولانا شوکت علی نے بھی شرکت کی تھی۔ اس کے بعد مولانا دین محمد وفائی کو جمعیت علمائے ہند کی صوبائی شاخ صوبہ سندھ کا ناظم مقرر کر لیا گیا، جس کا دفتر کراچی میں تھا، اس لیے

Marfat.com

مولانا وفائی کا کراچی میں قیام ضروری ہو گیا۔

اس طرح مولانا دین محمد وفائی سیاست کے میدان میں اترے۔

سیاسی نقطۂ نظر:

ملک کی سیاسیات میں ان کا نقطہ نظر تھا تحریک خلافت کی حمایت، جمعیت علمائے ہند سے انسلاک اور ملک کی آزادی کے لیے کانگریس سے وابستگی۔۔۔ وہ خود فرماتے ہیں:

''۱۹۱۹ء سے جب سے سیاسی سوجھ بوجھ پیدا ہوئی ہے، اب تک میرا سیاسی مسلک یہی رہا ہے، یعنی وطن کی آزادی کے لیے جدوجہد۔ تحریک خلافت کے زمانے میں مجھ میں سیاسی شعور پیدا ہوا۔ یہ حضرت مولانا تاج محمود امروٹی اور حضرت مولانا ابوتراب پیر سید رشد اللہ شاہ راشدی صاحب العلم الرابع کا فیضانِ صحبت تھا، جن کا صرف ایک ہی اصول تھا اور وہ تھا اسلام کی سربلندی، مسلمان قوم کا تحفظ، ملک کی آزادی اور خودمختاری کا حصول۔ اس سلسلے میں تین سال تک جمعیت علمائے ہند کی صوبہ سندھ کی شاخ کے سیکرٹری کے عہدے پر فائز رہا اور خلافت تحریک میں اپنی استعداد کے مطابق اپنے رفیقوں اور دوستوں کے ساتھ مل کر خدمت انجام دیتا رہا۔ تحریکِ خلافت کا تعلق چوں کہ ہندوستان سے باہر ترکی خلافت سے تھا، جب ترکوں نے خود ہی خلافت کا منصب ختم کر دیا تو یہ تحریک ہندوستان میں بھی رفتہ رفتہ ختم ہو گئی مگر جو مسلمان آزادی کے نشے سے سرشار تھے، وہ اس کے لیے جدوجہد میں مصروف رہے۔''

اس سے آگے لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں شدھی، سنگھٹن اور اس کے جواب میں تبلیغ و تنظیم کی تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئیں، لیکن ملک کی آزادی کے لیے بھی ہندو اور مسلمان مل کر کام کرتے اور تحریک کو آگے بڑھاتے رہے۔ میں نے شدھی تحریک کے انسداد، مسلمانوں میں تبلیغ اور ملک کی آزادی کی تحریک میں مقدور بھر حصہ لیا۔ میں نے سیاست کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے ہیں اور حالات کی آزمائش اور قومی تحریکوں کی بھٹی سے پک کر نکلا ہوں۔'' [1]

اس سے آگے تحریر فرماتے ہیں:

''میں نے ۱۹۳۰ء میں کانگرس کی طرف سے نمک سازی کے قانون کے خلاف جاری کردہ تحریک میں بھی حصہ لیا۔ چوں کہ یہ تحریک انگریزی حکومت کے خلاف تھی اس لیے جمعیت علمائے ہند، اس کے پیرو

[1] مولانا دین محمد وفائی، صفحہ ۲۱۶.

Marfat.com

کاروں، صوبہ سرحد کے پٹھانوں، خدائی خدمت گاروں اور بمبئی، یوپی، بہار وغیرہ کے مسلمانوں نے بھی اس تحریک کو پروان چڑھانے میں زبردست کوششیں کیں اور اسے کامیاب بنایا۔ [1]

بہرحال آزادیٔ وطن کے سلسلے میں مولانا دین محمد وفائی کا سیاسی نقطۂ نظر وہی تھا جو اس دور کے جلیل القدر علمائے اہل حدیث کا تھا جن میں مولانا ابوالکلام آزاد، جمعیت علمائے ہند کے بانی ومحرک مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا عبدالقادر قصوری، ان کے صاحب زادے مولانا محی الدین احمد قصوری، مولانا محمد علی ایم اے کینٹب قصوری، مولانا عبداللہ الباقی، مولانا عبداللہ الکافی، مولانا محمد اکرم خاں، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، قاضی عبدالرحیم، مولانا ابراہیم آروی اور دیگر حضرات شامل تھے۔ (رحمہم اللہ)

تصانیف وتراجم:

مولانا دین محمد وفائی اپنے عہد کیعالی مرتبت اور مصنف ومترجم بھی تھے۔ ان کی تصانیف اور تراجم کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ تاریخ محمد مصطفیٰ: اس کتاب میں نبی ﷺ کی سیرت اور آپ ﷺ کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

۲۔ صدیق اکبر: خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حالات میں۔

۳۔ فاروق اعظم: خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے واقعات وحالات پر مشتمل۔

۴۔ سیرت عثمان: خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے حالات میں۔

۵۔ حیدرِ کرار: خلیفہ رابع حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حالات میں۔

۶۔ خاتون جنت: اس میں جگر گوشۂ رسول ﷺ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے واقعات حیات بیان ہیں۔

۷۔ سوانح شیخ جیلانی: اس کتاب میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے حالات درج کیے گئے ہیں۔

۸۔ نومسلم ہندورانیاں: اس کے مندرجات کا علم اس کے نام سے ہو جاتا ہے۔

۹۔ توحید اسلام ترجمہ تقویۃ الایمان: مولانا اسماعیل شہید دہلوی کی مشہور کتاب تقویۃ الایمان کا سندھی ترجمہ۔

۱۰۔ نمازِ سندھی (مترجم)

۱۱۔ اعتقادِ صحیح: اس میں مذہبِ اہل حدیث کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔

۱۲۔ مقصد زندگی: علم نفس کا فلسفہ

[1] مولانا دین محمد وفائی، صفحہ ۲۱۶۔

Marfat.com

۱۳۔ یادِ جاناں: جناب جان محمد جونیجو بیرسٹر کی حیات و خدمات۔

۱۴۔ راحت الروح: تذکرہ مخدوم نوح ہالائی۔ (غیر مطبوعہ)

۱۵۔ الختم علی فم الخصم: یہ کتاب مرزائیت کے رد میں ہے۔

۱۶۔ لاجواب تحریر قرآنی: قرآن مجید کے بارے میں۔

۱۷۔ قرآنی صداقت: اس کا مطلب نام سے ظاہر ہے۔

۱۸۔ ہندو دھرم اور قربانی: یہ کتاب آریہ مذہب اور ہندوؤں کے رد میں ہے۔

۱۹۔ الہام الباری ترجمہ تجرید صحیح البخاری: صحیح بخاری کا سندھی ترجمہ جو پانچ جلدوں میں ہے۔

۲۰۔ ترجمہ فتوح الغیب: یہ کتاب نامکمل ہے۔

۲۱۔ رسوم موتیٰ: فقہ و عقائد کے موضوع پر۔ غیر مطبوعہ

۲۲۔ علاج اسپ: گھوڑوں کی بیماریاں اور ان کا علاج۔

۲۳۔ تذکرہ مشاہیر سندھ: مطلب نام سے ظاہر ہے۔ یہ تذکرہ پہلے چار جلدوں میں تھا۔ بعد ازاں تین جلدوں میں مکمل شائع کیا گیا۔

۲۴۔ اظہار الکرامہ فی مسئلۃ الخلافۃ والامامہ: اسلامی ریاست کے بارے میں۔

۲۵۔ اذکار حسین: شیعہ کے رد میں۔

۲۶۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے بارے میں دو کتابیں تصنیف کیں۔

تصانیف کی یہ فہرست مولانا دین محمد وفائی نے خود ہی یکم رجب ۱۳۵۳ھ (۱۱۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء) کو مرتب کی تھی۔

صحافت:

اخبار نویسی سے انھیں طالب علمی کے زمانے ہی سے دلچسپی تھی، لیکن اس دلچسپی کو عملی شکل دینے کا سبب مولوی عبداللہ میر پوری اور شیخ عبدالعزیز محمد سلیمان مالک اخبار ''الحق'' (سکھر) ہوئے، جن کی مدد سے مضمون نگاری کی مشق شروع کی۔

پھر رانی پور کے زمانۂ قیام میں قادیانیوں کے رد میں ''صحیفہ قادریہ'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا اور ٹلاہ شریف کے دورِ قیام میں پیر سید عبدالغفار شاہ راشدی کی سرپرستی میں ''الکاشف'' کے نام سے ایک رسالے کا اجراعمل میں لایا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں ''الوحید'' کے دورِ آغاز ہی سے انھیں معاون مدیر مقرر کرلیا گیا تھا اور یہ ''الوحید'' کے دفتر میں آ گئے تھے۔

۱۹۲۳ء میں انھوں نے کراچی سے اپنا ذاتی اخبار ماہنامہ ''توحید'' جاری کیا، جس کی اشاعت جلد ہی

Marfat.com

بہت بڑھ گئی تھی۔ ۱۹۲۷ء میں مرحوم سید حزب اللہ شاہ عرف جھنڈا شاہ شہید کی زیر سرپرستی سکھر سے ہفت روزہ ''الحزب'' جاری ہوا تو اس کی ادارت ان کے سپرد کی گئی، لیکن کچھ عرصے کے بعد انھیں ''الوحید'' میں بلا لیا گیا اور پھر کئی سال یہ ''الوحید'' میں مدیر کی حیثیت سے خدمت سرانجام دیتے رہے۔

حج بیت اللہ:

۱۹۳۳ء میں مولانا دین محمد وفائی نے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ اس سلسلے میں خود ان کے الفاظ کا مطالعہ کیجیے: ''اس وقت عمر کی چار دھائیاں گزر چکی ہیں۔ سفید بال بڑھاپے کی نشانی ظاہر ہو چکے ہیں، مجھ جیسے کمزور اور مفلس کو ۱۹۳۳ء میں اللہ تعالیٰ نے حج بیت اللہ، مسجد نبوی اور روضہ رسول اللہ ﷺ کی زیارت کا شرف عطا فرمایا۔ یہ سفر انتہائی امیرانہ انداز میں ہوا، جسے میں اللہ تعالیٰ کی ان نوازشات کا کرشمہ سمجھتا ہوں جو اس نے مجھ پر فرمائی ہیں۔''

اوصاف گوناگوں:

مولانا دین محمد وفائی اپنے زمانے میں نہ صرف صوبہ سندھ بلکہ پورے برصغیر کے اعاظم رجال میں سے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو گوناگوں اوصاف سے بہرہ مند فرمایا تھا اور وہ جامع الحیثیات شخصیت کے مالک تھے۔ تفسیر میں، حدیث میں، فقہ و اصول میں، شعر و شاعری میں، درس و تدریس میں، تقویٰ و صالحیت میں، سیاسی بصیرت میں، تذکرہ و تاریخ میں، مناظرہ و خطابت میں، اخلاق و کردار میں وہ خاص امتیاز رکھتے تھے۔ علم و کمال اور ادب و انشا میں مہارت کی بنا پر انھیں سندھ کے علامہ شبلی کہا جاتا تھا۔

لاہور میں آمد اور اہل علم سے ملاقات:

ایک مرتبہ وہ مسلم لیگ کے جلسہ الہ آباد میں جاتے ہوئے لاہور بھی تشریف لائے تھے۔ لاہور میں انھوں نے مولانا سید محمد داؤد غزنوی سے ملاقات کی اور ان کے ساتھ امرتسر گئے۔ وہاں مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا اسماعیل غزنوی سے ملے۔ مولانا اسماعیل غزنوی نے ان کو چند کتابیں بھی عنایت کیں۔ لاہور میں مولانا احمد علی اور شیخ محمد اشرف (تاجر کتب) مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ اس کا ذکر انھوں نے دلچسپ انداز میں خاصی تفصیل سے کیا ہے۔ وہ اہل علم سے قلبی تعلق رکھتے تھے اور ان سے مل کر خوش ہوتے تھے۔

ہم نے انھیں نہیں دیکھا، لیکن شنید ہے کہ وہ فراخ حوصلہ، منکسر و متواضع، مشرقی اخلاق کا اعلیٰ نمونہ، ملنسار اور حلیم الطبع تھے۔ اس کے ساتھ ہی نہایت خوددار اور غیور بھی تھے۔

وفات:

مولانا دین محمد وفائی کی عام صحت بہت اچھی تھی اور وہ علمی اور تحریری کام خوب صورت انداز میں

Marfat.com

باقاعدگی سے کر رہے تھے کہ اچانک ان پر بیماری کا حملہ ہوا۔ حکومتِ سندھ نے سرکاری سکولوں کے سندھی نصاب پر نظر ثانی کے لیے ایک کمیٹی بنائی تھی، جس کے وہ رکن تھے۔ اسی سلسلے میں حیدر آباد گئے، لیکن وہاں پہنچتے ہی ڈبل نمونیہ کی زد میں آ گئے اور کمیٹی کے کام میں کوئی حصہ نہ لے سکے۔

اس بیماری سے انھیں نجات تو مل گئی۔ لیکن کم زوری بہت بڑھ گئی اور وہ بیمار رہنے لگے۔ ۱۹۵۰ء کے شروع میں وہ پھر بیمار پڑ گئے اور اب حالت یہ ہو گئی کہ اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ ۲۲۔ جمادی الاخریٰ ۱۳۶۹ھ (۱۰۔ اپریل ۱۹۵۰ء) کی شب کو سکھر میں وفات پا گئے۔ دوسرے دن کلھوڑا خاندان کے بانی آدم شاہ کلھوڑا کے قبرستان میں جو ''آدم شاہ کی ٹکڑی'' کے نام سے مشہور ہے، دفن کر دیے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ان کی اولاد میں جناب علی نواز وفائی ان کے لائق بیٹے ہیں اور کتاب ''مولانا دین محمد وفائی'' پر انھوں نے مقدمہ تحریر کیا ہے جو زبان و اسلوب کے اعتبار سے بہت اچھا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۹۲ء میں چھپی اور میرا یہ مضمون جو مولانا دین محمد وفائی کے مختصر حالات پر مشتمل ہے، اس سے اکیس سال بعد ۲۵۔ جون ۲۰۱۳ء کو ضبطِ تحریر میں آیا۔

اب معلوم نہیں جناب علی نواز وفائی کس حال میں ہیں اور کہاں ہیں۔

❀❀❀❀

Marfat.com

حافظ محمد سلیمان بھوجیانی رحمانی

(وفات ۲۱۔جنوری ۱۹۵۳ء)

اس کتاب میں متعدد بھوجیانی علما کا تذکرہ کیا گیا ہے۔حافظ محمد سلیمان کا شمار بھی اسی خطے کے اصحابِ علم میں ہوتا تھا۔وہ حضرت مولانا فیض اللہ خاں بھوجیانی کے بھائی میاں ولی اللہ بھوجیانی کے فرزند گرامی تھے۔ ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم اپنے خاندانی مدرسہ فیض الاسلام میں مولانا عبدالرحمٰن، مولانا عبداللہ اور مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے حاصل کی۔پھر دارالعلوم تقویۃ الاسلام (المعروف مدرسہ غزنویہ) امرتسر میں چلے گئے۔مولانا عبدالعظیم انصاری بھی اس وقت ان کے ساتھ تھے اور ان کے ہم سبق تھے۔اس زمانے میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی انگریزی حکومت کے خلاف سیاسی معاملے میں جیل میں قید تھے اور انھوں نے جیل سے مولانا محمد علی لکھوی سے درخواست کی تھی کہ وہ ان کی قید کے زمانے میں چینیاں والی مسجد لاہور میں فریضہ خطابت انجام دیں۔

مولانا محمد علی لکھوی نے ان کی یہ درخواست اس شرط پر منظور فرمائی تھی کہ مسجد میں کم سے کم دس طالب علم ہونے چاہییں جو ان سے کتب حدیث کا درس لیں، چنانچہ مولانا غزنوی نے دارالعلوم تقویۃ الاسلام (مدرسہ غزنویہ) امرتسر کی مجلس انتظامیہ کو جیل سے پیغام بھجوایا کہ مدرسے سے دس طالب علم مسجد چینیاں والی بھیجے جائیں جو مولانا محمد علی لکھوی سے کتب حدیث کا درس لیں۔اس پیغام کے بعد آٹھ طالب علم وہاں بھیجے گئے، دو کا انتظام لاہور سے ہوگیا تھا، وہ تھے حافظ محمد یوسف گکھڑوی اور مولوی عبدالعزیز کاتب۔امرتسر سے جو طلباء مسجد چینیاں والی میں بھیجے گئے، ان میں حافظ محمد سلیمان بھوجیانی اور عبدالعظیم انصاری شامل تھے۔یہ ۱۹۳۱ء کی بات ہے۔

حافظ محمد سلیمان بھوجیانی اور مولانا عبدالعظیم انصاری نے اپنے ساتھیوں سمیت مولانا محمد علی لکھوی سے مسجد چینیاں والی میں کتبِ حدیث کی تعلیم شروع کی۔مولانا محمد علی بہت بڑے علمی خاندان کے جلیل القدر عالم اور ممتاز رکن تھے۔حافظ محمد سلیمان بھوجیانی اور ان کے رفقا نے ان سے ۱۹۳۳ء میں سندِ حدیث لی۔

اس کے بعد حافظ محمد سلیمان بھوجیانی مزید تحصیل علم کے لیے دارالحدیث رحمانیہ دہلی تشریف لے گئے اور وہاں کے جید اساتذہ کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیے۔دارالحدیث رحمانیہ سے فراغت پائی تو ضلع

Marfat.com

قصور کے ایک گاؤں بھوئے آصل میں اقامت گزیں ہوئے۔ یہاں انھوں نے خطابت کا سلسلہ شروع کیا اور اس کے علاوہ مدرسہ فیض الاسلام کے نام سے مدرسہ بھی جاری کیا۔ اس مدرسے میں درس نظامی کے ساتھ ساتھ فارسی پڑھانے کا بھی انتظام تھا اور فارسی فاضل کی کلاس بھی جاری کی گئی تھی۔ اس سے سکول ٹیچروں کو بہت فائدہ پہنچا۔

حافظ صاحب اپنے علاقے کے مشہور خطیب اور تجربہ کار مدرس تھے۔ شریف النفس اور حلیم الطبع۔ وہ چوں کہ قیام پاکستان سے بہت پہلے سے یہاں آباد تھے، اس لیے اپنے ان عزیزوں کے لیے وہ بڑا سہارا ثابت ہوئے جو ترک وطن کرکے بے حد تکلیفوں کے ساتھ یہاں پہنچے تھے۔ ان میں مولانا عبداللہ شہید بھوجیانی کے بچے اور بعض دیگر لوگ شامل تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے پناہ گزینوں کی آبادکاری میں انھوں نے بھاگ دوڑ کی۔ لوگوں کی مالی امداد کی اور ان کی ضروریات کی تکمیل کے لیے کوشاں ہوئے۔ وہ نہایت اذیت ناک دور تھا۔ بستے گھروں سے آرام کی زندگی بسر کرتے ہوئے لاکھوں کی تعداد میں لوگ یہاں آئے تھے۔ اس نواح کے حالات و معاملات کا انھیں کوئی علم نہ تھا۔ اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جن کے پاس نہ کوئی پیسا تھا اور نہ کھانے پینے کی کوئی چیز۔ وہ امداد کے محتاج اور تعاون کے مستحق تھے۔ جو شخص کسی انداز میں بھی ان کی طرف دستِ تعاون بڑھاتا، اسے بہت بڑا محسن سمجھا جاتا تھا اور واقعی وہ محسن ہوتا تھا۔ حافظ محمد سلیمان بھوجیانی نے اپنی استطاعت کے مطابق ان لوگوں کی امداد کی، جس کی وجہ سے وہ لوگ بھی ان کے شکرگزار ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بھی وہ مستحق اجر و ثواب قرار پائے۔

جماعتی اعتبار سے بھی انھوں نے بہت کام کیا۔ ۲۴۔ جولائی ۱۹۴۸ء کو مرکزی جمعیت اہل حدیث کے نام سے جماعت کی تنظیم کا عمل شروع ہوا تو حافظ صاحب نے مختلف مقامات میں ذیلی جمعیتوں کے قیام کے لیے بڑی بھاگ دوڑ کی۔ وہ متحرک اور فعّال شخصیت تھے۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی اور مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کا وہ بے حد احترام کرتے تھے اور علماء میں انھی تینوں بزرگوں کا مرکزی جمعیت کے دفتری معاملات سے قریبی تعلق تھا، اس لیے ان سے حافظ صاحب کا رابطہ رہتا تھا اور وہ ان کی ہدایت کے مطابق کام کرتے تھے۔ میں اس وقت مرکزی جمعیت کا آفس سیکرٹری تھا، اس لیے مجھے تنظیم جماعت سے متعلق ان کی تگ و دو کا علم ہے۔

۱۹۵۰ء میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی تحصیل چونیاں سے پنجاب اسمبلی کے امیدوار تھے۔ یوں تو تحصیل چونیاں کے ہر فرد جماعت نے مولانا کی کامیابی کے لیے بھرپور کوشش کی تھی، لیکن حافظ محمد سلیمان بھوجیانی نے تو اپنے آپ کو مولانا کے لیے کہنا چاہیے کہ وقف کر دیا تھا۔ وہ عوامی خطیب تھے اور اس علاقے کے لوگوں

Marfat.com

سے تعلقات رکھتے تھے، اس لیے ہر جگہ پہنچتے اور تقریر کرتے۔

وہ کریم النفس، باہمت، اہل علم کے قدردان اور باعمل عالم تھے۔ اپنے اسلاف کا بہترین نمونہ اور خاندان کی خوش اطوار نشانی۔ اس سراپا خلوص اور مرقع متانت عالم دین نے ۲۱۔ جنوری ۱۹۵۳ء (۶۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۲ھ) کو وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا عبدالعظیم انصاری کو ان کے شاگردوں کی جو تعداد معلوم ہو سکی، وہ دس تک پہنچتی ہے۔ ''تذکرہ علمائے بھوجیاں'' کے مطابق ان کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ مولانا محمد رفیق مدنی فیصل آباد۔
۲۔ مولانا محمد ابراہیم۔ موضع بھیڈیاں۔ قصور۔
۳۔ حافظ ظفر اللہ ساکن بنگا بلوچاں۔
۴۔ حافظ ولی محمد او۔ ٹی ٹیچر سکول کوٹ رادھا کشن۔
۵۔ ماسٹر محمد زکریا گوہڑوی۔
۶۔ مولوی احمد الدین کمیشن ایجنٹ پتوکی۔
۷۔ ماسٹر منظور احمد۔
۸۔ عبداللہ شاکر قصور۔
۹۔ حافظ بشیر احمد بھوجیانی بن مولانا عبدالرحمٰن شہید بھوجیانی۔
۱۰۔ مولانا عبدالرشید بھوجیانی بن مولانا عبداللہ شہید بھوجیانی۔

ان حضرات میں سے اب دو تین ہی شاید زندہ ہوں گے۔

(یہ سطور ۸۔ مئی ۲۰۱۴ء کو لکھی گئیں۔)

Marfat.com

مولانا عبدالحکیم بڈھیمالوی

(وفات دسمبر ۱۹۶۱ء)

متحدہ پنجاب کے ضلع فیروز پور کے بڑے چھوٹے مختلف مقامات میں بے شمار اہل حدیث علمائے کرام پیدا ہوئے جنھوں نے درس وتدریس اور وعظ وخطابت کے میدان میں بے پناہ خدمات سرانجام دیں۔ ان مقامات میں ایک چھوٹی سی بستی کا نام ''بڈھیمال'' تھا۔ اس بستی کے اصحاب علم کا تذکرہ میں نے جن کتابوں میں کیا ہے، وہ کتابیں ہیں: (۱) قافلہ حدیث (۲) دبستانِ حدیث (۳) گلستانِ حدیث۔ (۴) بزم ارجمنداں (۵) تذکرہ صوفی محمد عبداللہ (۶) برصغیر میں اہل حدیث کی سرگزشت (۷) چمنستانِ حدیث، زیر نظر کتاب (۸) بوستانِ حدیث اور دیگر کتابیں۔

مجھے نہیں معلوم ان کتابوں میں سے کوئی کتاب بڈھیمال کے کسی شخص نے پڑھی ہے یا نہیں پڑھی اور اگر پڑھی ہے تو وہاں کے کسی عالم دین کا تذکرہ ان کی نظر سے گزرا ہے یا نہیں گزرا۔

وہاں کے ایک اہل علم بزرگ مولانا عبدالحکیم بڈھیمالوی تھے جو صالح فطرت محقق اور صاحب مطالعہ عالم تھے۔ ان کی تاریخ ولادت کا پتا نہیں چلتا اور یہ بھی معلوم نہیں ہوسکا کہ انھوں نے اپنی تعلیم کا آغاز کب کیا اور کس استاذ سے کیا اور کس سے کون کون سی کتابیں پڑھیں۔ اپنے گاؤں بڈھیمال کے کسی استاذ سے استفادہ کیا یا لکھوکے جا کر کسی لکھوی بزرگ کے حضور زانوئے ادب تہ کیے۔ بعض دیگر بڈھیمالوی علما کی طرح مولانا عبدالحکیم کے ابتدائی دور کے اساتذہ کی نشان دہی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی۔ ان کے اخلاف میں سے بعض حضرات کم وبیش ۷۰۔۷۵ سال کی عمر کو پہنچ گئے ہوں گے اور انھوں نے اپنے اس جدّ امجد سے باتیں بھی کی ہوں گی اور ممکن ہے کوئی علمی فیض بھی حاصل کیا ہو، لیکن انھیں کچھ پتا نہیں کہ ان کے اس عالم فاضل بزرگ کی ابتدائی زندگی کیسے بسر ہوئی اور کن اساتذہ عالی قدر سے انھوں نے تحصیل علم کا آغاز کیا اور کس سے کیا پڑھا؟

جن لوگوں کو خود اپنے اسلاف کے متعلق تھوڑی بہت معلومات حاصل نہیں، ان سے کسی دوسرے کے بارے میں کچھ حاصل کرنے کی کیا توقع ہوسکتی ہے۔

بہرکیف مولانا عبدالحکیم بڈھیمالوی کی تحصیل علم کے متعلق جو کچھ معلوم ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے دہلی

Marfat.com

جا کر مولانا عبدالوہاب دہلوی کے حلقہ درس میں شمولیت کی اور ان سے اخذ فیض کیا۔ ظاہر ہے دہلی جانے سے پہلے بھی انھوں نے کسی صاحب سے کچھ پڑھا ہوگا، لیکن جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا، اس کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ دہلی کب گئے اور مولانا عبدالوہاب دہلوی سے انھوں نے کون کون سی کتابیں پڑھیں اور وہاں کتنا عرصہ رہے۔

مولانا عبدالحکیم کا مطالعہ وسیع تھا اور کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں رکھتے تھے۔ وہ اپنی زمین کے خود ہی کاشت کار تھے۔ ان کے پاس اونٹنی تھی، جس سے وہ ہل چلاتے تھے۔ دوپہر کو کام بند کر کے تھوڑی دیر آرام فرماتے تو کوئی کتاب پڑھنا شروع کر دیتے۔ وہ عام مسائل میں امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کے نقطۂ نظر کو زیادہ ترجیح دیتے تھے۔ میں نے پہلی دفعہ امام ابن حزم کی کتاب ''محلّٰی'' کا نام انھی سے سنا اور انھی کے پاس اس کتاب کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔

یہ بھی دیکھا کہ مجلس میں کسی مسئلے کے متعلق کسی کتاب کا حوالہ دینے کی ضرورت پڑتی تو وہ اس کی عربی عبارت نہیں پڑھتے تھے بلکہ کتاب سامنے رکھ کر پنجابی میں اس کا ترجمہ کرتے تھے۔ وہاں کے بعض اور علمائے کرام کو بھی میں نے اسی طرح عربی عبارتوں کے پنجابی میں تراجم کرتے دیکھا۔

بعض مسائل کی تحقیق میں وہ مجتہدانہ نقطۂ نظر رکھتے تھے اور دلچسپ انداز میں اس کا ذکر فرماتے۔ وہ نسوار لینے کے عادی تھے اور ان کا خیال یہ تھا کہ نسوار سے روزہ نہیں ٹوٹتا، اس لیے کہ یہ کھانے پینے کی چیز نہیں ہے، بس ایک عادت ہے جسے غلط بھی قرار دیا جاسکتا ہے اور صحیح بھی، لیکن روزے کے ٹوٹنے یا نہ ٹوٹنے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

غالباً ۱۹۵۵ء کی بات ہے کہ وہ کسی سلسلے میں لاہور تشریف لائے اور دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے ملے۔ میں اس وقت ہفت روزہ ''الاعتصام'' کا ایڈیٹر تھا اور اس اخبار کا دفتر دارالعلوم کی بلڈنگ میں تھا۔ میں انھیں اپنے دفتر میں لے گیا اور ان کی خدمت میں چائے کی پیالی پیش کی۔ بے حد خوش ہوئے، پھر اپنے گھر لے گیا وہ رات میرے پاس رہے۔

تقسیم ملک کے بعد وہ اپنے رشتے داروں کے ساتھ چک ۳۶ ضلع لائل پور میں آبسے تھے۔ انھوں نے دسمبر ۱۹۶۱ء کے پہلے ہفتے میں وفات پائی۔ میں نے ۲۲۔ دسمبر ۱۹۶۱ء کے ''الاعتصام'' میں ''ایک گم نام عالم دین کا انتقال'' کے عنوان سے ان پر مندرجہ ذیل تعزیتی شذرہ لکھا۔ آج سے ۵۴ سال قبل کی یہ تحریر آپ بھی پڑھ لیجیے۔ ممکن ہے مرحوم کے کسی پوتے پڑپوتے کی نظر میں بھی یہ الفاظ آجائیں۔

''مشرقی پنجاب کے ضلع فیروز پور میں ایک چھوٹا سا گاؤں ''بڈھیمال'' کے نام سے موسوم تھا۔ یہ

Marfat.com

گاؤں اہل حدیث علمائے کرام کا مسکن تھا۔ اب وہاں کے لوگ ضلع لائل پور کے چک نمبر ۳۶ گ ب میں اقامت پذیر ہیں۔ ان میں مولانا عبدالحکیم صاحب ایک نیک طینت محقق اور صاحبِ مطالعہ بزرگ تھے۔ حدیث اور متعلقات پر ان کی اچھی نظر تھی۔ حضرت مولانا عبدالوہاب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ جہاں جاتے کتاب ہاتھ میں رکھتے۔ اپنے کھیت جاتے تو بھی کوئی نہ کوئی کتاب ضرور ساتھ لے جاتے۔ ایک خاص قسم کے مطالعہ کے دل دادہ تھے۔ فکر و عمل میں حافظ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ سے متاثر تھے۔

افسوس ہے دو ہفتے ہوئے ان کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس دنیا میں مرحوم ہمیشہ گوشۂ گم نامی میں رہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے درجات بلند فرمائے آمین۔"

مولانا عبدالحکیم کی وفات پر میں نے ان کے بڑے بیٹے عبدالرحمٰن کو تعزیتی خط بھی لکھا تھا۔ ان سے جب بھی ملاقات ہوتی وہ اس خط کا ضرور ذکر کرتے تھے۔

افسوس ہے بڈھیمال کے بعض دیگر علمائے کرام کی طرح مولانا عبدالحکیم کے حالات بھی کسی نے لکھنے کی زحمت نہ کی۔ جو کچھ میسر آیا اس فقیر نے اپنی مختلف کتابوں میں لکھ دیا۔ معلوم نہیں اسے بھی ان کے اخلاف میں سے کوئی پڑھے گا یا نہیں۔

مولانا ممدوح کے پوتے مولانا محمد علی طویل عرصے تک جڑاں والا کے قریب چک نمبر ۲۳ میں امامت وخطابت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ وہ جامعہ تعلیم الاسلام (ماموں کانجن) کی مسندِ شیخ الحدیث پر فائز ہیں۔ وہ اچھے خطیب، خوش نوا واعظ، صالح عالم دین اور ملنسار ہیں۔

مولانا عبدالحکیم بڈھیمالوی کا حلیہ یہ تھا: پورا قد، گندمی رنگ، چوڑا چہرہ، کچھ بیٹھی ہوئی سی ناک جسے اردو میں چپٹی ناک کہا جاتا ہے، نرم کلام، سادہ لباس، پردے کے سخت پابند، نہایت نیک اور تہجد گزار، قناعت پسند اور متواضع عالم دین۔ ان کی دنیوی گم نامی بارگاہِ خداوندی میں ان شاء اللہ اخروی بلند نامی میں بدل جائے گی۔

❀❀❀❀

Marfat.com

علامہ حسین میر کاشمیری

(وفات ۱۵۔جنوری ۱۹۶۲ء)

میانہ قد، جسم پر فربہی کا غلبہ، موٹی سرخ آنکھیں، سارے چہرے پر قابض لمبی ڈاڑھی، بارعب آواز، مزاحیہ شاعر، عام لباس شلوار قمیص اور ترکی ٹوپی، سردیوں میں شیروانی، مشہور صحافی، انگریزی، اردو، پنجابی پر عبور، عربی اور فارسی سے آشنا، اچھے مقرر۔ یہ تھے علامہ حسین میر کاشمیری جو اصلاً امرتسر کے رہنے والے تھے۔ ان کی صحافت کا زیادہ عرصہ روزنامہ ''زمیندار'' (لاہور) میں گزرا۔ تقسیم ملک سے قبل روزانہ صبح کے وقت بذریعہ ٹرین امرتسر سے لاہور آتے اور شام کے بعد واپس امرتسر چلے جاتے۔ خوش مزاج، خوش اخلاق، خوش کردار، حلقہ تعلقات وسیع۔ باغ و بہار مگر نہایت متدین شخصیت کے مالک۔ مزاح اور لطیفہ گوئی ان کی زندگی کا ضروری حصہ تھے۔ مذہب اور سیاست سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں سے ان کے مراسم خاص طور پر بے حد خوش گوار تھے۔ قرآن مجید پر استحضار کا یہ عالم کہ عام مجلسی گفتگو اور تقریر میں موقع بموقع بہ کثرت قرآن مجید کی آیات پڑھتے۔ احادیث کے حوالے بھی دیتے اور صحابہ وائمہ کرام کے واقعات بھی بیان کرتے۔ علمائے کرام سے بہت قرب تھا۔ توحید کے پُر جوش مبلغ اور بدعات کے سخت مخالف۔ نماز جمعہ مولانا محمد حنیف ندوی کی اقتدا میں لاہور کی مسجد مبارک میں پڑھتے۔ پھر ایک وقت آیا کہ اس مسجد میں خود خطبہ جمعہ دینے لگے اور اپنے خاص اندازِ خطابت کی وجہ سے کامیاب خطیب قرار پائے۔

ان کا زمانہ برصغیر کی بھرپور سیاست کا زمانہ تھا۔ کانگرس، تحریک خلافت، مسلم لیگ، مجلس احرار وغیرہ جماعتوں کی سیاست عروج پر تھی۔ علامہ ممدوح کو سیاست کے تمام ادوار سے دلچسپی رہی۔ انھوں نے اگرچہ عملی سیاست میں زیادہ حصہ نہیں لیا تاہم تقسیم ملک سے قبل سیاسیات کے تمام حلقوں سے ہمیشہ قریب تر رہے۔ مجلس احرار کے بعض اخباروں سے ادارتی تعلق بھی رہا۔

علامہ حسین کی تاریخ ولادت کا علم نہیں ہوسکا۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ انھوں نے سکول، کالج اور دینیات کی تعلیم کب حاصل کی اور کن اساتذہ سے کی۔

لاہور کے صحافتی، سیاسی اور دینی حلقوں میں ان کے لطیفے بہت مشہور ہیں جو ان کی زندگی میں دلچسپی سے بیان کیے جاتے تھے، وفات کے بعد بھی بیان کیے جاتے رہے ہیں۔ بسا اوقات ان کا اندازِ کلام ہی لطیفانہ

Marfat.com

شکل اختیار کر لیتا۔ ان کے سلسلۂ لطائف میں سے چند لطیفے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱......۱۹۳۰ء میں مجلس احرار کی کشمیر تحریک نے بڑا زور پکڑا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس تحریک میں پچاس ہزار لوگوں نے گرفتاریاں پیش کی تھیں۔ گرفتار شدگان سے ریاست کشمیر کے جیل خانے بھر گئے تھے اور قیدیوں کا دائرہ پھیل کر انگریزی علاقوں کے شہروں تک چلا گیا تھا۔ لاہور میں دہلی دروازے کے باہر مجلس احرار کے دفتر کے سامنے سٹیج سجایا گیا تھا، جہاں روزانہ احرار لیڈر چودھری افضل حق مرحوم کی قیادت میں گرفتاریاں پیش کی جاتی تھیں۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے بتایا کہ ایک دن مجمع عام میں علامہ حسین میر نے بھی چند رفقاء کے ساتھ گرفتاری دی اور انھیں پولیس نے سنٹرل جیل میں بھیج دیا۔ تیسرے روز لوگوں نے دیکھا کہ علامہ صاحب اپنے خاص انداز رفتار میں ٹہلتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں، سیدھے سٹیج پر آئے اور چودھری افضل حق کے برابر جا کھڑے ہوئے۔ انھیں دیکھ کر چودھری صاحب بھی حیران اور لوگ بھی متعجب کہ یہ کس طرح جیل سے آ گئے۔ مائیک پر تقریر کرنا شروع کی۔ حضرات! میں جیل میں گیا۔ وہاں نہ تکّے، نہ کباب، نہ بکرے کا گوشت نہ مرغ کا۔ جیل کی روٹیاں اور دال سبزی دیکھ کر میں نے انگریز کی حکومت پر بھی لعنت بھیجی اور اس کی جیل پر بھی۔ اس غلط ماحول سے نکل کر یہاں آ گیا۔

۲......اسی زمانے کی یا اس سے کچھ آگے پیچھے کی بات ہے مجلس احرار کا ایک روزنامہ اخبار نکلتا تھا، جس کے عملہ ادارت میں علامہ صاحب بھی شامل تھے۔ انگریزی پولیس دوسرے سے تیسرے دن احرار کے دفتر کا چکر لگاتی اور تلاشی کا سلسلہ جاری رکھتی تھی۔ ایک دن انگریز پولیس کپتان، پولیس کی جمعیت کے ساتھ آیا اور تلاشی لینا شروع کی۔ علامہ حسین میر کے پاس آیا تو دیکھا کہ ان کے میز کے دراز پر تالا لگا ہوا ہے اور علامہ صاحب بغیر کسی طرف دھیان کیے لکھنے پڑھنے میں مصروف ہیں۔ کپتان صاحب نے حکم دیا: تالا کھولو۔ لیکن علامہ صاحب خاموش، اپنے کام مشغول۔ کپتان صاحب نے تیسری چوتھی دفعہ تالا کھولنے کو کہا تو علامہ نے ان کی طرف دیکھا اور کہا چابی نہیں ہے۔ کپتان صاحب نے خیال کیا، اس دراز میں ضرور کوئی قابل اعتراض چیز ہے۔ اس نے غصے میں آ کر ایک سپاہی سے کہا: ہتھوڑی لا کر تالا توڑ دو۔ تالا توڑ کر دراز دیکھی گئی تو اس کے اندر علامہ صاحب نے لکڑی کی کوئی چیز رکھی تھی۔ انگریز پولیس کپتان نے اسے ہاتھ میں پکڑا اور پھر اسے وہیں پھینک کر بڑبڑ کرتا ہوا دفتر سے باہر نکل گیا۔

اس طرح مختلف طریقوں سے یہ لوگ پولیس کا مذاق اڑاتے اور اسے پریشان کرتے رہتے تھے۔

۳......علامہ صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ جب انھیں کوئی لطیفہ سوجھتا تو وہ اسے بیان کرنے سے رک نہیں سکتے تھے، بے شک اس کی زد میں کوئی بھی آتا اور کیسا بھی ماحول ہوتا۔ ان کی اہلیہ مرحومہ کی

Marfat.com

وفات ہوئی اور انھیں دفن کرنے کے لیے قبرستان میں لے جایا گیا تو ان کے ایک عزیز کفن پر کلمۂ شہادت لکھنے لگے۔ علامہ صاحب نے آواز دی: پتا صحیح لکھنا پارسل واپس نہ آ جائے۔

۴...... اسی سلسلے کا یہ واقعہ بھی بعض حضرات سے سنا کہ کچھ لوگوں نے علامہ صاحب سے اہلیہ مرحومہ کے ''قل'' کرنے کو کہا۔ پہلے تو وہ انھیں اس کام سے ٹالتے رہے، لیکن جب اصرار بڑھا تو فرمایا کل (یا پرسوں) صبح آٹھ بجے آ جاؤ۔ لوگ وقت مقررہ پر پہنچ گئے اور اندر آ کر بیٹھ گئے۔ علامہ صاحب نے باہر سے مکان کو تالا لگایا اور خود اس اخبار کے دفتر میں جس میں کام کرتے تھے لاہور چلے گئے۔ اب اندر بیٹھے لوگ علامہ صاحب کا انتظار کر رہے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد انھیں حقیقتِ حال کا علم ہوا تو بڑی مشکل سے باہر نکلے۔

۵...... بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ علامہ صاحب موصوف سائیکل پر کہیں جا رہے تھے کہ اس کا پہیہ ایک خاتون کو جا لگا۔ خاتون نے کہا اتنی بڑی ڈاڑھی ہے اور سائیکل سنبھالا نہیں جاتا۔ بولے: بی بی یہ داڑھی ہے، بریک نہیں ہے۔

۶...... یہ واقعہ بھی بعض حضرات سے سنا کہ جماعت اہل حدیث کے ایک جلسے میں مولانا ثناء اللہ امرتسری کو بھی دعوتِ شرکت دی گئی تھی اور علامہ حسین میر کو بھی۔ دونوں ایک ہی ٹرین میں امرتسر سے سوار ہوئے، لیکن دونوں الگ الگ ڈبوں میں سفر کر رہے تھے۔ منزلِ مقصود پر پہنچے تو علامہ صاحب اپنے ڈبے سے باہر نکلے، جو لوگ استقبال کے لیے آئے تھے، انھوں نے علامہ صاحب کی بڑی ڈاڑھی دیکھی تو خیال کیا کہ مولانا ثناء اللہ صاحب یہی ہیں۔ وہ نہایت احترام سے انھیں جلسہ گاہ میں لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد اکیلے مولانا وہاں پہنچے تو علامہ کو دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا: علامہ تم مجھ سے ہاتھ کر گئے۔

۷...... یہ چند وہ واقعات یا لطائف ہیں جو مختلف لوگوں نے بیان کیے۔ اب ایک واقعہ یا لطیفہ سنیے۔ جو میرے سامنے پیش آیا۔

مولانا محمد حنیف ندوی مسجد مبارک (لاہور) کے خطیب تھے اور ان کی ڈاڑھی کچھ چھوٹی تھی۔ علامہ حسین میر عام طور پر پہلی صف میں منبر کے بالکل قریب بیٹھتے اور مولانا کی تقریر بڑے غور سے سنا کرتے تھے۔ تقسیم ملک سے تھوڑا عرصہ بعد کی بات ہے کہ مولانا کے خطبے کے دوران ایک عالم دین نے بلند آواز سے فرمایا: خطیب صاحب! آپ کی ڈاڑھی چھوٹی ہے۔ یہ الفاظ سن کر علامہ حسین میر خطیب کے برابر کھڑے ہو کر بولے: حضرات! ڈاڑھی میری دیکھیے اور خطبہ مولانا کا سنیے!

۸...... مرکزی جمعیت اہل حدیث کی تیسری سالانہ کانفرنس مولانا اسماعیل غزنوی کے زیر صدارت ۲،۳ اپریل ۱۹۵۵ء کو لائل پور (موجودہ فیصل آباد) میں منعقد ہوئی تھی۔ مولانا اسماعیل غزنوی ان دنوں بیمار تھے اور

Marfat.com

ان کا خطبۂ صدارت مولانا داؤد غزنوی کے فرمان پر اس فقیر نے لکھا تھا اور کانفرنس میں مولانا اسماعیل غزنوی کی موجودگی میں علامہ حسین میر مرحوم نے پڑھا تھا۔ خطبے کے آخری الفاظ یہ تھے: ''اب میں اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہوئے آپ سے رخصت ہوتا ہوں'' علامہ صاحب نے انگشت شہادت سے ''اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہوئے'' کا اشارہ مولانا اسماعیل غزنوی کی طرف کیا، (جس سے سامعین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی) اور رخصت ہو گئے۔

علامہ حسین میر خوش کلام اور حاضر جواب بزرگ تھے۔ ان کی طویل وعریض ڈاڑھی، ڈاڑھی کی بڑی شہرت تھی اور وہ ان کی شخصیت کی اصل پہچان تھی۔ لیکن وفات سے دو سال قبل ان پر فالج کا حملہ ہوا اور ان میں اٹھنے بیٹھنے کی طاقت نہ رہی تو ان کے بیٹے ڈاکٹر عبدالرؤف نے بے بس باپ کی ڈاڑھی پر قینچی چلائی اور اسے کتر ڈالا۔ اب وہ بالکل چھوٹی ہو گئی تھی۔ سنا تھا کہ ان کی عیادت کرنے کی بھی ہر شخص کو اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ جو شخص ان سے ملنے جاتا، اسے دیکھ کر ڈاڑھی کی طرف اشارہ کرتے اور رو پڑتے۔ دو سال اسی حالت میں گزرے، بالآخروہ ۱۵۔جنوری ۱۹۶۲ء کو وفات پا گئے۔ میں حضرت مولانا داؤد غزنوی کے ساتھ ان کے جنازے میں شامل ہوا۔ جو شخص ان کا چہرہ اور کتری ہوئی چھوٹی ڈاڑھی دیکھتا، نہایت افسوس کا اظہار کرتا۔

ان کے بیٹے ڈاکٹر عبدالرؤف پنجاب کے محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر تھے۔ انگریزی اور اردو کی بعض کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد عمر کے آخری دور میں انھوں نے ڈاڑھی رکھ لی تھی۔ میں ان کے جنازے میں بھی شامل تھا۔ ان کا جنازہ مولانا فضل الرحمٰن ازہری نے پڑھایا تھا۔

مجھے یاد پڑتا ہے علامہ حسین میر کا جنازہ مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے پڑھایا تھا۔

❀❀❀❀

Marfat.com

خواجہ عبدالمجید علی گڑھی

(وفات ۳۔ دسمبر ۱۹۶۲ء)

اکتوبر ۱۹۴۵ء کی بات ہے کہ جمعیت علمائے ہند کے اکابر نے جمعیت کے مرکزی دفتر (دہلی) میں مسلمانوں کی مختلف سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والوں کی میٹنگ بلائی۔ اس میٹنگ میں شرکت کا دعوت نامہ مجھے بھی موصول ہوا۔ میری عمر اس وقت بیس اکیس برس کی تھی۔ میں نہایت مسرت کے ساتھ اس میٹنگ میں شامل ہوا۔ شرکا کی تعداد دو سو سے اوپر ہوگی۔ جن میں مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد داؤد غزنوی، مولانا حفیظ الرحمٰن سیوہاروی، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا محمد میاں، مولانا عبدالمجید سوہدروی، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، شیر بنگال مولوی فضل الحق، پروفیسر ہمایوں کبیر وغیرہ حضرات شامل تھے۔ اس مجمع علما اور مجلس زعما میں ایک صاحب اور تھے جو چہرے بشرے کے اعتبار سے مولانا ابوالکلام آزاد سے ملتے جلتے تھے۔ وہی رنگ روپ، انھی کی طرح چڑھی ہوئی مونچھیں، چھوٹی سفید ڈاڑھی۔ مجھے شبہ پڑا کہ یہ مولانا ابوالکلام آزاد کے بھائی ہوں گے، لیکن فوراً ذہن میں آیا کہ ان کے تو ایک ہی بھائی تھے، ابوالنصر آہ۔ اور وہ جوانی میں وفات پا گئے تھے۔ یہ کوئی اور شخص ہیں۔ میری نظریں ان کے خوب صورت ادھیڑ عمر چہرے پر گڑی رہیں۔ پتا چلا کہ یہ خواجہ عبدالمجید ہیں اور علی گڑھ ان کا مسکن ہے۔ یہ میٹنگ دو دن جاری رہی۔ ایک دن خواجہ صاحب نے وہیں میٹنگ ہال میں شرکائے کرام کو سہ پہر کی پُرتکلف چائے پلائی۔ چائے نوشی کے وقت وہ مولانا داؤد غزنوی اور مولانا حسین احمد مدنی کے درمیان میں بیٹھے تھے۔ گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ میری شکل وصورت دیکھ کر بعض لوگ مجھے مولانا ابوالکلام آزاد سمجھنے لگتے ہیں۔

اس میٹنگ کے بعد وقت گزرتا گیا، حالات بدلتے رہے۔ لیکن خواجہ عبدالمجید علی گڑھی کا نقشہ اور حلیہ میرے ذہن کی لوح سے اتر نہ سکا۔ برصغیر آزاد ہوگیا اور ہم لوگ پناہ گیر کے طور پر پاکستان آگئے۔ میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کے آفس سیکرٹری کی حیثیت سے لاہور پہنچ گیا۔ اس کے بعد اخبار ''الاعتصام'' جاری ہوا تو اس کا مدیر اعلیٰ مولانا محمد حنیف ندوی کو اور معاون مدیر مجھے بنا دیا گیا۔ برصغیر کے مختلف مقامات سے ''الاعتصام'' کے تبادلے میں رسائل وجرائد آنے اور ہمارے مطالعہ میں گزرنے لگے، جن میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کا ہفتہ وار ''صدق جدید'' بھی تھا۔ پھر مولانا حنیف ندوی ادارہ ثقافت اسلامیہ میں چلے

Marfat.com

گئے تو الاعتصام کی زمام ادارت میرے سپرد کر دی گئی۔ ۱۹۶۲ء کے ماہ دسمبر کے ''صدق جدید'' (لکھنؤ) کے کسی شمارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا مضمون چھپا: ''عبدالمجید خواجہ مرحوم''! معاً اٹھارہ برس قبل (اکتوبر ۱۹۴۵ء) کے دیکھے ہوئے خواجہ عبدالمجید سامنے آ کھڑے ہوئے۔ مضمون پڑھا تو انکشاف ہوا کہ خواجہ صاحب مسلکاً اہل حدیث تھے۔ میرے لیے قدرتی طور پر یہ نہایت خوشی کی بات تھی۔ چنانچہ میں نے وہ مضمون ''صدق جدید'' سے نقل کر کے اپنے اخبار ''الاعتصام'' کے ۱۱۔ جنوری ۱۹۶۳ء کے شمارے میں چھاپ دیا۔ خیال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کبھی شخصیات پر لکھنے توفیق مرحمت فرمائی تو کسی مجموعے میں یہ مضمون شائع کیا جائے گا۔ لیکن اب اسے شائع کرنے کی ضرورت پڑی تو یہ بات ذہن سے نکل چکی تھی کہ اسے آج سے پچاس برس قبل ''الاعتصام'' کے کس شمارے میں شائع کیا گیا تھا۔ کسی طرح ''الاعتصام'' سے تلاش کر کے وہ مضمون اب قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے۔

آزادیٔ برصغیر کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کی وہاں کے جن مسلمان رہنماؤں نے خدمت کی، ان میں عبدالمجید خواجہ کا نام قابل ذکر ہے۔ مسلم لیگ والے تو مسلمانوں کو ہندوؤں کے حوالے کر کے پاکستان آ گئے تھے۔ ان کے یہاں آنے کے بعد وہی لوگ ان کا سہارا ثابت ہوئے جنھیں مسلم لیگ کی سیاسی لغت میں ہندوؤں کے ساتھی قرار دیا جاتا تھا۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر بہت کچھ کہا جاتا تھا۔

خواجہ عبدالمجید نے ۳۔ دسمبر ۱۹۶۲ء کو علی گڑھ میں وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب ذیل میں ملاحظہ ہو مولانا عبدالماجد دریابادی کا مضمون، خواجہ عبدالمجید کے متعلق۔

زندگی اور زندہ دلی کے پیکر مجسم ''خواجہ'' کو آج کس دل سے ''مرحوم'' لکھا جائے......! لیکن دل چاہے یا نہ چاہے بہر حال حکم قضا یہی ہے اور اسی کے آگے سر جھکانے کو ہم آپ کیا معنی ہر جن و بشر پیدا ہی ہوا ہے!

علی گڑھ کی خبر ۳۔ دسمبر دوشنبہ کی ہے کہ آج ۱۱ بجے دن کو عبدالمجید خواجہ ۷۷۔۷۸ سال کی عمر میں اپنے وطن حقیقی کو سدھار گئے۔

آہ غفلت کی گھڑیاں اور ہم نادانوں کی مدہوشیاں۔ وہ جس کا نورانی کا چہرہ ناز پروردہ اور چمکتا دمکتا۔ ابھی کل کی بات معلوم ہوتا ہے، آج اس سن کو پہنچ گیا تھا۔

''خواجہ'' ذات یا برادری کا نام نہیں، ان کا گھریلو عرف خواجہ تھا، پورا نام صرف ضابطوں ہی کے موقع پر لیا جاتا تھا۔

علی گڑھ سے اخلاص ترکہ میں تھا۔ ان کے والد محمد یوسف مرحوم سرسید کے مخلصوں میں تھے۔ شادی نواب محمد سمیع اللہ خاں مرحوم کی پوتی سے ہوئی۔ یہ سمیع اللہ خاں وہی ہیں جو ابتدائے تحریک علی گڑھ میں سرسید

Marfat.com

کے مخلص ترین رفیق ہی نہیں بلکہ کہنا چاہیے کہ برابر کے سہیم وشریک تھے۔

علی گڑھ میں پڑھ کر خواجہ ولایت گئے۔ کیمبرج سے بی اے کیا۔ لندن رہ کر بیرسٹر ہوئے۔ واپسی پر بیرسٹری پہلے پٹنہ میں شروع کی، پھر علی گڑھ میں۔ اس کے بعد الہ آباد ہائی کورٹ میں! آخر میں سالہا سال سے پھر علی گڑھ آ گئے تھے اور سارا وقت قومیات کی نذر کرنے لگے تھے۔ اخیر میں بیرسٹری سے بالکل ہی دست بردار ہو گئے تھے۔ قومی اور ملی دل چسپیاں آخر تک نہ چھوڑیں۔ بلکہ ان مشغلوں سے انہماک، صحت خراب رہنے کے باوجود بڑھ ہی گیا تھا۔

اللہ نے حسن ظاہری سے مالا مال کیا تھا۔ ولایت کی آزادیاں اس پر مستزاد۔ خواجہ کڑے امتحان میں پورے اترے۔ لندن جس طرح پاک صاف گئے تھے، اسی طرح پاک صاف واپس آئے۔

یہ مجاہدہ کوئی معمولی مجاہدہ نہ تھا۔

اور شراب وغیرہ کا تو کوئی چھینٹا بھی اڑ کر نہیں پڑنے پایا تھا۔

اللہ نے پیسا بھی دیا۔ خواجہ پیسے کا صحیح استعمال بھی جانتے تھے۔ مسرف ہوئے بغیر بڑے مہمان نواز تھے۔ مکان جب دیکھیے مہمانوں سے بھرا ہوا، بلکہ قومی اجتماعوں کے موقعوں پر تو یہ معلوم ہونے لگتا تھا کہ یہ مکان کوئی مستقل مہمان سرا یا ہوٹل ہے۔ پُر تکلف خاطر داریاں، دعوتیں، پارٹیاں مع سارے لوازم کے۔

مولانا محمد علی ایڈیٹر کامریڈ کی لیڈری جب ۱۹۱۱ء سے شروع ہوئی تو یو پی کے دو گروپ خاص طور پر اس شمع کے گرد پروانہ وار جمع ہو گئے۔

ایک حلقے میں یہی علی گڑھ کے عبدالمجید خواجہ، ڈاکٹر سید محمود، تصدق احمد خاں شروانی مرحوم اور ڈاکٹر ناظر الدین حسن (اب نواب ناظر یار جنگ حیدر آبادی) تھے۔ اور دوسرا حلقہ چودھری خلیق الزمان، شعیب قریشی مرحوم، عبدالرحمان صدیقی مرحوم اور عبدالعزیز انصاری کا تھا۔ (ڈاکٹر محمود کو یکساں عقیدت مولانا ابوالکلام رحمۃ اللہ علیہ سے بھی تھی)۔

واقعہ مسجد کان پور میں، مسلم یونیورسٹی کی تحریک میں، جنگ طرابلس کے چندے میں، جنگ بلقان کے چندے میں، اور پھر آخر میں تحریک خلافت میں، تحریک جامعہ ملیہ میں، ترک موالات میں، خواجہ بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے رہے، اور ان کی شرکت و ہم دردی ہمیشہ ''باغیوں'' ہی کے ساتھ رہی۔

مولانا محمد علی سے اختلاف ۱۹۲۲ء ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ مسئلہ داخلۂ کونسل کے سلسلے میں۔ خواجہ پنڈت موتی لال، سی آر داس وغیرہ کے ساتھ داخلہ کونسل کے حق میں ہو گئے۔ مولانا محمد علی، گاندھی جی، راج گوپال اچاریا وغیرہ کے ساتھ بدستور ''نو چینجر'' تھے۔ یعنی داخلۂ کونسل کے مخالف۔

Marfat.com

پھر اخیر ۱۹۲۸ء میں جب نہرو رپورٹ کے سلسلے میں مسلمان آزادی خواہوں کے درمیان شدید تفریق کی بنیاد پڑی تو خواجہ صاحب کا اختلاف مولانا محمد علی سے، خلافت کمیٹی سے اور مسلم لیگ سے اور زیادہ گہرا اور نمایاں ہوگیا اور یہ آخر دم تک برقرار رہا۔

جب مسلم لیگ اور کانگریس کے دو مختلف کیمپ قائم ہو گئے اور رنجشیں تلخ سے تلخ تر ہوگئیں تو خواجہ نے مسلم لیگ کے توڑ پر ایک آل انڈیا مسلم مجلس قائم کی اور خود اس کے صدر منتخب ہوئے، گو یہ مجلس بھی کچھ زیادہ چل نہ سکی۔

مدتوں جامعہ ملیہ میں بہ حیثیت شیخ الجامعہ (پرنسپل) کام کیا اور اس کے امیر (چانسلر) تو آخر دم تک رہے۔

وہ زمانہ قناعت، سادگی اور جفاکشی کے دور دورہ کا تھا۔ خواجہ نے اس مہم میں بھی خاصہ حصہ لیا۔ اور سفر انٹر کلاس میں کرنا شروع کر دیا۔ حالاں کہ آنکھیں دولت و ثروت میں کھلی تھیں۔

شعر و سخن کا یہی نہیں کہ اعلیٰ مذاق رکھتے تھے، شعر کے خوب پرکھنے والے تھے، بلکہ خود شاعر بھی تھے اور حکیم اجمل خاں مرحوم کی طرح تخلص شیدا رکھے ہوئے تھے۔

علمی مذاق عجب جامع پایا تھا۔ باضابطہ عالم دین نہ تھے، لیکن علوم شرعیہ میں مہارت اچھی خاصی تھی۔ تفسیر، حدیث، فقہ، کلام کسی موضوع میں بند نہ تھے اور بعض فرقوں سے مناظرے میں تو کہنا چاہیے کہ مہارت کامل رکھتے تھے۔ مسلکاً اہل حدیث تھے لیکن حنفیوں سے ایسے شیر و شکر رہتے تھے کہ کبھی ان پر گمان بھی غیر حنفی ہونے کا نہیں ہوتا تھا۔

حسرت موہانی مرحوم کی طرح خواجہ بھی اکثر معاملات و مسائل میں رائے منفرد ہی رکھتے تھے اور اس کا اظہار بڑی صفائی اور بے باکی سے بڑوں، چھوٹوں سب کی محفل میں کر ڈالتے تھے۔ کمیٹیوں میں شاید ہی کوئی میٹنگ ایسی ہوتی ہو جس میں خواجہ اپنی امنڈمنٹ پیش کرنے نہ کھڑے ہو جاتے ہوں۔ اس سے بالکل بے نیاز کہ کوئی ایک آواز ان کی موافقت میں اٹھتی ہے یا نہیں۔ البتہ چوں کہ کھرّے نہیں شیریں زبان تھے اس لیے مخالف بھی بگڑتے اور چڑتے ذرا کم ہی تھے۔ آنکھ اور زبان کی موہنی بھی آخر کوئی چیز ہوتی ہے۔

فرقہ امامیہ کے عقائد سے سخت بیزار تھے اور اپنے خیال کی تائید میں گھنٹوں مدلل گفتگو کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود اسی فرقے کے افراد سے خوب میل جول رکھتے تھے۔ چناں چہ اخیر عمر میں اپنی جائدادی مقدمات وغیرہ جن وکیل صاحب کے سپرد کر رکھے تھے ان کا تعلق اسی فرقے سے تھا۔

حکایات، لطایف و ظرائف کے بادشاہ تھے۔ گھنٹوں پاس بیٹھ کر باتیں سنیے تو طبیعت نہ اکتانے پائے۔ کانگریس کے سیکرٹری جنرل ایک عرصے تک، اور یو پی اسمبلی کے ممبر بھی غالباً چھ سال تک رہے۔ اگر

Marfat.com

چاہتے اور مزاج کو ذرا دربار داری کے لائق بنا لیتے تو موجودہ سرکار میں بڑے بڑے عہدے آسانی سے حاصل کر سکتے تھے۔

ایمان کے مضبوط اور عبادات کے پابند ہمیشہ سے تھے۔ ڈاڑھی بھی جوانی ہی کے زمانے سے رکھ لی تھی جو اب بڑی ہو کر خوب سفید اور پرنور ہو گئی تھی۔ گھٹنوں کے درد وضعف سے نماز اب کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتے تھے، کرسی پر بیٹھ کر یا جس طرح بھی بن پڑتا اخیر تک ادا کیے گئے۔

غیرت ایمانی اور جوش اسلامی، آزادئ ہند کے بعد سے بہت بڑھ گیا تھا۔ مسلم یونیورسٹی کے حال زار پر ہر وقت کڑھا کرتے اور اصلاح حال کی ہر عملی تدبیر میں لگے رہتے۔ یونیورسٹی کے نام سے جب ''مسلم'' حذف کر دینے کی تجویزیں ان کے کان میں پڑیں تو فرط غیرت سے تڑپ گئے اور بول اٹھے کہ ''میری زندگی میں تو ایسا نہیں ہوسکتا۔''

مشیت الٰہی نے انھیں عین ایسے وقت اٹھالیا، جب یونیورسٹی کو ان کی ضرورت سب سے زیادہ تھی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کا مضمون ختم ہوا۔ خواجہ عبدالمجید ہندوستان کے رہنے والے تھے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور تعلیم یافتہ گھرانے کے فرد تھے۔ ان کی سیاسی، ملی اور قومی خدمات کا دائرہ بہت وسیع تھا اور حلقہ مراسم تمام ہندوستان کے اونچے مرتبے کے لوگوں تک پھیلا ہوا تھا۔ مسلکی اعتبار سے باعمل اہل حدیث تھے۔ دینیات کا مطالعہ اکثر سکہ بند علمائے کرام سے زیادہ تھا۔ لیکن جماعت اہل حدیث کے شاید بہت کم لوگوں کے علم میں ہوگا کہ وہ اہل حدیث تھے۔ نہ ہندوستان کی جماعت اہل حدیث کے کسی اہل علم اور اہل قلم نے ان کا اور ان کی اہل حدیثیت کا تذکرہ کیا ہوگا اور نہ پاکستان کی جماعت کے کسی معزز رکن کو اس کا علم ہوگا۔

''چند رجال اہل حدیث، (شائع کردہ ندوۃ المصنفین گوجراں والا) میں مولانا ابوعلی اثری نے ان کا تذکرہ کیا ہے، لیکن انھیں ان کی ''اہل حدیثیت'' کا علم مولانا عبدالماجد دریابادی کے مضمون سے ہوا، انھوں نے ان کا تذکرہ یوسف حسین خاں مرحوم کی کتاب ''یادوں کی دنیا'' کے حوالے سے کیا ہے۔

ان کا حلیہ میرے ذہن میں آج سے ۳۷ سال قبل اکتوبر ۱۹۴۵ء سے پیوست تھا۔ پھر اس سے اٹھارہ سال بعد دسمبر ۱۹۶۲ء میں ان کی وفات ہوئی اور مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان پر مضمون لکھا اور ان کے مسلک کی وضاحت کی تو اس بہشتی روح سے قلبی تعلق میں مزید گہرائی پیدا ہوئی جو انھیں اس کتاب کے صفحات میں لے آئی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کا مضمون اگرچہ مختصر ہے مگر جامع ہے۔ اس میں انھوں نے خواجہ مرحوم کی زندگی کے تمام ضروری کوائف اپنے اسلوب خاص میں خوب صورت الفاظ میں بیان کر دیے ہیں۔ کاش

Marfat.com

ہندوستان کی جماعت اہل حدیث کے کوئی اہل قلم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ (دہلی) اور دیگر ذرائع سے ان کے حالات ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش کریں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ ہم لوگ اہل حدیث اس شخص کو سمجھتے ہیں جو ہمارے جیسا ہو، ہمارے گروپ سے وابستگی رکھتا ہو اور ہماری سیاسی اور تنظیمی پالیسی پر کاربند ہو۔ کتنے ہی ایسے اہل حدیث ہوں گے جو ہمارے معیار اہل حدیثیت پر پورا نہیں اترتے اس لیے ہم انھیں کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

انہی حضرات میں امرتسر کے ڈاکٹر سیف الدین کچلو کا نام آتا ہے۔ وہ پختہ فکر اہل حدیث تھے اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کے عقیدت مند تھے۔ مولانا امرتسری نے اپنے اخبار ''اہل حدیث'' کے متعدد مقامات پر ان کا ذکر کیا ہے۔ ۱۹۲۳ء میں آریہ سماجیوں کی طرف سے جاری کردہ ''شدھی تحریک'' کے مقابلے میں انھوں نے تحریک تبلیغ شروع کی تھی اور امرتسر سے ''تبلیغ'' کے نام سے اخبار بھی جاری کیا تھا، جس کی وجہ سے بے شمار مسلمان ارتداد سے محفوظ رہے تھے بلکہ تحریک تبلیغ سے متاثر ہو کر بعض مقامات کے غیر مسلم بھی دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئے تھے۔

امرتسر کے ایک بزرگ نے (جو حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری سے قریبی تعلق رکھتے تھے) بتایا کہ ۱۹۴۵ء کے الیکشن کا زمانہ آیا تو بعض لوگوں نے مولانا سے عرض کیا: آپ الیکشن لڑیں گے تو اسمبلی کے ممبر بن جائیں گے۔ فرمایا: مجھے ممبر بننے کی کیا ضرورت ہے میں تو ہر جمعے کے روز منبر پر کھڑا ہوتا ہوں اور اس پر بیٹھتا بھی ہوں۔ پھر ان سے پوچھا گیا کہ آپ الیکشن میں ووٹ کس کو دیں گے؟ جواب دیا: اگر میرا ووٹ ہوا تو سیف الدین کچلو کو دوں گا۔

ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے بعض اجلاسوں میں بھی شرکت کی اور تقریریں کیں۔ اس کا ذکر اخبار ''اہل حدیث'' (امرتسر) میں موجود ہے۔ ۱۹۴۶ء میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے پنجاب کانگرس کی صدارت سے استعفا دیا تو ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو اس کا صدر منتخب کیا گیا تھا۔

تقسیم ملک کے بعد وہ امرتسر سے دہلی چلے گئے تھے، اس لیے کہ ان کے نزدیک اس وقت کسی نہ کسی صورت میں ہندوستان کے مسلمانوں کی خدمت کرنا انتہائی ضروری تھا۔ مسلم لیگ کے لیڈر انھیں تنہا چھوڑ کر پاکستان تشریف لے آئے تھے، اس لیے کہ ان کے نزدیک یہاں آکر حکومت کرنا ضروری تھا۔

بات ہندوستان کے خواجہ عبدالمجید کی ہورہی تھی۔ وہ پرانے کانگرسی تھے۔ کسی زمانے میں ان کا نام مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر مختار احمد، انصاری، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، گاندھی جی اور حکیم اجمل خاں کے ساتھ آتا تھا۔ برصغیر کی تحریکاتِ آزادی میں وہ کئی دفعہ گرفتار ہوئے اور جیلوں میں رہے۔

Marfat.com

۱۹۱۳ء میں انگریزی حکومت نے مچھلی بازار کان پور کی مسجد منہدم کی تو اس کے خلاف جو تحریک چلی اس میں خواجہ عبدالحمید نے بھی حصہ لیا۔ اس کے لیے انھوں نے حکومت سے قانونی جنگ لڑی۔ ان کا شمار اس وقت کے الہ آباد ہائی کورٹ کے مشہور اور ماہر قانون بیرسٹروں میں ہوتا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے ۲۲۔ اکتوبر ۱۹۱۳ء کے ''الہلال'' میں ان ممتاز قانون دانوں کے فوٹو چھپے تھے جو مسجد کان پور کے مقدمے کی پیروی کر رہے تھے۔ ان میں خواجہ عبدالمجید کا فوٹو بھی شامل ہے۔ یہ ان کی جوانی کا زمانہ تھا۔ وہ سب لوگ عرصہ ہوا اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ موجودہ نسل کو بالکل معلوم نہیں ہوگا کہ مسجد کان پور کیا تھی اور اس کا کیا قصہ تھا اور اس سلسلے میں کن لوگوں نے کیا خدمات سرانجام دی تھیں۔ بے شک وہ بہت بڑے اور باہمت لوگ تھے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔

بیرسٹری کی تعلیم کے زمانے میں خواجہ عبدالمجید لندن کی کیمبرج یونیورسٹی میں پنڈت جواہر لال نہرو کے ہم جماعت تھے۔ اس لیے دونوں کے درمیان دوستانہ اور بے تکلفانہ روابط قائم تھے۔

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا عبدالغنی بڈھیمالوی

(وفات ۱۹۶۳ء)

پورا قد، متوازن جسم، بات چیت کے دوران ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لہر، تہمند اور قمیص پہنے ہوئے۔ سر پر عمامہ جسے اس زمانے میں ''لنگی'' کہا جاتا تھا، گندم گوں، نیک سیرت، تہجد گزار، یہ تھے تقسیم ملک سے قبل کے مولانا عبدالغنی بڈھیمالوی جو ۱۸۸۰ء کے قریب موضع بڈھیمال تحصیل مکتسر ضلع فیروزپور (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام نامی حافظ عبداللہ تھا اور چچا تھے صوفی عنایت اللہ جو زیادہ تر بڈھیمال سے آٹھ نو میل کے فاصلے پر فریدکوٹ میں رہا کرتے تھے۔ گورے چٹے، سفید لباس اور سفید ہی ڈاڑھی۔ فریدکورٹ کا سکھ حکمران ان کا احترام کرتا تھا۔

مولانا عبدالغنی کا مسکن (بڈھیمال) علما وصلحا کا گاؤں تھا اور یہ لوگ لکھوی علمائے کرام سے بہت متاثر تھے۔ مشہور عالم ومدرس شیخ الحدیث مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی، حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی، مولانا عیش محمد، قاضی محمد اسلم سیف فیروزپوری، جامعہ سلفیہ کے موجودہ شیخ الحدیث حافظ عبدالعزیز علوی کا تعلق اسی گاؤں سے تھا۔ مولانا عبدالغنی صاحب کے ایک بیٹے مولانا احمد علی تھے جنھوں نے درس نظامیہ کی تعلیم مکمل کی تھی۔ پوتے مولانا عبدالرحمٰن بڈھیمالوی ہیں جو بہت مدت سے جامعہ ابوبکر الاسلامیہ کراچی میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ایک پڑپوتے ریاض الرحمٰن صاحب ہیں جو عالم بھی ہیں اور خطیب بھی۔ یعنی مولانا عبدالغنی کے بیٹے، پوتے، پڑپوتے (شاید نواسے، پڑنواسے وغیرہ بھی) دینیات کے عالم ہیں، لیکن اس گھرانے کے کسی عالم کو صحیح طور سے پتا نہیں کہ ان کے اس والد اور دادا ے، پڑدادے اور نانے، پڑنانے کی ولادت کب ہوئی، انھوں نے ابتدائی تعلیم کہاں حاصل کی، کن اساتذہ سے کی۔ کب فارغ التحصیل ہوئے اور کن لوگوں کو کس زمانے میں پڑھاتے رہے۔ شاگردوں کے کیا نام تھے اور کون شاگرد کہاں کا رہنے والا تھا۔ صرف یہ معلوم ہے کہ انھیں ''بڑے مولوی صاحب'' کہا جاتا تھا۔ یہ انکشاف اگر وہ نہ بھی فرمائیں تب بھی ان سے تھوڑا بہت تعلق رکھنے والے لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ عمر میں بڑے تھے اور اپنے گاؤں کی مسجد کے امام اور خطیب بھی تھے۔ حافظ احمد اللہ صاحب کی تکمیل تعلیم تک وہ اس منصب پر فائز رہے۔ حافظ صاحب نے تعلیم سے فراغت پائی تو یہ منصب ان کے حوالے کردیا گیا اور خود مقتدی بن گئے۔ بڈھیمال کے نمبردار مولانا عبدالرحمٰن مرحوم

Marfat.com

تھے جوان کے رشتے دار تھے، ان کی وفات (۱۹۱۸ء) کے بعد ان کی جگہ انھیں سربراہ نمبردار بنایا گیا تھا۔ پھر جب مولانا عبدالرحمٰن مرحوم کے چھوٹے بھائی محمد سلیمان جوانی کی عمر کو پہنچے تو گاؤں کی نمبرداری ان کے سپرد کر دی گئی۔

مولانا عبدالغنی مرحوم ومغفور کے بارے میں ان کے اخلاف میں سے ایک صاحب نے بتایا کہ وہ اپنے گاؤں بڈھیمال میں چالیس سال خدمت تدریس سرانجام دیتے رہے۔ چالیس سال کی طویل مدت میں ان سے بہت لوگوں نے استفادہ کیا ہوگا، لیکن ان میں سے کسی کو ان کے پانچ شاگردوں کے نام بھی معلوم نہیں۔ ان حضرات کو مان لینا چاہیے کہ اپنے بزرگوں کے حالات سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ایک عزیز کی معرفت میں نے ایک اور عالم دین کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں تو ان کے پوتے (جو ماشاء اللہ عالم دین، اپنے علاقے کے مشہور واعظ اور ایک دارالعلوم میں مدرس ہیں) نے جواب دیا کہ میں اپنے دادا کے متعلق کچھ نہیں بتا سکتا، اس لیے کہ "میرے گوڈے دکھدے نیں" (یعنی میرے گھٹنوں میں درد ہوتا ہے)۔ قارئین کرام فیصلہ فرمائیں کہ حالات زبان سے بتائے جاتے ہیں یا "گوڈوں" سے؟ اگر زبان کا کام گوڈوں سے لیا جاتا ہے تو وہ طلباء کو تعلیم کیسے دیتے ہیں؟

اب مولانا عبدالغنی صاحب بڈھیمالوی مرحوم کی طرف آیئے۔ گزارش یہ ہے کہ لکھو کے گاؤں بڈھیمال سے پندرہ بیس میل کے فاصلے پر ہوگا اور یہ لوگ لکھوی علما سے متاثر اور حافظ محمد لکھوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف (تفسیر محمدی، احوال الآخرت، زینت الاسلام اور انواع محمدی وغیرہ) بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ کسی معاملے میں بات واضح نہ ہوتی ہو تو قرائن سے کام لیا جاتا ہے اور بسا اوقات قرائن دلیل اور ثبوت کا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔ مولانا عبدالغنی کے متعلق بتایا گیا ہے کہ انھوں نے دہلی جا کر حضرت میاں سید نذیر حسین کے مدرسے میں تعلیم حاصل کی (ان کے وہاں جانے سے کافی عرصہ پہلے میاں صاحب وفات پا چکے تھے) لیکن سوال یہ ہے کہ انھوں نے ابتدائی تعلیم کہاں اور کس سے حاصل کی؟

قرائن بتاتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم انھوں نے اپنے والد مکرم حافظ عبداللہ اور عم محترم صوفی عنایت اللہ سے حاصل کی، اس کے بعد لکھو کے جا کر لکھوی علماء سے درس نظامیہ کی کچھ کتابیں پڑھیں۔ پھر اپنے چچا زاد بھائی مولانا عطاء اللہ بن صوفی عنایت اللہ کی رفاقت میں عازم دہلی ہوئے اور حضرت میاں سید نذیر حسین رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسے میں پہنچے اور وہاں کے اساتذہ سے اخذ علم کیا، لیکن وہاں کے کس استاذ سے کس مضمون کی کون سی کتابیں پڑھیں؟ اس کا پتا نہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان کی اولاد اور رشتے داروں میں سے نہ کسی نے اس سلسلے میں ان سے کچھ پوچھا اور نہ خود انھوں نے کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت محسوس کی اور اس طرح

Marfat.com

ان کی تعلیم سے متعلق تمام معاملہ پردۂ اخفا میں رہا۔ اس زمانے میں زیادہ پوچھ گچھ کی لوگوں کو عادت بھی نہ تھی۔ یہ بہت بڑی بات تھی کہ فلاں شخص دہلی کا پڑھا ہوا ہے۔ اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہ تھی کہ دہلی میں کس سے کیا پڑھا۔ یہ بھی پتا نہیں کہ کسی مدرسے کی سند بھی ان کے پاس تھی یا نہیں تھی۔

پھر تحصیل علم کے بعد اپنے گاؤں (بڈھیمال) میں انھوں نے مسندِ درس بچھائی اور طلباء کو پڑھانا شروع کیا۔ اس وقت دیہات کے دینی مدارس میں رجسٹر وغیرہ میں طلباء کے نام لکھنے اور اس سلسلے کا ریکارڈ رکھنے کا رواج نہ تھا۔ طلباء آتے اور پڑھ کر چلے جاتے۔ نہ کسی کے آنے کو خاص اہمیت حاصل تھی اور نہ کسی کا جانا کوئی غیر معمولی واقعہ سمجھا جاتا تھا۔

خود ہمارے ہاں کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ) میں دو مدرسے جاری تھے، ایک جامع مسجد میں جہاں حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے مقامی اور غیر مقامی طلبا اکتساب علم کرتے تھے اور ایک حاجی نورالدین کی مسجد میں جہاں حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کا سلسلۂ درس جاری تھا، جس میں پندرہ بیس بیرونی طلبا داخل تھے، لیکن ان دونوں مدارس میں نہ کسی رجسٹر میں طلبا کے نام درج تھے اور نہ ان کی حاضری وغیرہ کا انتظام تھا اور نہ اس قسم کی باتوں کا کسی کو خیال تھا۔

علاوہ ازیں اس زمانے کے دیہات (بلکہ قصبات میں بھی) بچوں کی ولادت وغیرہ کی سرکاری یا غیر سرکاری طور پر تاریخیں لکھنے اور محفوظ رکھنے کا بھی التزام نہیں کیا جاتا تھا۔ وفات کی تاریخ بھی ضبط تحریر میں نہیں لائی جاتی تھی۔ لہٰذا کسی عالم یا عام شخص کے بارے میں اس قسم کی معلومات حاصل نہ ہوسکیں تو چنداں تعجب کی بات نہیں۔ ولادت و وفات کا معاملہ بالعموم کسی بڑے اور اہم واقعہ سے منسلک کردیا جاتا تھا۔ یعنی فلاں شخص کی ولادت یا وفات اس سال ہوئی تھی، جس سال بہت بارشیں ہوئی تھیں یا قحط پڑا تھا یا فلاں مقام پر فسادات ہوئے تھے یا فلاں بیماری پڑی تھی یا فلاں کی شادی یا فلاں کی غمی کا موقع رونما ہوا تھا۔ خود مجھ سے ایک مرتبہ میرے گاؤں میں مولانا عبدالغنی بڈھیمالوی کے ایک پوتے کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے مجھے کہا: تم اتنے لوگوں کے حالات لکھتے ہو، ہمارے بزرگوں کے متعلق بھی کچھ لکھو۔ میں نے جواب دیا: آپ اپنے بزرگوں کے تھوڑے بہت حالات دیجیے، میں ضرور لکھوں گا۔ میری اس گزارش کے جواب میں انھوں نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے: ''میری شادی ۱۹۵۹ء میں ہوئی تھی، وہ شادی میں شامل تھے، اس کے کچھ عرصہ بعد فوت ہوئے۔''

خوانندگانِ محترم فیصلہ فرمائیں کہ اس متن کی جو مختصر ترین سے بھی مختصر ہے، یہ فقیر کیا تشریح کرسکتا ہے۔ شخصیات سے متعلق اس فقیر کی سولہ سترہ کتابیں چھپ چکی ہیں، جن میں برصغیر کے (یعنی پاکستان،

Marfat.com

ہندوستان، بنگلہ دیش بلکہ نیپال کے بھی) ہزاروں اہل علم کے حالات معرضِ تحریر میں آ گئے ہیں۔اس موضوع پر لکھ کر مجھے بے حد مسرت ہوتی ہے۔جن حضرات کے واقعاتِ حیات کا مجھے علم ہو، ان سے متعلق کسی سے پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔لیکن جن کے بارے میں معلومات میسر نہ ہوں، ان کے لیے کسی نہ کسی کے دروازے پر دستک دینا ضروری ہوتا ہے۔بڈھیمالوی اصحابِ علم سے میری قرابت داری بھی ہے۔ان میں سے جن حضرات کے حالات سے میں ذاتی طور پر آگاہ ہوں، ان پر بغیر کسی سے پوچھے لکھ دیا گیا ہے، جسے خوانندگانِ محترم میری کتابوں (قافلہ حدیث، دبستان حدیث، گلستانِ حدیث، چمنستانِ حدیث، تذکرہ صوفی محمد عبداللہ مرحوم ومغفور اور زیر مطالعہ کتاب بوستانِ حدیث) میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔معلومات کی دست یابی کے مطابق کسی صاحب کے حالات خاصی تفصیل سے لکھے گئے ہیں، کسی کے اختصار سے! یہاں تحدیث نعمت کے طور پر عرض کردوں کہ یہ فقیر پہلا شخص ہے، جس کو اللہ نے توفیق بخشی اور بڈھیمالوی اصحابِ علم کے احوال قلم بند کیے اور کتابوں میں چھپے۔

اب پھر حضرت مولانا عبدالغنی بڈھیمالوی کی طرف آیے۔!

مولانا ممدوح کھاتے پیتے گھرانے کے فرد اور زمینوں کے مالک تھے۔عالی اخلاق اور خوش کردار بزرگ۔صالحیت اور تقوے کی نعمت بھی اللہ نے ان کو ودیعت فرمائی تھی اور ان کے دم درودوں میں بڑی تاثیر تھی۔سرکاری دربار میں بھی انھیں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔وہ ہم درد خلائق اور نرم خو عالم دین تھے۔پنجاب کے مشہور علماء ان کی تکریم کرتے تھے۔کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ) کی انجمن اصلاح المسلمین کا ہر سال تبلیغی جلسہ منعقد ہوتا تھا، جس میں بہت سے ممتاز علمائے کرام کو دعوتِ شرکت دی جاتی تھی، وہ تشریف لاتے اور لوگوں سے خطاب فرماتے تھے، مولانا عبدالغنی صاحب کو بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ہمارے ہوش سنبھالنے سے قبل کی بات ہے ایک مرتبہ مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور ان کے چچا زاد بھائی مولانا حافظ محمد زکریا غزنوی انجمن کے سالانہ جلسے میں تشریف لے گئے تھے۔یہ ان دونوں حضرات کی بھرپور جوانی کا زمانہ تھا۔جلسے میں شمولیت کے بعد وہ دونوں مولانا عبدالغنی سے ملاقات کے لیے بڈھیمال گئے تھے۔

اب آگے چلیے۔!

انگریزی حکومت کی گرفت سے برصغیر ۱۴۔اگست ۱۹۴۷ء کو آزاد ہوا تھا اور اس وقت (جیسا کہ سب کو معلوم ہے) اس پورے خطۂ ارض میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان فسادات پھیل گئے تھے۔ہم لوگ آزادی سے سات دن بعد چھوٹے بڑے ۳۰ افراد صبح چھ بجے بذریعہ ٹرک اپنے وطن کوٹ کپورہ سے روانہ ہوئے اور سورج غروب ہونے کے بعد آٹھ بجے قصور پہنچے تھے۔کوٹ کپورہ سے قصور تک کا فاصلہ تقریباً ساٹھ

Marfat.com

کلومیٹر ہے۔ یہ فاصلہ ہم نے ٹرک پر چودہ گھنٹوں میں طے کیا تھا۔ قصور آ کر پہلی رات ہم نے ایک سرائے میں بسر کی۔ میرے والد یا کوئی اور بڑی عمر کے شخص ہمارے ساتھ نہیں آئے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ہم صدیوں سے یہاں رہ رہے ہیں، ہمیں اپنے گھروں سے کوئی نہیں نکال سکتا۔ بہرکیف اس موقعے پر عرض یہ کرنا مقصود ہے کہ دوسرے دن ۲۲۔ اگست کو صبح سات بجے کے قریب میں مولانا عبدالقادر قصوری کے فرزند گرامی مولانا محمد علی قصوری ایم اے کینٹب کی کوٹھی پر گیا تو وہاں مولانا عبدالغنی صاحب اور بڈھیمال کے دیگر حضرات سے ملاقات ہوئی۔ بڈھیمال ریتلا علاقہ تھا اور کھیتی باڑی کے لیے یہ لوگ اونٹوں سے کام لیتے تھے۔ قصور میں یہ اونٹوں ہی پر آئے تھے۔

مولانا محمد علی قصوری نے ان لوگوں سے کہا کہ آپ لوگ زمینوں کے مالک ہیں۔ ہم قصور کے اردگرد آپ کو کسی گاؤں میں بڈھیمال کی زمینوں سے اچھی زمین الاٹ کرادیں گے، آپ یہیں رہ جایے۔ آپ کی وجہ سے اس علاقے کی جماعت اہل حدیث بھی مضبوط ہوگی اور آپ اپنے وطن سے قریب بھی ہوں گے۔ ملکی حالات بہتر ہوئے تو آسانی سے اپنے وطن (بڈھیمال) پہنچ جائیں گے۔ مولانا محمد علی قصوری کی یہ بات مولانا عبدالغنی اور ان کے ساتھیوں کے دل میں بیٹھ گئی تو مولانا عبدالغنی صاحب نے مجھے بھی فرمایا: ''ایتھے کتے نیڑے ای رہ پیے (یہاں کہیں قریب ہی رہ پڑیں)۔ بار بار انھوں نے ''نیڑے'' کا لفظ استعمال فرمایا تو میں نے عرض کیا: ''کاہدے نیڑے''؟ (کس کے نزدیک؟) بولے: ''اپنے پرانے وطن دے۔''

عرض کیا: جناب! اپنے پرانے وطن کو بھول جایے۔ ملک نہایت کھچاؤ، تناؤ اور دشمنی کی فضا میں تقسیم ہوا ہے۔ یہ کیفیت پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں کے لوگوں پر ہمیشہ تسلط جمائے رکھے گی اور ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل ہوتی رہے گی، جس کا نتیجہ دونوں ملکوں میں لڑائیوں کی صورت میں سامنے آتا رہے گا اور سرحد کے قریب رہنے والے ہر وقت سخت پریشانیوں میں مبتلا رہیں گے۔

اس سے کچھ دن بعد بڈھیمال کے لوگ تحصیل جڑاں والا کے ایک گاؤں چک نمبر ۳۶ میں جا آباد ہوئے۔ یہ گاؤں جڑاں والا سے سترہ اٹھارہ کلومیٹر دور اور ستیانہ بنگلہ سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ حضرت مولانا عبدالغنی صاحب نے کم وبیش ۸۴ سال کی عمر کو پہنچ کر اسی گاؤں میں ۱۹۶۳ء میں وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.

افسوس ہے ان کی صحیح تاریخ وفات کا پتا نہ چل سکا۔ تحقیق کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ امید ہے ان کے پوتے مولانا عبدالرحمٰن اور پڑپوتے مولانا ریاض الدین یا کوئی اور صاحب کسی طرح ان کے حالات جمع کرنے اور لکھنے کی کوشش کریں گے۔

Marfat.com

علامہ خلیل عرب

(وفات ۲۶۔ اگست ۱۹۶۶ء)

پورا قد، مناسب جسم نہ فربہی کا غلبہ نہ پتلے دبلے، چوڑا چہرہ، کشادہ پیشانی، گندمی رنگ، بھاری کھنک دار آواز، بارعب لہجہ، موٹی آنکھوں پر نظر کی عینک۔ یہ تھے علامہ خلیل عرب۔ عظیم المرتبت علمی خانوادے کے جلیل القدر فرد۔ ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے: خلیل عرب بن شیخ محمد بن شیخ حسین بن محسن انصاری یمانی۔ یہ خاندان عرب کے ملک یمن سے تعلق رکھتا تھا، اس لیے لوگ انھیں علامہ خلیل عرب کہتے تھے۔ کسی زمانے میں ان کے اکابر بھوپال آئے اور پھر والیِ ریاست بھوپال حضرت نواب صدیق حسن خاں سے ان کے تعلقات استوار ہوئے۔ علامہ خلیل عرب وہیں ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۶ء) میں پیدا ہوئے۔ وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ قرآن مجید بھی اسی شہر میں حفظ کیا۔ کتب حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مولانا سید امیر علی ملیح آبادی سے پڑھیں۔ وہیں ان کے والد مکرم شیخ محمد انصاری یمنی عربی ادب کے استاذ تھے، ان سے عربی ادبیات میں استفادہ کیا۔ نہایت ذہین اور حصولِ علم کے بے حد حریص۔ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے ہی سندِ فراغ لی۔

تدریسی زندگی کا آغاز ۱۹۱۳ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کی پروفیسری سے کیا۔ اس وقت اس کے پرنسپل مسٹر اے ایچ ہارلے ایم اے کینٹب تھے۔ علامہ خلیل عرب کا شمار عربی کے ماہرین میں ہوتا تھا، اس کی اطلاع مدرسہ عالیہ کے پرنسپل کو ہوئی تو انھوں نے ان کو باقاعدہ دعوتِ تدریس دی اور عربی کے پروفیسر کے طور پر ان کی خدمات حاصل کی گئیں۔ پرنسپل صاحب خود بھی عربی پڑھنے کے خواہاں تھے، چنانچہ انھوں نے ان سے عربی پڑھنا شروع کی۔ پرنسپل اور مدرسہ عالیہ کے ارکان انتظامیہ ان کے طریقِ تدریس سے بہت متاثر تھے اور طلبا بے حد شوق سے ان سے استفادہ کرتے تھے۔

قیامِ کلکتہ کے زمانے میں علامہ خلیل عرب، سید نواب علی چودھری بوگرہ کے ہاں مقیم تھے۔ اسی دوران وہاں ڈاکٹر ضیاء الدین سیڈلر کمیشن میں آئے۔ یہ کمیشن یورپ سے مدرسہ عالیہ کیطریق تدریس سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے آیا تھا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین بھی اس کمیشن کے رکن تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے توسط سے کیتھرن کالج لندن کے پرنسپل ڈاکٹر ہربرٹ لوئی نے علامہ خلیل عرب سے عربی کی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش کی، چنانچہ علامہ کچھ عرصہ انھیں عربی پڑھاتے رہے۔ آٹھ سال علامہ خلیل عرب نے مدرسہ عالیہ

Marfat.com

کلکتہ میں طلباء کو عربی پڑھائی۔

۱۹۲۱ء میں وہ سینئر لیکچرر کی حیثیت سے ڈھاکہ یونیورسٹی چلے گئے۔ وہاں گئے ابھی ڈیڑھ سال ہوا تھا کہ لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر کی جگہ خالی ہوئی اور اس یونیورسٹی کی مجلس انتظامہ نے ان کو لکھنؤ بلا لیا۔

علامہ ممدوح پندرہ سال لکھنؤ یونیورسٹی میں بہ طور پروفیسر خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۹۳۷ء میں استعفا دے کر بھوپال آ گئے۔ بھوپال ان کا مقام ولادت، ان کے بزرگوں کا مسکن اور علما کا مرکز تھا۔ وہاں انھیں بڑی پذیرائی ملی اور انھیں مستحق احترام سمجھا گیا۔ شہزادی عابدہ سلطانہ نے ان سے قرآن مجید کی تفسیر پڑھنا شروع کی، پرنس شہریار محمد خاں کے وہ اتالیق مقرر کیے گئے اور ریاست بھوپال کی مجلس علما کے انھیں رکن بنایا گیا۔

علامہ ممدوح تجربہ کار مدرس اور اپنے عہد کے بہت اچھے مقرر تھے۔ ان کے شاگردوں کی فہرست میں سید ابوالحسن علی ندوی، شہزادی عابدہ سلطانہ، ڈاکٹر ہربرٹ لوئی، مسٹر اے ایچ ہارلے، ڈاکٹر سید محمد معظم حسین سابق وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی، مولانا میزان الرحمٰن سابق پروفیسر ڈھاکہ یونیورسٹی، ان کی صاحب زادیاں رقیہ اور عطیہ، (محترمہ عطیہ کراچی یونیورسٹی کے شعبہ عربی کی چیئرپرسن رہیں) علامہ مرحوم کے دو بھائی شیخ حسین بن محمد انصاری اور شیخ عبید بن محمد انصاری، علامہ مرحوم کے فرزند گرامی محمد بن خلیل عرب اور دیگر بے شمار لوگ۔

علامہ ممدوح نے عربی تدریس کے سلسلے کی چند کتابیں بھی لکھیں جو اپنے موضوع کی نہایت اہم کتابیں ہیں۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے ایک مرتبہ بتایا کہ ربیع الاول کے مہینے میں لکھنؤ میں نبی ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے موضوع پر مختلف مقامات میں جلسے منعقد کیے جاتے تھے۔ منتظمین علمائے کرام کو بلاتے اور وہ تقریریں کراتے تھے۔ بعض علما اس قسم کے جلسوں میں نہیں جاتے تھے لیکن علامہ خلیل عرب ضرور جاتے تھے۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ہم نہیں جائیں گے تو اور قسم کے مقرر تقریریں کریں گے اور لوگوں کو اِدھر اُدھر کی باتیں سنائیں گے۔ ہمیں جلسوں میں جانا چاہیے اور سیرت کے موضوع پر صحیح واقعات بیان کرنے چاہئیں، چنانچہ علامہ جلسوں میں شریک ہوتے اور نبی ﷺ کی سیرت پاک سے متعلق تقریر کرتے۔ ان کی تقریر سے لوگ بڑے متاثر ہوتے۔

اس فقیر کو علامہ خلیل عرب کی زیارت اور ان کی خدمت میں حاضری کا شرف مرکزی جمعیت اہل حدیث کی چوتھی سالانہ کانفرنس کے موقعے پر حاصل ہوا۔ جو ۱۲، ۱۳، ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو گوجرانوالا میں ان کی زیر صدارت منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس کے صدر استقبالیہ مولانا محمد اسماعیل سلفی تھے جنھوں نے اس میں تحریری خطبہ صدارت پڑھا تھا۔ ان کے بعد علامہ خلیل عرب نے اپنا خطبہ صدارت ارشاد فرمایا جو طویل بھی تھا اور

Marfat.com

بہ درجہ غایت علمی بھی۔

اس کانفرنس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس موقعے پر خواتین کانفرنس بھی ہوئی تھی، جس کی صدارت علامہ کی صاحب زادی محترمہ عطیہ خلیل عرب نے کی تھی اور اس میں محترمہ نے خطبۂ صدارت پڑھا تھا۔ یہ خطبہ بہت سی معلومات کا پُر تاثیر مجموعہ تھا۔ علامہ مرحوم کی یہ بیٹی ذہین عالمہ ہیں۔ ❶ دونوں باپ بیٹی کراچی میں فروکش تھے اور وہیں سے تشریف لائے تھے۔ عطیہ خلیل عرب کے خطبے سے خواتین بہت متاثر ہوئی تھیں۔

کانفرنس سے فارغ ہو کر علامہ مرحوم اپنی صاحب زادی کے ساتھ لاہور تشریف لے آئے تھے۔ تقریباً ایک ہفتہ ان کا یہاں قیام رہا۔ اس فقیر کو ان کی میزبانی کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس وقت میں اندرون بھاٹی گیٹ رہتا تھا۔ میں نے علامہ مرحوم کو نہایت قریب سے دیکھا اور ان کے ارشادات سنے۔ مولانا محی الدین احمد قصوری، مولانا محمد حنیف ندوی اور بہت سے دیگر حضرات بھی ان کے پاس تشریف لاتے اور ان سے گفتگو فرماتے۔

میری مرحومہ بیوی اہل علم کی مہمان نوازی کو اپنے لیے سعادت سمجھتی تھی۔ ایک دن اس نے مچھلی کا پلاؤ پکایا۔ اس دن علامہ خلیل عرب اور ان کی صاحب زادی عطیہ کے علاوہ مولانا محی الدین احمد قصوری اور چند اور حضرات کو بھی بلایا گیا تھا۔ علامہ اور ان کی صاحب زادی نے بالخصوص اس پلاؤ کو بہت پسند فرمایا۔ محترمہ عطیہ کا میری بیوی سے دوستانہ ہو گیا تھا اور وہ اسے بھابی کہا کرتی تھیں۔

اس کانفرنس کے بعد عطیہ صاحبہ سے دو تین مرتبہ ملاقات ہوئی۔ ایک مرتبہ وہ لاہور آئیں اور ماڈل ٹاؤن میں کہیں مقیم ہوئیں۔ مجھے ٹیلی فون پر اطلاع دی تو میں رات کو ان کی قیام گاہ پر گیا اور تقریباً ایک گھنٹا ان سے باتیں ہوئیں۔ دوسرے دن وہ میرے اس وقت کے دفتر ادارہ ثقافت اسلامیہ تشریف لائیں۔

بہر کیف عرض یہ کرنا مقصود ہے کہ علامہ خلیل عرب اپنے دور کے جید عالم تھے۔ عربی ادبیات پر عبور رکھتے تھے۔ ان کے اسلاف بھی علم کی دولت سے مالا مال تھے اور ان کے اخلاف بھی اس نعمت سے بہرہ ور ہیں۔ علامہ مرحوم قیام پاکستان کے بعد اپنے خاندان کے ساتھ بھوپال سے کراچی آ گئے تھے، وہیں ۲۶۔ اگست ۱۹۶۶ء کو ان کا انتقال ہوا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون.

❀❀❀❀

❶ محترمہ عطیہ خلیل عرب ۴۔ جنوری ۲۰۱۶ء کو دبئ میں تقریباً ۸۵ سال کی عمر میں وفات پا گئیں۔ (عمر فاروق قدوسی)

Marfat.com

مولانا ملک عبدالعزیز ملتانی

(وفات ۹۔جولائی ۱۹۶۹ء)

بلدۂ ملتان میں بے شمار علمائے دین پیدا ہوئے، جنھوں نے تصنیف وتدریس اور خطابت وتقریر کی صورت میں بہ درجہ غایت خدمات سرانجام دیں۔ علماء کی اس جماعت میں ایک جلیل القدر عالم مولانا ملک عبدالعزیز ملتانی تھے، جن کا سالِ ولادت ۱۸۹۴ء ہے۔ ان کے والد کا نام ملک نبی بخش تھا اور وہ ارائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی اچھی خاصی زمین تھی اور کاشت کاری ان کا پیشہ تھا۔ ان کے خاندان میں کسی شخص کو علم سے تعلق نہ تھا۔

اس وقت ملتان میں دو علمائے دین حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد تھے، ایک مولانا عبدالحق ملتانی جو محلہ قالین بافاں حسین آگاہی میں درس وتدریس اور وعظ وخطابت میں مشغول تھے اور دوسرے تھے مولانا عبدالتواب ملتانی جن کی محلّہ قدیرآباد میں مسندِ درس آراستہ تھی۔ ملک عبدالعزیز ملتانی ان حضرات کی مجلسوں میں حاضر ہوتے اور دینِ اسلام کے بارے میں ان کی باتیں بڑے شوق سے سنتے تھے۔ پھر یہی شوقِ سماعت ان کو حصولِ علم کی وادی میں لے گیا۔ انھوں نے مولانا عبدالحق ملتانی سے بھی مروّجہ علوم کی تحصیل کی اور مولانا عبدالتواب ملتانی سے بھی خوب استفادہ کیا۔

ان دونوں بزرگانِ عالی منزلت سے اخذ فیض کے بعد سیالکوٹ کا عزم کیا اور مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کی خدمتِ عالی میں حاضری دی۔ مولانا سیالکوٹی اس وقت فارغ التحصیل حضرات کو تفسیر قرآن کا درس دیتے تھے، مولانا ملک عبدالعزیز ملتانی نے ان سے تفسیرِ قرآن پڑھی۔ مولانا سیالکوٹی کا شمار بھی حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذۂ گرامی میں ہوتا تھا۔

مولانا عبدالعزیز ملتانی نے مناظرانہ طبیعت پائی تھی اور مختلف مسائل میں بحث ومباحثہ کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔ پھر جیسے جیسے مطالعہ کی حدود بڑھتی گئیں، ان کے مباحث کا دائرہ پھیلتا گیا۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری سے ملاقاتیں شروع ہوئیں تو انھوں نے ان کو فنِ مناظرہ کے اصول بتائے اور مختلف افکار سے تعلق رکھنے والے مناظرین سے جس انداز میں مناظرہ کرنا چاہیے، ان کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ اس طرح انھوں نے ملتان کے بہت بڑے مناظر کی حیثیت سے شہرت پائی۔ مولانا ثناء اللہ بھی حضرت میاں سید نذیر حسین رحمۃ اللہ علیہ

Marfat.com

کے شاگرد تھے۔

مولانا عبدالعزیز ملتانی نے دہلی کی طرف بھی شدِّ رحال کیا اور مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور ان سے کتابیں پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔ وہ بھی حضرت میاں صاحب کے شاگرد تھے۔ اس طرح مولانا ملک عبدالعزیز ملتانی نے حضرت میاں صاحب کے پانچ تلامذہ کی بارگاہِ علم میں زانوئے تلمذ تہہ کیے۔

اس وقت ضلع فیروزپور کی ایک چھوٹی سی بستی ''بڈھیمال'' میں مولانا عبدالرحمٰن بڈھیمالوی کا سلسلہ درس جاری تھا۔ اپنے نام کی مناسبت سے مدرسے کا نام انھوں نے مدرسہ رحمانیہ رکھا تھا۔ مولانا ممدوح خاصی زمینوں کے مالک تھے اور اپنے گاؤں (بڈھیمال) کے نمبردار تھے۔ عالم جوانی میں وفات پا گئے تھے۔ مشہور مدارس شیخ الحدیث حافظ عبداللہ بڈھیمالوی، حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی اور جامعہ سلفیہ کے شیخ الحدیث حافظ عبدالعزیز علوی کا تعلقِ سکونت اسی گاؤں سے تھا۔ افسوس ہے مولانا عبدالرحمٰن بڈھیمالوی کے حالات کا علم نہ ہوسکا۔ یہ بھی پتا نہیں کہ انھوں نے کن علمائے کرام سے تعلیم حاصل کی۔ تقسیم ملک سے کئی سال پہلے حافظ عبدالعزیز علوی کے دادا میاں قادر بخش نے ان کے حالات پر مشتمل پنجابی نظم میں کتاب لکھی تھی، اب وہ کتاب کہیں نہیں ملتی۔ بہرحال یہاں عرض یہ کرنا مقصود ہے کہ مولانا ملک عبدالعزیز ملتانی نے بڈھیمال جا کر مولانا عبدالرحمٰن بڈھیمالوی سے بھی کسبِ علم کیا تھا۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا عبدالعزیز ملتانی نے چار عمل شروع کیے جن میں بڑا نام پایا۔ وہ عمل تھے:

☆......درس وتدریس

☆......تقریر وخطابت

☆......تصنیف وتالیف

☆......مناظرات ومباحث

اب ان اعمالِ اربعہ کی ترتیب وار تھوڑی سی وضاحت۔

اس زمانے میں ملتان کے عام خاص باغ میں جامعہ محمدیہ کے نام سے جماعت اہل حدیث کا دارالعلوم جاری تھا (جواب بھی جاری ہے) مولانا عبدالعزیز ملک کو اس کے مہتمم اور شیخ الحدیث بنایا گیا۔ مولانا ممدوح اس میں باقاعدگی سے خدمت تدریس انجام دیتے تھے۔ اس خدمت کا وہ جماعت سے کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے۔ ان کا معمول یہ تھا کہ وہ صبح کے وقت اپنے ذاتی تانگے پر مدرسے جاتے اور مسندِ تدریس پر بیٹھ کر طلبا کو پڑھانا شروع کردیتے۔ ملتان کے بیرون دہلی گیٹ ان کی آڑھت کی دکان تھی۔ تدریس سے فارغ ہو کر

Marfat.com

دکان پر تشریف لے جاتے۔ ظہر کے وقت واپس مدرسے آتے، نماز ظہر ادا کرنے کے بعد قیلولہ کرتے۔ پھر جامعہ کے سلسلے کے ضروری امور نمٹاتے اور لوگوں کے استفتا وغیرہ کا جواب دیتے۔ جامعہ محمدیہ میں عصر کی نماز ادا کرنے کے بعد اپنے تانگے پر گھر تشریف لے جاتے۔ اس دور میں ان سے بے شمار طلباء نے تعلیم حاصل کی، جن میں حافظ عزیز الرحمٰن لکھوی بن استاذِ پنجاب حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی، قاضی محمد اسلم سیف فیروز پوری، مولانا عبدالرحمٰن عتیق وزیر آبادی، مولانا محمد صدیق مظفر گڑھی، حافظ بشیر احمد بھوجیانی، مولانا محمد یاسین بیکانیری، مولانا محمد بلال شجاع آبادی اور دیگر بہت سے حضرات شامل ہیں۔ ان میں سے بہت سے حضرات وفات پا گئے ہیں اور کچھ زندہ ہیں۔ تحصیل علم کے بعد انھوں نے علمی اعتبار سے بڑی خدمات سرانجام دیں۔

مولانا عبدالعزیز کے علاوہ اس وقت جامعہ محمدیہ عام خاص باغ میں جو حضرات خدمتِ تدریس انجام دیتے تھے، وہ تھے مولانا عبدالرحمٰن لکھوی بن مولانا عطاء اللہ لکھوی، مولانا محمد عبدہ الفلاح، مولانا شمس الحق ملتانی، مولانا شرف الحق ملتانی، مولانا عبدالبصیر فاروقی اور دیگر متعدد علمائے کرام۔ یہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔

اب آیئے ان کی تقریر وخطابت کی طرف۔!

مولانا عبدالعزیز ملتانی کی تقریر وخطابت اور تبلیغی سرگرمیوں کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا۔ متحدہ پنجاب کے مختلف مقامات میں ان کے مواعظ کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس ضمن میں انھوں نے مولانا عبدالحق ہاشمی (احمد پور شرقیہ)، مولانا عبدالمجید سوہدروی، مولانا سلطان محمود (جلال پور پیروالا)، مولانا عبدالعزیز چورہوٹی ڈیروی اور دیگر مشاہیر علمائے کرام کے ساتھ بہت سے مقامات میں تقریریں کیں۔ ان کی تقریر بڑی موثر ہوتی تھی اور بڑے شوق سے لوگ ان کا وعظ سنتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ جامع مسجد اہل حدیث سبیل والی چوک گھنٹا گھر ملتان میں پچیس سال سے زیادہ عرصے تک خطبۂ جمعہ ارشاد فرماتے رہے۔ یعنی زندگی کے آخری دور تک یہ سلسلہ جاری رکھا۔

اب تصنیف وتالیف کے بارے میں

مولانا عبدالعزیز ملتانی تصنیف وتالیف کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ قلم کی زبان صاف تھی اور تحقیق سے لکھتے تھے۔ انھوں نے شیعی نقطۂ نظر سے متعلق بھی چند رسائل لکھے اور احناف سے متعلق بھی۔ مرزائیت کی تردید میں بھی ان کا قلم متحرک رہا۔ شیعہ کے بارے میں ان کے رسائل یہ ہیں:

(۱) فیصلہ قاتلانِ حسین (۲) فیصلہ نکاح ام کلثوم (۳) فیصلہ حدیث قرطاس (۴) فیصلہ باغ فدک (۵) اہتمام جنازہ خیرالانام (۶) خلافت صادقہ (۷) روداد شیعہ سنی مناظرہ اور فضائل خلفائے صادقین۔ مولانا

Marfat.com

عبدالمنعم فاروقی نے ان تمام رسائل کو یک جا کر کے اپنے فاروقی کتب خانہ، ❶ ملتان کی طرف سے شائع کیا۔ شیعی نقطۂ نظر کی تردید میں یہ رسائل بڑے اہم ہیں۔

احناف سے متعلق ان کی تصانیف یہ ہیں:

۱۔ استیصال التقلید: اس کتاب میں قرآن وحدیث، اقوالِ صحابہ، اقوال تابعین، اقوال ائمہ اربعہ اور اقوال اولیا وصوفیہ کی روشنی میں تقلید کا رد کیا گیا ہے۔

۲۔ تبرید العینین فی اثبات رفع الیدین: اس میں ثابت کیا گیا ہے کہ نماز میں رفع یدین کرنی چاہیے۔

۳۔ رسالہ قراۃ خلف الامام اور تحقیق تراویح۔

یہ رسالے بھی مولانا عبدالمنعم فاروقی نے فاروقی کتب خانہ، ملتان کی طرف سے یک جا چھاپ دیے ہیں۔

مرزائیت کی تردید میں ان کے رسائل یہ ہیں:

۱۔ اکاذیب مرزا۔

۲۔ حیات مسیح۔

ان رسالوں میں مرزائیت کا خوب محاسبہ کیا گیا ہے۔

مولانا نے ایک رسالہ ''فضائل درود شریف'' لکھا۔ پہلے رسائل کی طرح یہ رسالہ بھی طبع ہو چکا ہے۔

مولانا عبدالعزیز ملتانی کی لائبریری بہت سی کتابوں پر مشتمل تھی جو شیخ عبدالرشید صدیقی اور مولانا ابوحفص عثمانی کی کوشش سے ان کے ورثاء نے جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) کو دے دی تھی۔

مولانا ممدوح کا شمار چوٹی کے مناظرین میں ہوتا تھا۔ انھوں نے مختلف مناظرین سے مناظرے کیے اور جس موضوع پر مناظرہ کیا، اس کے تمام پہلوؤں کی بہت اچھے انداز میں وضاحت فرمائی۔

ملتان میں ان کی موروثی زمین بھی تھی اور کاروبار بھی کرتے تھے، اس بنا پر وہ مالی اعتبار سے آسودہ حال عالم تھے۔ درس وتدریس اور خطابت وغیرہ کے سلسلے میں کسی سے کوئی پیسا نہیں لیتے تھے۔

میں نے مولانا عبدالعزیز ملتانی کو پہلی مرتبہ ۱۹۵۴ء کے اپریل کے ابتدائی دنوں میں دیکھا تھا، جب ملتان میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کی دوسری کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ کانفرنس کے صدر مولانا محمد علی قصوری

---

❶ فاروقی کتب خانہ، ملتان، جماعت اہل حدیث کا ایک تاریخی مکتبہ تھا۔ گردش ایام سے یہ ادارہ ختم ہو چکا ہے۔ اب یہ ایک چھوٹی سی دُکان ہے، جہاں عام سی کتب فروخت ہوتی ہیں۔ مولانا عبدالتواب محدث ملتان نے یہ ادارہ قائم کیا تھا۔ وہ علم دوست شخصیت تھے۔ فاروقی کتب خانہ بعض بیش قیمت اور نادر کتب شائع کر چکا ہے۔ فاروقی کتب خانہ کے مالکان کو جن آزمائشوں سے گزرنا پڑا، اگر کسی باطنی تحریک سے وابستہ ادارے کو ان نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑتا، ایسا ادارہ کبھی ختم نہ ہوتا۔ مولانا عبدالتواب کے پوتے مولانا عبدالمنعم کتنے ہی برس ناکردہ گناہ کی پاداش میں پابند سلاسل رہے۔ یہاں تک کہ ادارہ ہی ختم ہو گیا۔ (عمر فاروق قدوسی)

Marfat.com

ایم اے کینٹب اور صدر استقبالیہ مولانا محمد اسحاق چیمہ تھے۔ میں اس وقت اخبار ''الاعتصام'' کا ایڈیٹر اور جمعیت اہل حدیث کا آفس سیکرٹری تھا۔ مولانا عبدالعزیز مقامی حیثیت سے اس کانفرنس کی اہم شخصیت تھے۔ طویل قامت، گندمی رنگ، بلند آہنگ اور فیصلہ کن اندازِ کلام۔ کانفرنس کے بعد لاہور میں کئی دفعہ ان سے ملاقات ہوئی۔ مجھے ہمیشہ شفقت کا مستحق گردانا۔ اس حسنِ اخلاق کے لوگ اب کہاں پیدا ہوں گے۔

انھوں نے ۷۵ سال کی عمر میں ۹۔ جولائی ۱۹۶۹ء کو دوپہر ڈیڑھ بجے وفات پائی۔ نماز جنازہ شب کے دس بجے مولانا عزیز الرحمٰن سعیدی (بستی چٹھہ والا) نے پڑھائی، جس میں علمائے کرام کی کثیر تعداد سمیت لوگوں کے جمِ غفیر نے شرکت کی۔ اس عالم جلیل کو جنرل بس سٹینڈ کے قریب پھاٹک کے ساتھ ان کے آبائی قبرستان میں دفن کردیا گیا۔

اللهم اغفر له وارحمه وعافه واعف عنه

افسوس ہے ان کی اولاد میں سے علم وعمل میں کوئی بھی باپ کا وارث نہ ہوسکا۔

❁❁❁❁

Marfat.com

مولانا اشرف الحق محمود ملتانی

(وفات ۱۵۔فروری ۱۹۷۱ء)

میانہ قد، گندم گوں، قدرے چوڑا چہرہ، خوش گفتار اور شگفتہ مزاج، علم وعمل کا پیکر حسین، عمدہ خصال اور شریف النفس، کارِ خیر کے لیے ہر آن متحرک، بہترین مدرس اور پُر جوش مقرر۔ یہ تھے مولانا شرف الحق محمود ملتانی۔ حضرت مولانا عبدالحق ملتانی کے چھوٹے صاحب زادے اور مولانا شمس الحق ملتانی کے برادرِ صغیر۔

۱۹۲۰ء کے آس پاس ملتان میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول ملتان میں مڈل پاس کیا اور علوم دینیہ کی پوری تعلیم اپنے والد ذی وقار مولانا عبدالحق سے حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے عربی فاضل اور فارسی فاضل کے امتحانات بھی پاس کیے۔

تحصیلِ علم کے بعد ملتان ہی میں مسندِ تدریس پر فائز ہوئے اور طلبا کی ایک جماعت کو تعلیم دی، جن میں حافظ عزیز الرحمٰن لکھوی، قاضی محمد اسلم سیف فیروز پوری، حافظ بشیر احمد بھوجیانی اور دیگر متعدد حضرات شامل تھے۔

کتبِ درسیہ پر عبور رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں عام مطالعہ وسیع تھا۔ امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم کی تصانیف سے خاص لگاؤ تھا اور ان کے افکارِ علمیہ سے بہت متاثر تھے۔

سیاسیات میں مجلس احرار سے منسلک تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور دیگر احراری اور کانگرسی راہنماؤں سے عملی اور ذہنی قرب تھا۔ تقسیم ملک سے قبل ان کی اور ان کے ہم نوا حضرات کی کوشش سے ملتان میں مجلس احرار کے مقرر کئی مرتبہ تشریف لائے اور عام جلسوں میں تقریریں کیں۔ تقسیم کے بعد سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو جو لوگ مستقل طور پر ملتان لے کر گئے ان میں مولانا شرف الحق محمود کا اسم گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

جماعت اہل حدیث کے جن علمائے ذی شان سے انھیں زیادہ عقیدت تھی، وہ تھے مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا حافظ عبداللہ روپڑی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، حافظ عبدالقادر روپڑی، حافظ اسماعیل روپڑی اور بعض دیگر حضرات۔ ملتان میں جمعیت تبلیغ اہل حدیث کے نام سے ایک تنظیم قائم کی گئی تھی، جس کے تبلیغی جلسوں میں روپڑی علمائے کرام کو بالخصوص دعوتِ شرکت دی جاتی تھی۔ ان کے علاوہ مولانا سلطان محمود جلال

Marfat.com

پوری، مولانا حافظ عبدالستار دہلوی، سید بدیع الدین شاہ راشدی، حافظ اسماعیل ذبیح اور مولانا محمد یوسف کلکتوی بھی ان تبلیغی اجتماعات میں تشریف لاتے اور اپنے مواعظِ حسنہ سے لوگوں کو مستفید فرماتے۔ نیز مولانا غلام اللہ خاں مرحوم اور سید عنایت اللہ شاہ گجراتی بھی ان کی دعوت پر ملتان تشریف لایا کرتے تھے۔

مولانا شرف الحق محمود خود بھی مقرر تھے اور ملتان کی جامع مسجد خواجگاں اہل حدیث میں خطبۂ جمعہ ارشاد فرماتے تھے۔

مولانا ممدوح کی وفات کا حادثہ اس طرح پیش آیا کہ وہ ملتان سے بذریعہ بس لاہور آ رہے تھے کہ رینالہ خورد کے قریب بس ایک ٹرک سے ٹکرا گئی اور مولانا کو شدید چوٹیں آئیں۔ انھیں پتوکی کے اسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ ان کے صاحب زادے ثناء الحق کو پتا چلا تو وہ پتوکی پہنچے اور والد مکرم کو بذریعہ ٹرین ملتان لائے اور انھیں نشتر اسپتال میں داخل کرا دیا گیا، لیکن ریڑھ کی ہڈی اور دماغ پر شدید ضربات آئی تھیں اور جسم پر گہرے زخم تھے۔ اس لیے وہ بے ہوشی کی حالت میں ۱۵۔ فروری ۱۹۷۱ء کو وفات پا گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون.

ان کا جنازہ ان کے بڑے بھائی مولانا شمس الحق ملتانی نے پڑھایا، جس میں ہر طبقہ فکر کے لوگ کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔

اللّٰھم اکرم نزلہ و وسع مدخلہ و ادخلہ الجنۃ الفردوس

مولانا شرف الحق کی نرینہ اولاد پانچ بیٹے ہیں، جس کی تفصیل اس طرح ہے۔

سب سے بڑے ثناء الحق شعیب ہیں۔ ابتدائی دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے بی کام کیا اور کراچی یونیورسٹی سے ایم کام کیا۔ پھر ایل ایل بی کیا۔ کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج آف کامرس ملتان میں پڑھاتے رہے۔ پھر اپنا کاروبار کرنے لگے۔

دوسرے بیٹے مولانا انیس الحق محمود ہیں۔ انھوں نے ملتان کے ملت ہائی سکول میں میٹرک کا امتحان دیا۔ پھر جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن میں داخلہ لیا اور تقریباً دو سال تعلیم حاصل کی۔ پھر تعلیم میں تعطل پیدا ہو گیا۔ بعد ازاں جلال پور پیر والا میں مولانا سلطان محمود صاحب اور مولانا محمد رفیق اثری اور مولانا اللہ یار سے چند کتابیں پڑھیں۔ جامعہ سلفیہ فیصل آباد میں بھی تعلیم حاصل کی۔ مدینہ یونیورسٹی میں بھی داخلہ لیا اور وہاں کا نصاب مکمل کیا۔ واپس آ کر ملتان کے دار الحدیث محمدیہ عام خاص باغ میں سلسلہ تدریس جاری کیا۔

تیسرے صاحب زادے عبدالحق زبیر ہیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد مکرم سے حاصل کی۔ بعد ازاں گورنمنٹ کالج ملتان سے بی ایس سی کر کے پاکستان نیوی میں ملازم ہو گئے۔ تقریباً پانچ سال ملازمت کی۔

Marfat.com

اب کاروبار کرتے ہیں۔

چوتھے بیٹے کا نام عامر محمود ہے۔ گورنمنٹ کالج سے ایف ایس سی کرنے کے بعد مدینہ یونیورسٹی چلے گئے۔ وہاں صرف دو سال رہے، واپس آ کر ایم اے انگلش کیا۔ اب کاروبار میں مصروف ہیں۔

پانچویں کاشف محمود ہیں، جنھوں نے ایم اے اسلامیات کر کے تجارت شروع کر دی۔

پانچوں بھائی مالی اعتبار سے آسودہ حال ہیں۔

(یہ سطور ۲۰۔ جون ۲۰۱۳ء کو لکھی گئیں۔)

Marfat.com

قاضی عبدالرحیم

(وفات ۲۷۔ فروری ۱۹۷۱ء)

میانہ قد، لاغر اندام، مختصر سی پوری ڈاڑھی، گورا رنگ، ایک ٹانگ میں لنگڑاہٹ، تیکھی ناک، باریک دانت، پتلے ہونٹ، نرم کلام، طبیعت میں حلم کا غلبہ، سنجیدہ طبع، بلند فکر، انکسار کا مجسمہ، تواضع کا پتلا، آنکھوں میں چمک، بہت اچھے طبیب، علم وعمل کے خوش نما پیکر، سیاست کے نشیب وفراز پر ماہرانہ نظر، مجلس خلافت کے راہنما، آزادئ وطن کے لیے سراپا جہد، انگریزی حکومت کے شدید ترین مخالف، شلوار قمیص میں ملبوس، پاؤں میں سرخ کھال کی جوتی، سر پر سفید ہلکا سا عمامہ، ہم دردی اور خیر خواہی میں یگانہ۔ یہ تھے قاضی عبدالرحیم جن کا آبائی مسکن قاضی کوٹ تھا جو گوجراں والا سے شمال مغرب میں ۱۵ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، لیکن وہ مدت سے گوجراں والا شہر میں قیام پذیر تھے اور چوک نیائیں میں حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کی مسجد کی ایک دکان میں طبابت کرتے تھے۔ یہ دکان انھوں نے مسجد کی انجمن اہل حدیث سے کرائے پر لی تھی۔

اب آیے ان کے حالات کی طرف! قاضی صاحب ۱۷۔ دسمبر ۱۸۸۴ء (۲۹۔ صفر ۱۳۰۲ھ) کو قاضی کوٹ میں پیدا ہوئے۔ اس گاؤں کا پہلا نام شہزاد پور تھا۔ مغل حکومت کے عہد زوال میں جب ہر طرف بدامنی پھیلی تو اس خاندان نے یہاں سکونت اختیار کر لی اور پھر اس خاندان کی وجہ سے اسے قاضی کوٹ کہا جانے لگا اور اسی نام سے اس نے شہرت پائی۔ اس گاؤں میں اس خاندان کے لوگوں کی اچھی خاصی زمینیں تھیں۔ اس گاؤں کے بعض افراد جو قاضی صاحب کے قریبی رشتے دار تھے، ''بم کیس'' میں بھی ملوث تھے۔ یہ اسلحہ یا بم وہ مجاہدین کو بھیجنا چاہتے تھے جو آزاد علاقے میں انگریزی حکومت سے جہاد کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں ان کو گرفتار کیا گیا اور ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ قاضی کوٹ کے اس مقدمے نے سیاسی حلقوں میں بڑی شہرت پائی تھی۔ یہ ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے اور ۱۹۲۱ء میں اس کا فیصلہ ہوا۔ ملزموں کو قید ہوئی اور جرمانہ بھی ہوا۔

یہ عجیب وغریب قسم کا کیس ہے۔ لیکن اس کی تفصیل ان شاء اللہ اس کتاب میں بیان کی جائے گی جو یہ فقیر ''برصغیر میں اہل حدیث کی سیاسی سرگزشت'' کے نام سے لکھنا چاہتا ہے۔ ❶

قاضی صاحب کا سلسلۂ نسب یہ ہے: قاضی عبدالرحیم بن قاضی عبداللہ بن قاضی نظام الدین بن قاضی قمر

---

❶ افسوس کہ حضرت بھٹی صاحب کا وقت موعود آن پہنچا اور وہ یہ کتاب نہ لکھ سکے۔

Marfat.com

الدین بن قاضی بدرالدین۔

قاضی صاحب کے دو بھائی اور تھے۔ قاضی عبیداللہ اور قاضی عبدالعزیز۔!

اس خاندان کے بعض افراد والیانِ کشمیر راجا گلاب سنگھ اور رنبیر سنگھ کے زمانے میں وہاں کے اہم عہدوں پر فائز رہے۔

اس خانوادۂ ذی مرتبت میں علمی ذوق اور دینی شیفتگی کا آغاز قاضی عبدالرحیم کے دادا قاضی نظام الدین سے ہوا۔ قاضی نظام الدین کا تعلق سید امیر حیدر شاہ صاحب خان پوری ہزاروی سے تھا جو حضرت سید عبداللہ غزنوی سے بھی عقیدت مندانہ تعلق رکھتے تھے اور مولانا غلام رسول (ساکن قلعہ میہاں سنگھ ضلع گوجراں والا) سے بھی۔ انہی کی وساطت سے قاضی نظام الدین کا مولانا عبداللہ غزنوی سے رشتۂ ارادت استوار ہوا اور پھر اس خاندان کے اکثر افراد نے مسلکِ اہل حدیث اختیار کر لیا اور خالص کتاب وسنت کی اتباع کرنے لگے۔

قاضی عبدالرحیم نے اردو، عربی، فارسی، صرف ونحو اور حساب وغیرہ کی ابتدائی کتابیں گھر ہی میں پڑھیں۔ جب عربی عبارت پڑھنے کی استعداد پیدا ہوئی تو ۱۸۹۵ء (۱۳۱۲ھ) میں حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کی خدمت میں وزیر آباد گئے اور ان سے تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ ۱۹۰۲ء (۱۳۱۹ھ) تک حضرت حافظ صاحب سے تفسیر، حدیث، صرف ونحو اور بعض دیگر علوم متداولہ کی درسی کتابیں پڑھ لیں اور سند حاصل کی۔

۵-۱۹۰۴ء (۲۳-۱۳۲۲ھ) میں وہ حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی کی خدمت میں امرتسر رہے۔ ان سے دوبارہ صحیح بخاری پڑھی اور مولانا عبدالاول غزنوی سے سننِ ابی داؤد دہرائی۔ اس اثنا میں مولانا محمد معصوم ہزاروی سے منطق اور دیگر علوم کی کتابیں پڑھیں۔

۱۹۰۶ء میں دہلی گئے اور مدرسہ طبیہ میں فنِ طب کے لیے داخلہ لیا۔ دو سال وہاں رہے اور ۱۹۰۸ء (۱۳۲۶ھ) میں فارغ ہو کر واپس وطن آئے اور گوجراں والا میں طبابت کا سلسلہ شروع کیا جو زندگی کے آخر دور تک جاری رہا۔

قاضی صاحب نے حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے تین شاگردوں سے تعلیم حاصل کی۔ حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی سے، حضرت امام سید عبدالجبار غزنوی سے اور حضرت مولانا عبدالاول غزنوی سے رحمہم اللہ۔ یہ بہت بڑی سعادت تھی جو ان کے حصے میں آئی۔

قاضی صاحب نے ملکی سیاسیات میں بھی بھرپور جدوجہد کی۔ وہ انگریزی حکومت کا زمانہ تھا۔ ابتدا میں ان کا تعلق سرحد پار کی جماعتِ مجاہدین سے ہوا۔ یہ لوگ سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی کی جماعت

Marfat.com

سے منسلک تھے جو قاضی صاحب کی دکان پر آتے اور وہ ان کی کسی نہ کسی انداز سے اعانت فرماتے۔

قاضی صاحب نے مختلف سیاسی جماعتوں میں حصہ لیا۔ جماعت مجاہدین کے لیے انھوں نے بے پناہ خدمات سرانجام دیں۔ پھر مجلس خلافت میں بے حد تگ و دو کی۔ وہ گوجراں والا کی مجلس خلافت کے راہنما اور قائد تھے اور اس شہر کے لوگ ان کا انتہائی احترام کرتے تھے۔ اپنے رضا کاروں اور ساتھیوں کی مدد سے شراب خانوں کے دروازوں پر دھرنا دیتے اور لوگوں کو اس کے خریدنے اور پینے سے منع کرتے۔ افیون کے ٹھیکوں پر جاتے اور لوگوں کو اس کے استعمال سے روکتے۔ اس طرح ہر برائی کے ارتکاب سے عوام کو روکنا انھوں نے اپنے آپ پر ضروری قرار دے رکھا تھا۔

وہ گوجراں والا کی جماعت اہل حدیث کے نہایت معزز رکن تھے اور وہ کچھ عرصہ مولانا محمد اسماعیل سلفی کے مدرسے میں فریضہ تدریس بھی ادا کرتے رہے۔ یہ کام وہ اعزازی طور پر کرتے تھے۔ تمام درسی علوم میں مہارت رکھتے تھے اور ان کے طریق تدریس سے طلبا مستفید ہوتے تھے۔

میرا ان سے قریبی تعلق فروری ۱۹۵۰ء میں ہوا۔ جب میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے معاون مدیر کی حیثیت سے گوجراں والا گیا۔ یہ اخبار اگست ۱۹۴۹ء میں گوجراں والا سے جاری ہوا تھا، وہاں کی جماعت اہل حدیث اس کے اخراجات کی ذمہ دار تھی اور مولانا محمد حنیف ندوی اس کے مدیر مسئول تھے۔ اخبار مرکزی جمعیت اہل حدیث کا ترجمان تھا۔ دو ڈھائی سال یہ اخبار گوجراں والا سے شائع ہوتا رہا۔ پھر اسے لاہور منتقل کرلیا گیا تھا۔

اس کا حساب کتاب قاضی صاحب کے سپرد تھا۔ منی آرڈر وہی وصول کرتے اور وہی اس کی آمدنی اور خرچ کا حساب رکھتے تھے۔ رقم انہی کے پاس ہوتی تھی اور تنخواہیں وغیرہ وہی دیتے تھے۔ لیکن آمدنی اور خرچ کا روزنامچے (ڈے بک) پر اندراج ایک اور صاحب کرتے تھے، جن کا نام بابو عبدالغنی تھا۔ وہ نہایت نیک بزرگ تھے۔

قاضی صاحب صبح اپنے مطب پر تشریف لے آتے اور شام کے بعد گھر جاتے۔ ان کا مکان بڑے قبرستان کی طرف تھا۔ مریض صبح سے شام تک قاضی صاحب کے پاس آتے رہتے اور وہ غور سے ان کی بات سنتے اور مرض کی کیفیت معلوم کرتے۔ بہت کم گو اور متانت پسند تھے۔

اس زمانے میں صوبہ سندھ کے گورنر میاں دین محمد تھے جو گوجراں والا کے رہنے والے تھے اور خلافت تحریک میں قاضی صاحب کے ساتھ کام کرتے رہے تھے۔ ایک دن ایک سیاہ رنگ کی بڑی کار قاضی صاحب کی دکان کے سامنے آ کر رکی۔ کار کا ڈرائیور باہر نکلا اور نہایت ادب سے قاضی صاحب سے عرض کیا کہ میاں

Marfat.com

صاحب بیمار ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ تشریف لائیں اور انھیں دوا دیں۔ آپ کے علاوہ یہاں کے کسی معالج کے علاج سے وہ مطمئن نہیں ہیں۔

قاضی صاحب نے ڈرائیور سے پوچھا: کون میاں صاحب؟

اس نے بتایا: میاں دین محمد صاحب۔ وہ کچھ دن پہلے کراچی سے یہاں آئے تھے اور بیمار ہو گئے ہیں۔

قاضی صاحب نے چند لمحے سوچا، پھر فرمایا: میں ان کے مکان پر نہیں جا سکتا۔ مجھ سے علاج کرانا چاہتے ہیں تو وہ یہاں تشریف لائیں۔

ڈرائیور نے دو تین دفعہ کہا کہ ان کا یہاں آنا مشکل ہے، لیکن قاضی صاحب نہیں مانے اور وہ چلا گیا۔

اس وقت اسماعیل ضیا مرحوم بھی وہیں تھے جو قاضی صاحب کے عقیدت مند تھے اور ۱۹۷۱ء کے انتخابات میں گوجراں والا سے پیپلز پارٹی کی طرف سے پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ ان کے والد حاجی محمد علی انجمن اہل حدیث کے خزانچی تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کو خزانچی بنایا گیا تھا۔ یہ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کے شاگرد بھی تھے۔ انھوں نے قاضی صاحب سے عرض کیا کہ میاں دین محمد آپ کے ساتھ تحریکِ خلافت اور آزادیٔ وطن کی دیگر تحریکات میں کام کرتے رہے ہیں، آپ چلے جائیں اور ان کو دوا دیں۔

فرمایا: ٹھیک ہے، وہ میرے ساتھی تھے اور میں ان کا احترام کرتا ہوں، لیکن اب وہ میرے ساتھی نہیں ہیں، وہ گورنر ہیں، میرا ان کے پاس جانے کو جی نہیں چاہتا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہی ڈرائیور پھر آ گیا اور قاضی صاحب کو میاں دین محمد صاحب کا پیغام دیا، لیکن قاضی صاحب نہیں گئے۔ فرمایا: ’’میرے جانے کے بعد اگر کسی گاؤں یا یہیں سے کوئی مریض آ گیا تو اسے تکلیف ہوگی۔‘‘

اسی قسم کا واقعہ دہلی کے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے بارے میں بھی بیان کیا جاتا ہے۔ وہ ملک کے معروف ڈاکٹر تھے اور کانگرس کے رہنماؤں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ کانگرس کے صدر بھی رہے تھے۔ ایک مرتبہ وائسرائے بیمار ہوا تو علاج کے لیے اس نے ایک انگریز افسر کو ڈاکٹر انصاری کے پاس بھیجا کہ وہ آئیں اور اس کا علاج کریں۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس اس وقت کئی مریض بیٹھے تھے، انھوں نے وائسرائے کے پاس جانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میرے کلینک میں کئی مریض بیٹھے ہیں، میں ان کو چھوڑ کر نہیں آ سکتا۔ وائسرائے اگر مجھ سے علاج کرانا چاہتے ہیں تو یہاں تشریف لائیں اور اپنی باری کا انتظار کریں۔

بہرکیف قاضی عبدالرحیم صاحب ممتاز عالم دین اور اپنے دور کے نامور سیاسی راہنما تھے۔ گوجراں والا کی جماعت اہل حدیث کے کم و بیش ۴۵ برس امیر رہے۔ نہایت مخلص اور صالح بزرگ تھے۔ اخبار ’’الاعتصام‘‘

Marfat.com

میں ان کے بے شمار مضامین شائع ہوئے۔ انھوں نے کم و بیش ۸۸ برس کی عمر پا کر ۲۷۔ فروری ۱۹۷۱ء (۲۔محرم ۱۳۹۱ھ) کو رات کے گیارہ بجے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ انا لله و انا الیه راجعون
اللهم اغفرله و ارحمه و عافه و اعف عنه .

ان کے دو بیٹے تھے قاضی وقار الاسلام اور قاضی عبداللہ۔ یہ بھی وفات پا گئے ہیں۔ پروفیسر قاضی مقبول احمد جن کے مضامین بعض جماعتی اخباروں میں چھپتے رہتے ہیں، قاضی صاحب کے لائق و ذہین نواسے ہیں۔ [1]

❀❀❀❀

[1] پروفیسر قاضی مقبول احمد جماعت اہل حدیث کے نامور لکھاریوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی ایک کتاب ''اسلام اور اجتہاد'' ہمارے ادارے مکتبہ قدوسیہ کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ جمہوریت کے مسئلے پر، نکاح بلا ولی کے مسئلے پر اور بھی کئی مفصل علمی تحریریں موجود ہیں۔ جو کہ شائع نہیں ہوئیں۔ قاضی صاحب ہمارے والد گرامی مولانا عبدالخالق قدوسی مرحوم کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ قاضی صاحب بھی ۲۰۔ مئی ۲۰۱۵ء کو وفات پا چکے ہیں۔ (عمر فاروق قدوسی)

Marfat.com

مولانا خدا بخش حدّاد بھوجیانی

(وفات ۱۶۔ مئی ۱۹۷۲ء)

مولانا خدا بخش بھوجیانی، علمائے بھوجیاں کے شاگرد، نامور عالم دین اور مردِ مجاہد تھے۔ تحصیل ترنتارن ضلع امرتسر کے ایک گاؤں ''کھارہ'' میں ۱۹۰۰ء کے قریب پیدا ہوئے۔ لوہار برادری سے تعلق تھا، اس لیے حدّاد کہلاتے تھے۔ والد کا نام میاں پیر محمد تھا۔ بچپن ہی میں والدین وفات پا گئے تھے۔

ان کے گاؤں (کھارہ) میں جہالت کا دور دورہ تھا اور سب لوگ پیر پرست تھے۔ پیر کے خلاف وہ کوئی لفظ بھی سننا گوارا نہ کرتے۔ خدا بخش حداد کی ابتدائی تربیت اسی ماحول اور اسی فضا میں ہوئی۔ کسی جگہ سے ہر سال ایک پیر صاحب ان کے گاؤں میں آتے اور نذرانے وصول کر کے چلے جاتے تھے۔ خدا بخش بارہ تیرہ سال کی عمر کو پہنچے تو اس پیر صاحب کو دیکھا۔ انھوں نے اپنے ہر مرید کو اپنی تصویر دی تھی اور تاکید کی تھی کہ اس تصویر کو ہمہ وقت اپنے پاس رکھے اور اس کا نقش دل میں بٹھائے رکھے۔ یعنی تصورِ شیخ نہایت ضروری ہے۔

پیر صاحب کا یہ بھی حکم تھا کہ ہر روز صبح کے وقت دو گھنٹے یہ تصویر سامنے رکھنا اور اسے اچھی طرح دیکھتے رہنا چاہیے۔ یہ تصویر خدا بخش کو بھی دی گئی تھی اور اس کے متعلق وہی حکم دیا گیا تھا جو دوسرے لوگوں کو دیا گیا تھا۔

ایک روز خدا بخش تالاب میں نہانے کے لیے گئے۔ کپڑے اتارے تو ان کی بے خبری میں تصویر پانی میں گر گئی۔ نہانے کے بعد کپڑے پہنے تو تصویر جیب میں نہ تھی۔ اس کے گرنے اور گم ہونے کا بہت افسوس ہوا۔ تالاب سے پانی کی ایک نالی باہر نکلتی تھی۔ دیکھا کہ وہ تصویر اس نالی میں بہتی ہوئی کافی دور چلی گئی تھی۔ اللہ کو ان کی بھلائی منظور تھی۔ فوراً خیال آیا کہ جو تصویر خود اپنی حفاظت نہیں کر سکی۔ پانی میں بہہ گئی، وہ مجھے کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ اسی وقت دل میں پیر کے خلاف نفرت پیدا ہوگئی۔ اس کے بعد قرآن مجید اور دینی کتابیں از خود پڑھنے لگے اور معلومات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔

اسی اثنا میں انھیں کسی اہل حدیث عالم کی کتاب مل گئی جس میں نماز کے متعلق مسائل درج تھے۔ کتاب میں یہ بھی لکھا تھا کہ رکوع کرتے اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کرنا سنت ہے۔ خدا بخش نے اس طرح نماز پڑھنا شروع کر دی، لیکن انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ اس طرح اہل حدیث نماز پڑھتے ہیں، جنھیں ان کے ہاں وہابی کہا جاتا ہے۔ لفظ وہابی وہاں کے دوسرے لوگوں کی طرح خود خدا بخش کے نزدیک بھی ناپسندیدہ تھا۔ ایک

Marfat.com

دن انھیں کسی نے نماز پڑھتے ہوئے رفع یدین کرتے دیکھا تو کہا: کیا تم وہابی ہو گئے ہو؟ یہ الفاظ سن کر انھیں سخت غصہ آیا اور اس سے جھگڑا شروع کر دیا کہ تم نے مجھے وہابی کیوں کہا؟

اس سے چند روز بعد قریب کے گاؤں سے ان کے ایک رشتے دار آئے، انھوں نے خدا بخش کو نماز میں رفع یدین کرتے دیکھا تو یہی الفاظ کہے کہ کیا تم وہابی ہو گئے ہو؟ وہ حیران ہوئے کہ یہ لوگ مجھے وہابی کیوں کہتے ہیں؟

ان کے رشتے دار نے بتایا کہ جس طرح تم نماز پڑھتے ہو، اہل حدیث اسی طرح نماز پڑھتے ہیں اور لوگ انھیں طنزاً وہابی کہتے ہیں۔ نماز پڑھنے کا صحیح طریقہ یہی ہے۔ انھوں نے کہا: میں قریب کے گاؤں بھوجیاں میں جمعہ پڑھا کرتا ہوں۔ وہاں ایک بڑے عالم مولانا فیض اللہ خاں رہتے، وہی جمعہ پڑھاتے ہیں اور اسی طرح نماز پڑھتے ہیں۔

خدا بخش نے کہا: تم مجھے بھی وہاں لے چلو۔ میں انھیں دیکھنا اور ان کے پیچھے جمعہ پڑھنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ وہ انھیں بھوجیاں لے گئے۔ انھوں نے مولانا فیض اللہ کی اقتدا میں جمعہ پڑھا۔ جمعے کے بعد ان کو سلام کیا اور ان کے ارشادات سننے کا موقع ملا، تو انھوں نے فرمایا: تم یہاں (بھوجیاں) آ جاؤ۔ میں تمھیں قرآن مجید کا ترجمہ اور دینیات کی کتابیں پڑھاؤں گا۔ چناں چہ یہ بھوجیاں چلے گئے اور مستقل طور پر وہیں سکونت اختیار کر لی۔ مولانا نے ان سے نہایت شفقت کا برتاؤ کیا اور یہ خدا بخش حداد بھوجیانی ہو گئے۔ کچھ عرصے کے بعد مولانا نے ان کی شادی بھی کر دی۔ اور اپنا ایک ذاتی مکان انھیں دے دیا۔

مولانا خدا بخش حداد نے بھوجیاں میں ابتدائی تعلیم مولانا فیض اللہ خاں اور ان کے فرزندوں مولانا عبدالرحمٰن اور مولانا عبداللہ سے حاصل کی۔ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے بھی استفادہ کیا۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے وہ دہلی گئے اور مسجد فتح پوری کے مدرسے میں علوم عقلیہ ونقلیہ کی تحصیل کی۔ ان کی اہلیہ کے بقول دیوبند اور لکھنؤ بھی گئے اور وہاں کے مختلف مدارس کے اساتذہ سے اکتسابِ علم کیا۔ لیکن کس عالم سے کیا پڑھا، اس کا علم نہیں ہو سکا۔ دہلی، لکھنؤ اور دیوبند سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد ضلع امرتسر کے ایک گاؤں موضع بھاؤوال آ گئے اور وہاں کے مشہور عالم مولانا محمد اسماعیل سے اخذِ فیض کیا۔

بعد ازاں بھوجیاں کے قریب موضع پنج وڑ میں رہائش اختیار کر لی تھی، لیکن عمر کا زیادہ حصہ بھوجیاں میں گزرا اور بھوجیانی کی نسبت سے شہرت پائی۔

مولانا خدا بخش حداد مشہور واعظ، مبلغ کتاب وسنت اور مناظرانہ طبیعت کے مالک تھے۔ تہجد گزار تھے اور قرآن کی تلاوت بہ کثرت کرتے تھے۔ دیہات میں جاتے اور اپنے انداز میں لوگوں کو صراطِ مستقیم پر گامزن رہنے کی تاکید فرماتے۔ تقسیم ملک کے بعد ضلع فیصل آباد کے ایک گاؤں چک نمبر ۵۱ سجادہ میں آ بسے

Marfat.com

تھے۔ اولادِ نرینہ سے محروم تھے۔ صرف ایک لڑکی ان کی اولاد تھی جو تقسیم کے زمانے میں دو سال کی تھی۔ وہ لڑکی والدین کے ساتھ پاکستان آئی اور صاحبِ اولاد ہوئی۔

مولانا خدا بخش حداد بھوجیانی نے پاکستان آ کر بھی اپنا سلسلۂ وعظ و تبلیغ جاری رکھا۔ وہ قد و قامت، صحت و توانائی اور گفتگو میں بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ اپنی بات مدلل انداز میں بلا جھجک لوگوں تک پہنچاتے وہ اپنے نئے مسکن چک نمبر ۵۱ سجادہ کی مسجد کے خطیب و امام تھے اور بچوں کو دینیات کی کتابیں پڑھاتے تھے۔

ایک بے حد اہم کام انھوں نے یہ کیا کہ تقسیم ملک کے زمانے میں بھوجیاں اور اس کے قرب و جوار کی جو عورتیں سکھوں کے قبضے میں چلی گئی تھیں، وہ ان کی بازیابی کے لیے کوشاں ہوئے۔ اس سلسلے میں کئی دفعہ ہندوستان گئے اور بہت سی عورتوں کو سکھوں کے قبضے سے آزاد کرا کے پاکستان لانے کامیاب ہوئے۔ یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ تھا جو انھوں نے ان حالات میں انجام دیا۔

مولانا موصوف قیام پاکستان کے بعد جس گاؤں میں سکونت پذیر ہوئے، اس میں چند گھر شیعہ حضرات کے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے محرم کے دنوں میں ذوالجناح کا جلوس نکالنے کی کوشش کی۔ مولانا نے اپنے عقیدت مندوں سے مل کر اس کی مخالفت کی اور جلوس نہیں نکلنے دیا۔ مولانا عبدالعظیم انصاری تذکرہ علمائے بھوجیاں میں رقم طراز ہیں کہ اس پر شیعہ حضرات برافروختہ ہوئے اور مولانا کے خلاف معاندانہ روش اختیار کر لی۔ ایک روز مولانا اپنے ایک دوست کے ساتھ کسی کام سے فیصل آباد گئے۔ واپسی میں کچھ دیر ہوگئی اور رات گئے واپس ہوئے۔ گاؤں سے دو فرلانگ کے قریب پہنچے تو شیعہ فرقے کے دو تین مسلح آدمیوں نے جو پہلے سے چھپے بیٹھے تھے، ان پر تلوار سے حملہ کر دیا۔ جان سے تو بچ گئے لیکن دائیں ہاتھ کی تین یا چار انگلیاں جڑ سے کٹ گئیں۔

انتقال سے چھے سال قبل مولانا خدا بخش حداد پر فالج کا حملہ ہو گیا تھا۔ یہ پورا عرصہ انھوں نے چار پائی پر گزارا۔ اس شدید بیماری کی حالت میں کبھی آہ و زاری نہیں کی۔ ہمیشہ صبر و شکر سے کام لیا اور اللہ کی رضا پر راضی رہے۔ اس کی حمد و ثنا زبان پر جاری رہتی اور باقاعدگی سے ہر وقت نماز ادا کرتے رہے۔

بیماری کے زمانے میں کوئی شخص کھانے کے لیے پھل پیش کرتا تو فرماتے، اس پھل کا کیا کھانا، آگے چل کر جنت کے پھل کھائیں گے۔ ان شاء اللہ۔

یہ پیکر علم و عمل بزرگ ۱۹۷۲ء کو وفات پا گئے۔ غفر اللہ لہ وجعل الجنۃ ماواہ۔

(تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو مولانا عبدالعظیم انصاری کی تصنیف ''تذکرہ علمائے بھوجیاں'' صفحہ ۲۳۲ تا ۲۴۰)

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا سید ممتاز محمد علی

(وفات یکم فروری ۱۹۷۳ء)

برصغیر میں بے شمار علمائے دین کا ظہور ہوا، جنھوں نے تبلیغی، تدریسی اور تحریری صورت میں کتاب وسنت کی بے پناہ خدمت کی۔ ان حضراتِ گرامی کی وسیع فہرست میں مولانا سید ممتاز علی کا اسم گرامی بھی شامل ہے جو ۱۸۸۸ء کے قریب اپنے ننھیال موضع ٹکریا میں پیدا ہوئے۔ یہ علاقہ ہندوستان کے صوبہ یوپی میں شامل ہے۔ ایک گاؤں جُجو تیا میں مولانا ممتاز علی نے درجہ چہارم تک تعلیم پائی۔ جُجو تیا کی زیادہ تر آبادی شیعہ حضرات پر مشتمل تھی۔ خود مولانا ممتاز علی کے آباواجداد بھی ابتدا میں اسی مسلک سے تعلق رکھتے تھے، لیکن مولانا نے ہوش سنبھالنے کے بعد جب شیعہ حضرات اور اہل سنت کی کتابوں کا مطالعہ کیا تو اہل سنت سے وابستہ ہوگئے اور اپنے والدین کو بھی یہی مسلک قبول کرنے کی تبلیغ کی، لیکن انھوں نے بیٹے کی بات ماننے سے انکار کیا اور شیعیت کو ترک کرنے اور اہل سنت سے وابستگی اختیار کرنے پر انھیں مستوجب سزا گردانا تو وہ گھر سے نکلے اور بنگال چلے گئے۔ ان کے والد کا نام نامی سید عابد علی تھا۔

بنگال میں ان کا تعلق سلفی علمائے کرام سے ہوگیا تھا۔ ان سے انھوں نے اپنے فہم کے مطابق کافی استفادہ کیا۔ وہاں وہ محنت مزدوری کر کے اپنے اخراجات کا انتظام کر لیتے تھے اور تھوڑی بہت تعلیم بھی حاصل کرتے تھے۔ دو سال ان کا قیام بنگال میں رہا۔ اس اثنا میں انھیں والدین بھی بہت یاد آئے، دیگر رشتے دار بھی یاد آتے رہے اور اپنے آبائی گاؤں کے لوگوں سے ملنے کو بھی بہت جی چاہا۔ قیام بنگال کے زمانے میں وہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا بھی کرتے رہے کہ ان کے والدین اور دیگر رشتے دار شیعیت سے تائب ہو کر اہل سنت سے وابستہ ہو جائیں۔

بہر کیف دو سال کے بعد وہ بنگال کی سکونت ترک کر کے اپنے وطن کو روانہ ہوئے۔ اثنائے راہ میں ضلع بستی کی تحصیل ہانسی کے گاؤں جُجنی پہنچے تو وہاں کے ایک نیک دل بزرگ وزیر میاں سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ان کی روداد سفر سنی تو تسلی دی کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں یہاں رہو اور بچوں کو پڑھاؤ۔ چنانچہ یہ موضع جُجنی میں بچوں کو تعلیم دینے لگے۔ اس کا علم ان کے والد سید عابد علی کو ہوا تو وہ وہاں پہنچے اور باپ بیٹے کی ملاقات ہوئی اور دونوں گلے ملے تو دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

Marfat.com

اب سید ممتاز علی کی اپنے گاؤں میں آمدورفت شروع ہوگئی تھی اور پہلے کی طرح تبلیغی سلسلہ جاری کردیا گیا تھا۔ گاؤں کے کچھ لوگ ان کے ہم خیال بھی ہوگئے تھے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ اپنے ہم خیال افراد کی مدد سے گھر کا وہ دروازہ توڑ دیا جس کے چبوترے پر تعزیہ رکھا ہوا تھا۔ اس پر گاؤں میں ہنگامہ برپا ہوگیا اور لوگوں نے یہ کہنا شروع کردیا کہ اب حسین بابا (یعنی حضرت حسین رضی اللہ عنہ) ان سے ناراض ہوجائیں گے اور ان کی ناراضی کی وجہ سے یہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوجائیں گے۔۔۔ مشیت ایزدی ملاحظہ ہو کہ سید ممتاز علی صاحب کی والدہ نے آنکھ میں کچھ درد محسوس کیا اور پھر معاملہ کافی بگڑ گیا۔ اس پر بعض لوگوں نے یہ کہا کہ یہ تعزیہ اکھاڑنے کی سزا دی گئی ہے۔ اس پر ممتاز علی نے اللہ سے گڑگڑا کر دعا مانگی جو اللہ نے قبول فرمائی اور والدہ کی آنکھ بالکل ٹھیک ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

﴿ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴾ (البقرة: ۱۸۶)

''اور جب میرے بندے تجھ سے میرے بارے میں سوال کریں تو بے شک میں قریب ہوں، میں پکارنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے، تو لازم ہے کہ وہ میری بات مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں، تاکہ وہ ہدایت پائیں۔''

مولانا سید ممتاز علی نے تھوڑی بہت تعلیم تو پہلے ہی حاصل کی تھی اور اس تعلیم کی روشنی میں وہ کتاب وسنت کی تبلیغ بھی کرتے تھے۔ اب انھوں نے باقاعدہ طور سے تحصیل علم کا عزم کیا، چنانچہ گھر سے نکلے اور مدرسہ سراج العلوم بونڈھیار پہنچے۔ اس وقت اس مدرسے کی مسند درس پر حضرت مولانا عبیداللہ رحمانی مرحوم ومغفور کے والد گرامی حضرت مولانا عبدالسلام مبارک پوری رحمہ اللہ متمکن تھے، ان کے علاوہ بعض اور اساتذہ بھی خدمتِ تدریس سرانجام دیتے تھے، ممتاز علی نے اس مدرسے میں داخلہ لیا اور ان حضرات سے استفادہ کرنے لگے۔

اس کے بعد مؤناتھ بھنجن کا قصد کیا۔ وہاں جامعہ فیض عام اور مدرسہ عالیہ کے اساتذہ کے حضور زانوئے شاگردی تہ کیے۔ ان تدریسی اداروں میں کچھ عرصہ اکتساب فیض کرنے کے بعد دلی میں دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں داخل ہونے اور وہاں کے اساتذہ کرام سے مستفید ہونے کا شوق پیدا ہوا اور یہ وہاں جا پہنچے۔

وہاں ان کی ملاقات علامہ خلیل عرب سے ہوئی۔ کچھ دن ان کے ہاں رہے، پھر انہی کی وساطت سے دارالعلوم میں داخلے کا موقع ملا۔ وہاں انھوں نے علامہ خلیل عرب سے بھی استفادہ کیا۔ ان کے علاوہ ندوہ کے اساتذہ سے بھی مستفید ہوئے اور وہیں سے سندِ فراغت حاصل کی۔

Marfat.com

بعدازاں حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری کی خدمت اقدس میں حاضری دی اور ان سے قرآن وحدیث کے نکات ومعارف سمجھنے کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے۔

مذکورہ بالا مدارس وجامعات سے انھوں نے جن اساتذہ گرامی سے استفادہ کیا ان میں مشہور اساتذہ ہیں: مولانا شاہ محمد، مولانا محمد سلیمان مئوی، مولانا عبدالسلام مبارک پوری، مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری، علامہ خلیل عرب، مولانا حفیظ اللہ صاحب، مولانا شبلی فقیہ، حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری اور دیگر متعدد حضرات۔ الہ آباد یونیورسٹی سے فاضل ادب عربی کا امتحان بھی پاس کیا۔

مروجہ تعلیم سے فراغت کے بعد صوبہ بہار اور دیگر بہت سے مقامات کے بزرگان دین اور علمائے ذی شان کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان سے مستفید ہونے کا شرف حاصل کیا۔ اسلاف میں سے امام ابن تیمیہ، امام ابن قیم، امام ابن کثیر، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، امام شوکانی اور دیگر بہت سے ائمہ کرام کی تصانیف کا مطالعہ کیا اور ان کے افکارِ عالیہ سے اثر پذیر ہوئے۔

مولانا ممتاز علی تحصیل علم کے مراحل طے کر چکے تو تدریسی اور تقریری صورت میں کتاب وسنت کی تبلیغ میں مشغول ہوگئے، اس سلسلے میں ان کے برادرِ صغیر مولانا اقبال حسین نے ان کا بھرپور طریقے سے ساتھ دیا۔ (ان کا تذکرہ اس کتاب میں مستقل عنوان کے ساتھ مذکور ہے)

مولانا کی خدمات:

☆...... مولانا ممتاز علی نامور مقرر تھے اور قرآن وحدیث کی روشنی میں تقریر کرتے تھے، جس سے لوگ بہت متاثر ہوتے تھے۔ انھوں نے اپنی اصلاحی تقریروں کا آغاز اپنے خاندان سے کیا، پھر اپنے گاؤں کے لوگوں کو مخاطب کرنے لگے۔ بعدازاں اردگرد کے دیہات میں آمدورفت شروع کی اور انھیں اسلام کی صاف ستھری تعلیم سے آگاہ کیا۔ ان کی تقریروں سے متاثر ہو کر بے شمار لوگوں نے غیر اسلامی رسوم ورواج کو ترک کیا۔ بعض مقامات کے متعدد غیر مسلموں نے اسلام قبول کر لیا اور پھر وہ آہستہ آہستہ اسلام کے مبلغ بن گئے۔

☆...... کتنے ہی مقامات میں مولانا کی کوشش سے دینی مدارس قائم ہوئے، جن میں مقامی اور بیرونی طلبا نے دینی تعلیم حاصل کی۔

❀...... متعدد مقامات میں نئی مسجدیں تعمیر کی گئیں۔ جہاں مسجدیں خستہ حالت میں تھیں، مرمت منہدم کر کے انھیں ازسرِ نو تعمیر کیا گیا۔ بعض دیہات کی مسجدوں پر غیر اہل حدیث قابض ہوگئے تھے یا قابض ہونے کی کوشش کر رہے تھے، ان مسجدوں کو بڑی جدوجہد سے اہل حدیث جماعت کے زیر انتظام لایا گیا۔

❀......بعض مقامات میں عیدالضحیٰ کے موقعے پر ہندو گائے کی قربانی کرنے سے روکتے اور حالات

Marfat.com

خطرناک موڑ میں داخل ہو جاتے تھے۔ مولانا ممتاز علی ایسے مواقع پر وہاں پہنچتے اور مسلمانوں کی ان افرادی صورت میں بھی مدد کرتے اور گفتگو میں بھی اپنا اثر استعمال فرماتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے مسئلہ حل ہو جاتا اور مسلمان اپنے مذہب کے مطابق قربانی کرتے۔

❀ ...... مولانا ممدوح کا زمانہ مناظروں اور مباحثوں کا زمانہ تھا۔ بہت سے مسائل میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے درمیان بھی مناظروں کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور احناف اور اہل حدیث کے درمیان بھی بعض معاملات میں مناظرے ہوتے رہتے تھے، مولانا ممدوح اس میں پوری دلچسپی رکھتے تھے۔ اور اگر کسی دوسرے مناظر کی خدمات حاصل کرنا پڑتیں تو اسے بھی حریف کے مقابلے میں میدان میں اتارا جاتا تھا۔

❀ ...... مولانا کا سلسلہ افتا بھی جاری رہتا تھا۔ لوگ مختلف مسائل سے متعلق ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور کتاب وسنت کی روشنی میں فتوے لیتے تھے۔

❀ ...... اپنے علاقے میں مولانا ممدوح بہت موثر شخصیت تھے اور ان کی آواز کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ان کے گاؤں یا قرب وجوار کے کسی گاؤں میں دو فریقوں کے درمیان کوئی تنازع پیدا ہو جاتا تو ان کے باب عالی پر دستک دی جاتی اور وہ فریقین کے بیانات سن کر شریعت کی روشنی میں جو فیصلہ کرتے، اسے بخوشی مان لیا جاتا تھا۔

❀ ...... ان جماعتی اور مسلکی خدمات کے علاوہ مولانا ممدوح ذاتی طور پر نہایت متقی اور صالح بزرگ تھے۔ تہجد گزار اور قائم اللیل۔ قرآن مجید کی روزانہ بالالتزام تلاوت کرتے۔ درس دیتے، خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے اور نماز باجماعت کے پابند۔ کمزور کی مدد اور نادار کی مالی امداد ان کے نزدیک ضروری تھی۔ زاہد وعابد اور قناعت پیشہ عالم تھے۔ عالی کردار اور اخلاقِ حسنہ کے مالک۔ ہر شخص کے ہم درد اور ہر مظلوم کے مددگار۔

مولانا سید عبدالاوّل نے (مولانا ممتاز علی کے بھتیجے اور ان کے برادرِ صغیر سید اقبال حسین کے فرزند گرامی تھے) ان دونوں بزرگوں کے حالات میں ''تذکرۃ السیدین'' کے نام سے کتاب لکھی۔ جو مولانا ممتاز علی کے پوتے مولوی علی احمد (مقیم دہلی) نے شائع کی، موصوف کا شمار دہلی کے بڑے تاجروں میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب مجھے مولانا عارف جاوید محمدی (کویت) نے ارسال کی ہے، مولانا ممتاز علی کے واقعاتِ حیات جو گزشتہ سطور میں اختصار کے ساتھ خوانندگانِ گرامی کے مطالعہ میں آئے، اسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

مولانا ممتاز علی نے جمعرات کے روز ۲۶۔ ذی الحجہ ۱۳۹۲ھ (یکم فروری ۱۹۷۳ء) کو ایک بج کر پینتالیس منٹ پر وفات پائی اور دوسرے دن (جمعۃ المبارک کو) ۹ بجے ان کے برادرِ صغیر مولانا سید اقبال حسین نے نماز جنازہ پڑھائی، جس میں بے شمار لوگوں نے شرکت کی۔

Marfat.com

ان کی وفات پر ایک شاعر نے مندرجہ ذیل مرثیہ کہا، جس کے آخری شعر کے دوسرے مصرعے سے سنِ وفات نکلتا ہے۔

صرصرِ غم آج یہ کیسی چلی — ہوگئی پژمردہ ہر دل کی کلی
سب کی آنکھیں ہوگئی ہیں اشک بار — رحم کے قابل ہے دل کی بے کلی
نالہ و فریاد ہر کوچہ میں ہے — بزم ماتم بن گئی ہے ہر گلی
محو حیرت تھا کہ آئی یہ صدا — داغِ فرقت دے گئے ممتاز علی
اب نہیں ہم میں کوئی ایسا رہا — عالم و عاقل، فقیہ و متقی
تھے غریبوں کے بہت ہی غم گسار — اب کرے گا کون غرباء پروری
ہر ادا پیاری تھی ان کی خلق کو — بات میٹھی جیسے مصری کی ڈلی
اللہ اللہ آج وہ روپوش ہیں — موت کے آگے بھلا کس کی چلی
آہ! وہ چھبیس ذی الحجہ کی شام — روح پاکیزہ خدا سے جاملی
خود کہی ہاتف نے تاریخ وفات — محوِ رحمت مولوی ممتاز علی

۱۳۹۲ھ

Marfat.com

مولانا امتیاز علی عرشی

(وفات ۲۴۔فروری ۱۹۸۱ء)

امتیاز علی عرشی نامور محقق، معروف اہل قلم، ممتاز مصنف اور رام پور (یوپی ہندوستان) کی رضالائبریری کے ڈائریکٹر تھے۔

اصلاً مرحوم کا تعلق پاکستان کے علاقہ سوات سے تھا اور وہاں کے قبیلہ حاجی خیل کے فرد فرید تھے۔ ان کے خاندان کے کچھ لوگوں نے اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں ترک وطن کر کے ہندوستان کا عزم کیا اور رام پور اور اس کے قرب وجوار میں اقامت اختیار کی۔ درحقیقت ان لوگوں کا پیشہ سپاہ گری تھا۔ عرشی صاحب کے دادا مولانا اکبر علی خاں نے اس پیشے کو خیرباد کہہ کر علم وفضل کی وادی میں قدم رکھا اور اپنے عصر اور علاقے کے مشہور محدث ہوئے۔ ان کے ایک بیٹے مولانا جعفر علی خاں تھے جو فضیلت علمی میں باپ کے صحیح جانشین تھے۔ سب سے چھوٹے کا نام ممتاز علی خاں تھا، وہ علم سے زیادہ تعلق نہ رکھتے تھے اور عمر بھی زیادہ نہیں پائی۔ مولانا امتیاز علی عرشی انہی کے فرزند دلبند تھے، جنھوں نے علوم ومعارف کے بہت سے گوشوں میں شہرت حاصل کی۔ مسلکاً یہ لوگ اہل حدیث تھے۔

امتیاز علی عرشی کی ولادت ۸۔دسمبر ۱۹۰۴ء کو رام پور میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر میں پائی۔ صرف ونحو اور عربی وفارسی کی مروّجہ درسی کتابیں مدرسہ مطلع العلوم میں پڑھیں۔ ۱۹۲۳ء میں لاہور آ کر پنجاب یونیورسٹی سے ''مولوی عالم'' کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد مولوی فاضل کی تیاری کے لیے اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ اس زمانے میں اورینٹل کالج کے اساتذہ کی جماعت میں علامہ عبدالعزیز میمن، سید طلحہ اور مولانا نجم الدین شامل تھے، جو وسعتِ علم میں ملک گیر شہرت کے مالک تھے۔ سید طلحہ کا تعلق حضرت سید احمد شہید بریلوی کے خاندان سے تھا۔ عرشی صاحب کا خاندان بھی سید صاحب کا عقیدت مند تھا اور رام پور اور اس کے نواح میں ان کو ''وہابی'' کہا جاتا تھا۔ لہٰذا قدرتی طور پر عرشی صاحب، سید طلحہ سے زیادہ قرب رکھتے تھے اور خود سید طلحہ بھی ان سے شفقت کا برتاؤ فرماتے تھے۔ مسلکی یک سانی کی بنا پر علامہ عبدالعزیز میمن اور مولانا نجم الدین بھی ان کے مہربان تھے۔

عرشی صاحب نہایت ذہین اور محنتی طالب علم تھے۔ انھوں نے ۱۹۲۳ء میں مولوی عالم کا امتحان پاس کیا۔

Marfat.com

۱۹۲۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کے اور ۱۹۲۵ء میں منشی فاضل کے امتحان میں کامیاب ہوئے اور عربی اور فارسی دونوں علوم کی سرکاری اسناد سے بہرہ ور ہوئے۔ ❶

عرشی صاحب نے فن طب کی کتابیں بھی پڑھیں۔ اس زمانے میں رام پور کے سرکاری مدرسہ عالیہ میں مولانا فضل حق رام پوری کا سلسلہ تدریس جاری تھا اور منطق وفلسفہ میں انھیں بڑی شہرت حاصل تھی۔ عرشی صاحب نے ان سے معقولات کی تکمیل کی اور ۱۹۲۶ء میں صرف انگریزی میں میٹرک کا امتحان دیا۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد عرشی صاحب دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے منسلک ہوئے اور وہاں سفارت کی خدمت ان کے سپرد کی گئی، لیکن کچھ عرصے کے بعد اس سے الگ ہو گئے۔ ندوۃ العلماء کے اصحاب اہتمام ان کے کام سے مطمئن تھے اور چاہتے تھے کہ وہ یہ خدمت انجام دیتے رہیں، لیکن انھوں نے معذرت کر لی۔ کچھ عرصہ عرشی صاحب تجارت بھی کرتے رہے۔

رام پور کا کتب خانہ جو رضا لائبریری کے نام سے موسوم ہے، برصغیر کے مشہور اور اعلیٰ درجے کے کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے اور اس (سابق مسلمان) ریاست کے حکمرانوں کے ذوق سلیم اور نادر ونایاب کتابوں سے ان کی گہری دل بستگی کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔ عرشی صاحب ۳۱۔ جولائی ۱۹۳۲ء کو اس کتب خانے کے ناظم اور لائبریرین مقرر ہوئے۔ وہاں جا کر ان کے علمی وتحقیقی جوہر نمایاں ہوئے اور اللہ نے ان سے وہ خدمت لی جس کے لیے انھیں پیدا کیا گیا تھا۔ اس کتب خانے کی توسیع وترقی کے لیے عرشی صاحب نے اپنے آپ کو وقف کر دیا اور نئے انداز سے اس کو مرتب کیا۔ پھر ان کی شب وروز کی محنت اور تگ ودو سے یہ ایک ایسا علمی مرکز بن گیا، جس سے بے شمار اہل علم اور ارباب تحقیق نے استفادہ کیا اور کر رہے ہیں۔

اس کتب خانے سے انھیں اس قدر قلبی تعلق پیدا ہو گیا اور اس کی آرائش وتزیین کو انھوں نے اپنے لیے اس طرح لازم قرار دے لیا کہ اسی کے ہو کر رہ گئے، دوسری کسی چیز سے کوئی علاقہ نہیں رکھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ انھیں سرکاری طور پر ایران وافغانستان کی ثقافتی سفارت قبول کرنے کی درخواست کی گئی اور اس کے صلے میں کئی ہزار روپے ماہانہ کی پیش کش ہوئی، مگر انھوں نے انکار کر دیا اور اس بڑے اعزاز اور بہت بڑی تنخواہ پر رام پور کی رضا لائبریری کے تھوڑے مشاہرے کو ترجیح دی۔

اس کتب خانے کے لیے انھوں نے جس ایثار کا مظاہرہ کیا اور جو بے مثال قربانی دی، اس کی وجہ سے ان کی شہرت دور دور تک پہنچی اور ان کی اس پُرخلوص خدمت کو بیرونِ ملک کے ارباب فضل وکمال نے بھی بے

---

❶ اب مولوی فاضل کو فاضل عربی اور منشی فاضل کو فاضل فارسی کہا جاتا ہے۔ مولوی اور مولوی عالم کے پرانے امتحانات کا پنجاب یونیورسٹی نے سلسلہ ختم کر دیا ہے۔

Marfat.com

حد احترام کی نگاہ سے دیکھااور خود ان کے ملک (ہندوستان) میں اسے بڑی اہمیت دی گئی اور انھیں اعزاز و انعام کا مستحق ٹھہرایا گیا۔ ساہتیہ اکادمی نے ان کو خاص اعزاز عطا کیا اور پریذیڈنٹ ایوارڈ بھی انھیں ملا۔ ان کی گوناگوں علمی خدمات کے اعتراف میں یادگاری مجلّے پیش کیے گئے، ملک کی بڑی بڑی کانفرنسوں میں انھیں خاص طور پر دعوت دی گئی اور بیرونِ ملک کے اہلِ تحقیق نے بھی ان کو مدعو کیا۔ متعدد انجمنوں اور اداروں کی طرف سے ان کی بصیرت علمی اور تحقیق وکاوش کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔

عرشی مرحوم نے عربی، فارسی، اردو، انگریزی چار زبانوں میں دادِ تحقیق دی اور ہر وادیٔ فن کی سیاحت کی۔ مختلف اصنافِ علوم پر ان کی نظر بہت عمیق تھی اور تحقیق و تفتیش کے ہر میدان میں ان کا رہوارِ قلم رواں دواں رہتا تھا۔ وہ اپنی ذات سے مرقعِ علم اور مجسمۂ تحقیق تھے۔ ان کی تصنیفات وتالیف اور مرتبات درج ذیل ہیں:

۱۔ تفسیر القرآن الکریم:...... یہ امام سفیان ثوری (متوفی ۱۶۱ھ) کی تفسیر قرآن مجید ہے، جس کا قلمی نسخہ عرشی صاحب کو رام پور کے کتب خانے سے ملا۔ ان کے خیال کے مطابق یہ نسخہ چھٹی صدی ہجری سے پہلے کا مکتوبہ ہے۔ اس کے شروع میں عرشی مرحوم نے امام سفیان ثوری کے مفصل حالات تحریر کیے ہیں اور بہترین انداز میں اسے مرتب کیا ہے۔ یہ ان کی نہایت قابل قدر خدمت ہے جو ۱۹۶۵ء میں معرضِ اشاعت میں آئی۔ یہ عربی زبان میں ہے۔

۲۔ فصل الخطاب لعمر بن الخطاب:...... یہ کتاب بھی عربی زبان میں ہے جو خلیفہ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے حالات پر مشتمل ہے اور مصنف شہیر کی کم وبیش پچاس برس کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ یہ غیر مطبوعہ ہے۔ اس کی اشاعت سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی حیاتِ مبارکہ کے بہت سے پہلو لوگوں کے سامنے آئیں گے۔ کاش اس کی اشاعت کا مرحلہ جلد طے ہو جائے۔

۳۔ کتاب الاجناس:...... یہ کتاب الاموال کے جلیل القدر مصنف ابو عبید قاسم بن محمد بن سلام ہروی (متوفی ۲۲۴ھ) کا رسالہ ہے جو عرشی صاحب نے ایڈٹ کر کے شائع کیا۔ ان کی یہ خدمتِ علم بھی عربی زبان میں ہے۔

۴۔ تاریخ اکبری المعروف تاریخ قندھاری:...... یہ عہد اکبری کی تاریخ ہے جو اس کے ایک درباری نے قلم بند کی تھی۔ عرشی صاحب نے اسے مرتب کر کے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا اور اہل علم کو اس کتاب سے متعارف کرایا۔ یہ فارسی زبان میں ہے۔

۵۔ تاریخ محمدی:...... یہ مرزا محمد حارثی بدخشی دہلوی کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں پہلی صدی ہجری سے لے کر مصنف کے عہد تک کے مشاہیر کے سنین وفات کی تحقیق کی گئی ہے۔ مولانا امتیاز علی

Marfat.com

عرشی مرحوم نے اس کتاب کے اس حصے کو مرتب کیا، جس کا تعلق بارھویں صدی ہجری سے ہے۔ یہ کتاب بھی فارسی زبان میں ہے۔ ۱۹۶۰ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔

۶۔ وقائع عالم شاہی:...... یہ کتاب درحقیقت مغل حکمران شاہ عالم ثانی کی فوج کے ایک بڑے عہدے دار کنور پریم کشور فراقی کا روزنامچہ ہے۔ شاہ عالم ثانی نے جب مرہٹوں پر حملہ کیا تو فراقی اس کی فوج میں شامل تھا۔ یہ روزنامچہ اسی زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ عرشی صاحب نے اسے دریافت کر کے مرتب کیا اور ۱۹۴۹ء میں اس کی اشاعت ہوئی۔ یہ روزنامچہ فارسی میں ہے اور اس دور کے حالات کی چشم دید دستاویز ہے۔

۷۔ نادرات شاہی:...... یہ مغل حکمران شاہ عالم ثانی کے فارسی، ہندی اور اردو کلام کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۴ء میں منظرِ اشاعت پر آئی اور اس کی اشاعت سے پہلی مرتبہ یہ بات لوگوں کے علم میں آئی کہ یہ مظلوم و مقہور بادشاہ شعر و سخن اور ادب سے گہرا تعلق رکھتا تھا۔

۸۔ دستور الفصاحت:...... یہ کتاب حکیم احمد علی یکتا کی تصنیف ہے۔ اس کا آخری باب شعراء کے حالات پر محیط ہے۔ عرشی مرحوم نے اسے مرتب کیا اور اس پر حواشی تحریر کیے۔ اس پر انھوں نے جو مقدمہ سپرد قلم کیا، اس میں شعرائے اردو کے چند تذکروں پر بڑی مفید بحث کی ہے۔ اس کتاب کا سالِ اشاعت ۱۹۴۳ء ہے۔

۹۔ اردو اور افغان:...... یہ کتاب اردو اور پشتو کے باہمی تعلق کے موضوع پر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس سلسلے کی یہ اوّلین معلومات افزا کتاب ہے۔ ۱۹۶۰ء میں پشتو اکادمی پشاور کی طرف سے شائع ہوئی۔

۱۰۔ فہرست مخطوطات اردو: یہ رضا لائبریری رام پور کے اردو مخطوطات کی مفصل فہرست کی جلد اول ہے اور ۲۱۰ نادر مخطوطات کے تعارف پر مشتمل ہے۔

۱۱۔ فہرست مخطوطات عربی:...... یہ رضا لائبریری کے کم و بیش ڈیڑھ ہزار عربی مخطوطات کی فہرست ہے جو چھے جلدوں میں مرتب ہوئی اور انگریزی زبان میں ہے۔ اس میں ہر کتاب کا تعارف کرایا گیا ہے۔ یہ فہرست چھپ چکی ہے۔

اب آیے میرزا اسد اللہ خاں غالب سے متعلق ان کی تحقیقات کی طرف۔!

۱۲۔ مکاتیبِ غالب:...... غالبیات مولانا امتیاز علی عرشی کا خاص دلچسپی کا موضوع تھا۔ اس موضوع سے انھیں رام پور کے کتب خانے سے منسلک ہو جانے کے بعد تعلق پیدا ہوا اور پھر اس سلسلے میں جوں جوں مواد سامنے آتا گیا، دلچسپی بڑھتی گئی۔ رام پور کے کتب خانے میں غالب کے ان خطوط کا ذخیرہ موجود تھا، جو

Marfat.com

غالب نے ریاست رام پور کے نواب یوسف علی خاں ناظم اور اس کے جانشین نواب کلب علی خاں وغیرہ کے نام لکھے تھے۔ عرشی صاحب نے یہ تمام خطوط جمع کیے اور ان پر ایک طویل و مبسوط مقدمہ تحریر کیا، جس میں غالب اور غالب کی خطوط نویسی پر تفصیل سے بحث کی۔ خطوط پر ضروری حواشی بھی لکھے۔ پھر ۱۹۳۷ء میں اس مجموعے کو ''مکاتیب غالب'' کے نام سے شائع کیا۔ غالب سے دلچسپی اور ادب سے تعلق رکھنے والے حلقوں میں اس کتاب نے بڑی مقبولیت حاصل کی اور غالب کے بارے میں عرشی صاحب نے ایک محقق کی حیثیت سے شہرت پائی۔ اس کتاب کو اتنی پذیرائی حاصل ہوئی کہ کئی دفعہ شائع کی گئی۔

۱۳۔ انتخاب غالب:...... یہ بھی عرشی مرحوم کا ایک قابل قدر ادبی اور تحقیقی کارنامہ ہے۔ ۱۸۶۶ء میں غالب نے والئی رام پور نواب کلب علی خاں کی فرمائش پر اپنے فارسی اور اردو کلام کا انتخاب کر کے اسے بھیجا تھا۔ یہ انتخاب رام پور لائبریری میں مخطوطے کی صورت میں محفوظ تھا۔ عرشی صاحب نے اسے مقدمے اور حواشی سے مزین کیا اور پھر یہ ۱۹۴۲ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔

۱۴۔ فرہنگ غالب:...... یہ کتاب مختلف زبانوں کے الفاظ کی ان تشریحات و معانی کو محتوی ہے جو خود غالب نے اپنی کتابوں میں کی ہیں۔ عرشی صاحب نے ان تمام تشریحات و معانی کو جمع کر دیا ہے۔ اس کتاب کو فنِ لغت کی ایک اہم کتاب کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ عرشی صاحب نے اس پر جو محنت کی وہ قابل داد ہے اور اس سے غالب کی ایک نئی تصنیف معرضِ وجود میں آ گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی تھی۔

۱۵۔ دیوان غالب:...... عرشی مرحوم کا یہ مرتبہ دیوانِ غالب ''نسخہ عرشی'' کہلاتا ہے۔ اس میں غالب کا تمام اردو کلام تاریخی ترتیب سے جمع کر دیا گیا ہے اور اس ضمن میں جہاں کہیں اختلاف ہے، اس کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے۔ یہ ایک علمی اور ادبی تحفہ ہے جو عرشی مرحوم نے غالب کے قدر دانوں کی خدمت میں نہایت خوب صورت شکل میں پیش کیا۔ یہ تین حصوں پر محیط ہے اور وہ حصے یہ ہیں:

☆...... گنجینۂ معنی

☆...... نوائے سروش...... اور

☆...... یادگار نالہ

عرشی صاحب طویل عرصے تک غالب کے بارے میں تحقیق و جستجو میں مصروف رہے اور اس موضوع سے متعلق انھوں نے بہت سے مضامین تحریر کیے اور کئی کتابیں لکھیں۔ ان میں سے بعض مقالات و مضامین

Marfat.com

ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔

عرشی مرحوم کے علاوہ غالب پر متعدد حضرات نے تحقیقی کام کیا، ان میں تین اصحابِ علم یہ ہیں: مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر شیخ محمد اکرام اور عربی، فارسی، اردو، ہندی، انگریزی کے مشہور ہندوستانی سکالر ڈاکٹر مالک رام۔

۱۶۔ مقالات عرشی:...... یہ عرشی مرحوم کے چودہ مقالات کا دل آویز مجموعہ ہے اور علمی و تحقیقی اعتبار سے نہایت اہمیت کا حامل۔ مقالات کا یہ مجموعہ مجلس ترقی ادب لاہور نے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا تھا۔

۶۶۹ صفحات کا یہ مجموعہ مندرجہ ذیل مقالات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

☆......امام سفیان ثوری کے سوانح حیات اور ان کی تصنیفات

☆......صحیح مسلم کا ایک قدیم نسخہ ہندوستان میں

☆......نہج البلاغہ کا استناد

☆......امام ابن حزم ظاہری اور ان کی کتاب ''الانساب''

☆......رباعیات عمر خیام کا ایک نادر نسخہ

☆......رباعیات عمر خیام ''مرصاد العباد'' میں

☆......نجم النسفی

☆......سمعانی اور ان کی کتاب ''الانساب''

☆......زرنوجی کا نظام تعلیم و تعلم

☆......آداب المتعلمین اور محقق طوسی

☆......طبقات الفقہاء الشافعیہ الوسطیٰ

☆......ظہور الاسرار نامی اور مظہر گڑھ

☆......تاریخ محمدی اور اس کے مولف کے احوال و آثار

☆......مولانا آصفی اور ان کی شاعری

مولانا امتیاز علی عرشی وسیع النظر اور کثیر المطالعہ عالم تھے۔ تفسیر و حدیث، تذکرہ و رجال اور شعر و ادب کے بہت سے گوشوں پر انھیں عبور حاصل تھا۔ شاعر بھی تھے اور کبھی کبھی شعر کہتے تھے۔ عرشی تخلص تھا۔ معیار شعری اتنا اونچا تھا کہ خود اپنا کلام بھی انھیں جچتا نہ تھا، اس لیے اس کی اشاعت سے گریز کرتے تھے۔ وہ متین و باوقار عالم، حلیم الطبع نقاد اور برصغیر کی علمی متاع تھے۔ وہ وطنی اعتبار سے ہندوستان سے تعلق رکھتے تھے، لیکن پاکستان کے اہل علم ان کے افکار سے برابر مستفید ہو رہے تھے۔

Marfat.com

انھوں نے علم وتحقیق کے ہر کوچے کی سیر کی اور فکر و دانش کی ہر راہ پر گامزن ہوئے۔ اللہ نے ان کو ذہن بھی تیز عطا فرمایا تھا اور قلم کی روانی سے بھی خوب نوازا تھا۔ انھوں نے جس موضوع پر لکھا اور جس مسئلے پر اظہارِ خیال کیا، اس کے تمام اہم پہلوؤں کی وضاحت کردی۔

اس عظیم محقق اور عالی مرتبت مصنف نے ۲۴ اور ۲۵۔ فروری ۱۹۸۱ء کی درمیانی شب کو حرکتِ قلب بند ہوجانے سے داعی اجل کو لبیک کہا اور رضا لائبریری کے قریب رام پور کے حامد پیلس کے ایک کونے میں انھیں دفن کردیا گیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا محمد اقبال رحمانی

(وفات ۳۱- اگست ۱۹۸۲ء)

چھوٹا قد، گٹھا ہوا جسم، مجسمۂ متانت، جلال و جمال کا خوش نما پیکر، نورانی چہرہ، نمونہ سلف، تقویٰ اور پرہیز گاری کے قالب میں ڈھلے ہوئے، صالحیت کی چلتی پھرتی تصویر، مزاج میں مسرت کی جھلکیاں، پُر وقار و پُر بہار شخصیت، گفتگو میں مٹھاس، عمدہ خصال، سادہ لباس، بہترین کردار۔ یہ تھا مولانا محمد اقبال رحمانی کا حلیہ اوران کی شخصیت کا عکس، جس سے ہم مطلع ہوئے۔

اب آیئے ان کے کوائفِ حیات اور زندگی کے شب و روز کی طرف:

وہ ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ضلع گونڈہ کے ایک قصبے بونڈھیار میں ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوئے۔ سنِ ولادت ''اللہ کی رحمت کے مظہر'' بنتا ہے۔ ان کے والد کا اسم گرامی عبدالستار اور دادا کا محمد اشرف خاں تھا۔ یہ حضرات مالی اعتبار سے بھی اس نواح میں اچھی شہرت رکھتے تھے اور دینی اعتبار سے بھی قرآن و حدیث پر عامل تھے، یعنی اہل حدیثیت وسلفیت کے مبلغ وداعی۔

ان کے قصبے کے دار العلوم کا نام ''جامع سراج العلوم'' تھا۔ اس کے مجلّے میں ان کے جو کوائفِ حیات شائع ہوئے ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے ابتدائی تعلیم وہیں کے ایک استاد مولانا محمد سلیمان مئوی سے حاصل کی اور گیارہ سال کی عمر میں جامعہ کے پرائمری عربی درجات کی تکمیل کرلی۔

اس کے بعد ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء کے درمیانی عرصے میں گھر سے نکلے اور دہلی پہنچے۔ وہ دہلی کے دارالحدیث رحمانیہ کے عروج کا زمانہ تھا۔ مولانا محمد اقبال رحمانی نے اس میں داخلہ لیا اور حصولِ تعلیم میں مصروف ہوگئے۔ تقریباً پانچ سال وہاں کے فاضل اساتذہ سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ۱۹۳۷ء یا ۱۹۳۸ء میں جامعہ سراج العلوم کے ایک نامور استاذ مولانا حکیم محمد یاسین دہلی گئے اور انھیں دوبارہ جامعہ سراج العلوم لے آئے۔ کچھ عرصہ وہاں تحصیل علم کی۔

اس کے بعد پھر دارالحدیث رحمانیہ (دہلی) چلے گئے اور ۱۹۳۹ء میں رحمانیہ سے سندِ فراغت حاصل کی۔

جامعہ سراج العلوم اور دارالحدیث رحمانیہ میں جن اساتذہ کرام سے حصول علم کیا، وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

مولانا حکیم محمد یاسین، مولانا محمد یونس، مولانا زین اللہ، مولانا عبدالغفور بسکوہری، مولانا محمد سلیمان مئوی،

Marfat.com

مولانا نذیر احمد املوی رحمانی، شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی، مولانا احمد اللہ پرتاپ گڑھی دہلوی، مولانا اصحاب اللہ عرف باجا، مولانا عبدالحلیم سرحدی اور مولانا عبدالحلیم ناظم۔

ان کے ان گرامی قدر اساتذہ میں سے حضرت مولانا احمد اللہ پرتاپ گڑھی دہلوی کو حضرت میاں سید نذیر حسین سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ اس اعتبار سے مولانا محمد اقبال رحمانی حضرت میاں صاحب کے بہ یک واسطہ شاگرد ہوئے۔

مولانا محمد اقبال رحمانی بیس سال کی عمر میں رحمانیہ سے فارغ ہو کر اپنے وطن آئے اور جامعہ سراج العلوم کی مسندِ درس پر متمکن ہوئے۔ اس وقت وہ بیس برس کے نوجوان تھے۔ پھر تادمِ واپسیں یہیں سلسلۂ تدریس جاری رکھا۔ وہ بے حد محنتی اور نہایت لائق مدرس تھے۔ مختلف اوقات میں ان سے بے شمار طلبا نے تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے علومِ مروّجہ میں سے ہر علم کی کتابیں طلبا کو پڑھائیں اور ان کے طریقِ تدریس سے طلبا ہمیشہ مطمئن رہے۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ طلبا کی تربیت بھی کرتے تھے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ اگر کسی سے کوئی کام لینا مقصود ہوتا تو وہ اس کا حکم دینے کے بجائے خود ہی کام کرنے لگتے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کسی کی نظر پڑتی تو وہ دوڑ کر آتا اور وہ کام کرنا شروع کر دیتا جو مولانا کر رہے ہوتے۔

مولانا موصوف طبعاً متواضع، منکسر اور مہمان نواز تھے۔ کوئی صاحب کہیں سے جامعہ تشریف لاتے تو انھیں مل کر بڑی مسرت کا اظہار فرماتے، خندہ پیشانی سے پیش آتے اور ان کی خدمت کرنا اپنا فرض قرار دیتے۔ چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں سے احترام کا برتاؤ ان کا شیوہ تھا۔

مولانا ممدوح جامعہ سراج العلوم کے منتظم و مہتمم بھی تھے۔ اس اعتبار سے بحیثیت منصب انھیں جامعہ کے اساتذہ پر فوقیت حاصل تھی، لیکن انھوں نے کبھی اس منصب کو اہمیت نہیں دی۔ وہ ہر استاذ کی تکریم کرتے اور جامعہ کے ہر شخص کو لائق تعظیم گردانتے۔ کسی قسم کی تعلّی اور بڑائی کا اظہار نہ کرتے۔ نرم خوئی ان کا خاصہ اور دل جوئی ان کا اصل وصف تھا۔

ان کا زمانۂ تدریس چالیس سال سے زیادہ عرصے پر محیط ہے۔ یہ پورا عرصہ اسی جامعہ سراج العلوم میں گزرا۔ اس میں انھوں نے تدریسی خدمات بھی سرانجام دیں اور جامعہ کی تعمیر میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ کئی نئے کمرے تعمیر کرائے اور طلبا کی رہائش کے لیے بہتر انتظامات کیے۔ لوگ ان کی بات مانتے اور جامعہ کی عمارتی اور تدریسی ترقی کے لیے ان سے پورا تعاون کرتے۔

وہ تمام عمر تدریس میں مصروف رہے اور اس ہمہ وقتی مصروفیت کی وجہ سے وہ کوئی تحریری کام نہیں کر

Marfat.com

سکے۔ اگر اس طرف توجہ فرماتے تو یہ کام ان کے لیے بہت آسان تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اصل کام درس و تدریس ہے۔ یہ علوم کے پھیلاؤ کا باعث اور لوگوں کی ذہنی، اخلاقی، فکری تربیت کا بنیادی ذریعہ ہے۔

مولانا موصوف واعظ اور مقرر بھی تھے اور سامعین ان کے طرزِ وعظ و خطابت سے متاثر ہوتے تھے۔

انھوں نے پہلا حج ۱۹۶۹ء میں کیا۔ دوسری دفعہ ۱۹۸۲ء میں اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ حج کے لیے گئے۔ ۱۴-اگست ۱۹۸۲ء کو بمبئی سے ہوائی جہاز پر سوار ہوئے۔ جاتے ہی اسی روز عمرہ ادا کیا۔ کچھ عرصے سے دل کے مریض تھے، لیکن اب افاقہ تھا۔ وہاں جانے کے بعد دوسرے دن (۱۵-اگست کو) تکلیف ہوگئی۔ مکہ مکرمہ کے ظاہر اسپتال میں داخل کرائے گئے۔ لیکن یہ بیماری جان لیوا ثابت ہوئی۔ منگل کے روز ۳۱-اگست ۱۹۸۲ء (۱۱-ذیقعدہ ۱۴۰۲ھ) کو وفات پا گئے۔ مکہ مکرمہ کے قبرستان جنت المعلّٰی میں دفن کیے گئے۔ ۶۳-سال عمر پائی۔

اللهم اغفرله و ارحمه و عافه و اعف عنه.

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا سید اسماعیل سلفی رائیدُرگی

(وفات ۳۱-جنوری ۱۹۸۳ء)

مولانا سید اسماعیل کے آبا و اجداد ہندوستان کے علاقہ دکن کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ اس علاقے کو اب آندھرا پردیش کہا جاتا ہے۔ یہ گاؤں ضلع انت پور کی تحصیل کلیان ڈرگ میں واقع ہے۔ سادات کے اس خاندان میں مدتوں سے پیری مریدی کا سلسلہ چلا آ رہا تھا اور یہ لوگ انہی عادات واطوار کے مالک تھے جو خاندانی پیروں میں پائی جاتی ہیں۔

مولانا اسماعیل کے والد کا نام سید سرمست حسین تھا۔ ان کی ملاقات ایک مبلغ توحید بزرگ مولانا سید عبدالقادر سے ہوئی جو ''سید قادر بادشاہ'' کے عرف سے معروف تھے۔ انھوں نے ان کا نام ''سید عبداللہ'' رکھ دیا اور مولانا اسماعیل شہید کی مشہور کتاب ''تقویۃ الایمان'' مطالعہ کے لیے عنایت فرمائی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ان کی زندگی کا پورا نظامِ عبادت بدل گیا اور پیری مریدی کے سلسلے ختم ہو گئے۔

سرمست حسین نے جو نام کی تبدیلی سے سید عبداللہ ہو چکے تھے، پیری مریدی تو چھوڑ ہی دی تھی، لیکن اب ان کا اپنے آبائی مسکن اور قدیم ماحول میں رہنا بھی مشکل ہو گیا، چنانچہ وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ وہاں سے نکلے اور پچیس میل دور ایک مقام ''رائیدرگ'' میں جا آباد ہوئے۔ ان کے آباد ہونے کے بعد اس مقام نے تعلیمی اور تدریسی اعتبار سے بڑی شہرت پائی۔

۱۸۹۷ء میں سید عبداللہ کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام انھوں نے ''تقویۃ الایمان'' کے مصنف کے نام پر اسماعیل رکھا۔ اسماعیل کی ابتدائی تعلیم والد بزرگ وار کے زیر نگرانی گھر ہی میں ہوئی۔ اللہ نے اس بچے کو قوتِ فہم بھی عطا فرمائی اور صلاحیت کی دولت سے بھی نوازا۔ جلد ہی متعدد درسی کتابیں پڑھ لیں اور مزید تحصیل علم کی راہ پر چل پڑے۔

۱۹۱۱ء میں کرنول چلے گئے، جہاں ایک عالم دین مولانا محمد عمر کا سلسلۂ درس جاری تھا۔ دو سال ان کی خدمت میں رہے اور علومِ متداولہ کی بہت سی کتابیں ان سے پڑھیں۔ اب ان میں حصولِ علم کا شوق اور بڑھ گیا تھا۔ چنانچہ وہاں سے نکلے اور ''پیارم پیٹ'' پہنچے جو علاقہ مدراس کے ضلع شمالی آرکاٹ میں واقع ہے۔ پیارم پیٹ کے مدرسے کی مسندِ درس پر حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد مولانا فقیر اللہ پنجابی رونق

Marfat.com

افروز تھے جو اس دور کے مشہور مدرس و مناظر اور ممتاز مبلغ و مقرر تھے۔ مولانا فقیر اللہ کا مدراس پہنچنے کا پس منظر یہ ہے کہ ان دنوں احناف کے بریلوی مسلک کے ایک واعظ مولانا سلطان احمد کی تقریروں کا بڑا چرچا تھا اور وہ اپنے خاص انداز میں اہل حدیث کی شدید مخالفت کر رہے تھے۔ بنگلور کے ایک تاجر سید عباس نے حضرت میاں سید نذیر حسین کو خط لکھا کہ وہ یہاں کسی ایسے اہل حدیث عالم کو بھیجیں جو مولانا سلطان احمد بریلوی کے اعتراضات کا کتاب و سنت کی روشنی میں مسکت جواب دے سکیں۔ حضرت میاں صاحب نے وہاں اپنے شاگرد مولانا فقیر اللہ کو بھیج دیا جو دہلی کے مطبع مجتبائی میں مصحح کے طور پر خدمت سرانجام دیتے تھے۔ ان کا وہاں تشریف لے جانا ہر اعتبار سے باعث برکت ثابت ہوا اور مولانا سلطان احمد بریلوی سے مقابلے کا انھوں نے جو اسلوب اختیار کیا اللہ نے اس میں انھیں کامیابی عطا فرمائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے اصرار کر کے ان کو وہیں روک لیا اور پھر بنگلور کے علاقے میں انھوں نے بے حد خدمات سرانجام دیں، وعظ و خطابت کی صورت میں بھی اور درس و تدریس کی شکل میں بھی۔

اس وقت پیارم پیٹ میں ایک معروف عالم مولانا عبدالقادر فروکش تھے جو عمر کی بہت سی منزلیں طے کر چکے تھے اور ان پر نقاہت نے غلبہ پا لیا تھا۔ وفات کے وقت انھوں نے وصیت کی کہ مولانا فقیر اللہ کو بنگلور سے بلا کر ان کی جگہ خطیب و مدرس مقرر کر لیا جائے۔ مولانا کو ان کی وصیت کی اطلاع ملی تو وہ بنگلور سے پیارم پیٹ تشریف لے گئے اور پھر وہیں سکونت اختیار کر لی۔ اب پیارم پیٹ اور اس کے قرب و جوار کی قسمت جاگی۔ مولانا کے وعظ و ارشاد اور درس و تدریس کا فیضان بڑھنے لگا اور علاقے میں کتاب و سنت کی روشنی روز بہ روز پھیلنے لگی۔ ❶

مولانا سید اسماعیل ۱۹۱۳ء میں مولانا فقیر اللہ کی خدمت میں گئے تھے۔ ۱۹۱۶ء تک چار سال وہ ان کے حلقۂ درس میں رہے۔ ان کے علاوہ بھی ان سے بہت سے لوگوں نے اخذِ فیض کیا اور پھر آگے چل کر ان لوگوں نے لاتعداد علما و طلبا کو مستفید فرمایا۔

پیارم پیٹ ہی کے دورانِ تعلیم میں مولانا فقیر اللہ سے مولانا سید اسماعیل کو امرتسر کے غزنوی علما کے متعلق پتا چلا تو وہ وہاں تشریف لے گئے اور مدرسہ غزنویہ کے اساتذہ کے سامنے زانوے شاگردی تہہ کیے۔ مولانا اسماعیل امرتسر میں مولانا ثناء اللہ امرتسری سے بھی فیض یاب ہوئے۔ نمازِ فجر کے بعد وہ ان کے درسِ قرآن میں شریک ہوتے رہے۔ مسلسل چھے سال انھوں نے مدرسہ غزنویہ کے عالی قدر اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اور ان سے خوب فیض پایا۔ ۱۹۲۳ء میں مدرسہ غزنویہ سے فراغت پائی اور سند حاصل کی۔ اسی سال

❶ مولانا فقیر اللہ کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو اس فقیر کی کتاب ''دبستانِ حدیث'' شائع کردہ مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور۔

Marfat.com

ان کی شادی ہوگئی۔

اس سے اگلے سال ۱۹۲۴ء میں علاقہ کرناٹک کے ایک شہر ''سرسی'' گئے اور دو سال وہاں امامت و خطابت اور درس و تدریس میں مشغول رہے۔ ۱۹۲۶ء میں رائیدرگ آ گئے۔ وہاں احناف نے اہل حدیث حضرات کے خلاف ایک مقدمہ دائر کر رکھا تھا۔ اس مقدمے کی وجہ یہ تھی کہ قصبہ وانمباڑی ضلع شمالی آرکاٹ کے ایک متمول شخص چاند صاحب نے جو چمڑے کی تجارت کرتے تھے اور مسلکاً اہل حدیث تھے، موضع رائیدرگ میں ایک مسجد بنوائی، جس میں سب فقہی مسالک کے لوگ نماز پڑھتے تھے۔ کچھ عرصے تک یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ اس مسجد کے خطیب و امام مولانا عبدالوہاب شیرازی تھے جو بڑا موثر وعظ کہتے تھے۔ جب ان کا اثر موضع رائیدرگ اور اس کے اردگرد کے قصبات و دیہات میں پھیلنے لگا اور اہل حدیث کی تعداد بڑھنے لگی تو احناف نے اہل حدیث کو مسجد میں آنے سے روک دیا اور دنگا فساد کر کے مسجد پر قبضہ کر لیا۔ مقدمہ عدالت میں چلا گیا۔ حسنِ اتفاق سے اسی اثنا میں مولانا سید اسماعیل سرسی سے رائیدرگ لوٹے اور اس مقدمے میں دلچسپی لینے لگے۔ مولانا نے مقدمے میں انتہائی بھاگ دوڑ کی۔ جماعت اہل حدیث کے تمام افراد نے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اس میں حصہ لیا۔ اصحابِ ثروت نے دل کھول کر مالی امداد کی اور دیگر لوگوں نے بھی جو کچھ ہوسکتا تھا، کیا۔ بالآخر اللہ کی مہربانی سے جماعت اہل حدیث کامیاب ہوئی، فیصلہ اس کے حق میں ہوگیا اور انھیں مسجد مل گئی۔

اب مولانا اسماعیل نے رائیدرگ کی جماعت کو منظم کرنے کے لیے وہاں انجمن محمدیہ کی بنیاد رکھی اور اس کے زیر اہتمام ایک مدرسہ جاری کیا۔ اس سے کچھ عرصہ بعد ۱۹۳۹ء میں اس ابتدائی مدرسے کو وسعت دینے کا عزم کیا اور اس عزم میں اللہ نے ان کو کامرانی بخشی۔ اس کے اولیں استاذ اس نواح کے مشہور عالم مولانا فضل الرحمٰن کو بنایا گیا جو ہندوستان کے نامور شیخ الحدیث مولانا محمد نعمان اعظمی مرحوم کے فرزندِ گرامی قدر تھے۔

جامعہ محمدیہ عربیہ کے علاوہ مولانا سید اسماعیل کی کوشش سے رائیدرگ میں ایک یتیم خانہ بنایا گیا۔ ہائی سکول بنائے گئے اور متعلقہ تعلیمی بورڈوں سے ان کی منظوری لی گئی۔ پھر ایک اہم کام یہ کیا گیا کہ افضل العلما اور منشی فاضل وادیب فاضل وغیرہ کے امتحانات کے لیے جامعہ محمدیہ عربیہ کا مدراس یونیورسٹی سے الحاق کرایا گیا۔ حکومت کی انتظامی مصلحتوں کی بنا پر صوبہ مدراس تقسیم ہوا تو جامعہ محمدیہ عربیہ کا الحاق سری ونکیشورا یونیورسٹی سے ہوگیا۔

مذکورہ تمام تعلیمی ادارے جامعہ محمدیہ عربیہ کی چار دیواری کے اندر ہیں۔ جامعہ کی لائبریری بھی وہیں ہے جو مختلف موضوعات کی اہم کتابوں پر مشتمل ہے۔ مولانا نے اپنا ذاتی کتب خانہ بھی جامعہ محمدیہ عربیہ کے حوالے

Marfat.com

کر دیا۔

مولانا ممدوح کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ امام ابن تیمیہ، امام ابن قیم اور ابن جوزی کی تصانیف بالخصوص انھیں بہت پسند تھیں اور ان کا مطالعہ وہ بڑے شوق اور دلچسپی سے کرتے تھے۔ جب تک ان کی نظر ٹھیک رہی، وہ مختلف کتابوں کا مطالعہ خود کرتے رہے، لیکن جب نظر کمزور ہوگئی تو کسی دوسرے سے اپنی پسند کی کتابیں سننے لگے۔ کثرتِ مطالعہ سے ان کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔

جماعتی تنظیم کے سلسلے میں ان کا تعلق ہمیشہ آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس سے رہا۔ وہ اس کے ہر جلسے میں شرکت فرماتے تھے اور علمائے کرام کی خدمت ان کا معمول تھا۔ طالب علم کی حیثیت سے تقریباً چھے سال ان کا قیام پنجاب میں رہا تھا اور اس صوبے کے بعض مقامات میں انھیں تقریر و خطابت کے مواقع بھی میسر آئے تھے، اس لیے اس نواح کے بہت سے علما کے علم و عمل کا ان پر خاص اثر تھا، جن میں مولانا حافظ عبداللہ روپڑی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد اسماعیل سلفی (گوجراں والا) اور غزنوی اصحاب علم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے وہ بہ درجہ غایت محبت و عقیدت کے مراسم رکھتے تھے۔ مولانا آزاد کے سیاسی نقطۂ نظر سے بھی وہ پوری طرح ہم آہنگ تھے۔ ذہنی اور عملی طور پر کانگریسی تھے۔ تقسیم ملک سے قبل بھی ان کا یہی سیاسی زاویۂ فکر تھا اور بعد میں بھی یہی رہا۔

علما سے تعلق و مراسم کے سلسلے میں وہ نہایت وسیع الظرف تھے۔ مولانا ابوالقاسم بنارسی، مولانا عبدالوہاب آروی، مولانا سید تقریظ احمد سہسوانی اور دیگر تمام علما کا جن میں مدراس اور رائیدرگ وغیرہ کے علاقوں کے علما شامل ہیں، وہ بے حد احترام کرتے تھے۔ عام طور پر علما میں معاصرت کی وجہ سے جو باہم بُعد سا پیدا ہو جاتا ہے، اس سے اللہ نے ان کو محفوظ رکھا تھا۔ وہ سب کو محترم گردانتے اور سب کی تکریم بجالاتے تھے۔

اہل حدیث علما کے علاوہ غیر اہل حدیث علما کا اکرام بھی ان کے نزدیک ضروری تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رائیدرگ تشریف لائے تو ان کی شان کے مطابق ان کا استقبال کیا اور ان کے اعزاز میں پبلک جلسے کے انعقاد کا اہتمام فرمایا۔

غیر مسلم لیڈر بھی وہاں جاتے تو مولانا اسماعیل صاحب ان سے میل ملاقات کرتے، ان کی تقریریں کرائی جاتیں اور ان سے اسی طرح پیش آتے، جس طرح مہمان سے پیش آنے کا حق ہے۔ ان غیر مسلموں میں جے پرکاش نارائن، سابق صدر ہندوستان ڈاکٹر نیلم سنجیوا ریڈی شامل ہیں۔ یہ آندھرا پردیش کے وزیر اعلیٰ بھی رہے تھے۔ یہ رائیدرگ گئے تو مولانا نے ان کا خیر مقدم کیا اور جلسہ بھی منعقد کرایا گیا، جس میں مولانا

Marfat.com

نے اس علاقے کی تلگو زبان میں پر جوش تقریر کی۔

مولانا ممدوح صاف دل عالم تھے۔ ان کا ذہن تعصب سے پاک تھا۔ وہ سب سے ہم دردانہ سلوک کرتے اور انھیں فائدہ پہنچانے کے لیے کوشاں رہتے۔ اس نواح کے مشہور عالم و مصنف مولانا ثناء اللہ عمری ایم اے (عثمانیہ) نے ایک مضمون میں ان کے حلیے، قدوقامت اور لباس وغیرہ کا ذکر کیا ہے: سانولا رنگ، دست و بازو قوی، سینہ کشادہ، کندھے مضبوط، سر بڑا اور اس پر شرعی بال، رعب دار چہرہ، بھرے رخسار، گھنی ڈاڑھی، کھلی پیشانی ان کے آثارِ ذہانت کی غماز، پنجابی طرز کا پاجامہ اور عمامہ زیبِ تن کیے ہوئے۔ قدوقامت بلند و بالا، آواز شیر کی طرح گرج دار، جنوبی ہند کے بے مثال واعظ، عوام تو عوام بڑے بڑے علما اور رؤسا کو بھی پل بھر میں رلانے اور پلک جھپکتے ہنسانے والے، شیریں بیان ایسے کہ دوست تو دوست جانی دشمن بھی ان کے قائل بلکہ گرویدہ تھے۔ جہاں جاتے عوام و خواص کو اپنا شیدا اور شیفتہ بنا لیتے۔ وعظ کی محفلوں میں ان کی طلاقتِ لسانی سے لوگ مبہوت ہو جاتے۔ قرآن و حدیث اور آثار سلف پر وہ بے تکان گھنٹوں بولتے اور اپنی درد بھری آواز سے پتھر کو بھی موم کر دیتے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کے مخالف بھی ان کی تعظیم و تکریم پر مجبور ہو جاتے۔

مولانا ثناء اللہ عمری مزید رقم طراز ہیں:

جنوبی ہند کے مختلف مقامات پر مولانا سید اسماعیل کے تبلیغی دورے شہروں کے علاوہ دیہاتوں میں بھی بہ کثرت ہوتے۔ وعظ کی ہر محفل میں مجمع ہی مجمع رہتا۔ ان کی تبلیغی جدوجہد نے بدعات و شرکیہ رسوم کے ازالے اور صحیح عقائد کی اشاعت میں وہ کام کیا جو شاید بڑے بڑے اداروں سے بھی برسوں میں انجام نہ پا سکتا۔ کتنی بدعتیں ہیں جو ان کی کوششوں سے مٹ گئیں اور کتنی سنتیں ہیں جو ان کی عملی زندگی کے طفیل زندہ ہو گئیں۔ ع

جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

اس مردِ خدا نے یہ دورے اس وقت کیے جب آج کی سفری سہولتیں عنقا تھیں۔ میلوں بیل گاڑیوں پر جانا پڑتا بلکہ بعض اوقات بارش اور گرمی میں دیہات کے کچے راستے پیدل طے کرنا پڑتے۔ کبھی اس مردِ مجاہد نے اس محنت شاقہ پر گھبراہٹ کا اظہار نہیں کیا۔ راہِ حق کے یہ تمام نشیب و فراز وہ ہنسی خوشی طے کرتے تھے۔

مولانا سید اسماعیل رائیدرگی علم و فضل کے ساتھ ساتھ نہایت صابر و شاکر اور متوکل علی اللہ تھے۔ وہ ۶۵ سال کی عمر کو پہنچے تھے کہ ۱۹۶۲ء میں ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ علاج معالجے سے دماغی حالت تو بحال ہو گئی لیکن ہاتھ پاؤں مفلوج ہی رہے۔ کامل بیس برس اسی حالت میں گزار دیے۔ ایک متحرک اور ہر وقت حالتِ عمل میں رہنے والے شخص کے لیے یہ بڑا صبر آزما مرض تھا۔ اس مرض میں وہ ہمیشہ تسلیم و رضا کا پیکر بنے رہے۔ نہ کبھی

Marfat.com

حرفِ شکایت زبان پر آیا اور نہ کبھی جذبات میں تلخی آئی۔ بیس سال کی اس طویل مدت میں ان پر کبھی اضطرابی کیفیت طاری نہیں ہوئی۔ مرض کی طوالت نے ان کے مضبوط جسم کو ہڈیوں کا ڈھانچا بنا دیا تھا۔ ان کی بصارت کا دیا بجھ گیا تھا، مگر بصیرت کی شمع روشن تھی۔ بدنی حالت پر نقاہت غالب آ چکی تھی، لیکن قوتِ فراست توانا تھی۔ دماغ کا معاملہ بھی صحیح تھا۔ ذہن بھی درست تھا اور طاقتِ گویائی میں بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

جنوبی ہند کے اس عالم کبیر نے تقریباً چھیاسی (۸۶) برس عمر پا کر ۳۱ جنوری ۱۹۸۳ء کو دوپہر کے وقت داعیِ اجل کو لبیک کہا اور دوسرے دن یکم فروری کو رائیدرگ کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ پاکستان کے لوگ ہندوستان کے اہل علم کے حالات سے بہت کم واقفیت رکھتے ہیں۔ جنوبی ہندوستان کے علما کے احوال زندگی تو انھیں اور بھی کم میسر آتے ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کے لوگ بھی پاکستان کے اصحابِ علم سے واقف نہیں ہوں گے۔

میں کسی اور دوست کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا، البتہ میری حالت یہ ہے کہ ہمیشہ نہایت بے تابی کے ساتھ ہندوستانی علما کے حالات سے آگاہی کا متمنی رہتا ہوں۔ اس بات میں بالعموم کویت سے میرے عزیز دوست عارف جاوید محمدی میری اعانت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس پر میں ان کا شکر گزار ہوں۔ مولانا سید اسماعیل رائیدرگی کے حالات بھی انھی نے ارسال فرمائے جو مولانا ثناء اللہ عمری ایم اے (عثمانیہ) اور مولانا محمد انور سلفی (مقیم کویت) کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ یہ چند سطور جو خوانندگانِ محترم کے مطالعہ میں آئیں انھی حضرات کے مضامین سے مستفاد ہیں۔

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا محمد کنگن پوری

(وفات ۱۰۔ جولائی ۱۹۸۳ء)

ضلع قصور (پنجاب) کی ایک معروف علمی شخصیت مولانا محمد کنگن پوری کی تھی۔ ان کی ولادت ۱۹۱۳ء (۱۳۳۱ھ) میں دریائے ستلج کے کنارے واقع ایک گاؤں مہو کے محمود میں ہوئی۔ والد کا اسم گرامی حاجی عمرالدین تھا۔ یہ خاندان ایک قصبے کنگن پور میں سکونت پذیر تھا۔

مولانا محمد کنگن پوری کچھ بڑے ہوئے تو حصولِ علم کی طرف توجہ کی اور ابتدائی تعلیم ایک عالم دین مولانا عبدالقادر فتح محمدی سے حاصل کی۔ پھر انہی کے ارشاد کے مطابق لکھو کے گئے اور حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے حلقہ تلامذہ میں شرکت کی اور ان سے خوب استفادہ کیا۔ صرف ونحو، معانی و بیان، فقہ واصول، منطق وفلسفہ اور تفسیر وحدیث کی تمام کتابیں ان سے پڑھیں۔

اس کے بعد ضلع فیروز پور کی تحصیل مکتسر کے ایک قصبے کھپیاں والی کا عزم کیا۔ وہاں حضرت مولانا عبداللہ صاحب کا سلسلۂ تدریس جاری تھا اور وہ اپنے وقت کے ممتاز محدث تھے، جو اگست ۱۹۴۷ء کے فسادات میں سکھوں کے ہاتھوں شہید ہوئے، ان سے مولانا محمد کنگن پوری نے دوبارہ علوم حدیث کی بعض کتابیں پڑھنے کا شرف حاصل کیا۔

اس وقت دہلی کے ایک مدرسے میں حضرت مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی درسِ حدیث دیتے تھے۔ ان کے درس حدیث کی تدریسی حلقوں میں بڑی شہرت تھی۔ مولانا محمد کنگن پوری کو حدیث اور علومِ حدیث سے بے حد شغف تھا، چنانچہ وہ دہلی کو روانہ ہوئے اور مولانا کھنڈیلوی سے اکتسابِ علم حدیث میں مشغول ہو گئے۔ فراغت کے بعد ان سے سند حاصل کی۔

حسنِ اتفاق سے انہی دنوں حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری جامع ترمذی کی شرح ''تحفۃ الاحوذی'' لکھ رہے تھے۔ مولانا محمد فارغ التحصیل ہونے کے بعد دہلی سے مبارک پور جا پہنچے اور حضرت مولانا مبارک پوری کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ مولانا کو ان کی قابلیت کا پتا چلا تو انھیں تحفۃ الاحوذی کی تصنیف میں اپنا معاون مقرر فرما لیا۔ مولانا مبارک پوری بولتے جاتے تھے اور یہ لکھتے جاتے تھے۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ کتنا عرصہ یہ خدمت سرانجام دیتے رہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس خدمت سے انھیں بہت علمی فائدہ پہنچا اور علومِ حدیث کے بارے

Marfat.com

میں ان کی معلومات میں بڑا اضافہ ہوا۔ اس علم سے انھیں پہلے سے رغبت تھی، اب یہ رغبت مزید بڑھ گئی۔

مبارک پور سے وہ دہلی گئے اور جس مدرسے میں ان کے استاذِ مکرم حضرت مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی خدمت تدریس انجام دیتے تھے، اسی مدرسے میں بہ طور مدرس ان کا تقرر ہوگیا۔ مولانا کھنڈیلوی کا بھی اصل مشغلہ علم حدیث تھا اور اس میں انھیں خاص امتیاز حاصل تھا۔ اب یہ بھی ان کی نگرانی میں اس خدمت میں مصروف ہوئے تو اس فنِ مبارک میں انھیں پوری مہارت حاصل ہوگئی۔

پھر وطن واپس آگئے اور ایک سال جامعہ محمدیہ لکھوکے (ضلع فیروز پور) میں تدریسی خدمت سرانجام دی۔ یہیں انھوں نے اپنی طالب علمی کا آغاز کیا تھا اور استاذِ پنجاب حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی سے تعلیم حاصل کرتے رہے تھے۔ اب یہیں ان کی نگرانی میں بہ طور مدرس خدمت انجام دینا شروع کی۔ جس طرح حضرت مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی کے زیرتربیت تدریس میں ان کو فائدہ پہنچا، اسی طرح مولانا عطاء اللہ لکھوی کی نگرانی میں تدریس ان کے لیے بے حد فائدہ مند ثابت ہوئی اور انھیں دونوں جلیل القدر اساتذہ کے اسلوبِ تدریس کا پتا چلا۔ ایک سال لکھوکے میں ان کا قیام رہا۔

بعد ازاں کنگن پور سے دو میل کے فاصلے پر موضع ''کلس'' میں بہ طور خطیب و مدرس پندرہ برس قرآن و حدیث کی اشاعت و تبلیغ میں مصروف رہے۔ حاجی جمال الدین جو موضع کلس کے واحد مالک تھے، مولانا کے اندازِ تدریس اور اسلوبِ خطابت کے گرویدہ تھے۔ ان کے تعاون اور حوصلہ افزائی سے مولانا نے اس علاقے میں کتاب و سنت کی بڑی تبلیغ کی اور اس کے نتیجے میں وہاں ایک مضبوط جماعت عالم وجود میں آگئی۔

۱۹۶۳ء میں وہ حضرت حافظ عبداللہ روپڑی کے اصرار پر جامعہ اہل حدیث قدس (لاہور) تشریف لے آئے اور پانچ سال یہاں ان کا سلسلۂ تدریس جاری رہا۔ حضرت حافظ صاحب روپڑی کے پاس بے شمار فتوے آتے اور لوگ ان سے مختلف قسم کے مسائل دریافت کرتے تھے۔ حافظ صاحب کے فرمان کے مطابق مولانا محمد کنگن پوری ان کے جواب لکھتے اور حافظ صاحب ہر فتوے پر دستخط کردیتے۔ فتوے کے سلسلے میں حضرت حافظ صاحب کو ان پر مکمل اعتماد تھا۔ اس فتویٰ نویسی سے بھی ان کے علم و مطالعہ کا دائرہ وسعت پذیر ہوا۔ جس طرح حافظ صاحب زاہد و متقی تھے، اسی طرح مولانا ممدوح بھی سراپا زہد واتقا تھے۔

مولانا ممدوح نیک سیرت اور صاحبِ اخلاقِ حمیدہ تھے۔ شیریں کلام اور سادہ مزاج۔ نماز باجماعت کے سختی سے پابند۔ نظر جھکا کر چلتے۔ نرم خو اور عمدہ خصال۔

حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے توجہ دلانے سے انھوں نے مشکوٰۃ کے حواشی لکھنا شروع کیے تھے۔ معلوم نہیں یہ اہم کام کہاں تک پہنچا تھا۔ یہ بھی پتا نہیں کہ اس سلسلے میں انھوں نے جو کام کیا وہ کہیں محفوظ

Marfat.com

بھی ہے یا نہیں۔

وہ علومِ حدیث پر گہری نظر رکھتے تھے اور اس کی خدمت کے لیے انھوں نے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔

وہ صحیح معنوں میں عالمِ باعمل تھے۔ نبی ﷺ کے ہر امر و نہی کو مدارِ عمل ٹھہرانا ان کے نزدیک ضروری تھا۔

اس خوش اطوار اور عالی کردار عالم نے ۱۰۔ جولائی ۱۹۸۳ء (۲۸-رمضان المبارک ۱۴۰۳ھ) کو وفات پائی۔ وفات کے وقت ان کی نرینہ اولاد پانچ بیٹے تھے۔

چودھری حمید اللہ سب سے بڑے تھے اور محکمۂ تعلیم میں کسی اہم عہدے پر فائز تھے۔

دوسرے مولوی بارک اللہ سکول ٹیچر تھے۔

تیسرے عطاء اللہ ظفر پریس رپورٹر تھے اور اپنا کاروبار بھی کرتے تھے۔

دو ان سے چھوٹے تھے۔ وہ بھی کاروبار میں مصروف تھے۔ [1]

والد مکرم کی راہ کسی بیٹے نے اختیار نہیں کی۔ وہ محقق عالمِ دین تھے۔ یقیناً ان کا خاصا بڑا کتب خانہ ہوگا۔ کچھ پتا نہیں ان کے کتب خانے کا کیا بنا۔ مختلف موضوعات پر ان کے عربی یا اردو کے مسودات بھی ہوں گے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ مسودات کہاں ہیں۔

❁❁❁❁

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "الفیوض المحمدیہ" از مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروز پوری: ص ۲۴۱ تا ۲۴۴۔

Marfat.com

مولانا عبداللہ ثانی امرتسری

(وفات ۷۔ ستمبر ۱۹۸۳ء)

پورا قد، گداز بدن، گندمی رنگ، تیکھی ناک، روشن آنکھوں پر نظر کی عینک، خوش لباس، خوش کلام، اچھے خطیب، سر پر سفید ململ کا عمامہ۔ یہ تھے مولانا عبداللہ ثانی امرتسری۔ ۱۹۰۱ء میں بمقام امرتسر پیدا ہوئے۔ یہ شہر ہمیشہ علم وعمل کا گھوارہ رہا۔ ہندو، مسلم اور سکھ تہذیبوں کا مرکز۔ متعدد مذاہب کا محور۔ ملکی سیاسیات میں بھی اس شہر کے لوگوں نے بڑی شہرت پائی اور آزادیٔ وطن کے لیے اس میں مختلف تحریکوں کے ذریعے بے حد جدوجہد کی گئی۔ یہاں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان خوں ریز فسادات بھی بہت ہوئے۔

جن علمائے کرام کی دینی مساعی کی وجہ سے اس شہر کو خاص طور پر شہرت ملی، وہ تھے غزنوی علما، حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری، حافظ عبداللہ روپڑی، مفتی محمد حسن، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا احمد اللہ رئیس امرتسری، مولانا غلام العلی قصوری، مولانا نور احمد اور دیگر بہت سے حضرات۔

حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری کے علاوہ بالخصوص مرزائیوں سے مناظروں کے سلسلے میں اس شہر کے جن لوگوں نے بہت نام پایا ان میں مولانا عبداللہ معمار، حبیب اللہ کلرک اور ان کے رفقائے کرام شامل ہیں۔ شہر کی طرح ضلع امرتسر کے مختلف مقامات میں بھی بے شمار نامور علماء پیدا ہوئے۔

ہمارا مقصد یہاں مولانا عبداللہ ثانی کے بارے میں چند باتیں عرض کرنا ہے۔ جس طرح اور بہت سے علما کے ابتدائی حالات کا پتا نہیں چلتا، اس طرح مولانا عبداللہ ثانی کی زندگی کے ابتدائی واقعات سے بھی ہم بے خبر ہیں۔ ان کے خاندانی پس منظر کا بھی ہمیں کوئی علم نہیں۔ انھوں نے تحصیل علم کا آغاز کب کیا اور کس عالم سے کون سی کتابیں پڑھیں اور کہاں پڑھیں، یہ تمام باتیں ہمارے دائرہ معلومات سے باہر ہیں۔ میرا خیال ہے، خود انھوں نے بھی اس قسم کی باتوں کا کہیں ذکر نہیں کیا (یا کیا تو ہمارے علم میں نہیں آیا)۔ کسی اور شخص کی بھی اس سلسلے کی کسی تحریر یا زبانی گفتگو کا ہمیں علم نہیں۔ ایک دو مرتبہ بعض حضرات سے صرف یہ پتا چلا تھا کہ انھوں نے حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کیا تھا، لیکن کس قسم کا استفادہ کیا تھا اور ان سے کون کون سی کتابیں پڑھی تھیں؟ اس کا کسی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔

ایک بات البتہ واضح ہے اور وہ یہ کہ امرتسر شہر اور اس کے قرب وجوار میں ہر فقہی مسلک کے علماء کثیر

Marfat.com

تعداد میں موجود تھے۔ شہر امرتسر میں مدرسہ غزنویہ تحصیل علم کا عظیم مرکز تھا، حافظ عبداللہ روپڑی کا سلسلہ تدریس بھی جاری تھا، مولانا ثناء اللہ امرتسری کی حیثیت علما وطلبا کے بہت بڑے مرجع کی تھی۔ علاوہ ازیں مفتی محمد حسن اور مولانا نور احمد کے مدرسے جاری تھے، جن میں ممتاز علما خدمت تدریس سرانجام دیتے تھے۔ ممکن ہے مولانا عبداللہ ثانی نے انہی مدارس میں سے کسی مدرسے میں تحصیل علم کی ہو۔ ان کا زیادہ تعلق حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری سے تھا اور مولانا کے ہفت روزہ اخبار ''اہل حدیث'' میں ان کے مضامین بھی کسی نہ کسی موضوع پر چھپتے رہتے تھے، ممکن ہے انھوں نے زیادہ استفادہ مولانا امرتسری سے کیا ہو۔

وہ امرتسر کی مسجد اہل حدیث ثاب کھٹیکاں میں خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا کرتے تھے اور اس مسجد میں ان کا درسِ قرآن بھی جاری رہتا تھا۔ وہ اپنے دور کے امرتسر کے ممتاز خطیب اور موثر واعظ تھے۔

میں نے ان کو پہلی مرتبہ تقسیم ملک سے کئی سال قبل اپنے آبائی وطن کوٹ کپورہ کی انجمن اصلاح المسلمین کے سالانہ جلسے میں تقریر کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ میرا وہ بچپن کا زمانہ تھا، لیکن مجھے یاد ہے وہ پنجابی زبان میں تقریر کرتے تھے اور ان کی تقریر سے لوگ بہت متاثر ہوئے تھے۔ انھیں وہاں ہر سالانہ جلسے میں دعوت شرکت دی جاتی تھی اور وہ باقاعدگی سے تشریف لے جایا کرتے تھے۔

حسنِ اتفاق ملاحظہ ہو کہ تقسیم ملک کے بعد ہم لوگ بھی (جو کوٹ کپوڑہ کی انجمن اصلاح المسلمین کی طرف سے ہر سال تبلیغی جلسہ کرایا کرتے تھے) جڑاں والا (ضلع فیصل آباد) آگئے اور مولانا عبداللہ ثانی بھی امرتسر سے وہیں منتقل ہوگئے۔ وہ بھی ہمیں جانتے تھے اور ہم لوگ بھی ان سے اچھی طرح متعارف اور ان کے وعظوں سے متاثر تھے۔ حافظ احمد پٹوی کی بھی کوٹ کپورہ کے سالانہ جلسوں میں شرکت رہتی تھی، انھوں نے بھی پناہ گزیں کی حیثیت سے جڑاں والا کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ ❶

جڑاں والا سے آٹھ نو میل کے فاصلے پر جڑاں والا فیصل آباد روڈ پر ایک قصبہ ''اواگت'' کے نام سے موسوم ہے۔ ہمیں اس نواح میں گئے چند روز ہوئے تھے کہ اواگت میں ایک چھوٹی سی نہر کے کنارے درختوں کے سائے میں کچھ لوگوں کی کوشش سے مہاجرین کی تکالیف اور ان کی فوری ضروریات کے سلسلے میں ایک جلسہ ہوا، جس میں اس علاقے کے بہت سے مہاجروں (یا پناہ گزینوں) نے شرکت کی۔ مقررین میں مولانا عبداللہ ثانی بھی شامل تھے اور یہ فقیر بھی۔ اس وقت مولانا ممدوح سے کافی دیر گفتگو ہوتی رہی۔ اس کے بعد میں اس قسم کے جلسوں میں کبھی نہیں گیا۔ مجھے پہلے جلسے ہی میں اندازہ ہوگیا تھا کہ بعض لوگ مہاجرین کی مظلومیت

---

❶ حافظ احمد پٹوی کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو اس فقیر کی کتاب ''گلستان حدیث'' صفحہ ۲۰۸۔ طبع مکتبہ قدوسیہ، اُردو بازار، لاہور۔ انھوں نے ۱۵۔ مارچ ۱۹۷۰ء کو جڑاں والا میں وفات پائی۔

Marfat.com

کے نام سے سرکاری اہل کاروں سے مل کر اپنا مفاد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس قسم کے حالات سے اللہ تعالیٰ سب کو محفوظ رکھے۔ بالخصوص شرفاء کے لیے وہ نہایت تکلیف دہ دور تھا۔

قیام پاکستان تک جڑاں والا شہر میں اہل حدیث کی کوئی مسجد نہ تھی۔ ایک مسجد دیوبندی حضرات کی تھی۔ ایک شاید بریلوی احناف کی ہوگی۔ وہاں جو اہل حدیث مختلف علاقوں سے آئے، ان میں ریاست فرید کوٹ کے لوگوں کی اکثریت تھی۔ ان لوگوں نے غلہ منڈی کے وسط میں مسجد بنائی اور مولانا عبداللہ ثانی کو اس کے خطیب مقرر کیا۔ مولانا خوب صورت انداز میں تقریر کرتے تھے اور لوگ بڑے غور سے ان کی تقریر سنتے تھے۔ ان کی تقریروں کے اثر سے بے شمار لوگوں نے مسلک اہل حدیث اختیار کیا۔

میں لاہور آیا اور اخبار الاعتصام جاری ہوا تو اس میں کبھی کبھی مولانا عبداللہ ثانی بھی مضمون لکھا کرتے تھے۔ انھیں مرکزی جمعیت اہل حدیث کی مجلس عاملہ کا رکن بھی بنایا گیا تھا۔ کچھ عرصہ وہ جامعہ سلفیہ کے ناظم تعلیمات بھی رہے۔ اس زمانے میں ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ وہ خوش مزاج اور خوش کلام عالم دین تھے۔ میں الاعتصام کی ادارت سے علیحدہ ہو کر ادارہ ثقافت اسلامیہ میں چلا گیا تھا، وہ ایک مرتبہ وہاں بھی تشریف لائے اور جماعتی معاملات سے متعلق گفتگو کرتے تھے۔

آخری دور میں وہ کچھ گھریلو پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے تھے، جن کی وجہ سے انھیں بعض بیماریاں لاحق ہو گئی تھیں۔ اسی اثنا میں لاہور اپنی صاحب زادی کے پاس آئے اور طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔ لاہور ہی میں ۷۔ ستمبر ۱۹۸۳ء کو وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا سید اقبال حسین

(وفات ۱۴۔فروری ۱۹۸۶ء)

مولانا سید اقبال حسین کی تاریخ ولادت ۱۸۹۶ء ہے۔ یہ مولانا سید ممتاز علی کے جن کا تذکرہ اس کتاب میں مندرج ہے، چھوٹے بھائی تھے۔ ابتدائی تعلیم ایک بزرگ میاں عبدالغنی سے اپنے مسکن میں حاصل کی۔ بعد ازاں مزید تعلیم کے لیے برادرِ کبیر سید ممتاز علی نے ان کو گونڈہ کی قدیم درس گاہ سراج العلوم میں (بونڈیہار) بھیج دیا۔ وہاں انھوں نے مولانا ابوالقاسم سے فارسی کی گلستان، بوستان اور بعض دیگر کتابیں پڑھیں اور علم صرف کی میزان منشعب اور پنج گنج وغیرہ کی تکمیل مولانا محمد سلیمان مئوی سے کی۔ پھر مدرسہ عالیہ مئو میں داخلہ لیا، وہاں مولانا ابوالنعمان عبدالرحمٰن سے دروس الادب اور قرأت الرشیدہ وغیرہ پڑھنے کا شرف حاصل کیا۔ بلرام پور جا کر مولانا عبدالحفیظ سے استفادہ کیا۔ مولانا سید ممتاز علی سے محیط الدائرہ اور مشکوٰۃ شریف پڑھیں۔ مولانا عبدالغفور بسکوہری اور بعض دیگر اساتذہ سے بھی مستفید ہوئے۔ دہلی کے مدرسہ رحمانیہ میں مولانا احمد اللہ دہلوی اور مولانا عبدالرحمٰن کے حضور زانوے ادب تہہ کیے۔ دہلی کے مدرسہ زبیدیہ کے بعض اساتذہ سے بھی تحصیل علم کی۔ دہلی ہی میں علم طب کی کتابیں پڑھیں اور ذریعہ معاش طبابت کو بنایا۔

روحانی علاج یعنی دم، درود اور تعویذ وغیرہ سے بھی شغف تھا۔ قبولیت دعا کی سعادت بھی بارگاہ الٰہی سے حاصل تھی۔ اس سلسلے میں لوگ ان کی خدمت میں آتے، مختلف معاملات کے لیے دعا کراتے اور اللہ تعالیٰ دعا قبول فرماتا۔ درس وتدریس اور وعظ وتذکیر کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ بعض مقامات میں مدارس بھی جاری کیے۔ اپنے قصبہ ''ریواں'' میں قاسم العلوم کے نام سے مدرسہ جاری کیا، جس کے عمر بھر ناظم رہے۔ یہ مدرسہ اب بھی اللہ کے فضل سے جاری ہے اور متداولہ علوم کی تعلیم کے لیے شہرت رکھتا ہے۔

جنات کے عارضے میں مبتلا لوگوں کا قرآن کی آیات پڑھ کر موثر علاج کرتے تھے۔ اس مرض کے بعض پرانے مریضوں کو اللہ نے شفا بخشی اور وہ سلفی العقیدہ ہو گئے۔ توحید وسنت کی تبلیغ کا یہ بہت بڑا ذریعہ تھا، جس کی وجہ سے متعدد مشہور افراد بلکہ خاندان دائرۂ سلفیت میں داخل ہوئے۔

مولانا اقبال حسین کی زبان کو اللہ نے بڑی توانائی اور تاثیر بخشی تھی۔ ان کی کوشش سے کئی مقامات میں گائے کی قربانی کا سلسلہ جاری ہوا۔ بہت سے لوگوں نے سودی کاروبار سے توبہ کی۔ ان کا حلقہ ارادت کافی

Marfat.com

پھیلا ہوا تھا اور جہاں جاتے جوش وجذبے سے وعظ کہتے اور پوری وضاحت سے توحید کی تبلیغ فرماتے۔

وہ تہجد گزار اور صالح عالم دین تھے۔نماز اشراق باقاعدگی سے ادا کرتے۔سنن ونوافل کے پابند تھے۔

ایک مدت سے بیماری کی گرفت میں تھے۔عشاء کی آخری نماز پڑھ کر بقائمی ہوش وحواس ۱۴۔فروری ۱۹۸۶ء (مطابق ۴۔ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۶ھ، کو آل اولاد کی موجودگی میں گیارہ بجے جمعرات کو بمقام ریواں وفات پائی۔انا للہ وانا الیہ راجعون

دوسرے دن جمعۃ المبارک کو ان کی نماز جنازہ پڑھی گئی جس میں لاتعداد لوگ شریک ہوئے۔

اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ

اب ملاحظہ ہو قطعہ تاریخ وفات ......

بابائے محترم جب رخصت ہوئے جہاں سے
غم گیں ہوگئے ہم اور چھا گئی اداسی
تاریخ وصل ہم کو بھولے گی اب نہ ہرگز
چودہ تھی فروری سن انیس سو چھیاسی

(تذکرۃ السیدین صفحہ ۱۴۱ تا ۱۶۰)

❀❀❀❀

Marfat.com

شیخ عبدالرشید صدیقی

(وفات ۶۔جون ۱۹۸۶ء)

۱۹۴۹ء کے اگست میں مولانا محمد حنیف ندوی کے زیرِ ادارت ہفت روزہ ''الاعتصام'' جاری ہوا۔ میں اس وقت مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کا آفس سیکرٹری تھا۔ اخبار کے چند شمارے چھپے تو حضرت الاستاذ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے فرمان کے مطابق میں نے اس میں پہلے اہلِ حدیث علمائے کرام کے بارے میں لکھنا شروع کیا۔ پھر بعض دیگر موضوعات پر بھی لکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا محمد حنیف ندوی کی طلب پر مجھے اخبار میں ان کا معاون یا خادم بنا کر بھیج دیا گیا۔ یہ فروری ۱۹۵۰ء کی بات ہے، اخبار اس زمانے میں گوجراں والا سے شائع ہوتا تھا۔ اس کے نگران حضرت الاستاذ مولانا محمد اسماعیل سلفی تھے لیکن وہ مضامین کی ترتیب واشاعت وغیرہ میں دخل نہیں دیتے تھے۔ میں دفتر ہی میں رہتا تھا۔ کبھی کبھی مولانا مرحوم کسی شہر یا قصبے کی مؤثر شخصیت کے نام رقعہ لکھ کر اخبار کی توسیع اشاعت کے لیے بھی مجھے بھیج دیا کرتے تھے۔ وہ میرے عالی قدر استاذ تھے اور میں ان سے کچھ سیکھنے کا خواہش مند تھا۔ وہ جو کچھ ارشاد فرماتے، میں اس پر عمل کرنے کے لیے تیار رہتا تھا بلکہ میری خواہش ہوتی تھی کہ وہ کچھ فرمائیں تو اس کی تعمیل کروں۔

مولانا محمد حنیف ندوی اخبار کے ایڈیٹر تھے، اس لیے میرا ان سے بہت قریبی رابطہ اور ہر وقت کا تعلق تھا۔ ان کی بھی ہر بات میرے لیے لائقِ تعمیل ہوتی تھی۔ اب میں تھک ہار کر گھر میں بیٹھا قلم گھسیٹ رہا ہوں تو گزشتہ دور کی ہمہ وقتی بھاگ دوڑ بہت یاد آتی ہے اور پیچھے کو گردن موڑ کر دیکھتا ہوں تو اس دور کی تمام سرگرمیاں مجسم شکل میں سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں۔

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ

۱۹۵۰ء کے جون کا مہینا تھا کہ ایک دن حضرت مولانا سلفی مرحوم نے فرمایا اگر تم ایک ہفتے کے لیے جنوبی پنجاب کے چند مقامات کا چکر لگا سکو تو امید ہے اخبار کی اشاعت کچھ بڑھ جائے گی۔ مولانا کا فرمان سن کر میں فوراً تیار ہوگیا۔ جوانی کا زمانہ بھی عجیب ہوتا ہے۔ گرمی اور سردی دونوں موسم ایک ہی نسل کے معلوم ہوتے تھے۔ اسی طرح دن اور رات کے نسب نامے میں بھی کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔

گوجراں والا سے چل کر میرا پہلا پڑاؤ اوکاڑہ تھا۔ وہاں اپنے دیرینہ دوست مولانا معین الدین لکھوی

Marfat.com

سے ملا۔ شہر سے چند خریدار بھی بنائے گئے اور جامعہ محمدیہ کے جلد ساز محمد یعقوب مرحوم نے اخبار کی ایجنسی بھی لے لی۔ پھر منٹگمری (ساہی وال) میاں چنوں، بورے والا اور خانیوال سے ہوتا ہوا پانچویں روز ملتان پہنچا۔ وہاں مجھے شیخ عبدالرشید صدیقی مرحوم کے پاس جانا تھا۔ میں چوں کہ مرکزی جمعیت کا آفس سیکرٹری تھا اور الاعتصام میں ہر ہفتے اپنے نام کے ساتھ مضمون بھی لکھتا تھا، اس لیے جماعت کے حلقوں میں کچھ غائبانہ جان پہچان ہوگئی تھی۔ میاں چنوں، بورے والا، ساہی وال، خانیوال اور ملتان وغیرہ شہروں میں فرید کوٹ اور فیروز پور کے مہاجرین خاصی تعداد میں آباد ہوگئے تھے اور ان میں سے کافی لوگ پہلے سے مجھے جانتے تھے، اس لیے کہیں بھی کسی قسم کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔

ملتان میں گھنٹا گھر کے اردگرد مجھے اپنے آبائی وطن کوٹ کپورہ کے کئی لوگ ملے، بعض فٹ پاتھ پر بیٹھے کپڑا بیچ رہے تھے، بعض ریڑھیوں پر مختلف قسم کی چیزیں فروخت کر رہے تھے۔ تقسیم ملک سے ڈھائی، تین سال بعد ان سے ملاقات ہوئی تھی اور چہروں پر ابھی تک پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ مجھے دیکھتے اور ملتے ہی ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ان آنسوؤں میں خوشی بھی جھلک رہی تھی کہ ایک عرصے کے بعد ملاقات ہوئی تھی اور افسردگی بھی پائی جاتی تھی کہ ہم جو جدّی پشتی ایک ہی جگہ کے رہنے والے اور خوشی غمی کے سانجھی تھے، اب ایک دوسرے سے اس طرح بچھڑ گئے ہیں کہ کسی کو کسی کے متعلق کچھ معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔

بہرحال مجھے شیخ عبدالرشید صدیقی سے ملنا تھا اور وہ ''الاعتصام'' کے خریدار تھے، میں پوچھتا پچھاتا ان کے مکان پر پہنچ گیا۔ اپنا نام بتایا اور آمد کا مقصد بیان کیا تو بہت خوش ہوئے۔ احترام سے بٹھایا اور قیام پاکستان کے موضوع پر گفتگو شروع کی۔ مولانا سلفی مرحوم یا کسی اور بزرگ سے پتا چلا تھا کہ سیاسی اعتبار سے وہ مجلس احرار سے تعلق رکھتے اور قیام پاکستان سے تھوڑا عرصہ قبل مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے۔ اس زمانے میں مجھے برصغیر کی سیاست سے بہت دلچسپی تھی۔ لیکن اس سلسلے میں ان سے زیادہ باتیں نہیں ہوئیں۔

پورا قد، گداز جسم، گندمی رنگ میں سرخی کی جھلک، کچھ ابھری ہوئی ناک، روشن آنکھیں۔ چوڑے شانے بہت اچھی صحت۔ یہ تھے اس زمانے کے شیخ عبدالرشید صدیقی۔

عبدالرشید صدیقی ۵۔ فروری ۱۹۰۴ء کو ملتان میں پیدا ہوئے، والد کا نام شیخ غلام قادر صدیقی تھا جو کشیدہ کاری کے پیشے سے منسلک تھے اور صالح سرشت بزرگ تھے۔ صدیقی صاحب نے عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو انھیں گورنمنٹ سیکنڈری سکول میں داخل کرا دیا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں انھوں نے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اس وقت ملک میں تحریک خلافت جاری تھی اور لوگ اس سے بہت متاثر تھے۔ ان کے والد بھی اس کے سرگرم ورکر تھے

Marfat.com

اوران کے ماموں مولانا محمد فیض اللہ ملتانی بھی اس کے پُر جوش کارکنوں میں سے تھے، جن کا شمار مولانا سلطان محمود افغانی ثم ملتانی اور مولانا عبدالحق ملتانی کے تلامذہ میں ہوتا تھا، وہ محکمہ ریلوے کے شعبۂ نقشہ نویسی میں ملازم تھے۔ تحریک خلافت میں شمولیت کے بعد انھوں نے ملازمت چھوڑ دی تھی۔ ان کے بھانجے شیخ عبدالرشید نے بھی مڈل پاس کرنے کے بعد انگریزی سکول سے تعلیم حاصل کرنا ترک کر دیا تھا۔

مجلس خلافت سے وابستہ وکلانے وکالت چھوڑ دی تھی، طلباء نے انگریزی سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کرنا ترک کر دیا تھا اور انگریزی حکومت کے مختلف سرکاری محکموں کے بہت سے ملازموں نے ملازمتوں سے استعفے دے دیے تھے، یعنی انگریزوں سے مکمل طور پر عدم تعاون (نان کواپریشن) کا عمل جاری ہو گیا تھا۔ مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی بڑی تعداد میں اس تحریک میں شامل تھے۔ اس وقت ملتان کی مجلس خلافت کے صدر سید صدرالدین گیلانی تھے، لیکن بعد ازاں انھوں نے اس سے استعفا دے دیا تھا اور ان کی جگہ اس کے صدر مولانا عبدالتواب ملتانی مرحوم ومغفور کو بنا لیا گیا تھا۔ اس وقت پورے ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خلاف زبردست تحریک جاری تھی اور مسلمانوں اور ہندوؤں میں اس سلسلے میں اس قدر مضبوط اتحاد پایا جاتا تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد (جو جولائی ۱۹۱۴ء میں شروع اور اکتوبر ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی تھی) دسمبر ۱۹۱۹ء میں یکے بعد دیگرے ہندوستان کی چار بڑی سیاسی جماعتوں کے اجلاس بمقام امرتسر ایک ہی پنڈال میں منعقد ہوئے تھے۔ کانگرس کا اجلاس پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں اور آل انڈیا مسلم لیگ کا حکیم محمد اجمل خاں کی صدارت میں ہوا۔ اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر مولانا ثناء اللہ امرتسری تھے اور انھوں نے خطبہ استقبالیہ پڑھا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر اور ان کے بھائی مولانا شوکت علی جو چھندواڑہ جیل میں قید تھے، رہا ہو کر سیدھے امرتسر آئے تھے اور اسی پنڈال میں مولانا شوکت علی کی صدارت میں آل انڈیا مجلسِ خلافت کا اجلاس ہوا تھا۔ وہیں مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی کوشش سے جمعیت سے علمائے ہند کا قیام عمل میں آیا اور اسی پنڈال میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے زیر صدارت جمعیت علمائے ہند کا جلسہ عام منعقد ہوا۔ اس جلسے کی مجلس استقبالیہ کے صدر بھی مولانا ثناء اللہ امرتسری تھے اور انھوں نے تحریری خطبہ استقبالیہ ارشاد فرمایا تھا۔ یعنی اس وقت حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب کو دو کانفرنسوں کی صدارت استقبالیہ کا اعزاز حاصل ہوا، پہلے مسلم لیگ کا اور اس سے دو تین روز بعد جمعیت علمائے ہند کا۔ دونوں کانفرنسوں میں تحریری خطبات استقبالیہ پڑھنے کا شرف بھی ان کے حصے میں آیا۔

جمعیت علمائے ہند اس وقت پورے برصغیر کے حنفی، اہل حدیث اور شیعہ علماء کی نمائندہ جماعت تھی، اس کے اوّلیں اور اختتامی اجلاسِ عام کے استقبالیہ صدارت کا منصب بہت بڑا منصب تھا جس پر مولانا ثناء اللہ امرتسری کو

Marfat.com

متفقہ طور پر فائز کیا گیا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے اس عالم جلیل کو اس زندگی میں ہر موقعے پر بے حد احترام عطا فرمایا، علمائے دین کی مجالسِ بابرکت میں بھی اور سامعین کی محافل عوام میں بھی۔ ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء .

زیب عنوان شیخ عبدالرشید صدیقی کی عمر اس وقت پندرہ سولہ سال کی تھی اور وہ نوجوانی کی منزل میں داخل ہو چکے تھے۔ اپنے والدِ مکرم کے ساتھ وہ امرتسر کے ان اجلاسوں میں شامل تھے۔

افسوس ہے مجلسِ خلافت نے زیادہ عمر نہیں پائی۔ ۱۹۱۸ء میں اس کا آغاز ہوا اور ۱۹۲۲ء میں یہ انتہائی زوردار تحریک ختم ہوگئی۔ اگرچہ اس کے بعد بھی کچھ عرصہ زندہ رہی لیکن یہ زندگی برائے نام تھی......

اس قدر طاقت ور اور ملک گیر تحریک کا اختتام اتنی جلدی کیوں ہوا؟ اس سوال کا جواب سنیے! تحریک عدم تعاون میں مذکورہ بالا جماعتیں شامل تھیں اور ان جماعتوں کے بے شمار لوگوں کو انگریزوں نے گرفتار کر کے ملک کی مختلف جیلوں میں قید کر دیا تھا۔ قید ہونے والوں میں ایک شخص کا نام منشی رام تھا جو کانگرسی تھا اور ہندو مسلم اتحاد کا بہت بڑا حامی تھا۔ ۱۹۲۲ء میں وہ جیل میں تھا۔ ہندوستان کے اس وقت کے وائسرائے نے اسے خفیہ طور پر جیل سے بلوا کر اس سے گفتگو کی۔ کیا گفتگو کی؟ اس کی تفصیل کا آج تک پتا نہیں چل سکا۔ اس کے بعد بے شمار سیاسی لوگوں نے اردو اور انگریزی میں بے شمار کتابیں لکھیں، لیکن وائسرائے اور منشی رام کی باہمی گفتگو کا مفصل تذکرہ کسی نے نہیں کیا۔ بہرحال اس گفتگو کے بعد منشی رام کو جیل سے رہا کر دیا گیا اور اس نے رہا ہوتے ہی یوپی میں شدھی کی تحریک شروع کر دی یعنی مسلمانوں کو جبراً ہندو بنانا شروع کر دیا۔ بے شمار ہندو اس کے ساتھ ہو گئے اور ہندو مسلم فسادات ہونے لگے۔ منشی رام کے بجائے اس نے اپنا نام ''سوامی شردھانند'' رکھ لیا اور پھر وہ اسی نام سے مشہور ہوا۔ ۲۳۔ دسمبر ۱۹۲۶ء کو ایک ۳۵ سالہ شخص عبدالرشید نے دہلی میں اس کے گھر جا کر اسے پستول کی گولی کا نشانہ بنایا اور وہ اسی وقت مر گیا۔

شدھی کی تحریک سے ہندو مسلم اتحاد ختم ہو گیا اور حالات کا دھارا بالکل بدل گیا۔ اتفاق کی جگہ اختلاف نے، اتحاد کی جگہ انتشار نے اور امن کی جگہ ہندو مسلم فسادات نے لے لی۔

اس کے بعد ۲۹۔ دسمبر ۱۹۲۹ء (۸۔ شعبان ۱۳۴۶ھ) کو مجلس احرار اسلام کا قیام عمل میں آیا۔ تو شیخ عبدالرشید صدیقی اس میں شامل ہو گئے۔ وہ ملتان شہر اور اس کے نواح میں مجلس احرار کے سرگرم رکن تھے۔ تمام احرار رہنماؤں سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ مولانا داؤد غزنوی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، شیخ حسام الدین، مولانا اسماعیل غزنوی اور دیگر بہت سے رہنما شیخ عبدالرشید صدیقی اور ان کے رفقائے کار کی کوشش سے کئی مرتبہ ملتان گئے اور انھوں نے انگریزی حکومت کے خلاف عام جلسوں میں تقریریں کیں۔ شیخ عبدالرشید صدیقی خود بھی مقرر تھے اور موثر تقریر کرتے تھے۔

Marfat.com

شیخ عبدالرشید صدیقی معروف معنوں میں عالم دین نہ تھے،لیکن انھوں نے چند درسی کتابیں مولانا عبدالحق ملتانی، مولانا عبدالتواب ملتانی، اپنے ماموں مولانا محمد فیض اللہ ملتانی اور بعض دیگر حضرات سے پڑھ لی تھیں۔ قرآن مجید کا ترجمہ بھی پڑھ لیا تھا۔ عام مطالعہ وسیع تھا۔ ملتان شہر اور ضلع ملتان کی جماعت اہل حدیث کے مخلص ترین رہنما تھے اور جماعتی سلسلے میں جہاں جاتے قرآن وحدیث کی روشنی میں بہت اچھے انداز میں تقریر کرتے۔

۲۴۔ جولائی ۱۹۴۸ء کو لاہور میں بصدارت مولانا سید محمد داؤد غزنوی مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو شیخ عبدالرشید صدیقی اس اجلاس میں شامل تھے۔ ابتدا ہی میں انھیں جمعیت کی مجلس عاملہ کا رکن بنا لیا گیا تھا اور پھر وہ ہمیشہ اس منصب پر قائم رہے۔ ملتان اور اس طرف کی جماعت کے سلسلے میں کوئی معاملہ پیش آتا تو مولانا غزنوی اور مولانا محمد اسماعیل سلفی ان سے مشورہ فرماتے اور ان کی رائے کو خاص اہمیت دی جاتی۔ میں کئی سال مرکزی جمعیت کا آفس سیکرٹری رہا اور جماعت وجمعیت کے ترجمان ہفت روزہ ''الاعتصام'' کی ادارتی خدمت بھی پندرہ سال انجام دیتا رہا۔ اس تمام عرصے میں شیخ عبدالرشید صدیقی کے مجھ سے مشفقانہ تعلقات رہے۔ ان کی زبان میں بڑی نرمی اور حلاوت تھی۔ بعض دفعہ وہ اس قدر شفقت سے پیش آتے کہ مجھے شرم آنے لگتی۔

۱۹۵۵ء کے پہلے ہفتے میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کی دوسری کانفرنس بصدارت مولانا محمد علی قصوری ایم اے کینٹب ملتان میں ہوئی۔ اس کے صدر استقبالیہ مولانا محمد اسحاق چیمہ تھے۔ میں اس وقت مرکزی جمعیت کا آفس سیکرٹری بھی تھا اور ''الاعتصام'' کا ایڈیٹر بھی۔ کانفرنس کے کسی معاملے میں شیخ عبدالرشید صدیقی سے رابطہ ہوتا تو وہ معاملے کی پوری تفصیل بڑے تحمل کے ساتھ بیان کرتے۔

انھیں علمائے کرام سے بہت محبت تھی اور ان کا نہایت احترام سے تذکرہ کرتے تھے، بالخصوص ملتان اور ضلع ملتان کے علماء کے بارے میں وہ بہت معلومات رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ اپنے علاقے کے سات آٹھ علمائے کرام کے تذکار ''الاعتصام'' میں شائع کرنے کے لیے مجھے دے گئے۔ ان کی اشاعت میں کچھ تاخیر ہوگئی اور پھر حالات ایسے پیدا ہوئے کہ میں الاعتصام کی ادارت سے مستعفی ہوگیا اور ادارہ ثقافت اسلامیہ میں بہ طور ریسرچ فیلو میری تقرری ہوگئی۔ ایک روز آٹھ بجے کے قریب دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ شیخ عبدالرشید صدیقی تشریف لے آئے۔ انھیں ناشتہ کرایا اور تشریف لانے کی وجہ پوچھی۔ فرمایا: میرے مضمون تم نے الاعتصام میں شائع نہیں کیے۔ یہ سن کر بڑی ندامت ہوئی۔ میں اسی وقت کاغذات دیکھنے لگا تو وہ سامنے پڑے تھے۔ میں نے نہایت ادب کے ساتھ ان کی خدمت میں پیش کیے اور شائع نہ ہونے پر معذرت کی۔ اس سے کچھ عرصہ بعد وہ الاعتصام میں شائع ہوگئے تھے۔

Marfat.com

ایک مرتبہ تشریف لائے اور فرمایا: ایک نہایت ضروری کام کے سلسلے میں آیا ہوں۔ عرض کیا، ارشاد فرمایئے، اگر میرے بس میں ہوا تو ضرور تعمیلِ ارشاد ہوگی۔ کام یہ بتایا کہ میرا بیٹا انجینئر ہے۔ اس کے لیے رشتہ درکار ہے۔ فلاں صاحب جو تمھارے دوست ہیں، مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان کی بیٹی تعلیم یافتہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس گھر میں میرے بیٹے کا رشتہ ہو جائے۔

اس سے چند روز قبل اس لڑکی کی نسبت ایک جگہ ہوگئی تھی۔ اس کی تفصیل میں نے عرض کی تو کہا: ممکن ہے وہاں فیصلہ کن بات نہ ہوئی ہو، مجھے معلوم تھا کہ فیصلہ ہوگیا ہے، تاہم میں نے اپنے مہربان دوست سے بات کی تو انھوں نے مسکرا کر فرمایا، تمھیں ساری بات کا پتا ہے۔ صدیقی صاحب کو یہیں لے آتے، میں خود انھیں سب کچھ بتا دیتا۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ صدیقی صاحب بعض اوقات اس فقیر کو اپنے خاص گھریلو سلسلے میں بھی تعاون کا حکم دیتے اور اس قابل سمجھتے تھے کہ شاید میں ان کے اعتماد پر پورا اتر سکوں۔

وفات سے چند سال پیشتر شیخ عبدالرشید صدیقی کئی قسم کی بیماریوں کی گرفت میں آگئے تھے۔ ان میں ایک بڑی بیماری بواسیر کی تھی۔ وہ بیماریوں کا مقابلہ کرتے کرتے بہت کمزور ہوگئے تھے اور بالآخر ۶۔ جون ۱۹۸۶ء کو (عیدالفطر ۱۴۰۶ھ) کو دوپہر کے وقت اللہ کی بارگاہ میں پہنچ گئے۔ ان کی وصیت کے مطابق عیدگاہ اہلِ حدیث باغ عام خاص (ملتان) میں اسی دن بعد نماز مغرب ان کی نماز جنازہ پڑھی گئی۔ نمازِ جنازہ مولانا علی محمد سعیدی (مرحوم ومغفور) نے پڑھائی۔ اللھم اکرم نزلہ ووسع مدخلہ وادخلہ جنت الفردوس۔

ان کی اولاد نرینہ صرف ایک بیٹا تھا، جس کا نام شیخ عبدالقدوس صدیقی تھا۔ وہ انجینئر تھے۔ کچھ عرصہ سعودی عرب رہے۔ پھر لاہور آگئے تھے۔ اس کے بعد نہ خود ان کے متعلق کچھ معلومات حاصل ہوئیں اور نہ ان کی آل اولاد کا پتا چلا۔ اندازہ یہ ہے کہ شیخ عبدالرشید صدیقی کی وفات کے بعد ان کے اخلاف میں کسی شخص کو جماعتی اور مسلکی معاملات میں ان کی طرح دلچسپی نہیں تھی۔

شیخ عبدالرشید صدیقی مرحوم کی زندگی کا خاصا عرصہ مجلس احرار سے وابستگی میں گزرا تھا اور احرار رہنماؤں سے ان کے گہرے مراسم بھی تھے، اس لیے ان کی وفات کے بعد نواب زادہ نصراللہ خاں (جن کا شمار چوٹی کے احرار رہنماؤں میں ہوتا تھا) ملتان گئے تو لیڈروں کی رسم کے مطابق انھوں نے ان کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھائی اور دعائے مغفرت کی...... نواب زادہ صاحب نے بھی آج سے تقریباً گیارہ سال قبل ۲۷۔ ستمبر ۲۰۰۳ء کو وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان دونوں مرحومین کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

(یہ سطور ۲۸۔ جون ۲۰۱۴ء کو لکھی گئیں)

Marfat.com

مولانا چراغ دین نور پوری

(وفات ۲۷۔اگست ۱۹۸۸ء)

ضلع گوجراں والا میں حافظ آباد روڈ پر ایک گاؤں کا نام نور پور چہل ہے جو قلعہ دیدار سنگھ سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہاں نور شاہ نام کا ایک شخص رہتا تھا اور لوگوں میں اس کی شہرت ایک ''پیر'' کی سی تھی، اسی کے نام پر گاؤں کو''نور پور'' کہا جانے لگا۔اس نواح میں نور پور نام کے اور گاؤں بھی ہیں، لیکن ان میں امتیاز کے لیے اسے''نور پور چہل'' کہا جاتا ہے۔نور شاہ کا کچھ پتا نہیں کہ کہاں سے آیا تھا اور کون تھا۔وہ یہاں آیا اور فقیرانہ بھیس میں رہنے لگا۔ کچھ لوگ اس سے عقیدت کا اظہار کرنے لگے اور اس کے دم درود کا سلسلہ شروع ہوگیا۔اس کی وفات کے بعد اس کے عقیدت مندوں نے گاؤں کے وسط میں اسے دفن کردیا اور اس کی قبر پر ہر سال عرس ہونے لگا۔لیکن اب وہاں نہ قبر کا کوئی نشان ہے اور نہ عرس اور میلہ وغیرہ ہوتا ہے۔

زیب عنوان بزرگ مولانا چراغ دین اسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔سکول میں انھوں نے پرائمری تک تعلیم حاصل کی تھی اور دینیات میں مختلف حضرات سے مستفید ہوئے۔اس وقت قلعہ دیدار سنگھ میں مولانا معراج دین کے علم وعمل کا بڑا شہرہ تھا۔وہ اپنی دکان پر لوگوں کو لکڑی (فرنیچر وغیرہ) کا کام بھی سکھاتے تھے اور ان کی علمی اور دینی تربیت بھی کرتے تھے۔ چراغ دین کے والد کام سکھانے کے لیے بیٹے کو مولانا معراج دین کے پاس لائے اور کہا اسے کام سکھانا ہے، وہابی نہیں بنانا۔انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا: میں تو اسے کام ہی سکھاؤں گا، لیکن کام سیکھتے سیکھتے یہ وہابی بن گیا تو اس کی قسمت۔

چراغ دین کو دینیات کی تعلیم کا بہت شوق تھا۔ناظرہ قرآن مجید سے لے کر ترجمہ قرآن اور کتب دینیہ انھوں نے مولانا معراج دین سے پڑھیں، علاوہ ازیں وہ علمائے احناف سے بعض مسائل سے بذریعہ خط کتابت بحث مباحثے کا سلسلہ بھی جاری رکھتے تھے۔ان علما میں قاضی شمس الدین (گوجراں والا)، مولانا سرفراز صفدر (گکھڑ منڈی) اور مولانا محمد امین اوکاڑی شامل ہیں۔اس قسم کی خط کتابت کا خاصہ ذخیرہ ان کے پاس موجود تھا، افسوس ہے ان کے اخلاف اسے محفوظ نہ رکھ سکے۔

مولانا چراغ دین کے نزدیک بچوں کو دینیات سے آشنا کرنا اور ان کے دل میں اسلامی احکام کو راسخ

Marfat.com

کرنا نہایت ضروری تھا۔ حضرت حافظ عبدالمنان نور پوری اپنی خودنوشت میں فرماتے ہیں:

''مولانا چراغ دین رحمۃ اللہ علیہ کو مساجد، دینی مدارس، مراکز کی تعمیر، بیوی بچوں کو دینی تعلیم وتربیت، دین کی تبلیغ وترویج، صحیح اسلامی عقائد واعمال کی تطبیق وتنفیذ، سنت پر عمل کرانے اور بچوں کو ترغیب دلا کر ان کے والدین سے اجازت لے کر دینی مدارس بالخصوص جامعہ محمدیہ گوجراں والا میں داخل کرانے، بعدازاں ان کی نگرانی اور دیکھ بھال کرنے کا بہت شوق تھا۔''

حافظ عبدالمنان نور پوری مرحوم ومغفور کے بقول مولانا چراغ دین نے ان کی بہت علمی تربیت کی، انھیں وہ مسجد میں بٹھالیتے اور نہایت نرم اور موثر لہجے میں انھیں وعظ ونصیحت کرتے، دینی علوم کی اہمیت بیان فرماتے اور اعمال خیر کی بجا آوری کا درس دیتے۔

حافظ صاحب مزید فرماتے ہیں: ''[مولانا چراغ دین نے میری] تعلیم وتربیت پر اتنی توجہ دی کہ اتنی توجہ میرے والد صاحب بھی نہیں دے سکتے۔'' ❶

مولانا چراغ دین کے ایک چچا کا نام عبداللہ تھا، جس نے پیروں کی سی وضع قطع بنا رکھی تھی۔ گاؤں میں تو اس کا بہ طور پیر کوئی تعارف نہ تھا، البتہ گاؤں سے باہر بعض مقامات میں اس کے مرید خاص تعداد میں تھے۔ وہ فوت ہوا تو اس کے مریدوں نے اس کی قبر قبرستان سے باہر بنانے کی کوشش کی اور اردگرد کے کافی لوگ اکٹھے ہوگئے جو اسے قبرستان سے باہر دفن کرنا چاہتے تھے، ان کا ارادہ دراصل اس کا مستقل مزار بنانے اور اس پر پھر عرس وغیرہ کا سلسلہ شروع کرنے کا تھا، لیکن مولوی چراغ دین نے کہا یہ میرا چچا ہے، میں اس کا بھتیجا ہوں، میں ہرگز اس کو قبرستان سے باہر دفن نہیں ہونے دوں گا۔ اسے مسلمانوں کے قبرستان ہی میں دفن کیا جائے گا۔ مولوی چراغ دین کے اس قطعی فیصلے پر اس کے مرید پیچھے ہٹ گئے اور اسے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

اس سے کچھ عرصہ بعد اس کے مریدوں کو پھر جوش آیا اور اپنے پیر کی لاش قبر سے نکال کر الگ دفن کرنے کا عزم کیا، اب کسی نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور مرید اپنے پیر صاحب کی قبر اکھاڑنے لگے۔ جب قبر کے پھٹے اکھاڑنے کا وقت آیا تو اس کے لیے کوئی شخص آگے نہ بڑھا، بالآخر ایک مرید نے ہمت کر کے قبر کا پھٹا اکھاڑا تو اتنی بدبو آئی کہ دور تک پھیل گئی اور سب لوگ بھاگ گئے۔ کئی گھنٹوں کے بعد پیر صاحب کے مرید پھر اکٹھے ہوئے اور لاش کو قبر سے نکال لیا، لیکن لاش بالکل گل سڑ چکی تھی۔ اسی حالت میں اسے دوسری جگہ دفنا دیا گیا۔

جب قبر اکھاڑ کر پیر صاحب کی لاش نکالی گئی اس سے کچھ عرصہ پہلے مولوی چراغ دین نور پور کی سکونت

---

❶ سیرت وسوانح حافظ عبدالمنان نور پوری رحمہ اللہ ص ۱۰۱

Marfat.com

ترک کر کے قلعہ دیدار سنگھ چلے گئے تھے، انھیں واقعہ کا پتا چلا تو فرمایا: اگر میں وہاں ہوتا تو لاش نہ نکالنے دیتا۔

حافظ عبدالمنان نور پوری فرماتے ہیں:

''اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔ مولانا چراغ صاحب وہاں موجود نہیں تھے، مریدوں نے قبر اکھاڑلی اور اس کی حالت دیکھ لی، عبرت حاصل کرنے والوں نے اس [پیر] کے انجام کو دیکھ کر توبہ کر لی۔'' ❶

مولوی چراغ دین کتاب وسنت کے جرأت مند اور مخلص تریں مبلغ تھے۔ ایک مرتبہ نور پور میں بریلوی حضرات نے جلسہ منعقد کیا، جس میں ایک مقرر نے اہل حدیث کے خلاف کافی کچھ کہا۔ ادھر مولوی چراغ دین نے ایک اہل حدیث عالم کو ان صاحب کی باتوں کا جواب دینے کے لیے تیار کر رکھا تھا۔ چنانچہ بریلوی حضرات کے مقرر کی تقریر ختم ہوتے ہی اہل حدیث عالم نے تقریر شروع کر دی اور معترض کے اعتراضات کے جواب دیے۔ صبح ہوئی اور بریلوی مقرر وہاں سے رخصت ہوئے تو گاؤں کے چودھری نے ان کو روک لیا اور کہا: ہم نے رات دونوں مقرروں کی تقریریں سنی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ دونوں آمنے سامنے مسجد میں بیٹھ جائیں، سامعین بھی وہیں بیٹھ جائیں گے۔ ہم آپ حضرات کی بالمشافہ گفتگو سننا چاہتے ہیں تا کہ معلوم ہو سکے کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ لیکن اس پر نہ بریلویت سے تعلق رکھنے والے لوگ تیار ہوئے اور نہ ان کے مقرر۔ اس کے بعد وہ مقرر کبھی نور پور نہیں آئے۔

مولوی چراغ دین لوگوں کے رفاہی کام بھی بہت کرتے تھے۔ ایوب خاں کے زمانۂ حکومت میں وہ بی ڈی ممبر منتخب ہوئے۔ ان کے حلقے میں نور پور، پھلوکی اور جیونا تین گاؤں شامل تھے۔ مولوی صاحب ممدوح نے ان تینوں مواضع میں لوگوں کے بڑے رفاہی کام کیے۔ جہاں وہ قرآن وحدیث کے جرأت مند مبلغ تھے، وہاں لوگوں کے مخلص تریں خادم بھی تھے۔ جس شخص کا تھانے کچہری میں کوئی جائز کام ہوتا، اس کی مدد کے لیے وہ ہر وقت تیار رہتے تھے۔

مولانا چراغ دین کو ذہین بچوں کی تلاش رہتی تھی جنھیں وہ دینیات کی تعلیم دلانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان بچوں میں ایک بچے کا نام خوشی محمد تھا اور اس کے والد کا نام تھا عبدالحق۔ اس بچے نے اپنے گاؤں نور پور میں صرف پرائمری تک تعلیم حاصل کی۔ اس کی ذہانت اور شوقِ تحصیلِ علم سے مولوی چراغ دین آگاہ تھے۔ اس کے والد عبدالحق سے مولوی چراغ دین نے کہا کہ یہ بچہ مجھے دے دو۔ انھوں نے کہا: آپ نے اس کا کیا کرنا ہے؟ فرمایا: میں اسے دینیات کی تعلیم دلانا چاہتا ہوں۔ عبدالحق کی زندگی غربت کی حالت میں گزر رہی تھی۔

❶ سیرت وسوانح حافظ عبدالمنان نور پوری ص ۱۰۲

Marfat.com

انھوں نے کہا: ہمارے گھر میں پانی کا نلکا نہیں ہے۔ خوشی محمد کہیں سے پانی لاتا ہے تو ہم اسے پیتے اور ہانڈی روٹی پکاتے ہیں۔ اب مولوی چراغ دین گوجراں والا گئے اور وہاں سے نلکا خرید کر عبدالحق کے گھر لگا دیا اور اس کے بدلے میں خوشی محمد کو پکڑا اور گوجراں والا جا کر حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کی خدمت میں پیش کیا اور دینیات کی تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔

یہی وہ خوشی محمد ہے جس نے حافظ عبدالمنان نور پوری کے نام سے شہرت پائی اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد خود مسند درس پچھائی اور بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ تحریری صورت میں بھی اور خطابتی صورت میں بھی انھوں نے بے حد خدمات سرانجام دیں۔

اس عالم جلیل اور معلم شہیر نے ۲۶ فروری ۲۰۱۲ء کو وفات پائی۔ بے شمار علما و صلحا نے ان کے جنازے میں شرکت کی۔ یہ فقیر بھی ان کے جنازے میں شریک تھا۔

مولوی چراغ دین کو حافظ عبدالمنان نور پوری سے اس درجہ دلی تعلق تھا کہ وہ کہا کرتے تھے میرے دو بیٹے ہیں، بڑا عبدالمنان اور چھوٹا عصمت اللہ۔

حافظ صاحب حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کے تدریسی ادارے جامعہ محمدیہ کا نصاب مکمل کر چکے تو مولوی چراغ دین نے ایک خوب صورت دستار اور شیروانی کے لیے کپڑا مولانا محمد اسماعیل سلفی کی خدمت میں پیش کیا، لیکن مولانا نے یہ کہہ کر یہ دونوں چیزیں لینے سے انکار کر دیا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں، کسی مستحق کو دے دیں۔

پھر مولوی صاحب نے مولانا سلفی سے کہا کہ میری خواہش ہے آپ عبدالمنان کو مزید کتابیں پڑھائیں۔ مولانا نے فرمایا: یہ ہمارے مدرسے سے فارغ ہو گیا ہے آپ مزید تعلیم کے لیے اسے حافظ محمد گوندلوی کے پاس لے جائیں، چنانچہ انھوں نے حضرت حافظ گوندلوی رحمہ اللہ کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر ان سے خوب استفادہ کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ مولوی چراغ دین نے حافظ عبدالمنان صاحب کے تمام معاملات میں ان سے تعاون کیا۔ انھوں نے گوجراں والا کی سرفراز کالونی میں مکان بنانا شروع کیا تو اس کی تعمیر میں بھی انھوں نے نگرانی کی۔

ایک دفعہ انھوں نے مولانا عارف جاوید محمدی سے کہا کہ مکان کی تعمیر کے سلسلے میں حافظ صاحب کچھ مقروض ہو گئے ہیں۔ آپ ان کی مدد کریں۔ چنانچہ عارف صاحب نے اس کا ذکر شیخ طارق العیسیٰ (کویت) سے کیا، انھوں نے مطلوبہ رقم عارف صاحب کو دے دی۔ عارف صاحب نے یہ رقم حاجی عبدالحق ناگی اور مولوی چراغ دین کے مشترکہ اکاؤنٹ میں جمع کرا دی۔ ان دونوں بزرگوں نے رقم حافظ صاحب کی خدمت

Marfat.com

میں پیش کی۔ حافظ صاحب وہ رقم لے کر اس شخص کے پاس گئے جس سے قرض لیا گیا تھا۔ اس نے رقم یہ کہہ کر لینے سے انکار کردیا کہ میں نے رقم بہ طور قرض نہیں بطور ہدیہ دی تھی، رقم دیتے وقت میں نے اسے ہدیہ اس لیے نہیں کہا تھا کہ آپ اسے قبول نہیں کریں گے۔ اب وہ رقم حافظ صاحب نے حاجی عبدالحق ناگی اور مولوی چراغ دین کو یہ کہہ کر واپس کردی کہ میرا مسئلہ حل ہوگیا ہے، مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ پھر یہ رقم مولانا عارف جاوید محمدی کو دے دی گئی اور انھوں نے شیخ طارق العیسٰی کو سارا واقعہ بیان کیا تو ان کے کہنے پر اسے دیگر مستحقین میں تقسیم کردیا گیا۔ یہ تھی حافظ عبدالمنان نور پوری رحمۃ اللہ علیہ کے بلندیٔ کردار کی ایک جھلک۔ وہ عالی مرتبت شخصیت تھے۔ اس قسم کے لوگ اب کہاں پیدا ہوں گے۔ وہ بے مثال عالم دین تھے رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

حافظ عبدالمنان نور پوری کے علاوہ مولانا بشیر الرحمٰن نور پوری، مولانا عبدالسلام اور مولانا منظور احمد رسول نگری کو دینیات کی تعلیم سے مزین کرنے کا بنیادی ذریعہ بھی مولوی چراغ دین تھے۔

مولوی صاحب ممدوح جن بچوں کو دینی مدارس میں داخل کراتے تھے، ان کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھتے تھے۔ ان کے وارث اگر مالی اعتبار سے کم زور ہوتے تو ان کی مالی مدد کرتے تھے۔۔۔ طلبا سے ان کی ہم دردی کا یہ عالم تھا کہ سردیوں میں وہ خشک میوے انھیں دیا کرتے تھے۔

مولوی صاحب کو جماعت اہل حدیث کی مسجدیں تعمیر کرانے کا بہت شوق تھا۔ انھوں نے قلعہ دیدار سنگھ اور اگو چک کے درمیان ایک مسجد کی تعمیر شروع کی اور مسجد مکمل ہوگئی، لیکن جس شخص سے زمین لی تھی۔ وہ احناف کے دیوبندی حلقے سے تعلق رکھتا تھا اور ان لوگوں نے مل کر مسجد پر قبضہ کرلیا۔

اس کے بعد انھوں نے جماعت اہل حدیث کے ارکان کے مشورے سے قلعہ دیدار سنگھ میں خاصی جگہ خریدی اور مسجد کی تعمیر کا منصوبہ بنایا۔ ۱۹۸۰ء میں مولانا عارف جاوید محمدی کویت کو روانہ ہوئے تو مولوی صاحب نے ان سے فرمایا کہ وہاں ہمارے مدرسے کو یاد رکھنا۔

۱۹۸۱ء میں کویت میں جمعیت احیاء التراث الاسلامی کا قیام عمل میں آیا تو شیخ طارق العیسٰی نے عارف صاحب سے کہا کہ ہم پاکستان میں مساجد تعمیر کرانا چاہتے ہیں۔ اس کا کوئی معقول انتظام ہونا چاہیے۔ عارف صاحب نے مولانا چراغ دین سے رابطہ کیا اور پھر شیخ ممدوح اور مولانا چراغ دین کے مشورے سے ''لجنۃ المساجد گوجراں والا'' کے نام سے ایک کمیٹی بنائی گئی، جس کے صدر حاجی عبدالحق ناگی اور ناظم مولانا چراغ دین مقرر کیے گئے۔ اس کے دیگر ارکان تھے۔ حافظ عبدالمنان نور پوری، حاجی عبدالرشید ناگی اور شیخ خالد مسعود بھنڈاری۔ حاجی عبدالحق اور مولانا چراغ دین کے نام سے اکاؤنٹ کھولا گیا اور تحصیل وزیر آباد کے گاؤں

Marfat.com

موضع ساروکی میں مسلک اہل حدیث کی پہلی مسجد تعمیر ہوئی۔

اس کے بعد مولانا چراغ دین کی کوشش سے منصوروالی، رسول نگر اور علی پور چٹھہ وغیرہ کئی مقامات میں اہل حدیث کی مساجد تعمیر کی گئیں اور یہ ان مقامات میں اہل حدیث کی اوّلیں مساجد تھیں پھر یہ سلسلہ مولانا موصوف کی نگرانی میں سکھر، مظفر گڑھ اور دیگر دور دراز شہروں تک پھیلا۔ وہاں مولانا رقوم لے کر بسوں پر جاتے اور تعمیر مساجد کی نگرانی کا فریضہ ادا کرتے۔ چوں کہ وہ خود کاری گر تھے، اس لیے معمار کے کام کو اچھی طرح دیکھتے۔

وہ علم وعمل کے پیکر تھے۔ تہجد گزار اور قائم اللیل۔ جمعرات اور سوموار کو بالالتزام روزہ رکھتے۔ خوش مزاج اور ملنسار۔ سادہ لباس اور سر پر قراقلی ٹوپی۔

مسجدوں کی تعمیر کے زمانے میں شیخ طارق العیسیٰ کئی مرتبہ پاکستان آئے اور مولانا چراغ دین کی پرخلوص کارکردگی سے نہایت متاثر ہوئے۔ ایک مرتبہ انھوں نے مولانا عارف جاوید محمدی سے پوچھا کہ آپ مولانا کو نگرانی کی تنخواہ دیتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا وہ تنخواہ نہیں لیتے۔ شیخ موصوف نے کہا انھیں ضرور تنخواہ دینی چاہیے اور تنخواہ مقرر بھی کر دی گئی لیکن وہ اس تنخواہ میں سے کچھ رقم خالد مسعود بھنڈاری کو (جو اکاؤنٹنٹ بھی تھے اور مولانا کے شاگرد بھی تھے) یہ کہہ کر واپس کر دیتے کہ یہ میرے خرچ سے زیادہ ہے، اسے تعمیر مساجد کے حساب میں جمع کرلو۔

خالد مسعود بھنڈاری بہت اچھے آدمی تھے۔ وہ مولانا چراغ دین کے شاگرد تھے۔ استاذِ مکرم کی وفات کے بعد انھوں نے تعمیر مساجد کے کام کو نہایت محنت اور دیانت داری سے آگے بڑھایا۔

مولانا چراغ دین نے قلعہ دیدار سنگھ میں مدرسہ رحمانیہ کے نام سے تدریسی ادارہ بھی قائم کیا تھا، جس کے شیخ الحدیث مولانا محمد یحییٰ گوندلوی مرحوم کو بنایا گیا تھا لیکن مالی کمزوری کی وجہ سے اسے بند کرنا پڑا، البتہ حفظ قرآن کا مدرسہ جاری ہے۔ جس میں بچے بھی قرآن حفظ کرتے ہیں اور بچیاں بھی۔ اسے مولانا چراغ دین کے لیے صدقہ جاریہ سے تعبیر کرنا چاہیے۔

مولانا چراغ دین مسلک اہل حدیث کے بہت بڑے خادم تھے اور اس مسلک کی ترویج کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ انھوں نے نور پور میں اہل حدیث کے ہر گھر میں مٹی کا ایک ایک برتن رکھ دیا تھا اور عورتوں سے درخواست کی تھی کہ آٹا گوندھتے وقت وہ آٹے کی ایک مٹھ اس میں ڈال دیا کریں۔ پھر کچھ دنوں کے بعد مولانا موصوف کی نگرانی میں وہ آٹا اکھٹا کر کے فروخت کر دیا جاتا تھا اور فروخت شدہ آٹے سے حاصل شدہ رقم مسجد کی تعمیر کے لیے بیت المال میں جمع کرادی جاتی تھی۔ یہ غالباً ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ کی بات ہے۔ اس طرح

Marfat.com

کی مختلف صورتوں سے اچھی خاصی رقم جمع ہوگئی تھی، جس سے شان دار مسجد تعمیر ہوئی۔

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتایا گیا مولانا چراغ دین کی کوشش سے گاؤں کے متعدد بچوں نے دینی تعلیم حاصل کی اور پھر انھوں نے دین کے جلیل القدر مبلغ اور مدرس کے طور پر شہرت پائی۔ احناف کے بعض بچے بھی ان کی کوشش سے دینیات کی تعلیم سے بہرہ ور ہوئے۔

نور پور کے زمانۂ قیام میں مولانا موصوف اس نواح کے ایک گاؤں قلعہ چند سنگھ میں بائیسکل پر جمعہ پڑھانے جایا کرتے تھے۔ چار سال یہ سلسلہ جاری رہا۔ وہ جمعہ پڑھا کر واپس آجاتے، نہ کسی سے کوئی پیسا لیتے اور نہ کسی کے گھر سے کھانا کھاتے۔ یہ سلسلہ فی سبیل اللہ چلتا تھا۔ چار سال کے بعد وہاں جمعہ پڑھانے کی ذمے داری اپنے ایک شاگرد عبدالغفور کے سپرد کردی اور خود قلعہ دیدار سنگھ میں سکونت پذیر ہوگئے جہاں مسجد مبارک کے نام سے خوب صورت مسجد تعمیر کرائی۔ اسی مسجد میں ایک تبلیغی جلسے کا انعقاد کیا، جس میں ان چار علماء سے تقریریں کرائی گئیں جو پہلے دیوبندی حنفی تھے، بعد میں مسلک اہل حدیث سے وابستہ ہوئے تھے، وہ تھے مولانا عبدالرحمٰن (فیصل آباد)، مولانا اللہ بخش (ملتان)، قاری عبدالحفیظ (فیصل آباد) اور قاضی عصمت اللہ دیوبندی کے شاگرد مولانا حسن محمد (ساکن نوکھر)۔ اس نواح کے دیوبندی حضرات اس جلسے سے بہت سٹ پٹائے، لیکن قلعہ دیدار سنگھ اور اس کے اردگرد کے رہنے والے لوگ اس جلسے سے بہت مستفید ہوئے اور مسلک اہل حدیث کی بڑی اشاعت ہوئی۔

قلعہ دیدار سنگھ میں اس وقت اللہ کی مہربانی سے اہل حدیث کی تقریباً تیس مسجدیں ہیں۔

مولانا چراغ دین نے پچاسی (۸۵) سال کی عمر کو پہنچ کر ۲۷۔ اگست ۱۹۸۸ء کو وفات پائی۔ انا للہ وانا الیه راجعون۔ اللهم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه۔

مولانا چراغ دین کے ایک بیٹے ہیں اور تین بیٹیاں۔ بیٹے کا نام قاری عصمت اللہ ظہیر ہے۔ انھوں نے درس نظامی کی تکمیل جامعہ محمدیہ گوجراں والا میں کی۔ اساتذہ میں مولانا محمد عبداللہ (گوجراں والا) مولانا ابوالبرکات احمد۔ حافظ عبدالمنان نور پوری، مولانا محمد اعظم، قاری محمد یحییٰ بھوجیانی اور قاری احمد الدین شامل ہیں۔

قاری عصمت اللہ ظہیر قلعہ دیدار سنگھ کی جامع مسجد رحمانیہ کے خطیب اور وہاں کے مدرسہ رحمانیہ کے مہتمم ہیں۔ جمعیت المناہل الخیریہ کے نائب صدر ہیں۔ حسن اخلاق کے مالک اور خوش کلام عالم دین ہیں۔

مولانا چراغ دین کی بڑی بیٹی کی شادی حضرت مولانا محمد اسماعیل کے توسط سے گوجراں والا میں حافظ عبدالغفار ناگی سے ہوئی۔

دوسری بیٹی کی شادی ڈاکٹر محمد الیاس بن مولانا معراج دین سے ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب آج کل کویت میں

Marfat.com

اقامت گزیں ہیں۔

تیسری بیٹی کی شادی موضع فیروزوالا (ضلع گوجراں والا) میں محمد اسماعیل صاحب سے ہوئی تھی۔ افسوس ہے دونوں میاں بیوی وفات پا گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(اس مضمون میں تحریر کردہ معلومات ہمارے دوست مولانا عارف جاوید محمدی، ڈاکٹر محمد الیاس اور قاری عصمت اللہ ظہیر صاحب سے حاصل ہوئیں۔)

مولانا چراغ دین ایک جراءت مند مبلغ تھے۔ وہ جس موقف کو صحیح سمجھتے، اس پر مداہنت نہیں کرتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ ۱۹۵۶ء میں انڈیا کسی کام گئے۔ وہ دارالعلوم دیوبند بھی چلے گئے۔ پھر وہاں کی روداد انھوں نے لکھی۔ جو ہندو پاکستان کے مختلف جرائد میں شائع ہوئی اور دلچسپی سے پڑھی گئی۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں:

''مجھے ماہ اگست ۵۶ء میں بھارت ضلع مظفر نگر جانے کا اتفاق ہوا۔ ویزا مل گیا اور چند لوگ بھی میرے ساتھ تھے جو ایک شادی کے سلسلہ میں موضع شیر پور ضلع مظفر نگر پہنچے۔ مجھے وہاں اتباع سنت کے موضوع پر ایک تقریر کا موقع ملا۔ مجمع احناف کا تھا، اس لیے انھوں نے تاڑ لیا کہ یہ غیر مقلد ہے۔ بعد تقریر سب میرے گلے کا ہار ہو گئے اور کہنے لگے کہ فاتحہ خلف الامام کے متعلق تمھاری رائے کیا ہے؟ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ فرض ہے۔ وہ چند ملاؤں کو لے آئے جو میرے اعتراضات کا جواب تک نہ دے سکے۔ شیر پور کے مولوی ہارون الرشید دیوبند پڑھتے تھے، انھوں نے مجھے دیوبند چلنے کی دعوت دی کہ وہاں تمھاری تسلی کر دی جائے گی۔ عوام نے بھی زور دیا کہ تم دیوبند چلو۔ اس مسئلہ کا فیصلہ وہیں ہو گا۔ مجھے بھی دیوبند دیکھنے کا شوق تھا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ انھوں نے اپنا ایک نمائندہ علی شیر ساتھ کر دیا۔ ہم ۲۲/اگست کو ۱۱ بجے وہاں پہنچ گئے۔ مولوی ہارون الرشید کمرہ نمبر ۳۸ میں قیام پذیر تھے۔ وہیں ہم بیٹھ گئے اور بحث شروع ہو گئی تو پہلے میں نے دلائل دیئے اور وہ توڑتے رہے مگر نہ توڑ سکے۔ بالآخر میں نے ان سے دلیل طلب کی اور صاف صاف کہہ دیا کہ اگر آپ لوگ کوئی صحیح اور مرفوع غیر مجروح حدیث منع فاتحہ خلف الامام سے متعلق پیش کر دیں تو ایک سو روپیہ انعام دوں گا۔ چنانچہ وہ کئی نوجوان عالم جو ہمارا شور سن کر جمع ہو گئے تھے، انعام کے لالچ میں ہاتھ پاؤں مارتے رہے، کوئی حدیث پیش نہ کر سکے۔ بالآخر سبھی کہنے لگے کہ انھیں حضرت مولانا کے پاس لے چلو۔ مولانا سے ان کی مراد حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنی تھے۔ میں نے کہا چلو، اسی بہانے مولانا کی زیارت بھی ہو جائے گی۔ چنانچہ ہم وہاں پہنچے، مولانا کے اردگرد بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے، مجھے دُور ہی جگہ مل گئی۔ وہیں بیٹھ گیا۔ مسئلہ زیر بحث آپ کی خدمت میں پیش ہوا۔ تو آپ طیش میں آ گئے اور غصہ سے یوں گویا ہوئے:

Marfat.com

''جولوگ یہ کہتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی، وہ جھوٹے ہیں، دغاباز ہیں، فریب کار ہیں۔لوگوں کے ایمان چھینتے ہیں، انھیں بہکاتے ہیں۔ان سے ہوشیار رہو اور کبھی ان کے جال میں نہ پھنسو۔تم لوگ ان کی بات سنتے ہی کیوں ہو۔ان کی مجلس میں جاتے ہی کیوں ہو۔اپنے عقیدہ اور عمل پر قائم رہو، اور ان کی باتیں مت سنا کرو۔''

میں یہ سن کر حیران رہ گیا کہ بار الہٰ! یہ مولانا حسین احمد صاحب ہیں یا کوئی بریلوی عالم بول رہا ہے، یہ طرز اور طریق تو بریلوی علماء سے مختص تھا کہ وہ ایسے کلمات کہہ کہہ کر متبعین کو وہابیوں سے ڈراتے ہیں، بچاتے ہیں اور دُور ہٹاتے ہیں۔کیا دیوبندی حضرات بھی اہلحدیث سے ایسی ہی نفرت کرتے ہیں؟ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ میرے ساتھیوں میں سے جو مجھے حضرت مولانا کے پاس لے گئے تھے۔ایک نے کہا کہ حضرت ہم تو ان کے پاس نہیں جاتے، وہ خود ہی ہمارے پاس آجاتے ہیں۔چنانچہ ایک صاحب پاکستان سے یہاں آئے ہوئے ہیں اور انھوں نے ہی یہ مسئلہ چھیڑ رکھا ہے اور اب آپ کے پاس سمجھنے کے لیے آئے ہیں۔مولانا نے بڑے زور سے فرمایا کہ اسے لاؤ، میں سمجھاؤں۔ چنانچہ میں آگے بڑھا۔سلام عرض کیا۔مولانا نے فرمایا: تم نے کچھ پڑھا بھی ہے، صرف نحو منطق فلسفہ کچھ جانتے بھی ہو؟ میں نے عرض کیا: حضور میں عالم نہیں ہوں، نہ سند یافتہ ہوں، صرف مسئلہ سمجھنا چاہتا ہوں۔آپ نے فرمایا: جب تم نے کچھ پڑھا ہی نہیں تو پھر یہ حدیث کیسے معلوم ہوئی؟ میں نے کہا: حضور آپ جیسے علماء ہی سے سنی ہے، آپ مجھے سمجھا دیں کہ فاتحہ پڑھنی منع ہے۔حضور نے اس سے روکا ہے وہ حدیث مجھے دکھا دیں، میں اتنی عربی تو جانتا ہوں اور پڑھ سکتا ہوں جس سے صحیح اور صریح حدیث میں امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے، وہ صرف دیکھنا چاہتا ہوں۔مولانا زیادہ جوش میں آگئے اور فرمانے لگے کہ کوئی عالم ہو تو سمجھاؤں، جاہل کو کیا سمجھاؤں؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت عالم تو پہلے ہی عالم ہوگا، وہ آپ کے پاس آکر سمجھے گا؟ سمجھانا تو بے علموں کو چاہیے تاکہ انھیں علم ہو اور وہ راہِ راست پر آجائیں، مگر مولانا نہ مانے، نہ کچھ بتایا نہ سمجھایا۔یہاں تک کہ میں نے اُٹھتے اُٹھتے یہ بھی کہہ دیا کہ حضرت اگر کوئی عالم آپ کے پاس آجاتا تو شاید آپ وہ الفاظ استعمال نہ کرتے جو قائلین فاتحہ کے متعلق آپ نے غصہ میں آکر پہلے استعمال کیے ہیں۔

جب میں کمرہ سے باہر نکل آیا تو بہت سے طلبا بھی میرے گرد جمع ہو گئے اور ادھر اُدھر کی ہانکنے لگے۔کوئی استہزا کرتا، کوئی مجھے گستاخ قرار دیتا کہ اتنے میں ایک سنجیدہ عالم آئے جو غالباً مدرس ہوں گے۔انھوں نے سب کو روکا اور مجھے بٹھا کر پوچھنے لگے کہ کہیے آپ چاہتے کیا ہیں؟ میں نے منع فاتحہ کے متعلق کوئی صریح مرفوع غیر مجروح حدیث طلب کی تو آپ نے مؤطا امام محمد سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا قول پیش کر دیا۔میں نے

Marfat.com

عرض کیا یہ حدیث نہیں صحابی کا قول ہے۔ پھر آپ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول پیش کیا۔ میں نے کہا: حضرت یہ بھی حدیث نہیں ہے، قول ہی ہے۔ میں تو ((لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِفَاتِحَۃِ الْکِتَاب)) کے مقابلہ کی حدیث جو ایسی ہی صحیح اور صریح ہو، دیکھنا چاہتا ہوں۔ مگر آپ کہاں سے دکھائیں گے۔ آپ کے بڑے بڑے عالم اس امر کا اعتراف کر چکے ہیں کہ ((لم یرونی حدیث مرفوع صحیح النهی عن قراءة الفاتحة خلف الامام)) (تعلیق، جلد، ص: ۱۰۱)

بس اس کے بعد میں واپس آ گیا اور دیو بند کے متعلق جو حسن عقیدت لے کر گیا تھا وہ وہیں چھوڑ آیا۔

بخدا یہ صحیح واقعہ ہے جو بطورِ آپ بیتی پیش کر دیا ہے۔

''میں نے دیو بند دیکھا'' (آپ بیتی)

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا الٰہی بخش شجاع آبادی

(وفات مئی ۱۹۸۹ء)

جنوبی پنجاب کا علاقہ متعدد اضلاع (ڈیرہ غازی خاں، لیہ، مظفر گڑھ، خانیوال، ملتان، بہاول پور، جلال پور پیروالا، رحیم یار خاں وغیرہ) پر مشتمل ہے۔ اس علاقے کے لوگوں کی بولی بڑی میٹھی ہے، جس میں اپنایت کا غلبہ پایا جاتا ہے۔ اس نواح میں بے شمار علمائے دین پیدا ہوئے اور انھوں نے بے پناہ تدریسی، تصنیفی اور خطابتی خدمات سرانجام دیں۔ ان میں سے بعض علما کا تذکرہ ''دبستانِ حدیث'' میں اور بعض ''گلستان حدیث'' میں کیا جا چکا ہے اور بعض کا ''بوستانِ حدیث'' میں کیا جا رہا ہے۔ ان حضرات میں ایک عالم دین مولانا الٰہی بخش شجاع آبادی تھے، جو ۱۹۰۷ء کے لگ بھگ شجاع آباد (ضلع ملتان) کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انھیں حصولِ علم کا شوق تھا، لیکن اس کے لیے وسائل نہ تھے۔

اس زمانے میں احمد پور شرقیہ میں مولانا عبدالحق ہاشمی کا سلسلۂ درس جاری تھا۔ وہ ان کی خدمت میں پہنچے اور ان سے درسیات کے ابتدائی اور متوسط درجوں کی کتابیں پڑھیں اور واپس شجاع آباد آ گئے۔ اس علاقے میں اس وقت چاہ خلیل والا علوم متداولہ کا اچھا خاصا مرکز تھا، جس میں مولانا خلیل الرحمٰن دینیات کی تعلیم دیتے تھے، مولانا الٰہی بخش شجاع آبادی نے اس میں داخلہ لیا اور مولانا ممدوح سے خوب استفادہ کیا۔ مولانا خلیل الرحمٰن کے بعد ان کے صاحب زادے مولانا عبدالرحمٰن نے باپ کی مسند سنبھالی تو الٰہی بخش نے ان سے بھی فیض حاصل کیا۔

ملتان شہر میں اس وقت مولانا عبدالحق محدث ملتانی کا مدرسہ مرجع علما و طلبا تھا اور مولانا اس عہد کے جلیل القدر عالم و مدرس تھے، مولانا الٰہی بخش نے ان سے بھی اکتسابِ علم کیا۔ وہ امرتسر کے غزنوی علما سے بھی مستفید ہوئے، حافظ عبداللہ روپڑی سے بھی انھوں نے اخذ فیض کیا۔ مولانا احمد علی لاہوری کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور ان سے تفسیر قرآن سے متعلق بعض اہم نکات سمجھنے کی کوشش کی۔ لاہور کی بادشاہی مسجد کے منصب خطابت پر مولانا غلام مرشد فائز تھے اور سنہری مسجد (رنگ محل) میں نماز مغرب کے بعد درسِ قرآن دیا کرتے تھے، جس کی اس زمانے کے لاہور کے پڑھے لکھے طبقے میں بڑی شہرت تھی، مولانا الٰہی بخش ان کے پاس بھی پہنچے اور قرآن کے بارے میں بعض اشکالات کا ان سے ذکر کیا اور اس موضوع پر ان سے تبادلہ

Marfat.com

خیالات کا موقع ملا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تحصیل علم کا انھیں بے حد شوق تھا اور اس کے لیے وہ ہر عالم کا دروازہ کھٹکھٹانے پر کمر بستہ رہتے تھے۔ ضلع میاں والی کے قصبہ واں بھچراں میں اس وقت ایک معروف دیوبندی عالم مولانا حسین علی کا مدرسہ جاری تھا اور علوم قرآن مجید کے متعلق ان کی بالخصوص بڑی شہرت تھی، مولانا الٰہی بخش نے طویل سفر طے کر کے ان کے بابِ علم پر بھی جا حاضری دی۔

بہر حال وہ حصولِ علم کے بے حد حریص تھے۔ جہاں کسی بڑے عالم کا پتا چلتا، اس طرف کا رخ کر لیتے اور اس سے استفادے کی التجا فرماتے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے شجاع آباد کی جامع مسجد اہل حدیث میں خطابت و امامت کا سلسلہ شروع کیا۔ اس ماحول کے مطابق ان کا سلسلۂ خطابت بڑا موثر تھا۔ وہ خالص قرآن وحدیث کی روشنی میں وعظ فرماتے تھے۔ عام واعظوں کی طرح اِدھر اُدھر کے قصے کہانیوں سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا۔ نہ اسرائیلی روایات بیان کرتے، نہ ضعیف روایات سے کام چلاتے، بلکہ اگر کوئی واعظ ایسی بات بیان کرتا تو اسی وقت اسے ٹوک دیتے اور تلقین فرماتے کہ لوگوں کو صحیح باتیں بتائی جائیں، غلط باتیں بیان کرنے سے گریز کیا جائے۔

۹۔ستمبر ۱۹۳۴ء کو مولانا الٰہی بخش کو دارالحدیث محمدیہ جلال پور پیر والا کے مدرس مقرر کیا گیا۔ اس سے اگلے مہینے اکتوبر ۱۹۳۴ء کو وہاں شیخ الحدیث مولانا سلطان محمود کا تقرر عمل میں آیا۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ مولانا الٰہی بخش شجاع آبادی نے دارالحدیث جلال پور پیر والا میں کتنا عرصہ خدمتِ تدریس انجام دی۔

دارالحدیث جلال پور پیر والا سے وہ ڈیرہ غازی خان تشریف لے گئے اور وہاں کی ایک مسجد میں خطبۂ جمعہ ارشاد فرمانے لگے۔

آخری عمر میں وہ کمزوری کی بنا پر اپنے گھر ہی میں محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ انھیں عرق النساء کا مرض لاحق ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے وہ شدید تکلیف میں رہتے تھے۔ فالج کے مرض میں بھی وہ مبتلا ہو گئے تھے، لیکن جسمانی کمزوری اور مختلف عوارض کے باوجود ذکر واذکار میں مصروف رہتے۔ عیادت کے لیے آنے والوں سے قرآن مجید کی کسی نہ کسی آیت کے متعلق گفتگو فرمانا ان کا معمول تھا۔

علما میں سے مولانا ثناء اللہ امرتسری کے مناظرانہ انداز اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی خاں کے خطیبانہ اسلوب کے بہت مداح تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو بہت بڑا مفسر قرآن قرار دیتے تھے اور ان کی تفسیر ترجمان القرآن سے انھیں بڑا شغف تھا۔

Marfat.com

وہ نہایت صابر وشاکر، مستغنی المزاج اور قرآن وحدیث سے محبت کرنے والے تھے۔اس فقیر منش عالم دین نے مئی ۱۹۸۹ء میں وفات پائی۔

اللهم اغفرله و ارحمه و عافه و اعف عنه ❶

❀❀❀❀

❶ ملاحظہ ہو ہفت روزہ ''الاعتصام''۔لاہور۴ تا۱۰۔مئی ۲۰۱۲ء

Marfat.com

ملک حسن علی جامعی شرق پوری

(وفات ۶۔ جولائی ۱۹۹۱ء)

۱۹۴۹ء کی سردیوں کے دن تھے۔ میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ جمعیت کے صدر مولانا سید محمد داؤد غزنوی بھی وہاں تشریف فرما تھے۔ ایک صاحب آئے اور انتہائی احترام کے ساتھ مولانا غزنوی سے ملے۔ مولانا نے بھی ان کے ساتھ بڑی محبت کا اظہار کیا، میں نے بھی اکرام کے ساتھ ان سے مصافحہ کیا۔ میانہ قد، گندمی رنگ، شلوار قمیص اور شیروانی میں ملبوس، کلے پر سادگی سے سفید عمامہ باندھے ہوئے، پوری مگر قدرتی طور پر قد و قامت میں چھوٹی ڈاڑھی۔ وہ کچھ دیر مولانا سے مصروف گفتگو رہے۔ بات چیت کا انداز نہایت مخلصانہ اور لہجہ تکریم و عقیدت کے جذبات کا آئینہ دار۔ یہ تھے ملک حسن علی جامعی شرق پوری!

میری ان سے یہ پہلی ملاقات تھی بلکہ کہنا چاہیے کہ یہ ملاقات ان تعلقات کی تمہید تھی جو آگے چل کر ان سے قائم ہوئے۔

وہ بہت اچھے طبیب تھے۔ ان کا اصل کام تو اپنی زمینوں کی نگرانی تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے مسکن شرق پور میں طبابت بھی کرتے تھے۔ یونانی ادویات خریدنے کے لیے وہ بالعموم آٹھ دس دن کے بعد لاہور آیا کرتے تھے۔ شرق پور سے آنے والی بس سے شیش محل روڈ کے باہر چوک میں اترتے تو پہلے دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں تشریف لاتے اور وہاں مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور مولانا عطاء اللہ حنیف سے ملاقات کرتے۔ اس فقیر پر بھی وہ مہربانی فرمانے لگے تھے، اس لیے مجھے بھی ازراہِ کرم موقع فراہم کرتے کہ میں انھیں سلام عرض کر سکوں۔

اسی زمانے میں یا اس سے کچھ مدت پہلے انھوں نے مولانا عطاء اللہ حنیف سے مشورہ کیا کہ وہ شرق پور کے لیے کسی ایسے عالم دین کی خدمات حاصل کرنا چاہتے ہیں جو میٹھے اور پیارے انداز اور دلکش و نرم اسلوب میں مسلک توحید کی تبلیغ و اشاعت کریں، یعنی وہاں کے ماحول کو پیشِ نگاہ رکھتے ہوئے وعظ و تقریر میں ''ہاتھ ہولا'' ہونا چاہیے اور زبان مناسب طریقے سے لچک آشنا ہو۔

مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب نے اس کے لیے اپنے سعادت کیش شاگرد مولانا محمد یحییٰ صاحب کا نام پیش کیا، جن کا وطنی تعلق علاقہ ہریانہ کے ضلع حصار سے تھا، اسی لیے اس زمانے میں انھیں مولانا محمد یحییٰ

Marfat.com

حصاری کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد شرق پور سے ان کا اتنا گہرا تعلق پیدا ہوا کہ وہ مولانا محمد یحییٰ شرق پوری کے نام سے مشہور ہوئے۔

شرق پور کے لیے مولانا محمد یحییٰ کا انتخاب مولانا عطاء اللہ حنیف نے کسی بڑی ہی ساعت سعید میں کیا تھا۔ بلاشبہ یہ بہت اچھا انتخاب تھا۔ مولانا محمد یحییٰ نے وہاں بہت کام کیا۔ بارگاہِ الٰہی سے اس کا اجر جہاں مولانا محمد یحییٰ کو ملے گا وہاں ملک حسن علی اور مولانا عطاء اللہ حنیف بھی یقیناً اس کے مستحق قرار پائیں گے۔ اسے ان کے لیے ''صدقہ جاریہ'' سے تعبیر کرنا چاہیے۔ ❶

ملک حسن علی نہایت عمدہ اوصاف کے مالک اور بہترین کردار کے حامل تھے۔ تقویٰ ان کا شعار، صدق مقال ان کا شیوہ، تبلیغ دین ان کا پیشہ اور توحید کی نشر و اشاعت ان کا شب و روز کا مشغلہ تھا۔

وہ شرق پور (ضلع شیخوپورہ) کے ارائیں خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس خاندان کے اکابر دینی اور دنیوی اعتبار سے شرق پور اور اس کے نواح میں بہت اچھی شہرت اور اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ ان کے دادا کا اسم گرامی محمد الیاس اور والد بزرگ وار کا نام نامی غلام فرید تھا۔ یہ دونوں باپ بیٹا شرق پور میں اچھی خاصی زمینوں کے مالک تھے اور اپنے علاقے میں انھیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں اس دور کے مروجہ علوم میں بھی اللہ نے ان کو بہرۂ وافر سے نوازا تھا۔

ملک صاحب مرحوم کے دادا میاں محمد الیاس سرکار کی طرف سے اپنے علاقے کے منصبِ ذیل داری پر فائز تھے۔ کم و بیش ساٹھ برس وہ اس منصب پر متمکن رہے۔ دین داری اور پابندیٔ شرع کے اوصاف حسنہ بھی اللہ نے ان کو عطا فرمائے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ متدین و پارسا لوگ کسی مشہور بزرگ کے دائرۂ بیعت میں شامل ہونا ضروری سمجھتے تھے۔ ان دنوں خواجہ سلیمان تونسوی کی ایک حلقے میں بڑی شہرت تھی۔ وہ ضلع ڈیرہ غازی خاں کے قصبے تونسہ میں فروکش تھے۔ میاں محمد الیاس وہاں پہنچے اور ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے۔

مختلف علوم و فنون کی بہت سی قلمی کتابیں میاں محمد الیاس صاحب کے کتب خانے میں موجود تھیں۔ فارسی شعر و ادب کا بالخصوص اچھا ذخیرہ ان کے پاس تھا۔ انھوں نے سو سال سے زیادہ عمر پا کر ۲۵۔ دسمبر ۱۸۹۶ء کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔

ملک حسن علی کے والد میاں غلام فرید بھی زیورِ تعلیم سے آراستہ تھے اور اپنے علاقے کے متدین بزرگ تھے۔ فارسی زبان سے باپ کی طرح انھیں بھی لگاؤ تھا۔ سکندر نامہ انھیں زبانی یاد تھا۔ انھوں نے ۳۰۔ مارچ ۱۹۱۴ء کو وفات پائی۔

❶ مولانا محمد یحییٰ شرق پوری کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب ''ہفت اقلیم'' شائع کردہ مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور۔

Marfat.com

میاں غلام فرید کے بڑے بھائی کا نام محمد پارس تھا، جو واقعی پارسا تھے اور اپنے عہد کے صاحب علم بزرگ تھے...... نیز اپنے علاقے کے نامور طبیب بھی تھے۔ ۲۹۔ مارچ ۱۹۱۱ء کو فوت ہوئے۔

اپنے باپ دادا کا کتب خانہ ملک حسن علی کو ملا جو اب تک ان کے گھر میں موجود ہے۔ ملک صاحب مرحوم نے اس کتب خانے سے خوب استفادہ کیا۔

دینی، دنیوی اور علمی اعتبار سے اس پُر ثروت گھرانے میں ۱۲۔ جولائی ۱۸۹۹ء کو اتوار کے دن ملک حسن علی پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی اور سات سال کی عمر میں ناظرہ قرآن مجید مکمل کیا۔ اس کے بعد شرق پور کے فارسی مڈل سکول میں داخل کرا دیے گئے، ۱۹۱۴ء میں ورنیکلر مڈل کا امتحان پاس کیا۔

جونیئر اور سینئر جماعتوں کے مروجہ نصاب کی تکمیل کے بعد ۱۹۱۷ء میں لاہور آ کر اسلامیہ ہائی سکول شیراں والا گیٹ میں داخلہ لیا۔ اس سکول کے ہیڈ ماسٹر اس زمانے میں خاں صاحب محمد دین بی۔ اے تھے۔ وہ طلبا کو انتہائی توجہ اور محنت سے پڑھاتے تھے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ اسلامیہ ہائی سکول شیراں والا گیٹ میں داخلے سے تین سال قبل (مارچ ۱۹۱۴ء میں) ملک حسن علی کے والد محترم میاں غلام فرید انتقال کر چکے تھے۔ ملک حسن علی اور ان کے چھوٹے بہن بھائیوں کی سر پرست ان کی والدہ مکرمہ تھیں۔

شیراں والا ہائی سکول کی طالب علمی کے زمانے میں ملک صاحب کے ذہن نے ایک نہایت خوش گوار کروٹ لی۔ وہ یہ کہ ان کے دل میں قرآن مجید کے معانی ومطالب کو سمجھنے کے لیے ایک زبردست تحریک پیدا ہوئی۔

اس کے لیے سوال پیدا ہوا کہ وہ کس عالم دین کے دروازے پر دستک دیں؟

اس کا جواب کہیں سے نہ مل سکا۔

بعض اساتذہ اور ان طلبا سے جنھیں وہ اپنی دانست میں دین دار سمجھتے تھے، اس کا ذکر کیا لیکن کسی طرف سے تسلی بخش جواب نہ ملا۔ آخر کار ایک طالب علم نے رہنمائی کی اور وہ انھیں خواجہ عبدالحیؒ فاروقی کے پاس لے گئے جو ان دنوں اکبری دروازے کے باہر احمدیہ بلڈنگ کے قریب اکھاڑہ بوٹا مل میں کرائے کے مکان میں رہتے تھے اور وہیں رات کے وقت کالجوں کے طلبا کو درس قرآن دیتے تھے۔

ملک صاحب باقاعدہ ان کے درس میں شامل ہونے لگے۔ قرآن مجید کے اس درس سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ خواجہ صاحب کا انداز بیان بڑا دلکش اور موثر تھا۔

اسلامیہ ہائی سکول کے بالکل سامنے شیراں والا دروازے میں مولانا احمد علی صاحب کی مسجد تھی۔ مولانا اس مسجد میں نماز فجر کے بعد درس دیتے تھے۔ اب ملک صاحب ان دونوں دروس قرآن میں بلاناغہ جانے

Marfat.com

لگے۔ صبح کے وقت مولانا احمد علی کے درس میں اور شام کے بعد خواجہ عبدالحیؒ فاروقی کے درس میں۔ دونوں سے انھوں نے خوب استفادہ کیا اور قرآن مجید کے مطالب کو سمجھنے کی راہیں ان کے سامنے کشادہ ہوئیں۔

یہاں یہ یاد رہے کہ مولانا احمد علی صاحب دراصل سکھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور مولانا عبیداللہ سندھی کے بھتیجے تھے۔ اللہ نے ان کو اسلام کی صراط مستقیم پر لگا دیا اور انھوں نے اس کے دین کی بڑی خدمت کی۔ پنجاب کے اس ممتاز عالم دین نے ۲۲۔ فروری ۱۹۶۲ء کو لاہور میں وفات پائی۔

یہاں چند الفاظ میں خواجہ عبدالحیؒ صاحب کا تعارف بھی ہو جانا چاہیے۔ وہ ضلع گورداس پور کے رہنے والے تھے۔ قدیم و جدید علوم وفنون سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔ ۱۹۱۵ء میں مولانا محی الدین احمد قصوری نے کلکتہ سے مولانا ابوالکلام آزاد کی نگرانی میں جب روزنامہ ''اقدام'' جاری کیا تو خواجہ صاحب کو وہاں بلا لیا گیا تھا۔ مولانا آزاد ان کی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوئے تھے اور ان کی گوناگوں خوبیوں کی بنا پر مولانا آزاد نے متعدد خدمات ان کے سپرد کر دی تھیں جو انھوں نے حسن و خوبی سے سرانجام دیں۔ کلکتہ میں مولانا نے ''دارالارشاد'' کے نام سے جو مدرسہ قائم کیا تھا، خواجہ صاحب اس سے بھی منسلک رہے۔ انھیں مولانا محی الدین احمد قصوری کے روزنامہ ''اقدام'' کے عملۂ ادارت کا بھی رکن بنا لیا گیا تھا۔

مولانا آزاد کے خواجہ صاحب بہ درجہ غایت مداح تھے۔ طویل عرصے تک جامعہ ملیہ (دہلی) میں استاد تفسیر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اس موضوع پر انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں اور بعض سورتوں کی الگ الگ کتابی صورت میں تفسیریں لکھیں۔ تقسیم ملک سے کچھ عرصہ بعد لاہور آ گئے تھے اور اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) میں تفسیر قرآن کے پروفیسر مقرر کر لیے گئے تھے۔

۸۔ جنوری ۱۹۶۵ء کو ان کا انتقال ہوا۔

ملک حسن علی نے مولانا احمد علی اور خواجہ عبدالحیؒ (دونوں بزرگوں) کے دروس قرآن میں شرکت کا شرف حاصل کیا اور دونوں سے مستفید ہوئے۔

۱۹۱۹ء میں ملک حسن علی نے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پھر اسی سال اسلامیہ کالج (لاہور) میں داخل ہوئے۔ اس زمانے میں مسٹر ہنری مارٹن کالج کے پرنسپل تھے۔ مسٹر ایم اے غنی، مولوی حاکم علی، مولانا اصغر علی روحی، خواجہ دل محمد اور سید عبدالقادر ایسے مشاہیر اہل علم اس کالج میں طلبا کو پڑھانے پر مامور تھے۔

اب ملک حسن علی کی زندگی کا ایک اور دور شروع ہوتا ہے اور وہ انقلاب و تغیر کی ایک نئی لہر سے آشنا ہوتے ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں شروع ہو جاتی ہیں اور برصغیر کے سیاسی حالات

Marfat.com

ایک نئی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔

۱۳- اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیاں والا باغ (امرتسر) کا خونی حادثہ پیش آیا۔ اسی زمانے میں ترکی کے خلاف اتحادیوں نے انتقامی کارروائیاں شروع کیں، یوں تو تمام ہندوستانیوں کو اس سے تکلیف پہنچی لیکن مسلمانوں نے خاص طور پر انتہائی اذیت محسوس کی اور وہ حکومت برطانیہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس مسئلے میں مسلمان اور ہندو بالکل متفق تھے اور انگریزوں کے خلاف ایک ہی قسم کے جذبات رکھتے تھے۔

اب ترک موالات کی تحریک نے جو زور پکڑا تو اس کے نتیجے میں اسلامیہ کالج لاہور کے بہت سے طلبا نے کالج سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلے کے لیے علی گڑھ پہنچ گئے۔ جامعہ ملیہ کا قیام علی گڑھ میں ہوا تھا اور اس کا افتتاح ۲۹- اکتوبر ۱۹۲۰ء کو مولانا محمود حسن نے کیا تھا اور اس کے مہتمم ونگران مولانا محمد علی جوہر مقرر کیے گئے تھے۔ ملک حسن علی اس وقت سیکنڈ ایئر کے طالب علم تھے۔ وہ بھی ۱۹۲۱ء کے شروع میں علی گڑھ جا کر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخل ہو گئے۔

اسی زمانے میں پنجاب کے شہر گجرات میں مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے مسلم آزاد ہائی سکول کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا الحاق جامعہ ملیہ سے کر دیا گیا تھا۔ ملک حسن علی کو جو جامعہ ملیہ میں ایف اے پاس کر چکے تھے اور بی اے کے طالب علم تھے، جامعہ کی طرف سے ٹیچر کی حیثیت سے مسلم آزاد ہائی سکول (گجرات) میں بھیج دیا گیا۔ ایک سال وہ یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۹۲۳ء کے شروع میں ملک صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ میں واپس چلے گئے۔ وہاں جا کر جامعہ کی طرف سے بی اے کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے اور ''جامعی'' کی نسبت ان کے نام کا حصہ بنی۔

ان دنوں مولانا محی الدین احمد قصوری نے جمعیت دعوت وتبلیغ قائم کی تھی، جس کی ایک برانچ ہندوستان کے صوبہ گجرات کے شہر پونا میں کھولی گئی تھی۔ جمعیت کی طرف سے وہاں انھوں نے ایک یتیم خانہ بھی قائم کیا تھا اور ایک ہائی سکول بھی جاری فرمایا تھا۔ اپریل ۱۹۲۳ء میں انھوں نے ملک حسن علی کو وہاں بلا لیا اور عربی جماعتوں کی تدریس کی ذمہ داری انھیں سونپی گئی۔ اس زمانے میں مولانا محی الدین احمد قصوری کے سب سے چھوٹے بھائی میاں محمود علی قصوری بھی اس سکول میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور ملک صاحب کے شاگردوں میں شامل تھے۔

ملک صاحب کے صاحب زادے پروفیسر ڈاکٹر محمود علی ملک نے ایک مرتبہ بتایا کہ میاں محمود علی قصوری نے اس دور کی باتیں کرتے ہوئے ایک دن ان سے بیان کیا کہ ملک صاحب طلبا کو پڑھاتے وقت چھڑی ہاتھ میں رکھتے تھے اور کلاس روم میں چکر لگاتے ہوئے دائیں ہاتھ سے چھڑی گھماتے رہتے تھے۔ جو طلبا

Marfat.com

شرارت کرتے یا اچھی طرح نہ پڑھتے، انھیں چھڑی سے مارتے تھے۔ ڈاکٹر محمود علی ملک نے میاں صاحب سے پوچھا: کبھی آپ کو بھی مار پڑی؟

میاں صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: ایک دفعہ مار پڑی تھی۔

میاں محمود علی قصوری انتہائی تکریم سے ملک صاحب کا نام لیتے اور انھیں ''استاد صاحب'' کہا کرتے تھے۔

کچھ عرصہ ملک صاحب پونا میں خدمت تدریس انجام دیتے رہے۔ اس اثنا میں سکول کی چھٹیوں میں گھر آئے تو والدہ نے وہاں جانے سے روک دیا کہ اتنی دور کی مسافت پر وہ اپنے بچے کو نہیں بھیج سکتیں۔

اس زمانے میں امرتسر سے ''تنظیم'' کے نام سے ایک روزنامہ اخبار شائع ہوتا تھا، جس کے مالک و مینیجر پنجاب کے مشہور سیاسی لیڈر ڈاکٹر سیف الدین کچلو تھے اور اس کے ایڈیٹر اس عہد کے ممتاز عالم وصحافی مولوی عبداللہ منہاس تھے۔ ملک حسن علی کو اخبار ''تنظیم'' کے عملۂ ادارت میں شامل کر لیا گیا۔ کچھ مدت وہ اس اخبار میں کام کرتے رہے۔

ان دنوں منڈی بہاء الدین (ضلع گجرات، پنجاب) سے ایک ماہانہ رسالہ ''صوفی'' شائع ہوتا تھا۔ اس کے مدیر ملک نصر اللہ خاں عزیز تھے۔ ۱۹۲۵ء میں ملک نصر اللہ خاں کو سہ روزہ اخبار ''مدینہ'' کے مالک مولوی محمد مجید حسن نے بجنور بلا لیا تھا، جہاں سے یہ اخبار شائع ہوتا تھا اور اس کی ادارتی ذمہ داری ان کے سپرد کر دی گئی تھی۔ ان کے بجنور جانے کے بعد ۱۹۲۵ء ہی میں رسالہ ''صوفی'' کے ایڈیٹر ملک حسن علی جامعی کو بنا لیا گیا۔ کم وبیش ایک سال ملک حسن علی رسالہ ''صوفی'' کے فرائض ادارت سرانجام دیتے رہے۔

۱۹۲۶ء میں وہ شرق پور آ گئے اور اپنی زمینوں کی دیکھ بھال اور نگرانی میں مشغول ہو گئے۔ علم طب سے ان کا خاندانی تعلق تھا۔ حکیم حاذق کا امتحان دیا اور سند حاصل کی۔

۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۰ء تک تقریباً آٹھ سال انجمن حمایت اسلام (لاہور) کے ادارہ دار الشفقت (ملتان روڈ) میں اتالیق اعلیٰ کے فرائض انجام دیے۔ ہائی کلاسوں اور اسلامیہ کالج کے طلبا کی تعلیمی اور اخلاقی نگرانی بھی ان کے ذمے تھی۔

یہ ایک اہم کام تھا جو ملک حسن علی جامعی کے سپرد ہوا۔ اللہ نے ان کو توفیق دی اور بہترین طریقے سے یہ فرض انجام دیا۔

۱۹۴۰ء میں ملازمت ترک کر دی اور گھر آ گئے۔

جن حضرات سے ملک حسن علی نے علم دین سیکھا اور توحید الٰہی کا درس لیا، ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

Marfat.com

۱- مولانا احمد علی: لاہور کے جید عالم اور مبلغ دین تھے۔

۲- خواجہ عبدالحی فاروقی: جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے استاد تفسیر تھے۔

۳- مولانا محمد سورتی: عربی کے ممتاز و نامور ادیب اور جامعہ ملیہ دہلی کے استاد ادب تھے۔

۴- حافظ محمد اسلم جیراج پوری: مشہور عالم و مصنف اور جامعہ ملیہ میں استاد تھے۔

۵- ڈاکٹر محمد علی شاہ سندھی: اپنے عہد کے مشہور عالم تھے۔

۶- مولانا کریم بخش: گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر تھے۔

۷- مولانا شہاب الدین: معروف عالم دین تھے اور لاہور میں چوبرجی کے قریب ایک مسجد میں خطیب تھے۔ درویش منش اور نہایت پرہیزگار۔

ملک صاحب ان بزرگوں کے بہت مداح تھے اور ان کے علم و فضل کے بے حد معترف۔ وہ لاہور تشریف لاتے تو مولانا شہاب الدین کی خدمت میں جانے کی ضرور کوشش کرتے۔ میاں شیر محمد شرق پوری مرحوم بھی ان بزرگوں میں شامل تھے، جن سے ملک حسن علی نے فیض حاصل کیا۔ ان کا ذکر وہ نمایاں عنوان سے کرتے تھے۔

میاں صاحب نے ۱۹۲۸ء میں وفات پائی۔ اس وقت ملک صاحب کی عمر تیس سال کی تھی۔ ملک صاحب کے بقول میاں صاحب ان پر ''بڑی شفقت فرمایا کرتے تھے۔'' اور ان کو ان سے ''طویل صحبتوں کا موقع ملا۔''

ملک صاحب ۱۹۲۳ء میں جب پونا میں مولانا محی الدین احمد قصوری کے قائم کردہ یتیم خانے کے ہائی سکول میں تدریسی خدمات سرانجام دیتے تھے، اسی زمانے میں انھوں نے وہاں سے بذریعہ خط میاں شیر محمد صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور میاں صاحب نے ان کو پانچوں نمازوں کے بعد "حَسْبِیَ اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَ ھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ" کا وظیفہ پڑھنے کی تلقین فرمائی تھی۔

بقول ملک صاحب ''میاں صاحب وہ نہ تھے جو کچھ انھیں سمجھا جاتا ہے۔ وہ ان خانہ برانداز جھگڑوں سے بلند واقع ہوئے تھے۔'' اور ''امت کے لیے اپنے قلب میں ایک خاص تڑپ اور سوز رکھتے تھے۔''

میاں شیر محمد کے ذوق مطالعہ کے بارے میں ملک صاحب فرماتے ہیں کہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی تفسیر ''بیان القرآن''، مولانا سید امیر علی ملیح آبادی کی تفسیر ''مواہب الرحمٰن''، مولانا عبدالحق حقانی کی تفسیر حقانی میاں شیر محمد کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ سیرت کی کتابوں میں سے قاضی محمد سلیمان منصور پوری مرحوم کی ''رحمۃ للعالمین'' کی تینوں جلدیں اور سید سلیمان ندوی کی ''سیرۃ النبی'' میاں صاحب بہت پڑھا کرتے تھے۔

Marfat.com

ملک صاحب صاف لفظوں میں فرماتے ہیں:

''جو شخص میاں صاحب کو بریلوی سمجھتا ہے، وہ ان کے ساتھ بڑی بے انصافی کرتا ہے۔ حضرت میاں صاحب، مولانا احمد رضا خاں صاحب کو ملنے کے لیے بریلی بھی تشریف لے گئے تھے، جو تاثر وہاں سے لے کر آئے تھے، وہ کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں۔''

ملک صاحب نے کسی زمانے میں ''حیاتِ جاوید'' کے نام سے میاں صاحب کے حالات میں ایک کتاب بھی لکھی۔

ملک صاحب میٹھے اور پیارے انداز میں بات کرتے تھے۔ مجھ سے ان کا تھوڑا بہت تعارف تو ۱۹۴۹ء کے شروع میں ہو گیا تھا، جب میں جمعیت اہل حدیث کے ناظم دفتر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتا تھا، لیکن اصل تعلقات اگست ۱۹۴۹ء کے بعد قائم ہوئے جب اخبار ''الاعتصام'' جاری ہوا۔ اس کے مدیر مولانا محمد حنیف ندوی تھے اور میں اس کا معاون مدیر تھا۔ ۱۵۔ مئی ۱۹۵۱ء کو مولانا ندوی ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک ہو گئے تو اس کے ادارتی فرائض کی انجام دہی میرے سپرد کر دی گئی۔ اسی زمانے میں ملک صاحب کے مضامین ''الاعتصام'' میں شائع ہونے لگے۔ انھوں نے متعدد پہلوؤں پر لکھا۔ قرآن مجید اور اس کی تعلیمات کے بہت سے گوشوں پر نہایت خوب صورت اسلوب میں اظہار خیال کیا۔ سیرت رسول ﷺ سے متعلق انتہائی دل آویز انداز میں قارئین کو بہترین مواد سے نوازا۔ ان کا بنیادی موضوع توحید تھا۔ اس سلسلے میں جب وہ قلم کو حرکت دیتے تو پڑھنے والا یوں محسوس کرتا کہ ان کے فکر و نظر کے وسیع صحن میں بوقلموں الفاظ و معانی کا ایک خوب صورت گلستاں لہرانے لگا ہے۔ اللہ نے ان کو بہت سی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ فارسی میں وہ مہارت رکھتے تھے اور ترجمہ کرتے تھے تو اصل کا گمان ہوتا تھا۔ مجدد الف ثانی کے نظریۂ توحید سے کہنا چاہیے کہ انھیں عشق تھا۔ ان کے فارسی مکتوبات کو انھوں نے پیار میں ڈوب کر اور موضوع میں غرق ہو کر اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔

عربی سے بھی انھیں کامل لگاؤ تھا اور اس سلسلے میں ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور امام ابن قیم رحمہ اللہ کی تصنیفات سے انھیں بالخصوص تعلق خاطر تھا اور مختلف مسائل کے بارے میں ان کے نقطۂ فکر کو وہ بڑی اہمیت دیتے تھے۔ ان کی بعض کتابوں کے بعض حصوں کو ملک صاحب نے صاف ستھری اور رواں اردو کا جامہ پہنایا۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ کے بعض افکار جو انھوں نے اردو میں منتقل کیے، میرے زمانہ ادارت میں ''الاعتصام'' میں کئی قسطوں میں شائع ہوئے اور حلقۂ قارئین میں شوق سے پڑھے گئے۔

تاریخ سے بھی انھیں دلچسپی تھی اور اس کے بعض ابواب کو انھوں نے خوب نکھار کر قلم بند کیا۔ لاہور کی

Marfat.com

تاریخ سے متعلق ان کا سلسلۂ مضامین جو میری گزارش پر انھوں نے شروع کیا اور ''الاعتصام'' میں کئی ہفتے شائع ہوتا رہا، زبان اور معلومات کے اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتا ہے۔

تحریر و نگارش میں تین چیزیں دیکھی جاتی ہیں:

۱- زبان بھی بہت اچھی ہو اور مواد بھی صحیح ہو۔ یہ درجہ اول ہے۔

۲- مواد صحیح ہو، زبان میں اگرچہ کہیں جھول پایا جاتا ہو، یہ دوسرا درجہ ہے۔ مواد کی صحت زبان کے نقص کو پورا کر دیتی ہے۔

۳- زبان اچھی ہو، مواد اگرچہ زیادہ صحیح نہ ہو۔ یہ تیسرا درجہ ہے۔

ملک حسن علی جامعی اس سلسلے میں درجۂ اول پر فائز تھے۔ ان کی زبان بھی بہت اچھی تھی اور پڑھنے والے کو مواد بھی نہایت عمدہ دیتے تھے۔ اب صاف اور سلجھے ہوئے انداز میں لکھنے والے اور قارئین کو عمدہ زبان اور صحیح ترین مواد دینے والے کم ہی لوگ رہ گئے ہیں۔

ملک صاحب میں ایک خوبی یہ تھی کہ وہ رفاہ عامہ کے کاموں میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ ۱۹۵۵ء کے اکتوبر میں پنجاب شدید سیلاب کی زد میں آ گیا تھا۔ اس وقت جمعیت اہل حدیث نے لاہور اور اس کے گرد و نواح کے مختلف مقامات میں اٹھائیس امدادی کیمپ لگائے تھے۔ شرق پور میں بھی ایک کیمپ لگایا گیا تھا، جس کا انتظام مولانا محمد یحییٰ اور ملک حسن علی جامعی کے سپرد تھا۔ لاہور سے شرق پور تک تیس کلومیٹر کی سڑک پانی میں ڈوب گئی تھی۔ اس پر موٹر کاروں کی آمد و رفت ممنوع تھی، البتہ بڑی گاڑیاں چل سکتی تھیں، جیپ کی بھی اجازت تھی۔ ان سطور کا راقم اور مولانا داؤد غزنوی اس زمانے میں تین چار مرتبہ جیپ پر شرق پور گئے اور وہاں سیلاب زدہ لوگوں سے رابطہ قائم کیا۔ ملک صاحب نے مولانا محمد یحییٰ اور دیگر حضرات کے ساتھ مل کر مستحق افراد کی بڑی مدد کی۔

اہل علم کا ملک صاحب بے حد احترام کرتے تھے اور ان سے مل کر انتہائی خوش ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا محمد حنیف ندوی، حاجی محمد اسحاق حنیف اور ان سطور کا راقم جمعے کے روز شرق پور گئے اور مولانا محمد یحییٰ کی اقتدا میں نماز جمعہ ادا کی۔ مقصد محض ملاقات تھا۔ ملک صاحب سے ملاقات ہوئی تو نہایت مسرت کا اظہار کیا۔

قرآن مجید کے درس اور اس کے مطالب کی تفہیم و توضیح کے بارے میں وہ مولانا محمد حنیف ندوی سے بہت متاثر تھے۔ مولانا طویل عرصے تک مسجد مبارک (لاہور) میں درس قرآن دیتے رہے تھے اور ملک صاحب کو بارہا ان کے درس میں شرکت کے مواقع میسر آئے تھے، اس لیے وہ ان کے اسلوب بیان اور طرزِ ادا کی خاص طور پر تحسین کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میں ان سے ملاقات کے لیے شرق پور گیا۔

Marfat.com

حسبِ معمول بہت خوش ہوئے اور خاطر مدارات کی۔ فرمایا: میں تمھیں کئی دنوں سے بہت یاد کر رہا تھا۔

عرض کیا: کوئی خاص بات تھی؟

بولے: ہاں، خاص بات تھی۔

فرمایا: ہماری علمی تاریخ میں متعدد ایسے اہل علم گزرے ہیں، جنھوں نے کوئی تصنیفی کام شروع کیا، لیکن اسے مکمل نہ کر سکے اور وفات پا گئے۔ ان کا یہ نامکمل کام ان کے کسی لائق شاگرد یا کسی اور لائق عالم نے پایہء تکمیل کو پہنچایا۔ ایسا بھی ہوا کہ بعض حضرات کے تکمیل شدہ کام پر ذیول لکھی گئیں اور اسے آگے بڑھایا گیا۔

اس کے بعد انھوں نے کہا کہ یہ تمہید میں نے یہ کہنے کے لیے باندھی ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے تفسیر ''ترجمان القرآن'' کی دو جلدیں لکھی ہیں اور تفسیر مکمل نہیں ہو سکی۔ یہ تفسیر مکمل ہونی چاہیے۔ فرمایا: میرے نزدیک اس کے لیے موزوں ترین آدمی مولانا محمد حنیف ندوی ہیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی عالم یہ کام نہیں کر سکتا۔ انھیں تمام کام چھوڑ کر یہ کام کرنا چاہیے اور ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے کرنا چاہیے۔

انھوں نے کہا کہ یہ بات بہت دنوں سے میرے ذہن میں گھوم رہی تھی اور میں چاہتا تھا کہ تم سے ملاقات ہو تو اس کا ذکر کروں اور تمھیں کہوں کہ مولانا ندوی کو تفسیر ''ترجمان القرآن'' کی تکمیل پر آمادہ کرو۔

ملک صاحب کے توجہ دلانے پر میرے ذہن میں بھی یہ بات آئی اور مولانا کے گوش گزار کی اور ملک صاحب کی تجویز کو عملی شکل میں لانے پر زور دیا۔

اس کے بعد بعض حضرات کی معرفت ملک صاحب کے پیغام بھی آئے اور خطوط بھی موصول ہوئے۔ چند اور اصحاب علم نے بھی اپنے طور پر مجھے یہ بات کہی۔ ایک دن خود ملک صاحب شرق پور سے ادارۂ ثقافت اسلامیہ تشریف لائے اور میری موجودگی میں مولانا حنیف ندوی رحمہ اللہ سے بات کی۔

مولانا نے جواب میں فرمایا: پہلی بات تو یہ ہے کہ اس بہت بڑے کام کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سورۂ نور اور اس کے بعد کی سورتوں کے مسائل خاص اہمیت کے حامل ہیں، معلوم نہیں مولانا آزاد کے ذہن میں کیا باتیں تھیں اور وہ کس طرح ان مسائل کی توضیح سے عہدہ برا ہونا چاہتے تھے۔

مولانا کے اس جواب کے بعد بھی ملک صاحب نے اپنی کوشش جاری رکھی اور اصرار کرتے رہے کہ وہ بہر حال تفسیر ''ترجمان القرآن'' مکمل کر دیں، لیکن افسوس کہ وہ مولانا سے اپنی بات منوانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

مولانا غلام رسول مہر سے بھی ملک صاحب قلبی تعلق رکھتے تھے۔ ایک دن صبح نو بجے کے لگ بھگ میرے دفتر آئے۔ میں اس وقت ''الاعتصام'' میں ادارتی خدمات انجام دیتا تھا۔ فرمایا: میں تمھارے

Marfat.com

ساتھ مولانا غلام رسول مہر سے ملنا چاہتا ہوں۔ سنا ہے ان کا کتب خانہ عربی اور فارسی کی بہت سی نادر و نایاب کتابوں پر مشتمل ہے۔ مجھے ان کی کتابیں دیکھنے کا شوق اور ان سے باتیں کرنے کی تمنا ہے۔ ہم مہر صاحب کے یہاں گئے۔ وہ اپنی کوٹھی کے برآمدے سے ملحق چھوٹے سے کمرے میں بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ حسب معمول تپاک سے ملے اور باتیں شروع کر دیں۔ ملک صاحب نے کہا: میں آپ کے کتب خانے کی زیارت کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ہمیں فوراً کتب خانے میں لے گئے اور بتایا کہ انھیں کتابیں پڑھنے اور خریدنے کا شوق کیسے پیدا ہوا اور کون کون سی کتابیں کب خریدیں اور کس ضرورت کی بنا پر خریدیں۔

اثنائے گفتگو میں مولانا ثناء اللہ امرتسری کا ذکر آ گیا۔ مہر صاحب نے کہا کہ ان کی تمام کتابیں میرے پاس موجود ہیں، صرف ایک کتاب ''شمع توحید'' نہیں ہے۔ میں اس کی تلاش میں ہوں۔ ملک صاحب نے کہا میرے پاس اس کے دو نسخے ہیں، ایک نسخہ آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ مہر صاحب نے میرا نام لیا کہ وہ مجھے کتاب بھجوا دیں اور میں ان سے منگوالوں گا۔ چنانچہ تین چار روز کے بعد ملک صاحب شرق پور سے تشریف لائے اور وعدے کے مطابق کتاب ''شمع توحید'' مجھے دے دی اور میں نے مہر صاحب کی خدمت میں پیش کر دی۔

مہر صاحب کا کتب خانہ دیکھ کر ملک صاحب بہت خوش ہوئے اور واقعی بہت عمدہ کتب خانہ تھا جو مختلف موضوعات کی عظیم الشان کتابوں پر محیط تھا۔ ان کی وفات کے بعد اس بہت سے عجائب پر مشتمل کتب خانے کا بہت بڑا حصہ عجائب گھر لاہور کی لائبریری میں منتقل ہو گیا۔

مہر صاحب پر میں ان شاء اللہ مستقل مضمون لکھوں گا، جو ان کے متعلق اپنی یادداشتوں پر مشتمل ہوگا۔

ملک حسن علی جامعی ایک متحرک اور صاحب علم و صاحب قلم شخصیت تھے۔ ان کے روابط دور گزشتہ کے بہت بڑے لوگوں کے ساتھ رہے تھے اور ان کی بعض باتیں وہ اپنے انداز میں سنایا کرتے تھے۔ مثلاً ڈاکٹر ذاکر حسین خاں سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف پہلے جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) کے پرنسپل رہے اور آزادی کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور پھر ہندوستان کے منصب صدارت پر فائز کیے گئے۔ ملک صاحب کے ان سے تعلقات جامعہ ملیہ کی طالب علمی کے زمانے میں قائم ہوئے تھے۔

مولانا آزاد سے بھی ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ وہ مولانا سے بہت متاثر تھے اور ان کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے۔

مولانا محمد علی جوہر کے وہ انتہائی مداح تھے اور اس وقت علی گڑھ جا کر جامعہ ملیہ میں داخل ہوئے تھے،

Marfat.com

جب اس کی زمام اہتمام مولانا محمد علی جوہر کے ہاتھ میں تھی۔ اس طرح انھوں نے مولانا محمد علی جوہر کو بہت قریب سے دیکھا تھا، ان کی تقریریں سنی تھیں اور ان کے افکار و خیالات سے براہ راست آگاہی حاصل کی تھی۔ مولانا محمد علی جوہر سے ان کی خط کتابت بھی رہی تھی اور ان کے چند خطوط ان کے پاس موجود تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحب زادوں (ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک اور ڈاکٹر محمود علی ملک) نے ان کی لائبریری سے یہ خطوط تلاش کرنے کی بہت کوشش کی، لیکن افسوس ہے، وہ خطوط نہیں ملے۔ اسی قسم کے اور بھی متعدد خطوط جن کا انھیں علم تھا کہ ان کے والد کی لائبریری میں موجود ہیں انھیں دست یاب نہیں ہوئے۔ کئی اہم کتابیں بھی لائبریری سے غائب تھیں۔

اصل بات یہ ہے کہ جو شخص ملک صاحب کی کتابیں دیکھنا چاہتا یا مشاہیر کے خطوط دیکھنے کی درخواست کرتا ملک صاحب اسے دیکھنے کی کھلی اجازت دے دیتے اور خود اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے۔ شنید ہے کہ مختلف اوقات میں پنجاب یونیورسٹی کے بعض حضرات ملک صاحب کے پاس آئے اور ملک صاحب نے ان پر اعتماد کیا اور وہ بہت سی اہم چیزیں لے کر چلتے بنے۔

ملک صاحب نہایت بلند اخلاق اور اپنے ملنے والوں سے انتہائی حسن سلوک سے پیش آتے تھے۔ میں کئی دفعہ ان کی خدمت میں شرق پور حاضر ہوا اور وہ ہمیشہ اس انداز سے ملے کہ مجھے ان کے اظہار انکسار کی بنا پر شرم محسوس ہونے لگی۔ ایک دن سردیوں کے موسم میں صبح ساڑھے سات بجے کے قریب میرے گھر پہنچ گئے اور ایک بوری میرے حوالے کی جس میں کئی درجن سنگترے تھے۔ فرمایا: یہ میرے اپنے باغ کے سنگترے ہیں جو شرق پور سے تمھارے لیے لایا ہوں۔

وہ خلوص و انکسار کا حسین پیکر تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان پر بڑا کرم فرمایا تھا۔ فقہی مسلک کے نقطۂ نظر سے وہ اہل حدیث اور دیو بندی حضرات کو خاص طور پر اہمیت دیتے تھے اور اگر ان میں کوئی ایسی بحث شروع ہو جاتی جس کے نتیجے میں تلخی کے آثار ابھر آنے کا خدشہ ہوتا تو وہ شدید ذہنی اذیت محسوس کرتے۔ یوں تو وہ اہل سنت کے تمام فرقوں میں صلح و آشتی کے خواہاں تھے، لیکن اہل حدیث اور دیو بندی حضرات کے درمیان وہ خاص طور پر اتحاد و یک جہتی کے متمنی رہتے تھے۔

میں انھیں کہا کرتا تھا کہ آپ بڑے خوش قسمت ہیں جن کے دونوں بیٹے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور فرماں بردار ہیں۔ دونوں ڈاکٹر ہیں۔ ایک علم کا ڈاکٹر اور ایک جسم کا۔ ذوالفقار علی پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں، یعنی علم کے ڈاکٹر۔ اس وقت وہ یونیورسٹی اورنٹیل کالج کے پرنسپل تھے۔ محمود علی کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے پروفیسر اور میو ہسپتال کے ممتاز معالج تھے، یعنی جسم کے ڈاکٹر۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ علم و ادب کے بھی مختلف شعبوں

Marfat.com

میں مہارت رکھتے ہیں اور ان کے مقالات مختلف رسائل و جرائد میں چھپتے رہتے تھے۔

ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے وائس چانسلر بھی ہوئے اور ڈاکٹر محمود علی ملک گنگا رام ہسپتال کے چیرمین مقرر کیے گئے۔

میرے بارے میں دونوں بھائیوں کو احساس ہے کہ ان کے باپ سے میرے تعلقات تھے، اس بنا پر دونوں میرا احترام کرتے ہیں۔ جب اور جہاں ملاقات ہو بہت اچھی طرح پیش آتے ہیں۔ دعا ہے اللہ انھیں خوش رکھے، جس طرح ان کا ماضی بہتر رہا اور حال بہتر ہے، اسی طرح مستقبل بہتر ہو۔ میرے ''الاعتصام'' کے دور ادارت میں دونوں بھائیوں کے مضامین ''الاعتصام'' میں چھپتے رہے۔ میں ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہوا اور ''المعارف'' کی ادارت میرے ذمے ہوئی تو ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک کے متعدد مضامین ''المعارف'' میں چھپے۔

کسی زمانے میں شرق پور اور اس کے قرب و جوار میں ملک حسن علی واحد شخص تھے، جو اس عقیدہ و عمل کے حامل تھے جو توحید خالص کی راہ مستقیم سے تعلق رکھتا ہے اور جس راستے پر چلنے والے کو اہل حدیث (یا اس وقت وہابی) کہا جاتا تھا۔ ان کی ہمت کی داد دیجیے کہ اس ایک شخص نے وہ کام کیا جو بہت سے افراد مل کر بھی آسانی سے نہیں کر سکتے۔ وہ مجاہدانہ ارادہ و عزم کے مالک تھے اور دلیرانہ انداز سے کار خیر کا آغاز کرتے اور پھر اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اپنی تمام قوتیں صرف کر دیتے تھے۔ انھوں نے بے شمار امور حسنہ سر انجام دیے، جن میں مندرجہ ذیل امور خاص طور پر لائق تذکرہ ہیں:

۱- شرق پور میں میاں شیر محمد مرحوم کی موجودگی اور ان سے عقیدت مندی کے دعوے کے باوجود سودی کاروبار کا سلسلہ جاری تھا اور کئی خاندان اس میں ملوث تھے جو ضرورت مندوں کا استحصال کرتے اور انھیں سود پر رقم دیتے تھے۔ ملک صاحب نے سود خوری کی شدید مذمت کی۔ انھوں نے اس کے خلاف چھوٹے چھوٹے پمفلٹ اور پوسٹر لکھے اور اپنے خرچ پر شائع کیے۔ ان کا مطمح نظر یہ تھا کہ سود خوری کے متعلق لوگوں کے ذہن میں نفرت پیدا ہو اور وہ اسے ترک کر دیں۔ ان پوسٹروں کا عنوان تھا ''سود خوروں کے خلاف اللہ اور رسول اللہ ﷺ کا اعلان جنگ۔''

یہ کام وہ مسلسل کئی سال کرتے رہے۔ اس دور کے شرق پور میں یہ بہت بڑا کام تھا جو انھوں نے انتہائی محنت اور اخلاص کے ساتھ کیا اور سود لینے اور دینے والوں پر اس کی قباحتیں واضح کیں اور اللہ تعالیٰ نے اس مہم میں انھیں کامیابی سے نوازا۔

۲- قرآن مجید سے ملک صاحب کو قلبی لگاؤ تھا۔ یہ سینۂ لاہوت کا وہ آخری بول ہے جو نطق جبریل کے

Marfat.com

قالب میں ڈھل کر لسان نبوت پر جاری ہوا اور پھر اس نے لوگوں کے دلوں میں جگہ پائی۔ ملک صاحب نے عوام وخوص کو اس کے معانی ومطالب سے روشناس کرانے کے لیے بڑی تگ وتاز کی۔ اس کے لیے وہ بے شمار لوگوں سے ملے اور انھیں قرآن مجید اور اس کا ترجمہ پڑھنے کی تلقین کی۔ سکول کے اساتذہ وطلبا سے بھی رابطے پیدا کیے اور ان کے سامنے قرآن کی عظمت وفضیلت بیان کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگوں نے ان سے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا اور اس کے مضامین ومطالب سے آگاہ ہوئے اور ان میں توحید خداوندی کا جذبہ ابھرا۔ اس عہد میں ملک صاحب نے ''عجائبات القرآن'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جس میں قرآن کی عظمت ورفعت کو اجاگر کیا اور اس کے مضامین کی وضاحت کی۔ غالباً ان کی یہ پہلی تصنیف ہے۔

۳- ایک زمانے میں علاقہ شرق پور میں مرزائیوں نے اپنی تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ مرزائی نت نئے لوگوں کو اپنے جال میں پھنسانے کے لیے اپنے مبلغین بلاتے اور مختلف مقامات پر عام جلسوں کی صورت میں اپنے باطل عقیدے کی تبلیغ کرتے۔ ان مقامات میں موضع بھینی کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ یہ موضع شرق پور شہر کے بالکل قریب ہے۔ اس میں مرزائیوں کی کافی تعداد سکونت پذیر تھی۔ یہ لوگ بھینی میں اپنے مشہور مبلغ مدعو کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بھینی میں ان کا جلسہ کافی مشہور تھا، جس میں مرزائی خواص وعوام پورے اہتمام سے شرکت کرتے تھے۔

ملک حسن علی صاحب عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کے لیے ہمیشہ سرگرم عمل رہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ انھوں نے بھینی میں مرزائیوں کے ساتھ ایک مناظرے کا اہتمام کیا جس میں مولانا احمد دین گکھڑوی اور مولانا محمد شفیع صاحبان کو مدعو کیا گیا۔ یہ علما عقیدۂ ختم نبوت پر ایمان رکھنے والوں کی طرف سے مناظر تھے۔ اس مناظرے میں مرزائیوں کو بری طرح شکست ہوئی اور اس کے بعد علاقے میں ہمیشہ کے لیے مرزائیت کا قلع قمع ہو گیا۔

۴- قیام پاکستان کے بعد مشرقی پنجاب سے جو لٹے پٹے پناہ گزین شرق پور اور اس کے گرد ونواح میں آئے، ملک صاحب نے اپنی ہمت وحیثیت کے مطابق ان کی بڑی خدمت کی۔ انھوں نے انجمن انصار المہاجرین کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جس میں شرق پور شہر اور علاقے کے متعدد سرکردہ لوگ شامل تھے۔ ملک صاحب کی سرکردگی میں اس انجمن کے ارکان نے مہاجرین کو ہر نوع کی سہولتیں بہم پہنچانے کی سعی کی۔

ملک حسن علی جامعی کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور اچھے خاصے زمیندار اور صاحبِ جائیداد

Marfat.com

خاندان کے فرد تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس قسم کے خاندانوں کے نوجوان کچھ اور ہی نوعیت کی عادات واطوار کے حامل ہوتے ہیں، لیکن ملک صاحب کو ابتدا ہی سے اللہ تعالیٰ نے صاف ستھرے ذہن اور بہترین عمل و کردار کی دولت سے مالا مال کر دیا تھا۔ یہ دولت تمام عمر ان کے پاس رہی اور انھوں نے ہر معاملے میں رضائے الٰہی کو سامنے رکھا۔

یہاں تک تو ملک حسن علی جامعی کی فہم و فراست، علم و قابلیت اور تحریر و نگارش کے بارے میں چند ضروری باتیں تھیں جو اختصار کے ساتھ خوانندگان محترم کی خدمت میں پیش کی گئیں، اب ان کی زندگی کا دوسرا اور آخری دور ملاحظہ ہو۔

ان کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ ایک دن صبح چھے بجے کے لگ بھگ انجینئرنگ یونیورسٹی (لاہور) کے اس وقت کے پروفیسر ڈاکٹر محمد یحییٰ صاحب میرے گھر آئے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جا کر کسی کام کے لیے ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک سے ملنا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہم شرق پور جا کر ان سے ملیں۔ میں نے ان سے کہا شرق پور جانے کی کیا ضرورت ہے۔ ڈاکٹر ذولفقار علی ملک لاہور رہتے ہیں، آٹھ نو بجے پنجاب یونیورسٹی میں ان سے مل لیں گے۔ انھوں نے جواب دیا کہ مجھے معلوم ہوا ہے، وہ کل شام کو شرق پور چلے گئے تھے۔

میں نے کہا، شام کو چلے گئے تھے تو کیا ہوا، تھوڑی دیر کو آ جائیں گے اور یونیورسٹی میں ان سے بات ہو جائے گی۔ مگر وہ نہیں مانے اور شرق پور جانے کے لیے اصرار کرتے رہے۔ میں نے بھی سوچا کہ چلیے اس بہانے ملک حسن علی کو بھی سلام عرض کر لیں گے اور مولانا محمد یحییٰ سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ وہاں پہنچے اور ملک حسن علی صاحب سے ملے۔ لیکن ملاقات میں وہ پہلے کی سی گرم جوشی نہ تھی۔ ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک کے بارے میں پوچھا تو بتایا کہ وہ تو رات یہاں نہیں آئے، لاہور ہی ہیں، لیکن یہ ضرور کہا بلکہ اصرار کیا کہ کچھ کھا پی لو۔ دو تین مرتبہ وہ کچھ کھانے کو لانے کے لیے اٹھے بھی، مگر ہم نے روک دیا۔ کھانے پینے کے لیے بار بار کہنے اور اصرار کرنے کے باوجود ان کے چہرے پر وہ آثارِ بشاشت نہ تھے، جن کا اس سے قبل اظہار ہوتا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ انھوں نے پہچانا نہیں۔

میں نے پوچھا، آپ نے مجھے پہچانا؟

بولے ہاں پہچانا!

جی میں آیا کہ ان سے پوچھوں، میرا نام کیا ہے؟ لیکن جرأت نہ ہوئی۔ خیال کیا کہ یہ سوئے ادب ہے۔

پھر عرض کیا، میرا نام اسحاق بھٹی ہے، میں لاہور سے آیا ہوں، پہلے اخبار ''الاعتصام'' سے وابستہ تھا،

Marfat.com

اب ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں کام کرتا ہوں۔

کہا، ہاں اسحاق بھٹی الاعتصام میں تھے۔ اب ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں کام کرتے ہیں۔ اچھا اب میں آپ کے لیے کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔ یہاں کا حلوہ پوری بہت اچھا ہوتا ہے، وہ کھالو۔

برتن اٹھا کر چلنے لگے، لیکن ہم نے بٹھالیا۔ اب میں نے ان سے کہا، میں یہاں مولانا محمد حنیف ندوی رحمہ اللہ اور ملک نصراللہ خاں عزیز رحمہ اللہ کے ساتھ بھی آیا ہوں، اور مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ کے ساتھ بھی۔ آپ بھی میرے پاس لاہور تشریف لے جاتے رہے ہیں اور ''الاعتصام'' میں آپ کے مضامین چھپتے رہے ہیں۔

فرمایا: ہاں! آپ یہاں آئے ہیں، ملک نصراللہ خاں بھی میرے دوست تھے اور مولانا حنیف ندوی بھی!

پوچھا، ڈاکٹر ذوالفقار علی لاہور میں کہاں رہتے ہیں؟

جواب دیا، لاہور ہی میں رہتے ہیں۔

میں نے کہا، سنا ہے دریائے راوی کے قریب سعید پارک میں رہتے ہیں۔

کہا: ہاں وہیں رہتے ہیں۔

اس کے بعد ہم اجازت لے کر چلنے لگے تو پھر کہا کہ کچھ کھاپی لیتے، جیسے آئے تھے، ویسے ہی چل پڑے۔

اس سے ان کے جذبۂ مہمان نوازی کا پتا چلتا ہے جو ان کے اندر پوری طرح بیدار ہے۔ یادداشت جواب دے چکی ہے۔ پچھلی کوئی بات ذہن میں محفوظ نہیں رہی، مگر مہمان کو کھانے پلانے پر اصرار کیا جارہا ہے۔

میں نے اپنے ساتھی سے کہا، چلیے مولانا محمد یحییٰ سے مل لیں۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، اگر انھوں نے بھی نہ پہچانا تو پھر کیا ہوگا۔ بہر حال ہم لاہور واپس آگئے۔

یونیورسٹی جا کر ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک سے شرق پور جانے کا ذکر کیا تو انھوں نے پوچھا، ابا جی نے آپ کو پہچان لیا؟ وہ تو کسی کو نہیں پہچانتے۔ یادداشت بالکل ختم ہوگئی ہے۔

اس سے چند روز بعد مولانا محمد یحییٰ سے اس سلسلے میں بات ہوئی تو انھوں نے دو عجیب باتیں بتائیں۔

انھوں نے کہا ایک دن چند لوگوں کی موجودگی میں ان سے کسی شخص نے ایک آدمی کے بارے میں پوچھا کہ یہ کون ہے؟ اس سوال کا بہ صورت سوال ہی جواب دیا کہ انھیں کون نہیں جانتا؟

مولانا محمد یحییٰ نے بتایا کہ اپنے بیٹوں کے نام بھی ان کے ذہن سے نکل چکے تھے۔ ایک دن کسی نے ان کے نام پوچھے تو الٹا اسی سے سوال کر دیا، یہ کیا پوچھنے کی بات ہے، اپنے بیٹوں کے نام بھی کوئی بھول سکتا ہے؟

ان دونوں سوالوں کے جواب بے حد منطقیانہ ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے لاشعور پر شعور کی حکمرانی تھی، یا یوں کہیے کہ وہ غیر شعوری طور پر شعور کی نعمت سے بہرہ ور تھے۔

Marfat.com

جب تک ان کی ذہنی وفکری حالت ٹھیک رہی، وہ تصنیف و تالیف اور مطالعہ کتب میں مشغول رہے۔ اخبارات ورسائل میں تحریر کردہ مضامین ومقالات کے علاوہ انھوں نے جو کتابیں تصنیف کیں، ان میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱- عجائبات القرآن: یہ کتاب قرآن مجید کی تعلیمات اور اس کی عظمت و رفعت سے متعلق ہے۔

۲- حیات جاوید: یہ کتاب میاں شیر محمد شرق پوری مرحوم کے واقعات وسوانح پر مشتمل ہے۔

۳- تعلیمات مجددیہ: یہ ضخیم کتاب حضرت شیخ احمد سرہندی، مجدد الف ثانی کے حالات اور ان کی تعلیمات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ منفرد اور جامع کتاب ہے جس میں حضرت مجدد رحمہ اللہ کے احوال و کوائف کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ پہلی دفعہ یہ کتاب ۱۹۶۵ء میں خود ملک صاحب نے شائع کی تھی، جس پر حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی اور دیگر متعدد حضرات کی تقریظات ہیں۔ پھر ۱۹۹۵ء میں مرحوم حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب شرق پوری (خطیب جامع مسجد اہل حدیث شرق پور) نے شائع فرمائی اور ان کے صاحب زادۂ گرامی قدر جناب مولانا حافظ مسعود عالم صاحب استاذ جامعہ سلفیہ فیصل آباد نے بے حد محنت اور شوق سے اس کی تہذیب وتصویب کا فریضہ انجام دیا۔ اس کتاب کا ہر شخص کو مطالعہ کرنا چاہیے۔

۴- مشاہد التوحید: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں مسئلہ توحید کی وضاحت کی گئی ہے۔

ملک حسن علی جامعی نے بانوے ۹۲ سال کی عمر پا کر ۶- جولائی ۱۹۹۱ء کو سفر آخرت اختیار کیا اور شرق پور کی سرزمین میں آسودۂ لحد ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

❁❁❁❁

Marfat.com

مولانا محمد داؤد راز دہلوی

(وفات ۲۔دسمبر ۱۹۹۱ء)

ہندوستان کے علاقہ میوات میں اہل حدیث اچھی خاصی تعداد میں آباد ہیں۔ یہ علاقہ دہلی سے بجانب جنوب اور آگرہ سے مغرب کی طرح واقع ہے۔ اس کا ایک حصہ راجستھان سے ملتا ہے تو اس کی شمالی حد صوبہ دہلی سے ٹکرائی ہے۔ مشرق میں یہ علاقہ صوبہ ہریانہ تک چلا گیا ہے۔ صوبہ یوپی کے بعض اضلاع سے بھی اس کی سرحدیں ملحق ہیں۔ مختلف اضلاع میں پھیلے ہوئے میوات کے اس علاقے میں تقریباً ڈھائی ہزار دیہات مسلمانوں کے آباد ہیں۔ جن میں بڑے علمائے دین پیدا ہوئے اور ان علمائے دین نے بے حساب خدمات سرانجام دیں۔ ماضی بعید میں یہاں علما کی بہت بڑی جماعت قرآن وحدیث کی تبلیغ میں مصروف رہی اور ماضی قریب میں بھی بے شمار اہل علم اس نواح میں درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کی صورت میں اسلام کی نشرواشاعت کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ اب بھی اپنی ہمت کے مطابق وہاں کے علما بہت کام کررہے ہیں۔ ان کے مدرسے جاری ہیں، مسجدیں آباد ہیں، تقریر وخطابت کے سلسلے قائم ہیں، قلم وقرطاس کے ذریعے نشر اسلام کی مساعی باقاعدگی سے اپنا سفر طے کررہی ہیں۔ ان کے اخبارات بھی مختلف مقامات سے شائع ہورہے ہیں جو کتاب وسنت کی تبلیغ کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔

اسی علاقہ میوات کے ایک نامور عالم دین مولانا محمد داؤد راز تھے، جو ۱۹۰۸ء میں اپنے آبائی گاؤں موضع راہپواہ میں پیدا ہوئے۔ باپ کا نام عبداللہ تھا اور انھوں نے اپنے اس بیٹے کا نام امید خاں رکھا تھا، لیکن جب بیٹے نے حصول علم کی وادی میں قدم رکھا تو اساتذہ نے ان کا نام محمد داؤد رکھ دیا اور شعروشاعری سے دلچسپی کی بنا پر ان کا تخلص ''راز'' قرار پایا، اس طرح انھوں نے محمد داؤد راز کے نام سے شہرت پائی۔ ان کا تعلق میوبرادری کی گوروال (راجپوت) گوت سے تھا۔ ان کے گاؤں راہپواہ کی نصف بسویداری مولانا محمد داؤد راز کے خاندان پر منقسم ہے۔

اس گاؤں کے لوگ تقریباً دوسوسال پیشتر ایک بزرگ احمد خاں پٹواری کی وساطت سے اہل حدیثیت سے آشنا ہوئے تھے جو قصبہ پہاڑی ضلع بھرت پور میں ملازم تھے اور خود احمد خاں صاحب نے قاضی رحیم الدین سکنہ پہاڑی کی تبلیغ وترغیب سے مسلکِ عمل بالحدیث اختیار کیا تھا۔ ❶

❶ تراجم علمائے اہل حدیث میوات از مولانا محمد اسرائیل سلفی ندوی ص ۱۳۸۔

Marfat.com

محمد داؤد راز نے قرآن مجید اور پرائمری تک تعلیم اپنے گاؤں سے قریب کے قصبے پنگواں میں پائی۔ اس کے بعد دینیات کی تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا تو دہلی چلے گئے۔ وہاں برصغیر کے اہل حدیث کی مشہور شخصیت حافظ احمد اللہ صاحب کے جاری کردہ مدرسہ حمیدیہ میں داخلہ لیا اور اس مدرسے کے اساتذہ سے اردو کی چند کتابیں پڑھیں جو دینی مسائل پر مشتمل تھیں، نیز صرف ونحو اور دیگر فنون سے متعلق کتابوں کی تکمیل کی۔ حدیث کی ابتدائی کتاب ''بلوغ المرام'' بھی اسی مدرسے میں پڑھی۔

حافظ حمید اللہ مرحوم ومغفور اپنے عہد کے صاحب جود وسخا بزرگ تھے۔ ان کی مالی اعانت سے دہلی شہر اور مختلف مقامات میں کئی مسجدیں تعمیر ہوئیں، متعدد دینی مدارس جاری ہوئے۔ بہت سی کتابیں شائع ہوئیں، جن میں قرآن وحدیث کے احکام بیان کیے گئے تھے۔ اہل حدیث علمائے کرام کے حالات پر مشتمل بعض کتابوں کی اشاعت بھی ان کے مالی تعاون سے ہوئی۔ وہ بعض مدارس کے مدرسین کی اپنی جیب خاص سے ماہانہ امداد کرتے تھے۔ وہ کھلے دل اور کھلے ہاتھ کے بزرگ تھے۔ ان کے فرزند گرامی حافظ محمد یحییٰ صاحب بھی والد مکرم کی طرح جماعتی معاملات میں نہایت وسعت قلب سے کام لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حافظ حمید اللہ صاحب کو جنت الفردوس عطا فرمائے اور حافظ محمد یحییٰ صاحب کی خیر وصلاح کے ساتھ زندگی دراز فرمائے۔

ان دنوں دہلی کے صدر بازار میں مدرسہ دار الکتاب والسنہ بھی جاری تھا، جس کے بانی حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب تھے۔ اس مدرسے کی تدریسی حلقوں میں بڑی شہرت تھی۔ محمد داؤد راز اس مدرسے میں داخل ہو گئے اور اس کے اساتذہ سے انھوں نے خوب استفادہ کیا۔ بقول ان کے ''اساتذہ کرام کی فہرست میں جناب میاں جی عبداللہ صاحب میواتی، جناب مولانا محمد سلیمان صاحب بنگالی لال گولہ والے، حضرت مولانا احمد صاحب ملتانی مہاجر مدنی، حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب صدری ملتانی، مولانا حافظ عنایت اللہ صاحب وزیر آبادی، مولانا عبدالجلیل صاحب مدیر صحیفہ اہل حدیث، حضرت مولانا ابو محمد عبدالجبار صاحب کھنڈیلوی، مولانا عبدالجبار صاحب سوکھپوری میواتی، مولانا عبداللطیف صاحب دہلوی قابل ذکر ہیں۔'' [1]

سننِ اربعہ انھوں نے حافظ عنایت اللہ وزیر آبادی اور مولانا عبدالجبار سوکھپوری سے پڑھیں اور صحیحین کا درس مولانا عبدالوہاب سے لیا اور سند فراغت حاصل کی۔

مولانا تحریر فرماتے ہیں:

''سن شعور ہی سے بفضل تعالیٰ مشاہیر علمائے جماعت سے حسنِ ظن رہا۔ اسی بنا پر حضرت مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری، حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی، حضرت مولانا محمد صاحب

[1] مقدمہ قرآن مجید ثنائی ترجمہ۔ ص ۳ (حاشیہ)

Marfat.com

دہلوی، حضرت مولانا ابوالقاسم صاحب سیف بنارسی، حضرت مولانا حافظ عبداللہ صاحب روپڑی، حضرت مولانا احمد اللہ صاحب شیخ الحدیث دہلوی، حضرت مولانا عبیدالرحمٰن صاحب عمرپوری دہلوی وغیرھم کی تقریری مجالسِ حسنہ میں شرکت کے علاوہ ان افاضل اسلام کے اسلامی لٹریچر کا بڑی قدر ومنزلت کے ساتھ مطالعہ کا شرف حاصل ہوتا رہا۔'' ❶

مولانا محمد داؤد راز نے حضرت مولانا شرف الدین دہلوی سے بھی کسب علم کیا اور سند حدیث لی، ۱۹۴۲ء میں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان دیا اور ڈگری حاصل کی۔ اس وقت فارسی کے فاضل کو منشی فاضل کہا جاتا تھا۔

آخری سندالاجازہ کے متعلق فرماتے ہیں:

''حضرت المحدث مولانا عبدالحق صاحب ہاشمی بہاول پوری مرحوم سے مکۃ المکرّمہ میں بیت اللہ شریف کے سامنے حاصل کی گئی۔'' ❷

تعلیم سے فارغ ہو کر مولانا محمد داؤد راز اپنے گاؤں رہپواہ آ گئے۔ اس وقت ان کے استاذ مولانا عبدالجبار سوکھپوری نے دہلی سے واپس آ کر علاقہ میوات کے سرکردہ لوگوں سے مشورے کے بعد اپنے آبائی مسکن سوکھپور میں ''مدرسہ اشاعت القرآن والحدیث'' کے نام سے ایک مدرسہ جاری کر رکھا تھا۔ انھوں نے مولانا راز صاحب کو بھی وہیں بلا لیا۔ میوات کے مشہور عالم دین حکیم عبدالحکیم شکراوی اس مدرسے کے سرپرست تھے۔ لیکن حالات ایسے پیدا ہوئے کہ یہ مدرسہ ختم ہو گیا اور اس کے بعد مولانا محمد داؤد راز کا کاروانِ زندگی مختلف مراحل سے گزرا۔

اسی اثنا میں ملک تقسیم ہو گیا اور بہت سے مدارس ختم ہو گئے، کافی تعداد میں لوگ پاکستان آ گئے اور جماعت اہل حدیث مومن پورہ بمبئی کی دعوت پر مولانا راز بمبئی چلے گئے۔ وہ بہت اچھے خطیب تھے اور تصنیف وتالیف کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ بمبئی جا کر ان کی صلاحیتیں اجاگر ہوئیں اور اللہ نے ان کو بہت سے کام کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اب حالات بدل چکے تھے۔ ملک آزاد ہو گیا اور حکمرانی کی نئی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ اس میں تقریر کا انداز بھی بدل گیا اور تحریر میں بھی تغیر رونما ہو گیا۔ نئے حالات میں مولانا ممدوح نے بمبئی میں مثبت انداز میں بہت کام کیا۔ انھوں نے وہاں جو تصنیفی کام کیا۔ اس کی تفصیل آئندہ سطور میں ان کے تصنیفی کارناموں میں آئے گی، لیکن ان کی خطابتی تگ ودو کے متعلق مولانا مختار احمد ندوی کے الفاظ قابل

❶ مقدمہ قرآن مجید ثنائی ترجمہ۔ ص۳۔ (حاشیہ)
❷ تراجم علمائے اہل حدیث از مولانا محمد اسرائیل سلفی ندوی۔ ص۱۴۲

Marfat.com

ملاحظہ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا محمد داؤد راز نے مسجد اہل حدیث مومن پورہ کے منبر سے شہر (بمبئی) اور (اس کے) مضافات کو توحید وسنت کا جو انقلاب آفریں پیغام دیا، اسے تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔'' ❶

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک گیارہ سال مولانا محمد داؤد کا قیام بمبئی میں رہا۔ اس کے بعد ان کے گھریلو حالات کچھ ایسے ہوگئے کہ انھیں بمبئی کی سکونت ترک کر کے دہلی آنا پڑا جو ان کے وطن میوات سے بالکل قریب ہے۔ دہلی میں انھوں نے اجمیری دروازہ کی مسجد اہل حدیث کو اپنا ٹھکانا بنایا اور تندہی سے قلمی کام میں مشغول ہوگئے۔ یہاں انھوں نے جو قلمی خدمات انجام دیں، ان کا تذکرہ ان کی تصنیفی سرگرمیوں میں بیان ہوگا۔

مولانا ممدوح کا مطالعہ وسیع تھا اور انھیں کام کرنے کی لگن تھی۔ وہ تحریری صورت میں بھی اپنے آپ کو مصروف رکھتے تھے اور تقریر وخطابت میں بھی ان کا ایک مقام تھا۔ انھوں نے مختلف اوقات میں مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے مبلغ کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں اور اس کے بعض مناصب پر فائز ہو کر بھی ان کی تنظیمی مساعی کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ مخلص ترین کارکن اور اونچے درجے کے مترجم ومحقق تھے۔ ہر کام محنت اور خوش دلی سے کرتے تھے۔

وہ بمبئی چھوڑ کر دہلی تشریف لائے تو ہر سال رمضان المبارک کا مہینا جماعت اہل حدیث بنگلور کی درخواست پر بنگلور میں گزارتے تھے۔ وہاں روزانہ نماز فجر کے بعد قرآن مجید کا درس دیتے اور نمازِ تراویح کے بعد درسِ حدیث۔ یہ عمل انھوں نے وفات تک باقاعدگی سے جاری رکھا۔

اب آتے ہیں اس مردِ جلیل کے سلسلۂ تصنیف وتالیف کی طرف۔!

۱۔ ان کا ایک نہایت اہم کام جو قیام بمبئی کے زمانے میں تکمیل کو پہنچا، وہ حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری کے ثنائی ترجمے والا قرآن مجید ہے، جس کی اشاعت مولانا محمد داؤد راز کی کوشش سے بمبئی میں ہوئی، اس کے متعدد ایڈیشن چھپے اور برصغیر کے بے شمار لوگ اس سے مستفید ہوئے۔

۲۔ ثنائی ترجمہ والا بارہ سورہ شریف

۳۔ بمبئی کے زمانہ قیام ہی میں ''فتاویٰ ثنائیہ'' کی ترتیب عمل میں آئی۔ مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری نے ۱۹۰۳ء میں امرتسر سے ہفت روزہ اخبار ''اہل حدیث'' جاری کیا تھا جو اگست ۱۹۴۷ء تک چوالیس سال

---

❶ تراجم علمائے اہل حدیث میوات ص ۱۵۱۔

Marfat.com

(۴۴) جاری رہا۔ اس میں ان کے فتوے بھی جو بالعموم بہت مختصر ہوتے تھے، چھپا کرتے تھے۔ فتوے کے سلسلے میں ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ لوگ ہم سے مسئلہ پوچھتے ہیں جس کا چند الفاظ میں جواب دینا چاہیے تاکہ اسے یاد رہے۔ یہ بے شمار فتوے تھے جو اہل حدیث کے ہر شمارے میں چھپتے تھے۔ مولانا محمد داؤد راز نے چوالیس سال کے اخبار ''اہل حدیث'' جمع کیے اور ان میں سے موضوع وار مولانا امرتسری کے فتوے ترتیب دیے جو دو ضخیم جلدوں میں معرضِ اشاعت میں آئے۔ یہ بے حد محنت طلب کام تھا جو مولانا مرحوم نے انجام دیا۔ بعض ایسے استفتا بھی تھے، جن کے جواب مولانا راز کے نزدیک تفصیل سے دینا چاہئیں تھے۔ لیکن مولانا امرتسری نے ان کے مختصر الفاظ میں جواب دیے تھے، ترتیب کے وقت انھوں نے حضرت مولانا شرف الدین دہلوی اور بعض دیگر علمائے کرام سے وہ جواب تفصیل سے لکھوائے۔ یہ کام بہت اہم اور بہت محنت کا متقاضی تھا۔ اللہ تعالیٰ مولانا راز کو جزائے خیر سے نوازے کہ انھوں نے دو جلدوں میں فتاوے مرتب کیے، اپنی نگرانی میں ان کی کتابت کرائی اور ان کی طباعت کا اہتمام کیا۔ ثنائی ترجمے والے قرآن مجید کی طرح ''فتاویٰ ثنائیہ'' کی اشاعت بھی بمبئی سے ہوئی۔ ❶

۴۔ بمبئی سے ۱۹۵۸ء میں مولانا محمد داؤد راز دہلی آئے اور اجمیری دروازہ والی مسجد اہل حدیث میں قیام پذیر ہوئے۔ یہاں انھوں نے صحیح بخاری کا اردو ترجمہ مع ضروری تشریح کے شروع کیا۔ وہ یہ کام رات کو بارہ بجے کے بعد نماز فجر تک کرتے تھے۔ سفر و حضر میں بھی انھوں نے یہ کام جاری رکھا۔ بعض اوقات تبلیغی دورے پر ٹرین میں جا رہے ہوتے تو اس میں بھی شرح بخاری کی تسوید میں مصروف ہوتے۔ پہلے پارے سے تیسویں پارے تک ترجمہ وتشریح کا کام مکمل کیا اور اللہ کی مہربانی سے اس کی اشاعت کا مرحلہ بھی حسن وخوبی سے طے ہو گیا۔ صحیح بخاری کے اس ترجمہ وتشریح کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور لوگوں نے اس سے بہت استفادہ کیا۔ ❷

❶ شیخ الاسلام حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کے فتاویٰ کا یہ مجموعہ پاکستان میں حضرت علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ اور ہمارے والد محترم مولانا عبدالخالق قدوسی رحمہ اللہ نے مل کر شائع کیا۔ اس کے علاوہ شیخ الکل فی الکل کے فتاویٰ نذیریہ بھی شائع کیے۔ برسوں بعد کچھ لوگوں نے انہی نسخوں کی فوٹو سٹیٹ کروا کر طبع کی۔ (عمر فاروق قدوسی)

❷ صحیح بخاری کا یہ نسخہ طباعت کے اعتبار سے خاصا کمزور تھا۔ مولانا راز مرحوم نے اسے تیس پاروں میں تقسیم کیا تھا۔ بعض اجزاء کی کتابت بہت عمدہ اور بعض کی بے حد خراب۔ کاغذ بھی بس گزارا ہی تھا۔ لیکن بہر حال مولانا راز مرحوم کا یہ کارنامہ تھا کہ اسباب کی عدم فراوانی کے باوجود انھوں نے ہمت سے کام لیا اور یہ عظیم سنگ میل عبور کیا۔ الحمد للہ سن ۲۰۰۰ء میں مکتبہ قدوسیہ نے مولانا کے اس نسخے کو عمدہ کمپوزنگ اور بے حد محنت سے تصحیح کرانے کے بعد اس کے شایان شان طبع کرایا۔ ہماری یہ کاوش بے حد پسند کی گئی۔ یہ محض اللہ رب العزت کا کرم تھا۔ الحمد للہ ہم نے یہ کام حدیث نبوی کی خدمت کے جذبے کے تحت کیا نہ کہ کاروباری منفعت کے پیش نگاہ۔ ہم نے کسی کی نقل نہیں، اپنا نسخہ تیار کرایا تھا۔ (عمر فاروق قدوسی)

Marfat.com

۵۔ اس کے بعد مولانا ممدوح صحیح بخاری کی طرح صحیح مسلم کے ترجمے کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس کی ایک جلد کا ترجمہ تشریح سمیت چھپ گیا۔ دوسری اور تیسری جلدیں مکمل کر کے پریس کو دیں لیکن چھپ نہ سکیں۔ معلوم نہیں صحیح مسلم کا ترجمہ وتشریح کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سب کچھ ضائع ہوگیا۔ مولانا ممدوح پوری صحاح ستہ کا اسی تشریحی انداز سے ترجمہ کرنا چاہتے تھے، لیکن ایسا نہ ہوسکا اور وہ اپنا یہ اہم ترین منصوبہ دل ہی میں لے کر اللہ کے دربار میں پہنچ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.

۶۔ خالص اسلام: یہ کتاب منکرین حدیث کے اعتراضات کے جوابات پر مشتمل ہے۔

۷۔ حج بیت اللہ شریف: اس کتاب میں حج بیت اللہ کا مسنون طریقہ بھی بتایا گیا ہے اور مکہ شریف کی تاریخ، عرب کے تاریخی ومقدس مقامات کا تذکرہ اور ان کے نقشے بھی درج ہیں۔

۸۔ مقدس مجموعہ: تین سو سے زائد پاکیزہ دعاؤں کا مجموعہ۔

۹۔ تحریک جماعت اسلامی اور مسلک اہل حدیث۔

۱۰۔ تحریک اسلامی کا پس منظر۔

۱۱۔ حقائق مودودیت۔

۱۲۔ اربابِ دیوبند اور اہل حدیث۔

۱۳۔ خطبات نبوی۔

۱۴۔ حیات ثنائی: حضرت مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری کے سوانح حیات۔

۱۵۔ اصلاح المسلمین: یہ منظوم کتاب ہے، جس میں ہندوستانی رواج ورسوم کی بالعموم اور علاقہ میوات کی رسوم کی بالخصوص برائی بیان کی گئی ہے۔

۱۶۔ پیام زندگی: اصلاحی نظموں کا مجموعہ۔

۱۷۔ سلسلہ نور الایمان کے اردو قاعدہ سے لے کر پانچویں جماعت تک۔

۱۸۔ چمن اسلام کا پانچواں حصہ۔

۱۹۔ فتاویٰ نذیریہ کے عربی اور فارسی فتاویٰ کا اردو ترجمہ۔

ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے جماعت اہل حدیث کے مختلف اخبارات میں متعدد موضوعات پر بہت سے مضامین لکھے۔

Marfat.com

مولانا محمد داؤد راز اپنے عہد کے ممتاز مصنف، نامور مقالہ نگار، شیریں بیان خطیب اور اچھے شاعر تھے۔ عالی اخلاق، نرم مزاج، سادگی پسند اور خوش اطوار۔ بہت اچھی مالی حالت ہونے کے باوجود خاکسارانہ ذہن اور ہم دردانہ اسلوبِ کلام۔

مولانا ممدوح نے تین حج کیے، پہلا ۱۹۵۱ء میں۔ دوسرا ۱۹۶۳ء میں اور تیسرا ۱۹۷۰ء میں۔

اب ان کا آخری دور اور وفات۔

زندگی کے آخری دور میں گھٹنوں میں درد کا عارضہ لاحق ہوگیا تھا۔عرق النسا کی شکایت بھی تھی۔ اعصابی کمزوری بڑھ گئی تھی۔ آخر میں فالج کا حملہ ہوگیا تھا۔ علاج کرایا، مگر افاقہ نہ ہوا، پھر وہ وقت آ گیا جو ہر شخص پر آتا ہے۔ بدھ کے روز بہ وقت ظہر ۲۔ دسمبر ۱۹۸۱ء (۳۔صفر ۱۴۰۲ھ) کو راہیٔ ملکِ بقا ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.

نمازِ جنازہ عشاء کے وقت شیخ الحدیث مولانا عبدالجبار نے پڑھائی، جس میں لوگوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ

ان کی وفات پر تقریباً چونتیس (۳۴) سال کی مدت بیت چکی ہے۔ مولانا محمد اسرائیل ندوی سلفی مصنف ''تذکرہ علمائے اہل حدیث'' (میوات) کے مطابق وفات کے وقت انھوں نے نرینہ اولاد تین بیٹے چھوڑے۔ خلیل احمد، نذیر احمد، سعید احمد، بیٹیاں اور پوتے پوتیاں بھی اللہ کے فضل سے موجود ہیں۔'' مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا علمی و دینی سلسلہ اولاد سے نہیں بلکہ شاگردوں سے چلے گا۔''

مولانا کی وفات پر جو تاریخی قطعات کہے گئے، وہ بھی ملاحظہ فرمایے:

پہلا قطعہ

مولانا راز دین کے ناصح چلے گئے — کر کے نبی کے علم کو واضح چلے گئے
ملت کے ہائے مشفق و ناصح چلے گئے — علم رسولِ پاک شارح چلے گئے
ہائے ایسا کوئی مناظر نہیں ہے آج — میدانِ دینِ حق کے فاتح چلے گئے
تاریخِ انتقال ہے کیا خوب اے کلیم — داؤد راز واعظ وصالح چلے گئے
(۱۴۰۲ھ)

Marfat.com

دوسرا قطعہ

گئے داؤد مولانا بھی اس پاک بستی میں
جہاں ہوتی ہے اہل علم وفن پر بارش رحمت
کلیم ایسی صدا دیتا ہے کوئی غم گساروں کو
بفضل رب مکاں اب ہے جناب راز کا جنت

(۱۴۰۲ھ)

(از کلیم مشوقی مالیگاؤں)

تیسرا قطعہ

عبرت کدہ ہے فلسفہٗ و شاہد و شہود بھی
ہست ہے جو آج کل ہو جائے گا نابود بھی
کون جانے کب کہاں آ کر ملے کس سے قضا
حضرتِ شارح بخاری چل دیا داؤد بھی

(۱۴۰۲ھ)

(از ڈاکٹر محمد عیسیٰ خان انیس)

❀❀❀❀

Marfat.com

قاری عبدالحکم کرم الجلیلی

(وفات ۷- ستمبر ۱۹۹۳ء)

صوبہ پنجاب کے ضلع جھنگ کے ایک بزرگ مولانا عبدالجلیل خاں تھے جو بلوچ برادری کے فرد تھے۔ انھوں نے دہلی جا کر مولانا عبدالوہاب مرحوم سے تعلیم حاصل کی اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ ان کے استاذِ محترم مولانا عبدالوہاب صاحب نے ان کو اپنے جریدہ ''صحیفہ اہل حدیث'' کا ایڈیٹر مقرر کر دیا تھا اور وہ تمام زندگی یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اس کے ساتھ انھیں مدرسہ دارالکتاب والسنہ کی مسند درس پر بھی فائز کیا گیا اور ان سے بہت سے طلباے علوم دینیہ نے فیض پایا۔

مولانا عبدالجلیل خاں کی نرینہ اولاد دو بیٹے تھے۔ عبدالحکم اور عبدالحکیم۔ ان سطور میں عبدالحکم کے بارے میں چند باتیں عرض کرنا مقصود ہے۔

عبدالحکم ۲۔ مئی ۱۹۲۶ء (۱۸ شوال ۱۳۴۴ھ) کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہاں کے ایک ہائی سکول سے میٹرک پاس کیا اور وہیں کے مدرسہ دارالکتاب والسنہ، مدرسہ صدیقیہ اور مدرسہ فتح پوری سے دینی علوم کی مروجہ کتابیں پڑھیں۔ اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان تقسیم ہوا تو اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان آ گئے اور کراچی کو اپنا مسکن بنایا۔ کراچی کے مدرسہ عربیہ اسلامیہ (واقع برنس روڈ) میں تعلیم مکمل کی اور سند فراغ لی۔ اساتذہ کی فہرست میں مولانا حافظ عبدالستار دہلوی، مولانا محمد ادریس، مولانا ظل الرحمٰن، مولانا محمد صدیق اور ان کے والد گرامی مولانا عبدالجلیل خاں شامل ہیں۔ ایک بزرگ میاں نذیر احمد سے قرآن مجید حفظ کیا اور قاری حامد حسن سے قراءت و تجوید کا فن سیکھا اور پھر انھیں قاری عبدالحکم کہا جانے لگا۔

علوم متداولہ سے فراغت پائی تو درس و تدریس اور وعظ و تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا۔ والد محترم کی وفات کے بعد ''صحیفہ اہل حدیث'' کی زمام ادارت انہی کے سپرد ہوئی۔ ان کی تلاوت قرآن کی بڑی شہرت تھی اور آواز کی حلاوت لوگوں کے لیے بے حد جاذبیت کا باعث تھی۔

کراچی کی جامعہ ستاریہ اسلامیہ کی مسجد ابن تیمیہ میں نماز تراویح پڑھانے کا آغاز انہی نے کیا اور پھر کئی سال یہ سلسلہ جاری رہا۔ کراچی کے مختلف علاقوں سے لوگ اس مسجد میں آتے اور قاری صاحب ممدوح کی اقتدا میں نماز تراویح پڑھتے۔

Marfat.com

پنجاب کا شہر قصور کراچی سے کم و بیش ایک ہزار کلو میٹر کی مسافت پر ہوگا۔ اس شہر میں اہل حدیث کی پہلی اور قدیم مسجد کا نام مسجد فریدیہ ہے۔ قاری صاحب کی شہرتِ تلاوتِ قرآن کراچی سے نکل کر قصور کی اس مسجد کے نمازیوں تک پہنچی تو ان میں سے کچھ لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اصرار کر کے رمضان المبارک میں انھیں قصور لے آئے۔ وہاں کے لوگوں نے ان سے قرآن سنا تو اس قدر متاثر ہوئے کہ انھیں نماز تراویح کی مستقل امامت کی پیش کش کی اور عرض کیا کہ وہ انھیں نماز تراویح پڑھانے کے لیے ہر رمضان یہاں تشریف لایا کریں۔ چنانچہ وہ اتنا طویل سفر کر کے کئی سال وہاں جاتے اور نماز تراویح پڑھاتے رہے۔

وہ مسلسل پندرہ سال فیصل آباد کے محلہ محمد پورہ کی مسجد مبارک اہل حدیث میں بھی نماز تراویح کی امامت فرماتے رہے۔ اس مسجد کے خطیب وہاں کے نامور عالم مولانا محمد طیب معاذ ہیں۔

غرض قاری عبدالحکم کرم الجلیلی قراءت و تجوید میں بھی مہارت رکھتے تھے، وعظ و خطابت میں بھی انھیں شہرت حاصل تھی اور دینی صحافت میں بھی ان کا قلم اپنے اندر خاص توانائی رکھتا تھا اور وہ جراءت کے ساتھ کتاب و سنت کی روشنی میں اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرتے تھے۔ درس و تدریس میں بھی ان کا مقام بلند تھا۔ انھوں نے طلباء کو کتب تفسیر و حدیث بھی پڑھائیں، صرف و نحو، عربی ادبیات، بیان و معانی، فقہ و کلام اور منطق و فلسفہ کی نصابی کتابیں بھی وہ باقاعدگی سے پڑھاتے رہے۔ وہ خطِ نسخ اور خطِ نستعلیق کے بھی ماہر تھے۔ اپنے اخبار ''صحیفہ اہل حدیث'' کی کتابت وہ خود ہی کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اور بھی عربی، اردو کی بعض کتابوں کی کتابت کی۔ وہ فتاویٰ نویس بھی تھے، لوگ ان سے جو مسائل پوچھتے ان کا قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب دیتے اور یہ فتوے ان کے اخبار ''صحیفہ اہل حدیث'' میں شائع کیے جاتے تھے۔ کراچی کی ایک مسجد میں ان کے والد مکرم مولانا عبدالجلیل خاں خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد خطابت کی ذمہ داری انھوں نے سنبھالی اور مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

مولانا حافظ عبدالستار دہلوی نے ''نصرۃ الباری'' کے نام سے صحیح بخاری کی شرح لکھنا شروع کی تھی۔ ان کی وفات کے بعد یہ اہم خدمت انہی قاری عبدالحکم کے سپرد ہوئی۔ انھوں نے سولہ پاروں کی شرح تحریر فرمائی تھی کہ انتقال کر گئے۔

ان پر فالج کا حملہ ہوگیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ مدرسے تشریف لاتے اور طلبا کو باقاعدہ پڑھاتے رہے۔ بے شمار علما و طلبا نے ان کے حضور زانوے شاگردی تہ کیے اور علم کی دولت سے بہرہ ور ہوئے۔ ان خوش بخت حضرات میں مولانا عبدالعزیز نورستانی، مولانا محمد الیاس سلفی، مولانا ثناء اللہ ڈیروی، مولانا محمود احمد حسن، مولانا عبدالوارث بنگالی اور ہمارے دوست رانا شفیق خاں پسروری اور رانا محمد خلیق خاں پسروری

Marfat.com

شامل ہیں۔

یہ جید عالم دین ۶۷ برس چار ماہ کی عمر پا کر ۷۔ ستمبر ۱۹۹۳ء (۲۹۔ ربیع الاول ۱۴۱۵ھ) کو اس جہان ناپائدار سے سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔

انا لله و انا اليه راجعون

اللهم اغفرله و ارحمه و عافه و اعف عنه

یہ سطور ۲۸۔ مارچ ۲۰۱۳ء کو سپردِ قلم کی گئیں۔ میں ''صحیفہ اہل حدیث'' میں ان کی تحریروں کا مطالعہ کرتا رہا ہوں، لیکن افسوس ہے کہ ان سے ملاقات نہیں ہو سکی اور بھی بے شمار علمائے دین اور بزرگانِ عالی مقام ہیں جو ہمارے آس پاس ہی مقیم ہیں، لیکن ان کو سلام کرنے اور ان کی مجلس میں حاضر ہونے کا موقع نہیں ملا۔

❀❀❀❀

Marfat.com

حکیم محمد حنیف امرتسری

(وفات ۵۔ مئی ۱۹۹۴ء)

امرتسر شہر اور ضلع میں بے شمار علمائے کرام پیدا ہوئے اور انھوں نے بے حد دینی خدمات سرانجام دیں۔ ان میں سے لاتعداد لوگ تقسیم ملک کے بعد پاکستان آئے اور مختلف مقامات میں سکونت پذیر ہوئے۔ یہاں بھی ان کی علمی اور دینی سرگرمیاں جاری رہیں۔ جن سے باشندگانِ ملک فیض یاب ہوئے۔

ان حضرات میں ایک عالم دین حکیم محمد حنیف تھے۔ جن کی ولادت ۱۹۲۳ء میں ضلع امرتسر کے ایک گاؤں میں موضع کرل گڑھ میں ہوئی۔ والد کا نام چودھری منگے خاں تھا جو اس نواح کے معروف طبیب بھی تھے اور زمیندار بھی۔

محمد حنیف کچھ بڑے ہوئے تو مقامی پرائمری سکول میں داخل کرادیے گئے۔ سکول میں ان کے ٹیچروں میں سے ایک ٹیچر سکھ مذہب سے تعلق رکھتے تھے جو اپنے شاگرد پر بڑی شفقت کا اظہار کرتے تھے۔ کرل گڑھ کے قریب ہی موضع ویرووالی تھا جہاں مولانا عبداللہ صاحب کا سلسلہ تدریس جاری تھا اور سکھ ٹیچر مولانا ممدوح کے علم وفضل اور تدین وتقویٰ سے متاثر تھے۔ محمد حنیف نے پرائمری پاس کی تو وہ سکھ ٹیچر اپنے اس شاگرد کو مولانا عبداللہ کی خدمت میں ویرووال لے گئے اور انھیں ان کے مدرسے میں داخل کرادیا۔ مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف بھی اسی مدرسے میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔

محمد حنیف کا تعلق پیر پرست گھرانے سے تھا اور ان کے والد چودھری منگے خاں امرتسر کے ایک پیر کے مرید تھے، لیکن محمد حنیف پیری مریدی کے سخت مخالف تھے۔ مولانا عبداللہ ویرووالوی کے حلقۂ تلمذ میں رہنے اور قرآن وحدیث کی تعلیم کے باعث توحید ان کے ذہن میں راسخ ہوگئی تھی۔ وہ طالب علمی ہی کے زمانے میں ان لوگوں سے باقاعدہ مباحثے کرنے لگے تھے جو بدعات کے مرتکب ہوتے اور پیری مریدی کو صحیح قرار دیتے تھے۔ انھوں نے اپنے والد کے پیر صاحب سے بھی عام لوگوں کی موجودگی میں مباحثہ کیا اور جس شخص کو منصف بنایا گیا تھا، اس نے ان کے حق میں فیصلہ دیا۔

درسِ نظامی کی تکمیل کے بعد محمد حنیف نے علمِ طب حاصل کیا اور ان کا شمار علما واطبا میں ہونے لگا۔ اسی اثنا میں ان کا تعلق حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی سے ہوا۔

Marfat.com

حکیم محمد حنیف کے بڑے بھائی چودھری محمد شفیع تھے۔ ان دونوں بھائیوں کے گاؤں کے سکھ نوجوانوں سے دوستانہ مراسم قائم تھے۔ تقسیم ملک کے زمانے میں ان مراسم کی وجہ سے عام مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ ان لوگوں نے نہایت امن کے ساتھ مسلمانوں کو وہاں سے نکلنے اور پاکستان میں آنے کے لیے مدد کی۔ پھر پاکستان آ کر حکیم محمد حنیف نے مولانا سید محمد داؤد غزنوی سے رابطہ قائم کیا اور مصیبت میں مبتلا لوگوں کی جس صورت میں امداد کر سکتے تھے، کی۔

لاہور سے وہ ضلع شیخوپورہ کے چک نمبر ۱۰ تھوتھیاں چلے گئے اور وہاں وعظ و تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا اور مسجد تعمیر کرائی۔ بعدازاں اس علاقے کے مرکزی مقام منڈی ڈھاباں سنگھ کا قصد کیا اور وہاں سکونت اختیار کی۔ پھر اشاعتِ دین اور توحید و سنت کی تبلیغ کے لیے اس کے قرب و جوار کے قصبات و دیہات (منڈی وار برٹن، مانگٹاں والا اور فیروز وٹواں وغیرہ) میں ان کی آمدورفت شروع ہوئی۔ اس کارِ خیر کے لیے وہ ہمیشہ مستعد اور متحرک رہتے تھے۔ منڈی ڈھاباں سنگھ کو اب صفدر آباد کہا جاتا ہے۔

اسی دوران میں انھیں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابوں کے مطالعہ کا موقع ملا اور ان سے متاثر ہو کر مولانا سے ملے اور جماعت اسلامی میں شامل ہو گئے۔ کچھ عرصہ اس جماعت میں کام کیا، پھر بعض معاملات میں مولانا کے نقطۂ نظر سے اختلاف کی بنا پر مولانا امین احسن اصلاحی، حکیم عبدالرحیم اشرف، مولانا عبدالغفار حسن، ڈاکٹر اسرار احمد اور بعض دیگر ارکان جماعت سے علیحدہ ہوئے تو انھوں نے بھی علیحدگی اختیار کر لی۔

حکیم محمد حنیف امرتسری نے ۱۹۵۳ء کی تحریک تحفظِ ختم نبوت میں بھی حصہ لیا۔ منڈی ڈھاباں سنگھ (صفدر آباد) میں انھوں نے توحید و سنت کی بڑی تبلیغ کی۔ وہاں اہل حدیث کی کوئی مسجد نہ تھی۔ ان کی کوشش سے مسجد بنائی گئی تو مخالفین مقابلے پر اتر آئے، لیکن ناکام رہے۔ اب وہاں اللہ کے فضل سے اہل حدیث کی سات مسجدیں ہیں، جن میں جمعہ و جماعت کا سلسلہ جاری ہے اور طلبا و طالبات کی تعلیم کا بھی انتظام ہے۔ مسجدوں کا انتظام ادارہ تبلیغ القرآن والحدیث کے توسط سے چل رہا ہے جو حکیم محمد حنیف امرتسری مرحوم نے قائم کیا تھا۔ منڈی صفدر آباد کے قرب و جوار کے بعض دیہات میں بھی ان کی کوشش سے مسجدیں تعمیر ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی جرأت و استقامت سے نوازا تھا۔

۱۹۶۱ء میں حکیم صاحب حج بیت اللہ کے لیے گئے۔ حرم مکی میں انھیں انتظامیہ کی طرف سے وعظ اور درسِ قرآن کی اجازت دی گئی۔ وہاں ان کی ملاقاتیں شیخ عبدالعزیز بن باز اور بعض دیگر شیوخ سے ہوئیں۔ وعظ و تبلیغ کے بارے میں یہ ملاقاتیں بہت مفید ثابت ہوئیں۔

۱۹۸۵ء میں انھوں نے اپنے اہل و عیال کے ساتھ حج کیا۔ پھر ۱۹۸۸ء میں ان کو حج میڈیکل مشن میں

Marfat.com

شامل کیا اور وہ مکہ اور مدینہ میں حجاج کی طبی خدمت کرتے رہے۔

حکیم محمد حنیف امرتسری کے فرزند حاجی کلیم الحسن بابر کے بقول ۱۹۸۲ء میں مذہبی خدمات کی بنا پر حکیم صاحب کو جنرل ضیاء الحق نے پاکستان کی مجلس شوریٰ کا رکن نامزد کیا تھا، لیکن انھوں نے اس منصب سے استعفا دے دیا۔ پھر ایک مرتبہ جنرل صاحب شیخوپورہ آئے تو ان سے حکیم صاحب کی ملاقات ہوئی اور انھوں نے مجلس شوریٰ کی رکنیت قبول کرنے کے لیے کہا لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔

حکیم صاحب خوش مزاج عالم تھے۔ منڈی صفدر آباد کے ایک شخص کو لوگ ہنسی مذاق میں ''شاہ جی'' کہا کرتے تھے۔ ایک سید خاندان کو رشتے کے لیے کسی سید کی تلاش تھی۔ انھیں کسی ذریعے سے صفدر آباد کے اس ''شاہ جی'' کا پتا چلا تو وہ ان کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے وہاں پہنچے اور حکیم صاحب سے ملے۔ ان سے پوچھا: کیا وہ واقعی شاہ صاحب (یعنی سید) ہیں۔ حکیم صاحب نے موسم کے مطابق ان کو چائے پانی پلایا۔ پھر فرمایا: میں آپ کو تو نہیں جانتا کہ آپ کون سے شاہ ہیں، لیکن جن شاہ صاحب کے متعلق آپ پوچھ رہے ہیں، سب کچھ جانتا ہوں۔ اس لیے کہ ہم نے خود ان کو ''شاہ جی'' بنایا ہے اور یہاں کے لوگ انھیں ''شاہ جی'' کہتے ہیں۔

یہ بات سن کر وہ مسکرائے اور حکیم صاحب کا شکریہ ادا کر چلے گئے۔

حکیم صاحب کو دل کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا، اسی عارضے سے انھوں نے ۵۔ مئی ۱۹۹۴ء کو وفات پائی۔ ان کی نماز جنازہ ان کے جانشین شاگرد حکیم محمد ابراہیم طارق نے پڑھائی۔ جس میں تمام مکاتبِ فکر کے ہزاروں افراد نے شرکت کی۔

حکیم صاحب مرحوم نے اپنے پس ماندگان میں ایک بیوہ، ایک بیٹی اور چار بیٹے چھوڑے۔ بیٹوں کے نام علی الترتیب یہ ہیں:

(۱) حکیم محمد سعید ناصر، (۲) محمد سلیم ساجد، (۳) حاجی کلیم الحسن بابر (۴) انس حنیف۔

(یہ سطور ۲۶۔ نومبر ۲۰۱۳ء کو لکھی گئیں ہیں)

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا معراج دین

(وفات ۲۔اگست ۱۹۹۷ء)

مولانا معراج دین کی ولادت ۱۸۹۴ء کے قریب قلعہ دیدار سنگھ (ضلع گوجراں والا) میں ہوئی۔ والد کا نام امام الدین تھا۔ یہ لوگ نجاری یعنی لکڑی کا کام کرتے تھے، ان میں سے بعض معمار بھی تھے جو لوگوں کے مکان تعمیر کرتے تھے۔ نجاری اور معماری دونوں کاموں میں ان کی شہرت تھی۔ قلعہ دیدار سنگھ میں مولانا معراج دین نے توحید کی تبلیغ اور قرآن وحدیث کے احکام بیان کرنا شروع کیے تو وہاں کے لوگوں کا اس طرف رجحان ہوا اور وہ دائرۂ اہل حدیث میں شامل ہونے لگے، اس سے قبل وہ اس مسلک سے آشنا نہ تھے۔

مولانا ممدوح اس نواح میں اپنے دور کے مشہور مناظر بھی تھے اور عبادت وزہد کی دولت سے بھی اللہ نے ان کو نوازا تھا۔ ان کی ایک تصویر میرے سامنے ہے جو شاید شناختی کارڈ کی ہوگی۔ طویل قامت، معتدل جسم، تیکھے نقوش، نکھرا ہوا گندمی رنگ، لمبی سفید داڑھی، کلے پر مشہدی دستار، آنکھوں پر عینک، جاذب نظر شخصیت کے مالک۔ سنا ہے عمر کے آخری دور میں قراقلی ٹوپی سر پر رکھتے تھے۔

ابھی عمر کی چند منزلیں طے کی تھیں کہ والدہ وفات پاگئیں اور والد نے دوسری شادی کرلی۔ ان کی دو بہنیں تھیں، ان میں سے ایک کی شادی ساہی وال میں ہوئی اور ایک کی قلعہ دیدار سنگھ میں۔ یہ دو تین مرتبہ اپنے والد (امام الدین) کے ساتھ پیدل ساہی وال گئے۔ بعد ازاں والد نے ساہی وال ہی میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ ایک بیٹی کے علاوہ ان کے بعض رشتے دار ساہی وال میں مقیم تھے۔ وہاں وہ نجاری کا کام کرتے تھے، جس میں انھیں مہارت حاصل تھی۔ معراج دین بھی والد کے ساتھ ساہی وال چلے گئے تھے۔

معراج دین کو بچپن ہی سے دینی علوم کے حصول کا شوق تھا، مگر سوتیلی ماں کو اس سے اختلاف تھا۔ انھیں مسجد سے جلدی چھٹی نہیں ہوتی تھی۔ وہ دیر سے آتے تھے جب کہ گھر کے افراد کھانے سے فارغ ہوجاتے تھے۔ ان کے لیے سالن وغیرہ گرم کرنا پڑتا تھا، جو سوتیلی ماں کے لیے مشکل کام تھا۔ آخر معراج دین نے ماں سے کہا: آپ میرا کھانا گرم نہ کیا کریں، میں مسجد سے آکر خود ہی گرم کرلیا کروں گا۔ یہ ساہی وال میں قیام کے زمانے کی بات ہے۔

یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ انھوں نے ساہی وال کی کس مسجد میں کون سی کتابیں پڑھیں اور کس سے پڑھیں۔

Marfat.com

صرف یہ پتا چل سکا ہے کہ وہاں انھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا اور والد سے نجاری کا کام سیکھا۔

ساہی وال میں مولانا معراج دین جس گلی میں سکونت پذیر تھے، اس میں ایک دن ایک قلعی گر کانسی کے برتنوں کو قلعی کرنے کے لیے آیا۔ وہ دہریہ تھا، اللہ کے وجود کو نہیں مانتا تھا، کہا کرتا تھا کہ یہ کائنات یوں ہی ظہور میں آگئی ہے، اس کا خالق کوئی نہیں ہے۔ ایک دن معراج دین اس کے پاس بیٹھے تھے۔ وہ ''گڑوی'' قلعی کر رہا تھا۔ معراج دین نے اس سے پوچھا: یہ گڑوی کس نے بنائی ہے، اس نے کہا کاری گر (ٹھٹھیار) نے۔ معراج دین نے کہا: اسے ٹھٹھیار (یا کسی کاری گر) نے نہیں بنایا، یہ خود ہی بن گئی ہے۔ اس نے کہا: خود کیسے بن سکتی ہے، اسے کاری گر نے بنایا ہے۔ یہ دیکھو اس پر ہتھوڑی کے نشان ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ اسے کسی نے بنایا ہے۔

معراج دین نے کہا: جب اتنا چھوٹا سا برتن کاری گر کے سوا نہیں بن سکتا، تو یہ اتنا بڑا آسمان، اتنی بڑی زمین، اتنے بلند پہاڑ اور بے شمار چیزیں خود بخود کیسے بن گئیں؟ وہ اس کا کوئی جواب نہ دے سکا تو لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ معراج دین نے جو کم عمر بچہ ہے، اسے شکست دے دی ہے۔

اس پر ان کے والد امام الدین بہت خوش ہوئے اور انھیں دینی تعلیم دلانے کا عزم کر لیا اور اللہ کی مہربانی سے انھوں نے تعلیم حاصل کی۔

بچپن ہی سے ان کی آواز سریلی تھی اور یہ خوش گلو تھے۔ پنجابی کی کئی نظمیں یاد کر لی تھیں۔ نظمیں ترنم سے پڑھتے تو لوگ شوق سے سنتے۔ پنجابی نظم کی ایک کتاب ''ردِ وہابیہ'' تھی جو انھیں زبانی یاد تھی۔ بریلوی حضرات ان سے یہ کتاب خاص طور پر سنتے اور داد دیتے۔ پھر انھوں نے حدیث وسنت کے موضوع کی چند اردو کتابیں پڑھیں تو اس قسم کی نظمیں پڑھنا ترک کر دیں اور مسلک توحید سے وابستگی اختیار کر لی۔

گوجراں والا کے چوک نیائیں میں جامع مسجد اہل حدیث مولانا معراج دین کے مکان کے قریب تھی، جس کے خطیب وامام اس وقت مولانا علاء الدین تھے۔ اس مسجد میں انھوں نے مدرسہ بھی جاری کر رکھا تھا اور چند مقامی اور بیرونی طلبا ان سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انسانی شکل میں جنات بھی ان کے حلقۂ شاگردی میں شامل تھے۔ مولانا علاء الدین نے حضرت مولانا غلام رسول (ساکن قلعہ میہاں سنگھ) سے بھی تعلیم حاصل کی تھی اور دہلی جا کر حضرت میاں سید نذیر حسین رحمہ اللہ سے بھی فیض یاب ہوئے تھے۔ مولانا علاء الدین نے ۶۔ستمبر ۱۹۲۱ء (۳۔محرم ۱۳۴۰ھ) کو بہ عمر ۹۸ سال گوجراں والا میں وفات پائی۔ [1]

---

[1] ان کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب ''تذکرہ مولانا غلام رسول قلعوی'' طبع اول (فروری ۲۰۱۲ء) ص ۳۲۱ تا ۳۲۵۔ نیز دیکھیے ''تذکرہ مولانا احمد الدین گکھڑوی'' طبع دوم (۲۰۱۵ء) ص ۲۹۸ تا ۳۰۰۔

Marfat.com

مولانا معراج دین کو تحصیل علم کا بہت شوق تھا۔ اس سلسلے کے دو واقعے قابل ذکر ہیں۔

ایک مرتبہ گھر سے نکلے اور لاہور آ گئے۔ ان دنوں رنگ محل کی سنہری مسجد میں دینی مدرسہ جاری تھا، وہ اس مدرسے میں داخل ہو گئے۔ نماز کا وقت ہوا تو رفع یدین کیا۔ استاذ اور طلبا نے انھیں یہ عمل کرتے دیکھا تو وہابی کہہ کر اسی وقت مسجد سے نکال دیا۔

یہ وہاں سے نکلے اور شیراں والا گیٹ میں حضرت مولانا احمد علی مرحوم کی مسجد میں چلے گئے۔ مولانا ممدوح مسلکی اعتبار سے فراخ حوصلہ تھے اور اہل حدیث طلبا کو بڑی شفقت سے تعلیم دیتے تھے۔ معراج دین مولانا موصوف کے طریق تعلیم و تربیت سے بہت متاثر تھے۔ خود فرماتے ہیں: ''میرا جی چاہتا تھا کہ ہر وقت حضرت استاذ کی خدمت میں حاضر رہوں اور ان سے فیض حاصل کروں۔'' مولانا بھی ان پر شفقت فرماتے تھے اور تعلیم کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک دن ایک شخص مولانا کے پاس آیا اور مسئلہ پوچھا کہ ''میں نے داڑھی کو مہندی لگائی ہے۔ اگر نماز کا وقت آ جائے تو کیا میں تیمّم کر کے نماز پڑھ سکتا ہوں؟'' مولانا نے فرمایا: ''تیمّم کر کے نماز پڑھ سکتے ہو۔''

معراج دین کہتے ہیں: ''میں نے عرض کیا حضرت! مہندی لگانا تو سنت ہے اور وضو کرنا فرض۔ کیا سنت کے لیے فرض کو ترک کیا جا سکتا ہے؟''

معراج دین اس بات پر وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں نے ناراضی کا اظہار کیا اور انھیں مدرسے سے نکال دیا گیا۔''

مولانا معراج دین کی اگرچہ پورا علم حاصل نہ کر سکے۔ تاہم چلتے پھرتے کافی کچھ حاصل کر لیا اور مناظر اور عالم کی حیثیت سے شہرت پائی۔ لیکن مدرس یا خطیب کے طور پر یا کہیں، تنخواہ دار کے طور پر خدمت انجام نہیں دی۔ وہ لوگوں کے نکاح بھی پڑھاتے تھے، اس کا کسی سے کوئی پیسا نہیں لیتے تھے۔ انھوں نے نجاری کا کام ساہی وال میں اپنے والد سے سیکھا تھا۔ پھر گوجراں والا میں مولانا محمد حنیف ندوی کے والد مکرم نور الدین سے سیکھا جو اس کام میں مہارت رکھتے تھے۔ بہت عرصے تک ان کا ذریعہ معاش یہی کام رہا۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کی خدمت میں وہ اکثر حاضری دیتے تھے۔ بیان کرتے ہیں: ''ایک دن میں مولانا اسماعیل صاحب کے درس میں حاضر تھا کہ مولانا نے فرمایا لوگ ذہین بچوں کو سرکاری سکولوں میں پڑھاتے ہیں اور کند ذہن بچوں کو مسجد میں بھیج دیتے ہیں۔''

پھر فرمایا: ''تمھارے استاذ نور الدین کا بیٹا محمد حنیف ذہین بچہ ہے، لیکن سکول میں پڑھتا ہے۔''

معراج دین کہتے ہیں: ''میں اسی وقت اپنے استاذ نور الدین کے پاس گیا اور انھیں مولانا سلفی کی بات سنا کر محمد حنیف کو دینی تعلیم دلانے پر آمادہ کیا اور پھر خود محمد حنیف کو مولانا اسماعیل صاحب کے پاس مدرسے

Marfat.com

میں چھوڑ کر آیا۔"

مولانا محمد حنیف ندوی نے مدارس کی پوری نصابی تعلیم مولانا محمد اسماعیل سلفی سے حاصل کی۔ ان کا شمار مولانا سلفی کے اولیں شاگردوں میں ہوتا ہے، وہ نہایت ذہین اور لائق طالب علم تھے۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی ہی نے ان کو دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) بھیجا تھا۔ مولانا ندوی کے والد گرامی پرہیزگار بزرگ تھے اور مولانا محمد اسماعیل صاحب کے عقیدت مند۔

مولانا معراج دین بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ لاہور کے علاقہ مزنگ میں مولانا محمد حنیف ندوی کے گھر ان سے ملاقات کے لیے گئے تو ان کی ابتدائی تعلیم کا واقعہ ان سے بیان کیا۔ مولانا نہایت احترام سے پیش آئے، چائے پلائی اور کافی دیر ان سے باتیں کرتے رہے۔

مولانا معراج دین ۱۹۱۴ء میں ساہی وال سے قلعہ دیدار سنگھ آئے تو ان کی عمر ۱۸ برس کی تھی۔ وہ اپنی بہن کے ساتھ رہتے تھے۔ بقول ان کے اس وقت وہاں صرف ایک شخص اہل حدیث تھا۔ وہ پوسٹ مین تھا اور اس کا نام تھا شیخ محمد دین۔ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا، لیکن بہت نیک شخص تھا۔ مولانا عبدالواحد غزنوی کا مرید تھا اور لوگوں کو کتاب وسنت پر عمل کی دعوت دیتا تھا، ہم مسلک ہونے کی وجہ سے معراج دین کا اس سے تعلق پیدا ہوگیا۔ دونوں کی تعلیم زیادہ نہ تھی لیکن دونوں نے تبلیغ دین کا کام بڑی محنت اور مستعدی سے کیا۔ بہت سے نوجوان ان کی تبلیغی جدوجہد سے متاثر ہوئے اور مسلک اہل حدیث قبول کیا۔

مولانا معراج دین نے جن حضرات سے استفادہ کیا ان میں ایک بزرگ مولانا احمد علی (ساکن اگوچک ضلع گوجراں والا) تھے۔ یہ دراصل مشرقی پنجاب کے ضلع فیروز پور سے تعلق رکھتے تھے اور تقسیم ملک کے بعد اگوچک چلے گئے تھے، جو قلعہ دیدار سنگھ کے قریب ہے۔ لکھوی علمائے کرام کے شاگرد تھے۔ باعمل عالم اور تہجد گزار تھے۔ گوجراں والا کی جامعہ اسلامیہ کے شیخ الحدیث مولانا فاروق احمد راشدی کے والد محترم تھے۔ مولانا محی الدین لکھوی اس نواح میں تشریف لاتے تو اگوچک بھی جاتے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مولانا معراج دین نے مولانا احمد علی (ساکن اگوچک) سے بھی تھوڑی بہت تحصیل علم کی۔

مولانا معراج دین نجاری کے کام کے ماہر تھے اور لوگ اپنے بچوں کو یہ کام سیکھنے کے لیے ان کے پاس بھیجتے تھے تو ان سے ازراہ مزاح کہا کرتے تھے کہ ہمارے بچوں کو کام سکھانا ہے، وہابی نہیں بنانا، یہ بھی اسی مزاحیہ انداز میں جواب دیتے کہ میں تو انھیں کام ہی سکھاؤں گا لیکن اگر یہ کام سیکھتے سیکھتے وہابی ہوگئے تو ان کی قسمت۔ بہرحال آہستہ آہستہ ان کی تبلیغ کا دائرہ پھیلتا گیا اور لوگ حلقہ اہل حدیثیت میں داخل ہوتے گئے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ان کی تعداد کو حیطۂ شمار میں لانا ممکن نہیں۔

Marfat.com

قلعہ دیدار سنگھ میں مولانا معراج دین کے شاگردوں میں ایک شاگرد کا نام چراغ دین تھا، انھیں مولانا چراغ دین نور پوری کہا جاتا تھا۔ وہ مولانا سے نجاری کا کام بھی سیکھتے تھے اور ان سے دینی کتابیں بھی پڑھتے تھے۔ علاوہ ازیں لوگوں کو کتاب وسنت پر عمل پیرا ہونے کی تاکید بھی کرتے تھے۔ وہ مولانا معراج دین کی دکان پر آتے تو اور لوگ بھی آجاتے اور مختلف مسائل پر گفتگو شروع ہو جاتی۔ اس گفتگو میں جو لوگ حصہ لیتے ان میں سے اکثر کا ذہن بدل جاتا اور وہ عامل بالحدیث ہو جاتے۔

ان حضرات پر ایسا وقت بھی آیا کہ انھیں وہابی کہہ کر مسجد سے نکال دیا جاتا۔ معراج دین اور محمد دین کو بڑی تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن انھوں نے تبلیغ کا سلسلہ ہر حال میں جاری رکھا اور مشکلات کا استقلال سے مقابلہ کیا۔

پھر ایک وقت آیا کہ مولانا معراج دین کے بہنوئی مستری حسن دین ان کے ہم نوا ہو گئے اور انھوں نے مسلک اہل حدیث قبول کر لیا۔ ان کا برادری میں بڑا اثر تھا اور اپنے قصبے (قلعہ دیدار سنگھ) میں بھی انھیں تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کی وجہ سے انھیں بڑی تقویت حاصل ہوئی اور ان کی آواز میں توانائی آئی۔

جب قلعہ دیدار سنگھ میں اہل حدیثیت کی دعوت پھیلی تو محلہ موری دروازہ میں دیوبندی حضرات کے اشتراک سے مسجد تعمیر کی گئی، لیکن تھوڑے عرصے بعد دیوبندی حضرات نے ہنگامہ بپا کر دیا اور اہل حدیث حضرات کو مسجد سے بے دخل کر دیا گیا۔ پھر ایک اور جگہ مسجد کی تعمیر کا آغاز ہوا تو وہاں بھی دیوبندی احباب نے جھگڑا شروع کر دیا اور فساد سے بچنے کے لیے اہل حدیث حضرات نے خاموشی اختیار کر لی۔

اس کے بعد مستری حسن دین کی کوشش سے ایک اور جگہ حاصل کی گئی تو وہاں ایک ہی رات میں مسجد تعمیر کر دی گئی اور اس میں فجر کی اذان دے کر نماز باجماعت ادا کی گئی۔ بعد ازاں ۱۹۲۶ء میں اس مسجد کی تعمیر نو کا فیصلہ ہوا تو حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کو دعوت دی گئی، وہ جو اس وقت لاہور میں مسجد چینیاں والی کے منصب امامت وخطابت پر فائز تھے، وہ تشریف لائے اور اپنے دستِ مبارک سے اس مسجد کا سنگ بنیاد رکھا۔ قلعہ دیدار سنگھ کی جماعت کی مالی حالت کمزور تھی، اس لیے حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی نے دہلی کے مخیّر بزرگ حافظ حمید اللہ مرحوم ومغفور کے پاس ایک شخص کو بھیجا اور انھوں نے پانچ سو روپے عنایت کیے جو اس انتہائی سستے زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔ حضرت مولانا غزنوی مرحوم نے کچھ اور لوگوں سے بھی تعاون کے لیے ارشاد فرمایا۔ کچھ مقامی جماعت کے ارکان نے امداد کی اور مسجد تعمیر ہو گئی۔ یہاں یہ یاد رہے کہ دہلی کے حافظ حمید اللہ صاحب ہندوستان کی موجودہ مرکزی جمعیت اہل حدیث کے امیر محترم حافظ محمد یحییٰ صاحب کے والد مکرم تھے۔ وہ بہت سخی اور مخیّر بزرگ تھے۔ انھوں نے اپنے زمانے میں دہلی اور ہندوستان کے مختلف

Marfat.com

علاقوں میں بے شمار مساجد تعمیر کرائیں اور بہت سے دینی مدارس کی مالی امداد کرتے رہے۔ اس قسم کے کاموں میں خرچ کرنے میں ان کا ہاتھ کشادہ اور دل کھلا تھا۔ ان کے علاوہ دہلی کے اور بھی متعدد سیٹھ تھے جو امور خیر میں فراخ حوصلگی سے حصہ لیتے تھے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ

قلعہ دیدار سنگھ کی اس مسجد کی موجودہ تعمیر ۱۹۵۷ء یا ۱۹۵۸ء میں ہوئی۔ شیخ محمد دین مرحوم کے اقارب میں سے شیخ محمد عبداللہ کی وساطت سے دس ہزار روپے وصول ہوئے تو دو منزلہ مسجد تعمیر ہوئی۔

مولانا معراج دین کے بارے میں چند اور باتیں!

☆ تبلیغ دین کو انھوں نے اپنے لیے عملاً لازم قرار دے لیا تھا۔ اس سلسلے میں بسا اوقات وہ اردگرد کے دیہات میں بھی جاتے، دیہات میں جمعہ بھی پڑھاتے۔ قلعہ دیدار سنگھ میں بچوں اور بچیوں اور بڑے عمر کے لوگوں کو ترجمہ قرآن بھی پڑھاتے، لیکن کسی سے ایک پیسا بھی نہ لیتے۔ نکاح بھی پڑھاتے، اگر اس خوشی کے موقعے پر کوئی کچھ دینا چاہتا تو فرماتے: میں تو نہیں لوں گا البتہ دینا ضروری ہے تو مسجد فنڈ میں دے دو، اس کی رسید دیتے اور مسجد فنڈ میں جمع کرادیتے۔ خود محنت کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتے۔ نجاری ان کا ذریعہ معاش تھا۔ البتہ ۱۹۴۷ء کے بعد اپنے شاگرد مولانا چراغ دین کے اشتراک سے قلعہ دیدار سنگھ کے مین بازار میں ہارڈ ویئر کی دکان کھول لی تھی۔ قرب وجوار کے دیہات میں رہنے والے اہل حدیث حضرات سے وہ باقاعدہ رابطہ رکھتے تھے۔

☆ ایک مرتبہ (غالباً ۱۹۸۰ء میں) اپنے عزیز مولانا عارف جاوید محمدی سے کہا کہ ایک شخص لدھے والا وڑائچ سے آیا ہے، ان کا خطیب وہاں نہیں ہے، میں خود کسی کام میں مصروف ہوں، آپ وہاں جائیں اور نماز جمعہ پڑھائیں۔ لیکن جمعہ پڑھانے کے بعد ان کے ہاں سے کھانا نہیں کھانا۔ چنانچہ عارف صاحب گئے اور جمعہ پڑھا کر واپس قلعہ دیدار سنگھ آگئے۔ مغرب کی نماز کے لیے مسجد میں گئے تو لدھے والا کا ایک شخص وہاں موجود تھا، اس نے مولانا معراج دین سے کہا کہ آپ کا آدمی جمعہ پڑھا کر اسی وقت وہاں سے واپس آگیا، ہم نے اس کے لیے کھانا تیار کیا تھا، اس نے کھانا نہیں کھایا۔ فرمایا: کوئی بات نہیں، وہ وہاں کھانا کھانے نہیں گیا تھا، جمعہ پڑھانے گیا تھا اور جمعہ پڑھا کر واپس آگیا۔

☆ مولانا ممدوح کے شاگردوں میں بچے بھی تھے، جوان بھی تھے اور بوڑھے بھی۔ وہ ہر شخص کو اس کے فہم کے مطابق مسئلہ سمجھانے کی کوشش کرتے۔ کوئی سوال کرتا تو بڑی نرمی سے اس کے سوال کا جواب دیتے، کسی معاملے میں کسی سے سختی کا برتاؤ نہ کرتے۔ نرم زبان اور سب کے خیر خواہ۔

☆ مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا اخبار ''اہل حدیث''

Marfat.com

(امرتسر) کا قاری رہا۔ قیام پاکستان کے بعد اخبار ''الاعتصام''، ''تنظیم اہل حدیث'' اور بعض دیگر اخبار منگواتے تھے۔ خود پڑھتے اور پھر مسجد میں منبر پر رکھ دیتے تا کہ دوسرے لوگ ان کا مطالعہ کر سکیں

☆ مولانا ممدوح نوجوانوں کو دینی کتابیں پڑھنے کا شوق دلاتے، دینیات کے موضوع کی کوئی نئی کتاب چھپتی اور ان کے علم میں آجاتی تو اسے خرید کر پڑھنے کی کوشش کرتے اور نوجوانوں کو اپنی کتابیں مطالعہ کے لیے دیتے اور فرماتے کہ مطالعہ کے بعد کتاب واپس کر دیں۔

☆ نماز فجر کے بعد گھڑی دیکھ کر بالالتزام روزانہ پندرہ منٹ قرآن مجید کا درس دیتے اور نمازی بڑے شوق اور دلچسپی سے ان کا درس سنتے۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ درس میں زیادہ وقت لگایا جائے تو لوگ اکتا جاتے ہیں اور درمیان میں اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ یہ قرآن کی بے ادبی ہے۔

☆ حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کا ذکر بڑی محبت اور احترام سے کیا کرتے تھے۔ ان کے علم اور حسن کے بہت مدّاح تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ان کی ہوش میں ضلع گوجرانوالا اور اس کے قرب وجوار میں ان دونوں حضرات نے جتنے مناظرے کیے، وہ ان سب میں شامل ہوئے۔

☆ مولانا احمد الدین گکھڑوی اور مولانا نور حسین گرجاکھی کے مناظروں کی باتیں بھی بڑے خوش گوار لہجے میں کیا کرتے تھے۔ مولانا احمد الدین گکھڑوی کے قلعہ دیدار سنگھ میں کچھ رشتے داری بھی تھے۔ وہ کبھی کبھی وہاں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اگر جمعے کا دن ہوتا تو خطبہ جمعہ وہی ارشاد فرماتے۔

☆ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی اور حضرت حافظ محمد گوندلوی سے مولانا معراج دین کے گہرے تعلقات تھے۔ حافظ صاحب کو وہ ''وڈے حافظ صاحب'' (بڑے حافظ صاحب) کہا کرتے تھے۔

☆ اپنے استاذ مولانا احمد علی (ساکن اگوچک) کے فرزند گرامی مولانا عارف احمد راشدی اور حضرت حافظ عبدالمنان نور پوری کا بڑا احترام کرتے تھے۔ حافظ عبدالمنان نور پوری کے علم وعمل کا ان پر بہت اثر تھا۔

☆ مولانا معراج دین کے شب وروز کے اوقات اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے، لوگوں کو دینی تعلیم دینے اور دینیات کی کتابوں کا مطالعہ کرنے میں گزرتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ رشتے داروں اور تعلق داروں سے ملاقات کے لیے ان کے گھروں میں بھی چلے جاتے تھے اور بیماروں کی مزاج پرسی کے لیے بھی تشریف لے جاتے۔

☆ مولانا عارف جاوید محمدی بیان کرتے ہیں کہ ۱۹۹۰ء میں جب عراق نے کویت پر حملہ کیا، مولانا ممدوح

Marfat.com

اس وقت کویت میں اپنے بیٹے ڈاکٹر محمد الیاس کے پاس تھے۔ سخت گرمی تھی، راستے غیر محفوظ تھے، سفر لمبا تھا، مولانا ممدوح کمزور بھی تھے اور طویل العمر بھی، اس لیے ڈاکٹر صاحب انھیں کویت سے پاکستان نہیں لا سکتے تھے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ جب تک حالات سازگار نہیں ہوتے، وہ کویت ہی میں رہیں گے۔ عارف جاوید صاحب بتاتے ہیں کہ میں ستمبر ۱۹۹۰ء میں کویت سے پاکستان کو روانہ ہونے لگا تو مولانا نے فرمایا: مجھے مولانا محمد داؤد راز کے ترجمے والی ''صحیح بخاری'' اور کچھ اور کتابیں دے دو میں انھیں پڑھتا رہوں گا۔ چنانچہ میں نے ان کو بہت سی کتابیں دے دیں۔ پھر حالات ٹھیک ہونے پر ۱۹۹۱ء میں واپس کویت گیا تو کتابیں واپس کر دیں اور فرمایا: میں نے ان سب کا مطالعہ کر لیا ہے۔

☆ مولانا عارف جاوید محمدی بیان کرتے ہیں کہ میں کویت سے ایک مرتبہ پاکستان آیا اور ان سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو دیکھا کہ وہ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے لیے فتاویٰ نذیریہ کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ان کا حال پوچھا تو فرمایا: اللہ تعالیٰ کا شکر ہے، اس نے لمبی زندگی عطا فرمائی اور بے شمار نعمتوں سے نوازا۔ اب سفر آخرت کی تیاری ہے۔۔۔ یہ ان سے عارف جاوید صاحب کی آخری ملاقات تھی۔

طویل العمر ہونے کے باوجود نہ انھیں کبھی بلڈ پریشر کا عارضہ ہوا، نہ شوگر یا کوئی اور بیماری لاحق ہوئی۔ قرآن مجید کے چند پارے انھیں یاد تھے، عام طور پر چلتے پھرتے ان کی تلاوت کرتے رہتے تھے۔

☆ قیام کویت کے زمانے میں انھوں نے وہاں کی بعض مسجدوں میں درس بھی دیا اور عارف جاوید صاحب کی وساطت سے بعض شیوخ سے ملاقات بھی کی، جن میں شیخ طارق العیسٰی اور شیخ محمد ابراہیم الشیبانی (مرکز المخطوطات) شامل ہیں۔

☆ نماز تہجد بالالتزام پڑھتے تھے۔ مسجد میں کسی مدرسے یا کسی مسجد کی تعمیر کے لیے باہر سے کوئی شخص مالی امداد کی غرض سے آتا تو مولانا ممدوح لوگوں سے چندے کی اپیل کرتے اور پہلے خود اپنی جیب سے کچھ رقم دیتے۔ صاف ستھرا لباس پہنتے اور نماز کھڑے ہو کر پڑھتے۔

☆ مولانا معراج دین کے اجداد میں سے ایک شخص ''تلو شاہ'' تھا۔ اس کی قبر گوجراں والا کے کھیالی دروازے میں ہے۔ لوگوں نے اس کا مزار بنا دیا ہے۔ اس کے ساتھ چار کنویں زمین تھی۔ لیکن مولانا معراج دین یا ان کے والد گرامی نے اس زمین کی کبھی خواہش نہیں کی، نہ تلو شاہ کے مزار وغیرہ سے کبھی کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار کیا۔

☆ اب آخر میں ایک اور واقعہ سنیے۔ مولانا معراج دین کے بڑے بھائی کا نام چراغ دین تھا۔ اس نے

Marfat.com

سکول کی کچھ تعلیم حاصل کی تھی اور تھوڑی بہت دینیات کی تعلیم سے بھی بہرہ ور تھا، لیکن وہ گھر سے نکل گیا تھا اور چلتے چلتے خوشاب پہنچ گیا تھا، وہاں اس نے پیری مریدی کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور اس علاقے کے لوگ اسے چراغ شاہ کہتے تھے۔ اس نے وہیں وفات پائی اور اس کے مریدوں نے اس کا مزار بنا دیا۔ اس کے مریدوں کو کچھ پتا نہ تھا کہ ان کا پیر چراغ شاہ کہاں کا رہنے والا ہے اور اس کے رشتے دار کون ہیں اور کہاں ہیں۔ لیکن اس کی وفات کے بعد انھوں نے اس کے رشتے داروں کی تلاش شروع کی اور پوچھتے پچھاتے قلعہ دیدار سنگھ پہنچ گئے۔ مولانا معراج دین سے ملے اور کہا: آپ کے بھائی چراغ شاہ کے مزار کی کئی مربعے اراضی ہے، آپ خوشاب آیے اور اس زمین پر قبضہ کیجیے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ بھائی کی حیثیت سے آپ ہی اس کے وارث ہیں۔ مولانا نے یہ اراضی لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا: ہمارا اس سے اور اس کی اراضی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان لوگوں نے کہا: آپ لکھ دیں کہ آپ کا اس اراضی سے کوئی تعلق نہیں، مولانا نے لکھ دیا اور وہ لوگ واپس چلے گئے۔

☆ مولانا معراج دین کے ایک بیٹے دلپذیر لاہور رہتے ہیں۔ وہ ان کے پاس لاہور آئے اور پوتوں سے کہا: میں چند روز یہاں رہوں گا، تم مجھ سے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا کرو لیکن انھیں اچانک ہیضہ ہو گیا اور وہ ۲۔ اگست ۱۹۹۷ء کو لاہور میں وفات پا گئے۔ ان کی میت قلعہ دیدار سنگھ (ضلع گوجراں والا) لائی گئی اور یہاں دفن کیے گئے۔ نماز جنازہ حضرت حافظ عبدالمنان نور پوری نے پڑھائی، جس میں بے شمار لوگوں نے شرکت کی۔

اللهم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه

اب آیے مولانا معراج دین کی اولاد کی طرف۔!

ان کی اولاد چار بیٹے ہیں اور پانچ بیٹیاں۔ چند الفاظ میں اس کا تذکرہ مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ ڈاکٹر عبدالرشید: یہ مولانا کے بڑے بیٹے تھے۔ ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھے اور اقبال ٹاؤن لاہور میں مقیم تھے۔ [1]

۲۔ محمد دلپذیر: ریٹائرڈ محکمہ انہار آفیسر سپیشل ڈیوٹی۔ جوہر ٹاؤن لاہور میں سکونت پذیر ہیں۔

۳۔ ڈاکٹر محمد الیاس: ان کی سکونت کویت میں ہے۔

---

[1] یہ تین مئی ۲۰۱۶ء کی بات ہے۔ ڈاکٹر عبدالرشید حسب معمول مسجد ابوہریرہ کریم بلاک میں نماز کے لیے آئے۔ ان کا وقت موعود آ گیا اور وہ ایک حادثے کا شکار ہو گئے۔ گہری چوٹ لگنے سے قومے میں چلے گئے اور اسی حالت میں وہ اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

Marfat.com

۴۔ عبدالقدیر: گوجراں والا میں کاروبار کرتے ہیں۔ [1]

اب بیٹیوں کے بارے میں

۱۔ بڑی بیٹی کی شادی حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم ومغفور کے مشورے سے حاجی عبدالحق ناگی مرحوم سے ہوئی۔ حاجی صاحب گوجراں والا کی جماعت اہل حدیث کی معروف شخصیت تھے۔ طویل عرصے تک جامعہ محمدیہ گوجراں والا کے خزانچی رہے۔ لجنۃ المساجد اور جمعیت المناہل الخیریہ کے بانی اور رئیس تھے۔ مولانا عارف جاوید محمدی کے سسر تھے۔

۲۔ ایک بیٹی کی شادی حاجی عبدالحق ناگی کے چھوٹے بھائی محترم جناب عبداللہ کوثر صاحب کے ساتھ ہوئی۔

دو بیٹیوں کی شادی قلعہ دیدار سنگھ میں جناب محمد ابراہیم صاحب اور جناب محمد انور سہیل صاحب سے ہوئی۔

سب سے چھوٹی بیٹی کی شادی گوجراں والا میں جناب طارق صاحب سے ہوئی۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ اس خاندان کے فوت شدگان کی مغفرت فرمائے اور زندوں کو علم وعمل کی نعمت بے پایاں سے نوازے۔ آمین یارب العالمین

❀❀❀❀

[1] یہ بھی وفات پا چکے ہیں۔ یکم ستمبر ۲۰۱۶ء بروز جمعرات کو انھوں نے گوجرانوالہ میں وفات پائی اور قلعہ دیدار سنگھ میں انھیں سپرد خاک کیا گیا۔

Marfat.com

قاری محمد یحییٰ بھوجیانی

(وفات ۳۔نومبر ۱۹۹۷ء)

کشیدہ قامت، گول چہرہ، کشادہ پیشانی، خوش گفتار، سادہ مگر صاف ستھرا لباس۔ یہ تھے قاری محمد یحییٰ بھوجیانی۔ حضرت مولانا فیض اللہ خاں بھوجیانی کے پوتے اور مولانا عبداللہ شہید بھوجیانی کے چھوٹے فرزند۔ عالم وصالح خانوادے کے عالم وصالح رکن۔ میں نے ان کو پہلی مرتبہ قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد لاہور میں حضرت مولانا عطاء اللہ بھوجیانی کے گھر میں دیکھا۔ اس وقت میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کے آفس سیکرٹری کے طور پر خدمت انجام دیتا تھا۔ تقسیم ملک کے دور میں بھوجیاں میں ان کے خاندان پر جو کچھ بیتی، میں چوں کہ اس کی تفصیل سے آگاہ تھا اس لیے ان سے مل کر کئی قسم کے خیالات ذہن میں گردش کرنے لگے۔ ان پر بے حد ترس بھی آیا اور مسرت بھی ہوئی کہ اللہ نے ان کی جاں بخشی کے اسباب پیدا کیے، یہ دشمن کی ستم رانیوں سے محفوظ رہے اور مشکلات کو عبور کرتے ہوئے یہاں پہنچ گئے۔ ان کے دو بڑے بھائیوں مولانا عبدالرشید اور عمر فاروق صاحب کا تذکرہ ان کے والد مکرم مولانا عبداللہ صاحب کے حالات میں کیا جا چکا ہے۔

محمد یحییٰ ۱۹۳۵ء میں موضع پنج وڑ میں پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں ان کے آبائی مسکن بھوجیاں کے قریب تھا اور ان کے والد مولانا عبداللہ صاحب اس وقت وہاں کے منصب تدریس وخطابت پر فائز تھے۔ محمد یحییٰ نے پرائمری تک تعلیم موضع جھبال (ضلع امرتسر) کے سکول میں حاصل کی۔ تقسیم ملک کے بعد یہ خاندان موضع بھوئے آصل (ضلع قصور) میں اپنے ایک رشتے دار عالم دین حافظ محمد سلیمان بھوجیانی کے ہاں مقیم ہوا۔ ۱۹۵۴ء تک یہ لوگ وہیں رہے۔ یہ نہایت پریشانی کا زمانہ تھا۔ اس اثنا میں محمد یحییٰ کی تعلیم کا سلسلہ منقطع رہا۔ ۱۹۵۴ء میں یہ بھوئے آصل سے اپنی والدہ اور بڑے بھائی عمر فاروق کے ساتھ گوجراں والا چلے گئے تھے۔

اب محمد یحییٰ بھوجیانی کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ لاہور آ گئے اور استاذ القراء قاری فضل کریم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مع تجوید کے قرآن مجید حفظ کرنے لگے۔ آخری چند پارے موضع میر محمد میں حافظ محمد یحییٰ عزیز کو سنائے۔ پھر قراءات وتجوید کی سند قاری فضل کریم مرحوم کے مدرسہ تجوید القرآن موتی بازار لاہور سے حاصل کی۔

بعدازاں قاری محمد یحییٰ نے ادیب فاضل کا امتحان دیا اور امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئے۔ پھر

Marfat.com

۱۹۵۷ء میں دارالعلوم تقویۃ الاسلام لاہور میں داخلہ لیااور باقاعدگی سے مروّجہ نصاب کے مطابق قرآن وحدیث اور علوم متداولہ کی تعلیم شروع کردی۔ یہ وہی دارالعلوم تھا جو مدرسہ غزنویہ کے نام سے معروف تھا اور تقسیم ملک سے قبل امرتسر میں جاری تھا۔اس کے مہتمم مولانا سید محمد داؤدغزنوی تھے اور قاری محمد یحییٰ کے والد مکرم مولانا عبداللہ بھوجیانی اور عم محترم مولانا عبدالرحیم بھوجیانی اس میں خدمت تدریس انجام دیتے رہے تھے۔اب اسی نام سے یہ دارالعلوم لاہور میں شیش محل روڈ پر منتقل ہوگیا تھا۔

دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں انھوں نے حافظ عبدالرشید گوہڑوی، مولانا عبدالرشید مجاہد آبادی سے بعض درسی کتابیں پڑھیں۔ پھر گوجراں والا چلے گئے اور وہاں جامعہ اسلامیہ میں داخلہ لیا۔ یہاں انھوں نے حضرت حافظ محمد محدث گوندلوی، مولانا ابوالبرکات احمد مدراسی اور دیگر اساتذہ سے استفادہ کیا اور درس نظامیہ کی تکمیل کی۔

حصولِ سند کے بعد ۱۹۶۶ء میں اسی جامعہ اسلامیہ میں بہ حیثیت استاذ خدمت انجام دینا شروع کی۔ درسی کتابیں انھوں نے بڑی محنت سے لائق ترین اساتذہ سے پڑھی تھیں۔ اللہ نے ذہانت کی دولت سے بھی نوازا تھا، اس لیے فنِ تدریس میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔خوب صورت انداز میں پڑھاتے اور طالب علم کی سمجھ کے مطابق بات اس کے ذہن میں ڈالنے کی کوشش کرتے۔

بہترین مدرس کے علاوہ تقویٰ و پرہیزگاری میں بھی اپنا ایک مقام رکھتے تھے اور ان کے یہ وہ اوصاف تھے جوانھیں اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملے تھے۔

وہ بڑے متحرک اور فعال عالم دین تھے۔ رفاہی کاموں میں بھی سرگرم رہتے تھے۔ افغانستان کے جہاد کے زمانے میں افغان مجاہدین کی انھوں نے بڑی مدد کی۔ان کی کوشش سے پشاور کے مرکز مجاہدین میں لاکھوں روپے کا سامان ٹرکوں کے ذریعے پہنچا جو اناج، کپڑوں، رضائیوں، صابن، ادویات وغیرہ پر مشتمل تھا۔ وہ مدرس بھی تھے، مقرر بھی تھے، سرگرم کارکن بھی تھے۔ وہ مجاہدانہ طبیعت کے مالک بھی تھے۔

جامعہ اسلامیہ گوجراں والا میں ان سے بے شمار حضرات نے تعلیم حاصل کی۔ جنھوں نے آگے چل کر بڑی علمی خدمات سرانجام دیں اور دے رہے ہیں، ذیل میں ان میں سے بارہ علمائے دین کے اسمائے گرامی درج کیے جارہے ہیں۔

۱۔ قاری محمد طیب بھٹوی۔ خطیب جامع مسجد امام القریٰ اہل حدیث۔ گوجراں والا

۲۔ حافظ مسعود عالم۔ نائب شیخ الحدیث جامعہ سلفیہ، فیصل آباد

۳۔ حافظ محمد عباس انجم گوندلوی۔ مدرس جامعہ اسلامیہ گوجراں والا

Marfat.com

۴۔ پروفیسر عبدالستار حامد۔ امیر جمعیت اہل حدیث پنجاب
۵۔ استاد القراء قاری محمد ادریس عاصم۔ المدرسۃ العالیہ تجوید القرآن۔ لاہور
۶۔ حافظ ثناء اللہ زاہدی۔ ناظم و مدرس مدرسہ اہل حدیث، صادق آباد
۷۔ بیرسٹر عثمان ابراہیم۔ ایم این اے گوجراں والا
۸۔ مولانا خالد حیات۔ گوجراں ولا
۹۔ شیخ الحدیث مولانا محمد اعظم صاحب مرحوم (گوجراں والا)
۱۰۔ مولانا محمد یحییٰ گوندلوی مرحوم (نامور مصنف و مترجم)

بلاشبہ قاری محمد یحییٰ بھوجیانی علم و عمل میں اپنے اسلاف کا شان دار نمونہ تھے۔ ۱۹۶۶ء سے ۱۹۹۷ء تک اکتیس برس ان کا سلسلۂ درس و تدریس جاری رہا۔

۱۱۔ شاہنواز تائب (خطیب)
۱۲۔ قاضی عبدالرشید ارشد جہلن (مناظر۔ خطیب)

Marfat.com

قاری نعیم الحق نعیم

(وفات ۳۰۔جنوری ۱۹۹۹ء)

ماہ وسال کا تعین کرنا تو ممکن نہیں البتہ اتنی بات ذہن میں محفوظ ہے کہ میں نے ایک دن پہلی دفعہ حضرت استاذ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے مکان پر ایک نوجوان کو دیکھا۔عربی کی ایک کتاب ان کے سامنے تھی اور یہ اس کے کسی مقام سے متعلق مولانا سے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بائیس تیئیس سال کی عمر، نکلتا ہوا قد، اکہرا بدن، سرخی مائل گندمی رنگ، روشن آنکھیں جن میں حیا کا عنصر نمایاں تھا، خندہ رو، تیکھی ناک، کچھ لمبا چہرہ، چوڑا ماتھا، سر پر بے ترتیب سے بڑھے بڑے بال، داڑھی کے بال قد و قامت میں چھوٹے مگر بکھرے ہوئے۔ وہ بار بار ان بالوں کو دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے ٹٹولتے تھے۔ جی چاہا کہ ان سے کہوں، برخوردار! یہ بال کہیں نہیں جائیں گے، ان پر اعتماد کرو اور انھیں اپنی حالت پر رہنے دو، لیکن نہیں کہہ سکا، اس لیے کہ دید و سلام کا یہ پہلا موقع تھا اور یہ موقع اس قسم کے بے تکلفانہ اسلوب کلام کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ صاف ستھرا مگر سادہ لباس۔ مولانا کے حکم سے الماری سے کوئی کتاب نکالنے کے لیے کھڑے ہوئے تو ٹخنوں سے اونچی شلوار۔ دھیمے مگر صاف اور مؤدبانہ لہجے میں بات کرتے تھے۔ میں جس کام سے مولانا کی خدمت میں گیا تھا، اس کے متعلق ان سے چند باتیں کیں اور واپس آ گیا۔

یہ بہت مختصر نشست تھی۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ کی۔ اس وقت مجھے بالکل پتا نہیں چلا کہ یہ کون نوجوان ہیں، کہاں کے رہنے والے ہیں، کیا کام کرتے ہیں اور مولانا کی خدمت میں کب سے ان کا آنا جانا ہے۔

چند روز کے بعد میں مولانا کی خدمت میں پھر کسی کتاب کے بارے میں معلومات لینےگیا تو وہ نوجوان اب بھی وہاں موجود تھے۔ میں نے کھڑے کھڑے مولانا سے کچھ عرض کیا اور فوراً ہی ان کے ہاں سے نکلا اور اپنے دفتر چلا گیا۔ اس نوجوان کے تعارفی حدود تک اس دن بھی رسائی نہ ہو سکی۔

کچھ عرصے کے بعد حقیقت کھلی کہ ان کا نام قاری نعیم الحق نعیم ہے۔ اب وہ ماشاء اللہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے مدیر کی حیثیت سے ہمارے سامنے تھے اور مجھ سے بہت کم عمر ہونے کے باوجود میرے نزدیک محترم و مکرم تھے۔

میں نے ''الاعتصام'' کے اجرا سے لے کر پندرہ سولہ سال اس میں خدمت انجام دی ہے۔ بلکہ کہنا

Marfat.com

چاہیے کہ ''خدمات انجام دی ہیں''۔دفتر کی جاروب کشی یا ''خاک روبی'' سے لے کر اس کی ایڈیٹری تک خدمت کی بہت سی منزلیں آئیں۔ چپڑاسی، کلرک، دفتری، اخبار کو حوالۂ ڈاک کرنے والا، مختلف علاقوں میں جا کر اس کے خریدار بنانے والا، منیجر، نائب ایڈیٹر، ایڈیٹر وغیرہ وغیرہ یہ تمام منزلیں میں نے طے کی ہیں اور پندرہ سولہ سال یہ سب کام اللہ کے فضل سے پوری مستعدی اور تیزی سے کرتا رہا ہوں۔

ان میں سے ہر خدمت کو الگ الگ شمار کیا جائے تو یہ دس بارہ ''خدماتیں'' ہو جاتی ہیں جو میں نے انجام دی ہیں۔اس لیے مجھے ''الاعتصام'' میں اس نوعیت کے کام کرنے والوں، اس میں مضامین لکھنے والوں اور اس کے ایڈیٹروں سے ہمیشہ قلبی تعلق رہا ہے۔ان میں سے کوئی صاحب چھوٹے درجے کے ہوں یا بڑے درجے کے، مجھے بہت اچھے لگتے ہیں، کیوں کہ میں تمام ''درجات پر فائز'' رہا ہوں۔اس اعتبار سے ''الاعتصام'' کا ہر کارکن مرحوم علیم ناصری تک میرا ''برخوردار'' اور جانشین ہے اور اپنے برخوردار اور جانشین سے محبت کرنا اور اس سے احترام آمیز شفقت کے ساتھ پیش آنا میری فطرت میں داخل ہے۔نعیم الحق نعیم چوں کہ میرے جانشین اور برخوردار تھے، لہٰذا میرے لیے ان سے محبت سے پیش آنا ضروری ہو گیا تھا۔

میں سیدھا سادا آدمی ہوں اور اپنے سے بعد میں آنے والے اخبار کے تمام کارکنوں سے محبت کرتا ہوں، ان سے بے تکلفانہ انداز میں مخاطب ہوتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اس بوٹے کو اس مقام پر لانے اور اسے چھوٹے بڑے باغ کی شکل دینے میں میرا بھی کچھ حصہ ہے۔ میں اس کا ''مالی'' رہا ہوں اور میں نے اس سے مالی فائدہ بھی اٹھایا ہے اور اپنی ذہنی بساط کے مطابق اس سے علمی فوائد بھی حاصل کیے ہیں، جن کے حصول کا سلسلہ بحمد اللہ اب بھی جاری ہے۔ اگر ان کی نیت نیک ہے (اور مجھے یقین ہے کہ نیک ہے) تو انھیں بھی حاصل ہو گا۔اس لیے کہ اس نیک کام کا آغاز اور اسے آگے بڑھانے کا سلسلہ شروع کرنے میں ہمارا بھی ہاتھ ہے۔

قاری نعیم الحق نعیم سے محبت اور تعلق کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ ''الاعتصام'' میں میرے جانشین اور ''خلیفہ'' تھے، اگرچہ انھیں یہ جانشینی اور خلافت بہت بعد میں ملی تھی۔

محبت اور تعلق کی اور بھی کئی وجہیں تھیں۔ وہ بھی قاری تھے، میں بھی قاری تھا۔ وہ قرآن کے قاری تھے، میں ان کا قاری تھا۔ یعنی وہ لکھتے تھے اور میں پڑھتا تھا۔اس طرح لفظ قاری اور عمل قراءت کا اطلاق ہم دونوں پر ہوتا تھا اور یہ ہمارا مشترکہ معاملہ تھا۔

بہرحال وہ بہت پیارے اور سلیقے کے آدمی تھے۔ چھوٹی عمر ہی میں اللہ نے ان کو بہت سی خوبیوں سے نواز دیا تھا۔ وہ حافظ قرآن تھے، خطیب تھے، امام تھے، مقالہ نگار تھے، صحافی تھے، شاعر تھے، پابند شرع تھے،

Marfat.com

باعمل عالم تھے۔ یہ تمام اوصاف ان کی ذات میں سمٹ آئے تھے، جو ہم ''بزرگوں'' کو اس برخوردار کی تکریم پر مجبور کرتے تھے۔ وہ ایک خاص حد میں رہتے ہوئے اچھے خاصے لطیفہ باز بھی تھے اور لطیفے بازی سے کسی حد تک مجھے بھی دلچسپی ہے۔ یہ بھی ہمارا ''کامن کاز'' تھا۔

وہ خوش طبع، خوش مزاج، خوش اخلاق، خوش لباس اور خوش کلام اہل علم تھے۔ وہ خود تو شاعر تھے ہی، مختلف شعرا کے بہت سے اشعار بھی انھیں زبانی یاد تھے۔

وہ ایک نستعلیق اور ذمے دار عالم دین تھے۔ روزانہ گوجراں والا سے لاہور دفتر ''الاعتصام'' آتے تھے اور بالعموم وقت پر آتے تھے۔ یہ بہت بڑی ذمے داری تھی جو وہ نبھا رہے تھے، ورنہ جو آمدنی انھیں الاعتصام کی ادارت سے ہوتی تھی، اس سے زیادہ انھیں اپنے گھر بیٹھ کر ہو سکتی تھی۔ خدمت کا ایک جذبہ تھا جو انھیں روزانہ یہاں آنے پر مجبور کرتا تھا اور اپنے استاذ محترم حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف کے حکم کی تعمیل تھی۔ ورنہ ہم نے بہت سے شاگردوں کو دیکھا ہے کہ انھیں استاد کی کسی بات کی کوئی پروا نہیں ہوتی، بلکہ بعض شاگرد تو استاد کو استاد ہی نہیں مانتے، اس لیے کہ وہ خود لکھنے پڑھنے لگے ہیں یعنی خود استادی شروع کر دی ہے تو کسی کو استاد کیوں تسلیم کریں۔

وہ ذہین اور معاملہ فہم اہل علم تھے۔ کتابوں سے اور لکھنے پڑھنے سے انھیں والہانہ تعلق تھا۔ اسی والہانہ تعلق کی بنا پر حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف نے ان کو بعض علمی کاموں کے لیے منتخب کیا اور وہ ان کے معیار پر پورا اترے۔ مولانا ان کے طریق کار پر مطمئن تھے اور ان کا یہ اطمینان ان کے لیے سند کی حیثیت رکھتا تھا۔

معاشی اعتبار سے وہ جس درجے کے آدمی تھے اور جس طرح گزر اوقات کرتے تھے، اس کا ان سے ملنے والوں کو خوب علم ہے۔ وہ حرص و طمع سے مبرا تھے۔ بعض کام وہ بلا معاوضہ کرتے تھے اور اس سے ان کا مقصد صرف اللہ کے دین کی تبلیغ اور اپنی کوشش کے مطابق ترویج حق تھا۔

دارالدعوۃ السّلفیہ کا کتب خانہ جو دفتر ''الاعتصام'' کی بالائی منزلوں میں ہے، میرے خیال میں کم و بیش پندرہ ہزار کتابوں پر مشتمل ہو گا۔ ان کتابوں میں تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، رجال اور لغت وغیرہ تمام موضوعات کی کتابیں موجود ہیں، قاری صاحب کو معلوم تھا کہ کون سی کتاب کہاں ہے۔ عربی کتابوں کے بارے میں بھی وہ معلومات رکھتے تھے اور اردو کتابوں کا بھی انھیں علم تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کتب خانے کی اکثر کتابیں ان کے مطالعے میں رہتی تھیں اور ان پر ان کی نظر تھی۔ اس اعتبار سے وہ ''صاحب نظر'' عالم دین تھے۔ اس طرح کی ''نظر'' اب شاید اس کتب خانے کے مستقل لائبریرین کی بھی نہیں ہوگی۔

کتب خانے سے استفادے کے لیے کوئی شخص جاتا اور ان سے طالب امداد ہوتا تو وہ اس کی مدد کرتے

Marfat.com

اور اس کی مطلوبہ کتاب کے متعلقہ مقام کی نشان دہی کرتے اور اگر کچھ سمجھنے کی ضرورت ہوتی تو اسے سمجھاتے۔ اس باب میں وہ فراخ حوصلہ اور وسعت قلب کے مالک تھے۔ خود مجھے متعدد دفعہ بعض حوالوں کے سلسلے میں ان کے تعاون کی ضرورت پڑی اور انھوں نے نہایت خوشی سے میرے ساتھ تعاون کیا۔ ایسا بھی ہوا کہ کسی کتاب کے حوالے کے بارے میں ان کو میں نے ٹیلی فون کیا اور پھر کچھ دیر بعد کتاب دیکھ کر انھوں نے مجھے ٹھیک ٹھیک جواب دیا۔ یہ ان کی مہربانی بھی تھی اور برخورداری بھی۔

وہ مزاح، مذاق اور لطیفے سے خوش ہوتے تھے اور اس کا جواب بھی دیتے تھے۔ میں انھیں کہا کرتا تھا کہ آپ کے نام کے دونوں جُز قرآن کے الفاظ ہیں ''نعیم'' بھی اور ''الحق'' بھی۔ ہم آپ کا نام لیں تو ان دونوں اجزا کا ہر حرف ہمارے نامہ اعمال میں دس نیکیوں کا اضافہ کرنے کا باعث بنتا ہے، اس سے آپ کو بھی ثواب حاصل ہوتا ہوگا، اس لیے آپ لوگوں سے کہا کریں کہ وہ آپ کو آپ کے نام ''نعیم الحق'' سے پکارا کریں۔ ''قاری صاحب'' نہ کہا کریں۔ ''ق-ر-ء'' کے مادے سے قرآن مجید میں ''قاری'' کا لفظ نہیں آتا، البتہ اس مادے سے بعض دوسرے صیغے قرآن میں آتے ہیں۔

وہ اس کے جواب میں فرماتے: میں نے کبھی کسی سے نہیں کہا کہ مجھے ''قاری صاحب'' کہا کرو، میں تو اپنا نام ''نعیم الحق'' ہی لوگوں کو بتایا کرتا ہوں۔ اگر وہ اپنے طور سے کوئی لفظ بولیں تو میں کیا کرسکتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے چھوٹی عمر میں لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے توقیر کے جذبات پیدا کردیے تھے، اس کی وجہ جہاں ان کا علم تھا، وہاں ان کا تدیّن، خلوص، لوگوں سے محض لوجہ اللہ تعلق اور اعمال خیر بھی تھے۔ بعض علمائے کرام کی طرح ان میں ہٹو بچو اور لوگوں سے کنارہ کش رہنے اور اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کے جراثیم نہ تھے۔ وہ سادہ مزاج اور میل ملاقات کے آدمی تھے۔ ان کی طبیعت میں سختی یا تیزی نہ تھی۔ وہ دل کے صاف، زبان کے میٹھے اور نرم طبع تھے۔ انکسار ان کا سرمایہ حیات اور تواضع ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ وہ ہر شخص کے بہی خواہ اور ہر متنفس کے خیر اندیش تھے۔ وہ متوکل علی اللہ تھے اور اپنے ہر معاملے کو انھوں نے اسی کے سپرد کر رکھا تھا۔

ان کی موت پر طویل عرصہ گزر چکا ہے، لیکن یہ لفظ بولنے کے لیے نہ زبان تیار ہے، نہ لکھنے کے لیے قلم آمادہ ہے۔ تاہم نہ چاہنے کے باوجود بسا اوقات بہت کچھ کہنا اور بہت کچھ لکھنا پڑتا ہے۔

ان کی موت جوانانہ موت تھی اور نہایت دردناک تھی۔ میرے نزدیک وہ شہادت کی موت تھی۔ ۳۰۔ جنوری ۱۹۹۹ء کو ہفتے کا دن تھا۔ وہ حسب معمول اپنے گھر سے دفتر ''الاعتصام'' آنے کے لیے صبح کے وقت گوجرانوالا کے ریلوے اسٹیشن پر آئے اور لاہور آنے والی ٹرین پر سوار ہوگئے۔ کبھی وہ لاہور کے بڑے اسٹیشن پر ٹرین سے اترتے اور تانگے پر یا کسی اور سواری پر الاعتصام کے دفتر شیش محل روڈ آجاتے تھے اور کبھی

Marfat.com

اس سے ایک اسٹیشن پہلے بادامی باغ اتر جاتے اور وہاں سے پیدل یا کسی سواری سے دفتر آ جاتے۔ ۳۰۔ جنوری کو انھوں نے بادامی باغ اترنے کا پروگرام بنایا، ان کے ساتھ ان کا تعلق دار ایک اور شخص بھی تھا، جس نے بادامی باغ اتر کر کہیں جانا تھا۔

وہ دس بج کر پندرہ منٹ پر گاڑی سے اترنے لگے تو گاڑی چل پڑی اور اترتے ہوئے ان کی شلوار کا پائنچا پائیدان میں پھنس گیا اور وہ پلیٹ فارم پر گر پڑے اور گاڑی انھیں اپنے ساتھ گھسیٹتی گئی۔ اس اثنا میں سر اور چھاتی پر اتنی شدید چوٹیں آئیں کہ وہیں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون.

یہ نہایت اندوہ ناک حادثہ اور الم انگیز واقعہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد ''الاعتصام'' کے دفتر اطلاع آئی تو حافظ احمد شاکر اور محمد سلیم چنیوٹی فوراً چند دوستوں کے ساتھ وہاں پہنچے۔ انھوں نے نعش اپنے قبضے میں کی اور گوجراں والا میں مرحوم کے بھائیوں کو ٹیلی فون کیا۔ معاملہ آناً فاناً وقوع پذیر ہوا تھا، اس لیے جہاں جہاں پتا چلا کہرام بپا ہوگیا۔

دفتر سے لاہور اور لاہور کے باہر مختلف مقامات پر بذریعہ ٹیلی فون اطلاع دی گئی۔ نماز مغرب کے بعد جنازہ تھا۔ بے شمار لوگ مرحوم کے مکان پر گوجراں والا پہنچ گئے۔

مرنے والے کی نیک شہرت اور ہر دلعزیزی کا اندازہ اس سے لگایے کہ جب جنازہ اٹھا تو اس میں شریک ہونے والوں کا ایک جم غفیر محلے کی گلیوں اور اس مسجد میں جہاں وہ درس قرآن دیتے اور خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے تھے، جمع تھا۔ شہر کا بڑا قبرستان ان کے مکان سے کافی دور ہے اور وہیں جناز گاہ ہے، لوگ پیدل یا سواریوں کے ذریعے وہاں پہنچے۔ تین دفعہ نماز جنازہ پڑھائی گئی اور تینوں دفعہ کثیر تعداد میں لوگوں نے اس میں شرکت کی۔

قاری نعیم الحق جوانی کے عالم میں اس دنیا سے رخصت ہوئے اور اپنی یادیں اپنے ملنے والوں اور اعزہ و اقارب کے دلوں میں چھوڑ گئے۔ غیب کی باتیں تو اللہ ہی جانتا ہے، لیکن ہمارے علم کے مطابق وہ اسی طرح پاک صاف حالت میں دنیا سے گئے ہیں، جس پاک صاف حالت میں وہ دنیا میں آئے تھے۔

جہاں تک ہم عاجز بندے جانتے ہیں انھوں نے ہمیشہ اللہ کے دین کی خدمت کی، بندوں سے ان کے معاملات زندگی کے ہر دور میں بہتر رہے۔ وہ اپنی استطاعت کے مطابق حقوق اللہ کا بھی خیال رکھتے تھے اور حقوق العباد بھی حتی الامکان پورا کرنے کی سعی کرتے تھے۔ ہماری معلومات کے مطابق انھوں نے کبھی کسی کو دانستہ تکلیف نہیں پہنچائی، کسی کی حق تلفی نہیں کی، کسی کو تنگ نہیں کیا، کسی کے درپے آزار نہیں ہوئے۔ وہ عمل کے پکے اور قول کے سچے تھے اور جتنی عمر پائی، اس میں سچائی کی تبلیغ کرتے رہے، تقریری صورت میں بھی اور

Marfat.com

تحریری شکل میں بھی۔

ان کا بچپن تحصیل علم میں گزرا اور جوانی احکام خداوندی کی اشاعت میں بسر ہوئی۔ اس کی شہادت بہت سے لوگ دیتے ہیں، بڑے بھی اور چھوٹے بھی، ان کے رشتے دار بھی اور محلے دار بھی، ہمسائے بھی اور غیر ہمسائے بھی۔ ان کا جنازہ بھی اس کا بہت بڑا شاہد تھا۔

ہم اللہ کے حضور اس مرحوم کے لیے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ التجا کرتے ہیں:

اللهم اغفرله و ارحمه و عافه و اعف عنه و اكرم نزله و نور قبره، و وسع مدخله و ادخله جنت الفردوس.

اس کے ساتھ ہی ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اولاد کو اپنے نیک طینت اور بلند کردار باپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العلمین.

○*○*○

میری گزارشات ختم ہوئیں۔ آئندہ صفحات میں ان کی لائق احترام بیوہ کا مضمون پڑھیے جو انھوں نے ''میرا ہمدم، میرا رفیق'' کے عنوان سے لکھا۔ یہ مضمون ہفت روزہ الاعتصام کی پانچ قسطوں (از ۴ جون ۲۰۰۴ء تا ۸ جولائی ۲۰۰۴ء) میں چھپا۔ اس طویل اور درد ناک مضمون میں مرحوم کی زندگی کے بہت سے گوشوں کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ ان کے خاندانی کوائف، ان کی طالب علمی کے واقعات، ان کے تدریسی احوال، ان کی معاشرتی زندگی، ان کی نیکی، صالحیت، طرزِ حیات، لوگوں سے میل جول، وظائف و اوراد وغیرہ تمام چیزیں اس مضمون میں آ گئی ہیں۔ اس میں ان کی حیات مستعار کے تمام پہلو نکھر کر قاری کے سامنے آ جاتے ہیں۔ آیے اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔

۱۲۔ شوال ۱۴۱۹ھ (بمطابق ۳۰۔ جنوری ۱۹۹۹ء) ہفتے کے روز حافظ نعیم الحق صاحب حسبِ عادت نمازِ فجر اور ذکر و اذکار سے فارغ ہو کر دفتر جانے کے لیے سفر کی تیاری میں مصروف ہوئے، جلدی جلدی ناشتہ کیا، بال وغیرہ درست کیے اور سر پر رومال لیا، جوتا پہنا۔ آج ہفتے کا دن تھا جس کی وجہ سے حافظ صاحب بہت جلدی جلدی تیار ہو رہے تھے کیونکہ ہفتے اتوار کو رسالے کا کام کرنا ہوتا تھا اور اس مقصد کے لیے انھیں ریل کار کی بجائے ساڑھے سات بجے خیبر میل سے جانا زیادہ پسند ہوتا تھا، ویسے بھی آج اس ہفتے کو حافظ ثناء اللہ مدنی حفظہ اللہ کے ساتھ دفتر ''الاعتصام'' میں ایک مشاورتی اجلاس تھا، جس کے لیے جلدی دفتر پہنچنا ضروری تھا مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ آج وہ کس سفر پر روانہ ہونے والے ہیں، دراصل آج انھیں دفتر نہیں بلکہ اللہ کے حضور پیش ہونا تھا۔ دنیا کی زندگی اختتام کو پہنچ چکی تھی اور یہ سفر سفرِ آخرت کی شکل اختیار کرنے والا تھا جس

Marfat.com

کے لیے سوا سات اور ساڑھے سات بجے کے درمیان وہ گھر سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ دفتر کے معاملات کی فکر دل میں بٹھائے ریلوے اسٹیشن گوجراں والا پہنچے تو خیبر میل کے آنے میں کچھ تاخیر تھی۔ اس سے پہلے ان کی عادت یہ تھی کہ اگر گاڑی کچھ لیٹ ہوتی تو واپس گھر تشریف لے آتے۔ مگر آج دوستوں کے استفسار پر جواب دیا کہ میں یہیں ٹھہر کر گاڑی کا انتظار کروں گا۔ سوچنے کی بات ہے کہ آج وہ گھر واپس کیوں نہ آئے؟ دراصل ان گلی کوچوں میں ان کے قدم پورے ہو چکے تھے اور آج اسٹیشن پر اس جگہ بیٹھنا بھی آخری تھا۔ ان کے قلم سے جو الفاظ لکھے جا رہے تھے وہ ان کی آخری سوچ تھی اور تحریر بھی آخری تھی کیوں کہ قلم والے کے ساتھ آج قلم کو بھی اس دنیا والوں سے رشتہ توڑ لینا تھا۔

زندگی کے سانس تیزی سے مکمل ہوتے چلے جا رہے تھے اور گاڑی موت کا پیغام لیے وقت متعین پر پہنچنے ہی والی تھی مگر منتظر بے خبر تھے۔ دفتر میں منعقد ہونے والی آج کی مجلس بعض لحاظ سے اہم تھی جس کی وجہ سے حافظ صاحب کے ذہن میں جلدی دفتر پہنچنے کا خیال بہت پختہ تھا مگر اللہ تعالیٰ آج اپنے فرمان کی صداقت کا مشاہدہ کروانا چاہتا تھا:

﴿وَ مَا تَدۡرِیۡ نَفۡسٌۢ بِاَیِّ اَرۡضٍ تَمُوۡتُ﴾ (لقمان: ٣٤)

”یعنی کوئی انسان آنے والے وقت کے متعلق نہیں جانتا کہ وہ آئندہ کیا کرے گا اور نہ وہ اپنی موت کے متعلق ہی جانتا ہے کہ وہ کس مقام پر اس کا استقبال کرنے والی ہے۔“

گاڑی جب گوجراں والا اسٹیشن پر پہنچی تو دوست احباب کے دیکھنے کے مطابق حافظ صاحب نے اپنے کاغذات سمیٹے اور اپنے ساتھ دنیا فانی سے رخصت ہو جانے والا قلم بند کیا اور گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ان کے ایک دوست کے بتانے کے مطابق راستہ بھر تسبیح پر ذکر الٰہی میں مصروف رہے اور ادھر فرشتے گروہ در گروہ ان کا استقبال کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ گاڑی دس بج کر چند منٹ پر جائے حادثہ پر پہنچی جہاں ان کی روح کو تو یقیناً اللہ کے فرشتوں نے ہاتھوں ہاتھ بہت سی خوشبوؤں میں لپیٹ لیا ہو گا۔ مگر گیارہ بجے کے قریب جب مجھے اس حادثے کی خبر ملی تو خبر کیا تھی، بجلی کا ایک زبردست کڑکا تھا، جس کی تکلیف اور درد سے بہنے والے آنسوؤں کے سیل رواں میں ماضی کی تمام یادیں اور مستقبل کی خوشیاں بہ گئی ہوں اور اس اندھیری دنیا میں دکھوں اور مصیبتوں کے پہاڑ میرے سر پر رکھ دیے گئے ہوں جن سے نجات اب دنیا کی اس زندگی میں شاید ممکن نہیں۔

حافظ صاحب کے اس حادثے کی خبر گوجراں والا میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ مگر کسی کو بھی اس بات کی صداقت کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ بہر حال چند لمحوں میں ان کے عقیدت مندوں کا جم غفیر گھر کے باہر

Marfat.com

جمع ہو چکا تھا۔ ہر آنکھ اشک بار تھی اور ہر دل غم زدہ تھا، رشتہ دار اور غیر رشتہ دار ہر ایک اس سانحے پر آنسو بہا رہا تھا۔ ہر شخص آخری دیدار کے لیے بے تاب تھا اور ہر زبان اس جانے والے کی صفت بیان کرنے میں مصروف تھی۔ ۴ بجے کے قریب جب ایمبولینس گوجراں والا میں حافظ صاحب کی اقامت گاہ پر پہنچی تو لوگ یہ منظر دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے کہ حادثے کی شدت کے باوجود ان کا چہرہ انتہائی پرسکون تھا اور ماتھے پر معمولی زخم کے نشان کے علاوہ چہرہ ہر قسم کی خراش سے محفوظ اور مسکراتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ دنیا سے رخصت ہونے کے بعد ان کے چہرے کی رنگت زندگی کی رنگت کی نسبت زیادہ کھلی ہوئی اور جاذبِ نظر محسوس ہو رہی تھی۔ غرض کہ انھیں دیکھتے ہی فرمان الٰہی بے اختیار زبان پر جاری ہو گیا۔

﴿يَآ أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ٥ ارْجِعِيْ إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ٥ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ٥ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ﴾ (الفجر: ۲۷-۳۰)

”راہ حق میں محنت کر کے تھکے ہوئے اور عبادتِ الٰہی سے سکون پانے والے نفسِ مطمئنہ اب تمھاری محنت اور مشقت سے بھرپور زندگی ختم ہوئی اور راحت و انعام پانے کا وقت آ پہنچا۔ لہٰذا اب اپنے رب حقیقی کی طرف مراجعت کرو اور بطور انعام میرے نیک بندوں کی معیت میں جنت میں داخلے کی خوش خبری حاصل کرو۔“

حافظ صاحب کے چہرے سے نفس مطمئنہ کی جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی اور اللہ کی عبادت، ذکر و اذکار اور شب بیداری کا نور ان کے چہرے پر واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ سنت رسول ﷺ کے مطابق نمازِ جنازہ کا وقت بلا تاخیر ساڑھے چھ بجے شام منتخب ہوا۔ حافظ صاحب کے دوست احباب اور عقیدت مند اس نماز اور دعا میں شرکت کو اپنے لیے سعادت سمجھتے ہوئے ہر صورت شریک ہونے کی کوشش کر رہے تھے اور بہت سے لوگ اللہ کے اس مہمان کو الوداع کہنے کے لیے پہلے سے قبرستان میں جمع ہو چکے تھے۔ نماز جنازہ کی امامت کے لیے حافظ صاحب کے مشفق استاد حافظ عبدالمنان نور پوری رحمہ اللہ کو منتخب کیا گیا۔ انھوں نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اس طرح دین کا آفتاب، عصر حاضر کا ولی، زاہدانہ زندگی بسر کرنے والا، دوستوں کا دردمند، خاندان کی آنکھ کا تارا، بچوں کا مشفق باپ، میرا سرتاج، میری روح اور زندگی کا سہارا، میرا ہمدم اور میرا رفیق ہمارے ساتھ ہزاروں سوگ واروں کو روتا چھوڑ کر اپنے رفقائے کار کے ساتھ اپنے بچوں کو بھی داغ مفارقت اور داغ یتیمی دیتے ہوئے اپنی آخری آرام گاہ میں جا پہنچا۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

اللھم اغفرلہ و ارفع درجتہ فی المھدیین و الحقہ بالصالحین . آمین

Marfat.com

ہمارے لیے یہ صدمہ تو ہر لحاظ سے ناقابل برداشت ہے ہی......مگر ان کے تعلق دار دوست احباب اور عقیدت مندوں کی آہ وزاری دیکھ کر خیال آتا ہے کہ اے کاش! یہ میری موت ہوتی اور مجھ جیسی خطا کار ان تمام دعاؤں کو لے کر اللہ کے حضور حاضر ہوتی تو شاید میری نجات کا کوئی ذریعہ بن جاتا۔ حافظ صاحب کے لیے جس طرح مساجد میں مغفرت اور بلندیٔ درجات کی دعائیں ہوئیں اور بے شمار جگہوں پر غائبانہ نماز جنازہ ادا کر کے لوگوں نے دوستی کا حق ادا کرنے کی کوشش کی، اور عقیدت کا اظہار کرنا چاہا، اس لحاظ سے ان کی دنیا سے رخصتی قابل رشک ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے یہ شعر انہی جیسے لوگوں کے لیے کہا ہو...... ع

یـــا ذا الــذی ولـــدتك امك بـــاكيـــا
و الـــنـــاس حـــولك مســـرورا
احـرص عـلـى عـمـل تـكـون بـه متى
يـبـكـون حـولك ضـاحـكـا مسـرورا

''اے جانے والے جب تو دنیا میں آیا تو اہل خانہ تیری آمد پر خوش تھے مگر تو رو رہا تھا اور پھر زندگی بھر ایسے عمل کرنے کی کوشش کر کہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت اہل دنیا تیری جدائی پر رو رہے ہوں مگر تو ہنستے مسکراتے چہرے سے رخصت ہو جائے۔''

آغاز سفر:

ہمارے دیکھنے کے مطابق حافظ صاحب کا حادثہ اور دنیا سے ان کی رخصتی ایک ڈراؤنے خواب کی طرح آناً فاناً ہو گئی۔ مگر جب ان کی گزشتہ زندگی کے حالات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس برگزیدہ بندے کو بڑے پیار اور محبت کے ساتھ سفر آخرت کے لیے اس انداز میں تیار کیا جس طرح ایک مشفق مالک کا حق ہوتا ہے اور اس تیاری کی ابتدا تقریباً چھ، سات ماہ پہلے سے ہو چکی تھی۔

عبادت کا ذوق تو حافظ صاحب کو بچپن سے ہی بہت زیادہ تھا جو جوانی کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا گیا۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی انجام دہی بھی ان کے رگ و ریشے میں سرایت کر چکی تھی مگر اب نوافل کی ادائیگی بھی ان کے معمولات کا حصہ بن چکی تھی۔ فرض نماز باجماعت ادا کرنا صرف معمول ہی نہیں تھا بلکہ جماعت کے ساتھ شریک ہونے میں کسی رکاوٹ کو قبول نہ کرتے (الا ماشاء اللہ) سفر کی تھکاوٹ ہو یا گرمی سردی کی شدت، صحت کی خرابی ہو یا کوئی اور مجبوری، حافظ صاحب نماز باجماعت کو ہر چیز پر مقدم رکھتے تھے اور فرض نمازوں کے علاوہ تہجد اور اشراق یا ضحیٰ کی نماز ادا کرنے کا بھی خاص اہتمام کیا کرتے تھے۔

گرمی کے دنوں میں تہجد کی نماز کی ادائیگی لاہور آنے جانے کی وجہ سے بعض اوقات مشکل ہو جاتی تو

Marfat.com

رات کو سوتے وقت ہی نفل ادا کرلیا کرتے تھے جب کہ موسم سرما میں بڑی باقاعدگی سے نماز تہجد ادا کرتے۔ صبح وشام کی ادعیہ مسنونہ اور قرآن حکیم کی مخصوص سورتیں بھی بچپن سے ہی پڑھنے کے عادی تھے (اس کا تفصیلی تذکرہ مضمون کے آخر میں ہوگا) عام حالات و اوقات میں ان کی زبان ہر وقت کسی نہ کسی ذکر الٰہی میں مصروف رہتی حتیٰ کہ ہماری ذاتی مجالس کا زیادہ تر وقت بھی مسائل شرعیہ اور دینی گفتگو میں صرف ہوتا۔

اسمائے الٰہیہ کا ورد:

یہ تمام عادات تو ان کی فطرت کا حصہ تھیں۔ مگر اب کچھ عرصے سے اسمائے الٰہیہ کو کثرت سے پڑھنا شروع کر دیا تھا، حتیٰ کہ بعض اسمائے الٰہیہ یومیہ کئی ہزار مرتبہ پڑھ لیا کرتے تھے، جن میں سے چند اسمائے الٰہیہ (میرے علم کے مطابق) درج ذیل ہیں:

یَا سَلَامُ ، یَا مُؤْمِنُ ، یَا اَللّٰهُ

تین تین سو مرتبہ

یَا وَلِیُّ ، یَا وَالِی ، یَا نَصِیْرُ

تین تین سو مرتبہ

یَا رَحْمٰنُ ، یَا رَحِیْمُ ، یَا کَرِیْمُ

تین، تین سو مرتبہ

لیکن اس کثرتِ ذکر کے باوجود بسا اوقات محسوس ہوتا کہ ان کی طبیعت سیر نہیں ہوئی اور هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ والی کیفیت ہے۔ ایک مرتبہ اسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ میرا خیال ہے کہ چند مسنون دعائیں زیادہ تعداد میں بطور وظیفہ پڑھی جائیں، یعنی سوا لاکھ مرتبہ تاکہ طبیعت پر واضح قسم کے اثرات ظاہر ہوسکیں۔ پھر سوا لاکھ کی متعین تعداد کے غیر مسنون ہونے کی وجہ سے سوا لاکھ کے بعد ان گنت پڑھ کر بدعت کے مرتکب ہونے سے بھی بچا جاسکتا ہے۔

اس سلسلے کی ابتدا لفظ "اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ" سے کی گئی۔ استغفار سے ابتدا کرنے کی وجہ یہ تھی کہ آدم علیہ السلام کی توبہ بھی استغفار کرنے کی وجہ سے ہی مقبول ہوئی تھی۔ اس کے بعد کلمۂ توحید "لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ" سوا لاکھ سے زائد مرتبہ پڑھا۔ پھر اسم مفرد یعنی اَللّٰهُ اَللّٰهُ پڑھا۔ پھر لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ اور اَللّٰهُمَّ اهْدِنِیْ وَ سَدِّدْنِیْ۔ پھر اَللّٰهُمَّ اَلْهِمْنِیْ رُشْدِیْ وَ اَعِذْنِیْ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ۔ پھر رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَ هَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا سوا لاکھ سے زاید مرتبہ پڑھا۔ اس کے بعد غالباً رَبِّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِكْرِكَ وَ شُكْرِكَ وَ حُسْنِ عِبَادَتِكَ پڑھا۔

Marfat.com

تیاری کے آخری مراحل:

یہ تمام وظائف چند ماہ میں مکمل کر کے رمضان سے چند دن قبل فارغ ہو گئے تو فرمانے لگے کہ اب میں اَللّٰھُمَّ اَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِی الْاُمُوْرِ کُلِّھَا وَ اَجِرْنَا مِنْ خِزْیِ الدُّنْیَا وَ عَذَابِ الْاٰخِرَۃِ کا وظیفہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے گزارش کی کہ آپ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَ بِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ کو بھول تو نہیں گئے؟ کہنے لگے کہ نہیں! میں بھولا تو نہیں۔ بلکہ بات یہ ہے کہ یہ ذکر فرشتوں کا ذکر ہے جس کی دلیل قرآن حکیم کی یہ آیت ہے: ﴿نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ﴾ میں چاہتا ہوں کہ پہلے گناہوں کی آلودگی ختم ہو جائے اور میں اس مقام پر پہنچ جاؤں کہ ذکر کرنے کے قابل ہوسکوں۔

اسی طرح ایک مرتبہ درود شریف پڑھنے کے متعلق بات ہوئی تو جواباً فرمایا کہ درود شریف بہت عظیم وظیفہ ہے، اس لیے میں اسے تمام وظائف (جن کا میں ارادہ کر چکا ہوں) کے آخر میں پڑھوں گا تا کہ باقی اذکار کی برکت اور درود شریف کی کثرت کی وجہ سے حضور ﷺ کی زیارت حاصل ہو سکے۔ نبی کریم ﷺ کی زیارت کی ان کو بڑی خواہش تھی۔ یہی وجہ تھی کہ زیارت حبیب ﷺ کا تذکرہ کرتے وقت ان کی آنکھوں میں خوشی کی عجیب چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ بہرحال ابھی اَللّٰھُمَّ اَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا...... کا وظیفہ ہی جاری تھا کہ سفر آخرت کا وقت آ پہنچا اور قلت مہلت کی وجہ سے یہ حسین لمحات دنیاوی زندگی میں میسر نہ آ سکے۔ مگر امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس نیک خواہش کی تکمیل ضرور فرمائی ہوگی۔

''زادِ راہ'' کے حصول کے لیے معمولات میں تبدیلی:

پہلے پہل چھٹی کے دن حافظ صاحب کو آرام کرنا بہت مرغوب تھا، فارغ وقت تقریباً سو کر ہی گزارا کرتے تھے اور بعض اوقات کئی کئی مرتبہ جگانے کے باوجود پھر نیند کی آغوش میں جا پہنچتے۔ اس کی ایک وجہ ان کی صحت کی ناسازی اور سفر کی تھکاوٹ بھی تھی۔ مگر اب ان کی یہ عادت متروک ہو چکی تھی اور ایک عرصے سے کثرتِ ذکر کو اپنا معمول بنا چکے تھے، سفر و حضر میں تسبیح کے دانوں پر ان کی انگلیاں حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیتیں۔ پہلے نیند سے جس قدر محبت تھی اب اسی قدر اس سے دوری ہو چکی تھی۔ گویا سفر آخرت کی تیاری کے لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں مخفی طور پر تلقین کر دی تھی کہ ﴿قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾

آخری رمضان المبارک اس طرح بھرپور محنت اور مشقت سے گزارا جیسے ایک مزدور اپنے مالک کی طرف سے ملنے والے گراں قدر انعامات کے حصول کے لیے مستعد ہو جاتا ہے اور کسی وقت بھی اس سے غفلت کا شکار نہیں ہونا چاہتا، بلکہ ہر وقت اس کی ایک ہی لگن ہوتی ہے کہ اس کا انعام اس کے حوالے ہو جائے۔ رمضان المبارک میں ان کے معمولات گزشتہ برسوں کے رمضان کی نسبت مختلف تھے۔ پہلے نماز

Marfat.com

تراویح کا پڑھ لینا ہی کافی سمجھتے تھے مگر اس دفعہ سحری کے وقت دوبارہ نوافل پڑھتے اور یہ نوافل اتنے لمبے ہوتے کہ اذان فجر سے چند منٹ پہلے فارغ ہو کر سحری کی طرف متوجہ ہوتے اور سحری کا کھانا بھی بہت ہی مختصر ہوتا۔ سادہ روٹی کے ساتھ تھوڑا سا مکھن اور شہد، بعد میں ایک کپ چائے، بس۔ شکم سیر ہونا انھیں سخت ناپسند تھا۔ سحری سے فارغ ہو کر نماز فجر کے لیے مسجد چلے جاتے اور پونے سات بجے کے قریب گھر واپس تشریف لاتے اور دفتر جانے کی تیاری کر کے اسٹیشن روانہ ہو جاتے، راستے میں ذکر و اذکار میں مشغول رہتے۔

شام کو گھر لوٹتے تو اکثر روزہ راستے میں ہی افطار ہو جاتا۔ اسی وجہ سے حافظ صاحب بیگ میں کھجوروں کا ایک لفافہ ضرور رکھتے جو ان کی اپنی افطاری کے ساتھ ساتھ دیگر مسافروں کی افطاری کے کام بھی آ جاتیں۔ عام حالات میں بھی حافظ صاحب کو کھجور بہت پسند تھی، جب بھی کھجور کھاتے حتی الوسع طاق عدد میں کھایا کرتے تھے......اگر کبھی روزہ گھر پہنچ کر افطار کرتے تو بھی صرف کھجور پر اکتفا کرتے یا نیم گرم چائے کا صرف ایک کپ تاکہ نماز مغرب باجماعت ادا کی جا سکے۔ مسجد سے واپس آ کر ایک گلاس دودھ میں انڈہ اور شہد ملا کر اور بعض اوقات تھوڑا سا گھی ڈال کر نوش جان فرماتے اور پھر سحری تک کچھ کھانے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔

رمضان المبارک میں خور و نوش کا پروگرام بہت مختصر کر دیتے اور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''ایسے لوگوں پر حیرت ہوتی ہے جو رمضان کو کھانے پینے کے دن سمجھ کر اپنی قیمتی کمائی اور خواتین کا قیمتی وقت دسترخوان کی نذر کر دیتے ہیں حالانکہ یہ دن زیادہ سے زیادہ عبادت کرنے کے ہوتے ہیں، اور کھانے پینے پر بے بہا خرچ کرنے کی بجائے ان ایام میں صدقہ وخیرات کرنا زیادہ افضل ہے۔ ویسے بھی عبادت کے لیے تقلیل المنام (نیند کو کم کرنا) ضروری ہے کیوں کہ زیادہ سونے سے وقت کا حرج ہو جاتا ہے اور اس مقصد کے لیے تقلیل الطعام (کھانے میں کمی کرنا) نسخۂ کیمیا ہے۔ زیادہ کھانے کی وجہ سے نیند میں اضافہ اور کم کھانے کی وجہ سے نیند میں کمی پیدا ہوتی ہے۔''

آخری رمضان المبارک میں کئی دفعہ گاڑی کے لیٹ ہو جانے کی وجہ سے سات بجے کے بعد گھر پہنچتے۔ ان دنوں نماز عشا کی جماعت بھی سوا سات بجے ہی ہوا کرتی تھی جس کی وجہ سے ایک کپ چائے پی کر مسجد روانہ ہو جاتے اور بسا اوقات چائے پینے کی فرصت بھی میسر نہ آتی، وضو کر کے مسجد چلے جاتے اور واپس آ کر دودھ وغیرہ پی لیتے تھے۔

جیبی سائز کا قرآن مجید (جو انھوں نے مکتبہ سلفیہ سے ہی لیا تھا) ماہ رمضان میں ان کی جیکٹ کی جیب میں ہوتا، جہاں بھی فرصت ملتی منزل پڑھ لیتے۔ قرآن مجید انھیں بڑی اچھی طرح یاد تھا جس کی وجہ سے انھیں نماز تراویح کے لیے زیادہ تیاری کرنے کی کبھی ضرورت پیش نہ آتی۔ بعض اوقات نماز مغرب کے بعد صرف

Marfat.com

ایک دفعہ پارہ پڑھ لینا یا مجھے سنا لینا کافی سمجھتے تھے۔

گزشتہ برسوں کی طرح اس دفعہ آخری رمضان میں بھی ان کی مصروفیات میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا، مگر پھر بھی سلسلۂ ذکر واذکار کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پایا۔ بلکہ فرصت کی ہر گھڑی وظائف میں صرف کرتے رہے۔ حتی کہ طاق راتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان راتوں میں نماز تراویح کے بعد گھر تشریف لے آتے اور کبھی ایک گھنٹا آرام کرنے کے بعد ۱۲ بجے دوبارہ مسجد تشریف لے جاتے اور کبھی ساری رات ہی عبادت اور ذکر کرنے میں گزار دیتے۔ طاق راتوں میں نماز تراویح کے علاوہ مزید گیارہ رکعات پڑھاتے جن میں سے وتر کبھی تین ہوتے اور کبھی پانچ یا سات۔ نماز میں قیام اور رکوع وسجود کی طوالت نیز خشوع وخضوع دیدنی ہوتے، نمازِ وتر میں دعائے قنوت پڑھتے تو یہ احساس ہوتا کہ جیسے آج یہ دعا ضرور قبول ہو گئی ہے۔

ساڑھے تین بجے تک قیام اللیل کا سلسلہ خصوصی دعا کے ساتھ ختم کر کے گھر تشریف لاتے، پھر ذکر الٰہی میں مصروف ہو جاتے اور فجر کی اذان سے کچھ وقت قبل تک اللہ کے حضور گوشہ نشین بنے رہتے اور نماز فجر کے بعد آرام کیے بغیر دفتر روانہ ہو جاتے۔

دنیا وآخرت کی بھلائی کا سوال:

رمضان کے آخر میں میرے استفسار پر بتایا کہ ''میں دعا ((اَللّٰھُمَّ اَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا ......)) پانچ ہزار مرتبہ پڑھ چکا ہوں، دعا لمبی ہے اور وقت بہت صرف ہوتا ہے۔ بہر حال ہم نے اللہ سے سراسر دنیا وآخرت کی بھلائی طلب کی ہے، دیکھتے ہیں کہ اللہ ہمیں اس کے بدلے میں کیا دیتا ہے۔'' یہ الفاظ دو تین مرتبہ کہے، اور ان کے ان الفاظ میں یقین اور پختگی کی جھلک اس قدر نمایاں تھی کہ میں دیر تک متعجب ہو کر ان کی طرف دیکھتی رہی۔ مجھے یقین کامل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حسن ظن کو ضرور پورا کیا ہوگا، کیوں کہ حدیث قدسی میں اس کا ارشاد ((اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ ......)) ''میں اپنے بندے سے ویسا ہی معاملہ کرتا ہوں جیسی وہ مجھ سے امید رکھے۔'' اس رمضان المبارک کو خلاف عادت قرآن مجید ۲۷ ویں رات کو ہی مکمل کر لیا اور رمضان میں پڑھا جانے والا یہ ان کا سینتیسواں قرآن تھا۔ سحری کے وقت جب ہم دونوں مسجد سے گھر پہنچے تو میں نے ان کی منزل کے مکمل ہو جانے پر خوشی کا اظہار کیا تو کہنے لگے کہ ''دیکھو میں ختم کر کے نہیں آیا بلکہ شروع بھی کر آیا ہوں۔'' پھر کہنے لگے ''میرا مطلب یہ ہے کہ پہلے نماز تہجد میں مختلف سورتیں پڑھی جاتی تھیں مگر اب مسلسل سارا قرآن پڑھنا چاہتا ہوں۔''

اٹھائیسویں شب لاہور دفتر الاعتصام میں نماز تراویح پڑھائی اور ۲۹ کو دفتر سے چھٹی تھی۔ اس دن کچھ تھوڑا سا آرام کیا۔ عید کا دن حسب سابق مصروف گزرا۔

Marfat.com

تعطیل کے معمولات:

عید کے دن حافظ صاحب کی مصروفیت عام لوگوں سے مختلف ہوتی تھی، چھٹی کے دن بیشتر حصہ مسجد بلال میں گزرا کرتا تھا۔ ایک نماز پڑھنے کے لیے جاتے تو دوسری نماز سے تقریباً آدھ گھنٹا پہلے مسکراتے مسکراتے گھر میں داخل ہوتے اور آتے ہی کہتے کہ ''میں اتنی دیر بعد آیا ہوں مگر پھر بھی قہوہ تیار نہیں ہوا۔'' بعض دفعہ کہتے کہ ''میرا دل چاہا کہ میں آپ لوگوں کو ایک نظر دیکھ آؤں۔'' بس اس طرح کے ہلکے پھلکے جملے بول کر دوبارہ مسجد جانے کے لیے تیار ہو جاتے اور ہر وقت ((و رجل قلبه معلق بالمسجد)) (الحدیث) کا مصداق بنے رہتے۔

آخری عید کی چھٹیاں بھی ایسے ہی گزر گئیں۔ مگر ان چھٹیوں میں ایک خوشی پہلے سے مختلف تھی اور وہ لاہور منتقل ہو جانے کی خوشی تھی اور روز مرہ کا سفر ختم ہو جانے کی خوشی اور سب سے بڑی خوشی اس بات کی تھی کہ لاہور رہائش پذیر ہو جانے کی صورت میں خدمت دین کے لیے زیادہ وقت میسر آ جائے گا اور بچوں کی تعلیم و تربیت پر بھی توجہ کی جا سکے گی۔ حافظ صاحب کو اپنے اس پروگرام کی اتنی زیادہ خوشی تھی کہ ہر بات اور ہر مجلس لاہور کے تذکرے پر ختم فرماتے۔ اب تو انھیں اپنے اس خواب کی تعبیر اس قدر قریب محسوس ہو رہی تھی کہ ایک دن کہنے لگے ''مجھے امید ہے کہ میرا یہ ریلوے پاس آخری ہے اور اب ہم بہت جلد لاہور چلے جائیں گے۔'' مگر اس خوشی کے ساتھ ساتھ فکر مند بھی بہت رہتے تھے۔ اس پروگرام کے سلسلے میں مختلف عام قسم کی پریشانیوں کی بجائے انھیں زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ لاہور جا کر کہیں ہم دنیا داری میں مزید نہ الجھ جائیں۔ گاہے بگاہے اس فکر کا اظہار کرتے رہتے اور بڑے بچوں کو سمجھاتے رہتے تھے۔

نرمیٔ گفتار اور گرمیٔ کردار میں مسلسل اضافہ:

جیسے جیسے دنیا کی زندگی کے دن پورے ہوتے چلے جا رہے تھے، ویسے ویسے حافظ صاحب کی عادات و اطوار اور طبیعت کی نرمی میں بھی مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا، نیکی کی جستجو اور کوشش میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ عیدالفطر کے بعد شوال کے چھ روزے رکھنے کا ارادہ کیا، اتفاق سے میں بخار کی وجہ سے ان کے اس ارادے میں شریک نہ ہو سکتی تھی۔ مگر میری خواہش تھی کہ حافظ صاحب بھی کچھ دن انتظار کر لیں تا کہ صحت کے بعد ہم دونوں اکٹھے روزے رکھ سکیں۔ مگر اس مرتبہ حافظ صاحب انتظار کے موڈ میں نہیں تھے انھوں نے اکیلے ہی چار روزے رکھے۔ پانچویں روزے کے لیے آخری جمعے کی شب میں نے پوچھا تو کہنے لگے کہ ''دو روزوں کی بجائے تین روزے رکھنے کا ارادہ ہے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ ایام بیض (تیرہ، چودہ، پندرہ تاریخ) کے روزے بھی رکھے جائیں۔'' حالانکہ اس سے پہلے صحت کی خرابی اور سفر کی وجہ سے روزہ رکھنے میں کچھ دقت محسوس کیا

Marfat.com

کرتے تھے۔

آخری جمعہ:

آخری جمعے کے دن غسل اور بالوں کی تراش خراش سے فارغ ہو کر خطبہ جمعہ کے لیے مسجد چلے گئے۔ اس شب اپنی والدہ محترمہ کو بہت زیادہ یاد کرتے رہے۔ آخری خطبہ سورۂ یٰسٓ کی چند آیات کی تفسیر کرتے ہوئے فکر آخرت کے موضوع پر ارشاد فرمایا۔ ہفتے کے دن حسب پسند ناشتہ فرمایا، دودھ پیا اور جاتے ہوئے کہہ گئے کہ ''آج میں دفتر پہنچ کر ڈاکٹر راشد صاحب سے فون پر بات کروں گا اور لاہور منتقل ہونے کے پروگرام کو فائنل کرنے کی کوشش کروں گا۔''

ہاں! واقعی آج ان کا اپنا پروگرام لاہور پہنچ کر مکمل ہو جانا تھا اور بایں صورت اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ آخری خواہش بھی پوری فرما دی۔

کاش اس آخری پروگرام میں میں بھی شریک ہو جاتی۔

مگر اللہ کو ہماری یہ جدائی ہی منظور تھی۔

اور اس محبت بھری زندگی کے لمحات مختصر ہی تھے۔

اندھیری دنیا میرا مقدر تھی......

بچوں کی نگاہ داشت کا بار گراں میرے ناتواں کندھوں پر رکھنا اللہ کو منظور تھا۔

اللھم لا تحرمنا اجره و لا تفتنا بعده و لا تضلنا بعده

خاندانی پس منظر اور حالات:

حافظ صاحب کے والد محترم عبدالعزیز صاحب مرحوم محمد دین صاحب کے بیٹے تھے اور محمد دین صاحب گوجراں والا میں رتہ باجوہ کے رہنے والے تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے اور متوکل علی اللہ انسان ہونے کی وجہ سے ''رتہ'' میں بہت مشہور تھے۔ لوگ اپنے بچوں کو دم وغیرہ کروانے اور دعا کروانے کے لیے ان کے پاس لایا کرتے۔ وہ اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے ''رتہ'' میں ''بابا جی'' کے نام سے مشہور تھے۔ ان کی نیکی اور پارسائی کے مختلف واقعات آج بھی رتہ کے بڑے بوڑھے لوگ بیان کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں حقیقی عزت و وقار کی دولت سے نواز رکھا تھا۔ ان کی نیکی کا ایک اثر یہ تھا کہ ان کی ساری اولاد (سب بیٹے اور بیٹیاں) دین دار، تہجد گزار اور شریعت کی پابند تھی۔ مگر ساری اولاد میں سے عبدالعزیز رحمہ اللہ صاحب دینی و دنیاوی تعلیم سے آراستہ تھے، تہجد گزار تھے، عمل صالح کی دولت سے مالا مال تھے۔ عبدالعزیز مرحوم کے کل گیارہ بچے تھے، حافظ صاحب ان سب بہن بھائیوں سے چھوٹے تھے، ان کے ۵ بہن بھائی تو بچپن میں ہی

Marfat.com

وفات پا گئے تھے جن میں سے دو بھائیوں کا نام ضیاء اللہ رکھا گیا مگر دونوں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

۱۹۵۲ء میں جب حافظ صاحب نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تو والدہ صاحبہ نے ان کا نام بھی ضیاء اللہ ہی رکھنا چاہا مگر اہل خانہ کی رائے سے محمد نعیم منتخب ہوا، جسے بعد میں حافظ صاحب نے نعیم الحق نعیم سے بدل لیا۔ حافظ صاحب کی عادات و اطوار بچپن سے ہی دوسرے بہن بھائیوں سے مختلف تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے سنجیدگی و متانت اور ذہانت انھیں بچپن سے ہی ودیعت فرما دی تھی، دیگر صلاحیتوں کی طرح حفظ و ضبط میں بھی نمایاں ملکہ حاصل تھا۔

آغاز تعلیم:

پانچ، چھے سال کی عمر میں جب تعلیمی دور کا آغاز ہوا تو والدہ محترمہ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ میں اپنے اس بیٹے کو خالص دینی تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتی ہوں، اس لیے اسکول بھیجنا مجھے پسند نہیں۔ اماں جی کے اس فیصلے پر بہت اختلاف ہوا، بڑے بھائی چونکہ دنیاوی تعلیم سے آراستہ تھے، اس لیے وہ اس فیصلے سے اتفاق نہ کر سکے۔ ان کا اعتراض صرف یہ تھا کہ دین دار (مولوی) لوگ روزگار کے معاملے میں بہت پریشان رہتے ہیں اور انھیں اکثر غربت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لہٰذا ہم اپنے بھائی کو اس تکلیف میں مبتلا نہیں دیکھ سکتے۔ یہ اختلاف اس حد تک پہنچ گیا کہ ایک طرف تو ماں جی نے والد صاحب کی رضامندی سے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے مسجد میں داخل کرانے کا فیصلہ کر لیا اور دوسری طرف ان سے بڑے بھائی صاحب نے انھیں انگریزی کے ابتدائی الفاظ اور گنتی وغیرہ سکھانا شروع کر دی اور مختلف اشیاء کے نام بھی سکھائے جن کی تعداد سو کے لگ بھگ تھی، نیز عصری تعلیم کے بہتر ہونے کو ان کے ننھے منے ذہن میں اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش شروع کر دی۔ بالآخر ایک دن حافظ صاحب کو اپنے ساتھ لے گئے اور مختلف مساجد اور اسکول دکھائے، دونوں کا فرق سمجھایا کہ مساجد میں بچے بغیر کسی سہولت کے زمین پر بیٹھ کر پڑھتے ہیں جب کہ اسکول میں خوب صورت یونیفارم میں ملبوس ڈیسکوں پر بیٹھے ہوئے بچے بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ پھر انھیں بازار سے جرابیں بوٹ اور دیگر اشیائے ضرورت خرید کر دیں اور ساتھ ساتھ تاکید کی کہ اب گھر پہنچ کر اماں جی سے یہ کہنا کہ میں مسجد میں نہیں بلکہ اسکول میں پڑھنا چاہتا ہوں۔

بھائی صاحب کو اپنی کوشش اور محنت پر بھرپور اعتماد تھا کہ آج فیصلہ ہماری مرضی کے مطابق ہو جائے گا اور گھر آ کر اماں جی سے گزارش کی کہ آج آپ نعیم سے پوچھیں کہ اسے کہاں پڑھنا پسند ہے۔ لہٰذا اماں جی نے اس بارے میں سوال کیا تو حافظ صاحب نے کچھ توقف کے بعد کہا: ''جہاں اماں جی پڑھانا پسند کریں گی، میں وہیں پڑھوں گا اور مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔'' یہ کہہ کر بازار سے خریدا گیا سامان بھائی صاحب کو

Marfat.com

واپس کر دیا۔

تکمیل حفظ قرآن مجید:

اس کے بعد اماں جی انھیں مسجد اہل حدیث، چوک نیائیں میں اپنے استاد مولانا محمد اسمٰعیل سلفی رحمہ اللہ کے پاس لے گئیں۔ ان دنوں مولانا محمد اسمٰعیل سلفی رحمہ اللہ مسجد اہل حدیث کے مہتمم و منتظم تھے اور شعبہ حفظ میں حافظ احمد دین صاحب حفظہ اللہ بطور استاد خدمت دین میں مصروف تھے۔ مولانا صاحب نے حافظ نعیم رحمہ اللہ صاحب کو ان کے سپرد کیا۔ نورانی قاعدہ پڑھنے کے بعد تیسویں پارے سے حفظ کی ابتدا کی اور مختصر مدت میں ۲۰۔ دسمبر ۱۹۶۲ء کو جمعرات کے روز دس سال کی عمر میں قرآن مجید مکمل حفظ کر لیا۔

حافظ صاحب کے زمانۂ حفظ کے ساتھی حافظ عبدالمنان صاحب بیان کرتے ہیں کہ جب ہمارا قرآن مجید مکمل ہوا تو مسجد میں ختم القرآن کے سلسلے میں تقریب منعقد کی گئی، مسجد اہل حدیث میں اس سلسلے کی یہ پہلی تقریب تھی۔ اس پروگرام میں مولانا اسمٰعیل رحمہ اللہ صاحب بھی موجود تھے اور متکلم اسلام مولانا محمد حنیف ندوی صاحب رحمہ اللہ بطور مہمان خصوصی مدعو تھے۔ اس تقریب کا آغاز حافظ نعیم الحق رحمہ اللہ کی تلاوت سے ہوا۔ ان کی تلاوت کے پرسوز اور اصول تجوید کے مطابق ہونے کی وجہ سے حاضرین مجلس داد دیے بغیر نہ رہ سکے اور خود مولانا محمد حنیف رحمہ اللہ صاحب نے بھی خوشی اور محبت کا اظہار کرتے ہوئے اول انعام سے نوازا۔ ان کے استاد حافظ احمد دین صاحب نے فرمایا کہ دونوں طالب علم اس قدر قابل اعتماد ہیں کہ انھیں کاغذ کی سند کی ضرورت نہیں بلکہ یہ خود ہی سند ہیں۔ دوران حفظ بھی استاد صاحب کے تاثرات اپنے ان دونوں شاگردوں کے متعلق بہت اچھے تھے اور دونوں کے ذہین و فطین اور ہر لحاظ سے ایمان دار ہونے کی وجہ سے استاد محترم کو ان پر بہت اعتماد تھا۔ دونوں ساتھیوں کی منزل ابتدا ہی سے پختہ اور تلفظ درست تھا جس کی وجہ سے دونوں اپنی منزل اور سبق سے فارغ ہو کر اپنے استاد صاحب کے ساتھ دوسرے لڑکوں کی منزل سننے میں تعاون کیا کرتے تھے۔

استاد صاحب کو ان کی منزل کی پختگی پر اس قدر یقین تھا کہ جب بھی کسی مسجد سے شبینہ وغیرہ کا پیغام آتا یا کسی مسجد میں قرآن ختم ہو جانے کے بعد چند دن تراویح پڑھانے کے لیے کہا جاتا تو حافظ صاحب سرفہرست دونوں کا نام پیش کرتے اور خاص کر حافظ نعیم الحق صاحب کو مخصوص جگہوں پر بھیجنا پسند فرماتے۔ بعض اوقات دیوبندی مدارس کے طلبا ان سے مل کر شبینہ پڑھنے میں جھجک محسوس کرتے اور ایک دن پڑھنے کے بعد دوسرے دن پڑھنے سے معذرت کر لیا کرتے تھے۔ حافظ صاحب نے شیراں والا باغ گوجراں والا میں سرکاری شبینہ میں کئی مرتبہ حصہ لیا اور اول انعام حاصل کیا۔ حفظ کے بعد دونوں ساتھیوں کی مصروفیت کی راہیں بظاہر مختلف ہو گئی تھیں مگر دلوں میں اسلامی اخوت کا مضبوط رشتہ بدستور قائم رہا۔ حافظ عبدالمنان صاحب حفظ

Marfat.com

کے بعد اپنی بعض مجبوریوں کی بنا پر کاروبار کی طرف متوجہ ہو گئے مگر ان کے دل میں خدمت دین کی محبت قائم رہی اور بالآخر چند سال قبل انھوں نے بھی اپنی اس پیاس کو بجھانے کا ارادہ کیا اور حافظ نعیم الحق صاحب سے مشورہ کرنے کے بعد کاروبار ترک کر دیا اور مسجد فاروق اہل حدیث باغبان پورہ (گوجراں والا) میں قرآن کریم حفظ کروانا شروع کیا۔ (اللہ تعالیٰ ان کی اس جدوجہد کو جاری و ساری رکھے اور شرف قبولیت سے نوازے۔آمین)

خوش الحانی:

حافظ نعیم صاحب کو حفظ وضبط کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوش الحانی کی نعمت بھی حاصل تھی اور لہجے کے پرسوز ہونے کی وجہ سے ان کی قراءت میں مقناطیس کی سی قوت تھی۔ اس خداداد صلاحیت کی وجہ سے حسنِ قراءت کے کئی مقابلوں میں اول انعام ان کا مقدر بنا۔ ان کی تلاوت ایک دفعہ سننے والا بار بار سننے کا متمنی ہوتا تھا۔ خاص طور پر نماز میں پرسوز لہجے میں پڑھتے تھے جس کی وجہ سے نمازیوں پر رقت طاری ہو جاتی۔ حافظ صاحب کے بچپن کے کئی واقعات اس بات کے شاہد ہیں جن میں سے اختصار کے پیش نظر تین واقعات کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ حفظ قرآن کے مکمل ہونے کے فوراً بعد حافظ صاحب نے قلعہ دیدار سنگھ (گوجراں والا) میں نماز تراویح پڑھانا شروع کی، اس وقت حافظ صاحب کی عمر ۱۱ سال کے لگ بھگ تھی جس کی وجہ سے روزانہ نماز تراویح کے بعد گھر واپس آنا مشکل تھا، لہٰذا مسجد کی انتظامیہ نے مشورہ کر کے مسجد کے قریب ہی کسی گھر میں ان کے قیام کا انتظام کیا اور رمضان کا مہینا حافظ صاحب وہیں رہے۔ جماعت کے لوگوں نے اور جس گھر میں حافظ صاحب کا قیام تھا، انھوں نے حافظ صاحب کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا اور وہ انھیں اپنے افراد خانہ کی طرح سمجھتے رہے۔ حافظ صاحب بھی زندگی بھر ان کے حسن سلوک کو یاد کرتے رہے۔ اسی دوران ایک دن پیغام ملا کہ ''قلعے'' میں فلاں لڑکے پر جنات کا سایہ ہے اور وہ جنات آپ کے پیچھے نماز تراویح پڑھتے ہیں، وہ آپ کے لب و لہجے اور قراءت سے متاثر ہیں اور ملنے کا شوق رکھتے ہیں۔ بہرحال اس کے بعد ملاقات ہوئی تو جنات نے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہم آپ سے تعلقات استوار کرنا اور دوستی کرنا چاہتے ہیں۔

حافظ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میں اس بات سے بہت خوف زدہ ہوا اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا جواب دوں۔ پھر میں نے ان سے کہا کہ میں اپنی والدہ صاحبہ کو پوچھ کر چند دنوں کے بعد بتاؤں گا۔ جب حافظ صاحب گھر ملنے کے لیے آئے تو اماں جی سے اس بات کا ذکر کیا۔ اماں جی نے انھیں اور

Marfat.com

زیادہ خائف کر دیا اور اس محبت سے انکار پر ان کا ذہن مزید پکا کر دیا۔ چند دن گزرنے کے بعد حسب وعدہ جنات کی دوسری ملاقات ہوئی اور انھوں نے اپنی بات کا جواب طلب کرنا چاہا تو حافظ صاحب نے صاف صاف انکار کر دیا، جس کی وجہ سے انھوں نے بے موسم پھل اور دور دراز علاقوں کی سیر کروانے حتی کہ حج اور عمرہ کروانے تک کا لالچ دینا چاہا مگر حافظ صاحب اپنے انکار پر پکے رہے اور قرآن مجید مکمل کرنے کے بعد اپنے گھر آ گئے۔

رمضان کے بعد اس لڑکے کی صحت ایک دفعہ زیادہ خراب ہوگئی۔ اس کے گھر والوں نے کسی عامل کو بلایا اور اس نے ان جنات کو حاضر کر کے نکل جانے کا حکم دیا۔ مگر جنات نے شرط لگائی کہ ہمیں ایک دفعہ حافظ نعیم صاحب کا قرآن سنایا جائے، پھر ہم ہمیشہ کے لیے چلے جائیں گے۔ لہٰذا اس لڑکے کے اہل خانہ حافظ صاحب کو اپنے ساتھ لے گئے اور حافظ صاحب نے انھیں تلاوت سنائی۔ اس طرح ان کی تلاوت کی وجہ سے اس مریض کو اللہ تعالیٰ نے شفایاب کر دیا۔

۲۔ ایک مرتبہ ''کھوکھر کے'' کی مسجد میں نماز تراویح پڑھانا شروع کی۔ ان دنوں وہاں آبادی بہت کم تھی اور آج کل کی طرح گنجان نہیں تھی۔ لوگوں کے دلوں میں موجودہ دور کی نسبت قرآن مجید کی محبت بھی بہت زیادہ تھی، آبادی کم ہونے کی وجہ سے مساجد بہت دور دور ہوا کرتی تھیں، لہٰذا مساجد میں لاؤڈ اسپیکر کی تیز آواز پر کسی کو اعتراض نہیں ہوا کرتا تھا۔

رمضان المبارک کی ایک سرد رات کا واقعہ ہے کہ حافظ صاحب ''کھوکھر کے'' کی مسجد میں نماز تراویح پڑھا رہے تھے کہ اسی دوران سیٹلائیٹ ٹاؤن کی دیوبندی مکتبِ فکر کی مرکزی مسجد کے قاری طلحہ قدوسی صاحب اپنی مسجد سے نکلے، خنک رات کی خاموشی میں یہ پھیلتی ہوئی آواز ان کو اس قدر بھلی معلوم ہوئی کہ وہ سائیکل پر آواز کی جستجو میں چل پڑے اور آواز کی سمت میں چلتے چلتے ''کھوکھر کے'' کی مسجد میں پہنچ گئے۔ دیکھا کہ بارہ تیرہ سال کا ایک بچہ قرآن سنا رہا ہے اور وہ بھی اس انداز میں کہ کسی بھی جگہ پر غلطی یا متشابہ کا امکان نہیں۔ قاری طلحہ صاحب بہت خوش ہوئے اور نماز مکمل ہونے کے بعد حافظ صاحب کو پیار بھرے لہجے میں دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

۳۔ حافظ صاحب اپنی زندگی کا ایک اور یادگار واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ وہ نماز پڑھا رہے تھے کہ ایک عمر رسیدہ حافظ قرآن ان کی آواز سن کر آواز کے پیچھے پیچھے مسجد میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور نماز شروع ہونے کی وجہ سے خود بھی نماز میں شریک ہو گئے۔ لیکن ایک بچے کے منہ سے قراءتِ قرآن کی خوب صورتی اور روانی دیکھ کر برداشت نہ کر سکے اور بلاوجہ ایک مقام پر غلط لقمہ دے دیا۔ حافظ

Marfat.com

صاحب نے لقمہ قبول نہ کیا اور پیچھے سے شروع کر کے اپنی یادداشت کے مطابق پڑھ گئے، اس نے دوبارہ لقمہ دیا مگر پھر حافظ صاحب پیچھے سے شروع کر کے آگے نکل گئے۔ وہ شخص غصہ سے بیخ پا ہو گیا اور زبردست ڈانٹ کے لہجے میں اس نے پھر لقمہ دے ڈالا۔ تیسری مرتبہ بھی حافظ صاحب نے اس کی پروانہ کرتے ہوئے اپنی قراءت جاری رکھی۔ نہ جانے اس شخص نے کس طرح سلام پھیرنے تک صبر کیا اور پھر سلام کے بعد صفوں کو چیرتے ہوئے آگے آیا اور غضب ناک لہجے میں بولا کہ ہم لوگ زندگی بھر سے قرآن سناتے چلے آ رہے ہیں مگر یہ کل کا بچہ ہماری بات ماننے کو تیار نہیں۔ اس کی اس گفتگو سے مسجد میں سناٹا چھا گیا اور پھر ایک معتبر شخص بولے کہ ہمارے حافظ صاحب کی منزل بہت پختہ ہے مگر پھر بھی ہم قرآن مجید دیکھ کر غلطی دور کر لیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید لایا گیا اور جب اس مقام پر اس لفظ کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ چھوٹے حافظ صاحب ہی درست پڑھ رہے تھے، بوڑھے حافظ صاحب نہ جانے کیوں اپنی یادداشت کھو گئے تھے اور غلطی ان کی اپنی ہی تھی۔

درس نظامی میں داخلہ:

حفظ قرآن سے فارغ ہوتے ہی حافظ صاحب نے شوال ۱۹۶۳ء میں درس نظامی کے لیے اسی مسجد (چوک نیائیں) میں داخلہ لے لیا۔ اردو تعلیم کی طرف عدم توجہ کی وجہ سے انھیں لکھنے پڑھنے میں کوئی خاص مہارت نہیں تھی۔ مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب رحمہ اللہ ان دنوں اس مدرسے کے ممتحن تھے۔ اس دوران پہلے امتحان میں جب انھوں نے حافظ صاحب میں تحریر کی کمزوری محسوس کی تو ان کی توجہ اردو تعلیم کی طرف مبذول کروائی۔ چنانچہ انھوں نے تھوڑے ہی عرصے میں اپنی اس کمی کو دور کر لیا۔ بعد ازاں پڑھائی کے تمام عرصے کے دوران اساتذہ کی نگاہوں کا مرکز بنے رہے اور ہمیشہ نمایاں پوزیشن حاصل کرتے رہے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب شیخ الحدیث مولانا اسماعیل سلفی رحمہ اللہ اس مسجد اور مدرسے کے منتظم تھے اور درس نظامی کی کلاسیں مرکزی مسجد اہل حدیث میں ہوا کرتی تھیں، مولانا عبداللہ صاحب رحمہ اللہ درس نظامی کے استاد تھے۔ ۱۹۶۸ء (۱۳۸۷ھ) میں جب مولانا اسمٰعیل رحمہ اللہ کی وفات ہوگئی تو اس کے بعد مولانا عبداللہ صاحب مسجد کے خطیب مقرر ہو گئے۔

مولانا اسماعیل رحمہ اللہ کی وفات سے پہلے مولانا عبداللہ صاحب کنگنی والا میں جامعہ محمدیہ کی تعمیر شروع کر چکے تھے اور ان کی یہ خواہش تھی کہ درس نظامی کی کلاسیں جامعہ محمدیہ میں منتقل کر دی جائیں، لہٰذا مولانا رحمہ اللہ کی وفات کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ شعبہ حفظ اور درس نظامی کی ابتدائی کلاسیں مسجد اہل حدیث میں اور انتہائی کلاسیں جامعہ محمدیہ میں ہوا کریں گی۔ حافظ صاحب نے بھی آخری تعلیم جامعہ محمدیہ میں حاصل کی اور ۱۹۷۰ء

Marfat.com

میں سند فراغت لی۔ حافظ صاحب کے والد محترم کی وفات بھی اسی سال ماہ جون میں ہوئی۔ وہ چند مہینے بیمار رہنے کے بعد اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

شاعری کا شوق:

درس نظامی کی تعلیم کے دوران حافظ صاحب کے دل میں شاعری کے شوق نے انگڑائی لی، چنانچہ انھوں نے اس طرف بھی توجہ کیے رکھی اور درس نظامی کی تکمیل کے دوران تقریباً ڈھکے چھپے شاعر بن چکے تھے۔ اپنی شاعری کے متعلق وہ خود ہی ایک واقعہ کا ذکر اس طرح کیا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ لاہور میں اردو محاذ والوں نے ایک خاص موضوع پر مشاعرے کا اہتمام کیا اور شعراء کو مقابلے کے لیے مدعو کیا، اس مشاعرے کو بذریعہ اخبار مشتہر کیا گیا تھا۔ حافظ صاحب کی نظر سے جب وہ اشتہار گزرا تو انھوں نے بھی مشاعرے میں شرکت کے ارادے سے غزل لکھ کر بذریعہ ڈاک روانہ کر دی۔ چند دنوں کے بعد جب کہ وہ اس غزل کو تقریباً بھول چکے تھے، انھیں ایک خط موصول ہوا جس میں ان کی غزل کے اول نمبر ہونے پر مبارک باد کے ساتھ مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی (اس مشاعرے میں فیصلہ کرنے والے ماضی قریب کے عظیم شاعر احسان دانش تھے) حافظ صاحب کی اس غزل کا اہل خانہ کو پہلے علم نہیں تھا، جس کی وجہ سے اس دعوت پر انھیں بہت حیرانی ہوئی۔

حافظ صاحب بتایا کرتے تھے کہ اس سے پہلے مجھے اکیلے لاہور جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا اور نہ لاہور کے راستوں سے مجھے کوئی واقفیت تھی۔ مقررہ تاریخ پر وہ اپنے بڑے بھائی عطاء اللہ عطا صاحب کے ساتھ لاہور پہنچے۔ مگر وہ اپنی سروس کی مجبوری کی وجہ سے مشاعرے میں شرکت نہیں کر سکے تھے، انھوں نے اپنے چچا زاد بھائی جاوید صاحب کو یہ ذمہ داری سونپ دی۔

حافظ صاحب جب اپنے چچا زاد بھائی کے ساتھ محفل میں پہنچے تو شریک محفل شعراء حضرات سمجھے کہ شاید دونوں میں سے بڑے بھائی شاعر ہیں۔ لیکن جب انعام حاصل کرنے کے لیے اسٹیج پر بلایا گیا اور اپنی غزل خود پڑھ کر سنانے کی استدعا پر حافظ صاحب اپنی نشست سے اٹھے تو حال میں موجود تمام لوگ انگشت بدنداں ہو گئے کہ بوڑھے بوڑھے شاعروں کا مقدر دوسرا اور تیسرا انعام بنا اور ایک نو عمر بچہ اول انعام کا میڈل حاصل کر رہا تھا۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ

درس نظامی سے فراغت اور مزید تعلیمی سرگرمیاں:

درس نظامی کے دوران قراءت و تجوید کا کورس بھی کیا۔ ان دنوں تجوید درس نظامی میں باقاعدہ شامل نہیں تھی۔ ۱۹۷۱ء میں فارسی فاضل کا امتحان اچھے نمبروں میں پاس کرنے کے بعد میٹرک کی تیاری شروع کر دی،

Marfat.com

جس کے لیے بڑے بھائی کے دوست سعید مرحوم کی خدمات حاصل کی گئیں اور اس طرح ۱۹۷۳ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اس میں نمایاں پوزیشن حاصل کی۔

حافظ صاحب کو مدینہ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا اور ان دنوں مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ صرف جامعہ سلفیہ فیصل آباد سے فارغ التحصیل طلباء کو دیا جاتا تھا۔ حافظ صاحب نے اپنی اس نیک خواہش کی تکمیل کے لیے جامعہ سلفیہ میں داخلہ لے لیا۔ مگر فیصل آباد کی آب وہوا کے ناموافق ہونے کی وجہ سے طبیعت ناساز رہنے لگی اور چند دنوں کے بعد واپس لوٹ آئے۔ دراصل اللہ تعالیٰ کو ان کے اس پروگرام میں تاخیر منظور تھی جس کی ظاہری وجہ صحت کی خرابی بنی۔ فیصل آباد سے واپس آکر انھوں نے دوبارہ عصری تعلیم شروع کر دی اور پرائیویٹ تیاری کر کے ۱۹۷۶ء میں ایف اے کا امتحان پاس کیا۔

تدریس کا آغاز:

ان تعلیمی سلسلوں سے کامیاب فراغت کے بعد تدریس کی غرض سے حافظ صاحب راولپنڈی روانہ ہو گئے جہاں کچھ عرصہ مسند تدریس پر فائز رہے، پھر لاہور آکر مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کے ساتھ ''تنقیح الرواۃ'' کی تیسری جلدی کی تصحیح میں مصروف ہو گئے۔

مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ:

۱۹۷۸ء میں اللہ تعالیٰ نے مدینہ یونیورسٹی میں داخلے کے اسباب پیدا فرمائے اور حافظ صاحب اس غرض سے سعودیہ روانہ ہو گئے۔ ادھر ان کی والدہ محترمہ نے موقع غنیمت جانتے ہوئے اگلے سال ۱۹۷۹ء میں فریضۂ حج کی ادائیگی کا ارادہ کیا اور ایک رشتے دار مرد اور چند خواتین کے گروپ کے ہمراہ عازم حج ہوئیں۔ راستے میں اپنی نقدی باقی حاجیوں کے ساتھ اس محرم کے سپرد کر دی۔ حاجیوں کا یہ قافلہ ابھی حاجی کیمپ کراچی تک ہی پہنچا تھا کہ معلم صاحب کا بیگ چوری ہو جانے کی وجہ سے تمام حاجی نقدی سے خالی ہاتھ ہو گئے جس کی وجہ سے باقی حاجیوں کے ساتھ والدہ صاحبہ کو بھی خاصی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ جدہ پہنچ کر جب حافظ صاحب سے اماں جی کی ملاقات ہوئی اور انھیں اس نقصان کا علم ہوا تو انھوں نے یونیورسٹی سے ملنے والے وظیفے کی رقم سے اماں جی کے تمام اخراجات پورے کیے اور ان کی پسند کے مطابق انھیں تحائف وغیرہ بھی خرید کر دیے۔ معمول اور طاقت سے زائد ان اخراجات کی وجہ سے بعد میں حافظ صاحب کو اپنی ضروریات کی خاطر اپنی کلائی کی گھڑی فروخت کرنا پڑی، جس کی آدھی رقم سے انھوں نے اپنی ضروریات کی تکمیل کی اور آدھی رقم سے سیکنڈ ہینڈ گھڑی خریدی جو وفات تک ان کے ہاتھ میں رہی اور اب بطور یادگار میرے پاس موجود ہے۔

Marfat.com

انعام اور آزمائش:

۱۹۷۹ء حافظ صاحب کی زندگی کا اہم ترین سال تھا۔ اس سال انھیں حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل ہوئی اور ایک زبردست قسم کی پریشانی بھی لاحق ہوئی۔

اس سال ارکان حج مکمل ہونے کے بعد چند نوجوانوں نے بیت اللہ پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا اور بہت سا اسلحہ جنازوں کی شکل میں بیت اللہ کے اندر پہنچا دیا اور بیت اللہ کے تمام دروازے بند کر کے حاجیوں کو بیت اللہ میں محصور کر دیا۔ اتفاق سے اماں جی اس وقت بیت اللہ کے اندر تھیں اور حافظ صاحب مدینہ منورہ میں تھے۔ حافظ صاحب کو جب یہ خبر پہنچی تو وہ اماں جی کی خبر گیری کے لیے مکہ مکرمہ پہنچ گئے اور واپسی پر کسی وجہ سے لیٹ ہو گئے۔

ادھر سعودی حکومت نے تمام یونیورسٹیوں کے غیر حاضر طلبہ کو زیر تفتیش کرنے کا فیصلہ کیا اور اس فیصلے کے مطابق دیگر طلباء کے ساتھ حافظ صاحب بھی تفتیش کی زد میں آ گئے۔ مگر کسی قسم کا کوئی جرم ثابت نہ ہونے کی وجہ سے ساتھیوں سمیت بری کر دیے گئے۔ گویا یہ پریشانی بھی انھیں والدہ صاحبہ کی خدمت اور خبر گیری کی خاطر اٹھانا پڑی۔ جزاہ اللہ خیرا

سعودی عرب سے واپسی:

سعودیہ سے واپسی کے بعد ۱۹۸۰ء میں طب سیکھنے کا شوق انھیں طبیہ کالج لاہور لے گیا۔ طب میں داخلے کا سبب دراصل ان کی اپنی صحت کی خرابی تھی۔ انھیں والد محترم کی وفات کے بعد کمر میں درد کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا، جس کے علاج سے تقریباً سب عاجز آ چکے تھے، طویل علاج معالجے کے باوجود انھیں مکمل آرام نہ آیا۔ حافظ صاحب کا خیال یہ تھا کہ طب پڑھنے کے بعد خود اپنا علاج کیا جائے مگر حسنِ اتفاق سے وہاں ان کی ملاقات حکیم محمد صدیق شاہین (رحمہ اللہ) سے ہوگئی۔ حکیم صاحب اس وقت لاہور میں اپنا مطب چلا رہے تھے اور طبیہ کالج آتے جاتے تھے۔

حکیم صاحب نے حافظ صاحب کی نبض تھامتے ہی فرمایا کہ آپ کی کمر میں فلاں جگہ پر ہوا ٹھہرنے کی وجہ سے درد ہے۔ حافظ صاحب رحمہ اللہ ان کی اس تشخیص پر بہت حیران ہوئے اور پھر ان سے علاج شروع کر دیا اور ان کے علاج پر اس قدر مطمئن ہوئے کہ تا زندگی انھیں کسی اور علاج پر اطمینان نہ ہو سکا۔ اس کے بعد اپنی اور بچوں کی جسمانی تکالیف میں ہمیشہ حکیم صاحب ہی کی طرف رجوع کرتے رہے اور حکیم صاحب بھی ان سے ہمیشہ حسن سلوک سے پیش آتے رہے۔

جزاہ اللہ تعالیٰ جزاء حسنا فی الدارین

Marfat.com

طبیہ کالج میں کچھ عرصہ پڑھنے کے بعد جامعہ رحمانیہ لاہور سے بسلسلہ تدریس منسلک ہو گئے، جہاں تدریس کے ساتھ ساتھ نظم ونسق کی ذمہ داری بھی انھی کو سونپ دی گئی اور بحمد اللہ تعالیٰ ان کے دور میں جامعہ کے حالات پہلے دور سے بہتر رہے اور جامعہ ترقی کی منازل تیزی سے طے کرتا رہا۔

صدر ضیاء الحق مرحوم کے دور میں شرعی عدالتیں وجود میں آئیں تو جج اور وکلاء حضرات کو شرعی قوانین سیکھنے کی ضرورت پیش آئی اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مختلف جگہوں پر قاضی کلاسوں کا اجراء ہوا۔ جامعہ رحمانیہ میں بھی اس سلسلے میں قاضی کلاس شروع کی گئی، حافظ صاحب اس میں بھی تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ قاضی کلاس میں معمر جج اور وکیل حضرات بعض اوقات باہمی مشورے سے مشکل ترین اور الجھے ہوئے سوالات حافظ صاحب رحمہ اللہ کے سامنے پیش کر کے انھیں لاجواب کرنے کی کوشش کرتے۔ مگر بتوفیقہ تعالیٰ حافظ صاحب ہر سوال کا جواب بطریق احسن دینے میں کامیاب ہو جاتے۔

شادی خانہ آبادی:

اکتوبر ۱۹۸۴ء میں جب رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے تو اس وقت بھی جامعہ رحمانیہ میں ہی مصروف کار تھے۔ ۱۹۸۵ء میں مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب (نور اللہ مرقدہ) کی خواہش پر "تنقیح الرواۃ" کی چوتھی جلد کی تکمیل کے سلسلے میں دفتر الاعتصام (دار الدعوۃ السلفیہ) سے وابستہ ہو گئے اور پھر تادم آخر اس دفتر میں مختلف امور بخیر وخوبی سرانجام دیتے رہے۔

سفرِ حج:

۱۹۹۴ء میں ان کے قریبی دوست اور مشفق بھائی ڈاکٹر راشد رندھاوا صاحب نے حج بدل ادا کرنے کے متعلق بات کی تو حافظ صاحب نے اس دعوت کو قبول فرمایا اور حافظ احمد شاکر صاحب (حفظہ اللہ) نے بھی وسعتِ قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اجازت کے ساتھ ساتھ انتہائی خوشی کا اظہار کیا۔ اس طرح حافظ صاحب رحمہ اللہ نے ۱۰ حاجیوں کے ہمراہ حج کے لیے رخت سفر باندھا۔

حافظ صاحب رحمہ اللہ کو حج جیسی نعمتِ عظمیٰ مل جانے پر اس قدر خوشی تھی کہ ناقابل بیان ہے۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان سے رخصت ہوتے وقت مجھے کہہ گئے تھے کہ میں مکہ اور مدینہ کے بازاروں میں خریداری کی غرض سے چکر لگا کر اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا، لہٰذا بہن بھائیوں کے تحائف پاکستان سے ہی خرید لیں گے اور پھر اپنے اس قول کے مطابق سعودیہ سے ساز وسامان کا بوجھ لادنے کی بجائے صرف چند کتابیں جو پاکستان میں نایاب تھیں، خریدیں۔ غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اس عظیم احسان کی قدر اس طرح کی کہ ادائیگی حج کے بعد بارگاہِ الٰہی میں جھکتے ہی چلے گئے اور عجز وانکسار کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ ان کی اس حالت عجز کی

Marfat.com

گواہ خود ان کی اپنی تحریر ہے جو انھوں نے بیت اللہ میں بیٹھ کر میرے نام لکھی اور پاکستان روانہ کی، اپنے اس خط میں لکھتے ہیں:

''بیت اللہ میں پہنچ کر مجھے جب یہ خیال آتا ہے کہ چودہ پندرہ سال بعد اللہ تعالیٰ نے مجھ پر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے دروازے کھول دیے ہیں، تو آنکھوں سے ایسے آنسو جاری ہوتے ہیں کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ ایسے وقت میری کیفیت بالکل وہی ہوتی ہے جو آدم علیہ السلام کی ہوئی ہوگی جب کہ ان کی توبہ قبول کی گئی ہوگی، جب وہ جنت سے نکالے گئے تھے۔''

مزید رقم طراز ہیں:

''لگتا ہے میری بھی توبہ قبول ہوگئی ہوگی، تبھی تو جنتِ ارضی کے دروازے مجھ جیسے عاصی پر کھول دیے گئے ہیں۔ اے اللہ! میرے اس حسنِ ظن کو سچا کر دکھا۔ آمین ثم آمین۔''

حج کے اثرات:

حج سے واپسی کے بعد حافظ صاحب رحمہ اللہ کی طبیعت میں یکسر تبدیلی آ گئی، شوقِ عبادت بڑھ گیا، اخلاقی اقدار بلند تر ہو گئیں، ہمدردی اور خدمتِ خلق کا جذبہ پروان چڑھتا گیا، دنیا سے بے رغبتی اور زیب و زینت کی اشیا سے بے رخی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ عجز و انکسار تو پہلے ہی ان کے رگ و ریشے میں سمایا ہوا تھا، حسن گفتار اور تحمل مزاجی ان کا شعار تھا، اہل خانہ سے بالخصوص والدہ محترمہ اور بڑے بھائی کے ساتھ محبت میں اضافہ ہو گیا۔

والدہ سے حسن سلوک:

ان کے والد صاحب تو تقریباً ۲۹ سال قبل اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ مگر والدہ محترمہ ابھی حیات تھیں، ان کی وفات حافظ صاحب کے حادثے سے ۲ سال ۶ دن قبل ہوئی۔ اس طرح انھیں اماں جی کی خدمت کرنے کا بہت موقع ملا رہا، والدہ کے ساتھ ان کا تعلق ﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ﴾ (بنی اسرائیل: ٢٤) کا آئینہ دار تھا۔ اماں جی کی وفات سے تقریباً ۴ ماہ قبل تک تنخواہ کی رقم اماں جی کے ہاتھ پر لا کر رکھا کرتے اور پیسے دینے کا انداز کچھ ایسا ہوتا تھا کہ گویا اماں جی کے تنخواہ قبول کرنے پر حافظ صاحب ان کے شکر گزار ہیں۔

گھریلو معاملات میں اماں جی کا فیصلہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا تھا اور پھر حیرت انگیز بات یہ کہ ان کے فیصلے کو قبول کرتے وقت ان کے ماتھے پر کبھی ناگواری کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ بلکہ خوش دلی کے ساتھ ان کا فیصلہ قبول فرماتے اور فوراً ان کے فیصلے کو جاری کر دیتے تھے اور ان کی خواہش کو اہل خانہ کی خواہشات پر

Marfat.com

فوقیت دیتے۔

اماں جی عرصہ دراز تک بیمار رہیں، فالج کی وجہ سے انھیں چلنے پھرنے میں بہت دقت محسوس ہوتی تھی، اسی عارضے کی وجہ سے ان کی آواز بھی بہت حد تک متاثر ہوگئی تھی۔ بعض اوقات بڑی کوشش کے باوجود بھی ان کی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کئی دفعہ یوں ہوتا کہ حافظ صاحب لاہور جانے کے لیے بالکل تیار ہوتے اور باہر نکلنے لگتے تو اماں جی انھیں بلالیتیں اور پھر ان کی بات سمجھتے سمجھتے گاڑی نکل جاتی۔ حافظ صاحب اس کوفت کو برداشت کر لیتے مگر والدہ کی بات ٹالنے کی کوشش نہ کرتے۔ بلکہ ان کے ماتھے پر شکن تک نہ آتی اور ان کی اطاعت وخدمت گزاری کو حافظ صاحب ہر چیز پر مقدم رکھتے۔

اماں جی کی ضروریات کی تکمیل اور خدمت کے سلسلے میں انھیں مجھ پر بہت اعتماد تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۹۹۴ء میں نے حج پر جانے کا ارادہ کیا تو اماں جی کی کمزوری کے پیش نظر میری ہزار خواہش کے باوجود مجھے ساتھ لے جانے پر آمادہ نہ ہوئے اور مجھے گوجراں والا میں رہنے کی تلقین کر کے سعودیہ روانہ ہو گئے۔ اسی سال میرے بھائی صاحب بھی اپنی اہلیہ کے ہمراہ ادائیگیٔ حج کے لیے جا چکے تھے، ان کے چلے جانے کے بعد میری والدہ صاحبہ (ناظمہ جامعہ تہذیب البنات حاجی آباد، فیصل آباد) اچانک شدید بیمار ہوگئیں۔ انھیں فاطمہ ٹرسٹ ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ اتفاق سے ان کی بیمار پرسی بعض وجوہات کے تحت میرے ہی ذمہ آئی، چنانچہ اماں جی اور حافظ صاحب کی اجازت ہی سے تقریباً پانچ، چھے دن کے لیے میں فیصل آباد گئی اور باقی وقت اماں جی کے پاس ہی گزارا۔

بچوں کی نگاہ داشت اور تربیت:

حافظ صاحب بچوں کے معاملات اور ان کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دیتے اور اس سلسلے میں بہت فکرمند رہتے، اللہ تعالیٰ نے انھیں دو بیٹیوں اور تین بیٹوں سے نواز رکھا تھا، بیٹی کے ساتھ انھیں بہت محبت تھی، بچوں کے نام اپنی مرضی سے تجویز فرماتے اور مسنون عقیقے کا خصوصی اہتمام فرماتے۔ تیسرے بیٹے کی آمد پر سجدۂ شکر اور نوافل کی ادائیگی کے ساتھ خوشی کا اظہار فرمایا اور عقیقہ کے دو بکرے گھر لا کر ذبح کیے جب کہ تیسرا بکرا اہل خانہ کے علم میں لائے بغیر باہر ہی ذبح کروا کر تقسیم کرا دیا۔

اعمال کا اثر گفتگو میں:

زیارت حرم کے بعد عملی طور پر مزید پختہ ہو جانے کی وجہ سے ان کی گفتگو بہت مؤثر ہوگئی تھی، جو بات بھی کہتے ہر عام وخاص کے دل میں اتر جاتی، بے عمل اور دین سے دور لوگ ایک دو مجلسوں کے بعد بے عملی سے تائب ہو جاتے اور پانچ وقت کی نماز کے پابند ہو جاتے، بہت سے نوجوانوں کے چہرے حافظ صاحب

Marfat.com

کے سمجھانے سے ڈاڑھی سے مزین ہو گئے تھے۔

لاہور میں ایک دوست سے فوٹو گرافی کے موضوع پر بات چیت کرتے ہوئے اسے سمجھایا کہ یہ کاروبار ناجائز ہے، شرعی دلائل کے ساتھ اسے بہت جلد قائل کرلیا، چنانچہ وہ شخص اپنے اس کاروبار کو تبدیل کرنے پر آمادہ ہو گیا اور اس کے دوسرے دوست نے تعاون کرتے ہوئے اسے سلائی کا فن سکھایا، جس کے بعد اس بندۂ خدا نے غلط کاروبار ترک کر کے کپڑوں کی سلائی کا کام شروع کر دیا۔

تقویٰ وللّٰہیت اور سادگی:

حافظ صاحب انتہائی سادہ اور کم گو تھے، تکلفات سے ان کی طبیعت بہت دور تھی۔ بے مقصد اور لمبی چوڑی گفتگو سے احتراز فرماتے۔ مخاطب کی طویل بات چیت کا مختصر مگر مؤثر اور دلائل پر مبنی جواب دے کر اسے مطمئن کر دیتے۔ شرعی حدود سے تجاوز اور خاندانی رسومات کے سخت مخالف تھے، صرف شرعی حدود کی ہی پابندی نہیں کرتے تھے بلکہ مشابہات سے بھی اجتناب کیا کرتے تھے۔ مشکوک اشیا کا استعمال اور کھانا پینا انھیں سخت ناپسند تھا۔ غلط رسومات اور اس طرح کی مجالس سے کنارہ کش رہنے کی کوشش کرتے، حتیٰ کہ لوگوں کے شادی بیاہ میں بہت کم شرکت کرتے اس لیے کہ اس میں وقت ضائع ہوتا ہے۔ خواتین کی رسومات کی بھی ہمیشہ حوصلہ شکنی کرتے، میک اپ کے سامان کو مشکوک اشیاء کا مرکب ہونے کی وجہ سے ناپسند کرتے اور میک اپ کا تذکرہ کرتے ہوئے پلستر کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ زیورات کو عورت کے گلے کا طوق قرار دیتے، اس لیے کہ اس بناوٹی حسن کی خاطر عورتیں اپنا قیمتی وقت اور بھاری رقوم ضائع کر دیتی ہیں اور اپنے شوہروں کے لیے تکلیف اور پریشانی کا سبب بن جاتی ہیں۔

حافظ صاحب نے زندگی بھر سادگی کا دامن بڑی مضبوطی سے تھامے رکھا۔ ان کی اپنی شادی کے موقع پر بھی جہاں ان کی اپنی وضع قطع بالکل سادہ تھی وہاں گھر بار، ان کا کمرہ اور پورا ماحول سادگی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ برات کے ساتھ جانے والے مرد و زن کو بھی بے ہودہ لباس پہننے کی اجازت نہ تھی۔ میرے والدین کا بھی ان سے مطالبہ تھا کہ برات کے ساتھ کوئی عورت بغیر برقعے کے نہ آئے۔ شادی کے بعد ان کی سادگی اپنی ذات تک ہی محدود نہ رہی بلکہ انھوں نے مجھے بھی اپنے دائرۂ عمل میں داخل کرنے کی خواہش کا اظہار فرمایا۔ چوں کہ ہماری تربیت بھی کچھ اسی طرح کی گئی تھی اور دونوں خاندانوں کے تعلقات استوار ہونے کی سب سے بڑی وجہ طرفین کی دین داری اور سادگی تھی، لہٰذا ان کی یہ خواہش من و عن پوری ہو گئی۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ مجھے خوب یاد ہے:

شادی کے اگلے دن یعنی ولیمے کے بعد جب ہم فیصل آباد گئے تو وہاں سے امی جان کے مشورے سے

Marfat.com

ٹویرالان کے دوپٹے خریدنے کا ارادہ کیا تا کہ گھر کی چار دیواری میں پردہ وغیرہ کے لیے انھیں استعمال کیا جا سکے۔ مگر ہم متذبذب تھے کہ نہ جانے حافظ صاحب اس بارے میں کیا مشورہ دیتے ہیں۔ خیر، بازار سے دوپٹے منگوائے گئے اور جھجکتے ہوئے حافظ صاحب کو دکھائے تو دیکھتے ہی فرمانے لگے کہ ''میں یہ تو نہیں جانتا کہ رنگ اور ڈیزائن کے لحاظ سے کون کون سے دوپٹے اچھے ہیں۔ البتہ یہ جانتا ہوں کہ طرفین (دونوں گھروں) سے تیار ہونے والے تمام ملبوسات کے دوپٹوں سے یہ دوپٹے بہتر ہیں۔''

فضول خرچی سے اجتناب:

ان کی اپنی سادگی کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ سادہ لباس پہنتے، بہت قیمتی اور بڑھکیلا لباس انھیں پسند نہیں تھا۔ اسی طرح قیمتی قسم کا جوتا کبھی نہیں خریدتے تھے۔ بلکہ جوتے اور لباس کے متعلق ان کا موقف یہ تھا کہ ''جوتے کا مقصد پیر کی حفاظت ہے اور لباس ستر پوشی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور یہ مقاصد کم قیمت اشیاء سے بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔ لٰہذا ایسے فضول کاموں کے لیے رقوم خرچ کر کے نایاب چیز خریدنے کا شوق مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔ مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ نہ فضول خرچ ہوتا ہے اور نہ بخیل۔''

۱۹۹۸ء کے وسط کی بات ہے کہ ڈاکٹر راشد رندھاوا صاحب کی وساطت سے وزیر اعظم نواز شریف صاحب کے والد گرامی میاں شریف صاحب سے ملاقات کے لیے رائے ونڈ جانے کا پروگرام بنا، جس کا مقصد نفاذ شریعت کے موضوع پر ان سے گفتگو کرنا تھا۔ اس موقعے پر حافظ صاحب نے نیا جوتا اور ٹوپی خریدنے کا پروگرام بنایا۔ جناح کیپ کے متعلق ان کا خیال تھا کہ شرعی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ٹوپی کے سر سے اونچا ہونے کی وجہ سے اس میں کراہت محسوس ہوتی ہے۔ مجھے ان کے اس پروگرام پر تعجب سا ہوا کیونکہ ایک عرصے سے وہ اسے چھوڑ چکے تھے۔ بہر حال ملاقات کی مقررتاریخ سے ایک دن قبل حافظ صاحب بازار جانے کے لیے تیار ہوئے اور میں مدرسے جانے کے لیے۔

مدرسے سے واپس آ کر میں نے یقین اور بے یقینی کے ملے جلے انداز میں خرید شدہ ٹوپی وغیرہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو جواب میں مسکرا دیے اور کہنے لگے کہ ''دراصل میں بازار گیا ہی نہیں'' میں نے وجہ پوچھی تو جواب ملا کہ ''میں سوچ رہا ہوں کہ جانا تو اس لیے ہے کہ شریعت کے نفاذ پر بات چیت ہو سکے اور اس بات چیت کے ساتھ جوتے اور ٹوپی کا کیا تعلق ہے؟ لٰہذا میرا پروگرام تبدیل ہو گیا۔''

حافظ صاحب کا اپنا ایک شعر اس وقت بار بار یاد آ رہا ہے جس کے مخاطب اس وقت وہ خود ہی ہیں:

دنیا سے آج اٹھ گیا وہ خوش ادا فقیر
جس کی نظر میں دولتِ دنیا رہی حقیر

Marfat.com

خورونوش میں سادگی:

کھانے پینے کے معاملات میں بھی بے حد سادہ اور بے تکلف تھے۔ دسترخوان پر ایک ہی قسم کا کھانا پسند کرتے۔ سادہ دسترخوان کو پرتکلف دسترخوان پر ترجیح دیتے۔ نمک مرچ ذرا تیز پسند کرتے کیوں کہ اسے دائمی نزلہ وغیرہ کے لیے مفید سمجھتے تھے، ادرک اور گرم مسالا ضرور استعمال کرتے تھے۔ ایک وقت میں مختلف قسم کے کھانوں کے متعلق فرماتے کہ ''صرف فرائض ادا کرنے والے مسلمان کو فقط دال اور روٹی پر ہی اکتفا کرنا چاہیے، اور اگر زیادہ قسم کے کھانے پسند ہوں تو فرائض کے ساتھ ہر قسم کے نوافل کی بھی کثرت کرنی چاہیے۔'' صحت مند ہونے کی صورت میں کھانے پینے میں ہر چیز قبول فرما لیتے، کسی بھی کھانے میں نقص نہیں نکالتے تھے۔ اگر کوئی چیز زیادہ پسند ہوتی تو پسندیدگی کے مطابق زیادہ مرتبہ (دورانِ طعام) الحمد للہ کہتے اور کھانا مکمل کرنے کے بعد بار بار مختلف دعائیں دہراتے۔ کھانا بہت کم مقدار میں کھاتے۔ بیمار ہو جاتے تو کئی کئی دن صرف چائے اور شہد ملا قہوہ پی کر گزار دیتے اور بیماری کے دوران روٹی سے پرہیز کرتے، بھوک کی شدت محسوس ہوتی تو چند بادام اور میوہ کھا لیتے، الغرض قلیل الطعام اور قلیل المنام کے اصول پر سختی سے کاربند تھے۔ کھانا کھانے کے بعد مسنون طریقے سے برتن صاف کرتے اور بچوں کو بھی یہی تلقین کرتے۔ کھانا کھاتے وقت زیادہ برتن استعمال کرنے سے گریز کرتے اور ہر چیز کے لیے ایک ہی پلیٹ پر اکتفا کرتے۔

مشکوک و مشتبہ چیزوں سے اجتناب:

اگر کوئی دوست دعوت میں مدعو کرتے تو خوش دلی سے اس کی دعوت قبول کرتے۔ مگر مشکوک روزگار والوں کی دعوت سے حتی الامکان پرہیز کرتے، بینک ملازمین اور اس قسم کے دوسرے لوگوں کے ہاں کھانا پینا انھیں پسند نہیں تھا۔ ایسے موقعے پر اکثر معذرت کا سہارا لیتے ہوئے دعوت قبول کرنے سے بچ جاتے۔

مہمان نوازی:

مہمان نوازی بڑے شوق سے فرماتے، جب بھی کوئی مہمان تشریف لاتے تو ان کی میزبانی کو سنت رسول ﷺ کے مطابق ادا کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن اگر خود کسی کے ہاں مہمان بنتے تو اپنے میزبان کو تکلیف دینے سے ہر ممکن حد تک بچتے اور سادہ میزبانی کو خوش دلی سے قبول کرتے۔

عالی ظرفی اور وسعت قلبی:

غالباً ۱۹۹۷ء کا واقعہ ہے کہ فیصل آباد کی ایک جامعہ میں انھیں تقریب بخاری میں درس کے لیے مدعو کیا گیا۔ درس بخاری تو نمازِ عشا کے بعد تھا مگر کھانے کا پروگرام عشا سے پہلے تھا۔ حافظ صاحب دفتر الاعتصام سے فارغ ہو کر سیدھے فیصل آباد روانہ ہو گئے، مگر راستے میں تاخیر ہو جانے کی وجہ سے کھانے میں شریک نہ

Marfat.com

ہو سکے، جب جامعہ پہنچے تو پہلے کھانا کھانے کی بجائے درس کو ترجیح دی۔ درس ختم ہو جانے کے بعد میزبان گروپ کی طالبات اپنی ڈیوٹی کے مطابق کھانا برتنوں میں ڈالنے لگیں تو معلوم ہوا کہ سوائے شوربے اور روٹی کے باقی اشیاء ختم ہو چکی ہیں۔ رات کافی بیت چکی تھی، اس لیے طالبات نے ناظمہ کی لاعلمی میں وہی کھانا حافظ صاحب کو پیش کر دیا۔ وقت گزر گیا، حافظ صاحب رحمہ اللہ اگلے دن فیصل آباد سے سیدھے لاہور دفتر پہنچ گئے اور شام کو گھر آئے تو خیر و عافیت کے علاوہ کسی بات کا تذکرہ نہیں کیا۔

ادھر جامعہ میں ایک دو دن گزر جانے کے بعد جب یہ بات ناظمہ تک پہنچی تو انھوں نے بہت شرمندگی محسوس کی۔ چوں کہ درس کا یہ پروگرام میری وساطت سے بنا تھا، اس لیے جامعہ کی مختلف ذمہ دار خواتین کی طرف سے فون پر بار بار معذرت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں بڑی حیران ہوئی کہ حافظ صاحب نے تو دبے لفظوں میں بھی کسی بات کا ذکر نہیں کیا اور ادھر جامعہ والوں کی پریشانی کا یہ عالم تھا کہ انھیں اپنی بار بار کی معذرت بھی ناکافی محسوس ہو رہی تھی۔ خیر جامعہ والوں کو تو میں نے حافظ صاحب رحمہ اللہ کے متعلق مطمئن کر دیا مگر خود بے چینی سے رات ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

رات کو جب حافظ صاحب رحمہ اللہ گھر تشریف لائے اور انھیں اس واقعے کی خبر دی تو ہنس پڑے اور چند لفظوں میں بات ختم کرتے ہوئے کہنے لگے کہ ''جامعہ میں میرے جانے کا مقصد درس دینا تھا نہ کہ دعوت اڑانا اور ویسے بھی روٹی اور سالن دونوں چیزیں موجود تھیں تو پھر شکایت کس بات کی؟''

کفایت شعاری، قناعت پسندی اور دیانت داری:

لین دین کے معاملات میں بھی حافظ صاحب صاف ستھرے تھے۔ قرض اٹھا کر عیش کرنا انھیں سخت ناپسند تھا اور ضروریات کے سلسلے میں اپنی اوقات سے تجاوز کرنا ان کی طبیعت کے منافی تھا۔ کسی کا حق اپنے ذمے قطعاً نہیں رکھتے تھے۔

دورانِ سفر سواری والے پر زبردستی کرنے کی کوشش نہ کرتے بلکہ باہمی رضامندی سے کرایہ طے کرتے اور لڑائی جھگڑے سے گریزاں رہتے، سواری والے کو بتائے ہوئے مقام سے آگے لے جانے کی کوشش کبھی نہ کرتے۔

یومیہ لاہور جانے آنے کا معمول تقریباً ساڑھے چودہ برس جاری رہا۔ اس سفر کے لیے حافظ صاحب رحمہ اللہ ریلوے پاس کی سہولت سے استفادہ کرتے رہے، لیکن ریلوے پاس کے بارے میں بھی ہمیشہ احتیاط برتتے رہے اور اس پورے عرصے میں ایک مرتبہ بھی ریلوے والوں کو شکایت کا موقع نہیں ملا۔

کبھی کبھار مجھے بھی ان کے ساتھ لاہور جانے کا اتفاق ہو جاتا تو میرا کرایہ بھی ریلوے حکام کے حوالے

Marfat.com

کر دیتے۔ ایک مرتبہ لاہور جانے کے لیے ہم گوجراں والا اسٹیشن پر پہنچے تو گاڑی پہلے سے آ چکی تھی جس کی وجہ سے میرا ٹکٹ خریدا نہ جا سکا اور گاڑی میں ٹکٹ چیکر کی عدم موجودگی کی وجہ سے سفر یوں ہی تمام ہو گیا۔ جب ہم لاہور پہنچے تو حافظ صاحب رحمہ اللہ مجھے وہاں کھڑا کر کے خود ٹکٹ خریدنے کے لیے چلے گئے اور پھر میرے پاس آ کر اس ٹکٹ کو پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ گاڑی آ جانے کی وجہ سے تمھارا ٹکٹ گوجراں والا سے نہیں خریدا جا سکا لہٰذا اس صورت میں حکومت کو اس کا حق مل گیا۔

اسی طرح ایک مرتبہ لاہور سے مرغ کا گوشت خریدا اور دکان دار کو ایک ہزار روپے کا نوٹ دیا۔ گاڑی چلنے میں وقت تھوڑا تھا جس کے پیش نظر واپس ملنے والے پیسے بغیر گنے جیب میں ڈال لیے اور گھر آ کر دیکھا تو پتا چلا کہ دکان دار نے غلطی سے ایک سو روپے کا نوٹ زیادہ دے دیا ہے، لہٰذا اگلے دن لاہور گئے تو ویگن کے ذریعے اس دکان پر پہنچے اور اس کے پیسے اس کے حوالے کر کے اللہ کا شکر ادا کیا۔ غرض یہ کہ زندگی بھر ان کی یہ کوشش رہی کہ حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کو بھی اچھے طریقے سے ادا کیا جائے اور عمر بھر اِعْطِ كُلَّ ذِيْ حَقٍّ حَقَّهٗ کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر حق دار کا حق ادا کرنے کے لیے کوشاں رہے۔

لالچ، حرص، ہوس اور خود غرضی جیسی بیماریوں سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی رحمت خاص کے زیر سایہ بچائے رکھا اور وہ گزر اوقات سے متجاوز ہو کر مال و دولت کو اکٹھا کرنے کے ہرگز خواہش مند نہ ہوئے بلکہ ساری زندگی دعوتِ دین کو دولتِ دنیا پر ترجیح دیتے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے مدرسے سے کبھی تنخواہ لینے کا مشورہ نہیں دیا اور خود بھی زندگی بھر تنخواہ کے اضافے کے لیے کبھی درخواست پیش نہیں کی اور نہ رفقا کی لکھی ہوئی درخواست پر دستخط کر کے ان کے حامی بننے کی کوشش کی بلکہ ضرورت کے وقت اپنی درخواست ہمیشہ اللہ کے دفتر میں پیش کرتے اور اللہ تعالیٰ ان کے توکل کو قبول کرتے ہوئے ہر موقع پر ان کی درخواست کو بطریق احسن شرف قبولیت سے نوازتا رہا۔

غالباً ۱۹۸۶ء میں جب مسجد بلال میں جمعۃ المبارک کا خطبہ دینا شروع کیا تو ایک ماہ گزرنے کے بعد مسجد کی انتظامیہ نے حافظ صاحب رحمہ اللہ کو معاوضے کی کچھ رقم پیش کی، لیکن حافظ صاحب نے رضائے الٰہی کو مدنظر رکھتے ہوئے تنخواہ قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا حالاں کہ دفتر الاعتصام سے ملنے والی تنخواہ محدود سی تھی اور اس کے علاوہ کوئی اور ذریعہ معاش بھی نہ تھا۔ حافظ صاحب کے اس فیصلے پر مجھے بہت خوشی ہوئی۔

میرے والد محترم کو جب جمعہ پڑھانے کا پتا چلا تو انھوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا اور جب انھیں معلوم ہوا کہ حافظ صاحب نے تنخواہ قبول نہیں کی تو اس بات پر حافظ صاحب کو خصوصی طور پر مبارک باد دی۔ حافظ صاحب اس عزم بالجزم پر تاحیات قائم رہے حادثے سے ایک دن پہلے بھی جمعہ کا خطبہ ارشاد فرمایا اور اس طرح مسجد

Marfat.com

بلال میں ۱۳ سال اور چند ماہ تک اس ذمہ داری کو بہ احسن طور نبھایا۔

ہوش ربا گرانی کے پیش نظر ایک دوست نے کالج میں سروس کرنے کا مشورہ دیا تو حافظ صاحب نے سرکاری تنخواہ کا عذر پیش کرتے ہوئے معذرت کر لی۔ اسی طرح ایک مرتبہ ایک اور دوست (غالباً حافظ رفیق گکھڑوی) نے جو خود اس وقت سعودی عرب میں مصروف کار تھے، مشورہ دیا کہ آپ اپنی اسناد اور ضروری کاغذات سعودیہ روانہ کریں تاکہ آپ کو سعودیہ بلایا جا سکے۔ حافظ صاحب نے ان کے اس پیغام پر کافی غور و غوض کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ سعودیہ کی مسجد میں بچوں کو ناظرہ قرآن پڑھا کر زیادہ پیسے کمانے سے لاہور الاعتصام کے دفتر میں خدمت دین کا فریضہ انجام دینا زیادہ افضل ہے۔ اسی قسم کی ایک پیش کش پشاور کے ایک مدرسے والوں کی طرف سے بھی کی گئی، لیکن حافظ صاحب کی طرف سے جواب نفی میں ملا، جس کی وجہ مولانا عطاء اللہ حنیف مرحوم کی حافظ صاحب کو کی گئی وصیت تھی۔

ریڈیو پاکستان کے پروگرام ''قرآن حکیم اور ہماری زندگی'' میں درس کے لیے انھیں مدعو کیا جاتا تھا۔ پہلے درس کے لیے ریڈیو اسٹیشن گئے اور درس کی ریکارڈنگ کے بعد واپس چلے آئے۔ ان کے ذہن میں اس تبلیغ پر اجرت ملنے کا خیال ایک فی صد بھی نہیں تھا۔ اس کے بعد جب دوسرے درس کے لیے مدعو کیے گئے تو درس ریکارڈ ہو جانے کے بعد ڈائریکٹر صاحب نے ۱۰۰ روپے کے دو چیک انھیں تھما دیے۔ حافظ صاحب اس چیک کو وصول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے مگر ڈائریکٹر صاحب کے اصرار اور ان کے بتانے کے مطابق عدم قبولیت کے نقصانات کی بنا پر انھیں چیک قبول کرنے پڑے مگر ذہنی طور پر پھر بھی انھیں قبول نہ کر سکے اور اس دلی ناخوشی کی وجہ سے ارادہ کیا کہ چند چیک جمع ہو جانے کے بعد انھیں کیش کرایا جائے گا اور کسی ضرورت مند سرکاری ملازم پر خرچ کر دیا جائے گا مگر اتفاق کی بات کہ پہلی مرتبہ کیش کرانے کا ارادہ کیا تو کسی وجہ سے سارے چیک اکٹھے ہی ضائع ہو گئے۔ اس وجہ سے دوسری مرتبہ پھر ریڈیو اسٹیشن والوں نے چیک بنا کر دیے اور کیش کرانے کا ارادہ سوموار یا منگل کا تھا۔ مگر ہفتہ کو جان جان آفریں کے سپرد کر کے اس سرکاری رقم سے بچ گئے۔ ۱۹۹۲ء میں حافظ صاحب کے ایک قریبی دوست نے عید کے موقع پر ۵۰۰۰ روپے کا چیک گھر کے ایڈریس پر روانہ کیا۔ چیک خط کے اندر رکھا گیا تھا جس پر لکھا تھا کہ میں یہ رقم بچوں کو عیدی کے طور پر بھیج رہا ہوں، قبول فرمائیں۔ اس دور میں ۵۰۰۰ کی رقم کی بڑی وقعت تھی۔ حافظ صاحب اس چیک کو دیکھ کر بہت حیران ہوئے اور تعجب کے ساتھ بار بار کہتے جاتے تھے کہ بھلا ہمیں پانچ ہزار روپے کی کیا ضرورت تھی اور ہم اس خطیر رقم کو کیا کریں گے، پھر میری طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا کہ اگر تمھاری کوئی اپنی ضرورت ہو جو پوری نہ ہو سکی ہو تو کیش کرانے کا سوچ لیتے ہیں، لیکن کافی سوچ بچار کے بعد اس چیک کو کیش نہ کرانے کا فیصلہ کیا

Marfat.com

اور آج بھی وہ چیک حافظ صاحب کے ساتھ حادثے کا شکار ہونے والے بیگ میں پڑا دنیا سے ان کی بے رغبتی اور دولت سے عدم محبت کا ثبوت پیش کر رہا ہے۔

حقوق اللہ کی ادائیگی کے ساتھ حقوق العباد کی ادائیگی کا بھی انھیں ہر وقت خیال رہتا تھا۔ والدہ، بہنوں اور بھائیوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے، اس طرح دیگر رشتہ داروں کے ساتھ بھی بڑے احترام و تکریم کا برتاؤ کرتے تھے۔ بڑوں کی عزت کرتے اور بچوں کے ساتھ پیار اور محبت کا سلوک کرتے اور ملاقات اور گفتگو میں اپنی علمی برتری کو کسی پر ظاہر کرنے کی کبھی کوشش نہ کرتے تھے۔ سسرال والوں سے بھی ان کا سلوک مثالی تھا۔ ان کی عزت وتوقیر اپنے والدین کی طرح سمجھتے تھے۔ عصر حاضر کا داماد ہونے کے باوجود کبھی انھیں مرعوب کرنے کی کوشش نہ کی بلکہ ان کے ساتھ دلی ہمدردی اور وابستگی کا اظہار فرماتے اور مدرسہ تہذیب البنات کے معاملات اور دیگر موضوعات پر انھیں مفید مشوروں اور قلمی تعاون سے نوازتے رہتے تھے اور ان پر مالی اور عملی بوجھ لادنا انھیں گوارا نہیں تھا بلکہ رسومات کی ادائیگی انھیں سخت ناپسند تھی اور ایسے موقعوں پر رقوم خرچ کرنے کو فضول خرچی قرار دیتے تھے، میری تمام ضروریات کو پورا کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے مجھے اپنی ضروریات والدین کے سامنے بیان کرنے سے منع کیا کرتے تھے۔ میرے والدین کی طرف سے وقتاً فوقتاً موقع ومحل کی مناسبت سے تحائف کا سلسلہ ہوتا تو اس کی ناقدری کرنے یا حرص وہوس کا مظاہرہ کرنے کے بجائے حدیث نبوی ﷺ: ((فما جاء ك من هذا المال و انت غير مشرف و لا سائل فخذه)) (متفق علیہ) پر عمل کرتے ہوئے ممنون ومشکور ہو کر قبول فرماتے۔

حافظ صاحب کے ساتھ میری ۱۴ سال اور تین ماہ کی حسین رفاقت کا مختصر وقت انتہائی خوش گوار انداز میں گزرا۔ ذاتی معاملات میں ہمارا آپس میں کبھی اختلاف نہیں ہوا نہ میری طرف سے روز بروز نئے مطالبے ہوتے تھے اور نہ ان کی طرف سے غلط سلط وعدوں کے ساتھ میری حوصلہ افزائی کر کے بدمزگی پیدا ہوتی تھی بلکہ باہمی اتفاق اور سلوک کی دولت سے اللہ نے ہمیں کچھ اس طرح نوازے رکھا کہ خانگی اور خاندانی مسائل بطریق احسن طے ہوتے گئے۔

حافظ صاحب کے ساتھ خاوند بیوی کے علاوہ میرا ایک اور رشتہ بھی تھا اور وہ تھا استاد شاگرد کا۔ شادی کے بعد حفظ قرآن کی لازوال نعمت مجھے انہی سے حاصل ہوئی، اس کے علاوہ دینی مسائل پر بھی اکثر گفت و شنید ہوتی رہتی تھی اور مختلف موضوعات پر مختلف دینی کتب کا مطالعہ ہم اکٹھے بیٹھ کر کیا کرتے تھے مگر افسوس کہ زندگی کی یہ پُرسکون گھڑیاں اتنی جلدی بیت گئیں جیسے ایک خواب ہو۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَهٗ وَ ارْفَعْ دَرَجَتَهٗ فِي الْمَهْدِيِّيْنَ وَ اَلْحِقْهُ بِالصَّالِحِيْنَ.

Marfat.com

حافظ صاحب کے شب و روز کے وظائف:

حصول علم و عمل کا ذوق اللہ نے انھیں بچپن سے ہی ودیعت فرما رکھا تھا۔شاید یہ سب کچھ ان کے اس خواب کی تعبیر ہی تھی جو انھوں نے بچپن میں دیکھا تھا۔اس وقت ان کی عمر تقریباً سات آٹھ سال ہو گی۔ بتایا کرتے تھے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میری جیب میں دو موتی ہیں جن میں چمک پیدا ہوئی جو آہستہ آہستہ روشنی کی شکل اختیار کر گئی اور وہ روشنی اس قدر بڑھی کہ دور دور تک پھیل گئی۔

حقیقت ہے کہ علمی شاگردوں کی طرح ان کے روحانی شاگرد بھی بہت تھے جو ان سے وظائف سیکھتے اور دین کی حلاوت سے مستفید ہوتے تھے۔خود ان کا اپنا وظیفہ ہر قسم کی مصروفیات کے باوجود کافی تھا۔اس سلسلے میں کچھ چیزیں جو اس مضمون میں پہلے سے بیان ہو چکی ہیں وہ تو عارضی مصروفیت تھی، اس کے علاوہ ان کا مستقل وظیفہ میرے علم کے مطابق یہ تھا:

صبح کے وقت "سورة یٰس" اور "سورة یوسف"۔ ظہر اور عصر کے وقت "سورة الفتح"۔ مغرب کے وقت "سورة الواقعة" اور عشا کے وقت "سورة الملك" اور "سورة السجدة"۔ "سورة الكهف" کی ابتدائی ۱۰ آیات۔صبح و شام اور جمعہ کے دن مکمل سورہ، "آیات توکل" اور "حرز اعظم" روزانہ ایک مرتبہ۔"پیارے رسول کی پیاری دعاؤں" میں مذکور صبح و شام کی جملہ ادعیہ۔

☆ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ . ۱۰۰ مرتبہ صبح و شام

❊ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَ اَتُوْبُ اِلَیْهِ . ۱۰۰ مرتبہ صبح و شام

❊ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ وَ اللّٰهُ اَکْبَرُ وَ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ . ۱۰۰ مرتبہ صبح و شام

❊ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ بَارِكْ وَ سَلِّمْ .

۱۰۰ مرتبہ صبح و شام

❊ سُوْرَةُ الْاِخْلَاصِ ۱۰۰ مرتبہ۔دن میں ایک مرتبہ اور کبھی کبھی سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ ۱۰۰ مرتبہ۔اس کے علاوہ ادعیہ مسنونہ کا مجموعہ جو انھوں نے خود ترتیب دیا تھا دن میں کسی وقت ایک مرتبہ پڑھ لیا کرتے تھے۔[1]

---

[1] محترم قاری نعیم الحق رحمہ اللہ کی اہلیہ محترمہ نے قاری صاحب کے اذکار و وظائف کے جو معمول بیان کیے ہیں، وہ خاصے حیران کن ہیں۔یا شاید ہمارے ایسے "کور ذوق" جو بمشکل فرض نماز کے بعد مسنون تسبیحات پر اکتفا کرتے ہیں، ان کے لیے یہ بہت طویل اذکار ہیں۔محترمہ موصوفہ نے اس موقع پر قاری صاحب کے جو معمولاتِ یومیہ ذکر کیے ہیں، طوالت کے خوف سے ان کا یہاں تذکرہ نہیں کیا جا رہا۔شائقینِ اذکار و وظائف ہفت روزہ "الاعتصام" کی متعلقہ اشاعت میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔(عمر فاروق قدوسی)

Marfat.com

مولانا عبدالوہاب حنیف بلتستانی

(وفات ۳-اگست ۲۰۰۲ء)

مولانا عبدالوہاب حنیف بلتستانی کا مختصر نسب نامہ یہ ہے: عبدالوہاب بن محمد جان بن روزی بن حیدر بن اسماعیل۔

ان کے علاقے بلتستان میں مولانا عبدالوہاب کے خاندان کو ''اخوند'' کہا جاتا تھا، جس کے معنے علم و امامت کے ہیں۔

مولانا عبدالوہاب حنیف کا تذکرہ کرنے سے پہلے چند الفاظ میں ان کے والد مکرم مولانا محمد جان سے متعارف ہونا ضروری ہے۔ مولانا محمد جان اور ان کے خاندان کے لوگ نوربخشی فرقے سے تعلق رکھتے تھے اور انہی کے سے عقائد و افکار کے حامل تھے۔ وہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے دہلی گئے اور وہاں حضرت میاں سید نذیر حسین کے مدرسے میں داخل ہوئے۔ بارہ سال وہاں تحصیل علم کرتے رہے۔ فراغت کے بعد وطن واپس آئے تو دعوت و تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا اور درس و تدریس کے لیے مدرسہ بھی بنایا، لیکن لوگوں نے ان کی مخالفت شروع کر دی اور انھیں تشدد کا نشانہ بنایا۔ مدرسہ بھی منہدم کر دیا۔ لوگوں کے تشدد کا جواب انھوں نے تشدد سے نہیں دیا بلکہ نرمی سے کام لیا اور سلسلہ وعظ و تبلیغ کسی نہ کسی انداز سے جاری رکھا۔

اس زمانے میں ہندوستان کی جماعت اہل حدیث کی تنظیم آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے نام سے قائم تھی۔ اس کا دفتر دہلی میں تھا اور ناظم اعلیٰ حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری تھے۔ مولانا محمد جان نے مولانا ممدوح سے بھی استفادہ کیا۔ کانفرنس کی طرف سے انھیں اپنے علاقے بلتستان کے مبلغ مقرر کیا گیا تھا اور سات روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ مولانا محمد جان نے ۱۹۶۲ء میں وفات پائی۔

اب آیئے ان کے فرزندِ گرامی مولانا عبدالوہاب حنیف کی طرف، جن کے ان سطور میں حالات بیان کرنا مقصود ہے۔ ان کی ولادت ۱۹۴۵ء (۱۳۶۴ھ) میں علاقہ بلتستان کے ایک گاؤں ''براہ'' میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم مولانا محمد جان سے حاصل کی۔ ۱۹۵۵ء میں مولانا محمد اسماعیل (م ۱۹۹۸ء) کے ساتھ غواڑی آئے اور دار العلوم میں مولانا مفتی کریم بخش، مولانا عبدالرحیم گنتھاوی اور مولانا محمد یونس سے کسب فیض کیا۔ دورانِ تعلیم بکریاں بھی چراتے رہے۔ پڑھنے میں تیز تھے اور ذہن رسا پایا تھا۔

Marfat.com

غواڑی کے اساتذہ سے اکتسابِ علم کے بعد مزید تعلیم کے لیے ۱۹۵۷ء میں پنجاب اور کراچی کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اس موقعے پر والد نے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: ''بیٹا علم سے فراغت سے قبل بلتستان نہ آنا۔'' فرماں بردار بیٹے نے باپ کی اس نصیحت پر پورا عمل کیا۔ دورانِ سفر زادِ راہ کہیں ختم ہوا تو محنت مزدوری کر کے پیسے جمع کیے اور اگلے سفر پر روانہ ہو گئے۔ ۱۹۶۱ء میں مدرسہ تعلیم القرآن راولپنڈی میں دورۂ ترجمہ و تفسیر مکمل کیا۔ وہاں سے دار العلوم تعلیم الاسلام اوڈاں والا (ضلع فیصل آباد) پہنچے اور ۱۹۶۴ء میں وہاں درس نظامی کی تکمیل کی۔ اسی سال ان کے والد مکرم مولانا محمد جان نے وفات پائی۔

اوڈاں والا کے دار العلوم میں ان کے اساتذہ تھے مولانا پیر محمد یعقوب قریشی، مولانا محمد یعقوب ملہوی، مولانا محمد صادق خلیل، مولانا عبدالصمد رؤف، مولانا عبدالرشید اثاروی اور مولانا عبدالرشید ہزاروی۔

۱۹۶۵ء میں انھوں نے لاہور بورڈ سے عربی فاضل کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور ۱۹۶۸ء میں لاہور بورڈ ہی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ علم کے حریص اور صالح فطرت شخص تھے۔ شیخ الحدیث مولانا سلطان محمود (جلال پور پیر والا) نے ان کی نیکی اور حصولِ علم میں رغبت دیکھ کر فرمایا تھا کہ یہ لڑکا سلف صالحین کے طلبا کا نمونہ ہے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد وطن واپس آئے تو اپنے گاؤں (براہ) میں طلبا کو بغیر کسی معاوضے کے پڑھانے کی پیش کش کی۔ لیکن گاؤں کے لوگوں نے ان کی یہ پیش کش منظور نہیں کی، جس سے وہ نہایت آزردہ خاطر ہوئے۔ اس کے بعد غواڑی آئے اور وہاں کے محلّہ گینتھا میں طلبا کو پڑھانے لگے۔ اسی اثنا میں جامعہ علوم اثریہ کے مہتمم حافظ عبدالغفور جہلمی نے ان کو اپنے ہاں بلا لیا اور وہ چار برس وہاں پڑھاتے رہے۔ جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) کے اربابِ اہتمام کو ان کی قابلیت کا پتا چلا تو انھوں نے جامعہ میں پڑھانے کے لیے کہا، لیکن حافظ عبدالغفور ان کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ پھر جامعہ علوم اثریہ کے لیے ایک استاذ مولانا محمد یعقوب عزیز کی خدمات حاصل ہو گئیں تو مولانا عبدالوہاب حنیف جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) تشریف لے گئے۔ جامعہ سلفیہ میں انھوں نے چار سال خدمت تدریس انجام دی۔ کچھ عرصہ تاندلیاں والا کے قریب موضع کٹو میں بھی ان کا سلسلۂ تدریس جاری رہا۔

جامعہ سلفیہ میں ان کی تدریس کے زمانے میں سعودی عرب کے مشائخ شیخ امان علی جامی اور شیخ علی مشرف بھی وہاں پڑھاتے تھے۔ ان سے ان کے تعلقات قائم ہوئے تو انھوں نے ان کے اور مولانا عبدالرحمٰن خلیق کے کاغذات شیخ عبدالعزیز بن باز کی خدمت میں بھجوا دیے۔ شیخ ممدوح نے ان دونوں کو بہ طور مدرس و داعی بلتستان بھیج دیا۔ چنانچہ شوال ۱۳۹۴ھ میں مولانا عبدالوہاب حنیف نے غواڑی کے مرکزی دار العلوم میں

Marfat.com

پڑھانا شروع کر دیا۔ اس وقت دار العلوم کے ناظم اعلیٰ حاجی خلیل الرحمٰن تھے۔ مولانا عبدالرحمٰن خلیق نائب ناظم کی حیثیت سے اور مولانا عبدالوہاب حنیف مدرس اور مدیر تعلیم کی حیثیت سے ناظم اعلیٰ حاجی خلیل الرحمٰن کے دست و بازو بنے۔

اب دار العلوم مزید ترقی کی راہ پر گام زن ہوا۔ پرانی عمارتیں گرا کر نئی عمارتیں بنائی گئیں۔ تعمیراتی فنڈ میں ان دونوں بزرگوں نے بھی اور دیگر اساتذہ نے بھی ایک ایک مہینے کی تنخواہیں دیں۔ تعمیر کے سلسلے میں مولانا عبدالوہاب حنیف کے جو حضرات سرگرم معاون تھے وہ تھے مولانا محمد حسن اثری، مولانا عبدالقادر یوگوی، مولانا عبدالحیّ اور مولانا محمد موسیٰ عبداللہ۔

اسی زمانے میں مولانا عبدالرشید صدیقی، ڈاکٹر عاصم عبداللہ قریوتی اردنی (حال ریاض سعودی عرب) شیخ احمد سندھی اور بعض دیگر حضرات دار العلوم غواڑی میں مدرس متعین ہوئے۔ اس دور کو دار العلوم کی نشأۃِ ثانیہ کے دور سے تعبیر کرنا چاہیے۔ مولانا عبدالوہاب حنیف نے غواڑی میں اپنا ذاتی مکان بھی بنا لیا تھا اور دار العلوم ہی ان کا مستقل ٹھکانا تھا۔

دار العلوم غواڑی اور بلتستان کے دیگر مدارس کے سلسلے میں مولانا عبدالوہاب حنیف کا شیخ عبدالعزیز بن باز سے رابطہ رہتا تھا۔ شیخ بھی چاہتے تھے کہ وہاں کے مدارس کے متعلق انھیں مطلع رکھا جائے۔ ۱۹۷۷ء میں مولانا عبدالوہاب حنیف نے فریضۂ حج ادا کیا اور بلتستان کے علاقے میں جو تدریسی اور دعوتی و تبلیغی کام ہو رہا تھا، اس کی تفصیل سے شیخ ابن باز اور دیگر سرکردہ شخصیتوں کو آگاہ فرمایا۔ اس سے ان حضرات کو بڑی مسرت ہوئی اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔ بلتستان کے تمام مدارس، دار العلوم غواڑی کے وفاق میں شامل ہو گئے۔

مولانا عبدالوہاب حنیف اگرچہ دار العلوم غواڑی کے انتظامی امور اور اساتذہ وطلبا کے اخراجات وغیرہ کے معاملات میں بہت مصروف رہتے تھے اور علاقے میں تبلیغی دورے بھی کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود وہ تدریسی خدمات بھی سرانجام دیتے تھے بلکہ بعض اوقات دوسرے اساتذہ کے اسباق بھی پڑھاتے تھے۔ اس طرح بہت سے طلبا نے ان سے کسب علم کی سعادت حاصل کی۔ ان سب کا احاطہ کرنا تو ممکن نہیں البتہ ان میں سے چند حضرات کے اسمائے گرامی ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

☆ شیخ عبدالرشید صدیقی (م ۲۰۱۰ء)
☆ شیخ عبدالواحد (دار العلوم غواڑی کے موجودہ ناظم اعلیٰ)
☆ شیخ محمد ابراہیم خلیل الفضلی (مکتب الدعوۃ اسلام آباد)
☆ ڈاکٹر محمد علی جوہر (مدیر مرکز اسلامی سکردو)

Marfat.com

☆ شیخ ثناء اللہ عبدالرحیم (مدیر تعلیم دارالعلوم غواڑی)
☆ شیخ ابوعبدالمجید محمد حسین بلتستانی (استاذ جامعہ اسلامیہ ابوبکر کراچی)
☆ شیخ ابوزبیر محمد حسین رشید (استاذ جامعہ اسلامیہ ابوبکر کراچی)
☆ شیخ محمد منیر قمر (ترجمان سپریم کورٹ الخبر سعودی عرب)
☆ شیخ مسعود الرحمٰن جانباز (مانسہرہ)
☆ شیخ عبدالقادر رحمانی (نائب مدیر مرکز اسلامی سکردو)
☆ حافظ عبدالحمید کریسی (دبئی)
☆ شیخ ابومحمد عبدالوہاب خاں (مدیر سہ ماہی مجلّہ التراث غواڑی)
☆ شیخ عبدالرحیم روزی (سیکرٹری سہ ماہی مجلّہ التراث غواڑی)
☆ شیخ سلیم اللہ عبدالباقی خاں (پشاور)
☆ شیخ محمد ابراہیم عبدالرحیم یوگری (ایم اے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ)
☆ ڈاکٹر عارف عبدالحکیم (پی ایچ ڈی جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ)

ان کے علاوہ متعدد حضرات ان کے حلقۂ شاگردی میں شامل ہیں۔

مولانا ممدوح کی تمام زندگی درس وتدریس اور دعوت وتبلیغ میں گزری۔ ان کے علاقے (بلتستان) میں شیعہ بھی بہت بڑی تعداد میں آباد ہیں اور نوربخشی بھی۔ مولانا عام جلسوں میں تقریریں کرتے تو یہ لوگ بھی ان کی تقریروں میں شریک ہوتے۔ مولانا اعتدال کے ساتھ قرآن وحدیث کی روشنی میں اہل بیت کا تذکرہ فرماتے تو ان دونوں فرقوں کے لوگ نہایت توجہ سے مولانا کی تقریر سنتے اور مسرت کا اظہار کرتے۔ ان کی تقریریں سن کر اہل حدیث کے متعلق بے شمار لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہوئیں اور ان کے ذہنوں پر تعصب کی جو دبیز تہیں جمی ہوئی تھیں، وہ ختم ہوئیں، بلکہ کتنے ہی لوگوں نے ان کے طرزِ کلام سے متاثر ہو کر اہل حدیث مسلک قبول کر لیا۔

بعض لوگ ان میں سے ایسے بھی تھے جنھیں ان کی تقریریں سننے یا ان کی مجلس میں بیٹھنے کا کبھی موقع نہیں ملا تھا اور وہ انھیں اپنا شدید مخالف سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ اہل وعیال سمیت گاڑی پر سکردو جا رہے تھے کہ راستے میں ”گول“ کے مقام پر شیعہ حضرات نے انھیں روک لیا اور گاڑی کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ گستاخ وہابی اور اہل بیت کا دشمن وغیرہ کے نعرے لگانے لگے۔ مولانا نے گاڑی سے اتر کر ان سے بات کرنا چاہی تو اہل خانہ نے اس خیال سے روکنے کی کوشش کی کہ یہ لوگ نقصان نہ پہنچائیں۔ لیکن مولانا گاڑی سے باہر نکلے اور

Marfat.com

ان سے بات کی۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں اہل بیت کے فضائل بیان کیے۔ وہ لوگ ان کی باتیں سن کر خوش ہوئے اور جانے کے لیے احترام کے ساتھ راستہ دے دیا۔

انھوں نے تدریسی اور دعوتی اعتبار سے اپنے آبائی گاؤں ''براہ'' میں بھی بڑی خدمات انجام دیں۔ ان کے والد مولانا محمد جان نے ''ہدایت الاسلام'' کے نام سے وہاں ایک مدرسہ قائم کیا تھا، جو سیلاب کی زد میں آ گیا تھا اور عمارت منہدم ہوگئی تھی، مولانا عبدالوہاب حنیف نے اسے دوبارہ تعمیر کرایا۔ اس وقت اس مدرسے میں دوسو کے قریب طلبا و طالبات تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور دس معلمین و معلمات انھیں تعلیم دینے پر مامور ہیں۔

مولانا عبدالوہاب حنیف غریبوں، مسکینوں، یتیموں اور بیواؤں پر خرچ کرنے میں بڑے فراخ دست اور کھلے دل کے عالم تھے۔ بالخصوص رمضان کے مہینے میں وہ ضرورت مندوں کی بے حد مدد کرتے۔ انھوں نے بعض غربا و مساکین کے لیے اپنی گرہ سے مکان بھی تعمیر کرائے۔ وہ بہترین عادات و خصائل کے مالک تھے۔ سب کے ہم درد اور سب کے خیر خواہ۔ میٹھی زبان اور شیریں لہجہ۔

وہ ہر سال دار العلوم غواڑی کے لیے سعودی عرب کا سفر کرتے تھے۔ ۲۰۰۲ء میں بھی مولانا محمد علی جوہر اور دار العلوم کے ناظم اعلیٰ مولانا عبدالواحد کے ساتھ سعودی عرب گئے۔ ان کے ساتھی تو واپس آ گئے، لیکن وہ بعض کاموں کی تکمیل کے لیے ریاض میں رک گئے۔ ۳-اگست ۲۰۰۲ء کو ان کا ریاض سے پاکستان واپسی کا پروگرام تھا۔ رات کی فلائٹ سے آنا تھا۔ عصر کی نماز وہاں کی ایک مسجد میں پڑھی۔ نماز کے بعد مسجد سے نکلے تو شیخ اباطین کے بیٹے محمد نے کہا: میں آپ کو گاڑی میں آپ کی قیام گاہ پر پہنچا دوں گا۔ ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا: میں خود ہی پیدل چلا جاؤں گا۔ تھوڑی دیر بعد سڑک عبور کرنے لگے تو تیز رفتار گاڑی کی زد میں آ گئے اور وفات پا گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

فوری طور پر انھیں ریاض کے شمیسی اسپتال لایا گیا، جہاں ڈاکٹروں نے ان کی موت کی تصدیق کر دی۔ پھر ضروری کارروائی کی تکمیل کے بعد ان کی میت تجہیز و تکفین کے لیے مغسلہ درہمیہ پہنچائی گئی اور بدھ کے روز ۷-اگست کو نمازِ عصر کے بعد مسجد جمیح میں ان کا جنازہ پڑھا گیا اور شام کو پانچ بجے ریاض کے جنوب میں واقع منصوریہ قبرستان میں انھیں دفن کر دیا گیا۔

اللھم اغفر لہ و ارحمہ و عافہ و اعف عنہ

ان کی وفات کی اطلاع اسی وقت دار العلوم غواڑی (بلتستان) میں دے دی گئی تھی۔ دار العلوم کے لیے اور ان کے اعزہ و اقربا کے لیے یہ بہت بڑا حادثہ تھا، جس پر لوگوں نے نہایت حزن و ملال کا اظہار کیا۔ ریاض اور سعودی عرب کے دیگر مقامات میں جہاں بھی ان سے تعلق رکھنے والے لوگ موجود تھے، سب نے ان کی

Marfat.com

ناگہانی موت کوعظیم المیہ قرار دیا۔ وہ دار العلوم کے جلیل القدر مدرس و معاون اوربلتستان کے خوش بیان خطیب تھے، اس لیے ان کی موت محض ایک شخص کی موت نہ تھی بلکہ ایک ادارے کا ناقابل تلافی نقصان تھا۔لیکن وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے، اللہ کے کاموں میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔

اب مولانا عبدالوہاب حنیف کی آل اولاد کے بارے میں۔

مولانا مرحوم نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے ایک بیٹا پیدا ہوا محمد یوسف۔ یہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے کلیۃ الدعوۃ کے فارغ ہیں اوربلتستان کے شہر سکردو میں المرکز الاسلامی میں خدمت تدریس انجام دے رہے ہیں۔شادی شدہ ہیں اوران کی اولاد تین بیٹے ہیں صہیب، یاسر اور خبیب اور ایک بیٹی ہے۔

مولانا کی دوسری بیوی سے پانچ بیٹے ہیں حبیب الرحمٰن،عبدالعزیز، عبدالماجد، محمد جان اور محمد سلیمان۔ پانچ بیٹیاں ہیں۔

حبیب الرحمٰن نے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے قسم فقہ السنہ میں پی ایچ ڈی کیا۔انھیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ ہر سال ماہ رمضان المبارک اور ایام حج میں اردو دان طبقے کی راہنمائی کے لیے مسجد نبوی میں روزانہ درس دیتے ہیں۔شادی شدہ ہیں اور تین بیٹے ہیں طلحہ، عبدالوہاب اور عبداللہ۔ دو بیٹیاں ہیں۔

مولانا عبدلوہاب حنیف کے دوسرے بیٹے عبدالعزیز جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے کلیۃ الدعوۃ میں تعلیم حاصل کررہے ہیں۔شادی شدہ ہیں اور اولاد ہے ایک بیٹی۔

تیسرے بیٹے عبدالماجد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے کلیۃ الحدیث کے آخری سال کے طالب علم ہیں۔

چوتھے بیٹے محمد جان دار العلوم بلتستان غواڑی کے فارغ التحصیل ہیں۔

پانچویں محمد سلیمان ہیں جو دارالعلوم غواڑی میں تعلیم حاصل کررہے ہیں۔

مولانا کی پانچ بیٹیوں میں سے چار شادی شدہ ہیں اور ایک کی شادی ابھی نہیں ہوئی۔

مولانا مرحوم کے بڑے داماد کا نام شیخ سلیم عبدالحکیم ہے۔ یہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے فارغ التحصیل ہیں، اور دار العلوم بلتستان غواڑی میں مدرس ہیں۔ان کے تین بیٹے ہیں صفوان، عفان، شمشان اور دو بیٹیاں ہیں۔

دوسرے داماد انجینئر حفیظ الرحمٰن ہیں۔ یہ آج کل انجینئرنگ کے ایک کورس کے سلسلے میں جنوبی کوریا میں مقیم ہیں۔ان کی اولاد دو بیٹے ہیں حذیفہ اور حنظلہ اور ایک بیٹی۔

تیسرے داماد ہیں شیخ شریف اسماعیل۔ انھوں نے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے تعلیم مکمل کی۔ اب علاقہ بلتستان میں ان کی دعوتی سرگرمیاں جاری ہیں۔ان کا ایک بیٹا ہے جس کا نام عبدالوہاب ہے اور دو بیٹیاں ہیں۔

چوتھے داماد شیخ عتیق الرحمٰن خاں ہیں۔ یہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے عقیدے میں ایم اے کررہے

Marfat.com

ہیں۔ ان کی اولاد دو بیٹیاں ہیں۔

مولانا عبدالوہاب حنیف نے اپنی بیٹیوں کو بھی دینی تعلیم دلائی۔ ان کی بعض بیٹیاں جامعہ دار العلوم بلتستان غواڑی کے شعبہ بنات میں تدریسی فرائض سرانجام دے رہی ہیں۔

(یہ معلومات مجھے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے آخری سال کے طالب علم جناب عبدالمجید محمد حسین بلتستانی نے بہم پہنچائیں اور میں نے ۲۲-جولائی ۲۰۱۲ء (۲-رمضان المبارک ۱۴۳۳ھ) کو انھیں اپنے الفاظ میں تحریر کیا۔ مولانا عبدالوہاب کی اولاد میں سے جو لوگ اس وقت تعلیم حاصل کر رہے تھے، اب فارغ التحصیل ہو چکے ہوں گے اور کہیں خدمات سرانجام دے رہے ہوں گے۔)

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا فضل کریم عاصم

(وفات ۲۲۔ مئی ۲۰۰۳ء)

بیسویں صدی عیسوی میں اللہ تعالیٰ نے اپنے جن بندوں کو کتاب وسنت کی اشاعت وتبلیغ کی ہمت بخشی، ان میں ایک بزرگ مولانا فضل کریم عاصم تھے۔ مولانا ممدوح ۴۔ اپریل ۱۹۰۸ء کو آزاد کشمیر ضلع میر پور کے ایک گاؤں ''پنیام'' میں پیدا ہوئے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حصول علم میں مشغول ہو گئے اور اس خوش نما وادی کے نشیب وفراز سے گزرتے ہوئے۔ ۱۹۴۰ء میں علوم متداولہ کی سند فراغ حاصل کی، اسی سال حکومت کشمیر کے محکمہ تعلیم سے وابستگی اختیار کر لی اور ۱۹۶۳ء تک معلم کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔

پھر حالات نے ایسی کروٹ لی کہ اسی سال (۱۹۶۳ء میں) برطانیہ چلے گئے۔ اس وقت ان کا قافلہ حیات ۵۷ ویں منزل عبور کر رہا تھا۔ بہ الفاظ دیگر وہ عہد کہولت سے نکل کر عالم پیری کی طرف بڑھ رہے تھے۔ برطانیہ میں انھوں نے مزدور کی حیثیت سے ایک فیکٹری میں کام شروع کیا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی اس مرد محنت پیشہ نے دعوت وتبلیغ کو بھی اپنا لازمۂ زندگی قرار دے لیا۔ ۱۹۶۴ء میں انگلستان کے دیارِ کفر میں انھوں نے اسلامک مشن کی بنیاد رکھی اور اس ارض تثلیث میں توحید کا علم لے کر میدان عمل میں اترے۔ چلتے چلتے بعض اہل حدیث رفقائے سفر ملے تو انھوں نے ۱۹۷۵ء میں وہاں جمعیت اہل حدیث برطانیہ کے نام سے جماعت کی تنظیم قائم کر لی۔ پھر جلد ہی اس تنظیم کے لائق اکرام کارکنوں نے بہ یک وقت پانچ کام شروع کر دیے جو اس ماحول میں بہت بڑے کام تھے اور بڑی تگ ودو کے طالب......!

۱۔ دعوت اسلام اور لوگوں کی اصلاح کا کام

۲۔ مسلمان بچوں کو دینی تعلیم سے بہرہ ور کرنے کا عزم

۳۔ مجلّہ ''صراط مستقیم'' کا اجرا

۴۔ یوتھ مسلم موومنٹ کے نام سے مسلمان نوجوانوں کی تنظیم

۵۔ اس کے علاوہ (ایک) بہت بڑا کام تھا لائبریری کا قیام، جس میں اسلام کے متعلق مختلف زبانوں میں صاف ستھرا لٹریچر جمع کرنا مقصود تھا تاکہ لوگ اسے پڑھیں اور اس سے استفادہ کریں۔

ان امور کا آغاز کسی ایسی سعادت سے بھرپور گھڑی میں کیا گیا تھا کہ ان کی ترقی کے لیے حالات روز

Marfat.com

بروز ساز گار ہوتے گئے اور کار خیر کا دائرہ لحہ بہ لحہ بڑھتا اور پھیلتا گیا، جس کی تفصیل ماہنامہ ''صراط مستقیم'' میں شائع ہوتی رہتی ہے۔ اب جمیعت اہل حدیث برطانیہ اس نواح کی ایک مضبوط تنظیم ہے، جو بے شمار اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات پر مشتمل ہے اور جس کے اثرات دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔

اس کام کا آغاز مولانا فضل کریم عاصم نے کیا تھا اور ان کا یہ صدقہ جاریہ ہے جس کا اجر بارگاہِ الٰہی سے ان شاء اللہ ہمیشہ انھیں ملتا رہے گا۔

مولانا فضل کریم عاصم سے میری پہلی ملاقات ۱۹۹۲ء میں ہوئی تھی۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ ایک دن چار بجے کے قریب گھنٹی کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ باہر نکلا تو میرے مرحوم دوست مولانا محمود احمد غضنفر ایک طویل قامت شخص کے ساتھ دروازے پر کھڑے تھے۔ چوڑا چہرہ، سرخی مائل گورا رنگ، سفید داڑھی، شلوار قمیص پہنے ہوئے۔ میں نے انھیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ وہ ان کا بڑھاپا تھا جس میں شادابی جھلک رہی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ جوانی بڑی چمک دار ہوگی۔ محمود احمد غضنفر نے کہا ''آپ ہیں مولانا فضل کریم عاصم......!''

میں ان کے نام اور کام سے تو کسی حد تک آگاہ تھا، لیکن ان کی زیارت کا موقع آج پہلی دفعہ ملا تھا۔

محمود احمد غضنفر کے ہاتھ میں ایک گٹھڑی تھی۔ میں انھیں اندر لے آیا۔ علیک سلیک کے بعد گٹھڑی کھولی تو اس سے تین ہزار سے زائد صفحات برآمد ہوئے۔ مولانا فضل کریم عاصم نے فرمایا: یہ میرے مسودات ہیں، جن کا وزن دس کلو بنتا ہے۔ انھوں نے ''دس کلو وزن'' کا لفظ بالکل صحیح بولا تھا، اس لیے کہ برطانیہ سے وہ ان کاغذات کو ہوائی جہاز پر لائے تھے اور ان کو تول کر جہاز میں رکھا گیا تھا، جن کا وزن دس کلو تھا۔

مولانا عاصم نے مجھ سے فرمایا: ان مسودات کو ترتیب دینا مقصود ہے۔ اس خدمت کی انجام دہی کے لیے میری نظر تم پر پڑی ہے اور میں اس باب میں تم پر اعتماد کرتا ہوں۔

میں نے دیکھا تو وہ دس کلو وزنی غیر مرتب مسودات مختلف موضوعات پر محیط تھے۔ اپنی بے حد تصنیفی مصروفیات کے باوجود میں نے ان کے اعتماد پر ''پورا اترنے کی کوشش کی'' اور انھیں مشورہ دیا کہ اس مسودے کو موضوع وار مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ان میں ایک حصہ ان کے ''مطالعاتی سفر'' کا تھا جس پر میں نے ''چند باتیں مولانا فضل کریم عاصم کے بارے میں'' کے عنوان سے مقدمہ لکھا اور اپنی محدود معلومات کے مطابق ان کی حیات مستعار کے علمی اور عملی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی سعی کی۔ یہ سفر نامہ جن ملکوں اور علاقوں پر مشتمل ہے وہ ہیں: ترکی، ایران، کشمیر، جرمنی، پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش، نیپال، فلسطین بلتستان، سعودی عرب اور انڈونیشیا۔ دلچسپ اور پر از معلومات سفر نامہ۔ اس سفرنامے میں ان ملکوں اور علاقوں کی تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی حالت کی نشان دہی خوب صورت پیرائے میں کی گئی ہے۔ کشمیر ان کا اپنا خطۂ ارض ہے۔ اس کی

Marfat.com

تفصیلات، جس اسلوب میں ضبطِ تحریر میں آئی ہیں، وہ اسلوب باعث کشش ہے۔

اس سفرنامے میں "مسافر" کے نام بعض حضرات کے مکتوب بھی درج ہیں، جن سے کتاب کا حسن مزید نکھر گیا ہے۔ اس سفرنامے میں ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا فضل کریم عاصم کا مسلک بھی ان کے ساتھ مصروف سفر ہے، ان کی تبلیغی مساعی بھی ان کے ہم رکاب ہیں اور ان کا جذبۂ اخلاص بھی قدم سے قدم ملا کر ان کی رفاقت اختیار کیے ہوئے ہے۔ یہ کتاب ۶۶۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

دوسری کتاب جو ان مسودات سے برآمد ہوئی اور بعد میں اشاعت کے مرحلے سے گزری، وہ ہے "تحریک اہل حدیث یورپ میں"۔ اپنے موضوع کا یہ قابل قدر سرمایہ ہے، جس میں یورپ میں اہل حدیث کی تبلیغی سرگرمیوں کی بھی وضاحت کی گئی ہے، بہت سے ضروری مسائل بھی بیان کیے گئے ہیں اور مولانا محمود احمد میرپوری کے حالات بھی معرض کتابت میں لائے گئے ہیں۔ معلومات سے بھرپور یہ کتاب ۴۶۴ صفحات پر محیط ہے۔

یہ دونوں کتابیں نعمانی کتب خانہ، اردو بازار لاہور کی طرف سے معرضِ اشاعت میں آئی ہیں۔ نعمانی کتب خانہ کے ناظم ہمارے مرحوم دوست مولانا بشیر احمد نعمانی کے فرزند ارجمند عزیز القدر محمد ضیاء الحق نعمانی نے یہ کتابیں خوب صورت انداز میں شائع کی ہیں۔

جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا، مولانا فضل کریم عاصم سے میری پہلی ملاقات ۱۹۹۲ء میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد ان سے کئی دفعہ ملاقات کے مواقع میسر آئے، لیکن ان ملاقاتوں کا دورانیہ بہت مختصر ہوتا تھا، صرف چند ساعتوں کا......!

افسوس ہے وہ ۲۲۔ مئی ۲۰۰۳ء کی صبح کو حرکت قلب بند ہو جانے سے برمنگھم (انگلستان) میں انتقال کر گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

وہ بہت مستعد اور فعال شخصیت تھے۔ مسلک اہل حدیث کے پرزور مبلغ، جمعیت اہل حدیث برطانیہ کے بانی اور کتاب و سنت کے مخلص ترین داعی۔ جہاں ان کے ہر وقت کے رفقائے کرام کو ان کی وفات سے شدید صدمہ پہنچا، وہاں آٹھ ہزار میل کی مسافت پر رہنے والے ہم پاکستانیوں کے لیے بھی ان کی موت بہ درجہ غایت افسوس کا باعث تھی۔ اس قسم کے پیکر خلوص لوگوں سے دنیا خالی ہوتی جا رہی ہے۔

اللہ اپنے اس نیک بخت بندے کی مغفرت فرمائے۔ آمین

Marfat.com

حافظ عبدالمنان

(وفات ۲۱- جولائی ۲۰۰۴ء)

ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے: حافظ عبدالمنان بن مولانا عبداللہ بن نور احمد بن قطب الدین بن رحمت اللہ۔

ان تمام حضرات کا شمار علما و صلحا میں ہوتا تھا اور یہ لوگ مشرقی پنجاب کے ضلع فیروز پور کی تحصیل مکتسر کے ایک گاؤں ''کھپیاں والی'' کے رہنے والے تھے۔

مولانا عبداللہ کا تذکرہ اس فقیر نے اپنی ایک کتاب ''گلستانِ حدیث'' میں کیا ہے۔ وہ ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کا آغاز اپنے والد مولانا نور احمد سے کیا۔ پھر لکھو کے جاکر مولانا عطاء اللہ لکھوی کے والدِ گرامی قدر مولانا عبدالقادر لکھوی سے مختلف فنون کی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے دو لائق ترین شاگردوں اور ماہرین حدیث حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی اور حضرت حافظ عبداللہ غازی پوری سے کتب حدیث کی تکمیل کی اور ان کی اسناد سے بہرہ مند ہوئے۔

تمام علوم متداولہ کی تحصیل کر چکے تو اپنے گاؤں میں ''نصرۃ الاسلام'' کے نام سے مدرسہ جاری کیا، جس میں خود انھوں نے اور ان کے عالم و فاضل بھائی مولانا محمد صاحب نے درس و تدریس کا سلسلہ جاری فرمایا۔ اس مدرسے میں ان سے بے شمار علما و طلبا نے اخذِ فیض کیا۔ مولانا عبداللہ جہاں جلیل المرتبت عالم دین تھے، وہاں صالحیت و تقویٰ شعاری میں بھی ان کا مقام بڑا بلند تھا۔

قیامِ پاکستان کے زمانے میں وہ اپنے آبائی وطن کھپیاں والی سے براستہ ہیڈ سلیمان کی ایک بڑے قافلے کے ساتھ پاکستان کی طرف آرہے تھے کہ سکھوں نے قافلے پر حملہ کر دیا اور بہت سے لوگوں کے ساتھ مولانا عبداللہ اور ان کے بھائی مولانا محمد شہید ہو گئے۔ یہ حادثہ ۲۴- اگست ۱۹۴۷ء کو پیش آیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

اس وقت مولانا عبداللہ کی عمر ۵۷ سال کی تھی۔

مولانا عبداللہ صاحب کے ایک ہی بیٹے تھے جو ۱۹۲۱ء کے آس پاس پیدا ہوئے اور ان کا نام انھوں نے اپنے رفیع المنزلت استاد کے نام پر عبدالمنان رکھا۔ حفظِ قرآن کے بعد انھیں حافظ عبدالمنان کہا جانے لگا۔

حصولِ علم کی ابتدا اپنے آبائی مدرسہ ''نصرۃ الاسلام'' سے کی۔ اسی مدرسے میں اپنے والدِ عالی قدر اور عمِ

Marfat.com

محترم سے درسِ نظامی کی تکمیل کی۔

۱۹۳۵ء میں وہ گوجراں والا گئے۔ وہاں محدث العصر حافظ محمد صاحب گوندلوی اور حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کا سلسلۂ درس جاری تھا، ان بزرگانِ ذی شان سے انھوں نے بعض کتب حدیث اور دیگر فنون کی اہم کتابیں پڑھیں۔ وہاں ایک سال ان کا قیام رہا۔

۱۹۳۷ء میں عازم دہلی ہوئے اور مدرسہ فتح پوری میں داخلہ لیا۔ اس مدرسے میں مولانا عبدالرحمٰن، مولانا سلطان محمود، مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی اور بعض دیگر اساتذہ سے معقولات وغیرہ میں استفادہ کیا۔

اس طرح ان تینوں مدارس کے مشہور اساتذہ سے انھوں نے اکتسابِ علم کیا اور ہر موضوع کی متداول کتابیں پڑھیں۔ بعدازاں ۱۹۳۹ء میں وہ اپنے والد مکرم کے قائم کردہ مدرسہ نصرۃ الاسلام میں والد اور چچا کے ساتھ خدمت تدریس سرانجام دینے لگے۔ وہ اپنے عہد کے منجھے ہوئے مدرس تھے۔ محنت سے پڑھاتے تھے۔ اس مدرسے کی بڑی شہرت تھی۔

تقسیم ملک کے نتیجے میں جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ان کے والد (مولانا عبداللہ) اور چچا (مولانا محمد) تو سکھوں کے ہاتھوں شہادت پا گئے تھے، لیکن حافظ عبدالمنان کسی طرح پاکستان پہنچ گئے اور ساہی وال چلے گئے۔ اس وقت حالات نہایت اذیت ناک تھے۔ لیکن انھوں نے ایک مسجد میں تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا اور خطبۂ جمعہ بھی ارشاد فرمانے لگے۔ اس طرح اللہ نے ان کو پاکستان میں بھی خدمتِ دین کا موقع فراہم کر دیا۔

ان کا وہ کتب خانہ جو تقسیم ملک کے وقت کھپیاں والی میں رہ گیا تھا، کسی شریف النفس فوجی کے ہاتھ آ گیا اور اس نے اسے پاکستان بھیج دیا۔ پھر وہ کتب خانہ حافظ صاحب ساہی وال لے گئے۔ بعدازاں انھوں نے یہ پورا کتب خانہ مولانا محمد یوسف صاحب کو پیش کر دیا جو دار الحدیث راجووال میں محفوظ ہے اور اصحابِ علم اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔

حافظ عبدالمنان کو پاکستان میں کئی حادثے پیش آئے۔ ۲۷-دسمبر ۲۰۰۰ء (۳۰ رمضان المبارک ۱۴۲۱ھ) کو ان کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ یہ ان کے لیے ایک بڑا صدمہ تھا۔ اس سے چند مہینے بعد یکم مارچ ۲۰۰۱ء (۵ ذی الحجہ ۱۴۲۱ھ) کو ان کے بڑے بیٹے عبداللہ خالد ایڈووکیٹ مرض کینسر سے وفات پا گئے۔ یہ بہت بڑا صدمہ تھا جو انھیں پہنچا۔ اس سے تقریباً تین سال بعد ۲۱-جولائی ۲۰۰۴ء (۳-رجب ۱۴۲۵ھ) کو یہ عالمِ کبیر اور مدرس شہیر بہ عارضہ قلب اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔

اللهم اغفرله و ارحمه و عافه و اعف عنه

ان کی وفات کے بعد درس وتدریس کی وہ روایت ختم ہو گئی جو ایک مدت سے اس خاندان میں چلی آ رہی تھی۔

Marfat.com

مفتی عبدالعزیز اعظمی عمری

(وفات ٦- جولائی ٢٠٠٥ء)

ہندوستان کے صوبہ یوپی کا ایک مشہور شہر مئو ناتھ بھنجن ہے۔ پہلے یہ شہر ضلع اعظم میں شامل تھا۔ اب کئی سال سے اسے ضلعے کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ اس شہر میں بے شمار اصحابِ علم پیدا ہوئے، جنھوں نے مختلف اوقات و مقامات میں بے پناہ علمی خدمات سرانجام دیں۔ ان میں سے متعدد حضرات کا تذکرہ یہ فقیر اپنی بعض تصانیف میں خاصی تفصیل سے کر چکا ہے جو خوانندگانِ محترم کے علم و مطالعہ میں آیا۔

مئو ناتھ بھنجن ہی کے ایک لائق احترام عالم مولانا مفتی عبدالعزیز اعظمی عمری تھے۔ اعظمی کی نسبت انھوں نے ضلع اعظم گڑھ کے باشندہ ہونے کی وجہ سے اختیار کی اور عمری کی نسبت کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے زیادہ تر تعلیم جنوبی ہند کی قدیم درس گاہ جامعہ دارالسلام عمرآباد (مدراس) میں پائی۔

مفتی صاحب ممدوح کا مختصر سلسلہ نسب یہ ہے: عبدالعزیز بن مولانا ابو القاسم محمد علی قدسی بن حاجی عبدالرحمٰن شہید بن حکیم جمال الدین۔

مفتی عبدالعزیز ۲۳ رمضان المبارک ۱۳۴۰ء (۱۹ مئی ۱۹۲۲ء) کو مئو ناتھ بھنجن کے محلّہ جمال پورہ کے ایک معروف علمی خاندان میں پیدا ہوئے۔ علمی گھرانوں کی عام روایت کے مطابق انھوں نے ناظرہ قرآن مجید گھر میں پڑھا۔ اردو فارسی وغیرہ کی چند ابتدائی کتابیں بھی گھر ہی میں پڑھیں۔ پھر تعلیم کا باقاعدہ آغاز اپنے شہر مئو کی جامعہ عالیہ عربیہ سے کیا۔ ان کی خوش بختی ملاحظہ ہو کہ ان کے زمانے میں ایسے بہت سے اہل علم موجود تھے جنھیں خود حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا یا ان سے جنھوں نے حضرت میاں صاحب کے عالی قدر تلامذہ کے حضور زانوے شاگردی تہہ کیے تھے۔ مفتی صاحب اس سعادت سے بہرہ مند ہوئے کہ انھیں حضرت میاں صاحب کے جلیل المرتبت تلامذہ سے حصولِ علم کے مواقع میسر آئے۔ یعنی وہ صرف ایک واسطے سے حضرت میاں صاحب کے شاگرد ہوئے۔

مئو ناتھ بھنجن کے بعض مدارس (مدرسہ عالیہ عربیہ اور مدرسہ فیض عام) میں کچھ عرصہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد مفتی صاحب نے جامعہ دارالسلام عمرآباد کا عزم فرمایا اور پھر تمام مروجہ علوم کی تحصیل وہیں کے اساتذۂ گرامی سے کی۔ علم و عمل کے ان مشہور مراکز میں انھوں نے جن اساتذہ سے کسبِ فیض کیا وہ مندرجہ ذیل ہیں:

☆ ...... مولانا حکیم محمد سلیمان مئوی صدر مدرس مدرسہ عالیہ عربیہ مئو ناتھ بھنجن تلمیذ حضرت میاں صاحب

Marfat.com

☆......مولانا محمد احمد صدر مدرس مدرسہ فیض عام مئو تلمیذ حضر میاں صاحب

☆......مولانا محمد لقمان مئوی شیخ الحدیث جامعہ دار السلام عمر آباد تلمیذ حضرت میاں صاحب

☆......مولانا ابوالقاسم محمد علی قدسی: یہ صاحبِ ترجمہ مفتی عبدالعزیز کے والد اور حضرت میاں صاحب کے لائق شاگرد مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری (مصنف تحفۃ الاحوذی) اور حضرت حافظ عبداللہ غازی پوری کے تلمیذ تھے۔ جامعہ دار السلام عمر آباد میں شیخ الحدیث کے منصبِ بلند پر فائز تھے۔ مفتی صاحب وہاں ان کے حلقۂ شاگردی میں رہے۔

☆......مولانا فضل اللہ وانماڑی مدراسی: یہ حضرت میاں صاحب کے دو نامور شاگردوں کے شاگرد تھے، مولانا شمس الحق عظیم آبادی کے اور مولانا سید عبدالجبار غزنوی کے۔

☆......مولانا محمد اسماعیل پیارم پیٹی: شیخ الحدیث جامعہ دار السلام عمر آباد۔ یہ حضرت میاں صاحب کے تلمیذ مولانا فقیر اللہ پنجابی کے شاگرد تھے۔

☆......مولانا عبدالواجد رحمانی پیارم پیٹی شیخ الحدیث جامعہ دار السلام عمر آباد۔ یہ حضرت میاں صاحب کے شاگرد شیخ الحدیث مولانا احمد اللہ پرتاپ گڑھی دہلوی کے شاگرد تھے۔

مفتی صاحب نے ۱۳۶۱ھ (۱۹۴۲ء) میں بہ عمر بیس سال علوم متداولہ کی تحصیل سے فراغت پائی اور وہ اسی سال جنوبی ہند کی ایک درس گاہ مدرسہ محمدیہ رائیدرگ (آندھرا پردیش) میں تدریسی خدمات سرانجام دینے لگے۔ جن جن مدارس و جامعات میں وہ ان خدمات پر مامور رہے، اس کی تفصیل اس طرح ہے:

☆...... جامعہ محمدیہ رائیدرگ میں ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک تدریس کی۔

☆...... پھر اپنے وطن مئو ناتھ بھنجن تشریف لے آئے۔ وہاں کے مدرسہ عالیہ عربیہ میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۱ء تک مدرس رہے۔

☆......۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۱ء تک دس سال جامعہ رحمانیہ بنارس سے منسلک رہے۔ وہاں اس وقت متعدد اساطین علم وفن کا سلسلہ تدریس جاری تھا، جن میں مولانا نذیر احمد رحمانی املوی بھی شامل تھے۔

☆...... پھر ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۶ء تک مئو ہی کے ''مدرسہ اثریہ دار الحدیث'' میں تدریس و افتا کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

☆......۱۹۶۶ء سے ۱۹۶۹ء تک مدرسہ دار الہدیٰ یوسف پور (ضلع بستی موجودہ سدھارتھ نگر) میں تدریس اور دعوت وارشاد کا محاذ قائم کیے رکھا۔

☆......۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۲ء تک ضلع بستی ہی کے ایک مقام پر ساعماد کے مدرسہ انوار العلوم کے منصب تدریس

Marfat.com

پر فائز رہے۔

☆......۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۸ء تک دوسری بار مئوناتھ بھنجن کے مدرسہ اثریہ دارالحدیث میں تدریس وافتا کی ذمہ داریاں ان کے سپرد رہیں۔

☆......۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۲ء تک مئو کے جامعہ اسلامیہ فیض عام سے وابستہ رہے۔

☆......۱۹۸۲ء میں پھر تیسری بار مدرسہ اثریہ دارالحدیث مئو میں آ گئے۔ اب ۲۰۰۲ء تک اسی مدرسے میں سلسلہ تدریس جاری رکھا اور یہ ان کی تدریسی زندگی کا آخری سال تھا۔

مدارس و جامعات کی اس سن وار فہرست سے پتا چلا کہ انھوں نے مختلف اوقات میں اپنے ملک ہندوستان کی نو درس گاہوں میں خدمت تدریس سرانجام دی۔ بعض درس گاہوں میں ان کی خدمت کے دو دو اور تین تین دور رہے۔ ان مقامات میں افتا کا سلسلہ بھی ان کے سپرد رہا۔ ان کے بعض فتوے مجلہ ''آثار جدید'' مئوناتھ بھنجن کے مفتی عبدالعزیز اعظمی عمری نمبر میں درج کیے گئے ہیں، جن سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے بہت بڑے مفتی بھی تھے یعنی تدریس اور افتا دونوں میں مہارت رکھتے تھے۔ لیکن غالباً ان کے تمام فتوے محفوظ نہیں رہے۔ افسوس ہے برصغیر کے بہت سے اہل حدیث علما کے فتووں کی حفاظت نہیں ہوسکی اور وہ ضائع ہو گئے۔

بہرکیف ان کی خدمتِ تدریس کا آخری دور مدرسہ اثریہ دارالحدیث مئو کا تھا۔ اب وہ بے حد کمزور بھی ہو گئے تھے اور ہوش وحواس میں بھی اختلال آ گیا تھا۔ پیدل چلتے ہوئے اپنے گھر کا راستہ بھی بھول جاتے تھے۔ بسا اوقات کہیں کے کہیں نکل جاتے۔ پھر تلاش بسیار کے بعد انھیں گھر لایا جاتا۔

مفتی صاحب موصوف نے ۱۹۴۲ء سے ۲۰۰۲ء تک ساٹھ سال سلسلہ تدریس جاری رکھا۔ اس طویل عرصے میں انھوں نے طلبا کو ہر علم کی چھوٹی بڑی کتابیں پڑھائیں۔ ان کا شمار اپنے دور کے ممتاز مدرسین میں ہوتا تھا۔ ان کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ ان سب کے نام بتانا تو کسی کے بس کی بات نہیں البتہ چند حضرات کے اسمائے گرامی ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

☆......مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری مصنف الرحیق المختوم وسابق امیر جمعیت اہل حدیث ہند

☆......مولانا اصغر علی امام مہدی ایڈیٹر ''ترجمان'' دہلی وناظم اعلیٰ مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند

☆......مولانا محمد ابراہیم یوسف پوری

☆......مولانا محمد اعظمی سابق شیخ الحدیث وشیخ الجامعہ عالیہ عربیہ مئو

☆......مولانا عزیز الحق عمری شیخ الحدیث جامعہ اثریہ دارالحدیث مئو ومدیر ماہنامہ ''آثارِ جدید'' مئو

Marfat.com

☆......مولانا محمد احمد اثری بن مولانا شکر اللہ فیضی سابق شیخ الحدیث جامعہ اثریہ دار الحدیث مئو

☆......مولانا عبدالرحمٰن رحمانی بن شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری

☆......مولانا قطب الدین رحمانی سابق مدرس جامعہ سراج العلوم جھنڈا نگر نیپال

☆......مولانا شفیع اللہ رحمانی مدرس کلیۃ الصالحات اپراہور ضلع بلرام پور

☆......مولانا محمد ابراہیم رحمانی سابق شیخ الحدیث جامعہ دار الحدیث یوسف پورہ (ضلع بستی)

☆......مولانا عابد حسن رحمانی سابق استاذ جامعہ سلفیہ بنارس

☆......مولانا عزیز الرحمٰن سلفی استاذ جامعہ سلفیہ بنارس

☆......مولانا ابوسفیان اثری مدنی استاذ جامعہ اثریہ دار الحدیث مئو

☆......مولانا مظہر علی سلفی مدنی استاذ جامعہ اسلامیہ فیض عام مئو

یہ مفتی صاحب ممدوح کے چند تلامذہ کے نام ہیں۔ ان کے علاوہ بہت بڑی تعداد ان حضراتِ علما کی ہے جنھوں نے ان سے تحصیل علم کی اور پھر وہ بہت سے اہم علمی مناصب پر فائز ہوئے۔

درس و تدریس کے علاوہ مفتی صاحب موصوف دعوت و تبلیغ کا فریضہ بھی انجام دیتے رہے۔ جب تک ان کی صحت اجازت دیتی رہی مختلف مساجد میں وعظ و خطابت کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ عام فہم انداز میں خطبہ دیتے اور آسان زبان میں مسائل بیان فرماتے۔ مشکل الفاظ استعمال کرنے کے عادی نہ تھے۔

خوش اخلاق، منکسر المزاج اور متواضع عالم تھے۔ سادہ لباس، سادہ خوراک، فرض شناس، اوقات کے پابند، طلبا کے لیے رحم دل، زاہد و متقی اور قناعت پسند۔ مہمان نواز، سب کے خیر خواہ اور ہم درد۔ اس عالمِ جلیل پر تنگ دستی کا دور بھی گزرا، جس کا انھوں نے نہایت صبر و تحمل سے مقابلہ کیا۔ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے، ہر حالت میں اللہ کا شکر ادا کیا۔ مطالعہ کا بے حد شوق تھا اور مختلف علمی موضوعات کی کتابیں پڑھنا ان کا معمول تھا۔ کسی کے لیے کوئی ناگوار بات ان کی زبان سے نہیں نکلتی تھی۔ نہایت غیور اور خوددار تھے۔ کبھی اہل ثروت کے دروازوں پر نہیں گئے اور علم کی دولتِ بے پایاں کو کبھی امراء کی دہلیز پر لے کر نہیں گئے۔ وضع داری اور رکھ رکھاؤ ان کی زندگی کا لازمی جز تھا۔ علماے سلف کا خوب صورت نمونہ تھے۔ علمی ثقاہت کا قابل اعتماد پیکر۔

حج بیت اللہ کی دل میں شدید تمنا رکھتے تھے، لیکن بہ ظاہر اس تمنا کے پورا ہونے کی کوئی صورت نہ تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا کہ یہ تمنا پوری ہوئی اور حج و زیارت کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت ممدوح اگرچہ ذاتی طور پر کبھی کسی ستائش یا انعام و نوازش کے متمنی نہ ہوے لیکن مختلف اوقات

Marfat.com

میں جماعتی طور پر ان کی ساٹھ سالہ علمی و تدریسی خدمات کا اعتراف کیا گیا اور ان کی طویل علمی زندگی کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ ۱۳، ۱۴، ۱۵ مارچ ۲۰۰۴ء کو پاکوڑ میں مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا تو جماعتی حیثیت سے انھیں توصیفی سند بھی دی گئی اور اچھی خاصی نقد رقم بھی دی گئی۔ اس موقعے پر ان کے شاگرد رشید مولانا مختار احمد ندوی کو بھی نقدی کی صورت میں انعام دیا گیا تھا، لیکن انھوں نے اپنا یہ انعام استاذِ گرامی کی نذر کر دیا تھا۔

حضرت مفتی صاحب ممدوح کی تمام زندگی تدریس میں گزری۔ ان کی تحریری خدمات بہت محدود ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ مئو ناتھ بھنجن کے علمائے کرام کے تراجم انھوں نے قلم بند کیے تھے، لیکن سنا ہے کہ وہ مسودہ بھی ان کے گھر میں نہیں ہے، انھوں نے کسی کو دیا، پھر واپس نہیں آیا۔

زندگی کے آخری دور میں نقاہت بہت بڑھ گئی تھی اور گھر تک ہی محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ ۱۵ جنوری ۲۰۰۵ء کو ان کی اہلیہ نے وفات پائی تو صحت مزید گر گئی۔ اس سے چند روز بعد دماغ کی تکلیف میں اضافہ ہو گیا۔ اس کا علاج پہلے تو مئو کے اسپتالوں میں ہوتا رہا۔ پھر ڈاکٹروں کے مشورے سے بنارس کے ایک بڑے اسپتال میں داخل کرا دیے گئے۔ وہاں بھی کچھ افاقہ نہ ہوا تو ڈاکٹروں نے گھر لے جانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ بدھ کے روز ۶ جولائی ۲۰۰۵ء کی صبح کو انھیں گھر لایا گیا اور پھر اسی دن شب کے تقریباً بارہ بجے ۸۳ سال کی عمر پا کر انتقال کر گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون.

حضرت مفتی صاحب کی نمازِ جنازہ ۷- جولائی ۲۰۰۵ء کو بعد نماز ظہر بمقام عید گاہ پچھّم مفتی صاحب کے تلمیذ رشید مولانا مظہر احسن ازہری نے پڑھائی، جس میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی اور انھیں ان کے آبائی قبرستان میں دفن کیا گیا۔

مفتی صاحب کی وفات کے نو مہینے بعد اپریل ۲۰۰۶ء میں ''مجلّہ آثارِ جدید'' (مئو ناتھ بھنجن) کا ''مفتی عبدالعزیز اعظمی عمری نمبر'' شائع ہوا جو ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ضخیم نمبر مفتی صاحب سے متعلق متعدد اہل علم کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس فقیر نے یہ چند سطور اسی نمبر کے مندرجات کی مدد سے ترتیب دی ہیں۔

حضرت مرحوم کی سند عالی تھی جو تین واسطوں سے حضرت امام شوکانی سے ملتی ہے اور تین ہی واسطوں سے حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کی معرفت حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی تک پہنچتی ہے۔ پھر ان سے آگے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی تھے اور ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا محمد حسین شیخوپوری

(وفات ۵۔ اگست ۲۰۰۵ء)

قیامِ پاکستان سے گیارہ مہینے بعد ۲۴۔ جولائی ۱۹۴۸ء کو دارالعلوم تقویۃ الاسلام لاہور میں مغربی پاکستان کی جماعت اہل حدیث کی تنظیم کے سلسلے میں جن علما و زعما کا اجلاس بلایا گیا تھا، ان میں مولانا محمد حسین صاحب شامل نہیں تھے۔ کچھ پتا نہیں اس وقت وہ کہاں تھے، کس حال میں تھے اور کس طرح زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ اجلاس میں شمولیت کی دعوت دینے والوں میں سے کوئی انھیں جانتا بھی تھا یا نہیں۔ اس اجلاس میں شیخوپورہ شہر سے مولانا ولی محمد تشریف لائے تھے جو وہاں کی مسجد اہل حدیث کے امام تھے اور اس زمانے میں وہاں اہل حدیث کی ایک ہی مسجد تھی، جسے ورکاں والی مسجد کہا جاتا تھا اور اہل حدیث کی اس وقت کی آبادی کے لیے یہ مسجد کافی تھی۔ مولانا ولی محمد واقعی ولی تھے۔ صاحبِ تقویٰ بزرگ، صالحیت کے پیکر دل نواز اور مجسمۂ حسنات۔ انھیں دیکھ کر خدا یاد آتا تھا۔ کم گو، متواضع، مسکین طبع، چہرے پر معصومیت جھلکتی اور آنکھوں سے حیا ٹپکتی تھی۔ اب ایسے لوگ کہاں پیدا ہوں گے۔ وہ مائیں مرگئیں جو اس قسم کے تقویٰ شعار بچوں کو جنم دیتی تھیں۔ وہ گودیں اجڑ گئیں جو بچوں کی بہتر تربیت کا ذریعہ بنتی تھیں۔ وہ ماحول ختم ہوا جس میں نیکی کے آثار ابھرتے تھے۔ وہ فضا ناپید ہوگئی جس میں حسنات کی خوش گوار ہوائیں چلتی تھیں اور وہ زمین بنجر ہوگئی جس میں خیر و صلاح کے گلستان لہلہاتے تھے۔ دلوں کی کھیتیاں ویران ہوگئیں، عمل کے جذبے کو دیمک چاٹ گئی اور روح کی دنیا اجڑ گئی۔

۲۴۔ جولائی ۱۹۴۸ء کے اجلاس سے کچھ عرصہ بعد مولانا محمد حسین مرکزی جمعیت اہل حدیث کے دفتر تشریف لائے۔ میں اس وقت جمعیت کا آفس سیکرٹری تھا۔ ناک نقشہ نہایت مناسب، سفید قمیص اور سفید تہبند زیبِ تن۔ سر پر کلف لگی کلے پر طرے دار سفید پگڑی۔ سرو کی طرح سیدھا لمبا قد، درشنی جوان، چہرے پر شرافت کے آثار نمایاں اور گفتگو میں احترام کا عنصر ہویدا۔ وہ مولانا سید محمد داؤد غزنوی سے ملے۔ مؤدبانہ لہجے میں چند باتیں کیں اور چلے گئے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے مولانا محمد حسین کو دیکھا اور ان سے ملاقات ہوئی۔ لیکن مولانا محمد حسین کون تھے؟ کہاں پیدا ہوئے؟ کہاں کے رہنے والے تھے؟ کہاں تعلیم حاصل کی اور کن اساتذہ سے کی؟ پاکستان

Marfat.com

کب آئے اور یہاں آ کر انھوں نے نئے اور اجنبی ماحول میں کس طرح زندگی کا آغاز کیا؟ اور پھر کس طرح انھیں منزل بمنزل آگے بڑھنے کے مواقع میسر آئے؟

آیئے ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

مولانا محمد حسین ضلع امرتسر کی تحصیل اجنالا کے ایک گاؤں ''بوہلیاں'' کے راجپوت خاندان میں ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام چودھری بلند خاں تھا جو فوج میں حوالدار تھے اور مسلکاً کٹر بریلوی۔ اس نواح میں اس وقت مانیاں والے کے پیروں کی بڑی شہرت تھی۔ چودھری بلند خاں ان پیروں کے مرید تھے۔ حقہ نوشی کے بڑے شوقین تھے اور حقہ بنا سنوار کر رکھتے تھے۔ فوج میں کسی کی تقریر سنی کہ قبر میں حقہ پینے والے کے منہ اور ناک اور دیگر اعضا سے دھواں نکلتا ہوگا۔ اس کے بعد حقہ نوشی ترک کر دی تھی۔

محمد حسین باپ کے ایک ہی بیٹے تھے اور بیٹیاں پانچ تھیں۔ اس لیے والدین اور گھر کے تمام افراد کے لیے پیار کا مرکز تھے۔ تعلیم کا آغاز گاؤں کے ایک شخص ملا غلام نبی سے کیا۔ چھے سال کی عمر میں ایک قریبی گاؤں جستر وال کے لوئر مڈل سکول میں داخل ہوئے اور بارہ سال کی عمر میں چھٹی جماعت کا امتحان پاس کر لیا۔

اس کے بعد دینی تعلیم کے حصول کا مرحلہ پیش آتا ہے اور وہ اس طرح کہ ان کے گاؤں بوہلیاں میں ایک بزرگ رہتے تھے جن کا نام بابا چنن خاں تھا اور وہ جلد ساز تھے۔ ایک مرتبہ اجنالا کے تحصیل دار نے ان کو جلدیں باندھنے کے لیے کتابیں بھیجیں جن میں حضرت حافظ محمد لکھوی رحمہ اللہ کی تصانیف ''زینت الاسلام''، ''احوال الآخرت'' اور اس قسم کی چند اور کتابیں تھیں۔ یہ تمام کتابیں توحید اور اتباعِ کتاب وسنت کے موضوع سے متعلق تھیں۔ بابا چنن خاں ان کتابوں کی جلد بندی کے ساتھ ساتھ انھیں پڑھتے بھی رہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ان کے مطالعہ سے پکے اہل حدیث ہو گئے۔ ان کی آواز بڑی رسیلی اور پُرسوز تھی۔ وہ ایک جذبۂ خاص سے ان کتابوں کے اشعار پڑھتے تو گاؤں کے لوگ ان کے گرد جمع ہو جاتے، جس کی وجہ سے وہ لوگ کسی حد تک توحید وسنت سے آشنا ہو گئے۔ اب محمد حسین کے اولیں استاد ملا غلام نبی کے مشورے سے ان کو دینی تعلیم دلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس وقت موضع کمیر پور کو اس نواح میں اہل حدیث کا مرکز قرار دیا جاتا تھا۔ مولانا حافظ عبداللہ روپڑی اور ان کے برادرانِ گرامی حافظ محمد حسین روپڑی اور حافظ عبدالرحمٰن روپڑی کا مسکن یہی قصبہ تھا۔ ان دنوں حافظ عبداللہ صاحب تو روپڑ میں اقامت فرما تھے، لیکن حافظ محمد حسین، حافظ عبدالرحمٰن، مولانا اللہ بخش کمیر پوری اور بعض دیگر حضرات کا وہاں سلسلہ تبلیغ جاری تھا۔ حافظ عبداللہ بہاول پوری کے والد مولانا نور محمد بھی وہاں خدمت تدریس انجام دیتے تھے۔ ایک اور بزرگ حافظ خیر دین نابینا تھے، جنھیں حضرت حافظ محمد لکھوی کی پوری ''تفسیر محمدی'' زبانی یاد تھی جو سات ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔

Marfat.com

ابتدا میں محمد حسین اپنے گاؤں سے روزانہ کمیر پور جاتے تھے، لیکن بعد میں وہیں رہنے لگے تھے۔ کمیر پور میں تیرہ سال کے اس بچے کو پہلا سبق حضرت حافظ عبداللہ روپڑی کے برادرِ صغیر حافظ عبدالرحمٰن نے پڑھایا تھا جو تیسویں پارے کی ابتدائی تین آیات ﴿عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ o عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ o الَّذِىْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ o﴾ کا ترجمہ تھا۔

یہ سبق انھوں نے شام کو گھر آکر والدین کو سنایا تو وہ نہایت خوش ہوئے۔

والدین نے اس اکلوتے بچے کی لاڈ پیار میں چھوٹی عمر ہی میں شادی کر دی تھی اور اپنی خاندانی روایت کے مطابق سہرے اور دیگر رسوم کے لوازم کے ساتھ کی تھی۔ ہاتھوں پر مہندی لگائی گئی تھی اور کلائی پر گانا باندھا گیا تھا۔ وہ جب کمیر پور تعلیم کے لیے گئے تو ہاتھ مہندی سے بھر پور تھے اور طلبا ان کا مذاق اڑاتے تھے۔

جن دنوں وہ اپنے گاؤں سے روزانہ صبح کے وقت پیدل کمیر پور جاتے اور شام کو واپس آتے تھے، ان دنوں کا ایک حیرت انگیز واقعہ ملاحظہ ہو۔ ایک دن راستے میں اچانک ڈراونی شکل کی ایک دیوہیکل شے سامنے آ کھڑی ہوئی، جسے دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو گئے۔ اس نے گرجتی ہوئی بھیانک آواز میں کہا:

''تم کون ہو؟''

جواب دیا: ''محمد حسین''!

پھر آواز آئی: ''کہاں جا رہے ہو؟''

کہا: ''کمیر پور مدرسے میں جا رہا ہوں۔''

کہا: ''وہاں کیوں جا رہے ہو؟''

پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا: ''قرآن پڑھنے کے لیے۔''

قرآن کا لفظ سنتے ہی وہ شکل غائب ہو گئی اور آواز خاموش ہو گئی۔

کمیر پور کو جاتے ہوئے راستے میں ایک گاؤں ''ونجاں والا'' آتا تھا۔ وہاں ایک پختہ قبر تھی جس کے گرد ایک مجاور اور اس کے چند مرید بیٹھے رہتے تھے۔ جب طالب علم محمد حسین وہاں سے گزرتے تو وہ لوگ ان کی طرف اشارہ کر کے کہتے یہ لڑکا روزانہ کمیر پور وہابیوں کے مدرسے میں پڑھنے کے لیے جاتا ہے۔ ایک دن مجاور نے ان کو بلایا اور کہا: تم ان لوگوں کے مدرسے میں جاتے ہو جو پنجتن پاک کو نہیں مانتے؟ انھوں نے کہا: میں طالب علم ہوں، مجھے نہیں معلوم پنجتن کون ہوتے ہیں۔ مجاور نے کہا: تم وہابی ہو، تمھیں اسی لیے پنجتن پاک کا پتا نہیں۔ انھوں نے کہا: آپ بتا دیں پنجتن پاک کون ہیں؟ مجاور نے کہا: پنجتن پاک ہیں اللہ، نبی، علی، فاطمہ، حسن، حسین ......! محمد حسین نے کہا: بابا جی یہ تو چھے ہوئے، ان میں سے ایک نکالیے تاکہ یہ پانچ ہو

Marfat.com

جائیں۔ اس پر مجاور تو خاموش ہو گیا لیکن مریدوں نے کہا: پیر جی! ہم نے آپ سے کہا تھا، وہابی کو نہ چھیڑو نہ بلاؤ۔ یہ لوگ بڑے گستاخ ہوتے ہیں۔

اس کے بعد ان لوگوں نے نہ کبھی انھیں بلایا اور نہ ان کی طرف کوئی اشارہ کیا۔

بہرحال مولانا محمد حسین کمیر پور کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ حافظ عبدالرحمٰن صاحب سے صرف ونحو کی ابتدائی اور بعض دیگر علوم کی کتابیں پڑھیں۔ مولانا نور محمد سے بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔

مولانا محمد حسین کے گاؤں بوہلیاں سے کمیر پور تین میل کے فاصلے پر تھا۔ اثنائے راہ میں دو میل بے آباد جنگل نما سا رقبہ تھا۔ ایک دن راستے میں ایک بزرگ حاجی غلام محمد نامی ملے جو اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے مولانا سے پوچھا کہ تم کون ہو اور کہاں جا رہے ہو؟ انھوں نے بتایا کہ بوہلیاں سے آیا ہوں اور کمیر پور پڑھنے کے لیے جا رہا ہوں۔ پوچھا: کس برادری سے تعلق رکھتے ہو؟ انھوں نے اپنے والد کا نام بتایا اور کہا راجپوت برادری سے تعلق رکھتا ہوں۔ حاجی صاحب خود بھی راجپوت تھے۔ وہ خوش ہوئے اور دعائیں دیں۔ فرمایا تم بہت اچھا کام کر رہے ہو، تعلیم مکمل کرو اور پھر کتاب وسنت کی اشاعت میں مشغول ہو جاؤ۔

مولانا محمد حسین کی تعلیم کا سلسلہ جاری تھا اور اس کی تکمیل کا مرحلہ قریب آ رہا تھا کہ ان کے والد صاحب گنٹھیا کے تکلیف دہ مرض میں مبتلا ہو گئے۔ بہت جلد یہ مرض انتہائی شدت اختیار کر گیا۔ درد کی شدت سے ان کی چیخیں نکل جاتی تھیں۔ اس طرح گھر کا سکون ختم ہو گیا۔ والد کو سنبھالنے والا کوئی نہ تھا۔ مجبوراً تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ اب وہ زراعت بھی کرتے تھے، ہل بھی چلاتے تھے، زمین کو پانی بھی دیتے تھے اور گھر کے دیگر کام بھی ان کے سپرد تھے۔ صرف سترہ سال کی عمر تھی۔ بیلوں کے ذریعے کنویں کے پانی سے زمین سیراب کی جاتی تھی۔ بعض دفعہ پوری رات ''گادی'' پر بیٹھے بیلوں کو ہانکنے اور زمین کو پانی دینے میں گزر جاتی۔ گھر کے تمام معاملات کا بوجھ ان پر آن پڑا تھا۔ قرآن سے انھیں ابتدا ہی سے محبت تھی۔ گادی پر بیٹھے اونچی آواز سے قرآن مجید پڑھتے رہتے اور اکیلے تقریر بھی کرتے رہتے۔ رات کے سناٹے میں خود ہی مقرر اور خود ہی سامع۔

کاشت کاری اور زراعت کے ساتھ ساتھ انھوں نے کپڑے کی تجارت کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ ان کا تحصیلی مقام اجنالا تھا۔ وہاں سے کپڑا خرید کر لاتے اور تھوڑے سے منافع پر گاؤں کی عورتیں گھر سے کپڑا خرید لیتیں۔ یہ کام کافی عرصہ کرتے رہے۔

مولانا ممدوح پنجابی کے شاعر بھی تھے۔ چناں چہ کاشت کاری اور کپڑے کی تجارت کے زمانے میں دو منظوم رسالے لکھے۔ ایک کا نام تھا ''چٹھی آسمانی'' اور دوسرے کا تھا ''دعوتِ عمل''

Marfat.com

موضع بوہلیاں کے بعض لوگ اگرچہ کچھ نہ کچھ توحید سے آشنا ہو گئے تھے، لیکن ان کی اکثریت مختلف قسم کی بدعات کا شکار تھی۔ خود ان کی راجپوت برادری کے زیادہ تر لوگ بالخصوص گاؤں کے چودھری بہت سی خرافات میں مبتلا تھے اور سودی کاروبار کرتے تھے، جسے چھوڑنے کے لیے وہ قطعاً تیار نہ تھے۔ مولانا محمد حسین نے پوری جرأت سے اس کی مخالفت شروع کر دی اور دیگر گھریلو امور کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ کتاب و سنت کی تبلیغ کو اس بندۂ خدا نے اپنا لازمۂ حیات قرار دے لیا۔

جن حالات سے وہ گزر رہے تھے، ان حالات میں تبلیغ کا کام بہت مشکل تھا، لیکن انھوں نے اللہ پر توکل کر کے اسے جاری رکھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں جلد ہی چند مخلص نوجوان معاون میسر آ گئے اور سب نے مل کر پوری کوشش سے تبلیغی مہم شروع کر دی۔ مولانا ممدوح نے ۱۷ سال کی عمر میں ۱۹۳۵ء میں گاؤں کی مسجد میں باقاعدگی سے خطبہ جمعہ کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ پھر تبلیغ میں تیزی لانے کے لیے ان چند دوستوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ رات کو اپنے مکانوں کی چھتوں پر چڑھ جاتے اور تقریریں کرتے۔ اس طرح آہستہ آہستہ ان کا دائرۂ اثر اور حلقہ تبلیغ وسیع ہوتا گیا۔

مولانا محمد حسین کے لیے بعض اعتبارات سے وہ بڑا تشویش ناک وقت تھا۔ والد بیمار، معاشی حالت کمزور، برادری مخالف، گھر کے تفکرات ذہن پر سوار، وہ جمعے کے روز والد کو اٹھا کر مسجد میں لاتے تھے۔ ایک سوال لوگوں نے یہ پیدا کر دیا کہ ان کی عمر چھوٹی ہے اور چہرے پر ڈاڑھی نہیں ہے، اس لیے ان کی امامت و خطابت محل نظر ہے۔ اس طرح بہت سے مسائل تھے، جن میں یہ گھرے ہوئے تھے۔ کچھ مدت وہ مسجد کی خطابت سے الگ بھی رہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا پھر سلسلۂ خطابت ان کے سپرد ہو گیا۔ اس نوجوان نے ہمت نہیں ہاری اور پوری مستعدی سے وعظ و تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا اور اللہ نے کامیابی عطا فرمائی۔ پھر ایسا وقت بھی آیا کہ انھوں نے اپنے علاقے کے بعض سالانہ تبلیغی جلسوں میں حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا حافظ عبداللہ روپڑی اور دیگر مشاہیر و اکابر کی موجودگی میں تقریریں کیں اور ان سے دعائیں لیں۔ اسی اثنا میں مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی، ان کے برادرِ کبیر حافظ اسماعیل روپڑی اور اس دور کے بعض دیگر مقررین و واعظین کی رفاقت میں مختلف مقامات میں وعظ و تقریر کے مواقع میسر آئے اور ان کے ساتھ مل کر خوب تبلیغی خدمات سرانجام دیں۔ انہی دنوں بٹالہ (ضلع گورداس پور) میں مولانا حکیم ہدایت اللہ بٹالوی سے ملاقات ہوئی اور ان سے طب کی چند کتابیں پڑھیں۔

حکیم ہدایت اللہ تقسیم ملک کے بعد لاہور آ گئے تھے اور چوک دال گراں میں یونانی دواخانہ کے نام سے مطب قائم کر لیا تھا۔ وہ لاہور کی جمعیت اہل حدیث کے نائب صدر تھے، جب کہ حضرت مولانا عطاء اللہ

Marfat.com

حنیف بھوجیانی اس کے صدر تھے۔ لاہور کی مسجد لسوڑے والی میں حکیم صاحب طویل عرصے تک خطبہ جمعہ بھی ارشاد فرماتے رہے۔

مولانا محمد حسین نے ہمیشہ ہر مسلک کے علما کا احترام کیا۔ ان کے گاؤں بوہلیاں میں جو بریلوی علما آتے، مولانا پورے احترام کے ساتھ ان سے ملتے اور انھیں گھر لے جاتے اور اپنی حیثیت کے مطابق انھیں کھانا کھلاتے۔ ان سے سنجیدہ انداز میں ہنسی مذاق کا معاملہ بھی چلتا رہتا تھا۔ با ادب با نصیب بے ادب بے نصیب کا محاورہ ان کے ذہن پر نقش ہو چکا تھا اور وہ پوری زندگی اس پر عمل پیرا رہے۔

ان سطور کا گنہگار راقم بھی حتی الامکان اس پر اللہ کے فضل سے عامل ہے۔ اس فقیر کی ذہنی اور فکری تربیت جس ماحول میں ہوئی اور جن بزرگانِ دین کی نگرانی میں ہوئی، وہ بزرگ تمام مسالک فقہ کے اہل علم کو تکریم کی نظر سے دیکھتے اور ان سے احترام کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اس باب میں یہ عاجز سب سے پہلے اپنے مرحوم دادا میاں محمد سے متاثر ہوا۔ وہ اہل علم کی بے پناہ عزت کرتے تھے۔ پھر حضرت الاستاذ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کو دیکھا کہ علما سے ان کا برتاؤ نہایت اکرام کا پہلو لیے ہوئے تھا۔ اس کے بعد حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی، حضرت مولانا محمد داود غزنوی، مولانا محمد حنیف ندوی، علمائے لکھویہ اور بہت سے دیگر حضرات کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا اور مختلف مسالک سے تعلق رکھنے والے علمائے کرام سے ان کے میل جول اور بات چیت کے انداز کا مشاہدہ کیا۔ یہ ماضی قریب کے ہمارے وہ اسلاف تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے علم کی دولت سے بھی خوب نوازا تھا، اظہارِ مدعا کی نعمتِ بے بہا بھی عطا فرمائی تھی اور عمل کی متاعِ گراں قدر سے بھی مالا مال فرمایا تھا۔ رحمھم اللہ تعالیٰ۔

مولانا محمد حسین نے تقریباً سترہ اٹھارہ سال اپنے آبائی گاؤں اور اس کے قرب و جوار میں توحید کی تبلیغ کی اور قرآن و حدیث کے احکام بیان فرمائے۔ ۱۹۴۲ء سے لے کر اگست ۱۹۴۷ء تک انھوں نے خاص طور سے پورے اہتمام کے ساتھ سلسلۂ تبلیغ جاری رکھا۔ اس زمانے میں ان کے رفقائے کار میں سے مولانا حافظ اسماعیل روپڑی اور مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی کے اسمائے گرامی بالخصوص لائق تذکرہ ہیں۔ ان حضرات کی یہ بھرپور جوانی کا زمانہ تھا جو انھوں نے اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کے احکام و فرامین کی اشاعت کے لیے وقف کر رکھا تھا۔

یہاں مولانا کے عہد تبلیغ کا ایک واقعہ سنتے جایئے۔ وہ ایک مرتبہ اپنے چند رفقا کے ساتھ کہیں وعظ کے لیے جا رہے تھے کہ ایک گاؤں ''کڑیال'' پہنچے جو ان کے مسکن موضع بوہلیاں سے پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ ایک رفیقِ سفر نے کہا کہ یہاں ایک شخص چودھری غلام محمد نمبردار رہتا ہے، وہ راجپوت برادری سے تعلق رکھتا

Marfat.com

ہے اور مرزائی ہوگیا ہے۔ وہ اکثر آپ کا تذکرہ کیا کرتا ہے۔ اس سے ملتے چلیں، ممکن ہے ہماری گفتگو کا اس پر کوئی اثر پڑے اور وہ مرزائیت سے تائب ہو کر دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائے۔ مولانا اپنے ساتھیوں سمیت اس کی حویلی میں گئے تو وہ بڑے تپاک سے ملا اور ان کی آمد پر بہت خوش ہوا۔ اس نے دورانِ گفتگو میں ان کو مرزائیت قبول کرنے کی دعوت دی اور مرزا غلام احمد قادیانی اور مرزا محمود کی بڑی تعریف کی۔ کہا: مرزا غلام احمد سچا نبی ہے اور اس کی نبوت کو تسلیم کرنے سے ہی نجات ہو گی۔ اس کا بیٹا مرزا محمود بھی جو اس کا خلیفہ ہے، برسر حق ہے۔

مولانا نے چودھری غلام محمد کی بات کو غلط قرار دیا اور قرآن و حدیث کی رو سے مرزا غلام احمد اور تمام مرزائیوں کی تکذیب کی۔ اس پر غلام محمد نمبردار نے سخت خفگی کا اظہار کیا اور تھوڑی دیر بعد مولانا اور ان کے ساتھی وہاں سے اگلی منزل کو روانہ ہو گئے۔

قیام پاکستان کے زمانے میں مرزا محمود نے مرزائیوں سے کہا تھا بلکہ پیش گوئی کی تھی کہ پاکستان کا کھیل چند روز کا ہے، جو لوگ یہاں سے جا رہے ہیں، وہ پھر واپس آ جائیں گے۔ اس نے کہا تھا کہ قادیان چوں کہ ہندوستان میں ہے اور (نعوذ باللہ) بابرکت جگہ ہے، اس لیے اس نواح میں مسلمانوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس کے بعد خود مرزا محمود اور اس کے اہل و عیال تو قادیان سے پاکستان آ گئے تھے، لیکن چودھری غلام محمد نمبردار اپنے گاؤں کڑیال میں رہا، اس لیے کہ اسے مرزا محمود کی پیش گوئی کی صداقت پر یقین تھا۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ بہت عبرت ناک واقعہ ہے۔ آپ بھی سن لیجیے۔ سکھوں کا ایک جتھا کڑیال میں داخل ہوا۔ ان لوگوں نے غلام محمد اور اس کے افراد خانہ کو گھروں سے نکالا اور انھیں ایک چھوٹی سی ندی پر لے گئے۔ پھر غلام محمد کے سامنے اس کی بہو بیٹیوں کی عصمت لوٹی اور بعد ازاں غلام محمد کے ٹکڑے کر کے اسے ندی میں پھینک دیا۔ اس طرح اس مرزائی خاندان کا انتہائی عبرت انگیز اور اذیت ناک انجام ہوا۔

۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے قیام کا اعلان ہوتے ہی مسلمانوں پر سکھوں کے مظالم کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور مشرقی پنجاب کے مسلمان ترک وطن پر مجبور ہو گئے تھے، جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں اپنے آبائی وطن سے محبت تھی اور اس مٹی سے پیار تھا، جہاں ان کے آبا و اجداد پیدا ہوئے تھے اور جہاں ان کے بزرگوں کی قبریں تھیں۔

اعلان پاکستان کے بعد مولانا محمد حسین کے گاؤں کے لوگ روتے دھوتے قافلے کی صورت میں اپنے آبائی وطن کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنے کے غم اور قیام پاکستان کی خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ شام کے وقت اپنے گاؤں سے نکلے اور رات کو دریا کے کنارے پہنچے اور وہیں رات بسر کی۔ نہایت مشکل سے پاکستان

Marfat.com

پہنچے۔ مولانا کا بیان ہے کہ اس سفر میں ''ہم نے اپنے قرب وجوار کی بہت سی جوان لڑکیوں کو دیکھا جنھیں پکڑ کر غیر مسلم لے جا رہے تھے۔ سکھوں کی برچھیوں پر ننھے معصوم بچوں کے لاشے تڑپتے دیکھے، بڑے بڑے گاؤں جلتے اور لٹتے دیکھے۔'' مولانا کے پاس تھری ناٹ تھری کی رائفل تھی، جس نے بڑا کام دیا اور اس کی گولیوں کی مدد سے کئی مردوں اور عورتوں کو جو غیر مسلموں کے نرغے میں پھنسے ہوئے تھے، نجات ملی۔ بہر کیف یہ لوگ لٹتے پٹتے پاکستان پہنچ گئے۔ مولانا کی گھوڑی پر ان کے بچے سوار تھے اور سائیکل پر بیمار باپ کو بٹھایا تھا۔

یہاں ان کی انسانی ہم دردی اور خدا ترسی کے متعدد واقعات میں سے دو واقعے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پہلا واقعہ یہ کہ پاکستان پہنچ کر ایک گاؤں کالا خطائی میں آئے تو ایک وسیع مکان میں ایک سکھ تنہا بیٹھا تھا۔ اس کے افرادِ خانہ مشرقی پنجاب کو روانہ ہو گئے تھے۔ مولانا اور ان کے ایک عزیز عبداللہ اس کے پاس پہنچے تو وہ انھیں دیکھ کر ڈر گیا کہ اب یہ لوگ اسے مار ڈالیں گے۔ لیکن مولانا نے اسے تسلی دی اور فرمایا جس طرح آپ پریشان ہیں، اس سے زیادہ پریشانی کے عالم میں ہم یہاں پہنچے ہیں۔ یہ کہہ کر اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ مولانا نے تو اسے کچھ نہیں کہا، لیکن رات کو کچھ لوگوں نے اسے قتل کر دیا۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے دیکھا کہ سامنے ایک نوجوان مسلمان دو ہندو نوجوان لڑکیوں کو لیے آ رہا ہے اور وہ دونوں رو رہی ہیں۔ مولانا نے ان لڑکیوں کو اس نوجوان سے رہائی دلائی اور ایک عیسائی پادری کے ذریعے سے ان کے قافلے تک انھیں پہنچانے کا انتظام کیا۔

یہ دو واقعے اس دور کے حالات کی مناسبت سے نہایت اہم تھے۔

کالا خطائی میں ہر جگہ غلاظت بکھری ہوئی تھی۔ کسی نہ کسی طرح ایک مہینا یہ لوگ وہاں رہے۔ وہاں سے شاہدرہ پہنچے، جہاں کھجوروں کے جھنڈ میں بے شمار لوگ بیٹھے تھے۔ (کھجوروں کے یہ درخت کئی سال تک یہاں رہے، اب انھیں اکھاڑ دیا گیا ہے اور ان کی جگہ بڑے بڑے مکان بن گئے ہیں) یہیں سے انھیں پتا چلا کہ ان کے گاؤں کے بہت سے لوگ مختلف علاقوں میں چلے گئے ہیں۔ بعض لوگ ملتان کی طرف، بعض لائل پور کی طرف اور بعض دیگر مقامات کی طرف روانہ ہو گئے ہیں۔ یعنی ان کے آبائی گاؤں اور اس کے اردگرد کے لوگ آپس میں بکھر گئے ہیں اور کوئی پتا نہیں کون کدھر گیا۔ یک جائی کا پرانا سلسلہ جو صدیوں سے چلا آ رہا تھا، ختم ہو گیا اور نئے حالات سے بالکل نئی فضا عالم وجود میں آ گئی۔

اب مولانا محمد حسین اور ان کے ساتھی شیخوپورہ کو روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچے تو بالکل اجنبی لوگ اور اجنبی

Marfat.com

ماحول۔ نہ کسی سے جان نہ پہچان۔ نہ کچھ کھانے کو میسر، نہ پینے کو۔ نہ کوئی واقف، نہ پرسانِ حال۔ بوڑھے ماں باپ اور بچوں کو لے کر کھلے میدان میں بیٹھے ہیں۔ کسی نے بتایا کہ غلہ منڈی میں پناہ گزینوں کے لیے کچھ ضروری سامان اور کپڑے وغیرہ تقسیم ہو رہے ہیں۔ وہاں گئے تو کچھ ہاتھ نہ آیا، سب کچھ تقسیم ہو چکا تھا۔ خالی ہاتھ واپس آ گئے۔ کسی کو کیا معلوم کہ یہ شخص اپنے علاقے کا کتنا بڑا مقرر اور خطیب تھا اور مستقبل قریب میں یہ اس شہر اور علاقے کا بہت بڑا مقرر اور خطیب ہوگا اور اسی شہر کی طرف اس کی نسبت ہوگی اور پنجاب میں اس کی خطابی آواز پورے زور سے گونجے گی۔

کالا خطائی میں قیام کے دنوں میں ان سے کسی نے ضلع شیخوپورہ کے تین مقامات کا ذکر کیا، وہ تھے کوٹ رنجیت [1]، کالو کے اور گھنگ۔ یہ تینوں نام ان کے ذہن میں رہے اور ساتھیوں کے مشورے سے موضع ''کالوکے'' کا عزم کیا، جو شیخوپورہ سے چند میل کے فاصلے پر سرگودھا جانے والی سڑک سے تھوڑی دور دائیں جانب واقع ہے۔ وہیں ڈیرے ڈال دیے اور زرعی زمین ان کے نام الاٹ ہو گئی۔

اس گاؤں میں مکان بھی مل گیا اور کچھ مطمئن بھی ہو گئے، لیکن فوری طور پر آٹے دانے کے حصول کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس کے لیے اس باہمت نوجوان عالم دین نے شیخوپورہ شہر کا رخ کیا اور وہاں غلہ منڈی میں پلے داری کرنے لگے اور اس کے ساتھ منشیانہ بھی ان کے سپرد ہوا۔ دوسرے پلے داروں کی نسبت انھیں مزدوری کے دو حصے ملتے تھے۔ ایک حصہ پلے داری کا اور ایک منشیانے کا۔ اس مزدوری پر وہ بہت خوش تھے، اس لیے کہ یہ خالص حلال کی کمائی تھی، جس میں محاورے کے مطابق خون پسینا ایک ہو جاتا ہے۔

اس شہر میں سب سے بڑا مسئلہ انھیں پانچ وقت کی نماز اور جمعۃ المبارک پڑھنے کا پیش آیا۔ اس کے لیے انھیں اہل حدیث کی مسجد کی تلاش تھی۔ معلوم ہوا کہ پرانے شہر میں ورکاں والی مسجد اہل حدیث حضرات کی ہے۔ یہ بھی پتا چلا کہ آئندہ جمعہ اس مسجد میں حضرت حافظ عبداللہ روپڑی پڑھائیں گے۔ یہ اس پلے دار مزدوری پیشہ عالم کے لیے بہت بڑی خوش خبری تھی۔ چناں چہ جمعے کے روز یہ اس مسجد میں پہنچے۔ حافظ صاحب انھیں پہلے سے جانتے تھے۔ انھیں سلام عرض کیا اور چند الفاظ میں اپنے سفرِ ہجرت کی روداد بیان کی۔ جماعت کے بعض ارکان سے بھی کچھ تعارف ہوا، اور چلے آئے۔

---

[1] کوٹ رنجیت سنگھ شیخوپورہ سے گوجرانوالہ کی طرف تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اب تو یہ گاؤں شیخوپورہ شہر کا تقریباً حصہ بننے کو ہے۔ یہاں اہل حدیث کی تین مساجد ہیں۔ ایک ان میں سے قدیم ہے۔ ہمارے دادا مرحوم حاجی غلام محمد اس کے بانی تھے۔ والد محترم مولانا عبدالخالق قدوسی رحمہ اللہ طویل عرصہ اس مسجد میں خطبہ ارشاد فرماتے رہے۔ کوٹ رنجیت سنگھ ہمارا آبائی گاؤں ہے۔ اب اس کا نام ''کوٹ حسین'' ہے۔ لیکن لوگوں میں پرانا نام ہی معروف ہے۔ (عمر فاروق قدوسی)

Marfat.com

اس زمانے میں اس مسجد کے مستقل خطیب مولانا نور حسین گرجاکھی مرحوم تھے جو گرجاکھ (گوجراں والا) سے جمعہ پڑھانے کے لیے تشریف لایا کرتے تھے اور مسجد کے امام مولانا ولی محمد تھے، جو واقعتاً ولی اللہ تھے، جن کا تذکرہ ان سطور کے آغاز میں ہوا ہے۔

دوسرا جمعہ پڑھنے کے لیے اسی مسجد میں دوبارہ گئے تو معلوم ہوا کہ مولانا نور حسین آج جمعہ پڑھانے نہیں آئیں گے۔ مولانا محمد حسین وضو کر رہے تھے کہ مولانا ولی محمد کی نظر ان پر پڑی اور وہ ان کے پاس آئے۔ پوچھا: جمعہ پڑھا لو گے؟ جواب دیا: ان شاء اللہ پڑھا لوں گا۔ چناں چہ جمعہ پڑھایا اور اس کے بعد مولانا ولی محمد اور وہاں کی جماعت کے لوگوں سے کچھ مزید تعارف ہوا۔ پھر دوسرا جمعہ پڑھانے کی بھی دعوت دی گئی۔ اس طرح مسلسل چار جمعے پڑھائے تو مسجد کی مجلس انتظامیہ نے باہم مشورہ کر کے انھیں مستقل خطیب مقرر کر لیا۔ اب مولانا محمد حسین اپنے گاؤں میں الاٹ شدہ زمین میں کاشت کاری کرتے تھے اور شیخوپورہ کی مسجد ورکاں والی میں خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے تھے۔ یہ ان کے آئندہ ''شیخوپوری'' ہونے کا گویا اولیں مرحلہ تھا۔

شیخوپورہ کی مسجد اہل حدیث کے خطیب ہونے کی وجہ سے وہاں کے لوگ ان کا احترام کرنے لگے تھے۔ ضلع کے جن مقامات میں جماعت کے لوگ فروکش تھے، ان سے بھی ان کا تعارف ہو گیا اور اس نواح کے علمائے دین سے بھی تعلقات قائم ہو گئے، مثلاً دھیر دے ڈوگراں میں مولانا عمر دین سے، نبی پور پیراں والا میں مولانا تاج دین سے، چوہڑکانا (حال فاروق آباد) میں مولانا محمد داؤد انور سے، فیروز وٹواں میں مولانا عبدالحق اور دیگر حضرات سے۔ اور بھی متعدد مقامات کے اہل علم سے مراسم پیدا ہو گئے تھے اور تبلیغ توحید کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا جس نے آہستہ آہستہ باقاعدگی کی شکل اختیار کر لی اور اس میں استحکام آ گیا۔

مولانا محمد حسین میل جول والے جی دار عالم دین تھے۔ مستقل مزاج، خوش اخلاق، وضع دار، اہل علم کے قدر دان، ہر شخص کا اس کے مرتبے کے مطابق احترام کرتے تھے، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ لوگ بھی ٹوٹ کر ان کا احترام کرتے تھے۔ انھوں نے بڑی مصیبتیں دیکھی تھیں۔ بڑی اذیتیں اٹھائی تھیں۔ اپنے آبائی گاؤں بوہلیاں سے لے کر حدودِ پاکستان تک بلکہ اس سے بھی آگے تک شریف زادیوں کو بلکتے اور روتے دیکھا۔ معصوم دوشیزاؤں کو غنڈوں کی گرفت میں جکڑی ہوئی دیکھا، وہ نہایت الم ناک اور درد انگیز سماں تھا۔ پنجاب میں اس وقت لٹیروں کا غلبہ، قاتلوں کی حکمرانی اور بدمعاشوں کا راج تھا۔ عزت دار سہمے ہوئے تھے۔ تمام علاقہ قتل گاہ بنا ہوا تھا اور خواتین کا خاص طور سے برا حال تھا۔ اس زمانے میں ''پنجاب دا نوحہ'' کے عنوان سے ایک سکھ خاتون شاعرہ نے پنجابی میں ایک دردناک نظم کہی تھی جس نے لوگوں کو بہت رلایا تھا۔ یہ خاتون گوجراں والا کے سکھ گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور اپنے خاندان کے ساتھ دہلی چلی گئی تھی۔ اس کا نام امرتا پریتم تھا۔ اس کی

Marfat.com

پنجابی نظم نے بڑی شہرت پائی تھی۔ لوگ اسے پڑھتے، سنتے اور روتے تھے۔ میں ۱۹۴۸ء میں لاہور آیا تو ایک شخص کو دریائے راوی کے پل پر یہ دردناک نظم پڑھتے ہوئے سنا۔ اس کے چند شعر میرے ذہن میں پیوست ہو گئے۔ اگر میرے معزز قارئین میں سے کسی صاحب کی حس تدین مجروح نہ ہو تو میں وہ شعر یہاں درج کر دوں۔

اج آکھاں وارث شاہ نوں کتے قبراں وچوں بول
تے اج کتابِ عشق دا کوئی اگلا ورقا پھول
اک روئی سی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے وین
اج لکھاں دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہن
اٹھ درد منداں دے دردیا تک اپنا پنجاب
بیلے وچھیاں لاشاں تے لہو دی بھری چناب
اج سبھے کیدو بن گئے حسن عشق دے چور
اج کتھوں لبھ کے لیائے وارث شاہ اِک ہور

کبھی کبھی یہ شعر مجھے یاد آ جاتے ہیں اور میں انھیں اپنے دل میں پڑھتا ہوں تو یقین جانیے تقسیم ملک کے دور کے قتل و غارت اور غنڈوں کے ہاتھوں خواتین کی بے حرمتی کی وہ تمام سرگزشت مجسم شکل میں سامنے آ کھڑی ہوتی ہے اور آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ اس تلخیٔ احوال کو وہی لوگ صحیح طور سے محسوس کر سکتے ہیں جو ان میں سے گزرے ہیں۔ دوسروں کو ہرگز اس کا پوری طرح احساس نہیں ہو سکتا۔

یکم نومبر ۲۰۰۵ء کے اخبارات میں خبر شائع ہوئی کہ ''امرتا پریتم چل بسیں'' تو بالعموم اخبارات نے یہی سرخی لگائی:

''اج آکھاں وارث شاہ نوں کتے قبراں وچوں بول۔''

امرتا پریتم ۱۳۔ اگست ۱۹۱۹ء کو گوجراں والا میں پیدا ہوئی تھی اور ۸۶ برس کی عمر پا کر ۱۳۔ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو دہلی میں وفات پا گئی۔ تقسیم ملک کے وقت وہ اٹھائیس برس کی جوان خاتون تھی اور اس زمانے میں اس نے ''پنجاب دا نوحہ'' کے عنوان سے یہ مشہور نظم کہی تھی۔

خیال گزرا تھا کہ پنجابی زبان کے ان اشعار کا اردو ترجمہ کر دیا جائے تا کہ پنجابی نہ جاننے والے قارئین ان کا مطلب سمجھ لیں، لیکن پھر جی میں آیا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ ترجمے سے شعریت ختم ہو جاتی ہے۔ پھر وہ ایک نثر رہ جاتی ہے۔

مولانا محمد حسین قیام پاکستان کے زمانے میں ترکِ وطن کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہمیں خیال تھا کہ

Marfat.com

لا الـہ الا اللہ کی خاطر ہم اپنے بڑوں کی قبروں، اپنی خوب صورت عبادت گاہوں، اپنے کاروبارِ زندگی، اپنی جائدادوں کی قربانی کر کے ایسی مملکت خداداد کی طرف جا رہے ہیں، جہاں لا الـہ الا الـلہ کی حکومت ہوگی۔ جہاں ہم کسی وڈیرے اور شرابی کبابی کے زیرِ نگیں نہیں ہوں گے۔ جہاں مساوات ہوگی، جہاں نہ چوری ہوگی، نہ ڈاکا، نہ قتل، نہ اغوا۔ نہ وہاں رنڈیوں کے بازار سجیں گے، نہ عریانی ہوگی، نہ بے حیائی ہوگی۔ حکومت ہوگی تو لا الـہ الا الـلـہ کو سمجھنے اور جاننے والوں کی۔ اسمبلیوں کی رکنیت کے لیے میرٹ ہوگا تو شرافت کا، دین داری کا۔ ان سنہری خیالات نے ہمارے سارے زخم مندمل کر دیے۔ ہماری تھکاوٹ دور کر دی۔ دین کے لیے، اسلام کے لیے، شرافت کے لیے، لا الـہ الا اللہ کے لیے ملک مل جائے تو ایسے ملک کے لیے جو کچھ بھی قربان ہو جائے سعادت ہے۔

اس سے آگے فرماتے ہیں:

ہمیں کب معلوم تھا کہ ہزار پریشانیوں اور قربانیوں کے بعد اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نام پر حاصل کیے گئے اس ملک میں ناموسِ رسالت اور تحفظ ختم نبوت کے لیے ہمیں مدتوں جیلوں میں رکھا جائے گا۔ پاکستان کا مطلب کیا...... لا الـہ الا الـلـہ محمد رسول اللہ (ﷺ) کا نعرہ ذہنوں سے محو کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ہم تو یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اس مملکتِ خداداد پر حکومت کرنے والوں کے لیے کوئی میرٹ نہیں ہوگا۔ بدمعاشی، قتل و غارت، بلیک میلنگ، غنڈہ گردی، لوٹ مار، رشوت اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے میرٹ پر جو پورا اترے گا، وہی حکومت کرنے کا حق دار ٹھہرے گا، انا للہ و انا الیہ راجعون.

(یہ الفاظ اس کتاب کے صفحہ ۸۸، ۸۹ پر درج ہیں، جو مولانا کے صاحب زادۂ گرامی مولانا عطاء الرحمٰن نے ''والدی و مشفقی'' کے نام سے ان کے حالات میں لکھی ہے۔)

تحریکِ پاکستان کے زمانے میں اس خوش فہمی میں صرف مولانا محمد حسین ہی نہیں اور بھی بہت لوگ مبتلا تھے۔

بہرکیف مولانا محمد حسین اپنے اہل و عیال کے ساتھ مصائب و آلام کی دلدل سے گزرتے ہوئے پاکستان کی حدود میں داخل ہوئے اور پھر شیخوپورہ کے ایک گاؤں میں بسیرا کیا۔ اس شہر کی غلہ منڈی میں پلے دار کے طور پر مزدوری کی اور اس زمین میں جو انھیں اپنے آبائی گاؤں کی موروثی زمین کے بدلے میں الاٹ ہوئی تھی، کاشت کاری کا سلسلہ شروع کیا اور ہل چلائے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے وعظ و تقریر میں مصروف ہوئے۔ ضلع شیخوپورہ کے علمائے کرام اور عوام سے تعلقات بڑھے اور تبلیغی جلسوں میں شرکت کرنے لگے۔ اس طرح انھوں نے مولانا محمد حسین شیخوپوری کی حیثیت سے شہرت پائی اور ''شیخوپوری'' کی نسبت ان

Marfat.com

کے نام کا جز بن گئی۔

روز بروز ان کا دائرۂ تعارف وسیع ہوتا گیا۔ یہاں آمد کے وقت وہ پینتیس چھتیس سال کے جوان تھے۔ جسم کی توانائی، قلب کی صفائی، زبان کی اثر آفرینی، اخلاق کی فراوانی اور کتاب وسنت سے بے پناہ محبت، وہ عناصرِ خمسہ تھے جو انھیں تبلیغ دین پر مجبور کرتے تھے۔ چنانچہ وہ جماعت کے ہر تبلیغی جلسے میں موجود ہوتے تھے۔ لوگ شوق اور دلچسپی کے ساتھ ان کی تقریر سنتے اور اثر پذیر ہوتے تھے۔ ان کی موثر ترین تقریروں اور مخلصانہ جذبات سے بھرپور خطابت کی بنا پر انھیں خطیب پاکستان کہا جانے لگا اور جس انداز سے وہ اپنے مواعظِ حسنہ میں قرآن مجید پڑھتے اور جس اسلوب میں عام فہم پنجابی زبان میں اس کی تفسیر بیان کرتے تھے اس کی وجہ سے وہ شیخ القرآن کے پر اعزاز خطاب کے مستحق قرار پائے۔

مولانا محمد حسین شیخوپوری کے شب و روز ہمارے لیے نشانِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پاکستان آ کر انھوں نے منزل بمنزل سفر حیات طے کیا۔ اپنی نئی زندگی کا آغاز اس مردِ جفاکش نے شیخوپورہ کی غلہ منڈی کی پلے داری سے کیا۔ پھر پلے داروں کے منشی مقرر کیے گئے، یعنی ایک کاپی پر یہ لکھنے لگے کہ کس پلے دار نے کتنی بوریاں اپنی جوان کمر پر اٹھا کر کہاں کہاں پہنچائیں اور کس وقت پہنچائیں اور ایک بوری کے حساب سے اس کی کتنی مزدوری بنی۔ ساتھ ساتھ اپنی مزدوری کا حساب بھی لکھتے جاتے تھے۔ اسی اثنا میں اسی شہر کی جامع مسجد کے منبر پر ہر جمعہ کو ان کی خطابت کی آواز گونجنے لگی اور اس سے قال اللہ و قال الرسول کے دل نواز نغمے پھوٹنے لگے۔ اب وہ پلے دار خطیب تھے اور طرح دار مقرر......!

پھر چلتے چلتے سفر حیات کی یہ مسرت انگیز منزل آئی کہ ان کا شہرۂ خطابت اس ضلعے کے ان مقامات میں پہنچا، جہاں تھوڑی بہت تعداد میں جماعت اہل حدیث کے لوگ آباد تھے۔ بعد ازاں ضلعے کی حدود عبور کر کے ان کی شہرتِ خطابت پورے پنجاب میں پھیل گئی جو اس وقت ۷ اضلعوں پر مشتمل تھا اور جسے مغربی پنجاب کہا جاتا تھا۔

پھر ہم نے دیکھا کہ وہ خطیب پاکستان اور شیخ القرآن تھے اور پشاور سے لے کر کراچی تک ان کی خطابت کی دھوم تھی۔

معلوم نہیں شیخوپورہ شہر میں وہ لوگ موجود ہیں یا نہیں، جن کی آڑھت پر یہ پلے دار کے طور پر مزدوری کرتے اور ان کے مزدوروں کا حساب لکھا کرتے تھے۔ پھر ان کے وہ مزدور ساتھیوں میں بھی کوئی زندہ ہے یا نہیں۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ ان آڑھتیوں اور مزدوروں نے خطیب پاکستان اور شیخ القرآن کی حیثیت سے انھیں سنا یا دیکھا ہو۔

Marfat.com

دنیا مقرروں اور واعظوں سے کبھی خالی نہیں ہوئی۔ نہ کبھی خطیبوں کا کال پڑا ہے، نہ ناصحوں میں کمی آئی ہے۔ بہتر سے بہتر مقرر، اچھے سے اچھے واعظ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر خطیب موجود ہیں اور لوگ ہمہ تن گوش ان کے ارشادات سنتے ہیں۔ ہر ایک کا الگ الگ انداز ہے۔ مولانا محمد حسین شیخوپوری کا بھی ایک انداز تھا جو انہی کے ساتھ مخصوص تھا۔ غالب کی زبان میں کہنا چاہیے:

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

موضوعِ کلام ان کی گرفت میں رہتا تھا اور زبان ان کے قابو میں ہوتی تھی۔ نہ وہ موضوع کو ادھر اُدھر بھٹکنے دیتے تھے اور نہ زبان کو اپنے اصل دائرۂ گفتگو سے باہر نکلنے کا موقع دیتے تھے۔ بعض نئے دور کے مقرر ان کی نقل اتارنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ناکام رہتے ہیں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ نقل ہمیشہ نقل ہی رہتی ہے، اصل کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ پھر خواہ مخواہ ''نقلیا'' بننے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنے حدِ اسلوب سے باہر قدم رکھیں گے تو نہ کوّے کی چال چل سکیں گے نہ ہنس کی۔ اپنی چال بھی بھول جائیں گے۔

دنیا میں بہت سے لوگ عاشقی کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن ملک عرب کے علاقہ نجد سے تعلق رکھنے والے قبیلہ بنو عامر کا قیس (جو اپنے عشق کی بنا پر مجنون کہلایا) کچھ اور ہی قسم کا جذبۂ عشق رکھتا تھا۔ جس طرح ہر عاشق مجنون نہیں ہوسکتا، اسی طرح پنجابی زبان کا ہر مقرر ضلع امرتسر کے گاؤں بوہلیاں کے راجپوت خاندان میں پیدا ہونے والا محمد حسین نہیں ہوسکتا۔ بقول شاعر......

بجز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار

یا یوں کہیے کہ......

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

مولانا محمد حسین شیخوپوری اسلام کے بارے میں نہایت باحمیت عالم دین تھے۔ اس کے خلاف کوئی آواز سننا اور خاموش رہنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ مرزائیت کا تمام سلسلہ سراسر خلاف اسلام اور بغاوتِ قرآن وحدیث پر مبنی ہے۔ ۱۹۵۳ء میں تحریک تحفظ ختم نبوت کا آغاز ہوا تو شیخوپورہ میں مرزائیت کے خلاف مولانا کی تقریریں ہونے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گرفتار کر لیے گئے۔ پہلے بوسٹل جیل لاہور میں رہے۔ بعد ازاں میاں والی جیل بھیج دیے گئے۔ میاں والی جیل کو ''پنجاب کا کالا پانی'' کہا جاتا ہے۔ ان جیلوں میں مولانا ممدوح آٹھ مہینے چار دن قید رہے۔

رہائی کے بعد پھر مسجد کی خطابت، گاؤں کی کاشت کاری اور ہل چلانے اور تبلیغی جلسوں میں شرکت اور

Marfat.com

تقریروں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔

ایک مرتبہ مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی تجویز سے مولانا محمد حسین شیخو پوری کو مرکزی جمعیت اہل حدیث کی طرف سے مبلغ مقرر کیا گیا تھا۔ ان کے ساتھ دوسرے مبلغ مولانا محمد ابراہیم خادم تھے۔ ان حضرات کی تبلیغی مساعی سے جماعت کے حلقے میں وسعت پیدا ہوئی اور جماعت کی آواز دور دور تک پہنچی۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا محمد حسین شیخو پوری لوگوں کے دل کی آواز اور ان کے جذبات کے صحیح ترجمان تھے۔ جو بات کہتے تھے، سامعین کے دلوں میں اتر جاتی تھی۔

مولانا ممدوح کی زندگی کے لیل ونہار بہت سے المیوں کا دردناک مرقع تھے۔

۱۹۴۷ء میں وہ اپنے موجودہ مسکن کالو کے آئے تو کچھ عرصہ بعد والدہ کی وفات ہو گئی۔ پھر ۱۹۵۰ء میں والد مکرم راہی ملک بقا ہوئے۔

مولانا خود ۲۸۔ جون ۱۹۷۶ء کی رات کو جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں تقریر کر کے بذریعہ بس شیخو پورہ آ رہے تھے کہ شہر کے قریب ان کی بس سڑک پر کھڑے بجری سے بھرے ٹرک سے ٹکرا گئی اور ان کا دایاں پاؤں تقریباً ٹانگ سے جدا ہو گیا۔ ہڈی اور پٹھے کٹ گئے۔ دیگر زخمیوں کے ساتھ انھیں اسپتال داخل کرا دیا گیا۔ بعد ازاں اسی شام ایک پرائیویٹ اسپتال میں فیصل آباد پہنچا دیے گئے۔ پھر لاہور امریکن اسپتال میں داخل کرا دیے گئے۔ میں اور مولانا محمد حنیف ندوی عیادت کے لیے گئے تو سخت تکلیف کے باوجود صبر وشکر کا یہ پیکر نہایت تپاک سے ملا۔ حالت پوچھی تو فرمایا: الحمد للہ بالکل ٹھیک ہوں۔

اس حادثے سے ساڑھے چھ مہینے بعد ۱۰ جنوری ۱۹۷۷ء کو ان کے سب سے چھوٹے نوجوان بیٹے حبیب الرحمٰن جو گاؤں کی زمین میں کاشت کاری کرتے تھے، صبح کے وقت ٹریکٹر لے کر آ رہے تھے کہ ریلوے پھاٹک پر پہنچے تو اچانک سرگودھا ایکسپریس آئی اور ٹریکٹر کے ساتھ حبیب الرحمٰن کے بھی ٹکڑے کر گئی۔ گوشت اور ہڈیاں دور تک جا گرے۔ دوسرا ساتھی محمد اعظم بھی جاں بحق ہو گیا، لیکن اس کا جسم سلامت رہا۔ مولانا اس وقت لاہور میں زیر علاج تھے اور چلنے پھرنے سے معذور تھے۔ ان کی اہلیہ بھی ان کے ساتھ تھیں۔ اسی حالت میں انھیں لاہور سے گاؤں لایا گیا اور انھوں نے دونوں میتوں کو لوگوں کے کندھوں پر لدی ہوئی دیکھا جو انھیں قبرستان کی طرف لے جا رہے تھے۔ میں دوسرے دن تعزیت کے لیے ان کی خدمت میں گاؤں پہنچا تو بہت لوگ بیٹھے تھے۔ میں نے افسوس کیا تو فرمایا: اللہ کو یہی منظور تھا اور جو اللہ کو منظور ہے، وہ ہمیں بھی منظور ہے اور یہی صحیح ہے۔

ایک بیٹا محمد خالد ایک سال کی عمر میں پولیو کے مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے دونوں ٹانگوں سے محروم

Marfat.com

ہو گیا۔ باپ کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ لیکن اس معذور بچے اور اس کے غم رسیدہ ماں باپ پر قدرت نے کرم فرمایا کہ اس نے قرآن مجید حفظ کر لیا اور اسے حافظ خالد کہا جانے لگا۔ پھر انھوں نے بے شمار بچوں کو قرآن حفظ کرایا اور بہت سے لوگوں کو ناظرہ قرآن مجید پڑھایا جو ان شاء اللہ ان کے لیے صدقہ جاریہ ثابت ہو گا۔

چند سال پیشتر مولانا کی نیک طینت اہلیہ وفات پا گئیں۔ اس عمر میں یہ ان کے لیے بہت بڑا سانحہ تھا۔ اس صالحہ خاتون کے جنازے میں ان سطور کا راقم عاجز اور حافظ احمد شاکر شریک ہوئے اور حضرت مولانا ممدوح اور ان کے صاحب زادوں سے اظہار تعزیت کیا۔

ان کے فرزند گرامی مولانا عطاء الرحمٰن پر فالج کا حملہ ہوا۔ عطاء الرحمٰن کے بیٹے اور مولانا کے پوتے کے بازو کو شدید ضرب آئی۔ اور بھی کئی قسم کی تکلیفوں سے دوچار ہوئے، لیکن انھوں نے ہر تکلیف پر صبر کا دامن تھامے رکھا اور ہر حالت میں اللہ کا شکر ادا کیا، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

انسان کا یہ نفسیاتی معاملہ ہے کہ اسے پہلی مرتبہ کوئی تکلیف پہنچے تو وہ اسے شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے، لیکن اگر پے در پے تکلیفوں کا سلسلہ شروع ہو جائے اور ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری مشکل سر اٹھا کر سامنے آ کھڑی ہو تو وہ انھیں برداشت کرنے کا عادی ہو جاتا ہے اور اس کا احساسِ تکلیف ختم ہو جاتا ہے۔ شاعر نے اس نفسیاتی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

رنج سے خوگر ہوا انساں، تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

۱۹۵۶ء تک شیخوپورہ شہر میں اہل حدیث کی ایک ہی مسجد تھی اور وہ تھی ورکاں والی مسجد، جس کا گزشتہ سطور میں ذکر ہوا۔ اس کے بعد مولانا محمد حسین نے بعض حضرات کی معیت میں شہر کے مضافات میں تبلیغی دوروں کا پروگرام مرتب کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہر کے قرب و جوار میں بہت سے حضرات نے مسلک اہل حدیث قبول کیا اور متعدد مسجدیں بنائی گئیں۔ شہر کے مختلف مقامات میں بھی مسجدیں تعمیر ہوئیں۔ میرا خیال ہے اس وقت پندرہ سولہ مسجدیں صرف شہر شیخوپورہ میں ہوں گی جن میں جمعۃ المبارک باقاعدہ پڑھا جاتا ہے اور مشہور خطبا فرائضِ خطابت انجام دیتے ہیں۔ ہر مسجد میں اچھی خاصی تعداد میں لوگ شریکِ جماعت ہوتے ہیں۔

مولانا محمد حسین شیخوپوری مہمان کا بے حد احترام کرتے اور مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے۔ بہت سال ہوئے، جب سرکاری دفتروں میں جمعے کے روز چھٹی ہوتی تھی، میں مولانا ممدوح کی اقتدا میں جمعہ پڑھنے اور انھیں سلام عرض کرنے کے لیے شیخوپورہ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ سبزی منڈی کے قریب کی مسجد میں

Marfat.com

جمعہ پڑھاتے ہیں۔ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ مدرسہ ہے، مولانا کسی اور مسجد میں خطبہ ارشاد فرماتے ہیں۔ چناں چہ ایک صاحب مجھے وہاں لے گئے۔ مولانا خطبہ دے رہے تھے۔ نماز کے بعد میں ان سے ملا، نہایت خوش ہوئے۔ ملنے والے اور لوگ بھی تھے۔ لیکن انھوں نے مجھے اس ہجوم سے نکالا اور اپنے گھر لے گئے جو مجھے یاد پڑتا ہے، مسجد کے قریب ہی تھا۔ میں لاہور سے کھانا کھا کر گیا تھا، لیکن انھوں نے اپنے ساتھ کھانے پر اصرار کیا اور فرمایا: جب یہاں آنے کا پروگرام تھا تو لاہور سے کھانا کھا کر کیوں آئے؟ اب اس کی سزا یہ ہے کہ تھوڑا بہت کھانا پڑے گا۔ کھانے کے بعد چائے پلائی۔ اس زمانے میں ریڈیو پر میری تقریروں کا سلسلہ چلتا تھا۔ فرمایا تمھاری تقریریں سنتا ہوں اور خوش ہوتا ہوں۔ انھوں نے تو ازراہِ کرم یہ بھی فرمایا تھا کہ میں ان سے ''استفادہ'' کرتا ہوں، لیکن میں یہ لفظ اپنے متعلق کہنا مناسب نہیں سمجھتا۔ اگر انھوں نے فرمایا تھا تو میں اسے اپنے لیے ان کی حوصلہ افزائی پر محمول کرتا ہوں۔

میں اجازت لے کر چلنے لگا تو فرمایا: ٹھہرو، تمھیں لڑکا کار پر لاہور چھوڑ آئے گا۔ میں نے اس پر شکریہ ادا کیا اور عرض کیا کہ میں تکلیف نہیں دینا چاہتا، بس پر چلا جاؤں گا۔ لیکن پھر بھی وہ بس سٹینڈ تک کار پر چھوڑنے آئے۔ میں ان کی اس کرم فرمائی پر ان کا بے حد شکر گزار ہوا۔

ایک مرتبہ پتا چلا کہ مولانا کی طبیعت ناساز ہے۔ چناں چہ حافظ احمد شاکر، جناب علیم ناصری (مرحوم) اور یہ فقیر مزاج پرسی کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے صاحب زادے مولانا عطاء الرحمٰن اور دوسرے فرزندانِ گرامی بھی موجود تھے۔ دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ اس وقت ان کے چہرے پر مسرت کے آثار لہرا رہے تھے۔

میں لاہور کے علاقہ ''سانده'' میں رہتا ہوں۔ چند سال پیشتر مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک صاحب میاں عبدالغفار سکونت پذیر تھے جو ارائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے اور صاحب حیثیت بزرگ تھے۔ ان کا اصل تعلق اوکاڑہ سے تھا۔ پھر وہ لاہور سے اوکاڑہ چلے گئے تھے۔ پختہ فکر خاندانی اہل حدیث تھے۔ کئی سال سانده میں رہے اور مجھ سے ان کا مخلصانہ محبت کا تعلق رہا۔ ایک مرتبہ انھوں نے اپنے مکان پر مولانا محمد حسین شیخوپوری کو تشریف آوری کی دعوت دی۔ وہ تشریف لائے اور نماز عشا کے بعد میاں عبدالغفار کے مکان کے وسیع دالان میں تقریر کی۔ مردوں اور عورتوں کا مجمع دور تک پھیلا ہوا تھا۔ جلسے کا صدر اس فقیر کو بنایا گیا تھا۔ مولانا شیخوپوری کی تقریر تین گھنٹے جاری رہی اور حاضرین ان کے طریق خطاب سے متاثر ہوئے۔ تقریر میں انھوں نے قرآن و حدیث کی روشنی میں مسئلہ توحید کی وضاحت کی۔ رسول اللہ ﷺ سے اہل حدیث کی محبت، جاں نثاری، قلبی تعلق اور حضور ﷺ کے ہر ارشادِ گرامی کو مشعلِ راہ قرار دینے کی وضاحت فرمائی۔ اہل

Marfat.com

بیت سے دلی لگاؤ کے واقعات بیان کیے، صحابہ رضی اللہ عنہم اور بزرگانِ دین سے متعلق اہل حدیث کے نقطہ نظر کو تفصیل سے منقح فرمایا۔ یعنی ہر ضروری مسئلہ رات گئے تک خوب صورت طریقے سے واضح کیا اور ہر رنگ میں کیا۔

شاعر کی زبان میں یوں معلوم ہوتا تھا کہ...... ع

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

طویل تقریر کے باوجود سامعین کو بھی اور فاضل مقرر کو بھی احساس ہو رہا تھا کہ بیانِ مسائل میں کمی رہ گئی ہے۔

کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے

اس علاقے میں اس وقت تک شاید یہ پہلا نعرۂ حق تھا جو میاں عبدالغفار صاحب کی کوشش سے مولانا محمد حسین شیخوپوری نے بلند کیا۔

اب مولانا ممدوح اس دنیائے ناپائدار سے کوچ کر کے عالم جاودانی کو چلے گئے ہیں تو خیال گزرتا ہے:

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

اب مولانا ممدوح کے لیے صوفی عبداللہ مرحوم کی ایک دعا کا تذکرہ۔

مولانا محمد حسین شیخوپوری کی مختلف تکلیفوں اور اللہ کی طرف سے ان کے ازالے کے سلسلے میں ان کے صاحب زادے مولانا عطاء الرحمٰن نے اپنی کتاب ''والدی و مشفقی'' میں تحریر فرمایا ہے کہ (غالباً) یحییٰ خاں کے مارشل لا کے زمانے میں مولانا نے صوبہ سندھ کے کسی مقام پر تقریر کی جس کے نتیجے میں حکومت نے گرفتار کر کے ان پر بغاوت کا مقدمہ دائر کر دیا اور مقدمے کی سماعت مارشل لا کی عدالت کے سپرد ہوئی۔ شیخوپورہ سے کئی سو میل کی مسافت طے کر کے وہاں آنا جانا انتہائی مشکل تھا۔ بہت لوگوں نے مقدمہ ختم کرانے اور مولانا کی رہائی کے لیے کوشش کی، لیکن کامیابی نہ ہوئی، اس اثنا میں عطاء الرحمٰن صاحب دعا کرانے کے لیے حضرت صوفی عبداللہ مرحوم کی خدمت میں ماموں کانجن (ضلع فیصل آباد) حاضر ہوئے اور واقعہ بیان کر کے دعا کی درخواست کی۔ اس وقت رات کے دس بج چکے تھے اور کئی آدمی ان کے پاس دعا کی غرض سے بیٹھے تھے۔

صوفی صاحب نے فرمایا: نماز فجر سے پہلے تہجد کے وقت ملو۔ تہجد کے وقت یہ ان کے کمرے میں گئے تو اب بھی لوگوں کا ہجوم تھا۔ عطاء الرحمٰن کو صوفی صاحب نے دیکھا تو بارگاہِ خداوندی میں ہاتھ اٹھائے اور درود شریف اور کلمات استغفار کے بعد دعا شروع کی کہ ''اے اللہ! مولوی محمد حسین تیرے دین کا خادم ہے۔ قرآن و حدیث کی تبلیغ کر رہا ہے۔ تو اس کی رہائی کے اسباب پیدا فرما۔''

مولانا عطاء الرحمٰن فرماتے ہیں کہ دعا اتنی لمبی تھی کہ میں ہاتھ اٹھائے ہوئے تھک گیا۔ لیکن صوفی صاحب نہایت آرام سے دعا کیے جا رہے تھے۔ کافی دیر کے بعد ہاتھ منہ پر پھیرے اور فرمایا جاؤ، ان شاء اللہ مولانا کو

Marfat.com

کوئی سزا نہیں ہوگی۔ اس کے بعد یہ لوگ مارشل لا کی عدالت میں پیشی کے لیے گئے تو فوجی افسروں نے بتایا کہ حکومت نے اس رات اس قسم کے تمام مقدمات ختم کر دیے ہیں اور گرفتار شدہ لوگوں کو رہا کر دیا گیا ہے۔ چناں چہ مولانا محمد حسین گھر آ گئے۔

حضرت صوفی عبداللہ مرحوم و مغفور مستجاب الدعوات بزرگ تھے، اس فقیر نے ان کے حالات تفصیل سے کتابی صورت میں لکھے ہیں۔ اس کتاب میں ان کی قبولیت دعا کے ۵۹ واقعات درج کیے گئے ہیں، جو ہم گنہگاروں کے لیے بہ ظاہر نہایت حیرت انگیز ہیں۔ ساڑھے چار سو صفحات کی یہ کتاب مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور کی طرف سے دو دفعہ شائع ہو چکی ہے۔ کتاب پڑھ کر بعض حضرات نے مجھے ان کی قبولیت دعا کے اور واقعات بھی بھیجے ہیں جو ان شاء اللہ کتاب کی تیسری اشاعت میں شائع ہوں گے۔

مولانا محمد حسین شیخوپوری مرحوم اوصاف حسنہ کے پیکر خوش نما تھے اور اپنے ملنے والوں سے رابطہ رکھتے اور ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک ذاتی واقعہ عرض کرتا ہوں۔ ۱۸۔ ستمبر ۱۹۸۸ء کو ہمارے گاؤں میں میرے والد مکرم نے وفات پائی۔ میں مولانا کو وفات اور جنازے کی اطلاع نہیں دے سکا تھا۔ انھیں کسی ذریعے سے پتا چلا تو اسی دن نماز مغرب کے بعد جنازے کے لیے ہمارے گاؤں پہنچے۔ لیکن جنازہ ان کے تشریف لے جانے سے پہلے پڑھا جا چکا تھا اور میت کو دفن بھی کر دیا گیا تھا۔

مولانا مرحوم کی سرگرمیوں کے کئی گوشوں سے ہم مطلع ہو چکے ہیں اور ان کی حیاتِ مستعار کے مختلف پہلوؤں سے ہمیں آگاہی حاصل ہو چکی ہے۔ اب ہم اس سلسلے کے آخری مرحلے کی طرف قدم زن ہیں اور دو چار باتیں کر کے چند لمحوں کے بعد خوانندگانِ کرام سے رخصت ہونے والے ہیں۔

☆......مولانا ممدوح نے وعظ و تقریر کے لیے پنجابی کو ذریعۂ اظہار بنایا اور انھیں پنجابی کے معروف خطیب مانا گیا۔ ان کے اصل مخاطب پنجاب کے لوگ تھے اور یہ بولی ان کے ساتھ مضبوطی سے جڑ گئی تھی اور وہ اس بولی کے گرویدہ تھے۔ میں نے ان کو اردو بولتے سنا ہے، لیکن نہ اردو سے ان کی زبان صلح کر سکی اور نہ ان کا لہجہ اردو کی نزاکتوں اور نخروں کو برداشت کر سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریر و خطابت کے ستر سالہ طویل سفر میں دونوں کی راہیں جدا جدا رہیں۔ نہ اردو نے ان کی طرف آنے کی کوشش کی اور نہ یہ اردو کی ناز برداری پر آمادہ ہوئے، تاہم اگر کہیں اردو میں تقریر کرنا پڑی تو لہجے کی مزاحمت کے باوجود ''وج گج'' کے کی۔ پیچھے ہٹنا ان کی راجپوتی ''آنکھ'' کے خلاف تھا۔

☆......قرآن مجید سے انھیں بے پناہ محبت تھی اور خطابت کے دوران وہ اس کی محبت کی گہرائیوں میں ڈوب کر اپنے خاص اسلوب میں قرآن مجید کی تلاوت فرماتے تھے اور اس کے معانی و مطالب کی وضاحت

Marfat.com

دل نشین نہج سے کرتے تھے۔

☆......مولانا ممدوح سے اس فقیر کے مراسم پر پچاس برس سے زائد عرصہ بیت چکا ہے یعنی شاعر کی زبان میں

یہ نصف صدی کا قصہ ہے
دو چار برس کی بات نہیں

اس طویل مدت میں اس فقیر نے ان کو کبھی کسی عالم دین، کسی مقرر، کسی واعظ یا کسی دوسرے شخص پر تنقید کرتے نہیں سنا۔ معلوم ہوتا ہے حرفِ تنقید سے ان کی زبان آشنا ہی نہ تھی۔ یہ بہت بڑی خوبی ہے جو انھیں بارگاہِ خداوندی سے عطا ہوئی تھی۔

☆......ثقہ راویوں کی روایت ہے کہ وہ تہجد گزار تھے۔ کسی عالم وخطیب کا تہجد گزار ہونا اللہ کا اس پر عظیم احسان ہے۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم ومغفور فرمایا کرتے تھے کہ نماز باجماعت پڑھنا تو عالم دین کا پیشہ ہے اس لیے کہ اس نے خود نماز پڑھانی ہے۔ اصل چیز تہجد ہے، کیا وہ تہجد پڑھتا ہے۔

☆......وہ سٹیج پر آ کر ہر مقرر کی تقریر سنتے تھے۔ اپنی تقریر سے پہلے مقرروں کی تقریر بھی غور سے سنتے اور بعد کے مقرروں کی بھی۔ ایک دن میں نے عرض کیا: آپ اتنی دیر بیٹھنے کی کیوں زحمت فرماتے ہیں؟ اپنی تقریر کے وقت آیے اور تقریر کر کے چلے جائے۔ فرمایا: اس لیے سب کی تقریریں سنتا ہوں کہ ممکن ہے کوئی ایسی بات علم میں آ جائے جو میرے لیے فائدہ مند ہو اور میں اسے آگے بیان کروں تو سامعین میں سے کسی کو اس سے فائدہ پہنچ جائے۔

☆......انھوں نے ۱۹۳۵ء میں خطابت کا آغاز کیا تھا جب کہ ان کی عمر صرف ۱۷ برس تھی اور ان پر جوانی کے سائے لہرا رہے تھے۔ ۲۰۰۵ء تک نہایت کامیابی سے یہ سلسلہ جاری رہا جب کہ سن وسال کے اعتبار سے ان پر بڑھاپے نے قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن یہ بوڑھا شیر اب بھی میدان میں تھا۔ یعنی پورے ستر سال ان کی عوامی خطابت کا ڈنکا بجتا رہا۔ ان کی خطابت سے بے شمار لوگوں نے راہِ راست اختیار کی۔ لا تعداد افراد کے عقائد درست ہوئے اور انھوں نے صراطِ مستقیم کو اپنایا۔

☆......مولانا محمد حسین شیخوپوری پر اللہ تعالیٰ کا یہ بہت بڑا کرم رہا کہ وہ زیادہ عرصہ بیمار نہیں ہوئے۔ نہ ارذل العمر کو پہنچے۔ وہ اللہ کے دین کی تبلیغ کرتے اور خدا اور رسول (ﷺ) کے ارشادات لوگوں کو سناتے ہوئے راہیٔ ملک بقا ہوئے۔

۶۔ اگست ۲۰۰۵ء کو صبح آٹھ بجے حافظ احمد شاکر نے ٹیلی فون پر اطلاع دی کہ رات مولانا محمد حسین شیخوپوری وفات پا گئے ہیں اور آج نماز ظہر کے بعد ان کا جنازہ پڑھا جائے گا۔ چناں چہ تھوڑی دیر کے بعد

Marfat.com

دفتر الاعتصام پہنچا تو حافظ احمد شاکر، ان کے فرزند گرامی حافظ حماد شاکر، ڈاکٹر عبدالغفور راشد اور یہ فقیر شیخوپورہ کو روانہ ہوئے۔

روانگی کے ساتھ ہی بارش شروع ہوگئی۔ ہم مولانا مرحوم کی قیام گاہ پر پہنچے تو وہاں ہجومِ عاشقاں تھا اور بارش نے بھی زور باندھ رکھا تھا۔ بہت بڑا جنازہ تھا اور کیوں نہ ہوتا، شاعر نے ان ہی کے لیے تو کہا ہے:

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اور واقعی کتاب و سنت کے عاشق کا جنازہ دھوم سے نکلا، جنازہ تین مقامات پر پڑھا گیا اور تینوں مقامات پر دھوم سے پڑھا گیا۔ پہلا جنازہ مولانا مرحوم کے مدرسے میں مولانا معین الدین لکھوی نے پڑھایا۔ دوسرا شیخوپورہ کے کمپنی باغ میں حافظ محمد یحییٰ میر محمدی نے پڑھایا اور تیسرا مرحوم کے گاؤں میں پڑھایا گیا اور تینوں جنازوں میں لوگوں کی تعداد کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ شدید اور مسلسل بارش کے باوجود بے شمار لوگوں نے جنازوں میں شرکت کی۔ شیخوپورہ کی تاریخ میں یہ پہلا جنازہ تھا، جس میں شرکائے جنازہ کی تعداد گنتی کی حدود سے بہت آگے نکل گئی تھی۔ عربی کے شاعر کے بقول:

ان الاولی شهدوا الصلوة و شيعوا

و اللّٰه لا تحصيهم الاقلام

یعنی وہ لوگ جو جنازے کی نماز میں شریک ہوئے اور اس کی مشایعت کی، خدا کی قسم ہمارے قلم ان کا شمار نہیں کر سکتے۔

اس گنہگار کے خیال کے مطابق تینوں جنازے اپنے وقت کے صالح بزرگوں نے پڑھائے اور ان میں مختلف مقامات کے لاتعداد علما و صلحا نے شرکت کی۔ محمد حسین شیخوپوری کے لیے ہم عاجز بندوں کی اللہ سے عاجزانہ دعا ہے کہ:

اسكنه اللّٰه فی الجنان و لا

زال عليا فی أهل الخلع

"خدا اپنے اس مبلغ دین بندے کا باغوں میں بسیرا کرے اور اسے ہمیشہ بہترین خلعت میں رکھے۔"

موسلا دھار بارش کی وجہ سے اگست کے حبس زدہ موسم کی فضا پر خوش گوار خنکی کے شامیانے تن گئے تھے۔ انھی شامیانوں کے سائے میں میت کو الدعوہ کی خوب صورت ایمبولینس میں ان کے گاؤں لے جایا گیا اور انھیں دفن کر دیا گیا اور لوگوں کی یہ دعا قبول ہوگئی کہ:

خدا تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

Marfat.com

بارش کی صورت میں آسمان سے مسلسل شبنم افشانی ہو رہی تھی۔

مرنے کے بعد اور دنیا سے رخصت ہو جانے کے باوجود اپنے اعمال صالحہ اور مواعظ حسنہ کی بنا پر محمد حسین شیخوپوری کی یاد لوگوں کے دلوں میں زندہ رہے گی۔ ایسے ہی مردانِ صالحیت شعار کے لیے زندہ تابندہ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

عرب کا ایک شاعر ابو العباس احمد بن فضل اللہ عمری کہتا ہے اور اندازہ فرمایے شاعرانہ زبان میں کتنا بڑا تخیل پیش کرتا ہے۔

قالوا قبرناه قلنا ان ذا عجب
حقا الكوكب الدارى قد قبروا

''لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے اس کو دفن کر دیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ بڑے تعجب کی بات ہے، کیا واقعی انھوں نے چمک دار ستارے کو دفن کر دیا ہے؟''

یعنی نہیں کیا، اس لیے کہ چمک دار ستارے کو زمین میں دفن کیا ہی نہیں جا سکتا (اس کا جسم اگرچہ دفن ہو گیا، لیکن اپنے اعمال خیر کی وجہ سے وہ زندہ ہے)۔''

بلھے شاہ نے شاید پنجابی میں اسی شعر کا ترجمہ کیا ہے:

بلھے اساں مرنا نہیں گور پیا کوئی ہور

اس ضمن میں فارسی کا شعر بھی ملاحظہ فرمایے:

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

وارث شاہ کی زبان میں اس فارسی شعر کا ترجمہ یہ ہوگا:

وارث شاہ اوہ سدا ای جیوندے نے
جنھاں کیتیاں نیک کمائیاں نے

یہی مطلب ہے فارسی کے الفاظ زندہ تابندہ کا!

مولانا محمد حسین شیخوپوری کی نرینہ اولاد میں سے ان کی وفات کے وقت پانچ بیٹے زندہ تھے اور پانچوں علمائے دین اور ملنسار و بلند اخلاق۔

(۱) فضل الرحمٰن صاحب (۲) مولانا عطاء الرحمٰن صاحب ایم اے اسلامیات و فاضل وفاق المدارس السّلفیہ (۳) قاری حافظ عبدالرحمٰن صاحب (۴) حافظ خالد محمود صاحب (۵) عزیز الرحمٰن صاحب۔ چھٹے حبیب

Marfat.com

الرحمٰن صاحب جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا والد کی زندگی میں ایک حادثے میں وفات پا گئے تھے۔
مولانا عطاء الرحمٰن پر والد کی وفات کے کچھ عرصہ بعد فالج کا حملہ ہوا اور وہ وفات پا گئے۔
جب سے انسان سطحِ ارض پر ابھرا ہے، اس جہانِ آب وگل میں موت اور زندگی کا کھیل برابر جاری رہا ہے اور نہایت تیز رفتاری سے چل رہا ہے۔ لیکن اس میں فتح ہمیشہ موت کو حاصل ہوئی ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ زندگی اپنے دنیوی سفر سے تھک ہار کر ایک جگہ پر آ رکتی ہے اور ہزار کوشش کے باوصف آگے بڑھنے سے انکار کر دیتی ہے۔ موت اس وقت کے انتظار میں ہوتی ہے۔ وہ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر آگے بڑھتی اور انسانی زندگی کو اپنے قبضے میں کر لیتی ہے۔ اسی کا نام روح کا قبض ہو جانا ہے۔ قبض الله روحه۔ پھر ہم اسے اپنے ہاتھوں زمین کی تہہ میں رکھ دیتے ہیں اور قرآن کے یہ الفاظ پڑھتے ہوئے اس پر منوں مٹی ڈال دیتے ہیں:

﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰىo﴾ (طٰہٰ: ۵۵)

اب آیئے مولانا محمد حسین شیخوپوری کے لیے سب یک زبان ہو کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کریں۔
اے مالک الملک! جہاں تک ہم جانتے ہیں یہ شخص اعمالِ خیر کا متلاشی رہتا تھا اور کتاب وسنت کا مخلص ترین مبلغ تھا۔ اب تیرے بلاوے پر تیرے پاس پہنچ گیا ہے۔
اے اللہ! اس کے متعلق تو ہماری یہ التجا منظور فرما کہ

اَكْرِمْ نزُلَهٗ وَ وَسعْ مدْخلهٗ وَ اَدْخلهُ جنت الفردَوْس

اور تو اس کو آواز دے۔

﴿يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُo ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةًo فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْo وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْo﴾ (الفجر: ۲۷-۳۰)

نیز آیئے ان کے بیٹوں، پوتوں اور نواسوں کے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ انھیں توفیق عطا فرمائے کہ وہ مرحوم کے نقشِ قدم پر چلیں اور قرآن وسنت کی تبلیغ وترویج کو اپنا بنیادی مقصد قرار دیے رکھیں۔ آمین یا رب العالمین.

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا شمس الحق ملتانی

(وفات ۲۹۔ اکتوبر ۲۰۰۵ء)

حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ کے ملتانی شاگردوں میں سے ایک مشہور عالم مولانا عبدالحق ملتانی جن کا تذکرہ اس کتاب میں خوانندگان محترم کے مطالعے میں آ چکا ہے۔جن کا تذکرہ اس کتاب (چمنستانِ حدیث) میں خوانندگانِ محترم کے مطالعہ میں آیا۔مولانا ممدوح کے دو فرزندانِ گرامی تھے اور دونوں علم وعمل کی نعمت سے بہرہ ور تھے۔ایک مولانا شمس الحق ملتانی اور دوسرے مولانا شرف الحق ملتانی۔آیئے ان سطور میں مولانا شمس الحق ملتانی کے حالات سے مطلع ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

۲،۳،۴۔ اپریل ۱۹۵۴ء کو مرکزی جمعیت اہل حدیث کی دوسری سالانہ کانفرنس ملتان میں مولانا محمد علی قصوری ایم اے کینٹب کے زیر صدارت منعقد ہوئی تھی۔اسی کانفرنس میں اس فقیر کو مولانا شمس الحق ملتانی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔دراز قامت، سرخی مائل گندمی رنگ، گول چہرہ، مناسب خدوخال، سفید لباس میں ملبوس، صحت مند اور خوش مزاج۔وہ ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔اس اعتبار سے اس وقت ان کی عمر چالیس برس کی تھی اور وہ ملتان کے ایک دار العلوم کی مسندِ درس پر متمکن تھے۔

مولانا شمس الحق نے شعور کی چوکھٹ پر قدم دھرا تو انھیں ملتان کے اسلامیہ ہائی سکول میں داخل کرا دیا گیا۔سکول میں ساتویں جماعت پاس کی تو اس سے رشتہ توڑ لیا اور دینی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ان کے والد مکرم مولانا عبدالحق ملتانی کا سلسلۂ درس جاری تھا، یہ اس میں شامل ہو گئے اور تقریباً تمام درسی کتابیں والد ہی سے پڑھیں۔پھر گوجراں والا جا کر حضرت حافظ محمد گوندلوی سے استفادہ کیا۔غالباً ان کا حلقۂ اساتذہ صرف انھی دو علمائے کرام پر مشتمل ہے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا شمس الحق ملتانی نے خود سلسلۂ تدریس شروع کیا اور یہ سلسلہ ان کے آبا و اجداد سے جاری تھا۔مولانا موصوف مختلف اوقات میں ملتان کے مختلف مدارس میں فریضۂ تدریس انجام دیتے رہے۔وہ اپنے عہد کے مشہور مدرس اور نامور خطیب تھے۔ان سے بے شمار علما وطلبا نے تعلیم حاصل کی، جن میں مولانا عبدالبصیر فاروقی، مولانا نذیر حسین ملتانی، قاضی محمد اسلم سیف فیروز پوری، حافظ عزیز الرحمٰن لکھوی، حافظ بشیر احمد بھوجیانی، مولانا عبدالرحیم لودھروی، مولانا محمد بن عبداللہ شجاع آبادی اور دیگر بہت سے

Marfat.com

حضرات شامل ہیں۔ باقاعدہ شاگردوں کے علاوہ اہل علم نے ان سے اجازہ حدیث کی سعادت حاصل کی۔ ان کے باقاعدہ تلامذہ اور اجازہ حدیث سے بہرہ مند ہونے والوں نے آگے چل کر بڑی تدریسی خدمات سر انجام دیں اور بعض نے قلمی خدمات بھی انجام دیں۔

مولانا شمس الحق ملتانی حلیم الطبع اور نرم خو عالم تھے۔ سنجیدہ مزاج اور خوش اخلاق۔ علماء کے قدردان اور طلبا کے لیے مشفق۔ تمام عمر خدمت علم میں مصروف رہے اور درس و تدریس کو اپنا اصل مشغلہ قرار دیے رکھا۔

بنیادی طور پر وہ اگرچہ مدرس تھے تاہم قلم و قرطاس سے بھی ان کا رابطہ تھا۔ انھوں نے فتوے بھی لکھے جو ابھی تک کسی نے موضوع وار جمع نہیں کیے اور بعض عنوانات پر کچھ مضامین بھی قلم بند کیے۔ ان کی ایک اہم خدمت یہ ہے کہ فارسی زبان میں قرآن مجید کی تفسیر مکمل کی، جس کا آغاز ان کے جدِ امجد مولانا سلطان محمود ملتانی نے کیا تھا۔ ان کے بعد اس کے کچھ اجزا ان کے فرزندِ عالی قدر مولانا عبدالحق ملتانی نے تحریر فرمائے اور پھر اس کی تکمیل کی سعادت مولانا شمس الحق ملتانی کے حصے میں آئی۔ اب جو حالات پیدا ہو گئے ہیں، ان کے پیش نظر اس تفسیر کی طباعت تو بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ تاہم مکمل ہو گئی ہے۔ اس کی طباعت اس لیے بھی دائرۂ امکان سے خارج نظر آتی ہے کہ یہ فارسی زبان میں ہے اور فارسی سے اب لوگوں کی دل بستگی تقریباً ختم ہوگئی ہے۔ اگر اردو میں ہوتی تو شاید کبھی چھپ جاتی۔

ہمارے خیال میں بہتر ہوگا کہ مولانا شمس الحق ملتانی کے ورثاء اپنے اسلاف کی اس عظیم القدر قرآنی خدمت کو کسی بڑی مقامی لائبریری میں مخطوطے کے طور پر جمع کرا دیں اور پھر فارسی کے کسی پروفیسر سے جو قرآنی علوم میں مہارت رکھتے ہوں، اس پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھانے کی کوشش کی جائے، جس میں یہ تذکرہ کیا جائے کہ برصغیر میں اب تک فارسی زبان میں کن کن عالی مرتبت اہل علم نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا یا تفسیر لکھی اور ان تراجم و تفاسیر کا مواد اور زبان کی صورت میں تقابل کیا جائے اور بتایا جائے کہ ان میں سے کون سی تفسیریں یا ترجمے طبع ہوئے اور کون سے نہیں ہوئے۔ جو طبع نہیں ہوئے وہ اس وقت کن کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اس انداز سے اس پر غور کیا جائے تو ہماری رائے میں یہ ایک اہم علمی خدمت ہوگی اور مولانا سلطان محمود ملتانی سے لے کر مولانا شمس الحق ملتانی تک تین نسلوں کی یہ قرآنی خدمت اس بنیادی موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے استفادے کا موجب ہوگی۔

ہم نے نیک نیتی سے اس خواہش کا اظہار تو کر دیا ہے، لیکن اس پر عمل شاید نہیں ہوگا۔ تین نسلوں کی اس فارسی تفسیر کی حفاظت کا غالباً کوئی انتظام نہیں ہو سکے گا۔ خدانخواستہ ایسا نہ ہو کہ یہ دیمک کی خوراک بن جائے۔ ممکن ہے اس کا کوئی حصہ دیمک کی زد میں آ بھی گیا ہو۔

Marfat.com

مولانا شمس الحق کے ماشاء اللہ سات بیٹے ہیں اور وہ ہیں (۱) ڈاکٹر محمد زکریا عارف (۲) محمد الیاس (۳) محمد ایوب (۴) ڈاکٹر محمد ادریس زبیر (۵) مولانا محمد ابراہیم (۶) محمد اسماعیل خاں اور (۷) سعد مسعود۔ ان میں سے بعض اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور بعض تجارت پیشہ ہیں یعنی اللہ کے فضل سے سب آسودہ حال ہیں اور معاشرے میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ پھر آگے ان کے فرزندانِ گرامی ہیں۔ وہ بھی ظاہر ہے تعلیم یافتہ ہوں گے۔ اگر یہ خود بھی اس تفسیر کو شائع کرنا چاہیں تو ہمارے خیال میں آسانی سے کر سکتے ہیں۔ انھیں یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ اسے کوئی خریدے گا یا نہیں خریدے گا۔ اس قسم کے کاموں پر مادی نقطہ نظر سے غور نہیں کرنا چاہیے۔ بس اپنے بزرگوں کی علمی یادگار کے طور پر شائع کرنے کا عزم کرنا چاہیے۔ ❶

اگر یہ تفسیر ضائع ہوگئی تو یہ نہایت افسوس ناک علمی حادثہ ہوگا اور اس کے ذمے دار مولانا شمس الحق ملتانی کے تعلیم یافتہ اخلاف قرار پائیں گے۔

مولانا شمس الحق ملتانی نے ۹۱ برس کی عمر پا کر ۲۹۔ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون.

ان کی نماز جنازہ ان کے بھتیجے مولانا انیس الحق نے پڑھائی، جس میں مختلف مکاتب فکر کے علمائے کرام سمیت ہزاروں لوگوں نے شرکت کی۔

اللھم اغفرلہ و ارحمہ و عافہ و اعف عنہ.

❀❀❀❀

❶ ان میں ڈاکٹر ادریس زبیر پر زیادہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ وہ اس طرح کہ ان کی اہلیہ محترمہ ڈاکٹر فرحت ہاشمی ہیں جو خواتین کی تعلیم و تربیت کے بین الاقوامی ادارے ''الہدیٰ انٹرنیشنل'' کی مؤسسہ ہیں۔ ان کی بلا مبالغہ ہزاروں نہیں لاکھوں خواتین شاگرد ہیں۔ جب کہ ادریس زبیر بھی اپنے انداز میں قرآن کریم کی خدمت میں مصروفِ عمل ہیں۔ بلاشبہ یہ ان دونوں میاں بیوی کی عظیم خدمت ہے، جس کے دور رس اثرات ہمارے معاشرے پر مرتب ہو رہے ہیں، لیکن اپنی تمام تر علمی و تدریسی مصروفیات سے کچھ وقت نکال کر اگر وہ یہ قرآنی خدمت بھی کر دیں کہ اپنے آباء کی تفسیر قرآن کی طباعت کا کوئی اہتمام کریں تو یہ ایک عظیم سعادت ہوگی۔

Marfat.com

مفتی اللہ بخش ملتانی

(وفات ۱۸۔ مارچ ۲۰۰۷ء)

مفتی اللہ بخش ملتانی کے والد کا نام محمد مراد تھا، وہ کسی زمانے میں موجودہ جغرافیائی حساب سے ضلع خانیوال کی تحصیل کبیر والا کے ایک گاؤں موضع غوث پورہ میں سکونت پذیر تھے اور کاشت کاری ان کا پیشہ تھا۔ اس خاندان کا کوئی شخص علم سے تعلق نہیں رکھتا تھا، سب کاشت کاری میں مشغول تھے۔

محمد مراد کے ایک بیٹے کا نام غلام رسول تھا۔ وہ پندرہ سال کی عمر کو پہنچ گیا تھا مگر بالکل جاہل تھا۔ اس کے دل میں تحصیل علم کا جذبہ ابھرا اور کسی کو بتائے بغیر گھر سے نکلا اور کسی مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے لگا۔ اسے تلاش کیا گیا لیکن کہیں سے اس کا سراغ نہ ملا۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کے والد محمد مراد نے غوث پورہ کی زمین فروخت کی اور ضلع ملتان کی تحصیل جلال پور پیروالا کے قریب ایک گاؤں ''موتھا'' میں چلے گئے۔ وہاں کچھ زمین خریدی اور کاشت کاری کا سلسلہ شروع کر دیا۔

تیس سال کی طویل مدت کے بعد غلام رسول صاحب آ گئے اور اپنے پرانے مسکن غوث پورہ پہنچے۔ وہ حصول علم کے لیے گھر سے نکلے تو مختلف مدارس میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے دارالعلوم جا پہنچے، علومِ متداولہ کی تعلیم حاصل کر چکے تو انھیں مولانا غلام رسول کہا جانے لگا۔ غوث پورہ سے انھیں پتا چلا کہ والد صاحب موضع موتھا (تحصیل جلال پور پیروالا) چلے گئے ہیں تو یہ بھی وہاں پہنچ گئے اور تیس سال بعد والدِ بزرگ والا اور افرادِ خاندان سے ملاقات ہوئی۔

یہاں ان کے ایک بھائی اللہ بخش بھی تھے جو ان کی سوتیلی ماں کے بطن سے ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئے تھے اور ولادت سے صرف گیارہ دن بعد ان کی والدہ وفات پا گئی تھیں۔ ان کی پرورش بڑی بہن نے کی تھی۔ یہ بھی کئی سال کے ہو گئے تھے، لیکن ان پڑھ تھے۔ مولانا غلام رسول نے والد کے پاس موضع موتھا میں سکونت اختیار نہیں کی، اپنے پرانے مسکن موضع غوث پورہ چلے گئے۔ تحصیل علم کی غرض سے چھوٹے بھائی اللہ بخش کو بھی ساتھ لے گئے۔ وہاں انھوں نے مدرسہ جاری کیا اور تدریس میں مصروف ہو گئے۔ اس مدرسے میں متعدد طلباء تعلیم حاصل کرتے تھے۔

مولانا غلام رسول کے شاگردوں کی جماعت میں ایک شاگرد مولانا دوست محمد تھے، جو ان کی وفات کے

Marfat.com

بعدان کے جانشین ہوئے۔ مفتی اللہ بخش نے ان سے بھی تعلیم حاصل کی اور بعض دیگر اساتذہ سے بھی کسبِ فیض کیا۔ اس کے بعد وہ راولپنڈی گئے اور مولانا غلام اللہ خاں مرحوم سے دورۂ تفسیر کیا۔ اس وقت کوٹلا شیخاں میں ایک دیوبندی عالمِ دین مولانا سلطان محمود کا سلسلۂ تدریس جاری تھا، مفتی اللہ بخش نے ان سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔

مفتی اللہ بخش چوں کہ احناف کے دیوبندی حلقے سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے دیوبندی حضرات کے بعض مدارس میں تدریس بھی کی اور خطابت وامامت کا فریضہ بھی سرانجام دیتے رہے۔ وہ لائق اور محنتی عالم دین تھے، اس لیے انھیں دیوبندی حلقے میں بہت احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، لیکن پھر ایک وقت آیا کہ مفتی صاحب کتبِ حدیث کا باقاعدہ مطالعہ کرنے لگے اور اس سے اثر پذیر ہوکر مسلکِ اہل حدیث سے وابستہ ہوگئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیوبندی حضرات نے ان کی شدید مخالفت شروع کر دی۔

ملتان کے اہل حدیث علما کو اس کا علم ہوا تو انھیں تسلی دی اور جامعہ محمدیہ عام خاص باغ (ملتان) میں تدریس کی پیش کش کی جو انھوں نے منظور فرمائی اور وہ تین سال جامعہ محمدیہ کی مسندِ درس پر فائز رہے۔ تدریس کے علاوہ جامعہ کی مسجد میں وہ خطبہ جمعہ بھی ارشاد فرماتے رہے۔ بعد ازاں مولانا شمس الحق ملتانی کی درخواست پر دارالحدیث رحمانیہ چونگی نمبر ۱۴ تشریف لے گئے اور وہاں کافی عرصہ بہ طور شیخ الحدیث خدمات سرانجام دیتے رہے۔ تدریس کے ساتھ ساتھ وہ جامعہ رحمانیہ میں خطابت کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے۔ علاوہ ازیں دعوت وتبلیغ، تصنیف وتالیف اور افتا کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ یہاں ان سے جن علمائے کرام نے استفادہ کیا، ان میں قاری عبدالحفیظ فیصل آبادی، سید ضیاء اللہ بخاری اور بہت سے دیگر حضرات شامل ہیں۔

مفتی صاحب کچھ عرصہ ڈاکٹر حافظ عبدالکریم کے قائم کردہ ''کلیۃ الحدیث'' (ڈیرہ غازی خاں) اور حاجی عبدالتواب کے جاری فرمودہ جامعہ محمدیہ (دوکوٹہ میلسی) کی مسند تدریس پر بھی متمکن رہے۔

۲۰۰۱ء میں ان سے مرکز ابن القاسم الاسلامی کے ناظم مولانا محمد شریف چنگوانی نے بہ طور شیخ الحدیث ان کی خدمات حاصل کیں۔ یہاں ان سے جن طلبا نے استفادہ کیا، ان میں مرکز ابن القاسم کے موجودہ شیخ الحدیث حافظ ریاض احمد عاقب بھی شامل تھے۔ انھوں نے ان سے جو کتابیں پڑھیں، وہ ہیں ''تفسیر بیضاوی''، ''صحیح بخاری''، ''ہدایہ اصول شاشی'' اور علم وفرائض کی مراجی۔ بقول حافظ ریاض احمد عاقب کے ''مفتی صاحب کامیاب مدرس تھے۔ طریقہ تدریس نہایت آسان تھا۔ دورانِ تدریس مشکل سے مشکل عبارت حل کرنے میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔''

مرکز ابن القاسم کی تدریس کے زمانے میں جامع مسجد ابن تیمیہ معصوم شاہ روڈ ملتان کی خطابت

Marfat.com

جمعۃ المبارک مفتی صاحب کے ذمے تھی۔ وہ ہر سال ماہِ رمضان میں جامع مسجد اہل حدیث ترین روڈ ملتان میں نمازِ تراویح میں جس قدر قرآن مجید پڑھا جاتا تھا، اس کا خلاصہ بیان فرمایا کرتے تھے۔ اس سے لوگ بے حد متاثر تھے اور کثیر تعداد میں ان کا درسِ قرآن سنتے تھے۔

مرکز ابن القاسم کی تدریس کے زمانے میں انھیں مرکز القادسیہ چوبرجی لاہور میں قاضی کورس کرانے کی دعوت بھی دی گئی، جس میں انھوں نے کچھ عرصہ کام کیا۔

مرکز ابن القاسم ہی میں انھیں مرضِ مرگی کا دورہ پڑا اور پھر دوروں میں اضافہ ہوتا گیا۔ علاج کرایا گیا، جس سے کچھ افاقہ ہوا اور صحت بحال ہوگئی۔ لیکن مرض پھر عود کر آیا۔ ایک مرتبہ درسِ قرآن کے دوران میں اچانک دورہ پڑا اور انھیں نشتر ہسپتال میں داخل کرایا گیا، لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ بالآخر وہ ۱۸۔ مارچ ۲۰۰۷ء کو داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کا جنازہ جامعہ محمدیہ عام خاص باغ میں مولانا مفتی عبدالرحمٰن رحمانی (ساکن عبدالحکیم) نے پڑھایا، جس میں علمائے کرام سمیت کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔

اللهم اكرم نزله ووسع مدخله وادخله جنت الفردوس۔

تدریس کے ساتھ ساتھ مفتی صاحب نے مندرجہ ذیل تصنیفی خدمات سرانجام دیں:

۱۔ قصص القرآن: یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے اور انبیائے کرام کے حالات پر محیط۔

۲۔ مایغید الناس فیما قال بعض الناس: اس میں امام بخاری کی سیرت کے متعلق مقدمہ اور ان مقامات کی وضاحت کی گئی، جہاں امام ممدوح نے بعض الناس کا رد کیا ہے۔

۳۔ تین طلاق: ایک مجلس کی تین طلاق کے سلسلے میں مفتی خیرالمدارس ملتان کے فتوے کا مدلل جواب۔

۴۔ دینی امور پر اجرت: یہ دینی امور پر اجرت کے جواز میں مختصر بادلیل رسالہ ہے۔

۵۔ اربعین حدیث، اربعین آیات: اس میں سماعِ موتی کے ردّ پر بحث کی گئی ہے۔

۶۔ صلاۃ الموحدین: اس میں قرآن وحدیث کی روشنی میں نمازِ نبوی کا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔

۷۔ کتاب الدعوات: ادعیہ ماثورہ کے متعلق رسالہ

۸۔ تنقید پر تنقید: نزولِ مسیح کے بارے میں صحیح بخاری کی دو روایات پر تنقید کے نام سے لکھے گئے رسالے پر مفتی صاحب کا نقد اور اس کا عمدہ جواب۔

مفتی صاحب میں یہ خصوصیت نمایاں تھی کہ ان کے علم وعمل کی رفتار یکساں تھی۔ وہ سادہ طبیعت اور دھیمے مزاج کے مالک تھے۔ بیانِ مسائل میں انداز محققانہ تھا۔

Marfat.com

ان کی نرینہ اولاد تین بیٹے ہیں۔عبدالرحمٰن،عبدالحنان اور عابد مستعان۔اوّل الذکر دونوں کاروبار کرتے ہیں اور تیسرے ابوہریرہ اکیڈمی (لاہور) میں زیرِ تعلیم ہیں۔ممکن ہے اس کتاب کی اشاعت تک تعلیم سے فارغ ہو جائیں۔

(یہ سطور ۲۲۔مارچ ۲۰۱۴ء کو لکھی گئیں)

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا مختار احمد ندوی

(وفات ۹۔ستمبر۲۰۰۷ء)

جن ہندوستانی اہل علم نے اپنے ملک میں حالات کی روشنی میں خدمات سرانجام دیں اور تحریر وتقریر میں پورے برصغیر میں شہرت پائی، ان میں ایک عالم دین مولانا مختار احمد فیضی ندوی تھے جو ۱۹۳۰ء میں صوبہ یوپی کے شہر مؤناتھ بھنجن کے محلّہ وشوناتھ پورہ کے ایک دین دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد مکرم کا نام حاجی محمد ضمیر تھا جو اپنے شہر اور علاقے کی جماعت اہل حدیث کے سرگرم رکن تھے۔ انھوں نے تقریباً سو سال عمر پائی اور جماعت کے مختلف دینی اداروں کی بڑی خدمت کی۔

مختار احمد نے تحصیل علم کا آغاز اپنے وطن مؤ سے کیا۔ پہلے وہاں کی ''جامعہ عالیہ عربیہ'' میں داخل کیے گئے اور اس جامعہ کے لائق اساتذہ سے چند درسی کتابیں پڑھیں۔ پھر اسی شہر کے دوسرے تدریسی ادارے ''جامعہ فیض عام'' میں چلے گئے۔ اس جامعہ میں وہ کئی سال حصول علم میں مشغول رہے۔ یہاں ان کے مشہور اساتذہ میں مولانا محمد احمد (جنھیں بڑے مولوی صاحب کہا جاتا تھا) اور مولانا عبداللہ شائق شامل تھے۔ جامعہ فیض عام سے سندِ فراغ لی تو انھیں مولانا مختار احمد فیضی کہا جانے لگا۔ جامعہ فیض عام کے فارغ التحصیل حضرات اپنے نام کے ساتھ فیضی کی نسبت لگاتے ہیں۔

اس وقت دہلی کے دارالحدیث رحمانیہ کا بڑا شہرہ تھا۔ مولانا مختار احمد وہاں بھی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ وہ لکھنؤ بھی پہنچے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا۔ ندوہ سے سند فراغت حاصل کی تو وہ مختار احمد ندوی کہلانے لگے۔

انھیں تحصیل علم کا بہت شوق تھا۔ اس کے لیے وہ مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ ان سے فنِ حدیث میں استفادہ کیا۔

انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی داخلہ لیا۔ وہاں عربی ادبیات کے علاوہ انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ اس طرح انھوں نے (انگریزی سمیت) درسی علوم کی تعلیم حاصل کرلی۔

اب ان کی عملی زندگی کی طرف آیئے۔ اس کا آغاز کلکتے کی جامع مسجد اہل حدیث کی خطابت وامامت سے ہوتا ہے۔ وہاں ہی انھوں نے مسجد میں درس وتدریس کا سلسلہ بھی شروع کردیا تھا اور وہیں مفتی کا

Marfat.com

منصب بھی انھیں حاصل ہوگیا۔ اب تین فرائض کی انجام دہی ان کے ذمے تھی۔ ایک خطابت، دوسرے امامت اور تیسرے فتویٰ نویسی۔ یہ تینوں کام اگرچہ نہایت اہم تھے لیکن اللہ کی مہربانی سے حسن وخوبی کے ساتھ سرانجام دیے جارہے تھے۔ ان کا قیام کئی سال کلکتہ میں رہا اور وہاں ان کے علم ومطالعہ کو خوب جلا ملی۔

کلکتہ کے بعد انھوں نے بمبئی کا عزم کیا۔ یہاں بھی ان کی مصروفیات وہی تھیں۔ یعنی درس وتدریس۔ اس کے ساتھ ہی وہ منصبِ افتا پر بھی فائز تھے۔ بمبئی کی جس مسجد میں وہ یہ فریضہ ادا کرتے تھے، اس کا نام بنگالی مسجد تھا اور وہ بمبئی کے علاقہ مدن پورہ میں تھی۔

اب آیے دیکھتے ہیں ان کی کوشش سے مختلف مقامات میں کون کون سے تدریسی اور رفاہی ادارے قائم ہوئے:

۱۔ معہد الحاج عبداللہ:...... اس ادارے کی بنیاد مولانا مختار احمد فیضی ندوی نے کلکتہ کے زمانۂ قیام میں رکھی تھی۔ یہ پہلا ادارہ ہے جو ان کی تحریک وتجویز سے قائم ہوا۔

۲۔ الدار السّلفیہ:...... یہ تصنیف وتالیف اور نادر ونایاب دینی کتابوں کی اشاعت کا ادارہ تھا جو انھوں نے بمبئی میں قائم کیا تھا۔ (اس ادارے کی طرف سے شائع شدہ کتابوں کا ذکر آگے آئے گا)۔

۳۔ جامعہ سلفیہ بنارس کے قیام میں بھی ان کی سرگرمیوں کو بڑا دخل ہے۔

۴۔ جامعہ محمدیہ منصورہ مالیگاؤں:...... بمبئی سے ساڑھے تین سو کلومیٹر کے فاصلے پر صوبہ مہاراشٹر کے شہر مالیگاؤں میں یہ ایک مرکزی دینی ادارہ ہے جو ۱۹۷۸ء میں مولانا نے قائم کیا۔ یہ ادارہ تقریباً ساٹھ ایکڑ اراضی میں پھیلا ہوا ہے اور سلفیانِ ہند کی بہت بڑی درس گاہ ہے۔

۵۔ مدرسہ عائشہ صدیقہ مالیگاؤں:...... یہ لڑکیوں کے لیے ایک منفرد نوعیت کا مدرسہ ہے۔

۶۔ محمدیہ طبیہ کالج مالیگاؤں:...... جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ طبیہ کالج ہے جو مولانا نے ۱۹۸۱ء میں قائم کیا۔

۷۔ بدر السائل ہسپتال مالیگاؤں:...... اس میں غریب ونادار مریضوں کا مفت علاج کیا جاتا ہے۔

۸۔ کلیہ فاطمۃ الزہرا:...... یہ لڑکیوں کا کالج ہے جو مولانا نے اپنے آبائی شہر مؤناتھ بھنجن میں جاری کیا۔

۹۔ الجمعیۃ المحمدیہ الخیریہ بمبئی:...... یتیم خانہ ہے جو ان کی کوشش سے بمبئی میں قائم کیا گیا۔ اس ادارے کی طرف سے مولانا کی سعی وہمت سے بمبئی کے علاقہ بھیونڈی اور دیگر مقامات میں فسادزدہ لوگوں کے لیے دو سو مکانات تعمیر کیے گئے۔

۱۰۔ محمدیہ ایجوکیشنل سوسائٹی بمبئی:...... یہ ایک تعلیمی ادارہ ہے۔

Marfat.com

۱۱۔ مدرسہ محمدیہ:...... یہ لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کے لیے موضع جھانڈہ (میوات) میں تعلیمی ادارہ قائم کیا گیا۔ یہ مرکزی ادارہ ہے جس کی شاخیں راجستھان ہریانہ اور مشرقی پنجاب میں بھی قائم ہیں۔

اسی طرح مولانا مختار احمد فیضی ندوی کی کوشش، سے مختلف مقامات میں متعدد تدریسی اور رفاہی ادارے معرضِ قیام میں آئے۔ بہت سی مسجدیں ان کی کوشش سے تعمیر ہوئیں۔ وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کورٹ کے رکن، مسلم پرسنل لا بورڈ کے نائب صدر اور ادارہ اصلاح المساجد بمبئی کے صدر تھے۔

مولانا موصوف ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۸ء تک مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے منصب صدارت پر فائز رہے۔

اب آیئے ان کی قلمی کاوشوں کی طرف۔ ان کی تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی وسیع ہے اور جو کتابیں ان کی کوشش سے معرضِ اشاعت میں آئیں، وہ بھی بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

۱۔ وہ تقریباً دس برس روزنامہ ''آزاد ہند'' (کلکتہ) میں مختلف موضوعات پر لکھتے رہے۔

۲۔ ہفت روزہ ''اہل حدیث'' (دہلی) جو تقسیم ملک کے بعد حافظ حمید اللہ مرحوم کی تجویز اور مالی اعانت سے جاری کیا گیا تھا، طویل مدت تک اس کی مجلس ادارت سے منسلک رہے اور اس میں بہت سے مقالات لکھے۔

۳۔ مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے پندرہ روزہ ''ترجمان'' میں بھی ان کے مضامین کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا۔

۴۔ ماہنامہ ''صوت الحق'' کی مجلس ادارت اور اس کے مضمون نگاروں میں بھی وہ شامل تھے۔

۵۔ شعب الایمان للبیہقی: مولانا نے امام بیہقی کی معروف کتاب ''شعب الایمان'' کی جلد ۸ سے ۱۷ تک کی تحقیق وتخریج کی۔ یہ خدمتِ حدیث کے سلسلے کا بہت بڑا کام ہے جو مولانا ممدوح نے عربی زبان میں کیا اور دارالسلفیہ بمبئی کی طرف سے اس کی اشاعت ہوئی۔

۶۔ نصیحۃ المسلمین باحادیث خاتم المرسلین: یہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ہے جس کا مولانا نے اردو ترجمہ کیا۔ کتاب مکارمِ اخلاق اور فضائل اعمال سے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سات سو چودہ صحیح احادیث کا مجموعہ ہے۔ مولانا نے اس کا سلیس اردو ترجمہ کیا جو ۲۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے الدار السلفیہ بمبئی کی طرف سے ۱۹۸۰ء میں شائع کیا گیا۔

۷۔ اوضح المسالک الی احکام المناسک: یہ کتاب شیخ عبدالعزیز الحمد السلمان کی کتاب "اوضح المسالك في احكام المناسك" کا اردو ترجمہ ہے۔ کتاب میں حج بیت اللہ کے ارکان ومسائل بیان کیے گئے ہیں۔ اردو ترجمہ صفحات ۲۶۴ پر مشتمل ہے۔

Marfat.com

۸۔ اسلام اور مسائل جاہلیت: یہ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدی کی کتاب ''مسائل الجاہلیة التی خالف فیھا رسول اللہ ﷺ اھل الجاہلیة'' کا اردو ترجمہ ہے۔ صفحات ۱۸۴۔

۹۔ ذکر الٰہی: یہ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "الوابل الصیب من کلم لحطیب" کا اردو ترجمہ ہے۔ صفحات ۲۳۷۔

۱۰۔ رسائل شیخ عبداللہ بن زید المحمود: اردو ترجمہ۔ صفحات ۲۷۹۔

۱۱۔ التوحید: اردو ترجمہ۔ صفحات ۱۲۲۔

۱۲۔ النبی الامی: اردو ترجمہ: صفحات ۲۲۴۔

۱۳۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب: اردو ترجمہ۔ صفحات ۱۹۲۔

۱۴۔ محاسن اسلام: اردو ترجمہ۔ صفحات ۸۸۔

۱۵۔ اسلام کے صحیح عقائد اور اس کے نواقض: اردو ترجمہ۔ صفحات ۶۴۔

۱۶۔ قربانی فضائل ومناقب: مولانا کی تصنیف۔ صفحات ۳۰۔

۱۷۔ مشروع اور ممنوع وسیلہ کی حقیقت: اردو ترجمہ۔ صفحات ۳۳۶۔

۱۸۔ خطبات محمدی: مکمل پانچ حصے۔ تصحیح وتقدیم۔ اردو۔

یہ سب کتابیں دار السلفیہ بمبئی نے شائع کیں۔ ان کے علاوہ مصنف ابن ابی شیبہ مشتمل بر پندرہ مجلات اور دیگر بہت سی کتابیں اس ادارے کی طرف سے چھپیں۔

اللہ تعالیٰ مولانا مختار احمد فیضی ندوی کی مغفرت فرمائے۔ ان کی تصنیفی اور اشاعتی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

اس عالم جلیل نے ۹۔ ستمبر ۲۰۰۷ء کو بمبئی میں وفات پائی۔

❀❀❀❀

Marfat.com

قاضی عبدالباقی قدسی

(وفات ۱۴۔ مارچ ۲۰۰۸ء)

قیام پاکستان سے قبل اپنے وطن (کوٹ کپورہ) میں علامہ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کے دودمانِ عالی قدر کے جس پہلے فرد کی زیارت کا مجھے شرف حاصل ہوا، وہ قاضی حبیب الرحمان تھے، جنھیں ان کے خاندان میں صوفی صاحب کہا جاتا تھا۔ وہ قاضی صاحب کے بھتیجے اور داماد تھے۔ ان کا تذکرہ میں نے اپنی کتاب ''نقوش عظمت رفتہ'' میں تفصیل سے کیا ہے۔ قاضی حبیب الرحمٰن نے ۱۵۔ جولائی ۱۹۵۷ء کو ڈیرہ غازی خاں میں وفات پائی۔

ان کے بعد آزادئ وطن سے پہلے قاضی محمد سلیمان منصور پوری کے پوتے قاضی عبدالکبیر کو دیکھا جو اس وقت اورئینٹل کالج (لاہور) میں مولوی فاضل کی تیاری کر رہے تھے۔ میں اپنے دوست مولوی محمد افضل کو ملنے کے لیے وہاں گیا تھا۔ انھوں نے مجھے قاضی عبدالکبیر کے بارے میں بتایا اور ان کے کمرے میں لے جا کر میری ان سے ملاقات کرائی۔ ترتیب کے اعتبار سے وہ قاضی صاحب کے تیسرے نمبر کے پوتے تھے۔ اردو، انگریزی اور فارسی کے شاعر تھے۔ علامہ اقبال کی فارسی نظم کی کتاب ''ارمغانِ حجاز'' کا انگریزی نظم میں ترجمہ کیا، جسے اقبال اکیڈمی کی طرف سے شائع کیا گیا۔

آزادی سے پہلے اس خاندان کے جس تیسرے رکن کو سلام عرض کرنے اور ان کے ارشادات سننے کا موقع ملا، وہ حضرت قاضی سلیمان صاحب کے چھوٹے بھائی قاضی عبدالرحمٰن تھے، جنھیں وکیل صاحب کہا جاتا تھا۔ وہ قیامِ پاکستان کے بعد ۱۳۔ نومبر ۱۹۴۷ء کی شب کو لاہور پہنچے۔ کچھ عرصہ بیمار رہے۔ ۳۰۔ دسمبر ۱۹۴۷ء کو لاہور میں فوت ہوئے اور کرشن نگر کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔

آزادی وطن کے بعد ۱۹۴۸ء کے جون میں ایک سلسلے میں مجھے راولپنڈی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک چھوٹی سی مسجد میں عصر کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد ایک صاحب نے قرآن مجید کا درس دیا۔ ان کے سامنے انگریزی ترجمے والا قرآن تھا۔ میں نے ان کا درس سنا اور چلا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ درس دینے والے بزرگ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کے فرزند گرامی قاضی عبدالعزیز منصور پوری تھے۔ آزادئ برصغیر کے بعد قاضی محمد سلیمان منصور پوری کے خاندان کے یہ اولیں بزرگ تھے جن کو دیکھنے اور جن کا درس سننے کی

Marfat.com

سعادت حاصل ہوئی۔ وہ اس وقت راولپنڈی میں اپنے بیٹے قاضی عبدالباری کے ہاں مقیم تھے۔

اس کے بعد وہ راولپنڈی سے لاہور منتقل ہوگئے تو ابتدا میں انھوں نے سنت نگر میں سکونت اختیار کی۔ میں اس وقت مرکزی جمعیت اہل حدیث کا ناظم دفتر تھا۔ اخبار ''الاعتصام'' میں بھی معاون مدیر کے طور پر خدمت انجام دیتا تھا۔ ۱۹۵۱ء کے وسط نومبر کی بات ہے کہ میں اپنے آبائی مسکن کوٹ کپورہ کے ایک بزرگ صوفی محمد (مرحوم) کے ساتھ شب کو آٹھ بجے کے بعد قاضی عبدالعزیز صاحب کے مکان پر حاضر ہوا اور کچھ دیر ان کی خدمت میں رہا۔ ان کی گفتگو سے پتا چلا کہ تقسیم ملک سے پہلے انھوں نے اپنے شہر پٹیالہ میں اپنے والد گرامی حضرت قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی معروف اردو تصنیف ''رحمۃ للعالمین'' کی تینوں جلدوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا جو تقسیم کے زمانے میں پٹیالہ میں ضائع ہوگیا۔ پٹیالہ سے ترک وطن کر کے وہ راولپنڈی آئے تو اپنے بیٹے قاضی عبدالباری کے ساتھ جس مکان میں وہ سکونت پذیر ہوئے، اس میں کسی انشورنس کمپنی کے بڑے بڑے رجسٹر پڑے تھے۔ انھوں نے ایک رجسٹر پکڑا اور ''رحمۃ للعالمین'' کا انگریزی ترجمہ شروع کر دیا جو تقریباً مکمل ہوگیا۔ قاضی صاحب سے مل کر اور ان کی یہ بات سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ ان سے گفتگو ہو رہی تھی کہ ان کے صاحب زادے قاضی عبدالکبیر بھی آ گئے، جن سے نو برس قبل اورینٹل کالج میں ملاقات ہوئی تھی۔

دوسرے دن میں نے قاضی عبدالعزیز منصور پوری کے بارے میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور مولانا محمد حنیف ندوی کو بتایا تو انھوں نے ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر فرمائی اور مجھے ملاقات کا وقت لینے کے لیے ان کی خدمت میں بھیجا، چناں چہ میں دوبارہ حاضر ہوا، اور ان سے اجازت لے کر تیسرے یا چوتھے دن جو حضرات ان سے ملاقات کے لیے ان کے مکان پر گئے، بہ ترتیب تواریخِ وفات ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱.....صوفی نذیر حسین: اس وقت مرکزی جمعیت اہل حدیث کے نائب صدر تھے اور حضرت قاضی محمد سلیمان منصور پوری کے خاص عقیدت مندوں میں سے تھے۔ قاضی عبدالعزیز صاحب کو بھائی جان کہا کرتے تھے۔ دراصل امرتسر کے رہنے والے تھے۔ آزادیٔ وطن کے بعد گوجراں والا چلے گئے تھے۔ کشمیری برادری کی اس ''گوت'' سے تعلق رکھتے تھے جنھیں ''صوفی'' کہا جاتا ہے، جیسے بعض کشمیریوں کو بٹ، ڈار اور وائیں وغیرہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ان کے بعض لوگوں کو ''صوفی'' کہا جاتا ہے۔ وہ ۲۷۔ فروری ۱۹۵۴ء کو فوت ہوئے۔

۲.....مولانا سید محمد داؤد غزنوی: اس وقت مرکزی جمعیت اہل حدیث کے منصبِ صدارت پر فائز تھے۔ انھوں نے ۱۶۔ دسمبر ۱۹۶۳ء کو وفات پائی۔

Marfat.com

۳...... مولانا محمد اسمٰیل سلفی: مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ناظم اعلیٰ تھے۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی وفات کے بعد انھیں جمعیت کے امیر منتخب کرلیا گیا تھا۔ ۲۰۔ فروری ۱۹۶۸ء کو ان کا انتقال ہوا۔

۴...... حاجی محمد اسحاق حنیف: اصلاً امرتسر سے تعلق رکھتے تھے۔ قیام پاکستان کے زمانے میں لاہور آئے۔ مرکزی جمعیت کی مجلس عاملہ کے رکن اور ناظم نشرواشاعت تھے۔ ۸۔ ستمبر ۱۹۶۹ء کی صبح کو لارنس روڈ اپنی گاڑی میں ڈرائیورسیٹ پر مردہ پاگئے۔ قاتل اور وجہ قتل کا آج تک پتانہ چل سکا۔

۵...... مولانا محمد حنیف ندوی: جلیل القدر عالم تھے۔ مفسر قرآن اور متعدد کتابوں کے مصنف۔ ۱۲۔ جولائی ۱۹۸۷ء کو رحلت پائی۔

۶...... مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی: انھوں نے ۲۔ اکتوبر ۱۹۸۷ء کی شب کو سفرِ آخرت اختیار فرمایا۔

۷...... میاں عبدالمجید: مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ناظم مالیات تھے۔ تاریخ وفات ۲۲۔ جون ۱۹۹۲۔

۸...... راقم الحروف محمد اسحاق بھٹی: آج ۲۸۔ اپریل ۲۰۱۰ء کو جب یہ سطور لکھی جارہی ہیں، زندہ ہے۔

قاضی عبدالعزیز منصور پوری ان حضرات کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ مکان بے شک چھوٹا تھا، لیکن مکین اپنی شخصیت کے اعتبار سے بھی بہت بڑا تھا اور اس کا دل بھی بڑا تھا۔ ایک دو کے سوا سب حضرات سے ان کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ گفتگو میں آزادیٔ وطن سے قبل اور بعد کی بہت سی باتیں زیر بحث آئیں۔ ''رحمۃ للعالمین'' کا انگریزی ترجمہ بالخصوص ہدفِ کلام رہا۔

گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی یہ مجلس بڑی دلچسپ رہی۔ اس کے بعد ہم لوگ مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے ساتھ ان کے مکان پر چلے گئے۔ وہاں فیصلہ ہوا کہ ''رحمۃ للعالمین'' کا انگریزی ترجمہ شائع کیا جائے۔ اس سلسلے میں ''الاعتصام'' (مورخہ ۳۰۔ نومبر ۱۹۵۱ء) میں ''رحمۃ للعالمین ٹرسٹ'' کے عنوان سے اداریہ لکھا گیا۔ ٹرسٹ قائم ہوا۔ میاں عبدالمجید مرحوم کے مکان پر اس ٹرسٹ کی چند میٹنگیں بھی ہوئیں، لیکن افسوس ہے کوئی اہم کام نہ ہوسکا۔ اس کی تفصیل میں نے اس مضمون میں لکھی ہے جو ''قاضی عبدالعزیز منصور پوری'' کے عنوان سے میری کتاب ''بزمِ ارجمنداں'' میں چھپا ہے۔

قاضی عبدالعزیز صاحب کے مکان پر اس مجلس میں ایک اور صاحب سے پہلی دفعہ ملاقات ہوئی۔ لمبا قد، متناسب جسم، چوڑا چہرہ، سرخی مائل گندمی رنگ، خوب صورت جوان، بہترین انگریزی سوٹ میں ملبوس۔ ڈاڑھی مونچھ صاف، گفتگو کا انداز نہایت مہذبانہ اور طرزِ تخاطب بے حد مؤدبانہ۔ یہ تھے حضرت قاضی محمد سلیمان منصور پوری کے بڑے پوتے اور قاضی عبدالعزیز کے فرزند کبیر قاضی عبدالباقی قدسی......! مجلس ختم ہوئی اور ہم اجازت لے کر مکان کی سیڑھیوں سے نیچے اترے تو قاضی عبدالباقی بھی ہمیں رخصت کرنے کے لیے

Marfat.com

نیچے اترے۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا:

''مرکزی جمعیت اہل حدیث اور اخبار الاعتصام کا دفتر شیش محل روڈ پر ہے۔''

میں نے عرض کیا: ''جی ہاں! شیش محل روڈ پر ہے۔''

فرمایا: ''کل میرا آدمی آپ کے پاس آئے گا اور آپ کو میرے دفتر اور مکان کا پتا اور ٹیلی فون نمبر دے گا۔ پھر ہمارا آپس میں رابطہ رہے گا۔''

چناں چہ دوسرے دن تین بجے کے قریب ایک طویل قامت شخص آئے۔ انھوں نے اپنا نام سید سالم شاہ بتایا اور کہا کہ وہ یہیں شیش محل روڈ پر رہتے ہیں اور قاضی عبدالباقی کے دفتر میں کام کرتے ہیں۔ ان کا آبائی تعلق پٹیالہ سے تھا اور پٹیالہ میں ان کا مکان قاضی صاحب کے مکان کے قریب تھا۔ یہ آج سے ۵۸ برس قبل کی بات ہے۔

اب آئندہ سطور میں ہم قاضی عبدالباقی صاحب کے تھوڑے بہت حالاتِ زندگی سے آگاہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

قاضی عبدالباقی ۱۰۔ دسمبر ۱۹۱۰ء (۸۔ ذی الحجہ ۱۳۲۸ھ) کو پٹیالہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پٹیالہ میں اپنے والد قاضی عبدالعزیز کے قائم کردہ اسلامیہ ہائی سکول میں حاصل کی اور وہیں میٹرک کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔ پھر علی گڑھ کا عزم کیا اور وہاں بی اے کی سند لی اور پھر ایل ایل بی کیا۔ واپس اپنے وطن آئے تو ریاست پٹیالہ کے ایک شہر سنام میں وکالت شروع کی۔ یہاں یہ یاد رہے کہ باقاعدہ وکالت شروع کرنے سے پہلے کسی وکیل کے ساتھ چھ مہینے کی ٹریننگ ضروری تھی۔ اس کے بعد وکالت کا لائسنس ملتا تھا۔ قاضی عبدالباقی نے اس کے لیے پٹیالہ ہائی کورٹ کے اس وقت کے چیف جسٹس دیوان پنڈی داس کو درخواست دی تو چیف جسٹس صاحب نے یہ لکھ کر درخواست واپس کردی کہ قاضی محمد سلیمان صاحب کے پوتے پر یہ شرط عائد نہیں کی جاسکتی۔ وہ کسی وکیل سے ٹریننگ لیے بغیر وکالت کرسکتے ہیں۔ یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ انھوں نے دینیات کی تعلیم اپنے والدِ گرامی قاضی عبدالعزیز اور جدِ امجد قاضی محمد سلیمان منصور پوری سے حاصل کی۔ اپنے اسلاف کی طرح تیز، ذہین اور تیز فکر تھے۔

قاضی عبدالباقی نے کچھ عرصہ وکالت کی۔ پھر وکالت کا پیشہ ترک کرکے بمبئی چلے گئے اور کاروبار کرنے لگے۔ چند سال بمبئی میں ان کا قیام رہا۔ قیام پاکستان کے ڈھائی سال بعد لاہور آ گئے۔ یہاں آکر ابتدا میں مسلم انشورنس کمپنی سے وابستہ ہوئے اور اس کے اعلیٰ عہدے پر پہنچے۔ کمپنی کا دفتر مزنگ روڈ پر تھا۔ میں پہلی دفعہ ان کی دعوت پر وہیں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ مولانا محی الدین احمد قصوری کی کوٹھی (نمبر ۵۳) ان

Marfat.com

کے دفتر کے بالکل قریب تھی۔ میں قاضی صاحب کے دفتر جاتا تو مولانا محی الدین احمد قصوری کی خدمت میں بھی حاضری دیتا۔ بعدازاں قاضی صاحب امریکن انشورنس کمپنی سے منسلک ہوگئے تھے۔ انگریزی، فارسی، اُردو زبانوں پر عبور تھا۔ اردو اور فارسی کے شاعر بھی تھے اور قدسی تخلص کرتے تھے۔

اس وقت قاضی صاحب ماڈل ٹاؤن کے سی (یا جے) بلاک کی ایک کوٹھی میں رہتے تھے۔ ان کے ساتھ کی کوٹھی میں نواب مالیرکوٹلہ کے ایک رشتے دار سکونت پذیر تھے۔ ایک دن قاضی صاحب نے مجھے چار بجے کے بعد اپنے مسکن پر آنے کو کہا۔ میں وہاں پہلی دفعہ گیا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ میں نے گھنٹی دی تو آواز آئی اندر آجایے۔ میں گیا تو قاضی صاحب ململ کا کرتہ پہنے اور سفید لٹھے کا تہبند باندھے کرسی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ میرے جانے پر چائے منگوائی اور دیر تک سلسلۂ کلام جاری رہا۔

۱۹۵۳ء کے (غالباً) وسط میں ان کے والد محترم قاضی عبدالعزیز صاحب سنت نگر سے ماڈل ٹاؤن کے قریب کے علاقہ گارڈن ٹاؤن کی کوٹھی نمبر ۵ میں منتقل ہوگئے تھے جو فیروز پور روڈ کے بالکل متصل تھی۔ مہینے ڈیڑھ مہینے کے بعد قاضی عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں حاضری کو میں نے اپنا معمول بنالیا تھا۔ وہیں قاضی عبدالباقی تشریف لے آتے تھے اور مختلف معاملات پر گفتگو ہوتی تھی۔

اسی کوٹھی میں قاضی عبدالباقی کے دو چھوٹے بھائی (قاضی عبدالکبیر اور قاضی حسن معزالدین) سکونت پذیر تھے۔ قاضی عبدالکبیر کی شادی اسی کوٹھی میں ہوئی تھی اور میں اس میں شامل تھا۔ اس زمانے میں قاضی عبدالعزیز سے بہت میل ملاقات رہی، لیکن افسوس ہے میں ان سے ان کے آباواجداد اور خاندانی حالات کی تفصیلات معلوم نہ کرسکا۔ کچھ پتا نہیں کہ اتنی اہم بات اس وقت میرے ذہن میں کیوں نہیں آئی۔ لیکن اس کے باوجود اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ قاضی محمد سلیمان منصورپوری کی سوانح حیات اسی فقیر کو لکھنے کی سعادت حاصل ہوئی، جو پانچ سو صفحات میں ''تذکرہ قاضی محمد سلیمان منصورپوری'' کے نام سے مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور نے جنوری ۲۰۰۷ء میں کتابی صورت میں شائع کی۔ اس کتاب میں قاضی محمد سلیمان منصورپوری کے آباواجداد اور اخلاف کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔

قاضی عبدالباقی سے چھوٹے قاضی عبدالباری تھے جو اسلام آباد رہتے تھے۔ ان سے ملاقات لاہور میں ہوئی تھی جو پہلی ملاقات بھی تھی اور آخری بھی۔ ان کا تذکرہ میں نے ''تذکرہ قاضی محمد سلیمان منصورپوری'' میں کیا ہے۔ انھوں نے ۳۔ستمبر ۲۰۰۰ء کو اسلام آباد میں وفات پائی۔

قاضی عبدالباقی سے تھوڑے عرصے میں میرے گہرے مراسم قائم ہوگئے تھے۔ میں ان سے ملاقات کے لیے ان کے گھر بھی جاتا تھا اور ان کے دفتر بھی۔ اسی طرح وہ بھی بارہا میرے دفتر اور گھر تشریف لائے۔ ان

Marfat.com

کے والد مکرم قاضی عبدالعزیز صاحب کی طبیعت جب زیادہ خراب ہوئی تو انھوں نے مجھے مطلع فرمایا اور میں نے ۲۴۔اگست ۱۹۵۶ء کو جمعۃ المبارک کے روز مسجد مبارک میں ان کے لیے دعاے صحت کرائی۔ پھر اس سے تیسرے دن ۲۶۔اگست اتوار کی صبح کو ان کا ٹیلی فون آیا کہ والد صاحب وفات پا گئے ہیں اور نمازِ ظہر کے بعد ان کی دنیوی اقامت گاہ نمبر ۵ گارڈن ٹاؤن میں نمازہ جنازہ پڑھنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ جنازہ مولانا سید محمد داؤد غزنوی پڑھائیں۔ چناں چہ میں اور مولانا غزنوی وقت مقررہ سے کچھ دیر پہلے وہاں پہنچے اور مولانا نے جنازہ پڑھایا۔ جنازے میں بہت لوگ شامل تھے۔ ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں انھیں دفن کیا گیا۔

قاضی عبدالباقی سے ملاقات کے یوم اول سے لے کر ہمیشہ میرا قریبی تعلق رہا۔ وہ میرے بے حد خیر خواہ تھے۔ میں جس زمانے میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں فریضہ ادارت سرانجام دیتا تھا، قاضی صاحب کبھی کبھی ادھر کا چکر لگا لیتے تھے۔ وہ جماعتی معاملات سے دل چسپی تو رکھتے تھے، لیکن اس سے ان کا بہت زیادہ تعلق نہ تھا۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد حنیف ندوی اور بعض دیگر حضرات کا وہ انتہائی احترام کرتے تھے۔

مولانا غزنوی کی وفات ۱۶۔دسمبر ۱۹۶۳ء کو صبح نو بجے ہوئی تھی۔ اسی وقت ریڈیو پر اعلان ہو گیا تھا اور اخبارات کے ضمیمے چھپ گئے تھے۔ قاضی صاحب شیش محل روڈ پر تشریف لائے۔ مجھ سے ملے، اپنے جاننے والے اور لوگوں سے بھی ملے اور چلے گئے۔

دوسرے دن نو بجے مولانا کی میت ان کے گھر سے اٹھائی گئی۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ قاضی عبدالباقی بھی مجمعے میں موجود تھے۔ جنازہ یونیورسٹی گراؤنڈ میں مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم نے پڑھایا۔ تدفین کے بعد ہم دارالعلوم تقویۃ الاسلام (واقع شیش محل روڈ) میں آئے تو قاضی عبدالباقی مجھے اور مولانا محمد حنیف ندوی کو انارکلی کے ایک ہوٹل میں لے گئے۔ میں بے حد مغموم تھا۔ وہاں ہم نے چائے پی۔ گفتگو کرتے ہوئے قاضی صاحب نے مجھے فرمایا کہ مولانا داؤد غزنوی تم پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ انھوں نے بہت دنیا دیکھی تھی اور وہ کام کے آدمی کو خوب پہچانتے اور اس سے کام لینا جانتے تھے۔ تم نے پندرہ سال کی طویل مدت ان کے ساتھ گزاری ہے۔ ممکن ہے ان کے بعد جماعتی معاملات میں تبدیلی آجائے اور تبدیلی کا اثر تم پر بھی پڑے، اس لیے تمھیں ابھی سے اس مسئلے پر غور کرنا چاہیے۔ مولانا محمد حنیف ندوی میرے کرم فرما تھے۔ انھوں نے بھی کچھ اسی قسم کی باتیں کیں۔

بہر کیف مولانا غزنوی کی وفات کے بعد قاضی عبدالباقی کی بات صحیح ثابت ہوئی اور جماعتی حالات میں تبدیلی آئی، جس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اس موضوع پر نہ کبھی کوئی بات کی ہے اور نہ کرنا چاہتا ہوں۔ سب لوگ اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ میں بھی زندگی کے سفر کا آخری موڑ کاٹ رہا ہوں۔

Marfat.com

بہرحال معاملہ یہاں تک پہنچا کہ میں نے ۳۰۔مئی ۱۹۶۵ء کو ''الاعتصام'' کی ادارت سے استعفا دے دیا اور ۲۱۔اکتوبر ۱۹۶۵ء کو مجھے بغیر کسی درخواست اور توقع کے ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ کرلیا گیا۔ میں نے ادارے میں بتیس سال تصنیفی اور تحقیقی خدمات انجام دیں۔ ادارے کے مجلّے ''المعارف'' کی ادارتی ذمے داری بھی مجھے سونپی گئی۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ادارے سے علیحدگی کے بعد بھی تصنیف وتالیف میں مصروف ہوں اور ان حضرات کو ہمیشہ یاد رکھتا ہوں اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کرتا ہوں، جن سے جماعتی اور علمی سلسلے میں طویل عرصے تک رفاقت رہی۔ وہ اب اس دنیائے فانی میں نہیں رہے، لیکن ان کی یادیں میرا سرمایۂ حیات ہیں۔ ان میں سے اکثر حضرات پر میں مضامین بھی لکھ چکا ہوں۔

قاضی عبدالباقی کو اپنے جد نامدار قاضی محمد سلیمان منصور پوری اور ان کی تصانیف سے بہ درجہ غایت قلبی تعلق تھا۔ ان کی تصنیف ''رحمۃ للعالمین'' کا انگریزی ترجمہ قاضی عبدالعزیز صاحب نے کیا تھا جو ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۱ء تک مسلسل تین سال ''پاکستان ٹائمز'' (لاہور) میں چھپتا رہا تھا۔ قاضی عبدالباقی نے اس ترجمے نظرثانی کی اور اس کی ایڈیٹنگ اور حوالوں کی چیکنگ وغیرہ پر کئی سال صرف کیے اور بڑی محنت سے یہ خدمت سرانجام دی۔ اللہ نے کرم فرمایا تینوں جلدوں کا انگریزی ترجمہ کتابی صورت میں شائع ہوگیا ہے۔ پہلی جلد ۳۹۰ صفحات، دوسری ۳۶۲ اور تیسری ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی مشہور تصنیف ''شرح اسماء اللہ الحسنیٰ'' کا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے جو ابھی شائع نہیں ہوا۔ یہ ترجمہ غالباً قاضی عبدالباقی کے صاحب زادے شاہد فرید قاضی کے پاس ہے۔

آج سے کم وبیش بیس برس پہلے کی بات ہے کہ مجھے قاضی محمد سلیمان منصور پوری کے حالات لکھنے کا خیال آیا۔ اس کا ذکر قاضی عبدالباقی سے کیا تو وہ نہایت خوش ہوئے اور ان کے متعلق دو مضمون عنایت کیے۔ ایک ان کا اپنا مضمون تھا جو قاضی صاحب کے ''سفرنامہ حجاز'' کی دوسری اشاعت کے آخر میں درج ہے۔ اس میں قاضی صاحب کے حالات صرف چھ صفحات میں بیان ہوئے ہیں۔ باقی مضمون میں پٹیالہ اور وہاں کی اس دور کی بعض شخصیات کا ذکر ہے۔ دوسرا مضمون حکیم عبداللہ روڑوی کا ہے جس کا عنوان ہے ''حالاتِ مبارکہ علامہ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری مرحوم ومغفور'' یہ مضمون آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ میں نے اِدھر اُدھر سے کچھ اور واقعات جمع کیے اور انھیں کمپوز کرایا۔ لیکن کمپوزنگ کے بعد میں نے ان صفحات کو پڑھا تو طبیعت مطمئن نہ ہوئی اور میں نے یہ کمپوز شدہ صفحات جو ڈھائی سو سے زیادہ تھے، ضائع کردیے۔ اس سے اٹھارہ انیس سال بعد پھر دل میں ایک لہر اٹھی اور اللہ کا نام لے کر دوبارہ لکھنا شروع کیا تو اس نے مدد فرمائی اور پھر تھوڑے عرصے میں ''تذکرہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری'' کے نام سے کتاب مکمل ہوگئی۔ تینتیس

Marfat.com

ابواب پر مشتمل یہ کتاب پانچ سو صفحات میں پھیلی ہوئی ہے جو مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور نے شائع کی ہے۔

قاضی عبدالباقی صاحب نے فرمایا تھا کہ وہ اس کتاب کے ایک سو نسخے خریدیں گے اور اپنے دوستوں اور تعلق داروں میں تقسیم کریں گے۔ لیکن اس اثنا میں وہ اپنے بیٹوں کے پاس دبئی چلے گئے۔ دبئی سے دوسرے بیٹوں کے پاس لندن تشریف لے گئے۔ لندن سے پھر دبئی آ گئے اور بیمار پڑ گئے۔ ان کی بیماری کی حالت میں کتاب چھپی اور ان کے چھوٹے بھائی قاضی حسن معزالدین صاحب نے ناشر حافظ احمد شاکر (مکتبہ سلفیہ) سے دس ہزار روپے کی کتاب خریدی اور اپنے دوستوں اور رشتے داروں کو تقسیم کی۔ آٹھ کاپیاں ازراہِ کرم مجھے بھی عنایت فرمائیں۔ یہ معلوم نہیں کہ دس ہزار روپے کے کتنے نسخے ملے۔ اس کے بعد بھی متعدد مرتبہ کئی کئی نسخے خریدے اور اپنے دوستوں کی نذر کیے۔ پانچ سو صفحات پر محیط یہ کتاب ناشر نے نہایت اہتمام سے شائع کی ہے۔ بہت اچھی کمپوزنگ، بہترین کاغذ، عمدہ طباعت، خوب صورت مضبوط جلد، دیدہ زیب سرورق۔ اس کے ساتھ ہی رجال واماکن اور ممالک وکتب اور رسائل کا اشاریہ، جس سے کتاب کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔

قاضی عبدالباقی اس فقیر کو یاد فرماتے رہتے تھے۔ بہت سال ہوئے ایک دن مجھے میرے دفتر ادارہ ثقافت اسلامیہ ٹیلی فون کیا کہ میں آج دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ کھاؤں۔ جون کا مہینا اور سخت گرمی۔ میں ڈیڑھ بجے کے قریب ان کے مکان پر ماڈل ٹاؤن پہنچا۔ علیک سلیک کے بعد فرمایا: کھانا پھر کھائیں گے، پہلے نماز پڑھ لیں۔ نماز کے بعد کھانا کھایا اور ساتھ ساتھ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ کھانے کے بعد فرمایا: ادھر آ جاؤ۔ کمرے میں ایک رضائی پڑی تھی اور ایک کمبل۔ رضائی خود اٹھائی اور فرمایا: یہ کمبل تم اٹھاؤ۔ میں یہ حکم سن کر تعجب سے انھیں دیکھنے لگا۔ فرمایا: میری طرف کیا دیکھتے ہو، اٹھاؤ کمبل۔ پہلے ہی گرمی سے برا حال ہو رہا تھا۔ رضائی اور کمبل دیکھ کر اور پسینے چھوٹنے لگے۔ میں نے تعمیل ارشاد کی اور بادل نخواستہ کمبل اٹھالیا۔ ارشاد ہوا اس کمرے میں چلو۔ اب رضائی ان کے کندھوں پر ہے اور کمبل میرے کندھے پر۔ وہاں دو تین چار پائیاں پڑی تھیں۔ ایک پر خود رضائی اوڑھ کر لیٹ گئے اور ایک پر مجھے کمبل اوڑھ کر لیٹنے کا حکم ہوا۔ اس کمرے میں ائیر کنڈیشن چل رہا تھا۔ دو ڈھائی گھنٹے ہم اس کمرے میں سوئے اور ساڑھے پانچ بجے میں ان کے ہاں سے چائے پی کر گھر کو روانہ ہوا۔

قاضی عبدالباقی کچھ عرصے سے بیمار تھے اور دبئی اپنے بیٹوں کے پاس رہتے تھے۔ کتاب ''تذکرہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری'' کی تصنیف کا انھیں علم تھا۔ اشاعت کے بعد انھوں نے یہ کتاب دیکھی تو ہوگی۔ لیکن میرا خیال ہے پڑھ نہیں سکے۔ ۱۴۔ مارچ ۲۰۰۸ء (۵۔ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ) کو جمعۃ المبارک کا دن تھا کہ دس

Marfat.com

بجے قاضی حسن معزالدین کا ٹیلی فون آیا کہ آج صبح نو بجے میرے بڑے بھائی قاضی عبدالباقی کا دبئی میں انتقال ہوگیا ہے۔ وہیں جمعے کے بعد پانچ بجے ان کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

قاضی حسن معزالدین سے یہ اطلاع پا کر بے حد افسوس ہوا اور گزشتہ ۵۸ سال کے تعلقات مجسم ہو کر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔

قاضی حسن معزالدین نے اسی روز شام کو بتایا کہ دبئی میں پانچ سو آدمی قاضی عبدالباقی کی نماز جنازہ میں شامل ہوئے...... اور خود انھوں نے جمعے کے بعد اپنے اہل خانہ اور بہنوں اور دیگر رشتے داروں کے ساتھ اپنے مکان (۳۱۔ بی بلاک۔ ماڈل ٹاؤن، لاہور) میں غائبانہ نماز جنازہ ادا کی۔

قاضی عبدالباقی نے عیسوی حساب سے ۹۸ سال تین مہینے چار دن اور ہجری حساب سے سو سال دو مہینے چھبیس دن عمر پائی۔

اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ۔

قاضی عبدالباقی کی وفات سے تیرہ دن بعد ۲۶۔ مارچ ۲۰۰۸ء کی رات کو ان کی صاحب زادی عصمت خلیل (اہلیہ خلیل الرحمٰن مالک سلمان آرٹ پریس لاہور) کا انتقال ہوا۔ وہ کچھ عرصے سے بیمار تھیں۔ میرا خیال ہے انھیں باپ کی وفات کی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ ان کی نمازِ جنازہ ۲۷۔ مارچ ۲۰۰۸ء کو جمعرات کے روز چار بجے بعد نماز عصر پڑھی گئی۔ جنازے میں قاضی حسن معزالدین اور قاضی عبدالباقی کے صاحب زادے احمد رشید قاضی سے ملاقات ہوئی۔

قاضی عبدالباقی نے وفات سے بہت سال پہلے ڈاڑھی رکھ لی تھی اور دنیوی معاملات سے منقطع ہو کر اپنے آپ کو ذکر الٰہی اور مطالعہ کتب کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کا عام مطالعہ خاصا وسیع تھا۔ وہ مہمان نواز اور مستحقین کے معاون تھے۔

قاضی عبدالباقی کی نرینہ اولاد چار بیٹے تھے اور چاروں اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ دو بیٹے احمد رشید قاضی اور شاہد فرید قاضی دبئی میں مقیم ہیں شاہد قاضی صاحب وفات کے وقت انہی کے پاس تھے۔ دو بیٹے فاروق حمید قاضی اور سلمان سعید قاضی برمنگھم (انگلستان) میں تھے۔ لیکن سلمان سعید جولائی ۲۰۰۳ء میں اچانک وفات پا گئے تھے۔ اس وقت قاضی عبدالباقی وہیں تھے۔ اب فاروق حمید قاضی اپنی فیملی سمیت انگلستان میں ہیں اور سلمان سعید کے اہل وعیال بھی وہیں ہیں۔

سلمان سعید کی وفات سے کچھ عرصہ بعد قاضی عبدالباقی لاہور آئے تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا

Marfat.com

اور سعادت مند بیٹے کی وفات پر اظہارِ افسوس کیا۔ فرمایا اللہ کو یہی منظور تھا جو ہوگیا۔ ہم بے بس بندے کچھ نہیں کرسکتے۔ اس مفہوم کے چند الفاظ انھوں نے انتہائی غم زدہ مگر صابر لہجے میں کہے۔

قاضی عبدالباقی قدسی کے چاروں بیٹوں کی اولاد کی تفصیل اس طرح ہے۔

۱......سلمان سعید قاضی مرحوم کے دو بیٹے ہیں، علی قاضی اور جنید قاضی۔ ایک بیٹی ہے، سعدیہ۔ یہ فیملی برمنگھم (انگستان) میں اقامت گزیں ہے اور اللہ کی مہربانی سے سب آسودہ حال ہیں۔

۲......احمد رشید قاضی کے دو بیٹے ہیں، امین رشید اور عمر رشید۔

۳......فاروق حمید قاضی کی اولاد ایک بیٹا ہے اور چار بیٹیاں۔ بیٹے کا نام ثاقب حمید قاضی ہے اور بیٹیوں کے نام ہیں فرحت حمید، صباحت حمید، مہرین حمید اور بشریٰ حمید۔ یہ گھرانا بھی انگلستان میں مقیم ہے۔

۴......شاہد فرید قاضی کے ایک بیٹے ہیں، جن کا نام حسنین قاضی ہے۔ یہ مڈل ایسٹ کنٹریز (شرق اوسط کے ممالک) میں بزنس مینیجر ہیں۔ تین بیٹیاں ہیں، ثنا قاضی، نوری قاضی، عشما قاضی۔

شاہد فرید قاضی کی بڑی بیٹی نابینا ہے۔ لاہور میں قرآن مجید حفظ کیا تھا۔ پھر یہ لوگ لندن چلے گئے۔ وہاں اس بچی نے یونیورسٹی میں وکالت کی تعلیم حاصل کی اور اسلام کی تبلیغ بھی کرتی رہی۔ اس کی تبلیغ سے جن لوگوں نے اسلام قبول کیا، ان میں ایک انگریز نوجوان بھی شامل تھا جو کسی بہت اچھے منصب پر فائز ہے۔ اس سے اس بچی کی شادی ہوگئی۔ اب اس بچی کا شمار وہاں کے بڑے وکلا میں ہوتا ہے۔

اس سے چھوٹی بہن بھی نابینا ہے۔ اس نے بھی قرآن حفظ کیا اور انگلستان کی ایک یونیورسٹی میں وکالت کی تعلیم مکمل کی۔ پھر خود وکالت کرنے لگیں۔

احمد رشید قاضی اور شاہد فرید قاضی کی فیملیاں دبئی میں ہیں اور یہ دونوں بھائی کراچی میں ماشاء اللہ بہت اچھے مناصب پر فائز ہیں اور ملک وقوم کی خدمت کررہے ہیں۔

قاضی عبدالباقی قدسی مرحوم کے سے چھوٹے بھائی قاضی حسن معزالدین کی نرینہ اولاد دو بیٹے ہیں۔ ایک ڈاکٹر عثمان عبدالعزیز قاضی امریکہ میں مقیم ہیں۔ دوسرے حسین عبدالرحمٰن قاضی پاکستان آرمی میں میجر کے عہدے پر فائز ہیں۔

قاضی حسن معزالدین نے ۱۰۔رمضان المبارک ۱۴۳۳ھ (۳۰۔جولائی ۲۱۰۲ء) کو لاہور میں وفات پائی۔

قاضی عبدالباقی کے دو بھائی اور تھے، قاضی عبدالباری اور قاضی عبدالکبیر۔ دونوں وفات پاگئے ہیں۔ قاضی عبدالکبیر کی صرف ایک بیٹی ہے، بیٹا کوئی نہیں۔ قاضی عبدالباری مرحوم کی چھے بیٹیاں ہیں، بیٹا کوئی نہیں۔

جہاں تک میں جانتا ہوں، اس گھرانے کے تمام افراد مشرقی روایات کے امین اور احکام اسلام پر عامل

Marfat.com

ہیں۔ بلند اخلاق اور اعلیٰ کردار کے مالک۔ تبلیغ دین کو اس خاندان کے ہر فرد (مرد وزن) نے اپنے آپ پر لازم قرار دے رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کا حامی وناصر ہو۔ آمین۔

علمی، تحقیقی اور تصنیفی اعتبار سے اس خاندان کے رکنِ اعلیٰ حضرت قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری تھے جو دنیوی منصب کے لحاظ سے پنجاب کی سب سے بڑی ریاست پٹیالہ کے سیشن جج تھے۔ ان کی تصانیف میں سے ''رحمۃ للعالمین'' نے بے حد شہرت پائی۔ اس اردو کتاب کے عربی ترجمے بھی ہوئے اور انگریزی بھی۔ ایک انگریزی ترجمہ جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا ان کے صاحب زادے قاضی عبدالعزیز منصور پوری نے کیا۔ پھر اس کی ایڈیٹنگ وغیرہ قاضی صاحب کے بڑے پوتے قاضی عبدالباقی قدسی نے کی اور نہایت محنت سے انھوں نے یہ خدمت سرانجام دی۔ یہ انگریزی ترجمہ، مولانا عبدالمالک مجاہد اپنے بین الاقوامی اشاعتی ادارے دارالسلام کی طرف سے شائع کرنا چاہتے تھے، انھوں نے میری معرفت اس سلسلے میں قاضی عبدالباقی مرحوم سے خاصی تفصیل سے بات کی۔ خود میری بھی یہی خواہش تھی کہ اس کی اشاعت کا کام مجاہد صاحب کے سپرد کر دیا جائے، اس سے کتاب کا دائرہ اشاعت بہت بڑھ جائے گا، لیکن ایسا نہ ہوسکا اور کتاب (تین جلدوں میں) قاضی عبدالباقی صاحب نے خود ہی شائع کی۔ اس کا ذکر ''چمنستانِ حدیث'' میں مولانا عبدالمالک مجاہد کے تذکرے میں کیا گیا ہے۔ میرا اب بھی جی چاہتا ہے کہ ممکن ہو تو اس کے حقوق طباعت دارالسلام کو دے دیے جائیں۔

بے شبہ یہ ایک عظیم خدمت ہے جس کی انجام دہی کی توفیق اللہ تعالیٰ نے قاضی عبدالباقی کو مرحمت فرمائی۔ وہ اپنے جدِ امجد کی متعدد کتابوں کو اردو سے انگریزی میں منتقل کرنا چاہتے تھے، لیکن ان کی یہ دلی تمنا پوری نہ ہوسکی۔

❀❀❀❀

Marfat.com

حافظ محمد یحییٰ عزیز میر محمدی

(وفات ۲ نومبر ۲۰۰۸ء)

میانہ قد، متوازن جسم، سرخی مائل گندمی رنگ، کشادہ پیشانی، کچھ چوڑا چہرہ، کھلا ہاتھ اور کھلا ہی دل۔ پوری داڑھی جو عمر کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہوئی سفید ہوگئی تھی۔ ہنس مکھ اور خوش مزاج۔ تہجد گزرا، کتاب و سنت کے مخلص ترین مبلغ، لوگوں کے ہم درد، صلحا کے خدمت گزار اور علما کا احترام بجالانے والے۔ سادہ لباس، سر پر سفید یا چار خانہ رومانہ، سفید قمیص اور سفید تہبند۔ یہ تھے ہمارے ممدوح مولانا حافظ محمد یحییٰ عزیز میر محمدی۔ اب ان کے حالات ملاحظہ ہوں:

ضلع قصور کے ایک گاؤں کا نام ''میر محمد'' ہے، جس میں صدیوں سے راجپوت برادری کے لوگ آباد ہیں۔ حافظ محمد یحییٰ عزیز اسی گاؤں کے رہنے والے تھے اور اسی برادری سے ان کا تعلق تھا۔ حافظ صاحب کے دادا پہلے شخص تھے جن کی وجہ سے اس گاؤں اور اس خاندان کو مسلک اہل حدیث سے شناسائی ہوئی۔ وہ عالم دین تو نہ تھے البتہ اپنی شرافت و دیانت اور پارسائی کی وجہ سے تمام گاؤں میں انھیں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کے فرزند گرامی حافظ محمد تھے۔ وہ بھی معروف معنوں میں عالم دین نہ تھے، لیکن بہ درجہ غایت متقی اور پرہیز گار بزرگ تھے۔ اپنے گاؤں اور اردگرد کے دیہات میں انھیں تکریم کا مقام حاصل تھا۔ بہت سے لوگوں نے ان سے قرآن مجید پڑھا اور حفظ کیا اور لاتعداد لوگ ان کی تبلیغ دین، ان کے اخلاق اور اس کے طرزِ گفتگو سے متاثر ہو کر جادۂ حق پر قدم زن ہوئے۔

انھوں نے اپنے گاؤں میں ایک دینی مدرسہ جاری کیا تھا۔ اس مدرسے میں طویل عرصے تک مولانا عبدالحق فریضہ تدریس انجام دیتے رہے جو اصلاً ضلع فیروز پور کی تحصیل موگا کے ایک قصبے سنگھاں والا کے رہنے والے تھے اور انھوں نے اگست ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں اپنے بعض عزیزوں کے ساتھ سکھوں کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کیا۔ وہ مسجد اقصیٰ اہل حدیث (گلشن راوی، لاہور) کے خطیب قاری محمد عزیر کے والد ماجد تھے۔ اس فقیر کو حضرت حافظ محمد صاحب کی زیارت اور ان کی مجلس میں بیٹھنے اور ان کے ارشادات سننے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ خوب صورت، خوب سیرت، طویل قامت، کم اور مجسمۂ خیر بزرگ!

اللهم اغفرله و ارحمه و عافه و اعف عنه .

Marfat.com

حافظ محمد صاحب کی اولادِ نرینہ دو بیٹے تھے۔ بڑے مولوی محمد یعقوب اور چھوٹے حافظ محمد یحییٰ۔ محمد یعقوب کچھ عرصہ دہلی میں حضرت میاں سید نذیر حسین رحمہ اللہ کے قائم کردہ مدرسے میں تعلیم حاصل کرتے رہے، لیکن وہاں کا نصاب مکمل نہ کر سکے اور واپس گاؤں آکر کاشت کاری میں مصروف ہو گئے۔ ان دونوں بھائیوں پر نیکی اور تقویٰ شعاری میں تو بلاشبہ الولد سر لابیہ کی مثال صادق آتی تھی، لیکن قد و قامت میں باپ کے ہم پلہ نہیں تھے۔ مولوی محمد یعقوب نے ۱۱۔ جنوری ۲۰۰۳ء کو اپنے گاؤں میر محمد میں وفات پائی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

ان سطور میں حضرت حافظ محمد یحییٰ صاحب کے بارے میں چند باتیں عرض کرنا مقصود ہے۔

حافظ صاحب دسمبر ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوئے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو پہلے ناظرہ قرآن مجید پڑھا۔ پھر اپنے گاؤں کے مدرسے میں قرآن حفظ کرنے کی سعادت حاصل کی۔ صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں غالباً مولانا عبدالحق (شہید) سے پڑھی تھیں۔

اس کے بعد امرتسر کے مدرسہ غزنویہ میں چلے گئے۔ وہاں حضرت مولانا نیک محمد، مولانا محمد حسین ہزاروی، مولانا عبداللہ بھوجیانی اور بعض دیگر اساتذہ سے مروجہ نصاب کی تکمیل کی۔ تعلیم کا سلسلہ جاری تھا کہ ملک تقسیم ہو گیا اور حافظ صاحب اپنے گاؤں میر محمد چلے گئے جو پہلے سے اس خطے میں واقع تھا جو پاکستان کے حصے میں آیا۔ پہلے ضلع لاہور میں شامل تھا۔ اب ضلع قصور میں شامل ہے۔

قیامِ پاکستان کے زمانے میں حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی فیروز پور میں اقامت گزیں تھے اور حافظ محمد یحییٰ کے والد مکرم اور ان کے خاندان کے دیگر بزرگوں سے ان کے قریبی مراسم تھے۔ تقسیم ملک کے بعد مولانا ممدوح فیروز پور سے گوندلاں والا (ضلع گوجراں والا) چلے گئے تھے اور وہاں انھوں نے اپنے طور پر تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ حافظ محمد یحییٰ صاحب کو اس کا پتا چلا تو وہ ان کی خدمت میں گوندلاں والا پہنچے۔ چار مہینے وہاں رہے اور ان سے چند کتابیں پڑھیں۔

اس وقت حضرت حافظ محمد گوندلوی گوجراں والا کی ایک مسجد میں جسے ''ٹاہلی والی مسجد'' کہا جاتا ہے، طلبا کو حدیث شریف کی انتہائی کتابیں پڑھایا کرتے تھے۔ حافظ محمد یحییٰ صاحب نے بھی ادھر کا رخ کیا اور ان سے کسبِ فیض کرنے لگے۔ وہ دیگر حضرات کی طرح حضرت حافظ صاحب گوندلوی کے علم، عمل، کثرتِ ذکر الٰہی، قیام اللیل، حفظ و اتقان، تلاوتِ قرآن اور اس طرح کے دوسرے محاسن سے بہت متاثر تھے۔ اسی طرح اپنے استاذ محترم حضرت مولانا نیک محمد رحمہ اللہ کے حلم، علمی گہرائی، سادگی، طریق تدریس اور طلبا کی تربیت کے انداز کا ان پر بے حد اثر تھا۔

Marfat.com

تقسیم ملک کے بعد دار العلوم تقویۃ الاسلام مدرسہ غزنویہ (امرتسر سے) لاہور منتقل ہوا تو حافظ محمد یحییٰ اس مدرسے میں آ گئے اور یہاں حدیث شریف اور دیگر علوم کی انتہائی کتابیں پڑھتے رہے۔ اس وقت اس دار العلوم میں مولانا عطاء اللہ حنیف، مولانا شریف اللہ خاں، مولانا محمد موسیٰ خاں اور مولانا محمد عبدہ الفلاح خدمت تدریس سرانجام دیتے تھے۔ مولانا عطاء اللہ حنیف شیخ الحدیث کے منصب عالی پر فائز تھے۔ ان سے حافظ صاحب کے خاندانی مراسم تھے۔ مولانا کا جنازہ بھی حافظ صاحب نے پڑھایا تھا۔ ان کی وفات پر وہ بے حد مغموم تھے۔

یہاں یہ بھی سنتے جایئے کہ ابتدائی عمر میں حافظ محمد یحییٰ صاحب نے سرکاری سکول میں داخلہ لیا تھا۔ میٹرک پاس کرنے کا ارادہ تھا، لیکن ساتویں جماعت میں تھے کہ سکول ماسٹر نے ان کو "وہابی" کہہ کر پکارا۔ معلوم نہیں اس نے کس لہجے میں یہ لفظ کہا، لیکن حافظ صاحب نے اس طرزِ تخاطب کو سخت برا مانا اور بستہ اٹھا کر گھر آ گئے۔ پھر جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا، دینی علوم کی تکمیل فرمائی۔

حافظ محمد یحییٰ دھیمے مزاج کے عالم دین تھے اور میٹھے انداز میں تبلیغ دین کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ کسی کو کافر کہنا، کسی کو منافق قرار دینا، کسی کو بے دینی کی حدوں میں داخل کر دینا، کسی پر شرک کا فتویٰ لگانا ان کا شیوہ نہیں تھا۔ بہت سالوں سے انھوں نے بھائی پھیرو کے قریب ایک گاؤں بنگا بلوچاں کو تبلیغ دین کا مرکز بنا رکھا تھا، جس میں یہ سلسلہ کامیابی سے جاری ہے اور اس کے اثرات پورے پاکستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مرکز میں مبلغین کو تبلیغ کے صحیح طریقے سے آگاہ کیا جاتا ہے اور فتوے بازی اور لوگوں سے لڑائی جھگڑا کرنے اور ترش روئی سے پیش آنے سے منع کیا جاتا ہے۔ اسلامی تعملی کو مثبت انداز میں پیش کرنے کی تلقین کی جاتی ہے، منفی رویہ اختیار کرنے سے روکا جاتا ہے۔

مبلغین کی جماعتیں دور دراز علاقوں تک جاتی اور لوگوں کو بتاتی ہیں کہ اسلام کن چیزوں پر عمل کا حکم دیتا ہے اور کن چیزوں سے روکتا ہے، یعنی لوگوں کی سمجھ کے مطابق انھیں اوامر ونواہی سے مطلع کیا جاتا ہے۔

پہاڑی علاقوں کا ہر سال دورہ کیا جاتا ہے، جن میں مری، باغ، ایبٹ آباد اور نتھیا گلی وغیرہ شامل ہیں۔ ان علاقوں کے لوگ اس جماعت کے مبلغین کی باتیں سنتے اور ان پر عمل کرتے ہیں۔ ان کی آمد پر خوش ہوتے اور ان سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کے پاس تشریف لاتے اور انھیں اسلامی احکام سے باخبر کرتے رہیں گے۔

حافظ صاحب کا قائم کردہ یہ تبلیغی نظام صرف وعظ تک محدود نہیں۔ اس کے مبلغین وعظ کے ساتھ لوگوں کی علمی اور اخلاقی تربیت کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ جہاں تک ممکن ہو، مستحق اور غریب لوگوں کی مالی مدد بھی

Marfat.com

کرتے ہیں۔ ان حضرات کا نقطہ نظر یہ ہے اور بالکل صحیح نقطہ نظر ہے کہ تبلیغ اسی وقت موثر ہوگی، جب مبلغ ان کی خدمت کریں گے۔ جس غریب مسکین کے ساتھ آپ عملی طور سے ہم دردی کا اظہار نہیں کرتے، اسے صرف وعظ فرماتے ہیں، وہ یقیناً یہ سوچتا ہے کہ یہ کیسے مبلغ اور واعظ ہیں، جنھیں ہماری مالی اور معاشی پریشانیوں کا تو احساس نہیں، لیکن ہمیں مسلسل وعظ فرماتے جا رہے ہیں۔ جن مبلغین کے دلوں میں کسی کے لیے رحم کا جذبہ نہیں پایا جاتا، وہ دینی تبلیغ میں کہاں تک صادق ہو سکتے ہیں، جب کہ قرآن و حدیث میں ایک دوسرے سے رحم دلی کے ساتھ پیش آنے اور اپنی توفیق کے مطابق مستحقین سے مالی تعاون کرنے کا حکم فرمایا گیا ہے۔

حافظ صاحب تبلیغ کے سلسلے میں زیادہ تر سفر میں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ برطانیہ کی جماعت اہل حدیث کی دعوت پر برطانیہ بھی گئے تھے اور وہاں کے مختلف شہروں میں چالیس دن کے لیے ان کا تبلیغی پروگرام مرتب کیا گیا تھا۔

ایک دفعہ وہ اسی سلسلے میں کویت بھی گئے تھے، وہ جہاں گئے سادگی ان کے ہم رکاب رہی اور نرم مزاجی ان کے ہم سفر۔

تبلیغی سلسلے کی مصروفیات کی وجہ سے وہ تصنیفی خدمت کی طرف متوجہ نہیں ہو سکے۔ البتہ ''تبلیغ و تربیت دین کے پانچ اصول'' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی، جو اصلاحی نوعیت کی کتاب ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس کی حیثیت تبلیغ دین کے طریقے اور اسلوب کی نشان دہی کرنے کی ہے۔

یہ کتاب کئی دفعہ چھپ چکی ہے اور کتاب کے سرورق پر قرآن مجید کی یہ آیت مبارکہ درج ہے:

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۝﴾

(حم السجدۃ: ۳۳)

''اور اس شخص سے کس کی بات اچھی ہو سکتی ہے، جس نے اللہ کی طرف دعوت دی اور خود نیک عمل کیے اور کہا میں بھی ایک مسلمان ہوں۔''

حافظ صاحب کی تبلیغی جدوجہد کے مختصر تذکرے اور اس کتاب کے ذکر کے بعد آئیے اب قرآن مجید سے متعلق ان کی خدمات کا تعارف کراتے ہیں جس کے وہ ہمیشہ مبلغ رہے اور واقعہ یہ ہے کہ (یٰیَحْيٰی خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ) کی وہ عملی تصویر اور چلتی پھرتی تفسیر تھے۔ انھوں نے ہر انداز میں اسے ہدف عمل ٹھہرایا اور پوری زندگی اس کی تبلیغ میں صرف کر دی۔

۱۔ تجوید قرآن کے موضوع پر سب سے پہلے انھوں نے ''آسان قاعدہ'' لکھا جسے حلقہ قرآء میں بے حد اہمیت حاصل ہوئی۔

Marfat.com

۲۔ اس کے بعد اسی موضوع پر "آسان کتاب" لکھی، اسے بھی قبولِ عام حاصل ہوا۔

۳۔ ان کی عظیم خدمت قرآن یہ ہے کہ متن قرآن سمیت پورا ترجمہ کیسٹوں کی صورت میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ ان کا اپنا ہے اور انھوں نے خود اپنی زبان میں ریکارڈ کرایا۔ یہ کیسٹیں مارکیٹ سے مل سکتی ہیں۔

اس سلسلے میں یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی متن اور ترجمے سمیت پوری تفسیر کی گئی ہے۔ لیکن سورہ آلِ عمران سے لے کر آخر قرآن تک ترجمے کے ساتھ کہیں کہیں مختصر الفاظ میں تفسیر بیان کی گئی ہے۔

افسوس ہے ان سطور کا راقم یہ ترجمہ یا تفسیر نہیں سن سکا۔ لیکن اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کی بے حد تعریف کرتے ہیں۔ تلاوت قرآن میں حافظ صاحب کے لہجے، ان کے ترجمے اور ان کے طریق ادا کے وہ بہت معترف ہیں۔ اس میں حافظ صاحب کا بے پناہ اخلاق بھی کارفرما ہے اور قرآن سے بہ درجہ غایت ان کی محبت کا بھی عمل دخل ہے۔ یہی وہ عناصر ہیں جو ان کی آواز میں سوز پیدا کرتے اور ان کے طرز ادا کو نکھار بخشتے ہیں، جس سے سامعین اثر پذیر ہوتے ہیں۔

راقم کے خیال میں کیسٹوں کے علاوہ اس کی طباعت کا اہتمام بھی کرنا چاہیے۔ اگر ایسا ہو سکے تو اس کی افادیت کا دائرہ زیادہ وسیع ہو گا اور اس پر جو رقم خرچ ہو گی وہ اس کی قیمت سے واپس ہو جائے گی۔ حافظ صاحب اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔ ان کے عقیدت مند اگر اس مسئلے پر غور فرمائیں تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اس باب میں کسی ناشر سے بھی بات ہو سکتی ہے۔ طباعت کی صورت میں ان شاء اللہ اس عظیم خدمت قرآن کو دوام حاصل ہو جائے گا۔

تبلیغ کے سلسلے میں حافظ صاحب کا نقطہ نظر قرآن مجید کے اس ارشاد کے عین مطابق تھا:

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ (النحل: ۱۲۵)

"اے نبی ﷺ! لوگوں ڈ کو دانش مندی اور بہترین اندازِ نصیحت سے اپنے پروردگار کے راستے کی طرف بلاؤ۔"

نصیحت اور وعظ کا انداز جتنا میٹھا ہو گا، اتنا ہی لوگ مبلغ سے متاثر ہوں گے۔ کڑوے کسیلے اسلوب گفتگو سے لوگ دور بھاگتے اور مبلغ سے نصرت کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ اس قسم کے لہجے میں اچھی سے اچھی بات کو بھی پسند نہیں کیا جاتا۔ حافظ محمد یحییٰ صاحب تبلیغ دین کے اس پہلو سے خوب آگاہ تھے، چناں چہ وہ قرآن کی روشنی میں لوگوں کے ذہن کے مطابق تبلیغ کرتے تھے اور اپنے مبلغین کو نرم اندازِ تخاطب اپنانے کی تلقین

Marfat.com

فرماتے تھے۔

جس طرح ان کی تبلیغ دین میں سادگی کا پہلو نمایاں تھا، اسی طرح ان کے عام طرزِ زیست میں بھی ہر آن سادگی کا عنصر غالب رہتا تھا۔ وہ برطانیہ گئے تو سادگی ان کے گھر سے ان کے ساتھ گئی اور وہاں کے مختلف شہروں کا تبلیغی دورکیا تو اس تمام سفر میں سادگی ان کی انگلی پکڑ کر ان کے ساتھ چلتی رہی۔ ایک لمحے کے لیے بھی ان سے جدا نہیں ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سادگی ان کی معاشرتی زندگی کا حسن تھا، جس کی حفاظت انھوں نے اپنے آپ پر لازم قرار دے رکھی تھی۔ وہ زمیندار تھے، کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، لیکن سادگی سے انھیں ہمیشہ پیار رہا۔

حافظ صاحب نے مرکز تبلیغ بنگا بلوچاں میں قرآنِ مجید کے حفظ اور دینی تعلیم کا بہت اچھا مدرسہ جاری کیا، جس میں کثیر تعداد میں بچوں نے تعلیم حاصل کی اور کر رہے ہیں۔ ان کی تربیت اس انداز سے کی جاتی ہے کہ وہ حصولِ علم کے بعد اسلام کے کامیاب مبلغ اور بہترین مدرس ہو سکیں۔ ہم گنہگاروں کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ نیک مقاصد میں حافظ صاحب کے اخلاف کو کامیابی عطا فرمائے۔

حافظ صاحب کا کسی پیمانے پر سلسلہ بیعت بھی تھا۔ ہمارے دوست مولانا عارف جاوید محمدی (کویت) نے ان سے باقاعدہ بیعت کی تھی اور وہ ان سے بہت متاثر ہیں۔

حافظ صاحب طویل مدت سے بیمار تھے۔ درمیان میں کبھی افاقہ بھی ہو جاتا تھا۔ لیکن بیماری کی طوالت نے ان کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور ان کی صحت جو کسی زمانے میں بہت اچھی تھی، اب ان کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ ایک مرتبہ میں اور مولانا عبدالرشید مجاہد آبادی ان کی عیادت کے لیے گئے تو وہ بالکل بے ہوش پڑے تھے۔ کسی کسی وقت ان کا جسم حرکت کرتا تھا۔ مولانا عبدالرشید مجاہد آبادی کے پوتے اور صاحب زادے حافظ عبدالرؤف بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہم کچھ دیر بیٹھے، ان کے لیے دعاے صحت کی اور مایوسی کا بوجھ اٹھا کر واپس آ گئے۔ لیکن چند روز بعد طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی۔

اس سے کچھ عرصہ بعد قاری محمد صہیب صاحب نے مرکز کے ایک جلسے میں شرکت کے لیے مجھے دعوت دی۔ میں حاضر ہوا۔ مجھے وعظ و تقریر سے دلچسپی نہیں، وہاں بہت بڑا مجمع تھا۔ میں نے اس مجمعے میں چند باتیں بیان کیں اور واپس آ گیا۔ اس وقت حافظ محمد یحییٰ صاحب وہاں نہیں تھے، معلوم ہوا کہ علاج کے لیے لاہور تشریف لے گئے ہیں۔

اس کے بعد ان کے بارے میں تشویش ناک خبریں سننے میں آئیں۔ میں عیادت کے لیے جانا چاہتا تھا، لیکن نہ جا سکا۔ یکم نومبر کو میری اہلیہ کی تعزیت کے لیے قصور سے گورنمنٹ کالج کے پرنسپل لیاقت علی بھلر اور

Marfat.com

(مرحوم) پروفیسر محمد سعید عابد تشریف لائے تو انھوں نے بتایا کہ چند روز سے حافظ صاحب کی طبیعت بہت خراب ہے۔ میں نے عرض کیا میں دو چار روز میں جاؤں گا۔ ۲ نومبر کی صبح کو محترمی حافظ احمد شاکر کے صاحب زادے عزیزی حماد شاکر کا ٹیلی فون آیا کہ حافظ محمد یحییٰ صاحب یکم اور ۲۔ نومبر ۲۰۰۸ء کی درمیانی رات کو لاہور عمر ہسپتال میں وفات پا گئے اور گیارہ بجے بنگا بلوچاں کے مرکز تبلیغ البدر میں ان کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور وہ نو بجے میرے پاس آئے اور ہم جنازے کے لیے یہاں سے چل پڑیں گے۔

چناں چہ حافظ احمد شاکر، حماد شاکر، الاعتصام کے مینجر محمد سلیم چنیوٹی، جناب عبدالمنان بٹ (گنپت روڈ) اور ان سطور کا راقم ساڑھے نو بجے لاہور سے روانہ ہوئے اور ساڑھے دس بجے وہاں پہنچے۔ قرب و جوار اور دور راز سے بہت لوگ آئے تھے۔ گیارہ بجے مولانا عتیق اللہ سلفی (ناظم مرکز الدعوۃ السلفیہ ستیانہ بنگلہ) نے نہایت عجز و الحاح کے ساتھ جنازہ پڑھایا۔ خود بھی روئے اور لوگوں کو بھی رلایا۔

اللهم اغفر له و ارحمه و عافه و اعف عنه و ادخله جنت الفردوس.

حافظ صاحب مرحوم سے میرا تعارف ۱۹۴۸ء کے اکتوبر میں ہوا تھا۔ میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ناظم دفتر کی حیثیت سے لاہور آیا۔ اس کا دفتر دار العلوم تقویۃ الاسلام کی بلڈنگ میں تھا اور حافظ صاحب وہاں طالب علم تھے اور درس نظامی کی انتہائی کتابیں پڑھتے تھے۔ اس وقت ان کے اساتذہ تھے مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، مولانا شریف اللہ خاں سواتی اور مولانا محمد موسیٰ خاں رحمہم اللہ۔ یہ سب حضرات اپنی اپنی باری سے سفر آخرت پر روانہ ہو چکے ہیں۔ رحمهم الله تعالىٰ

❁❁❁❁

Marfat.com

مولانا محمد یحیٰی گوندلوی

(وفات ۲۶۔جنوری ۲۰۰۹ء)

میانہ قد، نہ دبلے نہ موٹے، سانولا رنگ، کشادہ پیشانی، سادہ مزاج، سادہ لباس، سر پر چھوٹی سفید ٹوپی، نرم کلام، یہ تھے مولانا محمد یحیٰی گوندلوی۔ ۹۔نومبر ۱۹۵۶ء کو ضلع گوجراں والا کے قصبہ گوندلاں والا میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد یعقوب تھا۔

محمد یحیٰی نے ابتدائی دینی تعلیم گوندلاں والا کے اساتذہ سے حاصل کی۔ یہیں سرکاری سکول میں مڈل پاس کیا۔ ۱۹۶۸ء میں جامعہ اسلامیہ (گوجراں والا) میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۴ء میں یہاں کا نصاب مکمل کر کے ادارہ علوم اثریہ (فیصل آباد) میں داخل ہوئے۔ ۱۹۷۷ء میں اس ادارے کی تعلیم سے فراغت پائی۔

جامعہ اسلامیہ میں طالب علمی کے دوران ہی میں عربی فاضل کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے، جامعہ اسلامیہ میں ان کے اساتذہ تھے مولانا ابوالبرکات احمد مدراسی، مولانا محمد اعظم، مولانا محمد الیاس اثری اور قاری محمد یحیٰی بھوجیانی۔ ادارہ علوم اثریہ میں انھوں نے جن حضرات سے اخذِ علم کیا، ان کے اسمائے گرامی ہیں: مولانا عبداللہ لائل پوری (جھال خانوآنہ) مولانا محمد عبدہ الفلاح اور مولانا ارشاد الحق اثری۔ ان علمائے ذی قدر میں سے مولانا ارشاد الحق اثری ماشاء اللہ سرگرمی سے تصنیفی اور تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں، اللہ ان کی زندگی دراز فرمائے۔ باقی تمام حضرات سفرِ آخرت اختیار کر چکے ہیں، رحمہم اللہ تعالیٰ۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا محمد یحیٰی گوندلوی نے ۱۹۷۸ء میں دارالحدیث محمدیہ حافظ آباد میں تدریس کا آغاز کیا۔ وہاں پانچ سال ان کا سلسلۂ درس وتدریس جاری رہا۔ پھر قلعہ دیدار سنگھ (ضلع گوجراں والا) میں بہ طور مدرس تشریف لے گئے۔ کچھ عرصہ وہاں قیام رہا۔ بعدازاں حافظ عبدالرزاق سعیدی مرحوم کی دعوت پر منڈی فاروق آباد چلے گئے۔ وہاں سات آٹھ سال تدریس کی۔ ایک ماہنامہ رسالہ ''ترجمان السنہ'' بھی وہاں سے جاری کیا جو تھوڑا عرصہ ہی جاری رہا۔

فاروق آباد سے ۱۹۹۲ء میں ضلع سیالکوٹ کے ایک مقام ''ساہووالا'' کا عزم کیا۔ وہاں کی جامعہ تعلیم القرآن والحدیث کی مسندِ درس پر فائز ہوئے۔ پھر تادمِ وفات وہیں رہے۔ وہاں طلباء کو تفسیرِ قرآن بھی پڑھاتے رہے اور کتب حدیث بھی۔

Marfat.com

اس طرح تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے تیس سال کے لگ بھگ درس وتدریس کی۔ اس اثنا میں چوبیس یا پچیس مرتبہ صحیح بخاری پڑھائی۔ تدریس کے علاوہ کتب صحاح میں سے جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ اور شمائل ترمذی کے اردو زبان میں ترجمے کیے۔ ترمذی اور شمائل ترمذی کے ترجمے تو ان کی زندگی میں چھپ گئے تھے، لیکن ابن ماجہ کا ترجمہ شائع نہیں ہوسکا۔

جس طرح ان کا سلسلۂ تدریس جاری رہتا تھا، اسی طرح ترجمہ وتصنیف میں ان کا قلم رواں رہتا تھا۔ ان کے ترجمے کا ذکر تو ہوچکا، اب ان کی تصانیف کی طرف آیے۔ جو طبع ہوچکی ہیں، ان کی تعداد سترہ ہے اور وہ یہ ہیں (۱) مقلدین ائمہ کی عدالت میں (۲) ضعیف اور موضوع روایات (۳) ضرب شدید علی اہل التقلید (۴) دین تصوف (۵) مطرقۃ الحدید (۶) خیر البراہین (۷) شادی کی دوسری دس راتیں بجواب شادی کی پہلی دس راتیں [1] (۸) داستانِ حنفیہ (۹) عقیدہ اہل حدیث (۱۰) تحقیق تین طلاق (۱۱) طلاق اور شریعت محمدیہ (۱۲) نداء لغیر اللہ (۱۳) فتویٰ حرمت سود (۱۴) توہین انبیاء اور بائبل (۱۵) جرابوں پر مسح (۱۶) تخریج معیار الحق (۱۷) مسنون دعائیں۔

مسودات یعنی غیر مطبوعہ کتابیں دس ہیں:

(۱) سننِ ابن ماجہ کا ترجمہ وشرح (۲) تخریج تحقیق الکلام (۳) نواب صدیق حسن خاں کے فتاویٰ کی تخریج وتعلیق (۴) علامہ احسان الٰہی ظہیر کی تصنیف الشیعہ والقرآن کا اردو ترجمہ (۵) امام ابن تیمیہ کی تصنیف صحت مذہب اہل المدینہ کا ترجمہ (۶) سورہ المائدہ تک تفسیر قران (۷) اہل حدیث کون (۸) تاریخ انکار حدیث (۹) تکملہ ابکار المنن (۱۰) امام ابن تیمیہ کے رسالہ حقیقت وحدت الوجود کا ترجمہ۔

وہ مسلکی موضوعات پر مضامین بھی لکھتے رہے جو ہفت روزہ ''الاعتصام''، ہفت روزہ ''اہل حدیث''، ہفت روزہ ''تنظیم اہل حدیث'' اور ہفت روزہ اخبار ''الاسلام'' وغیرہ میں شائع ہوئے۔ ان کی زیادہ تر تحریریں حنفیت، شیعیت، قادیانیت اور عیسائیت پر تنقید سے متعلق ہیں۔

انھوں نے غربت کے ماحول میں پرورش پائی اور ہمیشہ اسی حالت میں رہے، لیکن دل کے سخی تھے اور

---

[1] ''شادی کی پہلی دس راتیں'' ایک نامور دیو بندی اہل علم مولانا عبدالغنی طارق لدھیانوی کی ہفوات قلم کا شاخسانہ ہیں۔ یہ صاحب رحیم یار خان میں خواتین کے ایک ''جامعہ'' کے مہتمم ہیں اور جامعہ اشرفیہ لاہور کے فضلا میں سے ہیں۔ تین درجن کے لگ بھگ کتب کے مؤلف ومرتب ہیں۔ یہ کتاب بے حیائی کا نادر مرقع ہے۔ کوئی باحیا اور باغیرت شخص اس کتاب کو اپنی بہو بیٹی کو پڑھوانا پسند نہیں کرے گا۔ اگرچہ وہ عبدالغنی طارق صاحب کا ہم مسلک وہم مشرب ہی کیوں نہ ہو۔ اس کتاب کا ایک جواب راقم السطور نے بھی ''اہل حدیث پر مزید کرم فرمائیاں'' کے عنوان سے تحریر کیا تھا جو الحمد للہ اکابر علما نے بے حد پسند فرمایا، جن میں مولانا یحییٰ گوندلوی بھی شامل تھے، بلکہ انھوں نے مجھے ایک خط بھی لکھا تھا جس میں اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا۔ (عمر فاروق قدوسی)

Marfat.com

مہمان نوازی ان کا وصف تھا۔ مطالعہ وسیع تھا اور ہر بات وضاحت سے با حوالہ بیان کرتے تھے۔ نہایت مخلص، لوگوں کے ہم درد، طلباء کے لیے مشفق اور اہل علم کے قدر دان تھے۔ امام ابن تیمیہ، امام ابن قیم، امام ابن حجر اور امام شوکانی کی تصانیف بالخصوص ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ وہ مناظر بھی تھے، انھوں نے مختلف مسالک و مذاہب کے علما سے مناظرے کیے۔ ذہین، حاضر جواب اور پختہ فکر عالم تھے۔ روپڑی علماے کرام سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، خاص طور پر حافظ عبدالقادر روپڑی سے بہت متاثر تھے۔ تواضع، انکسار، فروتنی اور نرمی ان کا شیوہ تھا۔ ذہن رقابت اور حسد سے پاک تھا۔ عبادت گزار اور صالح عالم دین تھے۔

ان کی پہلی بیوی وفات پا گئی تھیں۔ اس کے بعد دوسری شادی کی۔ دونوں سے اللہ نے اولاد دی۔ اللہ ان کی اولاد کا مستقبل بہتر فرمائے۔ انھیں شوگر کا عارضہ لاحق ہوگیا تھا، اسی مرض سے ۲۶۔ جنوری ۲۰۰۹ء (۲۹۔ محرم ۱۴۳۰ھ) کو پیر کے روز رات کے آٹھ بجے وفات پائی۔ انا للہ انا الیہ راجعون.

''میرے مربی و محسن مولانا محمد یحییٰ گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ'' کے عنوان سے مولانا محمد داؤد ارشد کا مضمون شائع ہوا۔ میں نے ان سطور میں اسی مضمون سے استفادہ کیا ہے۔

(یہ سطور ۲۱۔ نومبر ۲۰۱۳ء میں تحریر کی گئیں۔)

Marfat.com

علی ارشد چودھری

(وفات ۱۷۔فروری ۲۰۰۹ء)

۱۹۷۳ء کے غالباً اکتوبر کا مہینا تھا کہ ایک دن ایک نوجوان میرے اس وقت کے دفتر ادارہ ثقافت اسلامیہ آئے۔ سلام دعا ہوئی اور میں نے ان کو سامنے کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ گورے رنگ میں سرخی کی آمیزش نمایاں۔ بھرا ہوا گول چہرہ، جاذبِ توجہ نقش ونگار۔ پورا قد اور آنکھوں پر نظر کی عینک۔ ننگا سر، شلوار قمیص میں ملبوس۔ بیس اکیس برس کی بھرپور جوانی کا خوب صورت پیکر۔ خیروعافیت کے مختصر الفاظ کے بعد انھوں نے میری کسی کتاب کی کتابت کے بارے میں بات کی۔ میں بات سن کر سمجھا کاتب ہیں اور اسی سلسلے میں یہاں آئے ہیں۔ چناں چہ پوچھا:

آپ کتابت کرتے ہیں؟

جواب دیا: میں کتابت نہیں کرتا، یوں ہی بات کی ہے۔

پوچھا: کہاں سے آئے اور کیا مشاغل ہیں؟

نرم لہجے اور آہستہ کلامی سے جواب دیا: لائل پور کا رہنے والا ہوں اور وہیں سے آیا ہوں۔ کتابیں خریدنے اور پڑھنے کا شوق ہے اور یہی میرا شغل ہے، اور یہی شغل مجھے یہاں کھینچ لایا ہے۔

اس وقت لائل پور کو اسلام کا برقع اوڑھا کر فیصل آباد نہیں بنایا گیا تھا۔ ان کی زبان سے لائل پور کا لفظ سن کر مجھے خوشی ہوئی کہ میرے ہم علاقہ ہیں۔ عرض کیا: میں بھی لائل پوری ہوں اور جڑاں والا کے قریب ایک گاؤں سے تعلق رکھتا ہوں۔

اس کے بعد انھوں نے چند کتابیں خریدیں جو میں نے متعلقہ آدمی سے کہہ کر آدھی قیمت پر دلائیں۔ انھوں نے شکریہ ادا کیا اور چلے گئے۔

یہ نوجوان تھے علی ارشد، جن سے اس اولیں ملاقات کے بعد دوستی کا گہرا رشتہ قائم ہوگیا۔ اب نہ ان کا گھر میرے لیے بیگانہ تھا اور نہ میرا مسکن ان کے لیے اجنبی۔ نہ ایک دوسرے سے کوئی تکلف رہا تھا۔ نہ دوئی کا کوئی تصور..........!

نہایت افسوس ہے آج میں ان صفحات میں اس مخلص ترین دوست کی صف ماتم بچھا رہا ہوں، جس کا

Marfat.com

ذہن کے کسی گوشے میں کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا۔ میں اپنے قارئین کو بھی اس افسوس میں شامل کر رہا ہوں، جن میں سے بیشتر نے کبھی علی ارشد کا نام بھی نہیں سنا ہوگا۔

علی ارشد کے آباواجداد دراصل ضلع انبالہ کے ایک گاؤں ''دھنولا'' کے رہنے والے تھے اور آرائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ تقریباً ایک سو سال قبل آبادکار کی حیثیت سے لائل پور کے قریب ایک گاؤں چک نمبر ۱۱۷ میں سکونت پذیر ہوئے اور پھر انہی کی وجہ سے اس گاؤں کو بھی ''دھنولا'' کہا جانے لگا اور محکمہ مال کے کاغذات میں اس کا نام چک نمبر ۱۱۷ دھنولا لکھا گیا۔ اپنے اصل آبائی وطن میں یہ لوگ اچھی خاصی زمین جائداد کے مالک تھے۔ لائل پور آ کر اس میں مزید اضافہ ہوا۔ تقسیم ملک سے قبل ضلع انبالہ صوبہ پنجاب میں شامل تھا، لیکن تقسیم ملک کے بعد ہندوستان کی حکومت نے اپنی انتظامی اور سیاسی مصلحتوں کی بنا پر مشرقی پنجاب کے تین صوبے بنا دیے۔ ایک صوبہ تو پنجاب ہی رہا۔ دوسرے دو صوبے ہریانہ اور ہماچل پردیش کے ناموں سے موسوم ہوئے۔ ضلع انبالہ کو پنجاب سے نکال کر ہماچل پردیش میں شامل کر دیا گیا۔

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ مشرقی پنجاب میں ''دھنولا'' کے نام کے دو گاؤں تھے، ایک یہی ضلع انبالہ میں، دوسرا ریاست پٹیالہ کے ضلع برنالا میں، جسے ریاست دھنولا بھی کہا جاتا تھا۔ یعنی اس کا شمار پنجاب کی ریاستوں میں ہوتا تھا۔

ہمارے عزیز ترین دوست علی ارشد ۲۹۔ جون ۱۹۵۴ء کو چک نمبر ۱۱۷ دھنولا میں پیدا ہوئے۔ سکول اور کالج میں ایف اے تک تعلیم حاصل کی۔ وہ معروف معنوں میں عالم دین نہ تھے، لیکن ابتدائی عمر میں ہی انھیں مختلف موضوعات کی کتابیں پڑھنے، خریدنے اور جمع کرنے کا شوق تھا جو زندگی کے آخری دم تک قائم رہا۔ ایک مرتبہ انھوں نے بتایا کہ کسی ذریعے سے انھیں پتا چلا کہ جھنگ شہر کے فلاں شخص کے پاس کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ ہے اور وہ اسے بیچنا چاہتا ہے۔ یہ وہاں پہنچ گئے۔ اس سے ملے لیکن عمر چوں کہ چھوٹی تھی، اس لیے اسے یقین نہیں آیا کہ یہ لڑکا کتابوں سے دلچسپی رکھتا اور خریدنے کا خواہاں ہے۔ بہر حال انھوں نے کتابیں دیکھیں اور اپنی پسند کی کتابیں علیحدہ کر لیں۔ قیمت پوچھی تو ان کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے جو اس نے مانگے تھے، جتنے تھے اتنے کی کتابیں خریدیں اور اس سے کہا کہ جو کتابیں میں نے منتخب کی ہیں، وہ علیحدہ پڑی رہیں، میں دوبارہ آؤں گا اور لے جاؤں گا۔ گھر آئے، کتابیں رکھیں اور پیسے لے کر پھر جھنگ پہنچ گئے۔ اپنی منتخب کتابوں کے علاوہ اور کتابیں بھی خرید لیں۔ وہ شخص نہایت متاثر ہوا اور کہا جتنی جی چاہے کتابیں لے جاؤ، پیسے بعد میں دے دینا۔ بقول ان کے یہ پہلا موقع تھا کہ انھوں نے اپنے شہر سے باہر کسی شخص سے کتابیں خریدیں۔ اس کے بعد تو وہ بے شمار مرتبہ بے شمار مقامات پر گئے اور کتابیں خریدیں۔

Marfat.com

کتابوں کے سرکاری اداروں سے بھی ان کے مراسم تھے اور وہ ان سے کتابیں خریدتے تھے۔ اس سلسلے میں تین چار مرتبہ دہلی بھی گئے اور وہاں سے بوریاں بھر کر کتابیں لائے۔ ایک یا دو مرتبہ بمبئی بھی گئے۔ دہلی جاتے اور آتے وقت وہ رات میرے پاس (لاہور) رہتے تھے۔ ایک دفعہ بتایا کہ وہ بمبئی کے بھنڈی بازار میں ایک دکان پر کتابیں دیکھ رہے تھے کہ وہاں میری کتاب "فقہائے ہند" کی پانچ جلدیں پڑی تھیں جو وہیں کی چھپی ہوئی تھیں۔ انھوں نے دکان دار سے کہا: یہ تو پاکستانی مصنف کی کتاب ہے اور وہیں کی چھپی ہوئی ہے، آپ نے بلا اجازت چھاپ لی ہے۔ دکان دار نے جو ناشر بھی تھا، جواب دیا کہ پاکستانی ناشر بھی تو ہندوستان کی مطبوعہ کتابیں بلا اجازت چھاپ رہے ہیں، ہم نے چھاپ لی ہے تو کیا ہوا۔

جب میرا علی ارشد چودھری سے تعارف ہوا، اس وقت وہ فیصل آباد کے علاقے نیو سول لائن میں رہتے تھے۔ اس زمانے میں دو تین مرتبہ میں ان کے گھر گیا اور کتابیں دیکھیں۔ ان کے پچھواڑے کی گلی میں شاہد حسن کا مکان تھا۔ ان سے بھی اسی زمانے میں تعارف ہوا۔ انھیں بھی کتابیں پڑھنے اور خریدنے کا شوق ہے۔ علی ارشد سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ ایک مرتبہ میں مولانا ارشاد الحق اثری کو بھی شاہد حسن کے مکان پر لے گیا تھا۔ میرے بچپن کے ایک دوست حاجی محمد رفیق زبیدی تھے۔ وہ بھی کتابوں کے رسیا تھے۔ ایک دفعہ میرے ساتھ وہ بھی علی ارشد صاحب کے مکان پر نیو سول لائن گئے تھے اور ان کا کتب خانہ دیکھ کر خوش ہوئے تھے۔

فیصل آباد کے ایک مقام چوک سلطان باہو میں علی ارشد صاحب نے مکان خریدا تھا۔ اس مکان میں وہ تھوڑا عرصہ ہی رہے۔ وہاں بھی ایک مرتبہ میں ان سے ملاقات کے لیے گیا۔ پھر انھوں نے اقصیٰ ٹاؤن میں مکان خرید لیا۔ پہلا مکان کرائے پر دے کر نئے مکان میں منتقل ہو گئے۔ یہ کافی کھلا مکان تھا اور اس کا تہہ خانہ بھی تھا، جسے انھوں نے کتب خانہ بنا لیا تھا۔

میں اس مکان میں بہت دفعہ گیا اور بہت دفعہ وہاں قیام کیا۔ میرے آنے پر وہ بعض دوستوں کو بھی دعوت دے دیتے تھے اور عام طور سے رات گئے تک مجلس جمتی اور مختلف موضوعات زیر بحث آتے۔

جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن کے مرحوم صدر مولانا عبدالقادر ندوی کو بھی کتابیں خریدنے اور پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ میں نے ایک مرتبہ ان سے علی ارشد کا تعارف کرایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور ان کے مکان پر ان کی آمد و رفت رہی۔ علی ارشد بھی کئی مرتبہ ان سے ملنے ماموں کانجن گئے۔ ان کے ساتھ گاؤں اوڈاں والا بھی میرا اور ان کا آنا جانا رہا۔

علی ارشد کھلے دل اور کھلے ہاتھ کے آدمی تھے اور مہمان نواز تھے۔ مہمان کو دیکھ کر خوش ہوتے اور اس کی خدمت کرتے۔ کتابوں کے شائقین اور پڑھے لکھے لوگوں سے بالخصوص ان کے میل جول کا سلسلہ جاری رہتا تھا

Marfat.com

اور ان کا موضوع گفتگو بالعموم یا کوئی کتاب ہوتی تھی یا اس کا مصنف یا کسی قسم کے تاریخی اور علمی واقعات۔ لیکن بندوہ کسی معاملے میں بھی نہ تھے۔ لطائف وظرائف کا سلسلہ بھی چلتا تھا اور وہ اس میں پورا حصہ لیتے تھے۔

ان کا کتب خانہ مختلف موضوعات کی پندرہ ہزار کتابوں پر مشتمل تھا، جس میں بعض نایاب کتابیں بھی تھیں۔ ایک مرتبہ ایک دوست نے بتایا کہ وہ اپنا کتب خانہ فروخت کرنا چاہتے ہیں اور فیصل آباد والا مکان بیچ کر ان کا ارادہ گاؤں منتقل ہوجانے کا ہے۔ وہاں انھوں نے مکان کی تعمیر شروع کرادی ہے۔ میں نے اس دوست سے کہا کہ میری طرف سے انھیں پیغام پہنچایے کہ وہ گاؤں جائیں یا نہ جائیں، یہ ان کی مرضی کا معاملہ ہے، لیکن کتب خانہ فروخت نہ کریں۔ پڑھے لکھے حلقے اور مطالعہ کے شائقین میں ان کے تعارف اور قدرواحترام کا اصل باعث ان کا کتب خانہ ہے۔ اگر اسے فروخت کردیا گیا تو وہ صرف علی ارشد رہ جائیں گے، قدرواحترام کا دائرہ سمٹ جائے گا۔ اس کے بعد مجھے پتا چلا کہ انھوں نے کتب خانے کی فروخت کا پروگرام ختم کردیا ہے اور بعض دوستوں سے کہا ہے کہ بھٹی صاحب نے مجھے کتب خانہ فروخت کرنے سے روک دیا ہے، میں اب اسے فروخت نہیں کروں گا۔

میرے ساتھ ان کے تعلقات بے حد قرب کے تھے۔ میرے بارے میں پہلا مضمون انہی نے لکھا۔ مجھے اس مضمون کا بالکل علم نہ تھا، نہ انھوں نے کبھی اس کا ذکر کیا اور نہ کبھی مجھ سے معلومات لیں۔ جون ۱۹۹۵ء کا ماہنامہ ''تعلیم الاسلام'' (جو ماموں کانجن ضلع فیصل آباد سے میرے مرحوم دوست قاضی محمد اسلم سیف کی ادارت میں شائع ہوتا تھا) بذریعہ ڈاک آیا تو اس میں میرے متعلق پندرہ صفحات کا مضمون شامل تھا۔ یہ مضمون علی ارشد صاحب نے میری کتابوں کی مدد سے لکھا تھا اور ایڈیٹر کے طویل نوٹ کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ افسوس ہے، دونوں اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ کبھی ہم بھی وہیں چلے جائیں گے جہاں وہ گئے ہیں۔

علی ارشد کا مطالعہ وسیع تھا اور وہ تحقیق سے لکھتے تھے، لیکن انھوں نے اس طرف زیادہ توجہ نہیں کی، بس کتابیں خریدنے اور ان کے مطالعہ کو اصل مشغلہ قرار دے لیا اور یہ ان کا بہت اچھا مشغلہ تھا، تاہم میرے کہنے سے انھوں نے چند مضمون لکھے اور ان میں قارئین کو بہت معلومات دیں۔ ایک فیصل آباد کے میر حکیم نورالدین کے بارے میں اور ایک مولانا عبدالواحد کے بارے میں۔ یہ دونوں قدیم دور کے لائل پور کی بہت بڑی شخصیتیں تھیں اور دونوں اہل حدیث تھے، اور اپنے دور کے حالات کے مطابق دونوں کی خدمات کا دائرہ وسیع تھا۔ لیکن نئے دور کے لوگ ان سے زیادہ متعارف نہ تھے۔

جامعہ سلفیہ فیصل آباد کا سنگ بنیاد تین حضرات نے رکھا تھا، میر حکیم نورالدین نے، صوفی عبداللہ نے اور میاں محمد باقر نے...... حکیم صاحب نے ۱۱۔ جون ۱۹۶۰ء کو وفات پائی اور ان پر علی ارشد کا مضمون یکم جنوری

Marfat.com

۱۹۸۸ء کو ہفت روزہ ''اہل حدیث'' (لاہور) میں چھپا۔ میں اس زمانے میں اس اخبار کا اداریہ لکھا کرتا تھا۔ میر حکیم نورالدین لائل پوری پر میں نے بھی مضمون لکھا تھا جو میری ایک کتاب ''کاروان سلف'' میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں علی ارشد کے مضمون کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ یہ کتاب مکتبہ اسلامیہ امین پور بازار، فیصل آباد نے شائع کی۔

مولانا عبدالواحد پر علی ارشد کا مضمون مولانا ممدوح کی زندگی میں جنوری ۱۹۹۳ء کے ماہنامہ ''تعلیم الاسلام'' (ماموں کانجن) میں چھپا۔ مولانا ممدوح اپنے متعلق مضمون پڑھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔ اس کا اظہار انھوں نے ایک خط میں کیا جو میرے نام لکھا۔ مولانا ممدوح نے ۱۸۔ جون ۱۹۹۷ء کو فیصل آباد میں وفات پائی۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے علی ارشد صاحب انتہائی عقیدت مندانہ تعلق رکھتے تھے۔ مولانا کی بعض مجلسوں میں شریک ہونے والے ایک اہل علم ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنی تھے۔ علی ارشد نے ان کے متعلق بھی مضمون لکھا، جس میں ان کے ذاتی حالات اور علمی کوائف کی وضاحت کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ ان کے پُرخلوص تعلقات کی صراحت کی ہے۔

اب علی ارشد کی ایک اور تحریر کے متعلق سنیے!

ہندوستان کے مولانا عبدالماجد دریابادی مشہور دیوبندی عالم دین تھے۔ وہ مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کے مرید اور ان کے حلقۂ بیعت میں شامل تھے۔ قرآن مجید کی انھوں نے دو تفسیریں لکھیں۔ ایک اردو میں، ایک انگریزی میں۔ تفسیروں کے علاوہ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کا ہفت روزہ اخبار ''صدق جدید'' تھا جو لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا۔ وہ مرزائیوں کو کافر نہیں سمجھتے تھے، انھیں مسلمان قرار دیتے تھے۔ کئی سال ہوئے ماہنامہ ''الحق'' (اکوڑہ خٹک) کے صفحات میں اس موضوع پر بحث شروع ہوگئی۔ کسی نے لکھا وہ مرزائیوں کو کافر قرار دیتے تھے، کسی نے لکھا، نہیں قرار دیتے تھے۔ ہمارے مرحوم محقق دوست طالب ہاشمی صاحب نے خود مولانا عبدالماجد دریابادی اور بعض دیگر حضرات کی تحریروں سے ثابت کیا کہ وہ مرزائیوں کو کافر نہیں بلکہ مسلمان قرار دیتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ طالب ہاشمی اور ان کے ہم نوا اس میں حق بجانب تھے، مولانا ممدوح مرزائیوں کو کافر نہیں قرار دیتے تھے۔ اس بحث میں علی ارشد نے بھی حصہ لیا۔ میں نے ''الحق'' کے ایک شمارے میں ان کے یہ دلچسپ الفاظ پڑھے کہ ''جو حضرات یہ فرماتے ہیں کہ مولانا عبدالماجد دریابادی مرزائیوں کو کافر نہیں بلکہ مسلمان سمجھتے تھے، میں بھی اس سلسلے میں ان کا ہاتھ بٹانا چاہتا ہوں۔'' چناں چہ انھوں نے ان کا ''ہاتھ بٹایا'' اور ''صدق جدید'' کے پرانے شماروں سے جو ان کے کتب خانے میں محفوظ تھے، ثابت

Marfat.com

کیا کہ مولانا عبدالماجد دریابادی مرازئیوں کو کافر کہنے سے انکار کرتے تھے، ان کا اصرار تھا کہ وہ مسلمان ہیں۔ یہ دلچسپ بحث کچھ عرصہ جاری رہی۔ پھر بعض دیوبندی حضرات کے کہنے سے بند کردی گئی تھی۔ کیوں کہ اس سے مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کے مرید دیوبندی عالم کے متعلق لوگوں پر برے اثرات مرتب ہوتے تھے۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ علی ارشد کا اصل مشغلہ مطالعۂ کتب تھا، وہ لکھتے بہت کم تھے۔ لیکن جو لکھتے تھے، تحقیق سے لکھتے تھے۔ عام لکھنے والوں کی مدد کرتے تھے اور انھیں بتاتے تھے کہ فلاں چیز فلاں کتاب میں ملے گی۔ وہ کتاب کے مصنف کا نام بھی بتاتے تھے اور کتاب کے مقامِ اشاعت کی اطلاع بھی دیتے تھے۔

اب ان کی بیماری کے بارے میں سنیے!

کئی سال پہلے انھیں شوگر کا عارضہ لاحق ہوا، لیکن انھوں نے اس عارضے کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ میل جول اور مطالعہ وغیرہ کا سلسلہ بہ دستور جاری رکھا۔ پھر کچھ عرصہ قبل ان پر دل کا حملہ ہوا۔ چند روز اسپتال میں رہے، کچھ افاقہ ہوا تو پھر وہی سرگرمیاں عود کر آئیں۔ پرہیز کے بجائے دوستوں کے ہاں آنا جانا ان کے نزدیک زیادہ اہم تھا۔ اگرچہ دوا دارو کا استعمال بھی ساتھ ساتھ چلتا تھا، لیکن اصل اہمیت میل ملاقات کو حاصل رہی۔

۱۱۔جنوری ۲۰۰۹ء کو مکتبہ سلفیہ (لاہور) کی طرف سے حافظ احمد شاکر اور ان کے صاحب زادگان (شاکر برادران) نے لاہور کے ہمدرد سینٹر میں میرے متعلق ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ علی ارشد اس تقریب میں شمولیت کے لیے مولانا ارشاد الحق اثری، مولانا مجاہد الحسینی اور پروفیسر حبیب الرحمٰن کے ساتھ اپنی گاڑی میں لاہور آئے۔ پروگرام سے بہت خوش ہوئے۔ مجھے بھی انھیں دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ اس کے بعد ۹۔فروری کو میں فیصل آباد گیا۔ رات کے کھانے کا انتظام میاں طاہر صاحب نے اپنے مکان پر کیا تھا، جس میں دس گیارہ حضرات کو دعوتِ شرکت دی گئی تھی۔ شب کے ڈیڑھ بجے تک یہ محفل جاری رہی۔ دوسرے دن ۱۰۔فروری کو دس بجے جامعہ سلفیہ کے اساتذہ وطلبا کے اجتماع میں چودھری محمد یاسین ظفر اور حافظ مسعود عالم صاحب نے مجھے کچھ گزارشات پیش کرنے کا حکم دیا۔ اس سے فارغ ہو کر میں محمد رمضان سلفی کے پاس دارالکتب رحمانیہ (امین پور بازار) گیا تو وہاں جو دوست تشریف لائے وہ تھے غازی منصور محمود، علامہ جہاں گیر، پروفیسر سعید احمد چنیوٹی اور حکیم رانا مدثر محمد خاں سمندری۔ علی ارشد صاحب بھی موجود تھے۔ وہاں تقریباً نو بجے رات تک سلسلۂ گفتگو چلتا رہا۔ وہیں انھوں نے ہمیں گرم گرم پکوڑے کھلائے۔ پکوڑوں کے علاوہ دو چار اور چیزیں وہ خود لے کر آئے۔ بہت خوش اور ہشاش بشاش تھے۔ یہ ان سے آخری ملاقات تھی اور وہم گمان میں بھی نہ تھا کہ آج کے بعد ان سے میل ملاقات کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہوجائے گا۔ انھوں نے بار بار

Marfat.com

کہا کہ میں رات ان کے پاس رہوں لیکن مجھے جھنگ روڈ پر شاداب کالونی اپنے عزیزوں کے ہاں جانا اور رات وہیں رہنا تھا۔ چناں چہ دس بجے کے بعد میں فرقان صاحب کے ساتھ اپنی قیام گاہ پر پہنچا۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا جی علی ارشد کے ہاں رات رہنے کو چاہتا تھا، لیکن مجبور تھا اور ان کے ہاں رہنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

۱۱۔ فروری کو لاہور آ گیا۔ یہاں آ کر رات کے نو بجے کے قریب میرا ان سے بات کرنے کو جی چاہا۔ ان کا ٹیلی فون نمبر ۸۷۶۳۴۴ تھا۔ اس نمبر پر ٹیلی فون کیا تو گھنٹی ہو رہی تھی، لیکن کسی نے رسیور نہیں اٹھایا۔ تھوڑی دیر بعد پھر کیا تو پھر وہی معاملہ تھا۔ دوسرے دن کیا تو اب بھی خالی گھنٹی کی آواز آ رہی تھی، لیکن رسیور کوئی نہیں اٹھا رہا تھا۔ اس کے بعد فیصل آباد میں رمضان سلفی کو ٹیلی فون کیا اور علی ارشد کے نمبر کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ نمبر وہی ہے جس پر آپ نے رابطہ کرنے کی کوشش کی، لیکن انھوں نے یہ نمبر کٹوا دیا ہے۔ اب ان سے موبائل پر ملیے۔ موبائل کا نمبر انھوں نے بتایا تو اس پر ملاقات ہوگئی۔ میں نے ان سے کہا موبائل بے شک رکھیے، لیکن گھر کا یہ پہلا نمبر کٹوانا نہیں چاہیے۔ یہ ۱۲۔ فروری کی بات ہے۔ اس کے بعد ان سے بات نہیں ہو سکی۔

۱۷۔ فروری کو دن کے گیارہ بجے کے چند منٹ بعد میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ رسیور اٹھایا تو آواز آئی:
''میں فیصل آباد سے فرقان بول رہا ہوں۔ علی ارشد وفات پا گئے ہیں۔''

فرقان کی آواز غم میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے تین مرتبہ پوچھا: ''کیا کہا آپ نے؟''

انھوں نے تینوں مرتبہ ایک ہی جواب دیا: ''علی ارشد وفات پا گئے ہیں۔''

میرے لیے یہ نہایت غم ناک خبر تھی، جسے سنتے ہی کم وبیش ۳۸ برس میں پھیلے ہوئے مراسم متشکل ہو کر نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔ ان کے ساتھ بے شمار مرتبہ ان کی گاڑی پر مختلف مقامات پر سفر کیے تھے۔ میں جب فیصل آباد جاتا تو ان کی گاڑی ہر وقت میرے لیے موجود ہوتی۔ پھر جہاں جی چاہتا، جاتے۔ شہر فیصل آباد میں بھی اور شہر کے باہر بھی۔ یہ تمام سلسلہ ذہن میں گردش کرنے اور آنکھوں میں گھومنے لگا۔

میں نے اپنے افراد خانہ کو ان کی وفات کی اطلاع دی تو وہ بھی نہایت افسردہ ہوئے۔

اس سے تھوڑی دیر بعد رمضان سلفی کا ٹیلی فون آ گیا۔ انھوں نے بھی غم زدہ لہجے میں یہی خبر سنائی۔ پھر میاں طاہر صاحب نے فون کیا۔ بعد ازاں پھر فرقان کا فون آیا۔ لاہور سے کتاب سرائے (اردو بازار) سے جمال الدین افغانی نے اطلاع دی۔ گھنٹے پون گھنٹے میں مختلف دوستوں کے دس گیارہ ٹیلی فون یہی غم ناک خبر دینے کو آئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.

Marfat.com

پہلے وفات کی اطلاع کے ٹیلی فون تھے۔ پھر جنازے کے وقت کی اطلاع آنے لگی۔ پتا چلا کہ کل ۱۸۔فروری کو دس بجے جنازہ ان کے گاؤں دھنولا میں ہوگا۔ میت وہاں پہنچا دی گئی ہے۔ پھر فیصل آباد سے ایک دوست کا ٹیلی فون آیا کہ جنازہ آٹھ بجے ہوگا۔ میں غم واندوہ کا بوجھ اٹھائے اپنے نواسے نعمان کو ساتھ لے کر شام کے بعد چھے بجے لاہور سے روانہ ہوا۔ میاں طاہر صاحب کو پہلے اطلاع کردی تھی۔ ہم ساڑھے آٹھ بجے فیصل آباد پہنچے۔ میاں صاحب گاڑی لے کر بس سٹاپ پر آگئے تھے۔ رات میاں صاحب کے ہاں بسر کی۔ پتا چلا کہ جنازہ نو بجے ہوگا۔ ہم نے مولانا ارشاد الحق اثری کو ساتھ لیا۔ علی ارشد کے مکان (اقصیٰ ٹاؤن) سے ان کا گاؤں دواڑھائی میل کے فاصلے پر ہوگا۔ اسے فیصل آباد کا محلّہ ہی کہنا چاہیے۔

جنازہ جنازگاہ میں آچکا تھا۔ میں نے چہرہ دیکھا تو آنکھیں بند تھیں۔ ایسے معلوم ہوا، جیسے سو رہے ہیں۔ میرے دیرینہ دوست مولانا محمد یوسف انور جنازہ پڑھانے لگے تو میرے متعلق فرمایا کہ وہ ان کے دوست ہیں، معلوم نہیں لاہور سے آئے ہیں یا نہیں؟ جن دوستوں کو میری آمد کا علم تھا، انھوں نے جواب دیا: ''آگئے ہیں۔'' اب وہ پیچھے ہٹے۔ فرمایا: ''آگئے ہیں تو وہی جنازہ پڑھائیں۔'' یہ ان کی اس فقیر کے لیے عزت افزائی تھی۔ میں آگے بڑھا اور عرض کیا: ''جنازہ آپ ہی پڑھائیں۔'' چناں چہ انھوں نے جنازہ پڑھایا اور تدفین کے بعد میں نے قبر پر دعا مانگی۔ جن لوگوں کو ہمارے باہمی مراسم کا علم تھا، انھوں نے مجھ سے اظہار افسوس کیا اور میرے بارے میں مرحوم کے تاثرات بیان کیے۔ جنازے کے چار گھنٹے بعد میں اور فرقان وہاں سے ان کی گاڑی پر لاہور کو روانہ ہوئے۔

فیصل آباد سے لاہور تک راستے میں ہم اپنے دوست علی ارشد کی باتیں کرتے رہے۔ فرقان نے بتایا کہ دو چار روز قبل علی ارشد ڈھائی تین ہزار کتابوں کی پہلی قسط اپنے گاؤں لے گئے تھے اور وہ ان کے ساتھ تھے۔ انھوں نے ان کو اپنا گھر بھی دکھایا، جو ان کا مولد تھا۔ جس سکول میں وہ پڑھتے رہے تھے، وہ سکول بھی دکھایا۔ قبرستان بھی دکھایا اور کہا کہ ہم نے بالآخر یہیں آنا ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے، جیسے فرشتہ اجل کی طرف سے ان کے کان میں اپنی موت کی بھنک پڑ چکی تھی۔ فرقان کا بیان ہے کہ انھوں نے ان سے کہا: تم نے میرے جنازے میں ضرور شرکت کرنا ہوگی۔ ان سطور کے راقم کے متعلق بھی وہ ان سے باتیں کرتے رہے۔ جنازے کے بعد ان کے گاؤں کے بعض لوگ مجھے ملے، جن سے اس دن سے قبل میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ علی ارشد آپ کا اکثر تذکرہ کیا کرتے تھے۔

علی ارشد کا اصل ذوق کتابیں خریدنا اور پڑھنا تھا۔ یہی ان کا مقصد حیات اور یہی مطمح نظر تھا۔ ۱۱۔فروری کو جب ان سے آخری ملاقات ہوئی، اس وقت بھی انھوں نے بتایا کہ ۱۵۔فروری کو لاہور فورٹریس سٹیڈیم میں

Marfat.com

کتاب میلہ ہوگا، جس میں ہندوستان کی شائع شدہ کتابیں بھیجوں گی۔ چناں چہ وہ اس کتاب میلے میں اکیلے لاہور آئے۔ ہندوستان کی چھپی ہوئی چند کتابیں خریدیں اور واپس چلے گئے۔ یہ وفات سے دو روز پہلے کی بات ہے۔ یعنی آغاز شعور سے لے کر زندگی کے آخری ایام تک وہ کتابیں خریدتے اور پڑھتے رہے۔ یہ ذوق ان کا ایسا رفیق زندگی تھا جو ایک لمحے کے لیے بھی ان سے جدا نہ ہوا۔

ان کی وفات پر بہت سے لوگوں نے میرے ساتھ اظہار افسوس کیا۔ ملتان سے مولانا محمد یاسین شاد نے ٹیلی فون پر تعزیت کی۔ لیکن اس پر ان کی تسلی نہیں ہوئی تو تیسرے دن ملتان سے خود لاہور آئے۔ وہ جتنی دیر میرے پاس رہے، علی ارشد کی مہمان نوازی، دوست داری، خوش مزاجی، وسیع النظری، کتابی ذوق اور وسعتِ مطالعہ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

ان کے کتب خانے میں تفسیر، حدیث، تاریخ، سیرت، مقالات، ملفوظات، ادب، شعروشاعری، سفرنامے، پرانے اور نئے رسائل وجرائد کے خاص نمبر، سیاسیات، شخصیات، مذہبیات، صحافت، رجال، مکاتیب۔ غرض ہر موضوع کی کتابیں موجود تھیں۔ پنجابی شعروشاعری کا بھی خاصا ذخیرہ ان کے کتب خانے کی زینت تھا۔

غرض کتابیں ان کا بہت بڑا اثاثہ تھا اور اس اثاثے کی وہ بے حد حفاظت کرتے تھے۔ کسی کتاب کا ایک ورق بھی ضائع نہیں ہونے دیتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کا ذخیرۂ کتب صحیح جگہ پہنچ گیا۔ وہ میلسی کی مسعود جھنڈیر لائبریری کا حصہ بن گیا جو مختلف موضوعات کی کئی لاکھ کتابوں پر مشتمل ہے اور کئی ایکڑ میں پھیلا ہوا ہے۔ بے شمار شائقینِ مطالعہ اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ جنڈھیر تحصیل میلسی ضلع وہاڑی میں ہے۔

میرے مخلص تریں دوست علی ارشد کی صف ماتم تازندگی دل کے آنگن اور یادوں کے صحن میں بچھی رہے گی۔

اللھم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه اللھم اکرم نزله ووسع مدخله واخله جنت الفردوس

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا محمد رئیس ندوی

(وفات ۹-مئی ۲۰۰۹ء)

یہ فقیر اپنی مختلف تصانیف میں متعدد مرتبہ عرض کر چکا ہے کہ ہندوستان کے صوبہ یو۔پی کے بعض اضلاع میں بے شمار علمائے دین پیدا ہوئے جنھوں نے بے حساب علمی خدمات سرانجام دیں۔ اب بھی ان اضلاع میں کثیر تعداد میں اہل علم موجود ہیں، جو بے شمار مقامات میں درس و تدریس کی مسندیں بچھائے ہوئے ہیں اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں مشغول ہیں۔ ان اضلاع میں اعظم گڑھ، بستی، مئو ناتھ بھنجن، گونڈہ وغیرہ کے اضلاع خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (بستی کو اب سدھارتھ نگر کہا جاتا ہے) یقیناً ان کے علاوہ بھی بہت سے مقامات ہوں گے جہاں علوم دینیہ کی تعلیم و تدریس کے حلقے قائم ہوں گے اور اصحابِ قلم تصنیف و تالیف کا فریضہ سرانجام دے رہے ہوں گے، لیکن افسوس ہے ہم لوگ ان اطراف کی صورتِ حال سے پوری طرح آگاہ نہیں ہیں۔ ملک کے بٹوارے کے بعد علم بھی تقسیم ہو گیا۔ نہ اُدھر کے لوگ ہماری علمی کوششوں سے کامل واقفیت رکھتے ہیں، نہ ہمیں ان کی کاوشوں کا زیادہ پتا ہے۔

بہر حال یہاں مقصد مولانا محمد رئیس ندوی کے بارے میں چند گزارشات کا اظہار ہے، جنھیں ''رئیس الاحرار'' بھی کہا جاتا تھا۔ انھیں اپنے دور کے ہندوستان میں علومِ حدیث کے امام کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ اُس ملک کے ممتاز مدرس، نامور خطیب، بہت بڑے مصنف اور معروف مفتی تھے۔ وہ ۷- جولائی ۱۹۳۷ء (۲۷۔ ربیع الثانی ۱۳۵۶ھ) کو ضلع بستی کے ایک گاؤں ''بھٹیا'' میں پیدا ہوئے۔ اصلاً ان کا تعلق حنفی المسلک خاندان سے تھا۔ ان کے والدین اَن پڑھ تھے، لیکن اپنے اس بیٹے کو تعلیم سے آراستہ کرنے کی شدید خواہش رکھتے تھے۔ اللہ نے ان کی یہ خواہش پوری کی اور بیٹا علم کی دولت سے بہرہ ور ہوا اور اس کے ساتھ عمل کی سعادت بھی اسے حاصل ہوئی۔

ابتدائی تعلیم خود اپنے گاؤں میں بھی پائی اور اپنے نانا یعنی ننھیال کے گاؤں میں بھی پائی۔ اس طرح مڈل تک سرکاری سکول میں پڑھا۔ پھر دینی تعلیم کے حصول کی طرف متوجہ ہوئے اور ۱۹۵۳ء میں بستی شہر کا قصد کیا اور وہاں کے مدرسہ عالیہ میں داخلہ لیا۔ ۱۹۵۷ء تک وہاں تعلیم حاصل کی۔ پھر لکھنؤ جا کر دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا اور ۱۹۶۰ء میں وہاں کا نصاب مکمل کر کے گھر واپس آئے۔

Marfat.com

ابتدا سے مڈل تک جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، وہ تھے منشی عبدالحمید، منشی معین الحق، پنڈت شہرت اور گوکل۔

ندوہ میں ان کے اساتذہ گرامی تھے۔ مولانا سید عبدالغفار ندوی بلگرامی، مولانا محمود الحسن عثمانی، حافظ مرغوب الرحمٰن، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا اویس ندوی نگرامی، مفتی سید ظہور احمد، سید محمد رابع ندوی، مولانا محمد اسحاق ندوی سندیلوی، مولانا ابوالعرفان ندوی جون پوری، مولانا ابوالفضل عبدالحفیظ بلیاوی ندوی اور بعض دیگر حضرات۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ وہ حنفی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور تعلیم بھی انھوں نے اسی ماحول میں حاصل کی۔ ندوہ میں بھی اس انداز کی مسلکی بحثیں نہیں ہوتی تھیں کہ ان سے متاثر ہو کر کسی خاص فقہی نقطۂ نظر سے وابستگی اختیار کی جائے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اہل حدیثیت کی طرف کیوں کر مائل ہوئے اور یہ مسلک انھوں نے کیوں قبول کیا؟

بات یہ ہے کہ جب وہ ندوہ میں کتبِ حدیث پڑھنے لگے تو انھیں ان مسائل سے آگاہی ہوئی جنھیں اختلافی مسائل کہا جاتا ہے اور جن کا نماز، زکوٰۃ، صدقات وغیرہ بنیادی امور سے تعلق ہے، جن سے توحید نکھر کر سامنے آتی ہے، براہِ راست کتاب وسنت پر عمل کی راہیں کھلتی ہیں، تقلیدی معاملات کی اصل حقیقت واضح ہوتی ہے۔ پتا چلتا ہے کہ کس مسئلے میں نبی ﷺ کے کیا ارشادات ہیں اور امام صاحب کا کیا فرمان ہے۔ پھر عمل کس پر کرنا چاہیے، ارشاداتِ پیغمبر پر یا اقوالِ امام پر......؟

بس یہی فرق انھیں اہل حدیثیت کی طرف لانے کا باعث بنا اور اسی سے اثر پذیر ہو کر انھوں نے اپنی تحقیق اور مطالعہ سے حنفیت سے کنارہ کش ہو کر حدیث کو مدارِ عمل ٹھہرایا۔ پھر وہ اس زاویۂ فکر کے عظیم مبلغ، جلیل المنزلت معلم اور رفیع المرتبت استاد ہوئے۔ اس موضوع پر انھوں نے تقریریں کیں، کتابیں لکھیں، فتوے دیے اور اس کے ہر پہلو کی پوری تحقیق سے صراحت کی۔

ندوہ سے فراغت کے بعد مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ان کو ندوہ کی ایک شاخ میں جو مدرسہ عالیہ کے نام سے بستی (شہر) میں قائم ہے، بہ طور مدرس بھیج دیا۔ وہاں انھوں نے چھ مہینے خدمتِ تدریس انجام دی۔ پھر لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں ندوہ میں ابتدائی جماعتوں کے طلبا کو پڑھانے لگے۔ کچھ عرصہ یہ فریضہ ادا کیا۔

پھر ۱۹۶۱ء میں مولانا عبدالرؤف خاں جھنڈا نگری کے فرمان کے مطابق جامعہ سراج العلوم السلفیہ جھنڈا نگر (نیپال) میں خدمتِ تدریس پر مامور ہوئے۔ یہاں دو سال ان کا قیام رہا۔ اس اثنا میں تدریس کے ساتھ خطباتِ جمعہ، نمازِ فجر کے بعد درس قرآن، اردگرد کے دیہات وقصبات میں پند وموعظت اور تبلیغ دین

Marfat.com

وغیرہ کا سلسلہ بھی ان کے سپرد رہا۔ وہ یہ تمام فرائض حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔

بعد ازاں مدرسہ احمدیہ سلفیہ در بھنگا تشریف لے گئے۔ وہاں تقریباً چھ سال تدریس بھی کی اور وعظ و خطابت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ وہاں سے پندرہ روزہ ''الہدیٰ'' شائع ہوتا تھا، اس میں مضامین لکھتے رہے۔ یہ نہایت محنت طلب کام تھے جو انھوں نے باقاعدگی سے جاری رکھے۔

۱۹۶۶ء کو جامعہ سلفیہ (بنارس) میں تعلیم کا آغاز ہوا۔ ۱۹۶۹ء میں وہاں تدریس کے لیے قاری عبدالحق بانسوی کی تحریک سے مولانا محمد رئیس ندوی کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اس وقت جامعہ میں جو اساتذہ کرام مشغولِ تدریس تھے، ان میں سے چند حضرات یہ تھے: مولانا عبدالوحید رحمانی، مولانا عبدالمعید بنارسی، مولانا محمد ادریس آزاد رحمانی، مولانا مصلح الدین جیراج پوری، مولانا عبدالحمید رحمانی، مولانا عبدالرحمٰن لیثی، مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری، مولانا عظیم اللہ مئوی، ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری، مولانا عبدالحنان فیضی، مولانا عابد حسن رحمانی اور بعض دیگر حضرات۔

مولانا محمد رئیس ندوی باکمال مدرس، ماہر علوم حدیث، بالخصوص فن رجال میں منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ فقہ وفتویٰ میں بھی انھیں امتیاز حاصل تھا۔ جامعہ سلفیہ (بنارس) کے اساتذہ کی جماعت اس وقت ہندوستان کے چوٹی کے اصحاب علم پر مشتمل تھی۔ مولانا محمد رئیس ندوی کی شمولیت سے اس جماعت کی تدریسی شہرت مزید بڑھ گئی۔ ان کا اسلوبِ تدریس خاص اہمیت رکھتا تھا۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور درجاتِ علیا کی دوسری کتابوں کی تدریس انھی کے ذمے تھی۔ جامع ترمذی کا درس بھی یہی دیتے تھے۔ دورانِ تدریس اسناد و رجال، متون کی تفہیم وتوضیح، فقہی مسائل و احکام میں فقہا و محدثین کے درمیان اختلاف کا نہایت عمدہ اسلوب میں تجزیہ فرماتے۔ ہر مسئلہ طلبا کی فکری استعداد کے مطابق زیرِ بحث لاتے اور وہ اس سے خوب استفادہ کرتے۔

مولانا محمد رئیس ندوی ۱۹۶۹ء میں جامعہ سلفیہ سے منسلک ہوئے اور چالیس برس (تادم آخریں) اس سے وابستہ رہے۔ اس طویل عرصے میں ہزاروں نہیں تو سیکڑوں علما وطلبا نے ان سے استفادہ کیا اور ہر طالب علم ان کے منہجِ درس سے متاثر ہوا۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ کسی مدرس نے ایک ہی درس گاہ میں اتنے طویل عرصے تک نہایت دل جمعی سے خدمتِ تدریس انجام دی ہو اور کسی کو اس سے کوئی شکایت نہ ہوئی ہو۔ افسوس ہے یہ فقیر نہ ان کے تلامذہ کی زیادہ تعداد سے آگاہ ہے اور نہ ان کی سرگرمیوں سے واقفیت رکھتا ہے۔ البتہ جن حضرات کے نام مختلف رسائل وجرائد میں پڑھنے کا اتفاق ہوا، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

مولانا صلاح الدین مقبول احمد (کویت)، ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبدالجبار فریوائی (ریاض، سعودی عرب)، جناب محمد عزیر شمس (مکہ مکرمہ)، ڈاکٹر رضاء اللہ مبارک پوری، مولانا عبدالمعید مدنی علی گڑھ، مولانا رضاء اللہ

Marfat.com

عبدالکریم مدنی، مولانا اصغر علی امام مہدی سلفی (ایڈیٹر پندرہ روزہ ''ترجمان'' دہلی و ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیت اہل حدیث، ہند)، مولانا عبدالسلام سلفی، ڈاکٹر وصی اللہ (مکہ مکرمہ)، مولانا محمد الیاس (ریاض، سعودی عرب)، مولانا عبدالسلام سلفی، ذوالفقار ابراہیم اثری (لندن)، مولانا عبدالقیوم بستوی، مولانا عبدالمنان سلفی، مولانا شاہد جنید سلفی، مولانا شہاب اللہ مدنی، مولانا عبدالباری فتح اللہ سلفی (ابوظہبی متحدہ عرب امارات)، مولانا محمد ارشد فہیم الدین، حافظ محمد طاہر سلفی، مولانا عارف جاوید محمدی (کویت)، مولانا اقبال احمد بسکوہری اور مولانا احسن جمیل۔ ان حضرات میں سے یہ فقیر بعض حضرات کو ذاتی طور پر جانتا ہے اور اپنی بعض کتابوں میں ان کے حالات بھی لکھ چکا ہے۔ ایک دو کے سوا یہ سب ہندوستانی ہیں جو بہترین تصنیفی اور تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے برصغیر پاک و ہند کے بعض مشہور علما کی اردو کتابوں کو عربی میں منتقل کیا اور عرب ممالک میں ان کی علمی مساعی کو متعارف کرانے کا ذریعہ بنے۔

جب یہ فقیر ان حضرات کی کتابیں پڑھتا ہے اور ان کی علمی کاوشوں پر غور کرتا ہے تو ذہن میں آتا ہے کہ کاش پاکستان کے اہل علم بھی یہ اعزاز حاصل کریں۔ یہ اردو میں تو لکھتے ہیں اور ہر لکھنے والے کا اپنا انداز ہے جو لائق تحسین ہے۔ لیکن عربی میں لکھنے یا اپنے بزرگوں کی اردو کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی ''رحمۃ للعالمین'' کو (جو تین جلدوں پر مشتمل ہے) عربی کے قالب میں ڈھالنے کا سہرا ایک ہندوستانی عالم کے سر بندھا۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی کی بعض اردو کتابوں کے عربی ترجمے کی طرف بھی ذہن ہندوستانی علما کا منتقل ہوا، جنھوں نے قاضی صاحب کو تو کہاں دیکھنا تھا، مولانا محمد اسماعیل سلفی کی زیارت کا بھی انھیں موقع نہیں ملا۔ لیکن انھوں نے ان بزرگانِ ذی شان کی تصانیف کی اہمیت کا اندازہ کیا اور انھیں عربی میں منتقل کر دیا تاکہ عرب اصحابِ علم بھی ان سے مستفید ہو سکیں اور انھیں پتا چلے کہ برصغیر میں کتنے بڑے اہل علم پیدا ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں کے ناشروں کا یہ حال ہے کہ وہ خود اپنی تاریخ سے متعلق کتابیں چھاپنے سے ہچکچاہٹ کا شکار ہیں کہ یہ گھاٹے کا سودا ہے، اس سے کچھ آمدنی نہیں ہوگی۔ حالاں کہ انھیں آمدنی ہوتی ہے اور وہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن ذہن پر مادیت نے تسلط جما رکھا ہے۔

بات مولانا محمد رئیس ندوی سے متعلق ہو رہی تھی۔ مولانا مرحوم و مغفور نے جہاں درس و تدریس، وعظ و خطابت اور فتویٰ نویسی میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے وہاں تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی بڑی شہرت پائی۔ مختلف موضوعات پر قلم کو حرکت دی اور بہت سی اہم کتابیں ضبطِ تحریر میں آئیں، ان میں بعض مطبوعہ ہیں اور بعض غیر مطبوعہ۔ تفصیل آگے آ رہی ہے۔

ان مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کے علاوہ بہت سے مجلّات و رسائل میں شائع شدہ مضامین و مقالات:

Marfat.com

مولانا کا کنگِ قلم اللہ کے فضل سے ہمیشہ تیزی کے ساتھ چلتا رہا اور قارئین ہر قسم کا تحقیقی مواد فراوانی کے ساتھ ان سے حاصل کرتے رہے۔

ان کا ایک بہت بڑا وصف یہ تھا کہ وہ طلبا کے نہایت ہم درد اور خیر خواہ تھے۔ وہ ان پر سختی بھی کرتے تھے اور نرمی بھی۔ سختی میں بھی خیر خواہی کا عنصر پایا جاتا تھا اور نرمی میں بھی یہی جذبہ کار فرما تھا۔ وہ پوری تحقیق سے طلبا کو پڑھاتے اور ان میں تحقیقی ذوق پیدا کرنے کے خواہاں رہتے تھے۔

ان کی زندگی کا آغاز طلبِ علم سے ہوا اور اختتام بھی اسی پُر رونق فضا میں ہوا۔ انھیں کئی سالوں سے دل کا عارضہ لاحق تھا اور وہ صاحبِ فراش تھے، لیکن اس کے باوجود قلم وقرطاس سے ان کا رابطہ قائم تھا۔ وہ جامعہ سلفیہ (بنارس) سے وابستہ تھے اور جامعہ ہی میں قیام فرما تھے۔ یہیں ۹۔ مئی ۲۰۰۹ء (۱۴۔ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ) کو ان کا انتقال ہوا۔ اور ان کی میت بنارس سے ان کے گاؤں بھٹیا پہنچائی گئی۔ پھر ۱۰۔ مئی (۱۵ جمادی الاولیٰ) کو انھیں دفن کیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ❶

مولانا مرحوم کے ایک ہی صاحب زادے ہیں مولانا عبدالحق۔ یہ جامعہ سلفیہ بنارس کے فارغ التحصیل ہیں اور خدمتِ تدریس انجام دے رہے ہیں۔

اب مولانا محمد رئیس سلفی ندوی کے بارے میں ایک اور مضمون پڑھیے: یہ ہندوستان کے ایک خوش اطوار محقق اور متعدد عربی و اردو کتابوں کے مصنف و مترجم جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن فریوائی کا مضمون ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا تذکرہ اس فقیر نے اپنی کتاب ''گلستانِ حدیث'' میں کیا ہے۔ وہ ۱۹۵۱ء میں موضع پریوا ضلع پرتاپ گڑھ (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ اپنے ملک ہندوستان کے مختلف مدارس سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدینہ یونیورسٹی پہنچے اور اس کا نصاب مکمل کیا۔ پھر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور ریاض (سعودی عرب) کی جامعہ امام محمد بن سعود اسلامیہ میں بہ طور استاذِ حدیث خدمات سرانجام دینے لگے۔ اس فقیر سے وہ نہایت مخلصانہ مراسم رکھتے ہیں۔ مدینہ یونیورسٹی جانے سے قبل انھیں جامعہ سلفیہ بنارس میں مولانا محمد رئیس سلفی ندوی کے حلقۂ تلمذ میں شمولیت کی سعادت حاصل ہوئی۔ اپنے اس عالی قدر استاذ کے طریق تدریس اور فراوانی علم و تحقیق سے وہ بہت متاثر ہیں۔ اس تاثر کا اظہار انھوں نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے جو ''معلمِ دوراں،

---

❶ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

☆...... ماہنامہ ''السراج'' جھنڈا نگر (نیپال) دسمبر ۲۰۰۹ء، (از مولانا مطیع اللہ مدنی)

☆...... پندرہ روز ''ترجمان'' دہلی ۱۶ تا ۳۱ جولائی ۲۰۰۹ء (از مولانا عبدالمعید مدنی علی گڑھ)

☆...... پندرہ روزہ ''ترجمان'' دہلی، یکم تا ۱۵ ستمبر ۲۰۰۹ (از مولانا حافظ مہر الیاس (ریاض سعودی عرب)

☆...... سوانح علامہ محمد رئیس ندوی صفحہ ۱۶ تا ۲۱ (از مولانا عبدالحق بن مولانا محمد رئیس ندوی)

Marfat.com

رئیس العلماء الاحرار مولانا محمد رئیس سلفی ندوی رحمہ اللہ، حیات و خدمات'' کے عنوان سے ہفت روزہ ''الاعتصام'' کی ۱۴ تا ۲۰۔ ستمبر، ۲۱ تا ۲۷۔ ستمبر، ۲۸ تا ۴ ۔ اکتوبر ۲۰۱۲ء کی تین قسطوں میں شائع ہوا۔ اس طویل مضمون میں فاضل مضمون نگار نے خوش خصال استاذ کے تمام اوصاف کی خوب صورت اسلوب میں وضاحت کی ہے۔ یہ مضمون استاذ سے متعلق لکھنے والے ہر شاگرد کے لیے راہِ نگارش متعین کرتا ہے۔ آیئے اس کتاب میں اس مضمون کے بعض حصوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔

ہندوستان کی مشہور درس گاہ جامعہ سلفیہ، بنارس کے شیخ الحدیث، مفتی اور برصغیر کے مشہور محقق عالم دین مولانا محمد رئیس ندوی سلفی کا طویل علالت کے بعد بروز سنیچر (۹- مئی ۲۰۰۹ء مطابق ۱۴۔ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ) شہر بنارس کے ایک اسپتال میں رات کے گیارہ بجے انتقال ہوگیا۔ انا للہ و انا الیه راجعون.

آپ کی وفات حسرت آیات سے علمی حلقے میں جو خلا پیدا ہوگیا ہے، ہم اللہ رب العزت سے دعا گو ہیں کہ وہ اس کو پورا کرے، و ما ذلك علی الله بعزیز .

مولانا کی وفات سے ہر وہ شخص غم واندوہ کا شکار ہے جو آپ کی گوناگوں علمی و دینی خدمات اور تصنیف و تالیف، مناظرہ اور خطابت کے ذریعے نصف صدی سے زیادہ کی زندگی سے ذرا بھی واقفیت رکھتا ہے۔ مولانا عوامی سطح کے عالم نہ تھے، نہ ان کے اردگرد لوگوں کی بھیڑ بھاڑ رہتی تھی۔ آپ کی زندگی کا خلاصہ یہ ہے کہ دینی اور عربی مدارس میں تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے پوری زندگی پڑھنے پڑھانے، لکھنے لکھانے اور دعوت و تبلیغ میں گزار دی۔

مولانا اپنی علمی و تحقیقی تصنیفات کے ذریعے مرجع کی حیثیت اختیار کر چکے تھے بلکہ اسلامی علوم میں مہارت کی وجہ سے آپ چلتا پھرتا دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) تھے، چنانچہ تقریر و تحریر اور درس و تدریس میں انسائیکلو پیڈیائی انداز ان پر غالب رہتا تھا۔

راقم الحروف ابتدائی عربی کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے شوال ۱۳۸۴ھ (مارچ ۱۹۶۵ء) کے پہلے ہفتے میں اپنے گاؤں پریوا (ضلع پرتاپ گڑھ) سے مدرسہ سعیدیہ، محلّہ دارانگر (بنارس) آیا تو جامعہ رحمانیہ مدن پورہ (بنارس) کے اساتذہ اور طلبہ سے تعارف حاصل ہوا۔ مدن پورہ کا تاجا بیوپاری خاندان اور ان کی مسجد طیب شاہ کے نمازیوں سے بھی تعارف کا موقع ملا۔ ۱۹۶۶ء میں جامعہ رحمانیہ میں عربی کی تیسری جماعت میں داخلہ ہوا تو اس وقت بعض علما کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں اور مختلف اسلامی جرائد و مجلّات کی ورق گردانی اور دینی اجتماعات میں شرکت کی وجہ سے مزید اہل علم کے ناموں سے واقفیت ہوئی۔

۱۹۶۶ء اور ۱۹۶۷ء کے دو تعلیمی سال اس طرح گزرے کہ محلّہ ریوڑی تالاب میں جامعہ سلفیہ (مرکزی

Marfat.com

دار العلوم بنارس) کی عمارت بن رہی تھی اور پہلے ہی سال یعنی ۱۹۶۶ء میں ایک بڑے افتتاحی اجلاس کے بعد جامعہ سلفیہ میں تعلیم کا آغاز ہوا اور جامعہ رحمانیہ کے اساتذہ مولانا عبدالوحید رحمانی، مولانا محمد ادریس آزاد رحمانی اور مولانا محمد عابد حسن رحمانی رحمۃ اللہ علیہم جامعہ سلفیہ منتقل ہو گئے۔ ۱۹۶۷ء میں جامعہ احمدیہ سلفیہ دربھنگہ (بہار) سے شیخ الحدیث مولانا شمس الحق بہاری بھی جامعہ سلفیہ میں تدریسی خدمات انجام دینے آ گئے۔ ۱۹۶۸ء میں جب ہم لوگ عالمیت سال اول میں داخل ہوئے تو مذکورہ بالا اساتذہ کرام کے عملے میں ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ کا اضافہ ہوا۔ غالباً اسی سال یا اس کے آگے پیچھے شیخ الحدیث مولانا عظیم اللہ مئوی رحمہ اللہ اور ۱۹۶۹ء میں مولانا محمد رئیس ندوی بھی تشریف لائے۔ ان فاضل اساتذہ کی موجودگی میں رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ مولانا محمد رئیس الاحرار ندوی صرف ایک مدرس ہی نہیں بلکہ تصنیف و تالیف اور خطابت وصحافت کی دنیا میں بھی آپ کی شہرت ہے۔ پھر جب انجمن ندوۃ الطلبہ اور جامعہ سلفیہ کی لائبریری میں جریدہ ترجمان، اہل حدیث اور الہدیٰ (دربھنگہ) کی پرانی فائلیں الٹیں تو پتا چلا کہ علمی وتحقیقی سلسلہ وار مقالات کے لکھنے والے مولانا رئیس الاحرار ندوی یہ وہی مولانا صاحب ہیں جو اس وقت جامعہ سلفیہ میں فروکش ہیں۔ یہ ہے ابتدائی نقش جو مولانا کے بارے میں ذہن میں قائم ہوا۔

۱۹۶۸ء میں جامعہ سلفیہ سے عربی مجلّہ صوت الجامعہ کی اشاعت شروع ہوئی، جس کے ایڈیٹر ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری تھے، اور اردو مجلّہ بھی استاذ محترم مولانا محمد ادریس آزاد رحمانی املوی رحمہ اللہ کی ادارت میں ''صوت الجامعہ'' کے نام سے شروع ہوا، جو ''محدث'' کے نام سے اب تک شائع ہو رہا ہے۔ صوت الجامعہ (اردو) کے ابتدائی شماروں میں مولانا محمد رئیس رحمہ اللہ کے مضامین ہجری مہینوں کے تعارف کے عنوان سے چھپنے شروع ہوئے۔ پھر مسند تدریس وافتا پر اور طلبہ کی انجمنوں کی صدارت میں ندوی صاحب سے استفادے کا موقع ملا۔ ہم طلبہ کا اس پر اتفاق تھا کہ واقعی مولانا علوم وفنون کے ماہر ہیں، بلا کا استحضار ہے، اسی بنا پر مختلف مناسبتوں سے بہ کثرت مولانا سے استفادے کے لیے لوگ رجوع کرتے اور آپ کے افادات سے اطمینان حاصل کرتے۔

آج کی مجلس میں مولانا کی زندگی سے متعلق حافظے میں موجود معلومات اور مشاہدات کو قلم بند کیا جا رہا ہے۔ یہ تحریر ایک شاگرد کی طرف سے استاذ کی موت پر ان کے چاہنے والوں کے لیے ان شاء اللہ مہمیز کا کام دے گی اور اس طرح سے مولانا کی زندگی کے مفید گوشوں سے پردہ اٹھے گا اور آپ کی زندگی کے روشن پہلوؤں سے علما وطلبا کو فائدہ اٹھانے کا موقع ملے گا، ان شاء اللہ۔

ولادت اور ابتدائی تعلیم وتربیت:

مولانا محمد رئیس ندوی بن سخاوت علی صوبہ یو۔پی کے ضلع سدھارتھ نگر کے ایک گاؤں بھٹیا، مروٹیا بازار

Marfat.com

ضلع بستی (موجودہ سدھارتھ نگر) میں ۷- جولائی ۱۹۳۷ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر جونیئر ہائی اسکول تک گاؤں ہی میں رہے۔ اس کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء کی ایک شاخ مدرسہ بدریہ پکا بازار ضلع بستی میں رہ کر ہائی اسکول کا پرائیویٹ امتحان دیا، مدرسے میں دینی عربی و فارسی تعلیم اس کے نصاب کے مطابق ہوتی رہی۔ ۱۹۵۷ء میں لکھنؤ جا کر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا اور ۱۹۶۰ء میں عالمیت کی سند حاصل کی۔

بچپن میں سرکاری اسکول میں تعلیم کی وجہ سے ہندی اور انگریزی زبان سے تعلق قائم ہوا، اردو تو مادری زبان تھی ہی، پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں عربی اور اسلامیات کی تا فراغت تعلیم حاصل کی، اسی لیے ندوی کا لاحقہ نام کے ساتھ مدارس کے عرف عام کی وجہ سے ہوا۔

اساتذہ کرام:

ابتدائی تعلیم سے فراغت تک درجنوں اساتذہ سے یقیناً پڑھا اور استفادہ کیا ہوگا، لیکن چند مشاہیر اساتذہ یہ ہیں:

۱- منشی معین الحق ۲- منشی عبدالمجید

۳- منشی رضا

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ مندرجہ ذیل ہیں:

۴- مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: ان سے آپ نے حدیث کی سند اجازہ حاصل کی جو مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری کے ذریعہ حضرت میاں سید نذیر حسین تک پہنچتی ہے۔

۵- مولانا عباس ندوی ۶- مولانا عبدالغفار ندوی

۷- مولانا محمود الحسن عثمانی ۸- مولانا رابع حسن ندوی

۹- مولانا اسباط صاحب ۱۰- مولانا مفتی ظہور صاحب

مولانا علی میاں کی محبت اور ہمت افزائی سے مولانا محمد رئیس صاحب نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیمی سلسلہ جاری رکھا اور شوقِ مطالعہ کی بنا پر وہابیت اور ترک تقلید کے جرم کے علی الرغم بعض لوگوں کے منظور نظر بھی رہے۔

مشرف بہ اہل حدیث ہونے کا قصہ:

مذہب حق قبول کرنے والوں کی اکثریت کے بارے میں عام طور پر کم ہی لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہدایت کا راستہ کس طرح طے کیا اور مذہب و مسلک کی تبدیلی کے کیا عوامل و اسباب تھے، جن کی وجہ سے ان کے یہاں تبدیلی آئی۔ ماضی میں بہت سارے علما کے تذکرے میں تبدیلی مسلک کے اسباب کا

Marfat.com

ذکر ملتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ اپنے عہد کے فاضل اجل، ادیب شہیر، ممتاز محقق، صاحب نظر و بصیرت عالم اور اپنے وقت کے امام تھے۔ انھوں نے اپنی تعلیم اور مذہبی زندگی پر اپنی خودنوشت سوانح حیات (آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی) میں روشنی ڈالی ہے۔ مولانا نے غالی بدعتی اور سخت مقلد حنفی عالم (جن کی اہل حدیث دشمنی بڑی مشہور و معروف تھی) کے گھر میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی۔ والد کے تلامذہ اور متوسلین (ظاہر بات ہے کہ وہ آپ کے والد کے عقائد و مزاج سے ہٹ کر نہ ہوں گے) سے کسب فیض کیا اور اللہ کے فضل و کرم سے ذاتی مطالعے نے ان کو صحیح علم و عقیدہ تک پہنچایا۔ ایسے ہی اور بہت سارے واقعات ہیں۔

ہندوستان میں مسلک اہل حدیث کی ترقی کے دو خاص سبب ہیں:

۱- فقہ حنفی کے علما اور متوسلین جن کو موجودہ دور کی اصطلاح میں دیوبندی یا بریلوی کہا جاتا ہے، کا فقہی جمود اور تصلب۔

۲- علمائے اسلام کے اس جمود و تصلب پر تنقیدات و تبصرے۔

مولانا محمد رئیس ندوی گاؤں سے آکر ندوہ میں پڑھ رہے تھے، رفتہ رفتہ مطالعے کا شوق ہوا، ندوہ کی لائبریری سے ربط قائم ہوا اور اہل حدیث محقق علما کی شروحِ حدیث اور دوسری مؤلفات جیسے تحفۃ الأحوذی فی شرح سنن الترمذی، تالیف محدث عبدالرحمٰن مبارک پوری، عون المعبود فی شرح سنن ابی داود، تالیف محدث شمس الحق عظیم آبادی اور مؤلفات ائمہ محققین جیسے شیخ الاسلام ابن تیمیہ، حافظ ابن القیم، حافظ ابن کثیر، حافظ ذہبی، ابن حزم اور نواب صدیق حسن وغیرہ کا مطالعہ کرتے گئے اور حق واضح ہوتا گیا۔ خصوصاً بعض اساتذہ کی راہنمائی سے نواب صدیق حسن اور مولانا عبدالحی لکھنوی کی کتابوں کا تقابلی مطالعہ کیا، جس سے یقین و اذعان کے ساتھ مسلک سلف کے متبع ہو گئے۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں تقلید کو تین طلاق غیر رجعی دے دی، لیکن یہ روش ندوہ کے بورڈنگ اور کلاس کے ساتھیوں کو پسند نہ آئی تو انھوں نے استہزاء و تمسخر کے ساتھ تشدد کا راستہ اختیار کیا۔ حسن اتفاق یہ کہ مولانا اپنی طالب علمانہ سعادت مندی اور شوق مطالعہ کے باعث مولانا علی میاں ندوی کے یہاں متعارف تھے۔ جس وقت مولانا کے تقلیدی مذہب کے ترک کر دینے اور شاہراہ کتاب و سنت پر چلنے کی خبر پر بعض لوگوں کا ناگوار موقف سامنے آیا، مولانا علی میاں لکھنؤ سے باہر کسی سفر پر تھے، بہ ظاہر سفر لمبا تھا لیکن ہوا یہ کہ مولانا جلد ہی ندوہ واپس آگئے اور جب آپ کو اس واقعے کا علم ہوا تو آپ نے ندوی صاحب کی تائید کی اور طلبہ کی سرزنش کی۔ اس طرح محمد رئیس صاحب کو کچھ راحت ملی اور ذہنی کوفت میں کچھ کمی ہوئی۔ ڈاکٹر مسعود خاں ندوی بھوپالی ندوی صاحب کے ساتھی اور ایک ساتھ بورڈنگ میں رہنے

Marfat.com

والے طلبہ میں تھے۔ ۱۴۰۸ھ میں شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کی حیات وخدمات پر عالمی سیمینار کے موقع پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسران کے ساتھ جامعہ سلفیہ (بنارس) آئے، خود ندوہ سے علی میاں اور بعض اساتذہ نے شرکت فرمائی۔ اس موقع پر مسعود صاحب اور مولانا رئیس ندوی صاحب کی پرانی دوستی کے مظاہر دیکھنے میں آئے۔ ہنسی مذاق میں ڈاکٹر مسعود نے بتایا کہ ہم لوگ رئیس ندوی صاحب کا ندوے میں ترک مذہب پر قافیہ تنگ کر چکے تھے۔ یونیورسٹیوں میں پڑھ پڑھا کر ڈاکٹر مسعود ندوی ظاہر بات ہے کہ محض ندوی فارغ التحصیل نہ تھے بلکہ اب ان کے سوچنے سمجھنے کے انداز میں تبدیلی آ چکی تھی۔ یہ یاد رہے کہ ڈاکٹر موصوف نے حافظ ابن کثیر کی حیات وخدمات پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی، ان کا مقالہ علی گڑھ سے کافی دن پہلے شائع ہو چکا ہے، اب موصوف ریٹائرمنٹ لے کر علی گڑھ سے اپنے وطن بھوپال منتقل ہو چکے ہیں۔

بہر حال اوپر ذکر کیے گئے قبول سلفیت اور ترک تقلید کے دونوں سبب سے مولانا محمد رئیس ندوی مشرف بہ اہل حدیث ہوئے، تعصب وتقلید اور عجمی تصوف کے ماحول میں محقق علما کی کتابوں کے مطالعہ نے ندوی صاحب کو احرار علما کا رئیس بنا دیا، ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء.

ندوی صاحب کی زندگی میں مذہبی جمود کے ردعمل اور تحقیقی کتابوں کے مطالعے کے نتیجے میں جو تبدیلی آئی، اس نے آپ کو پوری زندگی اپنی قوم کو جگانے میں گزارنے پر آمادہ کیا۔ ندوی صاحب اس مسئلے میں تنہا نہیں ہیں، قدیم وجدید علما میں اس کی مثالیں ملتیہیں کہ صراط مستقیم کی ہدایت کے بعد ہدایت یافتہ عالم نے اپنی جدوجہد کا رخ اپنی قوم کی اصلاح کی طرف موڑا اور اس طرح اللہ رب العزت نے لوگوں کی ہدایت کا سامان فراہم کیا۔ آگے ہم بعض علما اور دعاۃ کا تذکرہ کریں گے، جنھوں نے اپنے خاندانی اور موروثی عقائد و افکار کو خیر باد کہا اور صحیح عقیدہ اور صحیح مسلک کی اشاعت کے لیے نمایاں جدوجہد کی۔ وجہ یہ ٹھہری کہ یہ علما جب اپنے پرانے ماحول سے نکلے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کو اس بات پر مطمئن کر دیا کہ صحیح مسلک کی عظیم نعمت کو صلاے عام بنانے کی راہ میں اپنا تن من دھن لگا دیں، یہیں سے دینی مدارس کی اہمیت اور تحقیقی کتابوں کی افادیت کا پتا چلتا ہے، آج بعض غیر اہل حدیث طبقوں کی جانب سے یہ آواز اٹھتی ہے کہ اہل حدیث حلقے اختلافی مسائل میں متشددانہ اور جارحانہ اسلوب کو بڑھاوا دے رہے ہیں اور یہ پروپیگنڈا محض اس وجہ سے ہے کہ اصل حقائق کو چھپایا جائے۔

یہ واضح رہے کہ عربی دنیا میں علامہ محمد زاہد کوثری اور ان کے تلامذہ کی حقیقت سے پردہ اٹھانے کے لیے کئی علما نے قلم اٹھایا جن میں سب سے اہم شخصیت علامہ عبدالرحمن معلمی یمانی کی ہے، جنھوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد میں کتب حدیث ورجال کی تحقیق میں گزارا۔ بعد میں مکہ مکرمہ

Marfat.com

میں مکتبۃ الحرم المکی میں لکھنے پڑھنے کا کام کیا۔ موصوف نے اپنی عظیم کتاب ''التنکیل بما فی تانیب الکوثری من الاباطیل'' میں محدثین اور ان کے منہج کا دفاع کیا۔ رواۃ حدیث کے بارے میں پھیلائی ہوئی کوثری تلبیسات کا علمی جائزہ لیا اور علامہ محمد عبدالرزاق حمزہ نے ''طلیعۃ التنکیل'' نامی رسالہ لکھا۔ علامہ محمد ناصر الدین البانی نے اپنی کتابوں میں کوثریت کا رد و ابطال کیا اور کوثری کے شاگرد و اخوانی لیڈر اور مختلف کتابوں کے محقق شیخ عبدالفتاح ابوغدہ پر شیخ بکر ابوزید اور علامہ بدیع الدین راشدی نے بھرپور تنقید کی جس سے بالعموم عرب دنیا اور عربی قاری پر محدثین کے خلاف ان جارحانہ تنقیدوں کی اصلیت واضح ہوگئی، لیکن اردو دان طبقے میں جب حدیث اور محدثین کے منہج کے خلاف مواد شائع ہونے لگا، تو اللہ تعالیٰ نے مولانا محمد رئیس ندوی صاحب کو اس کام کے لیے چن لیا اور ندوی صاحب ممدوح نے اپنی عمر عزیز کے بہترین ایام حدیث اور محدثین کے دفاع اور ان کے خلاف پھیلائے ہوئے الزامات واعتراضات کے رد و ابطال میں گزارے۔

مسلک تبدیل کرنے والی بعض شخصیات اور ان کے کارنامے:

☆......اسلامی دنیا کی عالمی حیثیت کی حامل شخصیت ڈاکٹر محمد تقی الدین الہلالی، جنھوں نے پوری زندگی عربی ادب کی خدمت کی اور دنیا بھر میں سلفی دعوت کی اشاعت کی، برصغیر (ہندو پاک) بھی ان کے فیض سے مستفید ہوا۔ محدث عبدالرحمٰن مبارک پوری کا شہرہ سن کر وہ مراکش (مغرب) سے ہندوستان تشریف لے آئے تاکہ ان سے علم حدیث حاصل کریں اور بعد میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں عربی کے استاذ ہوئے۔ آپ کے مشہور تلامذہ میں مولانا ابواللیث ندوی (امیر جماعت اسلامی ہند)، مولانا مسعود عالم ندوی (جنھوں نے مولانا مودودی کی کتابوں کو عربی میں منتقل کر کے مولانا مودودی اور ان کی جماعت کو عرب دنیا میں متعارف کرایا) اور مولانا علی میاں ندوی ہیں، جن کی شہرت محتاج تعارف نہیں۔

ان حضرات کی تربیت میں ہلالی صاحب کی جدوجہد کا بڑا دخل ہے۔ مدینہ یونیورسٹی کے عہد تدریس میں ساری دنیا کے طلبہ نے ان سے کسب فیض کیا اور ہندوستانی علما میں جامعہ سلفیہ کی طرف سے بھیجے گئے طلبہ جنھوں نے مدینہ میں تعلیم حاصل کی، ان میں سے مولانا عبدالحمید رحمانی، مولانا عبدالسلام مدنی، مولانا عبدالرحمٰن لیثی اور ڈاکٹر وصی اللہ عباس، علامہ احسان الٰہی ظہیر، ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن سلفی، ڈاکٹر عبدالعزیز بن مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری وغیرہ ہیں۔

ڈاکٹر رضاء اللہ مبارک پوری نے مراکش جا کر ۱۶، ۱۷ مہینے خصوصی طور پر ان سے استفادہ کیا، وہیں سے ان کی سفارش پر مدینہ یونیورسٹی میں بی اے میں داخلہ لیا، پھر ایم اے اور پی ایچ ڈی بھی جامعہ ہی سے کرنے کے بعد جامعہ سلفیہ میں استاذ ہوئے رحمہ اللہ۔

Marfat.com

یہ ڈاکٹر ہلالی عنفوانِ شباب تک غالی قسم کے تیجانی بدعتی تھے۔ انھوں نے خود اپنا واقعہ لکھا ہے کہ وہ اپنے شیخ طریقت کی موجودگی میں سلا نامی شہر جو کہ مراکش سے ملا ہوا ہے، اور دونوں کے درمیان حد فاصل ایک نہر ہے، ایک تیجانی محفل میں تیجانی مذہب کے مطابق رقص و سرود میں مشغول تھے کہ شیخ طریقت نے ان کو الگ لے جا کر بتایا کہ عزیزم! مذہب اور دین کے نام پر جو تماشے تم کر رہے ہو یہ غلط ہے۔ اس پر ہلالی صاحب کو بڑا تعجب ہوا، تو شیخ طریقت نے کہا کہ میں تو اب بوڑھا ہو چلا ہوں لیکن تم ابھی جوان ہو۔ پھر بتایا کہ اگر حق معلوم کرنا ہے، تو اپنے شہر مکناس کے پاس موجود مشہور شہر فاس چلے جاؤ، وہاں جامع القرویین کے پاس فلاں گلی میں محمد العربی نامی سلفی عالم موجود ہیں ان سے جا کر پوچھو، چنانچہ ہلالی صاحب پر جوش انداز میں جو کہ اہل مغرب کی خصوصیت ہے، ان کے گھر پہنچے۔ شیخ نے اچھا استقبال کیا اور رد و کد کے بعد یہ طے ہوا کہ مناظرے میں جو ہار جائے وہ جیتنے والے کا مذہب قبول کر لے۔ گفتگو کے دوران ایسا بھی موڑ آیا کہ ہلالی صاحب ناراض ہو کر گھر سے باہر جانے کے لیے دروازے پر گئے تو دربان نے باہر جانے سے روک دیا، اس لیے کہ شیخ محمد العربی کی یہ تاکید تھی کہ اس نوجوان کو باہر نہ جانے دیا جائے اس لیے کہ فرانسیسی قوانین کے مطابق رات میں باہر گھومنے والا جیل کی ہوا بھی کھا سکتا ہے۔

چنانچہ دوبارہ مناظرہ شروع ہوا اور اللہ تعالیٰ نے ہلالی صاحب پر رحم فرمایا اور ہلالی صاحب نے شرک و بدعت سے توبہ کر کے مذہب اہل حدیث قبول کر لیا۔ میں نے ہلالی صاحب سے ۱۴۰۰ھ میں بنارس میں کہا کہ میں جامعہ اسلامیہ کے طلبہ کے وفد کے ساتھ مغرب کے مختلف ممالک کے دورے سے واپس آ رہا ہوں اور آپ کے اصحاب و متوسلین اور تلامذہ سے ملاقاتیں رہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ میں آپ کو مغرب (مراکش) میں ڈھونڈتا رہا اور پتا چلا کہ آپ کا چاند تو مشرق (بنارس) میں جا کر طلوع ہوا ہے۔ بتائیں جس وقت آپ نے سلفی دعوت کو قبول کیا تھا مغرب میں سلفیوں کی تعداد کتنی تھی؟ برجستہ کہا: ''وَاحِدٌ وَّ نِصْفٌ'' یعنی پورے ملک میں صرف ڈیڑھ آدمی اہل حدیث تھے۔ آدھے ایک تیجانی شیخ جو اپنے اعتقاد میں صحیح اور اعمال میں غلط تھے اور پورے اہل حدیث شیخ محمد العربی الفاسی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ میں نے ۱۴۰۰ھ میں اپنے سفر مغرب میں اس بات کا اہتمام کیا کہ جس شہر میں بھی جاؤں وہاں کے ہر طبقے سے سلفی دعوت اور ہلالی صاحب کی جدوجہد کے بارے میں معلوم کروں۔ اس وقت ہمیں جو بات بتائی گئی وہ یہ تھی کہ الدار البیضاء (کاسا بلانکا) میں سنیوں یعنی سلفیوں کی تعداد پچیس فی صد ہے اور دوسرے شہروں اور دیہاتوں میں پندرہ فی صد اور یہ ساری تبلیغ ہلالی صاحب اور ان کے شاگردوں کی جدوجہد کی مرہون منت ہے، تقبل اللہ سعیہم۔

Marfat.com

اسی لیے میں نے برصغیر پاک و ہند کے علما کی خدمات حدیث کے تعارف پر مرتب اپنی کتاب ”جھود مخلصة فی خدمة السنة المطھرة“ کے دوسرے ایڈیشن (مطبوعہ جامعہ سلفیہ بنارس) میں ہلالی صاحب کے بارے میں لکھا تھا کہ معاصر علما اور دعاۃ میں ہلالی صاحب سب سے کامیاب داعی ہیں، جن کی جدوجہد کے نتیجے میں مغرب میں بھرپور دعوت توحید کا تعارف ہوا۔ لوگ سنت سے آشنا ہوئے اور دوسرے علاقوں میں بھی آپ کی دعوت کے اثرات بڑے گہرے رہے، نہ کوئی تنظیم تھی، نہ کسی تحریک اور نہ کسی ادارے کی جدوجہد کا اس میں عمل دخل تھا اور نہ کسی حکومتی ادارے کا، جب کہ عہد جدید کی دینی جماعتوں اور تعلیمی اداروں کے اسٹیج کو استعمال کرنے والے دعاۃ و مبلغین نے اصلاح عقائد کے باب میں اتنا گہرا اثر نہیں چھوڑا۔

☆......ڈاکٹر سید شفیق الرحمٰن اور ان کے برادران ڈاکٹر سید طالب الرحمٰن، طیب الرحمٰن، توفیق الرحمٰن اور توصیف الرحمٰن پانچوں بھائی (زیدی برادران) خاندانی بدعتی اور غالی مقلد تھے۔ ننھیال کی طرف سے شیعہ روافض۔ اسی کو کہتے ہیں کریلا اور نیم چڑھا۔ ہوا یہ کہ شفیق الرحمٰن صاحب پڑھنے کے لیے بہاول پور میڈیکل یونیورسٹی گئے۔ وہاں پروفیسر عبداللہ بہاول پوری کے ہوسٹل میں اس شرط پر رہائش مل گئی کہ یہاں خطبہ جمعہ اور بعض دوسرے دینی دروس اور مسجد میں نماز کی ادائیگی کی پابندی کرنی پڑے گی۔ جلد ہی پروفیسر صاحب کے وعظ سے متاثر ہو کر رفض و تشیع اور شرک و بدعت اور تقلید و تعصب کو خیر باد کہہ کر مذہب اہل حدیث قبول کر لیا۔ گھر گئے تو وہاں بھائیوں پر محنت کی، لیکن بات نہ بنی تو اپنے بھائیوں کو لے کر گھر سے بھاگ کر بہاول پور آ گئے۔ اس طرح سے صحیح عالم دین کی تربیت اور صالح ماحول کی وجہ سے ان کے بھائی اہل حدیث ہو گئے اور پھر بعد میں والدین نے بھی عمل و بدعت اور تقلید چھوڑ کر دعوت حق کو قبول کر لیا اور اس وقت یہ سارے بھائی اپنی اپنی صلاحیت و استعداد اور توفیق کے مطابق اپنی قوم کے ناخواندہ اور بدعت اور تقلید و تعصب میں مبتلا لوگوں کو صحیح راستہ بتانے کے لیے بے انتہا کوشش کر رہے ہیں۔

☆......ڈاکٹر شیخ شمس الدین افغانی رحمہ اللہ افغانستان کے مشہور محقق سلفی عالم تھے۔ پہلے یہ غالی حنفی مقلد اور وہابیوں یعنی اہل حدیث کو سخت برا بھلا کہنے والوں اور ان کے بارے میں سخت ترین موقف رکھنے والوں میں سے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جب عقیدۂ توحید اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نعمت سے مالا مال کیا تو یہ بھی سعادت ملی کہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں کلیۃ الحدیث میں داخلہ ہوا۔ وہاں سے بی اے کر کے پھر عقیدے میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں لیں اور ایم اے میں الماتریدیہ کے نام سے تحقیقی کتاب لکھی اور پی ایچ ڈی میں جھود الحنفیہ فی خدمة العقیدة کے عنوان سے تین جلدوں میں بڑی

Marfat.com

لاجواب کتاب لکھی اور ساتھ ہی پشاور میں الجامعۃ الأثریۃ کے نام سے درس گاہ قائم کی اور اس راہ میں خود ان کی غالی حنفی تقلیدی قوم نے ان کو اور ان کی جامعہ کو بار بار اجاڑا اور ان کو سخت تکلیفیں اٹھانا پڑیں۔ مدینہ منورہ میں وہ اپنی فیملی کے ساتھ ہمارے ہی محلے میں رہتے تھے۔ ایک دن ظہر کے بعد مسجد میں ہم دونوں بیٹھے ہوئے تھے تو میں نے پوچھا کہ شیخ شمس سنا ہے آپ وہابیوں کی شدید مخالفت کرتے تھے اور ان کو خنزیر کا لقب دیتے تھے، کیا یہ صحیح ہے؟ میرا ہاتھ پکڑ کر اور ہنس کر کہا کہ شیخ اتنا ہی نہیں بلکہ میں انھیں راہِ ہدایت پانے سے پہلے اس سے بھی زیادہ نجس، پلید اور کم بخت و بد بخت سمجھتا تھا۔ میں نے پوچھا: ذرا اس ''تحویل قبلہ'' کی تاریخ بیان کیجیے۔ تو فرمایا: ہوا یہ کہ ہم اپنے اسی گمراہ کن اور غلیظ خیالات پر تھے اور طالب علمی کی زندگی گزار رہے تھے کہ پاکستان سے ایک دیوبندی عالم آئے میں نے ان سے پوچھا کہ وہابیوں کے بارے میں ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہ صرف آدھے قرآن ہی کو مانتے ہیں، تو آپ بتائیے کہ کیا یہ صحیح ہے کہ وہ آدھے قرآن کو مانتے ہیں اور یہ کہ وہ پورے قرآن کو کیوں نہیں مانتے؟ انھوں نے جواب دیا کہ چونکہ قرآن میں بڑی تکرار ہے اس لیے وہ آدھے قرآن کو مانتے ہیں۔ پھر میں نے پوچھا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ عملاً پورے قرآن کو مانتے ہیں تو اس دیوبندی عالم نے کہا: ہاں یہ صحیح ہے کہ وہ بھی پورے قرآن کو مانتے ہیں۔ شیخ شمس نے کہا کہ اس گفتگو کے بعد اب میں نے وہابی اور اہل حدیث مذہب کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے اور سمجھنے کی کوشش شروع کی تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت دی۔ اس عظیم نعمت اور عظیم دعوت کو اپنی قوم تک پہنچانے کے لیے پوری دل جمعی کے ساتھ لگا ہوا ہوں۔ اگر میری قوم اور دوسری قومیں بھی سلفی دعوت کو صحیح طور پر سمجھ لیں تو ان شاء اللہ قبول حق میں دیر نہیں ہے۔

☆......اس وقت کے تین مشہور اہل حدیث علما کا ذکر ہے جو اپنی دینی و تبلیغی خدمات کی بنا پر عوام و خواص میں مقبول و مشہور ہیں۔

☆......مولانا رضاء اللہ بن عبدالکریم بدایونی مدنی، بریلوی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور وہ بھی بدایوں اور بریلی والی بریلویت۔ بچپن ہی میں مولانا محمد دین دار خاں (رہپوا، شکراوہ) ہریانہ کے دستِ شفقت نے اللہ کے حکم سے رضاء اللہ کو حقیقی ثنا خوان محمد بنا دیا۔ وہ اپنے ساتھ انھیں جامعہ سلفیہ (شکراوہ، میوات، ہریانہ) لے آئے۔ پھر دہلی میں پڑھا۔ اس کے بعد جامعہ سلفیہ (بنارس) میں عالمیت وفضیلت کی ڈگری لی اور پھر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں کلیۃ الحدیث سے بی اے کی ڈگری لے کر ہندوستان واپس آئے اور اپنے ہی علاقہ کے مدرسہ معہد التعلیم الاسلامی رچھا بریلی کو اپنی جدوجہد کا مرکز بنایا اور

Marfat.com

تدریس، تصنیف و تالیف، صحافت، مناظرہ اور تبلیغی دوروں کے ذریعے مسلک سلف کی اشاعت کا کام کیا۔ بعد میں دار الدعوۃ، دہلی سے وابستہ ہوئے۔ پھر مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے آرگن جریدہ ترجمان کی ادارت کی ذمہ داری قبول کی۔ پھر پانچ سال تک نائب ناظم جمعیت اہل حدیث کے عہدے پر کام کیا۔ اپنی دعوتی و تبلیغی اور تصنیفی سرگرمیوں کے ساتھ اس وقت دہلی کے جامعہ سید نذیر حسین میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

☆......مولانا اصغر علی بن امام مہدی سلفی مدنی: صوبہ بہار کے مغربی چمپارن میں واقع برندہ بن نامی گاؤں کے ایک دیوبندی گھرانے سے ان کا تعلق ہے۔ ابتدائی عربی تعلیم کے وقت اپنے علاقہ ہی کے مدرسے اور اہل حدیث اساتذہ سے متاثر ہو کر اہل حدیث ہوئے۔ مطالعہ کے شوق اور مناظراتی اندازِ بحث و تحقیق اور کرید کی عادت نے پڑھتے پڑھاتے اور بحث و تکرار کرتے خاندانی تقلیدی مذہب یعنی دیوبندیت کو چھوڑنے پر مجبور کیا اور اللہ کی توفیق سے مشرف بہ اہل حدیث ہوئے۔ جامعہ اثریہ دار الحدیث (مئو) اور جامعہ سلفیہ (بنارس) سے فراغت کے بعد مدینہ یونیورسٹی میں کلیۃ الحدیث سے بی اے کیا، ہندوستان واپس آ کر جامعہ سلفیہ (بنارس) میں تدریسی فرائض انجام دیے اور اب مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے دینی اور ملی خدمات میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

☆......مولانا سید معراج ربانی مدنی: موصوف کا تعلق اضلاع بستی و گونڈہ (موجودہ ضلع سدھارتھ نگر) کے بریلوی گھرانے سے تھا۔ اہل حدیث مدارس کی تعلیم اور علمائے اہل حدیث کی تبلیغ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو صحیح عقیدہ اور سنت کی نعمت سے بہرہ ور کیا۔ دہلی میں معہد التعلیم الاسلامی، پھر جامعہ اثریہ دار الحدیث مئوناتھ بھنجن سے فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد جامعہ اسلامیہ مدینہ نبویہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک مدت سے سعودی عرب ہی کے اندر مرکز توعیۃ الجالیات (حائل) کے زیر نگرانی دعوت و تبلیغ کا کام بڑی کامیابی سے کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلک سلف کی شرح و تفسیر کی وضاحت میں ان کو بڑی کامیابی دی اور سعودی عرب ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں جہاں بھی اردو ہندی بولنے والے اور مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ موجود ہیں، وہ سب ان کی تقریروں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور شرک و بدعت اور تقلید و جمود کی وادی سے نکل کر نورِ توحید و سنت میں سفر طے کر رہے ہیں، اللهم زد فزد و بارك فيهم جميعا.

ندوی صاحب کی تدریسی خدمات:

۱۹۶۰ء میں ندوہ سے فراغت کے بعد مولانا محمد رئیس ندوی نے سب سے پہلے مدرسہ بدریہ (بستی) میں

Marfat.com

تدریس کے فرائض انجام دیے۔ پھر جامعہ سراج العلوم جھنڈا نگر نیپال میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔ جامعہ کے ناظم مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈا نگری تھے، جو خطیب الاسلام اور خطیب الہند کے لقب سے ملقب تھے۔ برصغیر کے مشہور خطیب، مؤلف اور داعی تھے۔ پھر آپ نے جامعہ سلفیہ احمدیہ دربھنگہ میں تدریس کا کام شروع کیا اور وہاں کے مجلّہ الہدیٰ (جامعہ احمدیہ سلفیہ، دربھنگہ) میں مختلف موضوعات پر طویل مضامین لکھے۔ اس وقت ان کے ساتھ وہاں مولانا عبدالنور عبدالعظیم ندوی بستوی رحمہ اللہ بھی تھے۔

مولانا نے ۱۹۶۷ء سے تاحیات جامعہ سلفیہ میں درس و تدریس، تالیف و ترجمہ، افتاء اور دعوت و ارشاد میں زندگی گزاری۔

یہ تینوں مدارس جماعت اہل حدیث کے مشہور مدارس تھے اور اپنے اپنے علاقے میں بہت بڑی اہمیت کے حامل۔ اس پچاس سالہ تدریسی زندگی میں آپ سے بے شمار علما اور طلبا نے استفادہ کیا۔ ۱۹۶۷ء سے آج تک جامعہ سلفیہ سے استفادہ کرنے والے طلبا کی اکثریت آپ کی شاگرد ہے۔

خلاصہ یہ کہ مولانا محمد رئیس ندوی نے:

☆...... عملی زندگی تدریس، تالیف و ترجمہ اور دعوت وارشاد و افتا کے کاموں میں گزاری۔ ۱۹۶۰ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فراغت کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء کی شاخ مدرسہ بدریہ پکا بازار ضلع بستی میں (جہاں سے ہائی اسکول کا پرائیویٹ امتحان دیا تھا) تدریسی سلسلے کا آغاز کیا۔

☆...... سراج العلوم جھنڈا نگر نیپال میں درس و تدریس کی ذمہ داری نبھانے کے لیے گئے۔

☆...... دارالعلوم احمدیہ سلفیہ دربھنگہ بہار میں تدریسی فرائض انجام دیے۔

☆...... ۱۹۶۹ء میں مرکزی دارالعلوم جامعہ سلفیہ بنارس میں بہ حیثیت استاذ آپ کی تقرری ہوئی اور آپ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اسی کے ہو کر رہ گئے۔

درس قرآن وحدیث اور خطابت:

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی شاخ مدرسہ بدریہ پکا بازار ضلع بستی میں (جہاں سے آپ نے تدریسی سلسلے کا آغاز کیا تھا) قیام کے دوران آپ کا تعلق خاص سید عبدالغفار ندوی سے رہا، جنھوں نے آپ کو یہ موقع فراہم کیا کہ آپ جامع مسجد پکا بازار ضلع بستی میں نماز فجر کے بعد درس قرآن دیں۔ چنانچہ ہوتا یہ تھا کہ جب مولانا عبدالغفار صاحب سالانہ چھٹی پر چلے جاتے تو آپ ان کی جگہ تین مہینے درس قرآن دیا کرتے اور یہ سلسلہ برابر جاری رہا چنانچہ جب آپ جامعہ سراج العلوم جھنڈا نگر نیپال میں تدریسی سلسلے میں آئے تو اپنے اس قیام کے دوران یہ سلسلہ برابر جاری رکھا او آپ کے اس درس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ دور دراز علاقوں سے

Marfat.com

درس سننے کے لیے آیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ جامع مسجد جھنڈانگر نیپال میں خود مولانا عبدالرؤف جھنڈانگری بہ نفس نفیس موجود ہوا کرتے تھے اور آپ کا درس بہ غور سنا کرتے اور درس کے اہم نکات نوٹ کیا کرتے تھے۔

اس درس کا یہ سلسلہ دار العلوم احمدیہ سلفیہ دربھنگہ بہار میں تدریسی فرائض کی انجام دہی کے دوران بھی جاری رہا۔ علاوہ ازیں آپ ایک اچھے خطیب بھی تھے اور زمانۂ طالب علمی سے بہ کثرت جمعہ کی نماز کی امامت وخطابت کا فریضہ انجام دیتے رہے تھے چنانچہ جب تدریسی سلسلے میں جامعہ سراج العلوم جھنڈانگر نیپال میں قیام پذیر ہوئے تو اس دوران آپ جامع مسجد جھنڈانگر نیپال میں برابر جمعے کا خطبہ دیا کرتے اور خطابت و امامت کی ذمہ داری بھی سنبھالے ہوئے تھے۔

ندوی صاحب کی تصانیف:

ذیل میں مولانا محمد رئیس ندوی کی تصانیف کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱- الیہود فی القرآن:...... آپ دار العلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں عالمیت کر رہے تھے۔ عالمیت کے سال ''الیہود فی القرآن'' کے عنوان کے تحت ایک مقالہ تحریر فرمایا جس کی وہاں کے اساتذہ نے بہت تعریف کی اور سید ابو الحسن علی ندوی نے مشورہ دیا کہ آپ یہود پر ایک کتاب لکھیں۔ اس سلسلے میں مراجع کی فراہمی کے لیے انھوں نے وعدہ کیا۔ بلکہ اپنا ذاتی کتب خانہ بھی ان کے حوالے کر دیا، چنانچہ آپ نے بڑی محنت، توجہ، عرق ریزی سے یہ خدمت انجام دی اور چار ضخیم جلدیں مکمل کر لی تھیں اور پانچویں جلد کا آدھے سے زیادہ لکھ چکے تھے کہ ناگہانی طور پر یہ اہم کتاب منصۂ شہود پر آنے سے پہلے ہی مفقود ہوگئی اور اس کا کوئی پتا نہ چلا، جس کے بعد اسے دوبارہ لکھنے کی وہ ہمت نہ کر سکے۔

۲- تاریخ اہل حدیث ہند (مطبوع)

۳- خطبات نغمہ حدیث (مطبوع جامعہ محمدیہ منصورہ، مالیگاؤں)

۴- سیرت آدم علیہ السلام

۵- سیرت ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا (مطبوع جامعہ سلفیہ، بنارس)

۶- اولاد ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا

۷- سیرت علامہ نذیر احمد املوی رحمانی

۸- ابانہ (صفحات: ۳۰۰ سے زائد) مطبوع دربھنگہ

۹- ترجمہ سیرت امام ابن حزم:...... تالیف ڈاکٹر عبدالحلیم عویس (مطبوع، جامعہ سلفیہ، بنارس)

حنفی علما کی کتابوں پر تبصرے اور اختلافی مسائل پر مبحث و تحقیق سے متعلق کتابیں:

Marfat.com

۱۰- الـلـمحات الی ما فی کتاب انوار الباری من الظلمات :......مولانا سید احمد رضا بجنوری نے اپنے استاد مولانا انور شاہ کشمیری کے دروس شرح بخاری کو اردو میں مرتب کیا اور اسے ''انوار الباری'' کے نام سے شائع کرنا شروع کیا۔ اس شرح میں حنفی مذہب کی حقانیت ثابت کرنے کی کوشش میں محدثین کرام اور ان کے مسلک و منہج پر جارحانہ تنقید کی۔ ماضی قریب میں ترکی متعصب حنفی عالم محمد زاہد کوثری کی متعصّبانہ تحریروں سے استفادہ کرتے ہوئے مؤلف موصوف نے برصغیر کے علمی ماحول میں شرح بخاری کی آڑ میں محدثین کے خلاف فضا بنانے کی کوشش کی۔ ان تحریروں کا اصل ہدف یہ تھا کہ محدثین کے خلاف ایسا مواد اکٹھا کیا جائے جس کی مدد سے ان کی نگارشات اور تحقیقات کو مشکوک بنایا جائے۔ اس پروپیگنڈے کی مدد سے حنفی مسلک پر وارد ہونے والے اعتراضات کے اثر کو زائل کیا جائے اور حنفی مسلک کو مجموعی اعتبار سے دین کی صحیح بلکہ صحیح ترین تعبیر قرار دیا جائے۔ مولانا محمد رئیس ندوی نے اس کتاب کے جواب میں سیکڑوں صفحات پر مشتمل محدثین اور ان کے دلائل کے خلاف اٹھائے جانے والے اعتراضات کو سامنے رکھ کر مضبوط دلائل کی روشنی میں یہ عظیم کتاب لکھی جس کے ذریعے سے ہر چھوٹے بڑے ما بہ النزاع مسئلے پر مبسوط تحریر وجود میں آئی۔ ''الـلـمحات'' کی چار ضخیم جلدیں جامعہ سلفیہ سے شائع ہو چکی ہیں اور پانچویں جلد کے تکملے کے ساتھ اب یہ کتاب دوبارہ نئے ٹائپ پر پاکستان سے شائع ہو گئی ہے۔ ان پانچ جلدوں میں جتنے مباحث اور مسائل پر تفصیلی چیزیں موجود ہیں، شاید اردو میں ان موضوعات پر کسی اور کتاب میں موجود نہیں ہوں گی۔

''اللمحات'' کی پہلی جلد ۵۱۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلی بار ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی۔ ابتدا میں علامہ صوفی نذیر احمد کشمیری کا مقدمہ ہے جو ۱۴۔ جون ۱۹۷۸ء کو لکھا گیا۔

دوسری جلد ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی جس کے ۵۱۸ صفحات ہیں۔ کتاب کے شروع میں ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کا مقدمہ ہے۔ ندوی صاحب نے اس جلد کا مقدمہ ۲۲۔ اگست ۱۹۸۲ء کو لکھا۔

تیسری جلد ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی۔ شروع میں ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کا مقدمہ اور مولانا عبدالوہاب حجازی کی ایک نظم ہے۔ یہ جلد ۵۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

چوتھی جلد بھی ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی۔ اس پر بھی مقدمہ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کے قلم سے ہے۔ اس جلد کے ۵۷۶ صفحات ہیں۔ اس جلد میں کتاب ''انوار الباری'' کے مقدمۂ کتاب کے صفحہ ۲۱۱ پر موجود ایک عبارت پر بحث ہے اور آخری (پانچویں) جلد پاکستان سے پہلی بار شائع ہو رہی ہے۔

ندوی صاحب نے اپنے مقدمۂ کتاب میں لکھا ہے:

''انوار الباری کے مقدمے اور متعدد جلدوں کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ شرح صحیح بخاری کے نام

Marfat.com

سے شائع کی جانے والی یہ کتاب صحیح بخاری اور اس کے جلیل القدر مصنف امام بخاری کی تردید و تنقید میں لکھی جا رہی ہے۔ کتاب مذکور کا اصل مقصدِ تصنیف اہل حدیث و مسلک اہل حدیث پر نقد و نظر اور رد و قدح ہونے کے ساتھ اہل الرائے و مذہب اہل الرائے والتقلید کی مدح و تائید ہے۔ اپنی اس مہم میں مصنف انوار الباری اپنے ہم مزاج اہل قلم کے تیار کردہ قدیم و جدید مواد اور لٹریچر سے مدد لے رہے ہیں مگر اس سلسلے میں انھیں سب سے زیادہ مدد موجودہ صدی میں مسخ حقائق کے لیے چلائی گئی تحریک کے روح رواں علامہ زاہد کوثری اور ان کے اثر سے پیدا شدہ کوثری گروپ کی تحریروں سے مل رہی ہے۔''

واضح رہے کہ ماہنامہ القاسم (دیوبند) نے انوار الباری پر بڑا سخت تبصرہ کیا بلکہ ان تحریروں کے بارے میں لکھا کہ اس سے آگے فتنے کی آب یاری ہوگی اور مولانا عامر عثمانی نے ماہنامہ تجلی (دیوبند) میں اس کتاب کے مؤلف کی امانت و دیانت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''ہمیں بڑی ندامت و تکلیف ہو رہی ہے اس بات سے کہ محترم سید صاحب (مصنف انوار الباری) کی طرف خیانت جیسے گھٹیا جرم کا انتساب کریں لیکن اپنی خرابیٔ تقدیر کو کیا کریں، ہمیں یہ برا دن دیکھنا تھا۔ اخلاص و خیانت، تحقیق و بددیانتی، گویا آگ اور پانی جمع ہیں۔ کیسا عجوبہ ہے کہ یہ نقیضین ایک ہی جگہ جمع ہو جائیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم انوار الباری کے کسی بھی مسئلے کے بارے میں اطمینان سے محروم ہو گئے۔ اگر ایک دو جگہ صریح خیانت اور دیدہ و دانستہ حق پوشی کا قطعی ثبوت مل جائے تو سید صاحب ہی بتائیں، باقی سارے دفتر پر کیوں کر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔''

۱۱- اسلام میں نماز جمعہ کا حکم (مطبوع)

۱۲- تحویل قبلہ (مطبوع)

۱۳- رکعات تراویح:...... یہ کتاب چھے طویل قسطوں میں اخبار اہل حدیث (دہلی) بہ اہتمام مولانا سید تقریظ احمد سہسوانی چھپ چکی ہے۔

۱۴- نماز جنازہ اور اس کے مسائل

۱۵- غاية التحقيق في تضحية ايام التشريق (مطبوع)

۱۶- قصہ ایام قربانی کا (مطبوع دہلی)

۱۷- مفقود الخبر شوہر کا شرعی حکم

۱۸- صحت نکاح کے لیے ولی اور کفو کی شرط

Marfat.com

۱۹- کتاب العقیقہ

۲۰- غیر مقلدین کی حقیقت:......مرتبہ مولانا سعید الحق قاسمی پر رد بلیغ۔ یہ کتاب ''ضمیر کا بحران'' کے آخر میں (صفحہ ۳۷۲ تا ۴۶۹) ضمیمے کے طور پر ہے جس کا موضوع ایک دیوبندی حنفی عالم کے اہل حدیث کے بارے میں اٹھائے گئے اعتراضات کا ردّ و ابطال ہے۔ موضوع کی یکسانیت کی بنا پر یہ رسالہ ''ضمیر کے بحران'' کے آخر میں شائع ہوا۔ اس کا سالِ تالیف جنوری ۱۹۹۶ء (مطابق شعبان ۱۴۶۱ھ) ہے۔

۲۱- تنویر الآفاق فی مسئلة الطلاق

۲۲- نبی اکرم ﷺ کا صحیح طریقہ نماز:......مولانا جمیل احمد نذیری نے اس موضوع پر اسی عنوان سے ایک کتاب تصنیف کی جس کا مقصد فقہی مسلک کا دفاع تھا۔ ساتھ ہی اہل حدیث کے خلاف طعن و تشنیع بھی۔ مولانا محمد رئیس ندوی نے اس کتاب میں نذیری صاحب کی تصنیف کا بھرپور جائزہ لے کر صحیح مسلک کی ترجمانی کی۔ یہ کتاب جامعہ سلفیہ سے شائع ہوئی۔ اس وقت ہمارے پاس پاکستانی ایڈیشن ہے جس کے ۷۵۰ صفحات ہیں۔

۲۳- ضمیر کا بحران:......مولانا حافظ محمد یوسف جے پوری رحمہ اللہ نے ۱۳۴۰ھ مطابق (۱۹۲۲ء) میں ''حقیقة الفقہ'' نامی ایک کتاب لکھی جس کے پہلے حصے میں فقہ حنفی کے چھ سو انیس (۶۱۹) ایسے مسائل مذکور ہیں جو قرآن و حدیث یا اجماع صحابہ کے سراسر خلاف اور عقل و قیاس کے غیر معقول نتائج پر مشتمل ہیں اور دوسرے حصے میں فقہ حنفی کے چھ سو سینتیس (۶۳۷) ایسے مسائل درج ہیں جن کے اکثر حصے پر اہل حدیث کا عمل ہے اور جن کی وجہ سے حنفیہ انواع و اقسام کے دل آزار کلمات اہل حدیث کے حق میں استعمال کرتے ہیں۔ ان تمام مسائل کو مع حوالہ، مطبع اور سال طباعت کی نشان دہی کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ ایک بریلوی حنفی عالم نے مولانا جے پوری رحمہ اللہ کے ذکر کردہ مسائل میں سے چالیس مسائل کے حوالوں پر اعتراض کیا اور اس ضمن میں جماعت اہل حدیث کے خلاف زہر افشانی کی جس کا جواب مولانا محمد رئیس ندوی رحمہ اللہ نے اس کتاب میں دیا ہے۔ اس کتاب کی تکمیل ۲۵- دسمبر ۱۹۹۵ء (مطابق ۳ شعبان ۱۴۱۶ھ) کو ہوئی اور اس کا سال اشاعت جنوری ۱۹۹۷ء (مطابق شعبان ۱۴۱۷ھ) ہے۔ ناشر جامعہ سلفیہ (بنارس) ہے۔ اس کتاب کے آخر میں (صفحہ ۳۷۲ سے ۴۶۹ تک) ایک دوسرے رسالے کا جواب دیا گیا ہے جس کا عنوان ہے: ''غیر مقلدین کی حقیقت'' مرتبہ: مولانا سعید الحق قاسمی مئوی۔

۲۴- تصحیح العقائد بابطال شواهد الشواهد:......یہ کتاب ایک غالی بریلوی عالم کی تحریر کے

Marfat.com

جواب میں لکھی جو ان کے سراج العلوم (جھنڈا نگر) کے زمانۂ تدریس میں شائع ہوئی۔ نظر ثانی اور اضافے کے بعد دوبارہ یہ کتاب جامعہ سلفیہ (بنارس) سے شائع ہوئی۔

۲۵- علوی مالکی سے دو دو باتیں:...... حوار مع المالکی تالیف شیخ عبداللہ سلیمان المنیع: یہ تین کتابیں بریلوی فرقے کے رد میں ہیں۔ لیکن ضمیر کا بحران نامی کتاب میں زیر بحث مسائل کی ایک بڑی تعداد ان اختلافی مسائل کی ہے، جس میں دیوبندی اور بریلوی دونوں مکتب فکر اہل حدیث کے مخالف ہیں۔

۲۶- دیوبندی تحفظِ سنت کانفرنس (۲،۳-مئی ۲۰۰۱ء) کے موقع پر شائع کردہ ۲۹ مجموعہ مقالات پر سلفی تحقیقی جائزہ: یہ کتاب پہلی بار ہندوستان میں شائع ہوئی، پھر مکتبہ فضیل بن عیاض (کراچی، پاکستان) سے ۲۰۰۸ء میں ۱۰۲۷ صفحات پر شائع ہوئی۔ یہ کتاب ۲۹ رسائل پر مشتمل ہے جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

☆...... دیوبندی تحفظِ سنت کانفرنس (۱۴۲۲ھ موافق ۲۰۰۱ء) کے خطبۂ صدارت (از مولانا اسعد مدنی) پر سلفی تحقیقی نظر اور انکشافِ حقائق۔ صفحہ ۸۹ تا ۱۱۱۔

☆...... دیوبندی تحفظِ سنت کانفرنس (۱۴۲۲ھ موافق ۲۰۰۱ء) کے خطبۂ استقبالیہ (از مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب، مہتمم دار العلوم دیوبند) پر ہمارا تحقیقی تبصرہ و جائزہ و نقد و نظر۔ (صفحہ ۱۱۳ تا ۱۲۷)

☆......"کشف الغمة بسراج الامة" (تالیف: سید مفتی مہدی حسن شاہ جہان پوری، سابق صدر المدرسین و مفتی دار العلوم دیوبند) پر سلفی تحقیقی جائزہ (صفحہ ۱۲۹ تا ۲۴۱)۔ "کشف الغمة" مولانا محمد ابو القاسم سیف بنارسی (م: ۱۳۶۹ھ) کی کتاب "الجرح علی ابی حنیفة" کے جواب میں لکھی گئی تھی، اس کے جواب میں مولانا محمد رئیس ندوی نے یہ کتاب لکھی۔

☆......"تحقیق مسئلہ رفع الیدین" مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی اعظمی (استاذِ حدیث دار العلوم دیوبند) کی کتاب کا جائزہ (صفحہ ۲۴۳ تا ۲۹۳)

☆......"قراءۃ خلف الامام" (از مفتی مہدی حسن شاہ جہان پوری دیوبندی پر ہمارا تحقیقی جائزہ و سلفی نقد و تبصرہ۔ (صفحہ ۲۹۵ تا ۳۹۲)

☆......"مسائل نماز" فرقۂ دیوبندیہ کا کتاب و سنت کی روشنی میں پوسٹ مارٹم۔ (صفحہ ۳۹۳ تا ۴۶۲)

☆......"امام کے پیچھے مقتدی کی قراءت کا حکم" (از مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی اعظمی) پر سلفی تحقیقی جائزہ۔ (صفحہ ۴۶۳ تا ۵۰۱)

☆......"طلاق ثلاثہ صحیح مآخذ کی روشنی میں" (تالیف مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی اعظمی) کا شرعی جائزہ۔ (صفحہ ۵۰۲ تا ۵۳۸)

Marfat.com

☆...... ''حضرت امام ابوحنیفہ پر ارجاء کی تہمت'' (از مولانا نعمت اللہ اعظمی استاذ دار العلوم دیوبند) پر ہمارا سلفی تحقیقی جائزہ وتبصرہ۔ (از صفحہ ۵۳۹ تا ۵۴۸)

☆...... ''تحقیق مسئلہ رفع الیدین'' (از مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی اعظمی استاذ دار العلوم دیوبند) پر سلفی و تحقیقی جائزہ (صفحہ ۵۴۹ تا ۶۰۰)

☆...... ''آمین بالجہر صحیح بخاری میں پیش کردہ دلائل کی روشنی میں'' (از درسی افادات فخر الدین احمد سابق صدر المدرسین دار العلوم دیوبند وصدر جمعیت العلمائے ہند) کا شرعی پوسٹ مارٹم۔ (صفحہ ۶۰۱ تا ۶۱۹)

☆...... ''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں غیر مقلدین کا نقطۂ نظر'' (از مولانا ابوبکر غازی پوری) پر ہمارا تحقیقی تبصرہ وسلفی جائزہ۔ (صفحہ ۶۲۰ تا ۶۴۷)

☆...... ''شریعت مطہرہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مقام اور غیر مقلدین کا موقف'' (از مولانا عبدالخالق سنبھلی) پر ہمارا تحقیقی تبصرہ ونقد ونظر (صفحہ ۶۴۸ تا ۶۶۲)۔ مولانا محمد رئیس ندوی نے یہ رد ۲۵ اپریل ۲۰۰۲ء میں لکھا۔

☆...... ''شریعت مطہرہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مقام اور غیر مقلدین کا موقف'' (از مولانا عبدالخالق سنبھلی) پر ہمارا تحقیقی وتنقیدی جائزہ وتبصرہ (صفحہ ۶۶۳ تا ۶۹۸)۔ مولانا رئیس ندوی نے یہ رد ۲۲- مئی ۲۰۰۲ء میں لکھا۔

☆...... ''فرض نماز کے بعد دعاء، متعلقات ومسائل'' (از مولانا عبدالحمید نعمانی) پر ہمارا تحقیقی جائزہ و تبصرہ (صفحہ ۶۹۹ تا ۷۳۳)

☆...... ''تین طلاق کا مسئلہ دلائل شرعیہ کی روشنی میں'' (از مولانا مفتی سید سلمان منصور پوری، استاذ مدرسہ شاہی مراد آباد) پر ہمارا تبصرہ و جائزہ ونقد ونظر۔ (صفحہ ۷۳۴ تا ۷۶۲)

☆...... ''تحریک لا مذہبیت، غیر مقلدیت، سلفیت: دورِ حاضر میں افتراق بین المسلمین کی سب سے خطرناک عالم گیر مہم'' (از مولانا مفتی سید محمد سلمان منصور پوری، استاذ مدرسہ شاہی مراد آباد) پر ہمارا تحقیقی و دیوبندیت شکن زور دار تبصرہ۔ (صفحہ ۷۶۳ تا ۷۷۴)

☆...... ''خواتین اسلام کی بہترین مسجد'' (تالیف: مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی اعظمی، استاذِ حدیث دار العلوم دیوبند) پر ہمارا تبصرہ۔ (صفحہ ۷۷۵ تا ۸۰۰)

☆...... ''علم حدیث میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مقام ومرتبہ'' (از مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی اعظمی، استاذِ حدیث دار العلوم دیوبند) پر ہمارا تحقیقی جائزہ اور علمی وتنقیدی تبصرہ۔ (صفحہ ۸۰۱ تا ۸۱۵)

Marfat.com

☆......''قرآن وحدیث کے خلاف غیر مقلدین کے (۵۰) مسائل'' (از مولانا مفتی سید مہدی حسن شاہ جہاں پوری، سابق صدر المدرسین ومفتی دار العلوم دیوبند) پر ہمارا تحقیقی تبصرہ (صفحہ ۸۱۶ تا ۸۱۸)۔ مولانا رئیس ندوی نے اس رسالے کی تالیف، یعنی جون ۲۰۰۲ء سے پانچ سال پہلے ''ضمیر کا بحران'' نامی کتاب میں ان سارے مسائل پر تفصیلی بحث کی ہے جو دراصل حنفیوں کی بریلوی شاخ کی طرف سے شائع شدہ کتاب ''غیر مقلدین کے چالیس فریب'' کا تفصیلی جواب ہے۔

☆......''مسئلہ تقلید قرآن وحدیث اور اقوال علمائے سلف کی روشنی میں'' (از مولانا مفتی محمد راشد اعظم گڑھی، استاذ دار العلوم دیوبند) پر ہمارا تحقیقی وتنقیدی تبصرہ وجائزہ ورد بلیغ۔ (صفحہ ۸۱۹ تا ۸۲۳)

☆......''عورتوں کا طریقۂ نماز'' (از مولانا مفتی ابو القاسم نعمانی بنارسی، شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس) پر ہمارا بھرپور تحقیقی تبصرہ۔ (صفحہ ۸۲۴ تا ۸۳۶)

☆......''فقہ حنفی اقرب الی النصوص ہے'' (از مولانا سعید احمد پالن پوری، استاذِ حدیث دار العلوم دیوبند) پر ہمارا تحقیقی جائزہ وعلمی تبصرہ وتحقیقی بحث ونظر۔ (صفحہ ۸۳۷ تا ۸۵۱)

☆......''توسل واستغاثہ لغیر اللہ اور مقلدین کا مذہب'' (از مولانا مفتی محمد بلند شہری، مفتی دار العلوم دیوبند) کا تحقیقی جائزہ۔ (صفحہ ۸۵۲ تا ۸۷۳)

☆......''اجماع وقیاس کی حجیت قرآن وحدیث اور اقوال سلف کی روشنی میں'' (از مولانا محمد جمیل احمد سکروڈوی، استاذ دار العلوم دیوبند) پر رد بلیغ اور تنقیدی تبصرہ۔ (صفحہ ۸۷۴ تا ۸۷۹)

☆......''غیر مقلد کی توبہ، ایک حنفی اور غیر مقلد کے مابین دلچسپ مباحثہ'' پر تحقیقی وتنقیدی تبصرہ۔ (صفحہ ۸۸۰ تا ۸۹۸)

☆......''مسائل وعقائد میں غیر مقلدین کے متضاد اقوال'' (از مفتی حبیب الرحمٰن خیر آبادی، مفتی دار العلوم دیوبند) پر ہمارا تحقیقی وتنقیدی جائزہ وتبصرہ۔ (صفحہ ۸۹۹ تا ۹۱۹)

☆......''مسائل وعقائد میں غیر مقلدین اور شیعہ مذہب کا توافق'' (از مولانا محمد جمال بلند شہری، استاذ دار العلوم دیوبند) پر ہمارا تحقیقی تبصرہ اور تنقیدی جائزہ۔ (صفحہ ۹۲۰ تا ۹۵۴)

☆......''غیر مقلدین کے ۵۶ اعتراضات کے جوابات'' (از مولانا شبیر احمد قاسمی، استاذِ حدیث مدرسہ شاہی مراد آباد) پر ہمارا تحقیقی تبصرہ۔ (صفحہ ۹۵۵ تا ۱۰۲۷)

۲۷۔ "تراث المسلمین العلمی فی نظر شیخ الاسلام ابن تیمیہ" تالیف: عبدالرحمٰن بن عبدالجبار الفریوائی، اردو ترجمہ از مولانا محمد رئیس ندوی۔ (قلمی)

Marfat.com

۲۸۔ اصولِ حدیث افادات ابن تیمیہ کی روشنی میں:......تالیف: عبدالرحمٰن بن عبدالجبار الفریوائی، اردو ترجمہ ازمولانا محمد رئیس ندوی۔ (قلمی)

ربیع الاول ۱۴۰۸ھ کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ پر سیمینار کے دوسرے دن سعودی عرب سے میری لائبریری جامعہ سلفیہ پہنچی تو مولانا مرحوم نے میرے پی ایچ ڈی کے مقالے ''شیخ الاسلام ابن تیمیہ وجھودہ فی الحدیث و علومہ'' کو منگوا کر پڑھا اور بڑی دعائیں دیں اور کچھ دن کے بعد مجھے اور استاد محترم ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ مولانا رئیس ندوی مرحوم نے ہم لوگوں کی اطلاع کے بغیر کتاب پر بھرپور تقریظ لکھی اور مقالے کی پہلی جلد کے مذکورہ دو ابواب کا ترجمہ بھی کر دیا اور یہ میرے حق میں ایک اعزاز تھا کہ ندوی صاحب نے ہماری ہمت افزائی اس انداز میں فرمائی۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کتابوں کو شائع کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور استاد محترم کو اجر جزیل عطا فرمائے، آمین۔

ندوی صاحب کی تحریروں کا خلاصہ:

مولانا محمد رئیس ندوی صاحب نے درس و تدریس اور افتا، نیز تصنیف و تالیف کے ذریعے اسلامی علوم و فنون کی خدمت کی اور آپ کی اکثر تصانیف کا موضوع اختلافی فروعی اور اصولی مسائل کی تنقیح و تنقید تھا، چنانچہ آپ نے کتاب ''اللمحات'' کے ذریعے دیوبندی فلسفے کا تجزیہ کیا اور محدثین کے منہج کی شرح و ترجمانی فرمائی اور اس پاک و صاف منہج اور اس کے حاملین کے خلاف اٹھنے والے قدیم و جدید اعتراضات کا علمی انداز سیمسکت جواب دیا۔ مسلک سلف کی شرح و وضاحت کی، حدیث و فقہ کے تراجم کو کھنگال کر محدثین کے بارے میں پھیلائی گئی غلط فہمیوں اور بے جا تاویلات کی حقیقت واضح کی۔

مولانا رئیس ندوی صاحب جیسا فاضل محقق، ندوی نسبت کے علی الرغم، ندوی اسلوب دعوت و نگارش کی عدمِ تقلید کی وجہ سے ندوی حلقے میں بھی ہدف تنقید بنے۔

حقیقت یہ ہے کہ حقائق علمیہ و دینیہ کی تحقیق و تدقیق کر کے صحیح نقطۂ نظر کی وضاحت، محدثین کے منہج کی تصویب، مسائل کی تنقیح کر کے مولانا نے جو ممتاز اور مفید حقیقی دینی خدمت انجام دی اس پر ندوی حلقے کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس دینی فریضے کی ادائیگی کا حق ایک ندوی نے ادا کیا۔

ندوی صاحب کی تالیفات کے موضوعات اور ان کا اسلوب نگارش بعض ندوی دوستوں کو پسند نہ آیا۔ اس لیے یہ اسلوب اس حلقے میں عموماً ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ندوی علما کے علمی کاموں کے تعارف میں ندوی صاحب کا ذکر بھی ایک کتاب میں نظر سے گزرا۔ مؤلف موصوف جناب منور سلطان ندوی اپنی کتاب ''ندوۃ العلماء کا فقہی مزاج اور ابنائے ندوہ کی فقہی خدمات'' میں مولانا محمد رئیس ندوی کا تعارف

Marfat.com

کراتے ہوئے ان کی ۱۳ تالیفات کا تذکرہ کرتے ہیں، پھر فرماتے ہیں:

''ان کے علاوہ مختلف موضوعات پر ۱۰ سے زائد کتابیں ہیں۔''

اور آپ کی علمی خدمات پر یوں تبصرہ فرماتے ہیں:

''فقہ سے متعلق مذکورہ کتابوں کے نام سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتابیں اہل حدیث مسلک کے اعتبار سے لکھی گئی ہیں اور بعض حنفی مسلک یا کسی مسئلے کے جواب میں ہیں۔ احناف کے خلاف یا کسی مسئلے کی تردید میں جو تحریری ہیں ان میں آپ نے یہ انداز اختیار کیا ہے کہ پہلے احناف کے دلائل کا جائزہ لیا ہے، پھر ان دلائل اور خصوصاً حدیث کی روایتوں پر ہر اعتبار سے تفصیلی کلام کیا ہے اور سند و متن دونوں اعتبار سے ان روایتوں کو کمزور اور ضعیف ثابت کرنے کے بعد اپنے مسلک کی وضاحت کی ہے اور اپنے مسلک کی تائید میں روایتیں نقل کی ہیں۔ اس طرح آپ کی بعض کتابوں میں فقہ سے زیادہ حدیث کے مباحث ملتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ آپ نے بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ یہ علمی و تحقیقی سرمایہ تیار کیا ہے۔ اگر آپ کی یہ محنت اور جاں فشانی مختلف فیہ مسائل کی توثیق و توضیح اور دوسرے مکاتب فکر پر جارحانہ تنقید کے بجائے نئے مسائل کی تحقیق یا اسلام پر ہونے والے نت نئے اعتراضات کے جواب میں صرف ہوتی تو استفادہ و اِفادہ کے لحاظ سے یہ بدرجہا بہتر ہوتا۔'' (ص: ۳۵۷، ۳۵۸)

اس لمبے اقتباس میں ندوی صاحب کی علمی خدمات کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اختلافی مسائل پر خامہ فرسائی کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے اور جو مشورہ دیا گیا ہے وہ قارئین کے سامنے ہے۔ اس تحریر پر ہم اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ پسند اپنی اپنی، خیال اپنا اپنا۔

اصول اور فروع میں مسلمانوں کے درمیان اختلاف کی تاریخ بڑی طویل ہے۔ ثقہ اور راسخ علما کی ہمیشہ یہ ذمہ داری رہی ہے کہ وہ صحیح عقلی اور نقلی دلائل کی روشنی میں رشد و ہدایت کا کام انجام دیں اور لوگوں کو صحیح بات بتائیں، تاکہ لوگ صراط مستقیم پر چل سکیں۔ مولانا رئیس ندوی نے محققین ائمہ دین کا راستہ اختیار کیا، تاکہ لوگ صحیح کو دلائل کی روشنی میں صحیح کہیں اور غلط کو دلائل کی روشنی میں غلط کہیں، یہی خیر خواہی کا سب سے بڑا عنوان ہے۔ رہا جدید مسائل پر دادِ تحقیق دینا یا اسلام پر اعتراضات کا دفاع تو اس سے کسی نے کسی کو روکا نہیں لیکن اس باب میں موجود لٹریچر کی اکثر تحریروں پر یہ تبصرہ نامناسب نہ ہوگا ''للاسلام نصروا ولا للکفر کسروا'' جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے معتزلہ کے فکر وفن پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

Marfat.com

ندوی صاحب کا طرزِ تالیف:

مولانا محمد رئیس ندوی نے عام طور پر تاریخ وسیرت اور حدیث وفقہ میں اختلافی مسائل پر کتابیں لکھیں جن میں دلائل کی بھرمار کے ساتھ ساتھ تکرار اور طول بیانی پائی جاتی ہے، چونکہ اختلافی مسائل میں وہ ایسے مؤلفین کی تحریروں کا جواب لکھتے تھے جن کا اسلوب جادۂ اعتدال سے ہٹا ہوتا تھا اور تعصب وتقلید کی بنا پر جارحیت اور نازیبا الفاظ کے استعمال کی وجہ سے فریق مخالف کے جواب میں جواب آں غزل کے طور پر مولانا کے نوک قلم پر سخت سست باتیں بھی آجاتی تھیں جس کی وجہ سے مخالفین کا یہ کہنا ہے کہ ان کے لہجے میں بڑی سختی ہے اور یہ بات عملاً صحیح بھی ہے جس کی مثالیں ان کی تحریروں میں ملیں گی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اختلافی مسائل میں لکھنے والے مؤلفین میں مولانا پہلے آدمی ہیں جن کے لب ولہجے کی تیزی اور تلخی کی شکایت کی جارہی ہے یا اس سے پہلے بھی قدیم وجدید لوگوں کے یہاں اس طرح کا اسلوب ملتا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ مولانا نے جن لوگوں کو اپنی تیز وتند تنقید کا نشانہ بنایا وہ کون لوگ ہیں، خود ان کا لب ولہجہ کیا ہے اور علمی اور اختلافی مسائل کی تحقیق میں ان کے کارنامے کیا ہیں؟ کیا یہ حضرات دودھ کے دُھلے ہیں، ان کی تحریریں کوثر وتسنیم سے دُھلی ہوئی ہیں جو ہر حال میں احترام وعزت کے لائق وسزاوار ہیں؟ کیا علمی مسائل کی وضاحت وتنقیح میں ان کا قلم جادۂ اعتدال سے نہیں ہٹتا؟ کیا وہ ثقہ اور سنجیدہ مؤلفین کے اسلوب کی پیروی کرتے ہیں......؟

مولانا نے جن لوگوں کو مخاطب کیا اور جن کی تحریروں کا ردّ وابطال کیا ان کے قلم کی زد سے قابل احترام شخصیات بلکہ ائمہ سلف اور فقہا ومحدثین اور مسلمہ علمی حقائق، جو اہل علم کے یہاں مقبول اور قابل احترام ہیں، بھی بچ نہ سکے۔

غور طلب بات یہ بھی ہے کہ معترضین کے اعتراض میں فی الحقیقت کتنا وزن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا محمد رئیس ندوی کے قلم نے ایسے گستاخوں کی خبر لی ہے جن پر قدغن لگانا اور جن کو دندان شکن جواب دینا ضروری تھا۔ ندوی صاحب نے یہ کام کر کے امت کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے۔

مولانا محمد رئیس ندوی صاحب کے لہجے میں تلخی پائی جاتی ہے، اس کے پیچھے یہی سنت کی حمیت کا جذبہ کام کر رہا تھا، اس لیے کہ انھوں نے تقلید وتعصب کے ماحول میں آنکھ کھولی تھی اور سن رشد تک وہ اسی بھول بھلیوں میں رہے اور جب حدیث رسول ﷺ سے واقفیت ہوئی اور صحابہ وتابعین اور ائمہ دین کی دینی بصیرت سے کسب فیض کا موقع ملا تو حامیِ سنت اور ماحیِ بدعت عالم بن کر اپنی قوم کے لوگوں کو راہِ راست پر

Marfat.com

لانے کی بھرپور کوشش کی اور غیرت دینی سے مجبور ہوکر سخت لہجہ بھی اختیار کیا جس میں وہ معذور ہی نہیں بلکہ ماجور بھی ہوں گے، ان شاء اللہ۔

خوابوں کی تعبیر کا فن اور مولانا ندوی کی اس سے دلچسپی:

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ استاذِ محترم برزخی زندگی میں اس کی رحمت کے زیر سایہ محوِ خواب ہوں اور زندگی بھر دین وعقیدہ اور حدیث اور منہجِ محدثین کا یہ خادم اپنے رب کے خصوصی صلہ و اکرام کا مستحق ہو، اللھم اغفرله و ارحمهٗ رحمة واسعة.

من جملہ دیگر فنون کے تعبیر رؤیا کے فن سے بھی مولانا محمد رئیس ندوی کو لگاؤ تھا اور انھیں اس بارے میں اچھی واقفیت تھی اور پوچھنے پر خوابوں کی تعبیر بتاتے بھی تھے۔ میں نے مولانا کو بتایا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ آم کھا رہا ہوں تو مسکرا کر بولے: جی مولانا! یہ تو بڑا اچھا خواب ہے، آپ کے یہاں ان شاء اللہ اولاد نرینہ پیدا ہوگی۔ الحمد للہ جب گھر میں بچے کی پیدائش ہوئی تو وہ میرا پہلا بچہ عبداللہ تھا۔ یہ ۷۴، ۱۹۷۵ء کا واقعہ ہے۔

اساتذہ، طلبہ اور عام لوگوں سے تعلقات:

مولانا محمد رئیس ندوی کا تعلق اساتذہ اور طلبہ سے بڑا خوش گوار رہتا تھا۔ اس کا صحیح اندازہ ندوی صاحب کے قریب رہنے والوں کو بہت اچھی طرح ہے۔ اسی طرح سے جمعیت اہل حدیث اور دوسرے دینی، ملی اور مسلکی اداروں اور شخصیات سے روابط اور تعاون بھی ان کی شخصیت کا ایک اہم عنوان تھا۔ میں نے دیکھا کہ مولانا ندوی شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری، مولانا عبدالرؤف رحمانی اور مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی کا بڑا احترام کرتے اور ان کا بڑے ادب سے نام لیتے۔ ایک مرتبہ مولانا علی میاں نے پھلواری شریف (پٹنہ) کا سفر کیا اور ندوی صاحب کو اس کی اطلاع دی گئی۔ آپ نے مجھے ساتھ لیا اور بنارس کے ریلوے اسٹیشن پر ریزروڈبے میں ہم دونوں نے مولانا علی میاں کو سلام کیا اور کچھ دیر تک وہ مولانا ندوی سے ہم کلام رہے۔ وہیں پتا چلا کہ مولانا علی میاں بہت ٹھنڈا پانی نوش فرماتے تھے۔ جب پانی پینے کے لیے دیا گیا تو انھوں نے فرمایا: ''ماء یشرب'' مقصد یہ تھا کہ زیادہ ٹھنڈا تو نہیں ہے ہاں بس گزارہ ہو جائے گا۔

مولانا شمس الحق بہاری سے آپ کی بڑی گہری دوستی تھی۔ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری اور شیخ الجامعہ مولانا عبدالوحید صاحب رحمہ اللہ سے آپ کو بڑا اُنس تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جامعہ سلفیہ کے انتظام و انصرام سے متعلق ان دونوں کلیدی شخصیتوں نے ندوی صاحب کی بڑی تکریم کی اور تصنیف و تالیف کے معاوضے کے سلسلے میں میں نے ازہری صاحب کو بڑا چاق وچوبند پایا، تاکہ ندوی صاحب اپنے کاموں میں مشغول رہیں۔ میں اور آپ کے تلامذہ کی ایک تعداد جامعہ سلفیہ اور جامعہ رحمانیہ میں مختلف شعبوں میں کام کرتے رہے اور کر رہے

Marfat.com

ہیں۔ وہ ہم لوگوں سے نہایت مشفقانہ برتاؤ کرتے اور لکھنے پڑھنے کے کاموں میں ہماری حوصلہ افزائی کرتے، مشکل مسئلے کے حل میں مدد فرماتے، بلا تکلف ہماری کھانے پینے کی مجالس میں شرکت فرماتے۔ ہم دونوں جامعہ میں ایک ہی بلڈنگ میں ساتھ رہے، ہر وقت کا تعلق اور ساتھ رہا۔ مولانا میرے ساتھ میرے گاؤں پریوا بھی تشریف لے گئے۔ جب میں نے والد محترم عبدالجبار خاں فریوائی کے نام سے، فریوائی اکادمی کی طرف سے سالانہ ایوارڈ دینا شروع کیا جس کے الحمدللہ اب تک دس سال ہو گئے ہیں۔ مولانا ندوی صاحب کی خدمات کے اعتراف میں تیسرے سال آپ کی خدمت میں یہ ایوارڈ پیش کیا گیا جس میں آپ بیماری کے باوجود شریک ہوئے۔ اس تقریب کے ساتھ عزیزم عبدالمحسن کی شادی کے ولیمے کی تقریب بھی تھی، علما اور مشائخ کی ایک بڑی تعداد اس تقریب میں شریک ہوئی۔ اس موقع پر ندوی صاحب نے دارالدعوۃ کی تعمیر و ترقی دیکھ کر بڑی خوشی کا اظہار کیا اور دعائیں دیں۔

مولانا محمد رئیس ندوی صاحب کے بارے میں لکھنے کے کئی گوشے ہیں، مجھے قوی امید ہے کہ سدھارتھ نگر میں آپ کی حیات و خدمات پر منعقد ہونے والے سیمینار کے مقالات سے آپ کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر مزید روشنی پڑے گی۔ اللہ رب العزت استاذ محترم کو اپنے یہاں بڑا اجر و ثواب دے اور آپ کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور جنت الفردوس عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔

یہ تھا مولانا عبدالرحمن فریوائی کا طویل مضمون، جس میں انھوں نے اپنے استاذ گرامی کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا محمد عباس اختر

(وفات ۲۴۔ جولائی ۲۰۱۰ء)

پاکستان کے علاقہ بلتستان کی جماعتِ علما میں مولانا محمد عباس اختر کتاب وسنت کی تبلیغ اور توحید کی اشاعت میں ہمیشہ سرگرم رہے۔ وہ ۳۱۔ دسمبر ۱۹۵۸ء کو علاقہ خپلو کے گاؤں گربونگ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام اخوند علی موسیٰ ہے۔ سرکاری سکول میں پرائمری کا امتحان دیا اور پھر دینی تعلیم کے لیے دار العلوم غواڑی آئے۔ وہاں کچھ عرصہ پڑھنے کے بعد ۱۹۶۹ء میں جامعہ علوم اثریہ جہلم میں داخل ہوگئے۔ دو سال اس جامعہ میں پڑھا اور ۱۹۷۱ء میں فیصل آباد جامعہ سلفیہ میں داخلہ لیا۔ ۱۹۷۹ء میں جامعہ سلفیہ کا نصاب مکمل کیا اور سندِ فراغت حاصل کی۔ بعد ازاں وفاق المدارس السّلفیہ کا امتحان پاس کیا۔ کچھ عرصہ چینیاں والی مسجد لاہور میں علامہ احسان الٰہی ظہیر (ش ۲۳ مارچ ۱۹۸۷ء) کی خدمت میں گزارا۔ اساتذہ میں حافظ مفتی ثناء اللہ مدنی، علامہ احسان الٰہی ظہیر اور مولانا مفتی عبید اللہ خاں عفیف شامل ہیں۔

۱۹۸۱ء میں مولانا محمد عباس اختر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ چلے گئے اور وہاں کلیۃ الحدیث میں داخلہ لیا۔ ۱۹۸۶ء میں وہاں سے سندِ فراغت لی اور واپس وطن آ گئے۔ ۱۹۸۹ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے عربی کیا۔

مولانا محمد عباس اختر کا مقصد بلتستان کے دیہات وقصبات میں مدارس جاری کرنا اور تعلیم عام کرنا تھا۔ اس سلسلے میں ان کی اہلیہ بھی ان کی معاون تھیں۔ چنانچہ اپنے گھر موضع گربونگ میں ادارہ تعلیم القرآن قائم کیا، جس میں گاؤں کے اور اردگرد کے بے شمار بچے بلا امتیازِ مسلک قرآن مجید ناظرہ کے علاوہ دینیات کی کتابیں پڑھتے تھے۔

خپلو شہر کے مرکزی بازار کی حدود میں انھوں نے ڈھائی کنال جگہ خرید کر اس میں عظیم الشان مسجد بھی بنائی اور مدرسہ بھی تعمیر کیا۔ مدرسے کے افتتاح کے موقع پر بہت بڑے جلسے کا اہتمام کیا گیا، جس میں علاقے کے تمام مکاتبِ فکر کے علما و زعما اور عام لوگوں نے شرکت کی۔ یہ جلسہ ۳۔ نومبر ۲۰۰۹ء کو پروفیسر ساجد میر صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔

مولانا محمد عباس اختر بہت سے اوصاف کے مالک تھے۔ وہ صاف بیان اور پُر جوش خطیب بھی تھے، بہت اچھے مدرس تھے، علاقے میں اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ مجلسی گفتگو کا سلیقہ انھیں خوب آتا تھا اور تحمل سے

Marfat.com

بات کرتے تھے۔ وہ صلح کل عالم تھے، اپنے مسلک کی خوب صورت طریقے سے تبلیغ کرتے تھے، اسی لیے لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔

مزاج کے دھیمے لیکن ساتھ ہی جرأت مند بھی تھے۔ ایک مرتبہ ایک گاؤں ''سرموں'' میں اہل حدیث کی مسجد کے افتتاح کا پروگرام تھا۔ گاؤں کے بعض شر پسند لوگوں نے منصوبہ بنایا کہ وہابیوں کو گاؤں میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ انھوں نے پتھر کے ٹکڑے پکڑے کہ ان کی گاڑی آئے گی تو اس پر پتھر کے یہ ٹکڑے پھینکے جائیں گے اور انھیں واپس جانے پر مجبور کر دیا جائے گا۔ مولانا ممدوح کو اس کا پتا چلا تو اس گاؤں میں آئے اور ان لوگوں سے اس اسلوب میں بات کی کہ وہ خاموش ہو گئے۔ نہایت آرام سے مسجد کا افتتاح ہوا اور تقریریں کی گئیں جو مخالفوں نے بھی سنیں اور معاملہ ختم ہو گیا۔ پھر اسی مسجد میں ان کے بچے قرآن مجید اور دینیات کی کتابیں پڑھنے لگے۔

مولانا ممدوح دار العلوم غواڑی کی مجلس مشاورت کے رکن اور اس کے معاون تھے۔ لوگوں کے ہم درد اور مستحقین کی مالی مدد کرتے تھے۔ شاعر اور مضمون نگار تھے۔ اس علاقے کی جماعت اہل حدیث کے امیر تھے۔ مہمان نواز، خوش گفتار اور بذلہ سنج تھے۔ علاقے میں قیام امن اور مذہبی رواداری کے فروغ کے لیے مختلف مسالک کے علما و قائدین کے ساتھ مل کر خدمات سر انجام دیتے تھے۔ سماجی تقاریب میں شرکت کرتے اور باہمی صلح و صفائی کی گفتگو میں پیش پیش رہتے۔ ضلع کی سرکاری قسم کی میٹنگوں میں شریک ہوتے اور صائب مشورے دیتے۔ تعلیمی معاملات میں بالخصوص حصہ لیتے اور صورتِ حال کی روشنی میں بہترین تجاویز پیش کرتے۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے مولانا محمد عباس اختر کو بے حد عقیدت تھی۔ ان کے علم و کمال، ان کی خدمات، ان کے سیاسی نقطۂ نظر سے وہ نہایت متاثر تھے۔ ان کی کتابوں کا انتہائی شوق سے مطالعہ کرتے اور ان کے حالات میں جو کتاب شائع ہوتی، اسے خریدتے اور اس سے استفادہ فرماتے۔ ان کے بھتیجے جناب عبدالمجید (فاضل مدینہ یونیورسٹی) کا خیال ہے کہ وہ مولانا آزاد سے متعلق کچھ لکھنا چاہتے تھے، لیکن موت نے ان کو اس اہم کام کی انجام دہی کا موقع نہیں دیا۔

اب آیے ان کے آخری وقت کی طرف۔!

جسمانی طور پر وہ صحت مند و توانا تھے۔ بہ ظاہر کوئی تکلیف نہ تھی۔ کبھی کبھی فشار خون (بلڈ پریشر) کی شکایت ہو جاتی تھی، لیکن اس کی وہ پروانہ کرتے، تبلیغی اور علمی سرگرمیاں جاری رکھتے۔ ۱۳۔ جولائی ۲۰۱۰ء کو ان کے پاس ایک مہمان آئے جو رات انہی کے ہاں رہے۔ صبح (۱۴ جولائی) کو انھیں رخصت کیا اور پھر انجکشن لگوانے اسپتال چلے گئے۔ وہاں انھوں نے اپنے دوست مولانا محمد یعقوب کو بلوایا اور چند لمحوں میں وہیں

Marfat.com

وفات پا گئے۔ انا للہ و انا الیه راجعون .

یہ اچانک موت تھی، جس کی اطلاع فوراً اطراف واکناف میں پہنچ گئی۔ ان کی پہلی نماز جنازہ خیلو کی جامع مسجد میں ادا کی گئی۔ بعدازاں ان کی میت کو بذریعہ ایمبولینس ان کے گاؤں گربونگ پہنچایا گیا اور مولانا محمد رستم کی اقتدا میں دوسری نماز جنازہ پڑھی گئی۔ اللھم اغفرله و ارحمه و عافه و اعف عنه

ان کی اولاد تین بیٹے عبداللہ، عبدالرحمٰن اور ہارون اور پانچ بیٹیاں ہیں۔

❀❀❀❀

Marfat.com

حافظ عبدالرزاق سعیدی

(وفات ۱۵۔ اگست ۲۰۱۰ء)

حافظ عبدالرزاق کے والد کا نام جان محمد اور دادا کا عبدالرحمان عرف بابا کالو تھا۔ یہ دراصل ویرووال ضلع امرتسر کے رہنے والے تھے اور ان کا شمار مولانا عبداللہ ویرووالوی کے رفقا میں ہوتا تھا۔ مولانا ممدوح نے ویرووال میں مدرسہ شمسیہ جاری کیا اور مسجد تعمیر کی تو بابا عبدالرحمٰن عرف کالو اور ان کے فرزندِ گرامی نے ان سے بہت تعاون کیا۔ بابا عبدالرحمٰن کے چار بیٹے تھے اور چاروں کا شمار اس علاقے کے اصحابِ علم اور تقویٰ اشعار لوگوں میں ہوتا تھا۔ ان کے اسمائے گرامی یہ تھے:

۱۔ فتح محمد:...... یہ تقسیم ملک کے بعد ضلع شیخوپورہ کے ایک مقام ڈیرہ ملاسنگھ آئے اور وہیں سکونت اختیار کی۔ یہ خود بھی عالم دین تھے اور ان کے بیٹے مولانا عطاء اللہ صاحب بھی امامت و خطابت اور تدریس کا فریضہ انجام دینے لگے۔

۲۔ کرم دین:...... یہ صالح اور متقی بزرگ تھے اور ان کے فرزندِ نام دار مولانا محمد یحییٰ خلیق کئی سال جامعہ رحمانیہ فاروق آباد کے منصب شیخ الحدیث پر فائز رہے۔

۳۔ مولانا حکیم محمد ابراہیم:...... انھوں نے شیخ الحدیث مولانا عبداللہ ویرووالوی سے ان کے جاری کردہ مدرسہ شمسیہ میں تعلیم حاصل کی اور تقسیم ملک کے بعد حافظ آباد آئے جو اس وقت ضلع گوجراں والا کی تحصیل تھا، اب بہت سالوں سے اس کو ضلع کی حیثیت حاصل ہے۔ وہاں انھوں نے جامع مسجد مبارک اہل حدیث میں درس و تدریس اور خطابت کا سلسلہ شروع کیا جو تمام عمر جاری رکھا۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک تحفظ ختم نبوت میں حصہ لیا اور اس عمل خیر میں قید بھی رہے، جرأت مند اور بلند حوصلہ عالم دین تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے لائق فرزند حافظ محمد اسماعیل اسد ان کی جگہ خطابت و تدریس میں مصروف ہوئے۔ انھوں نے بھی ان فرائض کی انجام دہی میں بڑی شہرت پائی۔

حکیم محمد ابراہیم کو میں نے پہلی مرتبہ گوجراں والا میں استاذِ عالی منزلت حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی سے گفتگو کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ گداز جسم کے طویل قامت خوب رو جوان تھے۔ میں اس وقت ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں خدمت انجام دینے پر مامور تھا۔ یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے، جب یہ اخبار گوجراں والا سے شائع ہوتا تھا۔ حکیم صاحب مرحوم کے فرزند گرامی حافظ محمد اسماعیل اسد سے میرے دوستانہ مراسم تھے۔ میں اور حافظ احمد

Marfat.com

شا کر ایک دفعہ حافظ اسماعیل اسد کی دعوت پر حافظ آباد بھی گئے تھے، وہ بھی کئی دفعہ میرے غریب خانے پر لاہور تشریف لائے۔ افسوس ہے باپ بیٹا دونوں اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

۴۔ جان محمد:...... یہ زیب عنوان بزرگ حافظ عبدالرزاق سعیدی کے والد مکرم تھے۔ پابند شریعت اور علم وعلماء کے قدر دان۔

حافظ عبدالرزاق کی ولادت قیامِ پاکستان سے دس سال قبل ۱۹۳۷ء میں ان کے آبائی وطن ویرووال میں ہوئی اور اگست ۱۹۴۷ء میں اپنے وطن کی سکونت کر کے والدین کے ساتھ ضلع شیخوپورہ کے موضع ڈیرہ ملاسنگھ میں آئے۔ گھر کے تمام افراد علم اور علما سے رابطہ رکھتے تھے، اس لیے خیال ہے کہ وہاں کچھ تعلیم حاصل کی ہوگی۔ لیکن باقاعدہ تعلیم کا آغاز پاکستان آ کر مولانا عبداللہ ویرووالوی کے جاری فرمودہ مدرسہ دارالقرآن والحدیث لائل پور (موجودہ فیصل آباد) میں کیا۔

اس مدرسے میں ان کے ہم سبق تھے مولانا عبداللہ ویرووالوی کے دو صاحب زادے حافظ عبدالرحمٰن اور حافظ محمد داؤد مرحوم، حکیم عبدالرحیم اشرف مرحوم کے برادرِ خرد حافظ محمد احمد، ہمارے دیرینہ دوست مولانا محمد یوسف انور، چشتیاں کے مولانا عبدالقدوس اور دیگر متعدد حضرات، جن میں سے بعض وفات پا چکے ہیں اور بعض مختلف مقامات پر تدریس وخطابت میں مصروف ہیں۔

ابتدائی دور ہی سے حافظ عبدالرزاق صوفی منش، صالحیت پسند، خاموش طبع، خلیق اور سادہ طبیعت تھے۔ اس کے ساتھ ہی ذہین اور خوش مزاج بھی تھے۔ دم درود بھی کرتے تھے اور طبابت کا شغل بھی تھا۔ قرآن وحدیث اور بزرگانِ دین سے منقول وظائف کے بھی عادی تھے۔

مدرسہ دارالقرآن کے علاوہ انھوں نے حافظ آباد میں اپنے عم محترم مولانا حکیم محمد ابراہیم، علامہ محمد یوسف کلکتوی اور مولانا فضل الرحمٰن کلیم سے، جامعہ محمدیہ گوجرانوالا میں مولانا عبدالحمید ہزاروی سے اور جامعہ سعیدیہ خانیوال میں مولانا ابوالحسنات علی محمد سعیدی سے استفادہ کیا۔ مولانا علی محمد سعیدی نے مروّجہ تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے گاؤں ڈیرہ ملاسنگھ میں دینی مدرسہ جاری کیا۔ بعدازاں منڈی فاروق آباد چلے گئے۔ جسے پہلے منڈی چوہڑکانہ کہا جاتا تھا۔ وہاں مدرسہ رحمانیہ جاری کر کے درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری کیا اور خطابت وامامت کا بھی۔ اس وقت وہاں اہل حدیث کی ایک ہی مسجد تھی۔ نمازیوں کی تعداد بہت ہی کم تھی، نہ ہونے کے برابر۔ اس نواح میں مولانا عبدالرزاق نے توحید وسنت کی بڑی تبلیغ کی اور تبلیغی جلسوں کے انعقاد کا سلسلہ جاری کیا، جن میں مولانا حافظ عبداللہ شیخوپوری، مولانا محمد حسین شیخوپوری اور دیگر علمائے کرام کو دعوت دی جاتی تھی اور وہ تقریریں کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب منڈی فاروق آباد میں اہل حدیث کی چودہ

Marfat.com

مسجدیں ہیں جو نمازیوں سے بھری رہتی ہیں اور ان میں بچوں کو قرآن مجید اور دینیات کی تعلیم دی جاتی ہے۔

حافظ عبدالرزاق سعیدی تقریر و خطابت میں علامہ احسان الٰہی ظہیر، مولانا حبیب الرحمٰن یزدانی اور ان کے رفقائے کرام سے بالخصوص متاثر تھے۔

وہ کچھ عرصہ جھنگ کی مسجد اہل حدیث میں بھی خدمتِ خطابت انجام دیتے رہے۔ اپنے عہد اور علاقے کے وہ معروف خطیب اور واعظ تھے۔

ان کے شاگردوں کا حلقہ وسیع تھا جس میں حسب ذیل حضرات شامل تھے۔

حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی (مدرس جامعہ سلفیہ ومدیر ترجمان الحدیث فیصل آباد)، حافظ اعجاز احمد (مدرس جامعہ سلفیہ اسلام آباد)، مولانا منظور احمد، مولانا محمد اسحاق گوہڑوی (نوشہرہ ورکاں)، مولانا محمد دین (پنڈی بھٹیاں)، حافظ محمد اکرم جاوید (لدھے والا ورکاں)، حافظ محمد زکریا (منڈی وار برٹن) اور دیگر متعدد حضرات۔

حافظ صاحب سراپا اخلاص عالم، صاف بیان خطیب، سرگرم مبلغ، ملنسار، فیاض اور مہمان نواز تھے۔

انھوں نے مختصر علالت کے بعد ۱۵۔ اگست ۲۰۱۰ء (۴۔ رمضان المبارک ۱۴۳۱ھ) کو بروز اتوار سحری کے وقت وفات پائی۔ نماز ظہر کے بعد تین بجے ان کی نماز جنازہ منڈی فاروق آباد میں مولانا عتیق اللہ سلفی (ناظم مرکز الدعوۃ السلفیہ، ستیانہ بنگلہ) نے پڑھائی۔ پھر ان کی میت ان کے گاؤں (ڈیرہ ملا سنگھ) لے جائی گئی، وہاں نماز جنازہ مولانا حافظ عبدالحمید عامر (ناظم جامعہ اثریہ جہلم) نے پڑھائی۔

اللهم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه.

یہاں یہ یاد رہے کہ حافظ صاحب اپنے نام کے ساتھ ''سعیدی'' کی نسبت اس لیے لگاتے تھے کہ ان کے ایک استاذ مولانا ابوالحسنات علی محمد سعیدی تھے، جو دراصل ضلع فیروز پور کی تحصیل زیرہ کے ایک گاؤں صدروالا کے رہنے والے تھے اور انھوں نے دہلی میں حضرت مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی کے مدرسہ سعیدیہ سے سندِ فراغت حاصل کی تھی اور اپنے عہدِ علمی کی بنا پر سعیدی کہلاتے تھے۔ حافظ صاحب نے بھی اسی نسبت کو اختیار کیا۔

حافظ صاحب مرحوم کی نرینہ اولاد پانچ بیٹے تھے، ان میں ایک حافظ خالد محمود تھے جو بجلی کا کرنٹ لگنے سے وفات پا گئے تھے۔ جوان بیٹے کی اچانک موت باپ کے لیے بہت بڑے صدمے کا باعث تھی۔

ان کے علاوہ چار بیٹوں کے نام یہ ہیں (۱) شاہد محمود سعیدی (۲) حافظ زاہد محمود سعیدی (۳) پروفیسر ناصر محمود سعیدی اور (۴) حکیم راشد محمود سعیدی۔

افسوس ہے میری حافظ صاحب مرحوم اور ان کے فرزندوں میں سے اب تک کسی سے ملاقات نہیں ہوئی۔

(یہ سطور ۲۶۔ نومبر ۲۰۱۳ء کو لکھی گئیں۔)

Marfat.com

مولانا محمد ابراہیم ترمنی احمد پوری

(وفات ۵۔فروری ۲۰۱۱ء)

مولانا محمد ابراہیم ترمنی احمد پور شرقیہ (ضلع بہاول پور) کی علمی، دینی اور روحانی شخصیت تھے۔ دراز قامت، مضبوط قویٰ، خوب صورت نقش ونگار اور گورا رنگ۔ ضلع ڈیرہ غازی خاں کی تحصیل تونسہ کے قصبہ ''ترمنڑ'' میں ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے۔ سیال برادری سے تعلق تھا۔ والد کا نام سلطان محمود تھا جو زمیندارہ کرتے تھے اور خوش حال تھے۔ برادری میں احترام کا مقام حاصل تھا۔ اس خاندان کے ایک بزرگ صادق محمود تھے جو بمبئی میں مقیم تھے اور وہاں تجارت کرتے تھے۔

مولانا محمد ابراہیم ترمنی کی دادی کا نام زینب بی بی تھا۔ وہ نہایت صالحہ خاتون تھیں۔ قرآن کی قاریہ تھیں اور بچوں کو قرآن مجید پڑھاتی تھیں۔ گاؤں کی بے شمار بچیوں نے ان سے قرآن مجید ناظرہ پڑھا۔ محمد ابراہیم نے بھی انھی سے قرآن پڑھا۔

اردو کے ابتدائی اسباق انھوں نے ماسٹر عمر دراز سے پڑھے اور اردو املا گاؤں کے ہندو ماسٹر چارم لال سے سیکھی۔ پھر حساب اور سائنس کی کتابیں پڑھیں اور مڈل تک پہنچے۔ اس کے بعد تونسہ کے گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل ہوئے۔

انھیں دراصل دینیات کی تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا۔ اس کا ذکر والد صاحب سے کیا۔ وہ احمد پور شرقیہ کے مولانا عبدالحق ہاشمی کے مواعظ سے متاثر ہو کر کتاب وسنت پر عامل ہوئے تھے، جن کی اس علاقے میں وعظ وتبلیغ کے لیے اکثر آمد ورفت رہتی تھی۔ وہ محمد ابراہیم کو بھی جانتے تھے اور ان کے والد سلطان محمود سے بھی متعارف تھے۔

محمد ابراہیم ۱۹۴۵ء میں ترمنڑ سے مولانا عبدالحق ہاشمی کی خدمت میں احمد پور شرقیہ آئے۔ اس وقت مولانا عبدالحق ہاشمی مسجد کے دروازے پر کھڑے تھے اور ہاتھ میں ''صحیح بخاری'' تھی۔ محمد ابراہیم نے ان کو سلام کیا تو فوراً پہچان گئے۔ ان کے والد کی خیر وعافیت پوچھی اور ان سے کہا کہ کیسے آنا ہوا؟ انھوں نے کہا: طلبِ علم کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ فرمایا: ٹھیک ہے، پڑھو اور دل لگا کر پڑھو، احمد پور شرقیہ کو اپنا گھر سمجھو، یہاں تمھارے لیے روٹی کپڑے کا پورا انتظام ہوگا۔

Marfat.com

مولانا محمد ابراہیم نے عربی کی ابتدائی کتابیں مولانا عبدالحق ہاشمی سے پڑھیں۔ شیخ سعدی کی گلستان، بوستان اور کریما وغیرہ بھی وہیں پڑھیں۔ پھر ۱۹۴۷ء میں استاذِ مکرم کے حکم سے مولانا سلطان محمود مرحوم ومغفور کی خدمت میں جلال پور پیروالا چلے گئے۔ اس وقت شیخ الحدیث مولانا محمد رفیق اثری بھی وہاں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ محمد ابراہیم کو صرف قرآن وحدیث اور فقہ سے دل بستگی تھی۔ وہ جو کچھ استاذِ محترم سے سنتے، اسے باقاعدہ کاپی پر لکھتے جاتے تھے۔ فنون کی کتابوں سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا۔

انھوں نے ۱۳۷۱ھ (۱۹۵۲ء) میں سندِ فراغت لی اور اسی سال احمد پور شرقیہ کی جامع مسجد اہل حدیث ٹاہلیاں والی میں خطیب مقرر کر لیے گئے۔ تمام عمر اسی مسجد میں خطابت اور تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ سادہ مزاج، درویش صفت اور نیک سیرت عالم تھے۔ پڑھنے پڑھانے کے علاوہ کسی کام سے کوئی تعلق نہ تھا۔

۱۹۸۸ء میں پیرانہ سالی کے باعث مسجد کی خطابتی ذمہ داریوں سے الگ ہو گئے، لیکن مسجد میں اپنا حلقۂ درس قائم رکھا۔ ان کا اصل موضوع کتاب وسنت کی تبلیغ اور تدریس تھا۔ یہ فریضہ وہ ترک خطابت کے بعد بھی سرانجام دیتے رہے۔

مولانا محمد ابراہیم ترمنی مضمون نگار بھی تھے اور ان کے مضامین جماعتی جرائد مجلّہ تفہیم الاسلام (احمد پور شرقیہ) صحیفہ اہل حدیث (کراچی) الارشاد (کراچی) ہفت روزہ الاعتصام (لاہور) اور ہفت روزہ اہل حدیث (لاہور) میں شائع ہوتے رہے۔ یہ مضامین ہیں سجدہ، الفضل ماشہدت بہ الاعداد، گناہ کبیرہ کا بیان، ایمان اور عمل، جمعۃ المبارک کا دن اور طریقہ نمازِ رسول ﷺ، سجدہ۔ حقیقی مستحق کون؟ توبہ کی فضیلت واہمیت۔ ان مطبوعہ مضامین کے علاوہ ان کے متعدد غیر مطبوعہ مضامین بھی ہیں جو ہمارے عزیز دوست جناب حمید اللہ خاں عزیز مدیر ماہنامہ ''تفہیم الاسلام'' (احمد پور شرقیہ) کے پاس محفوظ ہیں۔

مولانا محمد ابراہیم ترمنی کو حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم کی تصانیف سے دلی لگاؤ تھا اور ان کی ہر موضوع کی کتابوں کا بڑے غور سے مطالعہ کر چکے تھے۔ مولانا امرتسری کی عربی تفسیر، جس کا نام ''تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن'' ہے، ان کے مطالعہ میں رہی اور پوری تفسیر اپنے ہاتھ سے لکھی۔ اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ تفسیر انھوں نے اپنے استاذِ عالی قدر مولانا سلطان محمود کو دکھائی تو انھوں نے اپنے اس شاگرد کی ڈائری میں یہ الفاظ تحریر فرمائے:

> ''قرآن مجید کا پڑھنا اور لکھنا دونوں باعثِ ثواب عمل ہیں۔ قرآن مجید کامل ہدایت اور تاثیروں پر مشتمل ہے، جس کے ذریعے حقانی علوم اور معارف حاصل ہوتے ہیں۔ قرآن مجید تدبر کا حکم دیتا ہے۔ ہماری دینی وعلمی ترقی کے لیے کامل رہنمائی قرآن ہے۔ یہ انسان کی زندگی کا آب

Marfat.com

حیات ہے، جس کا ایک ایک لفظ ہدایت اور تاثیر سے پُر ہے۔ ہم جن مسائل میں گھرے ہیں، اس کی اہم وجہ صرف قرآن سے دوری ہے۔ مسلمان حکمران اور ہمارا بالا دست طبقہ اس سے استفادہ اور رہنمائی لینے کا مصمم ارادہ کر لے تو ہم دنیا کے سامنے ذلیل ورسوا ہونے سے بچ جائیں۔''

(کتبہ ابو یحییٰ سلطان محمود عفی عنہ)

مولانا محمد ابراہیم انتہائی رقیق القلب تھے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور عجز وعاجزی کے ساتھ اللہ سے ملتجی ہوئے۔ ان کی دعا کو اللہ شرفِ قبول بخشتا تھا۔

ایک مرتبہ مسجد میں ایک خاتون آئی۔ اس نے کہا کہ میرا بیٹا گم ہو گیا ہے۔ ہم سخت پریشان ہیں، مسجد میں اعلان کر دیں ممکن ہے بیٹا مل جائے۔ فرمایا: مسجد میں کسی گم شدہ چیز کا اعلان کرنا منع ہے۔ بولی: تو پھر دعا کر دیں کہ میرا بیٹا مجھے مل جائے۔ اب مولانا نے اللہ کی بارگاہ میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ دو مرتبہ سورہ اخلاص پڑھی، دو مرتبہ درود شریف پڑھا۔ پھر نہایت خشوع وخضوع سے دعا مانگی اور عرض کیا اے اللہ، اے رحمان، اے رحیم، اے قاضی الحاجات۔ ماں باپ کے نورِ نظر کو ان کے گھر پہنچا دے۔ تو مایوس دلوں پر رحم فرما اور کمزوروں کی دست گیری کر۔ اس قسم کے الفاظ بار بار کہے۔ خاتون دعا کرا کے گھر آ گئی اور اگلے دن اس کا بیٹا اسے مل گیا۔ بیٹے نے بتایا کہ منشیات فروشوں نے اسے اغوا کر لیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے ان کی گرفت سے نکل کر گھر آیا ہے۔

ایک شخص کو جنات کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ وہ لوگوں کو پیٹتا اور دیواروں پر ٹکریں مارتا تھا۔ اسے مولانا محمد ابراہیم کے پاس لایا گیا تو مولانا نے اس سے پوچھا: قرآن مجید پڑھا ہے؟

اس نے کہا: پڑھا ہے۔

اسے سورہ جن پڑھنے کی تلقین کی۔ خود بھی سورہ جن کی تلاوت شروع کر دی۔ آخر میں درود شریف پڑھا اور اسے فرمایا روزانہ سورہ جن پڑھا کرو۔ پانچ وقت نماز پڑھو۔ نجس اور پلید چیزوں سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ اس نے اس پر عمل کیا اور تکلیف رفع ہو گئی اور خوش حالی کی زندگی بسر کرنے لگا۔

مولانا نہایت صالح اور باعمل تھے۔ ان کو خواب میں نبی ﷺ کی زیارت کا شرف بھی حاصل ہوا تھا۔ انھوں نے خواب میں بھی دیکھا کہ وہ مولانا ثناء اللہ امرتسری کی ''تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن'' ان کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

مولانا محمد ابراہیم ۸۵ برس عمر پا کر ۱۵۔ فروری ۲۰۱۱ء کی شب کو احمد پور شرقیہ میں فوت ہوئے۔ اس وقت ان کے پسماندگان میں ایک بیوہ سمیت تین بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ بیٹوں کے نام ہیں محمد یوسف سیال اور

Marfat.com

محمد یونس سیال۔ دونوں کاروبار کرتے ہیں اور آسودہ حال ہیں۔ مولانا ممدوح کے مفصل حالات کے لیے ملاحظہ ہو: مجلّہ تفہیم الاسلام (احمد پور شرقیہ) میں اس کے ایڈیٹر حمید اللہ خان عزیز کا مضمون مارچ ۲۰۱۱ء تا اکتوبر ۲۰۱۱ء۔

❀❀❀❀

Marfat.com

حافظ محمد دین

(وفات ۲۔مئی ۲۰۱۲ء)

تقسیم ملک سے قبل کا پنجاب بڑے بڑے انتیس ضلعوں پر مشتمل تھا۔ ہر ضلع کے بلاد و قصبات (بلکہ دیہات میں بھی) بے شمار مسجدیں موجود اور مدرسے جاری تھے جن میں ہر وقت اللہ کی عبادت کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور قال اللہ وقال الرسول کی روح پرور صدائیں سنائی دیتی تھیں۔ علاوہ ازیں تبلیغی جلسے بھی منعقد ہوتے رہتے تھے۔ ان جلسوں میں مختلف مقامات کے واعظین ومقررین کو دعوتِ شرکت دی جاتی تھی اور وہ لوگوں کو قرآن وحدیث کے احکام سناتے اور اسلام کے بیان فرمودہ اوامر ونواہی کی تفصیلات سے انھیں مطلع فرماتے تھے۔ ان تبلیغی اجتماعات میں غیر مسلم بھی شرکت کرتے اور علما کے مواعظِ حسنہ سے اثر پذیر ہوتے تھے۔ بسا اوقات علما کی تقریروں سے متاثر ہو کر جلسے ہی میں بعض غیر مسلم قبول اسلام کا اعلان کر دیتے تھے۔ اس طرح اسلام کی تعلیمات کا دائرہ وسیع ہوتا رہتا اور مسلمانوں کی تعداد بڑھتی رہتی تھی۔ لیکن تقسیم ملک کے نتیجے میں پنجاب کے جو اضلاع مسلمانوں سے خالی ہو گئے، وہاں نہ کہیں مسجد رہی، نہ مدرسہ اور نہ تبلیغ دین کا کوئی امکان باقی رہا۔

ہمارے زیب عنوان بزرگ حافظ محمد دین کے آباواجداد کا خوش قسمتی سے پنجاب کے ضلع سرگودھا سے تعلق تھا جہاں تقسیم ملک سے پہلے بھی کسی نہ کسی سطح پر مدارس جاری تھے اور مسجدیں آباد تھیں۔ تقسیم ملک کے بعد ان میں مزید اضافہ ہوا اور تبلیغ اسلام کے دائروں میں وسعت پیدا ہوئی۔

حافظ محمد دین ضلع سرگودھا کے موضع کوٹ بھائی خان میں ۲۴۔ جنوری ۱۹۳۹ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد گرامی کا نام خدا بخش تھا اور وہ جاٹ برادری کی ''لک'' شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے وقت یہ آٹھ نو سال کے بچے تھے۔ ددھیال بھی نیک خصال اور صالح کردار تھے اور ننھیال بھی اللہ کی مہربانی سے خوش اطوار اور نماز روزے کے پابند۔ باعمل موحد اور بدعات ورسوم سے کنارہ کش۔ غربا ومساکین کے معاون اور ملنسار واخلاص حسنہ کے مالک۔ حافظ صاحب نے ابتدائے عمر ہی سے اپنے اسلاف کے اوصاف حسنہ کو مشعل راہ بنایا اور حصولِ علم میں مشغول ہوئے۔

انھوں نے ابتدائی تعلیم حافظ سراج الدین اور ان کے بھائی میاں برہان الدین سے حاصل کی۔ یہ

Marfat.com

دونوں بھائی متقی اور اسلامی احکام کے گرویدہ تھے۔ قارئین کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس دور میں نہ کسی نوجوان کو انگریزی بال رکھ کر ننگے سر گلیوں میں چلنے کی جرأت تھی، اور نہ کوئی عورت بے پردہ گھر سے باہر نکل سکتی تھی۔ لوگ ان بزرگوں کا انتہائی احترام کرتے اور ان کی اس قسم کی باتوں پر عامل تھے۔ چھوٹی بچیاں بھی سر پر اس طرح دوپٹہ رکھتی تھیں کہ سر کا کوئی بال نظر نہیں آتا تھا۔

حفظ قرآن اور کچھ ابتدائی تعلیم کے بعد حافظ صاحب مزید تعلیم کے لیے مولانا ابوالسلام محمد صدیق صاحب کی خدمت میں سرگودھا گئے اور ان سے درس نظامی کا پورا نصاب مکمل کیا۔ حافظ صاحب مولانا محمد صدیق کے طریقِ تدریس، ان کی فراوانی علم، ان کے اخلاق اور اندازِ وعظ وخطابت سے نہایت متاثر ہوئے۔

مولانا محمد صدیق اپنے عہد کے جلیل المرتبت عالم دین تھے۔ ان کی ولادت ۱۹۱۴ء یا ۱۹۱۶ء میں ضلع فیروز پور (مشرقی پنجاب) کے ایک گاؤں فیروزوال میں ہوئی۔ مختلف مقامات کے اساتذہ سے حصول علم کے بعد ۱۹۳۴ء میں انھوں نے حضرت حافظ عبداللہ روپڑی کی خدمت میں روپڑ حاضری دی اور ۱۹۴۰ء تک چھ سال ان سے مصروف استفادہ رہے۔ ایک سال گوجراں والا میں حضرت حافظ محمد گوندلوی اور حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی سے مستفید ہونے کا شرف حاصل کیا۔ بعض درسی کتابیں حضرت حافظ محمد حسین روپڑی سے پڑھیں۔ تکمیل تعلیم کے بعد ۱۹۴۲ء میں لدھیانہ چلے گئے۔ وہاں دارالحدیث کے نام سے مدرسہ جاری تھا۔ اس کی مسند درس پر متمکن ہوئے اور وہاں کی جامع مسجد اہل حدیث کی امامت وخطابت کی ذمے داری بھی ان کے سپرد تھی۔

تقسیم ملک کے بعد وہ اپنے اعزہ واقارب کے ساتھ سرگودھا تشریف لے گئے تھے۔ وہاں خطابت وامامت کا فریضہ بھی انجام دینے لگے اور درس وتدریس کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ مدرسہ البنات بھی جاری کیا اور ''اشاعة السنته النبویه'' کے نام سے اشاعتی ادارہ بھی معرضِ قیام میں لایا گیا۔ روپڑی علمائے کرام سے ان کا بالخصوص بہت تعلق تھا۔ حضرت حافظ عبداللہ روپڑی سے وہ نسبتِ تلمذ رکھتے تھے۔ ان حافظ اسماعیل روپڑی اور حافظ عبدالقادر روپڑی سے ان کے گہرے دوستانہ مراسم قائم تھے، اس لیے ان حضرات کی وہاں بہت آمدورفت رہتی تھی۔ اس وقت حافظ محمد دین بھی وہیں تھے اور وہ اس صورتِ حال سے خوب آگاہ تھے۔ اس لیے ان پر بھی روپڑی علما کا بہت اثر پڑا اور وہ ان کی تقریر وخطابت اور مناظرانہ سرگرمیوں کے بے حد مداح تھے۔

مولانا ابوالسلام محمد صدیق صاحب نے ۶۔ اپریل ۱۹۸۸ء کو سرگودھا میں وفات پائی اور ان کی نمازِ جنازہ حافظ عبدالقادر روپڑی نے پڑھائی۔

Marfat.com

بات حافظ محمد دین کے بارے میں ہورہی تھی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے سرگودھا کے مدرسہ دارالحدیث ڈی بلاک میں تدریس بھی شروع کر دی تھی اور ایک مسجد میں کچھ عرصہ خدمتِ خطابت بھی انجام دیتے رہے۔

وہ روپڑی علما کے علاوہ حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور دیگر علمائے کرام سے بھی تعلق رکھتے اور ان کا بے حد احترام بجالاتے تھے۔ ان کا آئینۂ قلب صاف اور ذہن وسیع تھا۔ وہ سب اہل علم کی عزت کرتے اور سب اہلِ علم ان سے تکریم کے ساتھ پیش آتے تھے۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید سے بہت قریبی تعلق تھا۔ انہیں اپنے گاؤں میں خطاب کے لیے بلایا تھا۔ ان کی شہادت سے بہت آزردہ خاطر ہوئے۔ وہ یہ جذبہ رکھتے تھے کہ علامہ کا خون رایگاں نہیں جانا چاہیے۔ کسی بھی صورت ان کے قاتل چاہئیں۔ اور پھر ان کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیے جس کے وہ حق دار ہیں۔ چاہے اس کے لیے مجھے اپنے بیٹوں کی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔

حافظ محمد دین عجز و عاجزی کا پیکر اور صبر و رضا کا مجسمہ تھے۔ تقویٰ ان کا شیوہ اور توکل ان کا پیشہ تھا۔ حلیم الطبع اور منکسر المزاج تھے۔ کوئی کام کرنا ہوتا تو استخارہ کرتے۔ کوئی مشکل پیش آتی تو نفل حاجت ادا فرماتے اور حسبنا اللہ ونعم الوکیل کثرت سے پڑھتے۔ نماز خشوع و خضوع سے پڑھتے۔ قرآن مجید کی بکثرت تلاوت کرتے۔ رمضان المبارک میں نمازِ تراویح میں جو قرآن مجید پڑھتے نماز کے بعد بہ صورتِ تفسیر اس کا خلاصہ بیان کرتے۔ کھیتوں میں جاتے اور اپنے ہاتھ سے کام کرتے۔ لوگوں کی مدد کر کے خوش ہوتے۔ عام لوگوں سے حسنِ سلوک اور رشتے داروں سے تعلقات قائم رکھنا ان کے نزدیک ضروری تھا۔ حقوق العباد کا خاص اہتمام فرماتے۔ فیاض اور مہمان نواز تھے۔ ہمسائے کا اکرام اور ان کی ضروریات کا خیال رکھتے۔ کوشش کرتے کہ زبان سے کوئی ایسا لفظ نہ نکلے جو دوسرے کے لیے تکلیف کا باعث ہو۔ نرم کلام اور شیریں بیان تھے۔ مستحق کی مدد کر کے خوش ہوتے اور ضرورت مند سے حتی الامکان تعاون کرتے۔

دیہات میں تبلیغی جلسوں کے انعقاد کے لیے کوشاں رہتے، جن میں علما سے تقریریں کرائی جاتیں جو آسان زبان اور پیار کے لہجے میں لوگوں کو قرآن و حدیث کی روشنی میں روزمرہ پیش آنے والے مسائل بتاتے اور انھیں ان مسائل پر عمل کرنے کی تلقین کرتے۔

حافظ محمد دین طبیب بھی تھے۔ وہ لوگوں کو دوا بھی دیتے تھے اور ان کے لیے اللہ سے دعائے صحت بھی کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے علاج سے مریض کو شفا بخشتا تھا۔

حافظ صاحب نے اپنی زندگی میں کئی تدریسی ادارے جاری کیے اور متعدد مقامات پر مساجد میں توسیع

Marfat.com

کی یا نئی مسجدیں تعمیر کرائیں، جس کی تفصیل یہ ہے:

☆...... مسجد و مدرسہ اہل حدیث چک نمبر ۲۳ الف جنوبی بھاگٹاں والا۔

☆...... مسجد و مدرسہ معاذ بن جبل اہل حدیث بھاگٹاں والا۔

☆...... مسجد و مدرسہ اہل حدیث سیال موڑ۔

☆...... مسجد و مدرسہ اہل حدیث چک ۲۵ جنوبی بھاگٹاں والا۔

☆...... مسجد اہل حدیث بھٹو کالونی چک نمبر ۲۳ الف جنوبی۔

☆...... سرپرست ونگرانی جامع مسجد اہل حدیث کوٹ بھائی خاں

عمر کے آخری دور میں حافظ صاحب کو شوگر کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا، جس سے جگر بھی متاثر ہوا بہت علاج کرایا گیا لیکن وہی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ انھوں نے ۲۔ مئی ۲۰۱۲ء (۱۰۔ جمادی الاخریٰ ۱۴۳۳ھ) کو وفات پائی اور بے شمار لوگوں نے جنازے میں شرکت کی جن میں بہت سے علمائے کرام شامل تھے۔

اب آیے حافظ محمد دین کی اولاد کی طرف۔! ان کی اولاد سات بیٹے ہیں اور چار بیٹیاں...... بیٹوں کی تفصیل اس طرح ہے:

۱۔ عبدالرؤف:...... یہ بی اے پاس ہیں۔ الیکٹریکل کورس میں سند یافتہ ہیں۔ پہلے کراچی میں کام کرتے تھے۔ پھر جدہ چلے گئے۔ وہاں الیکٹریکل سامان کی دکان ہے۔ یوں یہ تو سب کے معاون ہیں لیکن اپنے والد کے دوستوں اور ملنے والوں میں سے جو لوگ حج اور عمرے کے لیے جاتے ہیں، ان سے کسی کی ان سے ملاقات ہو جائے تو اس کی بالخصوص خدمت کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

۲۔ عمر فاروق:...... جامعہ ستاریہ کراچی کے فارغ التحصیل ہیں۔ مولانا ابوالسلام محمد صدیق مرحوم سے دوبارہ صحیح بخاری پڑھی۔ محکمہ تعلیم میں عربی ٹیچر تھے۔ پھر ملازمت چھوڑ کر اپنے بھائی عبدالرؤف صاحب کے پاس جدہ چلے گئے۔ اچھے مقرر ہیں اور صاف لہجے میں بات کرتے ہیں۔ جدہ میں ''دارالمسافر'' کے نام سے اس ''مسافر'' نے کتب کی فروخت کا ادارہ قائم کیا ہوا ہے۔ پاکستانی اور ہندوستانی تارکین وطن کے لیے ان کا کتب خانہ بہت کام کی جگہ ہے۔ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری سے بہت گہرا تعلق تھا اور علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید کے جاں نثاروں میں سے ہیں۔

۳۔ حافظ عبدالماجد:...... جامعہ ابوبکر الاسلامی کراچی، مدرسہ تقویۃ الاسلام اوڈاں والا ضلع فیصل آباد اور جامعہ سلفیہ فیصل آباد میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ وفاق المدارس کا امتحان بھی پاس کیا۔ کچھ عرصہ بھلوال کی مرکزی مسجد میں خطابت وامامت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ آج کل جدہ (سعودی عرب

Marfat.com

کی مسجد خلیل اربعین میں عربی خطبے کا اردو ترجمہ کرنے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

۴۔ عبدالخالق:...... انھوں نے انگریزی اور پولیٹکل سائنس میں ایم اے کے امتحانات امتیازی نمبروں میں پاس کیے۔ آج کل جدہ (سعودی عرب) میں تجارت کرتے ہیں۔ ملنسار اور عالی اخلاق ہیں۔

۵۔ محمد یحییٰ:...... جدہ میں اپنے بڑے بھائی عبدالرؤف صاحب کے ساتھ کام کرتے ہیں۔

۶۔ عبدالمالک:...... جامعہ ابوہریرہ لاہور اور جامعہ بخاری سیالکوٹ میں دینی تعلیم حاصل کی۔ اسلامیات میں ایم اے کیا۔ آج کل جدہ میں کاروبار کرتے ہیں،

۷۔ حافظ احمد دین ساجد:...... لائق اور فہیم نوجوان ہیں۔

حافظ محمد دین صاحب مرحوم و مغفور کے بارے میں یہ معلومات جناب عطا محمد جنجوعہ کی تصنیف ’’شیخ القرآن والحدیث حضرت مولانا حافظ محمد دین رحمۃ اللہ علیہ‘‘ سے لی گئی ہیں۔ اور بعض معلومات عزیزم عمر فاروق قدوسی نے فراہم کیں۔

(یہ سطور ۶۔ جون ۲۰۱۲ء کو لکھی گئیں۔)

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا محمود احمد غضنفر

(وفات ۲۰۔ جون ۲۰۱۲ء)

پورا قد، سرخی مائل رنگ، قدرے لمبا چہرہ، نیل گوں آنکھیں، سر اور داڑھی کے بھورے سے بال، کھلی پیشانی، خندہ رو، خوش گفتار، خوش لباس، شلوار قمیص میں ملبوس، سر پر قراقلی ٹوپی، مہمان نواز، دوستوں پر خرچ کرنے والے۔ یاروں کے یار اور ہم درد۔ یہ تھے مولانا محمود احمد غضنفر جن سے ۱۹۸۰ء یا اس سے کچھ مدت پہلے میرا تعارف ہوا۔ اس وقت وہ غالباً بند روڈ (لاہور) کی مسجد مزمل میں جمعہ پڑھایا کرتے تھے۔ یہ مسجد میاں فضل حق کی کوشش سے تعمیر ہوئی تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے اس زمانے میں یا اس سے کچھ بعد وہ سعودی عرب کی طرف سے مبعوث کے طور پر دار العلوم تقویۃ الاسلام (شیش محل روڈ لاہور) میں خدمت تدریس بھی انجام دیتے تھے۔ سنا ہے کہ مبعوث کی حیثیت سے تقرر عام طور سے انہی لوگوں کا کیا جاتا ہے جنھوں نے سعودی عرب کے کسی سرکاری تدریسی ادارے میں تعلیم حاصل کی ہو، لیکن محمود احمد غضنفر نے وہاں تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ ان کا تقرر اس لیے ہوا کہ ان کے میاں فضل حق مرحوم سے گہرے مراسم تھے اور میاں صاحب کا سعودی عرب کی بعض اہم شخصیات سے میل جول تھا، اس بنا پر ان کا نام مبعوثین کی فہرست میں آ گیا۔ میاں صاحب مرحوم میں یہ خوبی تھی کہ وہ اپنے دوستوں اور ملنے والوں کی مدد کرتے تھے۔

مولانا محمود احمد غضنفر بڑے نفیس اور خوش مزاج عالم تھے۔ میرا جب ان سے تعارف ہوا، وہ ان کی جوانی کا زمانہ تھا۔ وہ لکھنے پڑھنے کے عادی تھے، میرا بھی اصل مشغلہ یہی تھا اور یہی درحقیقت ہمارے باہمی تعلقات کا باعث بنا۔

ان کے آبا و اجداد مشرقی پنجاب کے ضلع لدھیانہ کی تحصیل سمرالا کے ایک گاؤں پوٗوت کے رہنے والے تھے اور جاٹوں کی گریوال گوت سے تعلق رکھتے تھے۔ اس علاقے کے لوگ روپڑی علمائے کرام (حضرت حافظ عبداللہ روپڑی، حافظ محمد حسین روپڑی، حافظ اسماعیل روپڑی اور حافظ عبدالقادر روپڑی) سے زیادہ متاثر تھے۔ محمود احمد غضنفر کے خاندان پر بھی انہی کے اثرات کا غلبہ تھا اور ان حضرات سے ان لوگوں نے خوب فیض پایا تھا۔

محمود احمد غضنفر کی ولادت یکم جنوری ۱۹۴۵ء کو اپنے آبائی گاؤں میں ہوئی۔ قیامِ پاکستان کے وقت یہ صرف ڈھائی سال کے بچے تھے۔ ان کے آبا و اجداد نے اپنے اصل وطن سے کوچ کیا اور ضلع لائل پور کے

Marfat.com

ایک گاؤں چک نمبر ۹ ج ب ڈگورہ نزد ڈھیکری والا میں سکونت اختیار کی۔ وہ نہایت افراتفری کا زمانہ تھا۔ محمود احمد نے عمر کی چند منزلیں طے کیں تو سرکاری سکول میں داخل کرا دیے گئے۔ اس کے بعد جلد ہی دینیات کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ مختلف مدارس کے اساتذہ سے استفادے کے بعد جامعہ سلفیہ میں داخلہ لیا اور ۱۹۶۵ء میں وہاں سے فراغت پائی اور مستحقِ سند قرار پائے۔ اساتذہ کی فہرست متعدد جلیل القدر علما پر مشتمل ہے، جنمیں حضرت محدث حافظ محمد گوندلوی، حافظ عبداللہ بڈھیمالوی، مولانا عبدالغفار حسن، حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی، مولانا عبداللہ امجد چھتوی، حافظ بنیامین، پیر محمد یعقوب قریشی اور بعض دیگر حضرات شامل ہیں۔

محمود احمد غضنفر ذہین اور محنتی طالب علم تھے اور اسی بنا پر اساتذہ ان پر نظرِ کرم رکھتے تھے۔ عربی زبان اور ادبیات سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔

۱۹۶۵ء میں محمود احمد غضنفر فیصل آباد کی مشہور درس گاہ جامعہ تعلیمات اسلامیہ سے بہ طور مدرس منسلک ہوئے۔ اس درس گاہ کے بانی حکیم عبدالرحیم اشرف مرحوم ومغفور تھے۔ اس میں متعدد حضرات نے تعلیم حاصل کی، جن میں ہمارے دوست مولانا محمد بشیر سیالکوٹی بھی شامل ہیں، ان کا شمار جدید اور قدیم عربی کے ماہرین میں ہوتا ہے۔ جامعہ تعلیمات اسلامیہ کا قیام حکیم عبدالرحیم اشرف کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

۱۹۷۰ء تک پانچ سال غضنفر صاحب اس میں خدمت تدریس انجام دیتے رہے۔ اسی سال وہ لاہور آ گئے۔ یہاں انھوں نے تدریسی کام بھی کیا اور تقریر وخطابت کا سلسلہ بھی جاری فرمایا اور ترجمہ وتصنیف کو بھی مرکزِ توجہ ٹھہرایا۔ انھیں جدید عربی سے بھی لگاؤ تھا اور قدیم سے بھی تعلق تھا۔ انھوں نے اس تعلق سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور تحریر وتدریس اور ترجمہ وتصنیف کے سلسلے میں بڑی خدمات سرانجام دیں۔

انھوں نے ۱۹۸۲ء میں لاہور کے علاقہ اعوان ٹاؤن میں جامعہ الفیصل الاسلامیہ کے نام سے ایک تدریسی ادارہ قائم کیا جو کافی جگہ میں پھیلا ہوا تھا اور اس کی عمارت بڑی خوب صورت تھی۔ اس میں فلپائن، انڈونیشیا اور افغانستان وغیرہ کے طلبا تعلیم حاصل کرتے تھے۔ جامعہ الفیصل الاسلامیہ سے متصل ایک مسجد بھی تعمیر کی۔ یہ بہت اچھا تدریسی سلسلہ تھا جو انھوں نے جاری کیا۔ اس کی اوپر کی منزل میں ان کی رہائش تھی۔ اس میں علما کی آمد ورفت بھی شروع ہو گئی تھی اور محمود احمد غضنفر ان کی مہمان نوازی کرتے تھے، لیکن یہ ادارہ زیادہ عرصہ قائم نہ رہا اور یہ بہترین سلسلہ تھوڑی مدت بعد ختم ہو گیا۔

ہمارے یہ عالم فاضل دوست استقلال کی کمی کی وجہ سے کہیں زیادہ دیر تک نہ سکے۔ لاہور میں انھوں نے بعض مساجد میں خطبات جمعہ کا سلسلہ شروع کیا، لیکن جلد ہی ختم بھی کر دیا۔ یہی حال ان کی خدمتِ

Marfat.com

تدریس کا رہا۔ رہائش کے بارے میں بھی ان کی یہی عادت تھی۔ لاہور شہر میں انھوں نے مختلف مقامات میں مکان خریدے، کچھ عرصہ اس مکان میں قیام کیا، پھر اسے فروخت کر کے کوئی اور خرید لیا۔ بالآخر یہاں سے نکل کر شیخوپورہ جا ٹھکانا بنایا۔ پھر اسے بھی بیچ ڈالا اور گاؤں چلے گئے۔

سیر و سیاحت کا انھیں بہت شوق تھا۔ انھوں نے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ متحدہ عرب امارات کے کئی چکر لگائے۔ کویت گئے، بارہا سعودی عرب جانے کا اتفاق ہوا، فلپائن، افغانستان اور ہندوستان کی سیر بھی کی، برطانیہ بھی گئے۔

ایک دن صبح نو بجے کے قریب مکتبہ قدوسیہ کے عزیزی عمر فاروق قدوسی نے ٹیلی فون پر اطلاع دی کہ مولانا محمود احمد غضنفر پر فالج کا حملہ ہو گیا ہے۔ یہ نہایت تشویش ناک اطلاع تھی۔ وہ ایک پرائیویٹ اسپتال میں داخل تھے۔ میں اور عمر فاروق قدوسی اسی وقت ان کی خدمت میں پہنچے۔ ان کے دو بڑے بھائی اور چند اور عزیز وہاں موجود تھے۔ غضنفر صاحب بالکل مطمئن تھے۔ مسکراتے ہوئے ہم سے مصافحہ کیا۔ بتایا کہ وہ اپنے بعض عزیزوں کے ساتھ فیصل آباد گئے تھے۔ بذریعہ بس واپس آئے۔ بس سٹینڈ پر بس سے اترنے لگے تو ایک ٹانگ بالکل حرکت نہیں کر رہی تھی۔ ساتھیوں نے بس سے اتارا اور اسپتال آ گئے۔ انھیں یقین تھا کہ جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔

وہ پروفیسر عبدالرحمٰن لدھیانوی (خطیب جامع مسجد رحمانیہ راج گڑھ لاہور) کے بہنوئی تھے۔ چند روز بعد پروفیسر صاحب نے بتایا کہ انھیں جناح اسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ میں ان کے ساتھ وہاں پہنچا تو اب بھی خوش تھے اور مطمئن تھے کہ جلد آرام آ جائے گا اور وہ تندرست ہو کر گھر چلے جائیں گے۔ پھر کچھ افاقہ ہوا تو وہ گھر چلے گئے۔

اللہ نے یہ کرم فرمایا کہ ان کے دونوں ہاتھ فالج کی گرفت سے محفوظ تھے اور ان کے ذہن و دماغ پر بھی اس بیماری کا کوئی اثر نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے بیماری کی حالت میں اپنا قلمی کام جاری رکھا اور کئی عربی کتابوں کا اردو ترجمہ کیا۔ ایک روز حالتِ مرض ہی میں بعض رفقا سمیت میرے غریب خانے پر تشریف لے آئے۔ ۱۳-اکتوبر ۲۰۰۹ء کو پروفیسر عبدالجبار شاکر کا انتقال ہوا اور ان کی میت شیخوپورہ لائی گئی تو ان کے جنازے میں بھی وہ شریک تھے۔

قلم و قرطاس سے انھیں خاص انس تھا، جس کی رفاقت انھیں ہر حال میں حاصل رہی، تندرستی میں بھی اور حالتِ مرض میں بھی۔ تصنیفی کام بھی انھوں نے کیا، لیکن ترجمے میں زیادہ سرگرم رہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حیاتِ طیبہ کے مختلف پہلوؤں کو انھوں نے خوب صورت انداز میں عربی سے اردو میں منتقل کیا۔ مثلاً ”جرنیل

Marfat.com

صحابہ''، ''شہسوار صحابہ''، ''حکمران صحابہ''، ''مبشر صحابہ'' صحابیات و تابعات کے حالات بھی انھوں نے بہ صورتِ ترجمہ بیان فرمائے۔ مثلاً صحابیات مبشرات، صحابیات طیبات، صحابیات الرسول، زوجاتِ الرسول، زوجاتِ صحابہ۔ عہد تابعین کی جلیل القدر خواتین وغیرہ۔ مختلف موضوعات پر چالیس سے زیادہ کتابیں بہ صورت تصنیف و ترجمہ ان سے یادگار ہیں۔ بیماری کے دنوں میں ان کا قلم مزید رواں ہو گیا تھا۔ ان کی اردو زبان صاف اور واضح ہے۔ میں نے ان کی کئی کتابوں پر مقدمے لکھے اور تمام کتابیں دلچسپی سے پڑھیں۔ ان کی تصانیف ان کے لیے صدقہ جاریہ ہیں۔ ❶

مرض بڑھا تو انھیں لاہور کے شیخ زید اسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ پروفیسر عبدالرحمٰن لدھیانوی کے ساتھ میں ان کی عیادت کے لیے گیا۔ کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ چند روز کے بعد پروفیسر صاحب انھیں اپنے گھر لے آئے۔ بعد ازاں کھلی فضا میں اپنے گاؤں ماچھی وال لے گئے جو بورے والا کے قریب ہے۔ وہیں ۲۰ جون ۲۰۱۲ء کو نمازِ عصر کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ دوسرے دن ۲۱۔ جون کو میت ان کے گاؤں چک ۳۶ گ ب بگوڑھ (ضلع فیصل آباد) لے جائی گئی، جہاں انھیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون.

جنازے میں بہت سے علمائے کرام سمیت سیکڑوں لوگوں نے شرکت کی۔ انھوں نے اپنے پیچھے ایک بیوہ، ایک بیٹا اور چھے بیٹیاں چھوڑیں۔ یہ سب لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔ بیٹے اور بیٹیوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔

وہ بہت اچھے دوست اور بہت بڑے مصنف و مترجم اور عالم تھے۔ ہم عاجز بندے ان کے لیے اب دعائے مغفرت ہی کر سکتے ہیں اور جب تک زندہ ہیں کرتے رہیں گے۔

اللّٰھم اغفر لہ و ارحمہ و عافہ و اعف عنہ.

اپنے مخلص ترین مرحوم دوست کے پسماندگان کے لیے بھی ہماری عاجزانہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر موقع پر ان کا حامی و ناصر ہو اور وہ خیر و عافیت سے رہیں۔

---

❶ محترم محمود احمد غضنفر رحمہ اللہ نے تصنیف و تالیف میں قرآن کریم اور حدیث مبارکہ کی خدمت بھی کی۔ وفات سے پہلے قرآن کریم کی ایک جامع اور بے حد عمدہ تفسیر ''ضیاء التفاسیر'' کے نام سے مکمل کر چکے تھے۔ اس کا مسودہ ان کے ناشر کے پاس محفوظ ہے اور اشاعت کا منتظر ہے۔ حدیث رسول پاک کی خدمت میں انھوں نے چالیس احادیث قدسیہ پر مشتمل ایک مختصر کتاب ترجمہ کی جو کہ بہت اعلیٰ معیار پر مکتبہ قدوسیہ کی طرف سے شائع کی گئی۔ اس کے علاوہ ''عمدۃ الاحکام'' کی ایک معیاری شرح ''ضیاء الکلام'' کے نام سے لکھی اور شاید یہ اُردو زبان میں ''عمدۃ الاحکام'' کی اکلوتی شرح ہے۔ ''الالمام'' جو کہ احکام الحدیث کے موضوع پر ایک معرکہ آراء کتاب ہے، اس کی شرح ''ضیاء الاسلام'' کے نام سے لکھی جو کہ مطبوع ہے۔ اس کے علاوہ غضنفر صاحب کا ایک اور عمدہ کام شیخ الاسلام امام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ کے بعض رسائل کو اُردو قالب میں ڈھالنا بھی ہے۔ (عمر فاروق قدوسی)

Marfat.com

مولانا عبدالحمید رحمانی

(وفات ۲۰۔ اگست ۲۰۱۳ھ)

ہندوستان کے رفیع المنزلت علما میں سے ایک عالم دین مولانا عبدالحمید رحمانی تھے، جن کے والد کا اسم گرامی عبدالجبار تھا۔ مولانا عبدالحمید رحمانی صوبہ یوپی کے ضلع سدھارتھ نگر کے ایک گاؤں ''تندوا'' میں ۲۱۔اپریل ۱۹۴۰ء کو پیدا ہوئے۔ضلع بستی اور مئوناتھ بھنجن کے مختلف مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد جامعہ رحمانیہ بنارس میں داخلہ لیا۔ ۱۹۶۲ء میں جامعہ رحمانیہ سے فضیلت کی سند لی۔ اس کے بعد قسمت نے یاوری کی۔ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں پہنچ گئے، وہاں کلیۃ الدعوۃ واصول الدین میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۰ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی۔

انھوں نے مختلف مدارس و جامعات میں جن اساتذہ کرام سے تعلیم حاصل کی، ان میں بعض حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں: (۱) مولانا محمد زمان رحمانی (۲) مولانا عبدالمبین منظر (۳) مولانا محمد اقبال رحمانی (۴) مولانا عزیز احمد ندوی (۵) مولانا محمد احمد سابق ناظم مدرسہ فیض عام مئو (۶) مولانا شمس الحق سلفی (۷) مولانا عبدالمعید بنارسی (۸) مولانا عبدالرحمٰن نحوی (۹) مولانا عبدالرحمٰن رحمانی (۱۰) مولانا عظیم اللہ مئوی (۱۱) مولانا نذیر احمد رحمانی (۱۲) مولانا محمد بشیر رحمانی (۱۳) مولانا محمد یوسف پراچی (۱۴) مولانا عبدالوحید رحمانی (۱۵) ڈاکٹر تقی الدین ہلالی (۱۶) شیخ عبدالمحسن العباد (۱۷) مولانا عبدالغفار حسن (۱۸) شیخ عبدالرؤف اللبدی (۱۹) شیخ نورالدین عترالشامی (۲۰) شیخ ممدوح فخری (۲۱) شیخ حماد الانصاری (۲۲) شیخ رمضان مصری۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد جن اداروں میں تدریس فرمائی، ان کے نام یہ ہیں:

(۱) جامعہ رحمانیہ چار سال (۲) جامعہ سلفیہ بنارس دو سال (۳) معہد التعلیم الاسلامی ابوالکلام آزاد اویکننگ سینٹر دہلی چند ماہ۔

علاوہ ازیں یہ خدمات بھی ان کے حصے میں آئیں۔ (۱) مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے شعبہ تالیف وتحقیق میں تین سال ''ہندوستان میں خدمات حدیث'' سے متعلق مقالات کی نگرانی (۲) ''فتنہ انکار حجیت حدیث'' کے موضوع پر تحقیقی مقالات کی تیاری (۳) مرکزی جمعیت اہل حدیث کے نصابِ تعلیم کی تیاری۔

ان کا صحافتی کام یہ ہے (۱) ایڈیٹر پندرہ روزہ ''ترجمان'' دہلی چار سال (۲) معاون ایڈیٹر ماہنامہ

Marfat.com

''صوت الجامعہ'' بنارس۔ دوسال (۳) ممبر ایڈیٹوریل بورڈ ماہنامہ ''اوقاف'' آرکن پنجاب وقف بورڈ۔ (۴) سرپرست ماہنامہ ''التوعیہ'' آرکن مجمع البحوث الاسلامیہ نئی دہلی۔

وطن واپس آکر جامعہ رحمانیہ (بنارس) کی مسندِ درس پر متمکن ہوئے۔ چار سال اس جامعہ میں بہ حیثیت استاذ خدمت سرانجام دی۔ پھر جامعہ سلفیہ (بنارس) میں چلے گئے۔ دوسال وہاں تدریس کی۔ کچھ عرصہ مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ناظم اعلیٰ رہے۔ مرکزی جمعیت کی نظامت عملیا کے دور میں انھوں نے پورے ملک کے دورے کیے اور مختلف مقامات میں مرکزی جمعیت کی شاخیں قائم کیں۔

۱۹۸۰ء میں دہلی کے علاقے اوکھلا میں 'ابوالکلام آزاد اسلامک اویکننگ سینٹرنئی دہلی'' کی بنیاد رکھی، جس نے اب علمی، تحقیقی، دعوتی اور رفاہی کاموں کے بہت بڑے سینٹر کی شکل اختیار کرلی ہے۔ اوکھلا کے اس کمپلکس میں کئی ادارے قائم ہوچکے ہیں، جن میں جامعہ عثمانیہ سنابل، معہد عثمان بن عفان، عائشہ صدیقہ کالج، خدیجۃ الکبریٰ گرلز پبلک اسکول، خدیجہ نیشنل اسپتال دریا گنج وغیرہ شامل ہیں۔

وہیں وسیع وعریض تین منزلہ مسجد عمر بن الخطاب بھی بڑی شان سے سر اٹھائے کھڑی دکھائی دیتی ہے۔ وہیں ایک عظیم الشان لائبریری قائم ہے جو مختلف موضوعات کی کم وبیش ڈھائی لاکھ کتابوں پر مشتمل ہے۔

مولانا عبدالحمید رحمانی بڑے متحرک اہل علم تھے، ان کی کوشش سے ملک کے کئی علاقوں میں متعدد دینی ادارے قائم ہوئے اور بہت سی مسجدیں تعمیر کی گئیں۔ ان کے ادارے کی طرف سے کئی ضروری معلومات پر مشتمل کتابوں کی اشاعت ہوئی، جن سے لوگوں نے بے حد استفادہ کیا اور کررہے ہیں۔

اپنے ادارے ابوالکلام آزاد اسلامک اویکننگ سینٹرنئی دہلی کی طرف سے مولانا عبدالحمید رحمانی نے بہت سال پہلے ''التوعیہ'' کے نام سے ماہنامہ رسالہ بھی جاری کیا تھا جو زبان، انداز اور معلومات کے اعتبار سے بہت عمدہ رسالہ تھا۔ اس ماہنامے میں سید ابن احمد نقوی کے مضامین باقاعدگی سے شائع ہوتے تھے جن کا مطالعہ لوگ بڑے شوق اور اہتمام سے کرتے تھے۔ کئی سال سے التوعیہ کی جگہ ماہنامہ ''التبیان'' نے لے لی ہے۔ اس رسالے کو بھی علمی وتحقیقی مضامین کے خوب صورت مجموعے کی حیثیت حاصل ہے۔

مولانا ممدوح تحریر وتقریر میں یکساں عبور رکھتے تھے۔ وہ وسیع المطالعہ عالم تھے اور جماعت اہل حدیث کی تاریخ پر ان کی نگاہ بالخصوص بہت عمیق تھی۔ اس کے ساتھ ہی تقویٰ کی نعمت بھی بارگاہِ الٰہی سے انھیں ودیعت کی گئی تھی۔

ہندوستان کثیر المذہبی ملک ہے۔ تقسیم ملک سے قبل یہاں آریہ سماجیوں، سناتن دھرمیوں، دیوسماجیوں، عیسائیوں اور دیگر مذاہب کے مبلغوں کا مسلمان مناظروں اور عالموں سے مباحث ومناظرات کا سلسلہ جاری

Marfat.com

رہتا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد یہاں تو یہ سلسلہ ختم ہوا لیکن ہندوستان میں پہلے سے بھی بڑھ گیا، کیوں کہ ادھر کے غیر مسلم مناظرین ومباحثین ادھر چلے گئے ہیں اور اسلام پر مسلسل حملے کر رہے ہیں۔ اللہ بھلے کرے ہندوستانی علمائے دین کا کہ وہ ان کے اعتراضات کا نہایت مستعدی سے جواب دے رہے ہیں۔ مولانا عبدالحمید رحمانی کا شمار ان علما میں ہوتا تھا جو درس وتدریس اور تحریر وتقریر کے ذریعے سے بھی اسلام کی تبلیغ کرتے ہیں اور اسلام پر اعتراض کرنے والوں کا جواب مناظرانہ انداز میں دینے کے لیے بھی ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

مولانا رحمانی اسلام کے عظیم مبلغ تھے۔ وہ اپنے ملک (ہندوستان) میں تو تبلیغ میں مشغول رہتے ہی تھے، برطانیہ کی جماعت اہل حدیث کی دعوت پر بھی وہ دو مرتبہ برطانیہ گئے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۸۸ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۹۳ء میں۔ ان کو برطانیہ میں دعوت دینے کے اصل محرک مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری تھے جو برطانیہ کی مرکزی جمعیت اہل حدیث کے نائب ناظم اعلیٰ ہیں۔ برطانیہ جانے سے پہلے مولانا شیر خاں منصورہ مالیگاؤں کے شیخ الجامعۃ المحمدیہ تھے۔ یہ جامعہ ہندوستان کی ایک بڑی اور مشہور درس گاہ ہے۔ مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری نے یہاں بہت کام کیا اور دل لگا کر کیا۔ ان کا تذکرہ اس کتاب کے آئندہ صفحات میں بہ سلسلۂ ’’موجودین‘‘ خوانندگانِ کرام کے مطالعہ میں آئے گا۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا عبدالحمید کی ذات میں بہت سے اوصاف جمع فرمادیے تھے۔ تقسیم کے بعد ہندوستان میں جو حالات پیدا ہوئے، وہ مسلمانوں کے لیے بے حد تکلیف دہ تھے۔ ان حالات میں جن لوگوں نے ہندوستان میں سکونت اختیار کیے رکھی اور پھر اس ملک میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کو اپنا مقصد زندگی قرار دیا، وہ انتہائی باہمت لوگ ہیں۔ مولانا عبدالحمید کا شمار انہی عالی ہمت لوگوں میں ہوتا تھا۔ اللہ کی مدد ان کے شامل حال رہی اور انھوں نے بہت کام کیا۔ مولانا ممدوح کے اہم مقالات یہ ہیں۔

۱۔ مقالہ عربی بہ عنوان ’’نواب صدیق حسن خدمات اور کارنامے‘‘ مطبوعہ ماہنامہ ’’صوت الجامعہ‘‘ بنارس، پانچ قسطوں میں۔

۲۔ ’’مسلم پرسنل لا‘‘ پر جریدہ ترجمان کا خاص نمبر۔ اس میں مولانا کی تحریر۔

۳۔ ’’حج اور عیدالاضحیٰ‘‘ کے موضوع پر جریدہ ترجمان (دہلی) میں مولانا کی تحریرات۔

۴۔ عربی اور اردو میں ان کے مقالات جو مختلف جرائد میں چھپے۔

مولانا عبدالحمید رحمانی جن سرکاری اور غیر سرکاری مناصب پر فائز رہے، وہ یہ ہیں (۱) جنرل سیکرٹری مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند (۲) صدر جمعیت شبان المسلمین بنارس (۳) معاون سیکرٹری مسلم مجلس

Marfat.com

مشاورت ہند (۴) رکن کل ہند مسلم پرسنل لا بورڈ (۵) رکن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکشن کمیٹی (۶) رکن دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش (۷) رکن مجلس الثقۃ والتربیۃ الاسلامیہ جامعہ نگرنئی دہلی (۸) رکن مجلس عاملہ ایجوکیشنل ڈیویلپمنٹ آرگنائزیشن نئی دہلی (۹) جنرل ایڈوائزر جامعہ دارالسلام عمر آباد تامل ناڈو (۱۰) رکن مرکزی ایڈوائزر حج کمیٹی حکومت ہند (۱۱) رکن اقلیتی کمیشن حکومت ہند (۱۲) صدر مجمع البحوث الاسلامیہ، نئی دہلی (۱۳) رکن اساسی ورلڈ اسلامک کونسل لندن (۱۴) رکن مجلس تاسیسی اسلامی کونسل برائے مسلمانان جنوبی ایشیا سری لنکا۔

وفات سے کچھ عرصہ پہلے وہ بعض امراض کی گرفت میں آ گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انھیں شوگر کا عارضہ لاحق ہوگیا تھا جس کی وجہ سے وہ بہت کمزور ہوگئے تھے۔ بالآخر وقت موعود آ پہنچا اور وہ ۲۰۔ اگست ۲۰۱۳ء کو دہلی میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اللھم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه .

ان کے پسماندگان میں پانچ بیٹے ہیں۔ ایک بیٹی اور ایک اہلیہ۔ اللہ ان سب کا حامی و ناصر ہو۔

❁❁❁❁

Marfat.com

مولانا بشیر احمد اعوان

(وفات ۲۸۔ اگست ۲۰۱۳ء)

ضلع بہاول پور کی تحصیل احمد پور شرقیہ کی ''بستی نوناری'' احمد پور شرقیہ سے شمال مغرب میں پندرہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ بہت عرصہ پیشتر یہاں ایک بزرگ مولوی عبداللہ سکونت پذیر تھے جو اعوان برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ مولوی عبداللہ مسلکاً حنفی تھے اور اس علاقے کے پیر اور معزز بزرگ تھے۔ وہاں کی مسجد کے امام بھی وہی تھے۔ ان کے بیٹے مولوی حکیم کرم دین تھے جو اس نواح کے نامور عالم حضرت مولانا عبدالحق ہاشمی کے صحبت یافتہ اور عقیدت مند تھے۔

بستی نوناری میں مولانا عبدالحق ہاشمی مرحوم ومغفور کے بعض رشتے دار سکونت پذیر تھے اور ان سے میل ملاقات کے لیے ان کی وہاں آمدورفت رہتی تھی، جس کا سلسلہ ۱۹۳۰ء میں شروع ہوا تھا۔ اس موقعے پر بستی نوناری میں وہ وعظ بھی فرمایا کرتے تھے۔ وہ جیّد عالم دین ہونے کے علاوہ مشہور واعظ بھی تھے۔ ان کے وعظوں سے بے شمار لوگ متاثر ہوئے اور انھوں نے مسلکِ اہل حدیث سے وابستگی اختیار کی۔

مولوی حکیم کرم دین اور ان کے متعدد ساتھی بھی مولانا ہاشمی کے مواعظ سے اثر پذیر ہو کر اہل حدیث ہو گئے تھے اور خلافِ شرع رسوم ورواج کو ترک کر دیا تھا۔ مولوی کرم دین صاحب کا حضرت مولانا سلطان محمود (جلال پور والا) سے قلبی تعلق تھا اور وہ حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے اور مولانا ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

مسلک اہل حدیث سے وابستگی کی بنا پر بستی نوناری کے لوگوں نے مولوی کرم دین اور ان کے ساتھیوں کو مسجد میں جانے سے روک دیا تھا اور انھوں نے اپنی الگ مسجد تعمیر کر لی تھی۔

مولانا بشیر احمد اعوان انہی مولوی کرم دین کے فرزند تھے اور مولوی عبداللہ کے پوتے تھے۔ وہ بستی نوناری میں ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی پرائمری سکول میں حاصل کی اور کچھ دینی علوم کی تحصیل اپنے والد مکرم سے کی۔ جب علوم دینیہ کی کچھ سوجھ بوجھ ہو گئی تو ۱۹۳۵ء میں حضرت مولانا عبدالحق ہاشمی کی خدمت میں احمد پور شرقیہ چلے گئے اور ان کی درس گاہ ''المدرسة المحمدیه'' میں داخلہ لیا۔ اسی مدرسے میں انھوں نے مولانا عبدالحق ہاشمی کے والدِ محترم مولانا عبدالواحد ہاشمی (تلمیذ حضرت میاں سید نذیر حسین

Marfat.com

محدث دہلوی) سے فارسی کی بعض کتابیں پڑھیں۔

جب مولانا عبدالحق ہاشمی مکہ مکرمہ چلے گئے تو بشیر احمد اعوان نے جلال پور پیر والا کا عزم کیا اور وہاں کے دارالحدیث محمدیہ داخل ہو کر حضرت مولانا سلطان محمود اور دیگر ممتاز علمائے کرام سے اکتسابِ علم کرنے لگے۔ پھر وہیں علوم متداولہ کی تکمیل کی اور سند لی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد حضرت مولانا سلطان محمود کے فرمان کے مطابق اسی دارالحدیث میں خدمت تدریس سرانجام دینے لگے۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا، جس کے وہ استاذِ عالی قدر کی بارگاہِ فضیلت سے مستحق گردانے گئے۔

مولانا بشیر احمد اعوان کے اساتذہ کرام کی رفیع الشان جماعت میں مولانا عبدالواحد ہاشمی، مولانا عبدالحق ہاشمی، مولانا سلطان محمود، مولانا حبیب اللہ گمانوی اور مولانا عبدالغنی جاجروی کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مولانا بشیر احمد اعوان کے حالات مجھے میرے مخلص تریں دوست جناب حمید اللہ خاں عزیز ایڈیٹر ماہنامہ ''تفہیم الاسلام'' احمد پور شرقیہ نے ارسال کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ مولانا کا قد میانہ اور رنگ گورا تھا۔ کم گو، سنجیدگی پسند، نرم خو، سادہ مزاج اور قناعت پیشہ تھے۔

تبلیغ دین کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے اور اپنے عہد اور علاقے کے علما سے ان کے قلبی مراسم تھے، جن میں مولانا عبداللہ مظفر گڑھی، مولانا عبدالرزاق فاروقی، مولانا محمد حسین محمدی، جناب حمید اللہ خاں عزیز کے دادا حکیم فیض اللہ خاں، مولانا محمد ابراہیم سیال، قاری عبدالوکیل صدیقی اور پروفیسر عبداللہ بہاول پوری کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ افسوس ہے یہ سب حضرات اس عالمِ آب وگل سے رخصت ہو گئے ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کی تبلیغی اور اصلاحی مساعی کا انھیں بہتر اجر عطا فرمائے اور ان کا ٹھکانا جنت الفردوس ہو۔

مولانا بشیر احمد اعوان مناظرے کا ذوق بھی رکھتے تھے، ان کی کچھ تحریری بحثیں احمد پور شرقیہ کے شیعہ حضرات سے ہوئیں۔ یہ ان کا طالب علمی کا زمانہ تھا اور اس وقت وہ حضرت مولانا عبدالحق ہاشمی کے حلقۂ درس میں شامل تھے۔ مولانا ہاشمی کی نگرانی میں انھوں نے ''عظمتِ خلفائے راشدین'' کے نام سے ایک رسالہ بھی مرتب کیا تھا، جسے سردار محمد خاں درانی مرحوم نے چھپوا کر مفت تقسیم کیا تھا۔

مولانا محمد بشیر اعوان نامور مبلغ، ممتاز مدرس اور درویش صفت عالم تھے۔ انھوں نے ۹۳ برس کی عمر پا کر ۲۸۔ اگست ۲۰۱۳ء کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کی نماز جنازہ دوسرے دن (۲۹۔ اگست) کو صبح دس بجے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد رفیق اثری

Marfat.com

نے پڑھائی، جس میں خان پور، لیاقت پور، بہاول پور اور دیگر مقامات کے سیکڑوں لوگ شریک تھے۔

اللهم اغفر له وارحمه وعافه واعف عنه وادخله جنت الفردوس .

وفات کے وقت مولانا مرحوم کی نرینہ اولاد چار بیٹے تھے:

(۱) ماسٹر حفیظ اللہ (۲) مولانا ثناء اللہ اعوان (۳) ڈاکٹر محمد یحییٰ اور (۴) حافظ محمد داؤد۔

مولانا ثناء اللہ اعوان دارالحدیث محمدیہ جلال پور کے فارغ التحصیل ہیں۔ انھوں نے شیخ الحدیث مولانا سلطان محمود، مولانا محمد رفیق اثری اور مولانا اللہ یار خاں سے اخذِ فیض کیا۔ ۱۹۷۱ء میں سندِ فراغ لی۔ جامع مسجد اہل حدیث بستی نوناری کے منصبِ خطابت پر فائز ہیں اور وسیع حلقہ تلامذہ رکھتے ہیں۔

(یہ سطور ۲۹۔ جون ۲۰۱۴ء کو لکھی گئیں۔)

Marfat.com

مولانا حکیم محمد اکبر فاروقی

(وفات ۱۱۔نومبر ۲۰۱۳ء)

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ضلع پرتاپ گڑھ میں ایک گاؤں کا نام ''پریوانرائن پور'' ہے، جسے اہل حدیث کا گاؤں کہا جاتا ہے۔ اس گاؤں میں ۱۹۱۹ء میں مولانا حکیم محمد اکبر فاروقی پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام شیخ محمد زکریا اور دادا کا شیخ احسان اللہ تھا۔ گورے چٹے اور نہایت خوب صورت تھے، اسی لیے لوگ انھیں نواب صاحب کہا کرتے تھے۔

محمد اکبر فاروقی نے ابتدائی تعلیم خاندان کے ایک بزرگ شیخ محمد ایوب سے حاصل کی۔ قرآن مجید ناظرہ بھی انہی سے پڑھا۔ شیخ محمد ایوب صاحب، حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی مرحوم ومغفور کے باقاعدہ شاگرد تو نہ تھے، لیکن ان کی خدمت میں دہلی حاضری کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ دہلی جا کر ان کے ارشادات سننا اور ان سے اخذِ فیض کرنا ان کا معمول تھا۔ حضرت میاں صاحب کے واقعات وارشادات وہ بڑے شوق اور دلچسپ انداز میں بیان کیا کرتے تھے۔

مولانا محمد اکبر فاروقی کی ابتدائی زندگی میں دارالحدیث رحمانیہ کی تعمیر ہوئی اور اس میں درس وتدریس کا آغاز ہوا۔ اس کی تعمیر کے تمام اخراجات دہلی کے دو بھائیوں (شیخ عبدالرحمٰن اور شیخ عطاء الرحمٰن) نے اپنی جیب سے ادا کیے۔ پھر آگے چل کر اس میں تعلیم کا آغاز ہوا تو اساتذہ کی تنخواہیں بھی یہ خود ہی دیتے تھے اور طلبا کے قیام وطعام کا انتظام بھی یہی کرتے تھے۔ اس دارالحدیث کی پورے برصغیر میں شہرت تھی اور ملک کے مشہور اساتذہ خدمتِ تدریس انجام دیتے تھے۔ محمد اکبر فاروقی کے بعض قریبی طلبا اس میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ خود محمد اکبر بھی وہاں پہنچ گئے۔ یہ ۱۹۳۱ء کی بات ہے، لیکن عمر چھوٹی ہونے کی وجہ سے رحمانیہ میں تو داخل نہ ہوسکے، البتہ مدرسہ زبیدیہ میں داخلہ لیا۔ ابتدائی درجات کی تعلیم مدرسہ زبیدیہ میں حاصل کی۔ پھر دارالحدیث رحمانیہ میں داخل ہوگئے۔ وہاں ان کے ممتاز ساتھیوں میں مولانا محمد اقبال (کنڈ و بونڈھیار) اور شیخ سیف الرحمٰن احمد (بانی دارالحدیث مدینہ کے صاحب زادے) شامل تھے۔ اساتذہ میں حضرت مولانا احمد اللہ صاحب محدث پرتاپ گڑھی دہلوی، شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری، مولانا نذیر احمد رحمانی املوی، مولانا عبدالرحمٰن صاحب ڈاک مئوی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ صاحب ''تحفۃ الاحوذی''

Marfat.com

حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری بہ غرضِ علاج دہلی تشریف لائے تو مولانا محمد اکبر فاروقی نے ان سے بھی استفادہ کیا۔ ۱۹۳۸ء تک انھوں نے دارالحدیث رحمانیہ میں تعلیم حاصل کی۔ پھر اسی سال مولانا احمد اللہ صاحب دارالحدیث رحمانیہ سے استعفادے کر مدرسہ زبیدیہ آئے تو وہاں کے کئی طلبا مولانا کے ساتھ مدرسہ زبیدیہ میں آگئے، جن میں محمد اکبر فاروقی بھی شامل تھے۔

حضرت مولانا احمد اللہ صاحب مولانا محمد اکبر فاروقی صاحب پر بڑی شفقت فرماتے تھے، انھوں نے دیگر علوم سمیت حضرت مولانا پرتاپ گڑھی سے صحیح بخاری پڑھی اور صحیح مسلم کی دوسری جلد کا درس لیا۔ دینیات کی تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے طبیہ کالج قرول باغ (دہلی) میں داخلہ لیا اور وہاں سے کامل الطب والجراحت کی سند لی۔ بعدازاں حضرت مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے سند واجازہ کی سعادت سے بہرہ مند ہوئے۔

علوم آلیہ وعالیہ سے فراغت کے بعد وہ ۱۹۴۵ء میں دہرہ دون چلے گئے، وہاں اہل حدیث کی ایک ہی مسجد تھی، اس میں امامت وخطابت کے فرائض انجام دینا شروع کیے۔ اس سے دوسال بعد اگست ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا تو فسادات شروع ہوگئے، دہرہ دون بھی فسادات کی زد میں آ گیا۔ اب وہ کسی طرح وہاں سے نکلے اور اپنے وطن پر یوانرائن پور پہنچ گئے۔ گاؤں میں انھوں نے اپنا ذاتی مطب کھول لیا۔ دوسال وہ یہاں مطب کرتے رہے۔ پھر حالات میں کچھ اعتدال پیدا ہوا تو دہرہ دون کا قصد کیا اور وہاں کی میونسپلٹی کے یونانی دواخانہ میں بہ حیثیت حکیم متعین ہوئے۔ علاج معالجے میں دہرہ دون اور اس کے گردونواح میں انھوں نے بڑی شہرت پائی۔ یہاں تک کہ ہمالیہ کمپنی کے بورڈ ممبر کے ممبر بن گئے۔ ۱۹۸۴ء میں ریٹائر ہوئے۔

مولانا ممدوح اچھے خطیب تھے۔ آواز بلند اور پاٹ دار تھی۔ سامعین ان کی تقریر سے بے حد متاثر ہوتے تھے۔ زمانۂ طالب علمی میں کچھ مضامین بھی لکھے جو دارالحدیث رحمانیہ کے ماہنامہ ''محدث'' میں چھپے۔ پرہیزگاری اور تدین میں بھی ایک مقام رکھتے تھے۔

مولانا محمد اکبر فاروقی چوں کہ مولانا احمد اللہ صاحب پرتاپ گڑھی کے شاگرد تھے اور مولانا احمد اللہ صاحب حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے تلمیذ تھے۔ اس طرح مولانا محمد اکبر اور حضرت میاں صاحب کے درمیان صرف ایک واسطہ تھا، اس لیے عرب علمانے مولانا محمد اکبر سے سند واجازہ سے مفتخر ہونے کی سعی کی۔ آپ مدینہ منورہ گئے تو مسجد نبوی کے امام حذیفی نے آپ کے سامنے موطا امام مالک پڑھا اور اجازہ لیا۔ ان کے علاوہ شیخ عبدالعزیز فریح سابق رئیس قسم السنۃ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، شیخ ابوالعلی المنذری اور بعض دیگر علمانے بھی آپ سے سند واجازہ حاصل کیا۔

Marfat.com

کویت گئے تو وہاں کے علما نے بھی آپ سے حصول سند کی درخواست کی اور آپ نے انھیں سند دی۔ بحرین تشریف لے گئے تو وہاں کے شہزادے نے آپ کو بے حد اکرام کے مستحق گردانا۔

مولانا محمد اکبر فاروقی نے ۹۴ سال کی عمر پا کر ۱۱۔نومبر ۲۰۱۳ء کو دہرہ دون میں سفر آخرت اختیار کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون. مولانا ممدوح کے پسماندگان میں تین بیٹوں اور دو بیٹیوں کے علاوہ ماشاء اللہ پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں سے بھرا پڑا کنبہ آباد ہے۔

مولانا مرحوم کے علمی جانشین ان کے بھتیجے مولانا راحت اللہ فاروقی ہیں، جو مدرسہ محمدیہ منصورہ بالیگاؤں میں شیخ التفسیر اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ اس خاندان کے وفاتِ شدگان کی مغفرت فرمائے اور زندوں کو کتاب وسنت کی خدمت سرانجام دینے کی توفیق بخشے۔ آمین یارب العالمین۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ماہنامہ ''محدث'' بنارس، جنوری ۲۰۱۴ء)

❁❁❁❁

Marfat.com

مولانا ثناء اللہ مجاہد فیروز پوری

(وفات ۲۵۔فروری ۲۰۱۴ء)

تقسیم ملک سے قبل ایک شخص مسمّٰی امام الدین مشرقی پنجاب کے شہر فیروز پور میں سکونت پذیر تھے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں ملک کا بٹوارہ ہوا تو وہ ضلع بہاول نگر کے شہر ہارون آباد کے قریب موضع چک نمبر ۹۳۔۶ آر میں آ گئے اور فوج میں ملازمت اختیار کر لی۔ پھر وقت آیا کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے دو بیٹے دیے۔ ایک کا نام ثناء اللہ رکھا اور ایک کا عطاء اللہ۔ بیٹے کچھ بڑے ہوئے تو والدہ وفات پا گئیں اور ان کے باپ (امام الدین) کے دل میں ان کو دینی تعلیم دلانے کا خیال پیدا ہوا۔ اوڈاں والا ضلع فیصل آباد میں مدرسہ تعلیم الاسلام جاری تھا جو ایک مشہور بزرگ صوفی عبداللہ مرحوم و مغفور نے جاری کیا تھا۔ امام الدین اپنے دونوں بیٹوں کو لے کر صوفی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھیں اس مدرسے میں داخل کرا دیا گیا۔ یہ ۱۹۶۲ء کی بات ہے۔

یہ بچے اپنے وطن اور ماحول سے بہت دور تھے، اس لیے نئی جگہ میں اداس ہو گئے۔ چنانچہ اداسی سے مغلوب ہو کر عطاء اللہ تو واپس اپنے گاؤں چک نمبر 93/6R واپس چلا گیا لیکن ثناء اللہ نے کسی نہ کسی طرح ہمت سے کام لیا اور قدم جمائے رکھے۔ مدرسے کے بانی صوفی صاحب نے بھی ان سے شفقت کا برتاؤ کیا اور تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ تھوڑے عرصے کے بعد مدرسہ تعلیم الاسلام اوڈاں والا سے ماموں کانجن منتقل ہو گیا اور اس کا نام رکھا گیا جامعہ تعلیم الاسلام۔

صوفی صاحب نے ثناء اللہ کو مجاہد کا لقب دیا اور انھیں ثناء اللہ مجاہد کہا جانے لگا۔ ثناء اللہ مجاہد کا حصول علم کا ابتدائی دور تو اداسی کے سایہ میں گزرا لیکن پھر صورت حال نے پلٹا کھایا اور وہ محنت اور کامل توجہ سے تحصیل علم میں مشغول ہو گئے۔ صوفی صاحب نے بھی ان کے لیے دعائیں کیں۔ اللہ ان کی دعائیں قبول فرماتا تھا۔ ثناء اللہ کے لیے انھوں نے جو دعا کی وہ بھی اللہ کی بارگاہِ قدس میں قبولیت کے مرتبے کو پہنچی۔ یہ صوفی صاحب کے قریب رہے اور ان کی بڑی خدمت کی۔

ثناء اللہ مجاہد نے اوڈاں والا اور جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن میں جن اساتذہ کرام سے تعلیم حاصل کی، ان میں مولانا عبدالرشید اثاروی، مولانا محمد صادق خلیل، مولانا عبدالرشید ہزاروی اور مولانا پیر محمد یعقوب قریشی شامل ہیں۔ حضرت محدث حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ سے بھی انھیں اخذِ فیض کا شرف حاصل ہے۔

Marfat.com

مولانا ثناء اللہ مجاہد نے ۱۹۶۸ء میں پیر محمد یعقوب سے صحیح بخاری پڑھی اور اسی سال فارغ التحصیل ہوئے۔ انھوں نے عملی زندگی کا آغاز ضلع بہاول نگر کے موضع حافظاں والا سے کیا۔ ایک سال وہاں ان کا قیام رہا۔ اس کے بعد فیصل آباد چلے گئے۔ وہاں برکت پورہ میں کچھ عرصہ مقیم رہے۔ پھر وہاں سے ضلع بہاول نگر کے علاقہ کھچی والا میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ وہاں ۱۹۷۲ء میں مدرسہ تعلیم الاسلام کے نام سے تدریسی ادارہ قائم کیا۔ اس کی ابتدا یوں سمجھیے کہ ایک جھونپڑی سے کی گئی۔ پہلا جمعہ وہاں پڑھایا تو ان کے مقتدی صرف سات آدمی تھے، لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور کسی موقعے پر مایوسی کا اظہار نہیں کیا۔ دیہات میں سائیکل پر جاتے اور قرآن وحدیث کے مسائل سے لوگوں کو آگاہ کرتے۔ بعض اوقات دیہات میں وعظ وتبلیغ کے دوران ان پر پتھر بھی پھینکے گئے، مگر یہ اپنے کام میں مشغول رہے۔ پھر وقت آیا کہ لوگ غور اور انہماک سے ان کے مواعظ سننے لگے اور اردگرد کے دیہات میں جہاں کوئی اہل حدیث نہیں تھا، وہاں کے بے شمار لوگ مسلک اہل حدیث سے وابستہ ہوگئے اور اہل حدیث کی بہت سی مسجدیں تعمیر ہوگئیں۔

اپنے علاقے میں انھوں نے کئی مرتبہ تبلیغی جلسوں کے انعقاد کا بھی انتظام کیا، جس میں بعض مشہور علمائے کرام نے شرکت کی اور تقریر فرمائی۔ حافظ عبدالقادر روپڑی اور مولانا محمد حسین شیخوپوری بھی ان کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے۔ ان کی تقریروں میں مختلف دیہات کے لوگوں نے بکثرت شرکت کی اور بہت متاثر ہوئے۔

سید بدیع الدین راشدی مشہور عالم ومقرر تھے اور عربی، اردو، سندھی کی بہت سی کتابوں کے مصنف۔ وہ بھی وہاں تشریف لے گئے تھے۔ مولانا ثناء اللہ مجاہد کے طریق تبلیغ اور اسلوب تدریس سے متاثر ہو کر انھوں نے ان کو اپنے ہاں جانے کی دعوت دی اور ان حالات کے مطابق پانچ ہزار روپے ماہانہ دینے کی پیش کش فرمائی، لیکن مولانا ثناء اللہ مجاہد کھچی والا کو چھوڑ کر وہاں جانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ کھچی والا میں اس وقت انھیں صرف ڈھائی سو روپے ماہانہ ملتے تھے۔ انھوں نے پیر صاحب سے فرمایا۔ میں نے یہاں بہت محنت کی ہے۔ یہ لوگ مجھے جانتے ہیں، میں انھیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہاں کے ڈھائی سو چھوڑ کر علاقہ سندھ کے پانچ ہزار لینا مجھے منظور نہیں۔ مولانا کا یہ بہت بڑا ایثار تھا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کا اجر دیا ہوگا۔

وہ درس نظامی اور وفاق المدارس السلفیہ کے فاضل تھے۔ سرکاری طور پر بھی عربی فاضل تھے اور ایک گورنمنٹ سکول میں بہ طور عربی ٹیچر خدمت انجام دیتے تھے۔ اس کے ساتھ دو دینی مدرسے بھی چلا رہے تھے۔ ایک طلبا کا مدرسہ اور ایک طالبات کا۔ خود بخاری شریف پڑھاتے تھے۔ خطابت وتبلیغ کی ذمہ داریاں بھی ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔ کاموں کے اس ہجوم کی وجہ سے انھوں نے سرکاری ملازمت چھوڑ دی اور اپنے

Marfat.com

آپ کو کلی طور پر قرآن وحدیث کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔

ان کے ایثار کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو: طالبات کے مدرسے کی عمارت کا مسئلہ پیش آیا تو اپنی ذاتی زمین فروخت کر کے مدرسہ تعمیر کرایا، جس میں طالبات کی تعلیم کا سلسلہ آسانی سے آگے بڑھا۔ ان کی خود اپنی رہائش افرادِ خانہ سمیت صرف دو کمروں میں تھی۔

انھوں نے بے شمار طلبا و طالبات کو تعلیم دی اور انھیں ۳۶ سال صحیح بخاری پڑھانے کا اعزاز حاصل ہے۔

ان کو مجاہد کا لقب صوفی عبداللہ صاحب نے دیا تھا اور وہ واقعی مجاہدانہ طبیعت کے مالک تھے۔ کشادہ دل، بلند حوصلہ، اخلاق حسنہ کے حامل اور دست سخا سے متصف۔ لوگوں سے خوش دلی سے پیش آتے۔ کسی کے خلاف ان کے دل میں کوئی خفگی نہ تھی۔ نرم کلام اور شیریں گفتار۔ کسی سے کبھی تلخ کلامی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ کسی نے کوئی زیادتی کی تو اسی وقت معاف کر دیا۔ عابد وزاہد اور تہجد گزار۔ ان کی صالحیت کی بنا پر لوگ وصیت کرتے تھے کہ وہ اس کا جنازہ پڑھائیں۔ کوئی ضرورت مند آتا تو مولانا تو اس سے پورا تعاون کرتے۔

۲۸۔ جون ۲۰۱۳ء کو وہ ایک حادثے کی زد میں آگئے اور ان کی ریڑھ کی ہڈی فریکچر ہوگئی۔ مسلسل آٹھ مہینے چار پائی پر پڑے رہے۔ کسی نے بیماری کے متعلق پوچھا تو جواب میں ہمیشہ الحمد للہ کہا۔ انھیں قرآن مجید کے بیس پارے زبانی یاد تھے، ان کی تلاوت کرتے رہتے۔

اس مبلغ اسلام اور عامل کتاب وسنت نے ۲۵۔ فروری ۲۰۱۴ء کو وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.

حافظ عبدالستار حامد نے ان کا جنازہ پڑھایا، جس میں کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ.

پسماندگان میں ایک بیوہ، پانچ بیٹے اور ایک بیٹی چھوڑی۔ بیٹوں کے نام یہ ہیں: عمر فاروق، علی مرتضی، حافظ امیر معاویہ، عثمان غنی اور ابوطلحہ۔ بیٹی درس نظامی کی فاضلہ ہے اور مدرسۃ البنات کی ناظمہ۔

❀❀❀❀

Marfat.com

پینتیس موجودین

خدام حدیث

Marfat.com

Marfat.com

قاری محمد رمضان

(وفات ۲۵۔ اگست ۲۰۱۵ء)

کم وبیش چالیس برس قبل کی بات ہے کہ میں ایک عزیز کی شادی پر بورے والا گیا۔ وہاں چونتیس پینتیس سال کے ایک صحت مند جوان سے ملاقات ہوئی۔ پورا قد، بھرا ہوا گداز جسم، چوڑا چہرہ، گندمی رنگ میں سرخی کی جھلک، کشادہ سینہ، موٹی آنکھوں میں حیا کی آمیزش، کھلی جبیں، نہایت خندہ روئی سے پیش آئے۔ خود ہی اپنا تعارف کرایا میرا نام محمد رمضان ہے، جامعہ سلفیہ لائل پور میں بچوں کو قرآن مجید پڑھاتا ہوں۔ (اس وقت لائل پور کا نام فیصل آباد رکھ کر اسے مسلمان نہیں بنایا گیا تھا) قریب کھڑے ایک شخص نے لقمہ دیا، ان کا نام قاری محمد رمضان ہے، یعنی نام کے ساتھ ''قاری'' کا سابقہ لگایے۔ بات کچھ آگے بڑھی تو معلوم ہوا کہ ہم انہی کے بڑے بھائی عبداللہ کے گھر آئے ہیں۔

قاری محمد رمضان سے مل کر اور ان سے ہم کلام ہو کر بڑی مسرت ہوئی۔ وہ ملائم لہجے میں بات کرتے تھے اور بات کرتے وقت ان کے لبوں پر مسکراہٹ ابھرتی تھی۔ پتا چلا کہ وہ کئی سال سے جامعہ سلفیہ کے شعبہ تحفیظ القرآن سے منسلک ہیں اور بے شمار بچے ان سے قرآن مجید حفظ کر چکے ہیں اور بڑی تعداد میں حفظ کر رہے ہیں۔

وہ آزادیٔ ملک سے تین سال قبل ۸۔ جولائی ۱۹۴۴ء (۱۷۔ رجب ۱۳۶۳ھ) کو (سابق) ریاست بیکانیر کی تحصیل گنگانگر کے موضع چک صادر والی میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ملک سے پہلے برصغیر میں بڑی چھوٹی تقریباً چھے سو ریاستیں تھیں۔ آزادی کے تھوڑا عرصہ بعد حکومت ہند نے ریاستیں ختم کر دی تھیں۔ ریاست بیکانیر بھی جو ایک راجپوت ریاست تھی، ختم کر دی گئی تھی، بیکانیر کو ضلع بنا دیا گیا تھا، گنگانگر کو بھی (جسے اس وقت تحصیل کا درجہ حاصل تھا) ضلع بنا دیا گیا تھا۔ اس ریاست کا حکمران ہندو مسلمان تمام رعایا کا خیر خواہ تھا۔ تقسیم ملک کے بعد وہ نہیں چاہتا تھا کہ ریاست کی سکونت ترک کر کے مسلمان پاکستان جائیں، تاہم کافی تعداد میں مسلمان پاکستان آگئے تھے، لیکن خاصی تعداد میں وہاں بھی رہ گئے تھے اور اب بھی ہیں۔ بیکانیر کا علاقہ اب ہندوستان کے صوبہ راجستھان میں شامل ہے۔

قاری محمد رمضان کے والد کا نام رحمت اللہ تھا۔ یہ دین دار گھرانا تھا۔ پاکستان آکر یہ لوگ بورے والا کے قریب ایک گاؤں میں اقامت گزیں ہوئے اور کریانے کی چھوٹی سی دکان کھول کر گزر اوقات کرنے

Marfat.com

لگے۔ ایک مرتبہ کسی عزیز کی شادی پر گھر کے سب افراد گاؤں سے باہر گئے تھے کہ چور آئے اور گھر اور دکان سب سامان لوٹ کر لے گئے۔ اب یہ بالکل خالی ہاتھ تھے۔ گاؤں میں ان کا کوئی کاروبار نہ تھا۔ پریشانی کے عالم میں گاؤں سے نکلے اور بورے والا شہر آ گئے اور قاری صاحب کے سب بھائی چھوٹا موٹا کام کرنے لگے۔ ان کے والد رحمت اللہ نے کھل بنولے کا کام شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ حالات بدل گئے اور تنگ دستی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

بورے والا میں اس وقت اہل حدیث کی ایک ہی مسجد تھی جو قیام پاکستان کے بعد مولوی عبدالعزیز (سابق چیف جسٹس ریاست فرید کوٹ) اور دیگر حضرات کی کوشش سے بنائی گئی تھی۔ تعمیر مسجد کے کچھ عرصہ بعد مولانا عبداللہ گورداس پوری کو اس کے خطیب اور امام مقرر کیا گیا تھا، قاری محمد رمضان کے والد محترم نے اس مسجد میں اذان دینا شروع کی۔ مسلسل پچیس سال وہ اس مسجد میں پانچ وقت اذان دیتے رہے، تہجد کے وقت بھی اذان دیتے تھے۔ اذان کی وجہ سے ''بابا بانگا'' کے عرف سے معروف ہو گئے تھے۔

محمد رمضان نے سکول کی ابتدائی تعلیم کے بعد مولانا عبداللہ صاحب کی مسجد میں حافظ عبدالستار حسن سے قرآن حفظ کرنا شروع کیا اور حفظ کی تکمیل قاری انور علی اور خدا بخش سے کی۔ ان کے بھائیوں نے بھی حفظ قرآن کی سعادت حاصل کی۔ حفظ قرآن سے فارغ ہوئے تو قاری محمد رمضان کے بڑے بھائی عبدالجبار انھیں اوکاڑہ لائے اور جامعہ محمدیہ میں داخل کرا دیے گئے۔ جامعہ محمدیہ کے ناظم مولانا معین الدین لکھوی تھے۔ جامعہ میں خطبہ جمعہ بھی وہی دیتے تھے۔ صبح کی نماز کے بعد بالعموم درس قرآن بھی وہی دیا کرتے تھے۔ جامعہ محمدیہ میں اساتذہ کرام اس زمانے میں مندرجہ ذیل دس حضرات تھے۔

(۱) شیخ الحدیث مولانا محمد عبدہ الفلاح (۲) مولانا عبدالعزیز طور۔ یہ میاں محمد باقر مرحوم کے بھانجے اور داماد تھے۔ (۳) مولانا منیر الدین لکھوی (۴) حافظ محمد بن مولانا محی الدین لکھوی (۵) مولانا ہدایت اللہ ندوی (۶) حافظ بشیر احمد بھوجیانی (۷) مولانا محمد جمعہ خاں (۸) مولانا محمد اسحاق (۹) قاری محمد نواز (۱۰) قاری انور علی۔

ان حضرات میں سے اب صرف مولانا منیر الدین لکھوی زندہ ہیں جو چک نمبر ۱۸ نزد رینالہ خرد میں مدرسۃ البنات چلا رہے ہیں۔ اللہ ان کی زندگی دراز فرمائے۔ نو (۹) حضرات اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی میں پہنچ گئے ہیں۔ رحمہم اللہ تعالیٰ

جن حضرات نے طلبائے علم کی حیثیت سے قاری محمد رمضان کے ساتھ جامعہ محمدیہ میں تعلیم حاصل کی، ان میں مولانا حافظ عبدالعزیز علوی شیخ الحدیث جامعہ سلفیہ فیصل آباد شامل ہیں۔ ان دونوں کا سامان ایک ہی

Marfat.com

المارى ميں تھا اور کھانا پینا بھی اکٹھا تھا یعنی ہم پیالہ وہم نوالہ تھے۔ دونوں نے مولانا محمد عبدہ الفلاح سے صحیح بخاری، تفسیر بیضاوی، حجتہ اللہ البالغہ، المسامرہ، حسامی اکٹھے پڑھیں۔ چند اور طلبا بھی ان کے ہم سبق تھے۔ حافظ عبدالعزیز علوی کے بقول جامعہ محمدیہ اوکاڑہ سے وہ ۱۹۶۷ء میں فارغ ہوئے۔ فراغت کے بعد خانیوال میں دو سال مولانا علی محمد سعیدی کے مدرسے میں طلبا کو قرآن مجید حفظ کراتے رہے۔

پھر بورے والا آگئے اور کچھ عرصہ اپنے بھائی قاری عبدالحق کے ساتھ کریانے کی دکان پر کام کیا۔ اس اثنا میں حالات ایسے پیدا ہوئے کہ دکان کا کام چھوڑ دیا اور سعودی عرب چلے گئے۔ وہاں تقریباً سوا سال ان کا قیام رہا۔ پھر واپس آکر کچھ عرصہ بورے والا میں گزارا، بعدازاں فیصل آباد کی جامع مسجد الفردوس میں بہ طور خطیب تشریف لے آئے۔ اس سے چار پانچ سال بعد ان کا تقرر جامعہ سلفیہ کے شعبہ تحفیظ القرآن میں ہوگیا، لیکن جامع مسجد الفردوس میں خطابت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس مسجد کی مجلس انتظامیہ کے تمام ارکان ان سے انتہائی عقیدت مندانہ تعلق رکھتے تھے، یہ بھی ان سب کا بے احترام کرتے تھے۔

اپنے گھریلو معاملات اور بیاہ شادیوں کے سلسلے میں بھی وہ قاری صاحب سے مشورہ لیتے اور ان کی رائے پر عمل پیرا ہوتے۔ ان کے بچے ان سے قرآن مجید حفظ کرتے تھے۔

قاری صاحب جامعہ سلفیہ سے بہ درجہ غایت قلبی تعلق رکھتے تھے، اس کی ترقی کے لیے کوشاں رہنا انھوں نے اپنے آپ پر فرض قرار دے لیا تھا۔ فیصل آباد کے لوگوں سے ان کے تعلقات بہت وسیع تھے اور وہ ان سے جامعہ کے لیے بڑی رقم فراہم کرتے تھے۔ وہ جامعہ کے طلبا اور جامعہ کے اساتذہ سے نہایت محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔

قاری صاحب ممدوح صالح اور متقی عالم دین تھے۔ اخلاقِ حسنہ کا چلتا پھرتا پیکر اور عالی کردار مدرس۔ ان کی عام صحت بہت اچھی تھی۔ ۲۵۔ اگست ۲۰۱۵ء کی صبح کو وہ اچھے بھلے گھر سے نکلے اور جامعہ میں اپنے شعبہ تحفیظ القرآن میں آئے اور بچوں کو پڑھانے لگے۔ اس سے فارغ ہوکر اپنے کمرے میں گئے اور وہیں وقت موعود آپہنچا اور اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اس وقت کمرے میں اکیلے تھے۔ چند منٹ بعد ان کا ایک رفیق کمرے میں آیا تو دیکھا کہ مسجد الفردوس کے خطیب کا دھڑ یہاں پڑا ہے اور ان کی روح جنت الفردوس میں پہنچ گئی ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون.

ان کی تمام عمر صالحیت کی فضاؤں اور اعمال خیر کے ماحول میں گزری اور اسی فضا اور اسی ماحول میں ان کی موت واقع ہوئی۔ عیسوی تاریخ ۲۵۔ اگست ۲۰۱۵ اور ہجری ۹۔ ذیقعدہ ۱۴۳۶ھ تھی۔ منگل کا دن اور ساڑھے گیارہ بجے کا وقت۔

Marfat.com

اسی دن ان کی نماز جنازہ نماز عصر کے بعد جامعہ سلفیہ کے گرامی قدر استاذ حافظ مسعود عالم نے پڑھائی، جس میں جامعہ کے اساتذہ وطلبا اور فیصل آباد شہر کے بے شمار لوگوں نے شرکت کی۔

بعد ازاں ان کی میت ان کے گھر بورے والا لے جائی گئی۔ وہاں جامعہ سلفیہ کے شیخ الحدیث مولانا حافظ عبدالعزیز علوی نے دوسری نماز جنازہ پڑھائی، جس میں بورے والا شہر اور مرحوم کے اعزہ واحباب نے شرکت کی۔

اللّٰھم اغفر وارحمه وعافه واعف عنه

قاری صاحب مرحوم کی شادی ۱۹۶۸ء کو ہوئی۔ ان کی اولاد چھ بیٹے ہیں اور دو بیٹیاں۔ چھوٹے بیٹے کے سوا سب شادی شدہ اور برسرِ روزگار ہیں۔

ان کے ایک بیٹے کا نام قاری احمد فرحان بھٹی ہے۔ یہ والد کی جگہ مسجد الفردوس کے منصب خطابت پر فائز ہیں اور جامعہ سلفیہ کے شعبۂ تحفیظ القرآن میں خدمت انجام دیتے ہیں۔

جامعہ سلفیہ کی طرف سے ایک ماہانہ رسالہ ''ترجمان الحدیث'' کے نام سے شائع ہوتا ہے جس کے رئیس التحریر جامعہ کے پرنسپل پروفیسر محمد یاسین ظفر ہیں اور مدیر ہیں جامعہ کے مدرس حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی۔ اس کے عملہ ادارت نے قاری صاحب کی وفات کے بعد جو پہلا شمارہ شائع کیا وہ ان کے حالات اور ان کی تدریسی اور خطابتی کاوشوں پر مشتمل ہے، جامعہ کے متعدد مدرسین کے افکار عالیہ اس شمارے میں مندرج ہیں۔ ہر فاضل مضمون نگار نے قاری صاحب کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار خوب صورت انداز میں کیا ہے۔ کوئی صاحب قاری صاحب کی زندگی کے کسی پہلو پر لکھنا چاہیں تو اس شمارے سے انھیں مواد مہیا ہو جائے گا۔ اس شمارے میں اس خاک نشین کی چند سطور بھی درج ہیں جن کی حیثیت ان مضامین کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ معلوماتی اعتبار سے نہ اسلوب تحریر کے اعتبار سے۔!

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا محمد مستقیم سلفی

(ولادت ۲۵۔مئی ۱۹۴۶ء)

ہندوستان کے ممتاز مصنفین اور رفیع المنزلت مدرسین کی طویل فہرست میں مولانا محمد مستقیم سلفی کا اسم گرامی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ ۲۵۔مئی ۱۹۴۶ء کو موضع پھلوریا، پوسٹ امواپور، ضلع سدھارتھ نگر (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی محمد سعید تھا۔

مولانا محمد مستقیم سلفی نے ہندوستان کی جن مشہور جامعات میں تحصیل علم کی وہ ہیں: جامعہ رحمانیہ بنارس اور جامعہ سلفیہ بنارس۔

جن اساتذہ کرام سے اخذ فیض کیا وہ ہیں: شمس الحق سلفی، مولانا محمد زمان رحمانی، مولانا عبدالحنان فیضی، مولانا نذیر احمد رحمانی دہلوی، مولانا محمد ادریس آزاد رحمانی، مولانا عظیم اللہ مئوی، مولانا عبدالمعید بنارسی، ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری، مولانا عبدالوحید رحمانی، مولانا محمد عابد رحمانی۔

فارغ التحصیل ہونے بعد مولانا محمد مستقیم دو کاموں میں مشغول ہوئے۔ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں۔

درس وتدریس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۱ء تک دو سال موضع ویڈھن ضلع سیدھی (مدھیہ پردیش) میں خدمتِ تدریس انجام دی۔

۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۷ء تک پانچ سال جامعہ سراج العلوم جھنڈانگر (نیپال) میں مصروفِ تدریس رہے۔

۱۹۷۷ء تا ۱۹۷۹ء دو سال جامعہ سراج العلوم بونڈیہار (ضلع گونڈہ یوپی) میں سلسلہ تدریس جاری رکھا۔

۱۹۷۹ء میں جامعہ سلفیہ بنارس نے ان کی خدمات حاصل کرلیں۔

اب ان کی خدمت تصنیف وتالیف کی طرف آیے۔

جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات:

یہ ان کی انتہائی لائقِ ستائش خدمت ہے۔ یہ کتاب بڑے سائز کے ۸۵۶ صفحات پر محیط ہے جو ادارۃ البحوث الاسلامیہ والدعوۃ الافتاء بالجامعہ السلفیہ بنارس کی طرف سے فروری ۱۹۹۲ء (شعبان ۱۴۱۲ھ) میں شائع ہوئی۔ برصغیر کے علمائے اہل حدیث نے جو تصنیفی خدمات سرانجام دیں اور جس

Marfat.com

موضوع پر دیں، اس کی تفصیل (بہت حد تک) اس کتاب میں مذکور ہے۔ تقسیم ملک کی وجہ سے افسوس ہے علم بھی تقسیم ہو گیا، دراں حالاں کہ فیصلہ شہروں اور علاقوں کی تقسیم کا کیا گیا تھا۔ علم کی تقسیم کا نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے علم بھی بٹوارے کی زد میں آ گیا۔ میں کئی سال سے برصغیر پاک وہند کے علمائے کرام کے حالات لکھ رہا ہوں، لیکن مجھے بہت سے ہندوستانی علماء کے بارے میں معلومات نہیں ملتیں۔ اسی طرح ہندوستان کے علما بھی بہت سے پاکستانی علما کے متعلق بے خبر ہیں۔ ہمارے لیے امریکہ، برطانیہ اور فرانس وغیرہ ملکوں میں جانا آسان ہے، لیکن ہندوستان میں جانا مشکل ہے، جہاں ہماری تہذیب وثقافت کے نشانات جگہ جگہ موجود ہیں۔ اسی طرح ہندوستانی علماء کا پاکستان آ کر اپنے اسلاف کے متعلق معلومات فراہم کرنا تقریباً ناممکنات میں سے ہے۔ میں کہنا دراصل یہ چاہتا ہوں کہ کتاب ''جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات'' کے صفحات بہت سے مشہور پاکستانی مصنفین کی تصنیفات کے ناموں سے خالی ہیں، لیکن اس کے باوجود کتاب میں بہت کچھ آ گیا ہے۔ کتاب بیس فصلوں پر مشتمل اور مندرجہ ذیل مضامین کو اپنے صفحات میں لیے ہوئے ہے۔

پہلی فصل:...... کتب ترجمہ قرآن مجید۔ اس میں بتایا گیا ہے کن علمائے اہل حدیث نے ترجمہ قرآن کی خدمات انجام دی۔

دوسری فصل:...... کتب تفاسیر میں اہل حدیث کی جدوجہد۔

تیسری فصل:...... کتب حدیث، شروح حدیث، اصولِ حدیث۔

چوتھی فصل:...... کتب عقائد۔ اس میں توحید ذات وصفات باری تعالیٰ۔ حقیقتِ ایمان اور اس کی اقسام، رسالت ونبوت، معجزات، احوالِ قیامت وبرزخ، جنت وجہنم اور ان کے مستحقین اور کرامات سے متعلق اہل حدیث کی تصانیف کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

پانچویں فصل:...... اس میں طہارت، نماز، مسائل جمعہ، نمازِ جنازہ، نماز تراویح، نمازِ عیدین، قرأت فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر، اثبات رفع الیدین، زکوٰۃ، روزہ، حج وقربانی، نکاح وطلاق، حلال وحرام وغیرہ مسائل کے موضوعات پر اہل حدیث علما نے جو کتابیں تصنیف کیں، ان کی ایک لمبی فہرست موجود ہے۔ فتاوے، معاش واقتصاد، تہذیب وتمدن، مراث وفرائض، زیارتِ قبور، پردہ، ذکر ودعا اعمال صالحہ اور اعمال سیئہ، سنت اور حدود وتعزیرات سے متعلق بھی اہل حدیث حضرات کی تصانیف کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

چھٹی فصل:...... کتبِ اخلاق وتصوف پر مشتمل اہل حدیث مصنفین کی کتابوں کا ذکر۔

ساتویں فصل:...... کتب مجادلہ ومناظرہ۔ قرآن، حدیث، عقائد، رسالت ونبوت، فقہ، نماز ومساجد، شرک وبدعت، میلادِ مروّجہ، تقلید، رفض وتشیع۔

Marfat.com

آٹھویں فصل:......خطبات ومواعظ وصایا کے موضوع پر کتبِ اہل حدیث۔

نویں فصل:......کتب سیرت وسوانح، تاریخ، سفرنامے۔

دسویں فصل:......علمِ طب کے بارے میں اہل حدیث کی تصانیف۔

گیارھویں فصل:......کتبِ ادبیات، نثر، نظم وشعر، ناول وغیرہ یعنی اقسام ادب۔

بارھویں فصل:......کتب لغا۔

تیرھویں فصل:......کتب صرف ونحو۔

چودھویں فصل:......کتبِ منطق وفلسفہ۔

پندرھویں فصل:......کتبِ سیاست۔

سولھویں فصل:......کتبِ ادیان، یعنی نصرانیت، ہندو مذہب اور قادیانیت وغیرہ سے متعلق کتابیں۔

سترھویں فصل:......جماعت اہل حدیث یعنی اہل حدیث جماعت اور انجمنوں کے بارے میں۔

آٹھارھویں فصل:......اسلامی فرقے۔

انیسویں فصل:......ریویو وتعارف۔

بیسویں فصل:......متفرق کتابیں۔ اہل حدیث مصنفین کی چھوٹی بڑی مختلف کتابیں۔

استدراک:......تفسیر، حدیث، ذکر ودعا، کتبِ اخلاق وتصوف وغیرہ بہت سے موضوعات کی جو کتابیں ان بیس فصلوں میں کسی وجہ سے نہیں درج ہوسکیں، وہ استدراک میں درج کردی گئیں۔

اب اس کتاب کے مندرجات کے بارے میں چند ضروری باتیں۔

گزشتہ سطور میں عرض کرچکا ہوں کہ ہندوستانی علما اور پاکستانی علما کے درمیان رابطے کے فقدان یا کمی کی وجہ سے ایک دوسرے کی علمی نوعیت کی پوری سرگرمیوں سے مطلع ہونا بہت مشکل ہے۔ دونوں ملکوں کے دیوبندی علما کا بالعموم رابطہ رہتا ہے اور بہت حد تک ایک دوسرے کی علمی مساعی سے آگاہ ہیں، جب کہ اہل حدیث حضرات میں روابط کی بے حد کمی ہے اور کچھ پتا نہیں چلتا کہ کس ملک کے علمائے عظام کیا علمی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

مولانا محمد مستقیم کی اس کتاب میں جو اپنے موضوع کی اوّلیں کتاب ہے، اس کمی کو محسوس کیا گیا۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

☆......مولانا محمد حنیف ندوی جلیل القدر عالم دین تھے اور قابل ترین مصنف۔ میں پورے ہندوستان کی بات نہیں کرتا، صرف متحدہ پنجاب کی بات کرتا ہوں کہ اس میں پورے قرآن کی دو اردو تفسیریں لکھی گئیں،

Marfat.com

ایک مولانا ثناء اللہ مرحوم ومغفور امرتسری کی ''تفسیر ثنائی'' جو چار جلدوں میں اختتام کو پہنچی۔ اس کی پہلی جلد ۱۸۹۵ء میں چھپی اور آخری جلد ۱۸۔فروری ۱۹۳۱ء (۲۹۔رمضان المبارک ۱۳۴۹ھ) کو مکمل ہوئی۔

پورے قرآن مجید کی دوسری تفسیر (جو متحدہ پنجاب میں لکھی گئی) مولانا محمد حنیف ندوی کی تفسیر ''سراج البیان'' ہے جو ۱۹۳۴ء میں پہلی بار لاہور سے شائع ہوئی اور اس کے بعد کئی بار چھپی۔ لیکن مولانا محمد مستقیم کی کتاب ''جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات'' میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ مولانا محمد حنیف ندوی کی اور بھی بہت سی کتابیں ہیں مثلاً لسان القرآن (دو جلدیں نامکمل) مطالعہ قرآن، مطالعہ حدیث، اساسیات اسلام، مسئلہ اجتہاد، افکارِ غزالی، تعلیماتِ غزالی، افکار ابن خلدون وغیرہ۔ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض کتابوں کی اشاعت سے پہلے مولانا محمد مستقیم سلفی کی کتاب مرتب ہوگئی ہو مگر تفسیر سراج البیان سے مولانا سلفی کا جو تقسیم ملک سے بہت پہلے چھپی تھی، مطلع نہ ہونا عجیب سی بات ہے۔ ❶

مولانا محمد حنیف ندوی نے تقسیم ملک سے قبل ''صحیح بخاری'' کا ترجمہ بھی مع شرح کے شروع کیا تھا، اس کا ابتدائی حصہ چھپ گیا تھا، کچھ حصے کا مسودہ ضائع ہوگیا تھا، جو لاہور کے اشاعتی ادارہ ''ادبستان'' کے پاس تھا، مولانا کی وفات (۱۲۔جولائی ۱۹۸۷ء) کے بعد میری درخواست پر ''ادبستان'' والوں نے اسے تلاش کیا، لیکن مل نہیں سکا۔ زبان اور اسلوب بیان کے اعتبار سے یہ نہایت علمی کام تھا۔ اگرچہ مکمل نہ تھا، لیکن جتنا تھا، بہت اہم تھا۔

☆...... علامہ محمد اسد ۲۔جولائی ۱۹۰۰ء کو ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی زندگی مختلف منزلوں سے گزری۔ وہ دراصل آسٹریا کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے ستمبر ۱۹۲۶ء میں جرمنی کے دارالحکومت برلن جا کر مسلمانوں کی انجمن کے صدر کے سامنے کلمۂ شہادت پڑھا اور اسلام قبول کیا۔ بعدازاں ان کی اہلیہ بھی مسلمان ہوگئیں اور دونوں حج بیت اللہ کے لیے گئے۔ عمرہ کیا اور بیت اللہ شریف کی زیارت کر

❶ مولانا محمد مستقیم سلفی نے اس کتاب کی ساتویں فصل میں بعض فرقوں کے رد میں علمائے اہل حدیث کی تصانیف ذکر کی ہیں لیکن حیرت انگیز طور پر انھوں نے حضرت علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ اور ان کی کتب کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا بلکہ رد قادیانیت میں بھی ان کی کتب کا ذکر نہیں کیا۔ مزید حیرت اس بات پر ہوئی ہے کہ وہ اس کتاب کی تالیف کے دوران لاہور تشریف لائے اور یہاں بعض علمی مراکز کا سفر بھی کیا اور وہاں قیام پذیر بھی ہوئے۔ اور ان کی لائبریریوں سے استفادہ بھی کیا۔ مگر نامعلوم وجوہ کی بنا پر حضرت علامہ رحمہ اللہ کی تصانیف ان کی نظروں سے اوجھل رہیں۔ حالانکہ علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ بہر حال کسی بھی پاکستانی عالم دین کی نسبت دنیا بھر میں علمی، تحریکی اور سیاسی حلقوں میں زیادہ معروف تھے۔ اس کے ردعمل میں انڈیا سے ہی تعلق رکھنے والے ایک اہل علم مولانا عبدالغفار عبدالرزاق نے حضرت علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید کی سوانح مرتب کی اور بھارت سے اسے طبع کیا۔ یہ اس عقیدت ومحبت کا ثبوت تھا جو اہل ہند کو پاکستانی عالم دین سے تھی۔ مولانا عبدالغفار نے اپنی اس تحریر میں علامہ شہید کی تصنیفی خدمات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ (عمر فاروق قدوسی)

Marfat.com

کے بہت خوش ہوئے، لیکن اس سے نو دن بعد مکہ مکرمہ میں ان کی اہلیہ وفات پا گئیں۔

۱۹۳۲ء میں وہ برصغیر میں آئے۔ یہاں علامہ اقبال، مولانا محمد داؤد غزنوی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور دیگر بے شمار لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ پنجاب کے پہلے وزیر اعلیٰ نواب افتخار حسین خاں آف ممدوٹ تھے۔ انھوں نے علامہ محمد اسد سے رابطہ پیدا کر کے ۱۹۴۸ء میں اسلامی تعمیر نو (Reconstruction of Islam) کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس ادارے کے ڈائریکٹر علامہ محمد اسد کو اور ڈپٹی ڈائریکٹر سید نذیر نیازی کو بنایا گیا تھا۔ رفقاے ادارہ تھے مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا ابویحییٰ امام خاں نوشہروی، شاہ محمد جعفر پھلواری ندوی، سید شبیر احمد شاہ اور مولانا شفیق الرحمٰن لکھوی۔ اس ادارے کی طرف سے ''عرفات'' کے نام سے ایک ماہانہ مجلّہ بھی جاری کیا گیا تھا، جس میں انگریزی اور اردو مضامین شائع ہوتے تھے۔ لیکن یہ ادارہ پنجاب کے آخری انگریز گورنر فرانسس موڈی نے تھوڑے عرصے کے بعد ختم کر دیا تھا اور پنجاب اور پاکستان کی حکومت کا کوئی شخص گورنر فرانسس موڈی کے اس غلط اقدام کے خلاف احتجاج نہ کر سکا اور کسی کو یہ کہنے کی ہمت نہ پڑی کہ یہ ملک ہمارا ہے اور اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے بنایا گیا ہے، تم اس اسلامی ادارے کو کیوں ختم کر رہے ہو۔

بہرحال یہاں عرض یہ کرنا مقصود ہے کہ علامہ اسد کا اس وقت پاکستان ہی سے تعلق تھا، انھوں نے انگریزی میں مندرجہ ذیل کتابیں لکھیں:

۱۔ اسلام ایٹ دی کراس روڈ: اس کا اردو ترجمہ ''اسلام چوراہے پر'' کے نام سے ہوا۔

۲۔ روڈ ٹو مکہ: اس کا عربی میں ترجمہ ''الطریق الی مکۃ'' اور اردو ترجمہ ''طوفان سے ساحل تک'' کے نام سے کیا گیا۔

۳۔ علامہ اسد کی ایک اور انگریزی کتاب کا ترجمہ مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے ''اسلامی مملکت وحکومت کے بنیادی اصول'' کے نام سے کیا۔ یہ کتاب دراصل پاکستان کی حکومت کے لیے لکھی گئی تھی۔

۴۔ علامہ ممدوح نے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ کیا، جس کا نام ہے ''دی میسج آف دی قرآن''۔

۵۔ صحیح بخاری کا ترجمہ بھی انھوں نے قیام پاکستان کے ابتدائی زمانے میں کیا تھا۔

مولانا محمد مستقیم نے اپنی کتاب میں علامہ محمد اسد اور ان کی تصانیف کا ذکر نہیں فرمایا۔ علامہ ممدوح نے ۲۰۔فروری ۱۹۹۲ء کو وفات پائی۔ اللہ اس بہت بڑے خادمِ قرآن وحدیث کی مغفرت فرمائے۔

☆......حاشیہ تفسیر جامع البیان: مولانا محمد مستقیم سلفی نے ''جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات'' میں تحریر فرمایا ہے کہ تفسیر جامع البیان پر حاشیہ مولانا عبداللہ غزنوی نے لکھا (ص ۷)

Marfat.com

مولانا محمد مستقیم سلفی کو سہو ہو گیا ہے۔ یہ حاشیہ مولانا عبداللہ غزنوی نے نہیں لکھا بلکہ ان کے سب سے بڑے بیٹے مولانا محمد غزنوی نے لکھا جو افغانستان سے باپ کے ساتھ ہجرت کر کے امرتسر تشریف لائے تھے۔ وہ سید میاں سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد تھے۔

تفسیر جامع البیان پر یہ حاشیہ جو عربی زبان میں ہے، سب سے پہلے میاں فیروزالدین (ساکن جموں کشمیر) نے شائع کیا تھا، پھر یہ تفسیر مع حاشیہ مولانا محمد غزنوی ۱۸۹۲ء میں مطبع فاروقی دہلی سے شائع ہوئی۔

☆......ترجمہ ریاض الصالحین: مولانا محمد مستقیم رقم طراز ہیں کہ ''ریاض الصالحین'' کا ترجمہ مع متن عربی مولانا عبدالغفور غزنوی نے کیا۔

ریاض الصالحین کا یہ پہلا ترجمہ ہے جو مولانا عبدالغفور غزنوی نے نہیں بلکہ ان کے جدِ امجد مولانا سید عبداللہ غزنوی کے ایک ارادت مند مولانا احمد الدین کوموی نے کیا تھا (موضع کوم) ضلع لدھیانہ مشرقی پنجاب کا ایک مشہور قصبہ ہے، جس میں بہت سے اہل علم پیدا ہوئے۔ ''ریاض الصالحین'' کا یہ ترجمہ لاہور سے مولانا عبدالغفور غزنوی نے شائع کیا تھا۔ (مولانا عبدالغفور غزنوی، مولانا محمد غزنوی کے بیٹے اور مولانا عبداللہ غزنوی کے پوتے تھے۔)

☆...... نیز راس الباری علیٰ اطراف البخاری: یہ مولانا عبدالعزیز مرحوم خطیب جامع مسجد گوجراں والا کی تصنیف ہے۔ مولانا محمد مستقیم سلفی نے مولانا عبدالعزیز کو اہلِ حدیث قرار دیا ہے۔ یاد رہے، وہ اہل حدیث نہیں بلکہ وہ دیوبندی حنفی تھے۔ موضع سہال ضلع اٹک میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۹ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور شیخ الہند مولانا محمود حسن اور دارالعلوم کے دیگر اساتذہ سے اخذ علم کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ گوجراں والا تشریف لائے اور یہاں خطابتی وتدریسی خدمات سرانجام دینے لگے۔

اکتوبر ۱۹۴۰ء میں ان کی وفات ہوئی اور انھیں ان کے وطن سہال (ضلع اٹک) میں دفن کیا گیا۔

مولانا محمد مستقیم سلفی کی یہ تصنیف اپنی نوعیت کی اولین تصنیف ہے جو برصغیر پاک وہند کے مصنفین اور ان کی تصانیف کے باب میں دائرۃ المعارف کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر مولانا سلفی ہر مصنف کے مختصر حالات بھی لکھ دیتے تو کتاب کی اہمیت بہت بڑھ جاتی۔ بہر حال فاضل مصنف اور کتاب کے ناشر جامعہ سلفیہ بنارس کے اصحاب انتظام اس اہم خدمت پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ انھوں نے ایسا منفرد اور بہترین کام کیا ہے۔ جس کی طرف اس سے پہلے کسی کا دھیان نہیں گیا۔ بہت سے لوگوں نے ایک ایک اہلِ علم کی تصنیفات کا ذکر تو کیا ہے (وہ بھی قابل ستائش کام ہے) لیکن پورے برصغیر کے مصنفین کی مختلف موضوعات پر مشتمل تصانیف کا ایک ہی کتاب میں تذکرہ کرنے کی اس فقیر کے خیال میں یہ اولیں کوشش ہے، جس میں فاضل مصنف

Marfat.com

کامیاب رہے ہیں۔

اس کتاب سے خوانندگانِ محترم کو پتا چلا کہ برصغیر کے اہلِ حدیث مصنفین نے صرف نماز، روزے اور آمین، رفع الیدین وغیرہ کے موضوع پر ہی کتابیں نہیں لکھیں، بلکہ صرف ونحو، فلسفہ وحکمت، ادب وشعر، سیرت وسوانح، سفرنامے، تفسیر وحدیث ہر موضوع پر تصانیف کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔ پھر عربی، فارسی، اردو، پنجابی وغیرہ ہر اس زبان میں لکھا جو برصغیر میں بولی جاتی ہیں۔

اس کتاب کی طباعت کے بعد بھی عربی، انگریزی، اردو، ہندی، بنگلہ اور ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں بہت سی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ مولانا محمد مستقیم سلفی یا کسی اور صاحب کو ان کتابوں کا بھی کتابی صورت میں تذکرہ کر دیں تو یہ ان کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

مولانا محمد مستقیم کی تین اور کتابوں کا پتا چلا ہے۔ ان میں ایک کتاب کا نام ''فارغینِ جامعہ سلفیہ بنارس اور ان کی حیات وخدمات'' ہے اس کتاب کے مطالعہ کا ابھی تک اس فقیر کو شرف حاصل نہیں ہوا۔ یقین ہے ان شاءاللہ یہ کتاب بھی بہت سی معلومات پر محیط ہوگی۔

پاکستان کی جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) کا قیام، ہندوستان کی جامعہ سلفیہ (بنارس) سے آٹھ سال پہلے ۱۹۵۶ء میں ہوا۔ اب یہ فقیر اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ قارئینِ کرام دونوں ملکوں کی دونوں جامعات سے تعلق رکھنے والے اہلِ علم کی تصنیفی جدوجہد میں خود ہی موازنہ فرمالیں۔

جو حضرات جامعہ سلفیہ بنارس سے فراغت پاتے ہیں وہ سلفی کہلاتے ہیں، لیکن وہ لائق تکریم حضرات جو جامعہ سلفیہ فیصل آباد کے فارغ التحصیل ہیں، وہ سلفی کہلانے سے گریز فرماتے ہیں۔

مولانا محمد مستقیم سلفی کی تیسری کتاب کا نام ہے: ''گمراہ ومنحرف فرقوں کی تردید میں جماعت اہلِ حدیث کی خدمات ومساعی''۔ کتاب کے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب بھی اپنے موضوع کی نہایت اہم کتاب ہوگی۔

مولانا کی چوتھی کتاب کا نام ہے: پردہ کی شرعی حیثیت۔

فاضل مصنف کی مندرجہ بالا چار کتابوں کا علم ہوسکا ہے، اور آسمان سے بھی چار کتابیں نازل ہوئیں تھیں۔ پنجابی کا ایک شعر ہے

چار کتاباں عرشوں آئیاں
پنجواں آیا ڈنڈا

دعا ہے اللہ تعالیٰ مولانا محمد مستقیم سلفی کی زندگی درواز فرمائے اور وہ ہمیشہ خدمتِ علم میں مشغول رہیں۔

(یہ سطور یکم جون ۲۰۱۴ء کو لکھی گئیں)

Marfat.com

حافظ عبدالکبیر علوی

(ولادت ۱۹۴۶ء)

حافظ عبدالکبیر علوی درسیات کے ممتاز عالم اور استاذ الاساتذہ حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی کے صاحب زادۂ گرامی ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں موضع بڈھیمال ضلع فیروز پور (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباواجداد کا ضروری تذکرہ حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی کے حالات میں بیان کیا جا چکا ہے۔

حافظ صاحب مرحوم کی اولاد میں سب سے بڑے حافظ عبدالعزیز علوی ہیں جن کا تذکرہ میں نے اپنی ایک کتاب ''گلستان حدیث'' میں کیا ہے۔ ان سے چھوٹے یہی صاحب ترجمہ حافظ عبدالکبیر علوی ہیں۔ میانہ قد، گندم گوں، گداز بدن، متبع کتاب وسنت، مبلغ توحید۔ ابھی ایک سال کے بچے تھے کہ اگست ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہو گیا اور یہ لوگ ضلع فیصل آباد کی تحصیل جڑاں والا کے ایک گاؤں چک نمبر ۳۶ گ ب میں آبسے۔ عبدالکبیر نے اسی گاؤں میں اپنی تعلیم کا آغاز کیا اور سرکاری سکول میں پرائمری پاس کی۔

اس کے بعد ۱۹۵۷ء میں مولانا عبداللہ ویرووالوی کے جاری فرمودہ مدرسہ دارالقرآن والحدیث (فیصل آباد) میں داخلہ لیا۔ اس وقت ان کی عمر گیارہ سال کی تھی۔ اس مدرسے میں پانچ سال تعلیم حاصل کی۔ پھر جامعہ محمدیہ اوکاڑہ چلے گئے۔ وہاں دو سال مختلف اساتذہ کے حضور زانوے تلمذ تہ کیے۔ بعد ازاں پھر مدرسہ دارالقرآن والحدیث آ گئے اور اسی مدرسے میں حضرت مولانا عبداللہ ویرووالوی سے صحیح بخاری پڑھی اور سند فراغت لی۔ ۱۹۶۹ء میں حضرت محدث حافظ محمد گوندلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے دوبارہ صحیح بخاری پڑھنے کا شرف حاصل کیا۔ اس طرح انھوں نے دو عظیم القدر اساتذہ حدیث سے صحیح بخاری کا درس لیا اور ان کے طریقِ تدریسِ حدیث سے مستفید ہوئے۔ قاری محمد اسلم سے قرآن مجید حفظ کیا۔

۱۹۷۰ء میں سرگودھا کی جامع مسجد سے تدریس کا آغاز کیا، دو سال وہاں قیام رہا۔ وہاں سے مدرسہ دارالقرآن والحدیث (فیصل آباد) آ گئے، جسے اب کلیہ دارالقرآن والحدیث کہا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ وہاں سلسلہ تدریس جاری رہا۔ اس کے بعد شیخوپورہ، ملتان، حافظ آباد، آزاد کشمیر، فیصل آباد وغیرہ کے مختلف مدارس میں پڑھاتے رہے۔ اب کئی سال سے اپنے گاؤں چک نمبر ۳۶ گ ب کے مدرسہ عائشہ للبنات میں بہ حیثیت شیخ الحدیث خدمت تدریس انجام دے رہے ہیں۔ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اس مدرسے کا اجرا مولانا

Marfat.com

عتیق اللہ سلفی کی کوشش سے عمل میں آیا۔ اس نواح میں اس مدرسے کو بڑی شہرت حاصل ہے اور اس کا نہج تدریس خاص اہمیت رکھتا ہے۔

لڑکیوں کی دینی تعلیم کے اب بے شمار مدرسے جاری ہو گئے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق اس سلسلے کا پہلا مدرسہ آج سے ۸۸ سال قبل ۱۹۳۵ء میں میاں محمد باقر مرحوم نے اپنے گاؤں چک نمبر ۴۲۷ گ ب (تحصیل تاندلیاں والا ضلع فیصل آباد) میں جاری کیا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک بڑا مدرسہ تھا جو اللہ کے فضل سے اب بھی جاری ہے اور اچھے خاصے رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ بے شمار بچیاں اس میں دینیات کی تعلیم حاصل کر چکی ہیں۔

یہ سطور ۳۔ مارچ ۲۰۱۳ء کو لکھی جا رہی ہیں۔ حافظ عبدالکبیر علوی نے اب تک ایک دو کے سوا مختلف مدارس میں بہ طور شیخ الحدیث خدمات سرانجام دیں، کسی مدرسے میں تھوڑا عرصہ ان کا قیام رہا، کسی میں کچھ زیادہ عرصہ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ دینی احکام کے متعلق ان کی طبیعت میں سختی کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے اور مدارس کے ارباب انتظام سے کچھ اختلافات ابھر آتے ہیں، اس لیے ان کا وہاں رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی باخبر ہیں کہ حافظ صاحب موصوف کے مزاج میں زیادہ سختی ہے یا ارباب مدارس کی انتظامی حکمتیں ہیں کہ جن سے حافظ صاحب کا سمجھوتہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔

Marfat.com

حافظ محمد الیاس اثری

(ولادت ۱۹۴۷ء)

ضلع شیخوپورہ کے ایک گاؤں کا نام سدھاں والی ہے۔ اس کی آبادی اہل حدیث مسلک کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ اسی گاؤں میں ۱۹۴۷ء میں یعنی قیامِ پاکستان کے سال حافظ محمد الیاس اثری پیدا ہوئے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کی ولادت اگست کے مہینے میں ہوئی یا اس سے آگے پیچھے کسی اور مہینے میں۔ بہرکیف حافظ محمد الیاس اثری اور پاکستان دونوں ''توام'' ہیں یعنی جڑواں بھائی یا ہم عمر کہہ لیجیے۔

ان کے والد کا اسم گرامی حاجی محمد امین تھا۔ حافظ صاحب کی پیدائش سے تین سال بعد ۱۹۵۰ء میں بہت بڑا سیلاب آیا تھا اور مسلسل ۸۴ گھنٹے بارش ہوتی رہی تھی جس سے ان کا سارا گاؤں صفحۂ ہستی سے مٹ گیا تھا، صرف مسجد قائم رہی تھی اور وہ اب بھی قائم ہے۔ اسی نام سے یہ گاؤں بی-آر-بی نہر کے دوسری جانب آباد ہو گیا، لیکن حافظ محمد الیاس اثری کا خاندان سیلاب کے بعد یہاں سے بدوملہی چلا گیا تھا۔

تعلیم کا آغاز انھوں نے بدوملہی میں کیا۔ اس وقت حافظ محمد ابراہیم کمیر پوری مرحوم وہاں کی مسجد اہل حدیث کے خطیب تھے۔ ان کی اہلیہ مرحومہ حافظ قرآن تھیں، انھوں نے اس نیک بخت خاتون سے قرآن حفظ کرنا شروع کیا، لیکن جلد ہی یہ لوگ بدوملہی سے جلو موڑ (لاہور) چلے گئے، وہاں باٹا پور کی جامع مسجد میں قاری امیر الدین سے پڑھنے لگے۔ وہاں بھی تھوڑا عرصہ ہی قیام رہا اور لاہور چوک دالگراں کی مسجد قدس میں قاری فضل الٰہی کی خدمت میں پیش کر دیے گئے۔ لاہور سے پھر رختِ سفر باندھا اور دوبارہ بدوملہی چلے گئے۔ یہ خاندان تو بدوملہی میں رہا، لیکن محمد الیاس کو گکھڑ منڈی بھیج دیا گیا۔ وہاں ۱۹۶۱ء میں قرآن مجید حفظ کر کے واپس اپنے گھر بدوملہی آ گئے۔

ان دنوں نارنگ منڈی کی جامع مسجد اہل حدیث کے منصبِ خطابت پر مولانا شمشاد سلفی متمکن تھے۔ ان سطور کی تحریر (۱۵۔ مئی ۲۰۱۳ء) تک وہ وہیں ہیں۔ مشہور عالم دین اور نامور خطیب ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں حافظ الیاس صاحب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہاں کی جماعت اہل حدیث نے ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ صبح و شام بچوں کی تعلیم کی ذمہ داری ان کے سپرد ہوئی اور یہ خود مولانا محمد شمشاد سلفی سے مروجہ دینی نصاب کی کتابیں پڑھنے لگے۔ اس طرح انھوں نے وہاں بہت سے بچوں کو پڑھایا اور بعض نے ان سے

Marfat.com

قرآن مجید بھی حفظ کیا اور خود انھوں نے نصاب کے مطابق درس نظامی کی تکمیل کی۔ صحیح بخاری کی آخری حدیث کا درس مولانا ابو البرکات احمد مدراسی مرحوم ومغفور نے دیا۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے زمانے میں یہ وہیں تھے۔

اپنے استاذِ مکرم مولانا محمد شمشاد سلفی کے فرمان کے مطابق یہ نارنگ منڈی سے گوجراں والا کی جامعہ اسلامیہ چلے گئے۔ وہاں مختلف علوم وفنون کی تقریباً تمام کتابیں دوبارہ پڑھیں۔ جامعہ میں ان کے اساتذہ گرامی بہ ترتیب تواریخ وفات مندرجہ ذیل پانچ حضرات تھے:

۱۔ مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم کھوکھرکی ...... وفات ۱۹۶۷ء

۲۔ حضرت محدث حافظ محمد صاحب گوندلوی رحمہ اللہ ...... وفات ۱۹۸۵ء

۳۔ مولانا ابو البرکات احمد مدراسی مرحوم ...... وفات ۱۹۹۱ء

۴۔ مولانا قاری محمد یحییٰ بھوجیانی مرحوم ...... وفات ۱۹۹۷ء

۵۔ مولانا فاروق احمد راشدی موجودہ شیخ الحدیث، جامعہ اسلامیہ (اللہ ان کی عمر دراز فرمائے آمین)

۱۹۶۸ء میں انھیں گوجراں والا کی ٹاہلی والی مسجد میں امام اور مدرس مقرر کر لیا گیا تھا۔ کئی سال یہ سلسلہ جاری رہا۔ نماز مغرب کے بعد وہاں درسِ قرآن بھی دیا کرتے تھے۔

۱۹۷۱ء میں حافظ محمد الیاس اثری کے استاذِ مکرم مولانا ابو البرکات احمد نے ان کو اپنے ساتھ ہی جامعہ اسلامیہ (گوجراں والا) کی مسند درس پر متمکن کر لیا۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا جس سے یہ عالی قدر استاذ کی توجہ خاص سے نوازے گئے۔ اکیس سال انھوں نے وہاں خدمتِ تدریس انجام دی۔ ۱۹۹۱ء میں مولانا ابو البرکات کی وفات کا سانحہ پیش آیا تو بعض وجوہ کی بنا پر انھیں اس خدمت سے سبک دوش ہونا پڑا۔

حافظ محمد یحییٰ میر محمدی مرحوم ومغفور کی کوشش اور تحریک سے ۱۹۹۰ء کے قریب ٹاہلی والی مسجد میں ''مرکز الاصلاح'' کا قیام عمل میں آیا تھا، جس کا مقصد لوگوں کو اسلام کی تبلیغ کرنا تھا۔ حافظ صاحب مرحوم نے مقامی طور پر اس کی ذمہ داری حافظ محمد الیاس اثری کے سپرد کر دی۔ مختلف مقامات میں بہ حیثیت مبلغ جاتے اور اپنے انداز میں اسلام کی تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے تھے۔ بعد ازاں ۱۹۹۶ء میں نوشہرہ روڈ پر اس مرکز کے لیے الگ جگہ لے لی گئی۔ وہاں مرکز تبلیغ کے ساتھ ''مرکز العلوم الاثریہ'' بھی بن گیا۔ اس میں تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ بعد ازاں مرکز تبلیغ اور مرکز علوم اثریہ کو الگ الگ کر دیا گیا۔ اللہ کی مہربانی سے تدریس کا کام بھی ہو رہا ہے اور تبلیغ کا بھی۔ تبلیغ کے لیے علاقہ گلیات تک مبلغ جاتے ہیں اور وہاں کے لوگوں کے فہم کے مطابق آسان طریقے سے اسلام کا پیغام ان تک پہنچاتے ہیں۔ ان کی مالی مدد بھی کی جاتی ہے۔ اسی قسم کا مرکز اصلاح وتبلیغ

Marfat.com

کاموں کی میں بھی بنایا گیا ہے جو جی ٹی روڈ پر ضلع گوجراں والا کا مشہور شہر ہے۔

مولانا محمد الیاس اثری باہمت عالم دین ہیں، تدریس و تبلیغ کے ساتھ ساتھ انھوں نے تصنیفی کام بھی کیا، جس کی تفصیل یہ ہے۔

☆......کتاب التوسل:...... یہ بزرگان دین کے وسیلے کے موضوع پر اچھی کتاب ہے۔ مشتمل بر صفحات ۱۸۰

☆......القول الانیق:......اس کا موضوع یہ ہے کہ ایامِ قربانی چار ہیں۔ یہ ۴۰ صفحات کا رسالہ ہے۔

☆......تفسیر سورہ یوسف:...... یہ دو سو صفحات کی کتاب ہے۔

☆......ذکر الکبائر:......اس میں ستر (۷۰) کبیرہ گناہوں کا ذکر ہے۔

☆......ترجمہ نیل المرام:...... یہ حضرت نواب صدیق حسن خان صاحب کی کتاب ہے جو آیاتِ احکام پر مشتمل ہے۔ حافظ محمد الیاس اثری نے اس کا اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔

☆......افادۃ الشیخین:...... یہ حضرت محدث حافظ محمد گوندلوی اور مولانا ابو البرکات احمد مدراسی کے وہ افادات ہیں جو وہ صحیح بخاری کی تدریس کے آغاز میں بیان فرمایا کرتے تھے۔ مولانا محمد اسماعیل صاحب کے بعض افادات بھی اس میں شامل ہیں۔

حافظ محمد الیاس اثری کا اصل اور بنیادی کام تدریس ہے جو وہ تینتالیس (۴۳) سال سے باقاعدگی کے ساتھ کر رہے ہیں اور یہ نہایت اہم کام ہے۔ ان کا طریقِ تدریس بہت عمدہ ہے۔ طلبا کو ہر فن کی کتاب کا ہر مسئلہ سمجھانے کی وہ پوری کوشش کرتے ہیں۔

ان کے شاگردوں کی وسیع فہرست میں مندرجہ ذیل حضرات شامل ہیں۔

حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی مدرس جامعہ سلفیہ و مدیر ترجمان الحدیث فیصل آباد، حافظ ثناء اللہ زاہدی شیخ الحدیث صادق آباد، پاکستان کے ممتاز و نامور استاذ الاساتذہ قاری محمد ادریس عاصم لاہور، حافظ عبدالحمید عامر مہتمم جامعہ علوم اثریہ جہلم، پروفیسر حافظ عبدالستار حامد وزیر آباد، مولانا ندیم شہباز مدرس جامعہ سلفیہ فیصل آباد، مولانا عبدالسمیع بن مولانا ابو البرکات احمد مدرس جامعہ اسلامیہ گوجراں والا، پروفیسر سرفراز لکھوی دیپال پور، پروفیسر ذوالفقار احمد ریسرچ سنٹر دار السلام لاہور، مولانا عبدالسلام کوٹ بھوانی داس ضلع گوجراں والا، حافظ محمد عباس انجم گوندلوی اور دیگر بہت سے حضرات جو مختلف مدارس میں خدمت تدریس میں مصروف ہیں۔

ہمارے عزیز دوست قاضی عبدالقدیر خاموش ان کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ انھوں نے حافظ صاحب سے پچیس (۲۵) متفرق درسی کتب پڑھیں جو مختلف موضوعات اور فنون پر مشتمل ہیں۔ قاضی صاحب نے ایک مرتبہ اپنے گاؤں ہیل (ضلع گجرات) میں اپنی تنظیم مسلم کرسچن فیڈریشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام علما و

Marfat.com

مدرسین کی تین روزہ ورکشاپ منعقد کی تھی۔ دسمبر کے آخری دن تھے اور سردی زوروں پر تھی۔ قاضی صاحب کا گھر نوتعمیر تھا۔ اس پروگرام میں حافظ محمد الیاس اثری بھی اپنے تلمیذ رشید کی دعوت پر شریک ہوئے تھے۔ میں بھی عزیزم عمر فاروق قدوسی کے ہمراہ قاضی عبدالقدیر خاموش کی دعوت پر اس اجتماع میں شریک تھا۔

اب حافظ محمد الیاس اثری کے چندان شاگردانِ گرامی کا ذکر کیا جاتا ہے جو اس دنیا سے رخصت ہو کر عالم جاودانی میں پہنچ گئے ہیں اور انھوں نے اپنی زندگی میں تدریسی، خطابتی اور تصنیفی صورت میں بے حد جدوجہد کی۔ ان میں مولانا محمد یحییٰ گوندلوی، قاری عبدالوکیل صدیقی خان پوری اور مولانا فاروق اصغر صارم گوجراں والا شامل ہیں۔ رحمهم الله تعالی۔

حافظ محمد الیاس اثری کی شادی ۱۸۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو ہوئی۔ اولاد پانچ بیٹے ہیں اور دو بیٹیاں۔ بڑے دو بیٹے عبدالحنان مغل اور عبدالمنان مغل کاروبار کرتے ہیں۔ تیسرے بیٹے عبدالدیان اثری باقاعدہ عالم دین ہیں اور والد مکرم کے ساتھ مرکز العلوم الاثریہ میں مدرس ہیں۔ اور گوجراں والا کی جامع مسجد صدیق اکبر میں خطیب ہیں۔ چوتھے بیٹے حافظ عبدالرحمٰن نے قراءت و تجوید کا علم بھی پڑھا ہے۔ آگے شاید وہ مزید علم کی تحصیل کریں گے۔ ان چار بیٹوں کے بعد دو بیٹیوں کی ولادت ہوئی۔ سب سے چھوٹے بیٹے کا نام عبدالعلام ہے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ اس خاندان کا حامی و ناصر ہو۔ آمین

(یہ سطور ۱۵۔ مئی ۲۰۱۳ء کو لکھی گئیں۔)

❀❀❀❀

Marfat.com

حافظ عبد العلیم علوی

(ولادت ۱۹۴۹ء)

درمیانہ قد، گورا رنگ، چھریرا بدن، نیلی آنکھیں، ہنس مکھ، خوش کلام، ملن سار، بہت اچھے مدرس، نیک اطوار، علم کے ساتھ موقع ومحل کے مطابق مصلحت کا بھی خیال رکھنے والے۔ یہ ہیں حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی کے فرزند خوش خصال حافظ عبدالعلیم علوی، جن کی ولادت ۱۹۴۹ء کو موضع چک نمبر ۳۶ گ ب (ضلع فیصل آباد) میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے سرکاری سکول میں پائی۔ قرآن مجید ناظرہ گھر میں پڑھا۔ ان کے بچپن کا زمانہ عجیب قسم کا تھا۔ والد ایک دینی مدرسے میں پڑھاتے تھے۔ دونوں بڑے بھائی حافظ عبدالعزیز علوی اور حافظ عبدالکبیر علوی بعض مدارس میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور گھر سے باہر تھے۔ والدہ بیمار تھیں۔ عبدالعلیم سکول میں تعلیم بھی پاتے تھے اور گھریلو کام بھی کرتے تھے۔ تین بہنیں تھیں۔ مال مویشی کے لیے چارہ بھی لاتے، ان کا دودھ بھی دوہتے اور ان کے گوبر وغیرہ سے گھر بھی پوتا کرتے۔ اس طرح ابتداء ہی سے کام کی عادت پڑ گئی اور زندگی کے شب وروز عجیب طرح کے قالب میں ڈھلنے لگے۔

دینیات کی تعلیم کا آغاز مدرسہ رحمانیہ موضع ڈھلیانہ (ضلع اوکاڑہ) سے ہوا، جہاں اس وقت ان کے والد مکرم حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی خدمت تدریس پر مامور تھے۔ مدرسے کے نصاب کی رو سے پہلی جماعت وہیں پڑھی۔

پھر کلیۃ القرآن والحدیث (فیصل آباد) آ گئے۔ وہاں تین سال رہے۔ اس اثنا میں بلوغ المرام کا کچھ حصہ اور مشکوٰۃ شریف کا حصہ اول پڑھا۔ پھر علم صرف کی فصول اکبری، علم الصیغہ اور بعض دیگر فنون کی کتابیں پڑھیں۔ یہ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کا زمانہ تھا۔

اس کے بعد جامعہ محمدیہ (جی ٹی روڈ گوجرانوالا) میں داخلہ لیا اور وہاں حافظ عبدالسلام بھٹوی، حافظ عبدالمنان نورپوری، مولانا عبدالحمید ہزاروی، مولانا محمد رفیق سلفی، مولانا جمعہ خاں اور بعض دیگر اساتذہ سے تحصیل علم کی۔ اس وقت ڈاکٹر فضل الٰہی بھی وہیں تھے۔ ان دونوں نے علم مناظرہ کی کتاب رشیدیہ اکٹھے پڑھی۔

حافظ عبدالعلیم علوی نے صحیح بخاری حضرت حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ سے پڑھی۔ یہ خوبصورت اتفاق ہے کہ ان کے والد حافظ احمد اللہ اور دونوں بڑے بھائیوں حافظ عبدالعزیز علوی اور حافظ عبدالکبیر علوی نے بھی صحیح

Marfat.com

بخاری حضرت حافظ گوندلوی سے پڑھی تھی۔شاید حافظ گوندلوی صاحب کے تلامذہ میں ایسی مثال نہ ہو۔

۱۹۷۳ء میں حافظ عبدالعلیم علوی جامعہ محمدیہ (گوجراں والا) سے فارغ ہوئے تو اسی سال وہاں اعزازی طور پر تدریس شروع کر دی پھر دارالعلوم محمدیہ شیخوپورہ چلے گئے، وہاں پانچ سال ان کا سلسلہ تدریس جاری رہا۔ وہاں سے پھر جامعہ محمدیہ گوجراں والا آ گئے اور ایک سال وہاں رہے۔اس وقت ان کے بڑے بھائی حافظ عبدالعزیز علوی راولپنڈی کے مدرسہ تدریس القرآن میں پڑھاتے تھے، یہ بھی ان کے پاس وہیں چلے گئے، لیکن انھیں وہاں کی آب و ہوا موافق نہ آئی، ایک سال بعد واپس آ گئے اور جامعہ محمدیہ شیخوپورہ میں خدمت تدریس انجام دینے لگے۔نو سال وہاں ان کا قیام رہا۔پھر ایک سال چینیاں والی مسجد (لاہور) میں پڑھایا۔بعدازاں مولانا عبداللہ امجد چھتوی کے مدرسہ اشاعت العلوم چک نمبر ۱۴۹ (نزد عارف والا) تشریف لے گئے۔پانچ سال وہاں تدریس کی۔پھر ایک سال جامعہ محمدیہ عام خاص باغ ملتان میں مدرس رہے۔ملتان سے ۱۹۹۱ء میں جامعہ اسلامیہ گوجراں والا آ گئے اور مسلسل بیس سال اس جامعہ میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور اس اثنا میں ان سے بے شمار شائقین علوم دینیہ نے اخذ فیض کیا۔ بہت سال ہوئے، مجھے گوجراں والا کے ایک تدریسی ادارے میں مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق مقالہ پڑھنے کے لیے بلایا گیا تھا۔میں وہاں گیا اور مقالہ پڑھا۔حافظ عبدالعلیم علوی بھی سامعین میں موجود تھے اور میرے قریب ہی بیٹھے تھے۔انھیں دیکھ کر اور ان سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی۔

علالت کی وجہ سے ۲۰۱۰ء میں جامعہ اسلامیہ سے فیصل آباد کے کلیۃ القرآن والحدیث آ گئے اور وہاں اب خدمت تدریس میں مشغول ہیں۔یہ سطور ۳۔ مارچ ۲۰۱۳ء کو تحریر کی گئی ہیں اور ماشاء اللہ حافظ عبدالعلیم علوی فریضہ تدریس انجام دے رہے ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کا حامی و ناصر ہو۔

❀❀❀❀

Marfat.com

صوفی گلزار احمد

(ولادت ۱۵۔ اپریل ۱۹۵۰ء)

ان کا سلسلہ نسب یہ ہے: گلزار احمد بن محمد غوث خاں بن گوہر خاں بن ذوالفقار خاں۔ چھریرا بدن، نکلتا ہوا قد، گندم گوں، میٹھا اسلوب گفتگو، بہترین معلم، تقویٰ و صالحیت کی نعمت سے مالا مال۔ طلباء کے ہمدرد، اہل علم کے قدردان، نرم مزاج، شلوار قمیص میں ملبوس ۔ یہ ہیں صوفی گلزار احمد جو فیصل آباد کے دارالقرآن والحدیث کی مسند شیخ الحدیث پر فائز ہیں۔

صوفی گلزار احمد کی تاریخ ولادت کا صحیح طور پر علم نہیں ہو سکا۔ قیام پاکستان کے بعد انھیں سرکاری سکول میں داخل کرایا گیا تو تاریخ ولادت ۱۵۔ اپریل ۱۹۵۰ء لکھا دی گئی۔ اصل تاریخ ولادت اس سے پہلے کی ہے۔ وہ قیام پاکستان سے قبل ضلع امرتسر کی تحصیل اجنالہ کے گاؤں سارنگ دیو میں پیدا ہوئے جو سارنگڑا کے نام سے معروف تھا۔ اگر انھیں پانچ سال کی عمر میں سکول میں داخل کرایا گیا ہو تو ان کی تاریخ ولادت اپریل ۱۹۴۵ء ہونی چاہیے۔ بہرحال سکول میں داخلے کے مطابق وہ ۱۵۔ اپریل ۱۹۵۰ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا خاندانی تعلق راجپوت بھٹی برادری سے ہے اور کھیتی باڑی ان کا پیشہ تھا۔ تقسیم ملک سے پہلے پچیس تیس برس ان کے والد لاہور میں ملازمت کرتے رہے۔ پھر گاؤں جا کر کاشت کاری کرنے لگے تھے۔ ترک وطن کے بعد تقریباً پوری برادری چک نمبر ۲۹ ج ب شمالی (ضلع فیصل آباد) امین پور روڈ میں آباد ہوئی۔ برادری کے سربراہ چودھری خورشید عالم خاں ذیلدار تھے۔ اس خاندان میں دینی تعلیم کسی نے حاصل نہیں کی تھی۔ البتہ نماز، روزے کے سب لوگ پابند تھے اور مسلکاً حنفی تھے۔ گلزار احمد کا رابطہ ایک مرتبہ ایک بزرگ سید محمد اکرم شاہ گیلانی سے ہوا تو ان کی وساطت سے حکیم محمد صادق سیالکوٹی مرحوم کی کتاب ''صلوٰۃ الرسول'' انھیں حاصل ہوئی۔ اسے پڑھ کر دینی مسائل کی سمجھ آئی اور پھر مزید مطالعہ کا موقع ملا تو مسلک اہل حدیث قبول کر لیا۔

صوفی گلزار احمد نے ابتدائی تعلیم مڈل سکول چک نمبر ۳۰ ج ب فیض پور امین پور روڈ (فیصل آباد) میں پائی۔ پرائمری کے امتحان میں سکالرشپ حاصل کیا اور مڈل کے امتحان میں بھی سکالرشپ کے مستحق قرار پائے۔ بعد ازاں سکول کی تعلیم چھوڑ دی اور ۲۹۔ فروری ۱۹۶۴ء کو ہفتے کے روز مولانا عبداللہ ویرووالوی کے جاری کردہ دارالقرآن والحدیث (فیصل آباد) میں داخل ہو گئے اور دینی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔

Marfat.com

انھوں نے پوری مروجہ تعلیم وہیں حاصل کی۔ اساتذہ کے اسمائے گرامی ہیں: مولانا عبداللہ امجد چھتوی، مولانا محمد اسحاق خائف، مولانا محمد خاں، مفتی غلام اللہ ربانی۔ مدرسے کے نصاب کی انتہائی درجے کی کتابیں شیخ الحدیث مولانا عبداللہ ویروِوالوی سے پڑھیں۔ ان لائق تکریم اساتذہ کی جماعت میں سے اب حضرت مولانا عبداللہ امجد چھتوی زندہ ہیں اور مرکز الدعوۃ السلفیہ ستیانہ بنگلہ کے منصب شیخ الحدیث پر فائز ہیں۔ باقی تمام اساتذہ وفات پا چکے ہیں۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔ [1]

۱۹۷۱ء میں صوفی گلزار احمد نے سند فراغ لی۔ استاذ مکرم مولانا عبداللہ ویروِوالوی نے ان سے اور مولانا محمد ہود سے وعدہ لیا تھا کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ اسی مدرسے میں خدمت تدریس انجام دیں گے۔ چنانچہ اس وقت سے اب تک وہ یہیں سلسلہ تدریس جاری رکھے ہوئے ہیں۔

مولانا گلزار احمد نے مروجہ تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۹۷۱ء میں دارالقرآن والحدیث میں درس وتدریس کا آغاز کیا تھا۔ اب تک بے شمار شائقینِ علوم ان کے حلقۂ شاگردی میں شامل ہو چکے ہیں، جن میں سے چند حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

۱۔ مولانا محمد انس مدنی	مدیر کلیۃ دارالقرآن والحدیث فیصل آباد
۲۔ مولانا محمد یٰسین ظفر	مدیر جامعہ سلفیہ فیصل آباد
۳۔ مولانا عبدالحی عابد	شیخ الحدیث، کوٹ ادو
۴۔ مولانا عبدالحی انصاری	ادارہ علوم اثریہ فیصل آباد
۵۔ مولانا محمد نصراللہ عزیز	مہتمم مرکز اہل حدیث غلام محمد آباد، فیصل آباد
۶۔ مولانا امان اللہ مجاہد	خطیب جامع مسجد اہل حدیث سیالکوٹ
۷۔ مولانا عبدالقدیر شرفی	دسوہہ
۸۔ مولانا محمد ادریس سلفی	ناظم امتحانات جامعہ سلفیہ فیصل آباد
۹۔ مولانا محمد صدیق	مدرس جامعہ سلفیہ فیصل آباد
۱۰۔ مولانا محمد یونس خلیق	خطیب رضا آباد

صوفی گلزار احمد کو زمانہ طالب علمی ہی سے خطابت اور مناظروں سے دلچسپی ہے، بالخصوص مرزائیت سے متعلق ان کی معلومات بڑی وسیع ہیں۔ طالب علمی کے دور میں دارالقرآن والحدیث کے ہفتہ واری اجلاسوں میں وہ جس موضوع پر تقریر کرتے ہیں، اس کے تمام گوشوں کی وضاحت فرماتے ہیں۔ ان اجلاسوں میں انھوں نے

[1] شیخ الحدیث حضرت مولانا عبداللہ امجد چھتوی بھی مورخہ ۱۵ اگست ۲۰۱۷ء کو وفات پا چکے ہیں۔

Marfat.com

نے "القول الصریح فی حیات المسیح" کے عنوان سے متعدد تقریریں کی ہیں۔

فیصل آباد کے بعض مرزائیوں کے گھروں میں جا کر ان سے مناظرے اور مباحثے کیے۔ جن کے بہت اچھے نتائج نکلے ہیں۔

۱۹۷۴ء میں ان کی شادی ہوئی، جس میں ان کے استاد محترم حضرت مولانا عبداللہ ویروowالوی نے بھی شرکت فرمائی۔ مولانا ویرووالوی تقویٰ اور پرہیزگاری میں بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ شادی میں کوئی غیر شرعی حرکت ہوئی تو وہ واپس آ جائیں گے۔ اللہ کی مہربانی سے کوئی غیر شرعی حرکت نہیں ہوئی اور مولانا اس سے خوش ہوئے۔ یہی ذہن خود صوفی گلزار احمد کا ہے۔ ان کے بھائی کی شادی میں انھیں گانے بجانے کا شبہ پڑا تو وہی موقف اختیار کیا جو استاذ مکرم کا تھا، چنانچہ خطرہ دور ہو گیا اور بھائی کی شادی شرعی طریقے سے انجام پا گئی۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ صوفی گلزار احمد کو اپنے دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

❀❀❀❀

Marfat.com

حکیم محمد ابراہیم طارق ایم اے

(ولادت ۲۱۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء)

ان کا مختصر سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد ابراہیم طارق بن حاجی محمد حسین بن حاجی محمد اسحاق۔ ۱۹۵۱ء میں محمد ابراہیم کے والد، والدہ، دادا، دادی اور بڑی بہن حج کے لیے گئے تھے۔ اسی دوران مدینہ منورہ میں ۲۱۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو ان کی ولادت ہوئی۔ اس اعتبار سے یہ واقعتہً مدنی ہوئے۔ لیکن مدنی کہلانے کے تکلف میں نہیں پڑے۔

ان کا وطنی تعلق ضلع شیخوپورہ کی منڈی ڈھاباں سنگھ سے ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد مختلف اوقات میں اس قصبے کے کئی نام رکھے گئے۔ کبھی اسے رحمان آباد کے نام سے موسوم کیا گیا، کبھی احمد پور کہا گیا اور کبھی صفدر آباد۔ اب یہ صفدر آباد ہے۔ یعنی وہاں کے لوگوں کے نزدیک ''ڈھاباں سنگھ'' کا فرانہ نام تھا۔ اسے کفر سے نکال کر مشرف بہ اسلام کرنے کے لیے متعدد مراحل سے گزارا گیا۔ پھر صفدر آباد پر سب کا اتفاق ہوگیا۔ اب یہ نام ''متفق علیہ'' ہے۔ شاید ''صفدر'' وہاں کا کوئی بڑا زمیندار یا سرمایہ دار ہوگا، اس کے مقابلے میں مذکورہ تمام نام شکست کھا گئے اور وہ جیت گیا۔ مجھے یاد پڑتا ہے میں ۱۹۶۴ء میں کسی سلسلے میں وہاں گیا تھا۔ یہ میرا وہاں کا پہلا اور اب تک کا آخری پھیرا تھا۔ اس وقت یہ قصبہ ڈھاباں سنگھ ہی تھا، اس کے بعد اس پر ''اسلام'' کا ورود ہوا۔ جس نے صفدر آباد کی صورت میں ظہور کیا۔

بہرکیف ہم اصل مقصد محمد ابراہیم طارق کی طرف آتے ہیں۔ انھوں نے پانچ سال کی عمر میں صفدر آباد کی جامع مسجد اہل حدیث میں قرآن مجید ختم کیا۔ پھر وہاں کے سرکاری سکول میں مڈل اور میٹرک تک تعلیم پائی۔ میٹرک کا امتحان دیا تو ان کے دادا حاجی محمد اسحاق وہاں کی مسجد کے خطیب حکیم محمد حنیف امرتسری کی رفاقت میں ان کو فیصل آباد کے مدرسہ دارالقرآن والحدیث میں مولانا عبداللہ صاحب ویرووالوی کی خدمت میں لے گئے، ۱۰۔ مئی ۱۹۶۷ء کو انھیں اس مدرسے میں داخل کرادیا گیا اور یہ دینیات کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ وہیں میٹرک کے نتیجے کا پتا چلا اور اپنی کامیابی سے مطلع ہوئے۔

پھر سرگودھا بورڈ سے ۱۹۶۹ء میں ایف اے کا پرائیویٹ طور پر امتحان دیا۔ پڑھنے میں تیز تھے، ہر سال مدرسے میں اول آتے اور انعام حاصل کرتے رہے۔

مدرسے کی تعلیم کے دوران میں میاں فضل حق مرحوم سے تعلق پیدا ہوا تو انھوں نے اصرار کر کے ۱۹۷۰ء

Marfat.com

میں ان کو جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں داخل کرادیا۔ وہاں بی اے اور فاضل عربی کے امتحانات پاس کیے۔ وہیں ۱۹۷۲ء میں حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی سے صحیح بخاری پڑھی اور سند حاصل کی۔ اس سے اگلے سال ۱۹۷۳ء میں دوبارہ حضرت حافظ محمد گوندلوی سے صحیح بخاری پڑھی اور سند لی، نیز وفاق المدارس السّلفیہ پاکستان کا امتحان ممتاز درجے میں پاس کیا۔

جن اساتذہ کرام سے تحصیل علم کی، وہ ہیں حضرت حافظ محمد گوندلوی، مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی، مولانا عبداللہ ویروو الوی، حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی، مفتی غلام ربانی، مولانا محمد اکال گڑھی، حافظ محمد داؤد، حافظ محمد بنیامین طور، پروفیسر غلام احمد حریری رحمہم اللہ تعالیٰ۔

مروجہ درسی تعلیم سے فراغت پائی تو ساہی وال میں حافظ عبدالحق صدیقی کی مسجد میں امامت وتدریس شروع کردی۔ بعدازاں اسی مسجد میں جامعہ ثنائیہ کے نام سے دارالعلوم کا قیام عمل میں لایا گیا اور بہ طور مدرس ماموں کانجن (ضلع فیصل آباد) کے قاری محمد شکیل مرحوم کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ساہی وال میں حکیم محمد ابراہیم طارق نے علم طب پڑھا اور وہیں چوک گھاس منڈی میں دواخانہ کھول لیا۔

۱۹۷۶ء میں حافظ عبدالحق صدیقی نے سفر آخرت اختیار کیا تو مسجد اور مدرسے کا نظام ان کے سپرد کردیا گیا، لیکن اس سے ایک سال بعد ان کے والد محمد حسین پر فالج کا حملہ ہوگیا اور یہ واپس صفدر آباد آگئے۔ اسی زمانے میں ان کو ریاض (سعودی عرب کے دارالحکومت) کی ایک یونیورسٹی میں داخلے کی اطلاع آئی، لیکن یہ والد کی بیماری اور بعض گھریلو مجبوریوں کی وجہ سے وہاں نہیں جاسکے۔

۱۸۔ جولائی ۱۹۷۸ء کو مولانا حافظ محمد ابراہیم حافظ آبادی کی بیٹی اور مولانا حافظ محمد اسماعیل اسد کی ہمشیرہ سے ان کی شادی ہوئی۔ یہ نیک خاندان کی نیک خاتون تھیں۔

۲۔ نومبر ۱۹۷۸ء کو ان کے والد حاجی محمد حسین کا انتقال ہوگیا۔ وہ کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ والد کی وفات کے بعد یہ چھوٹے بھائی حافظ محمد یوسف کے ساتھ مل کر وہی کام کرنے لگے، لیکن اس اثنا میں حافظ محمد یوسف آرمی میں بھرتی ہوگئے جو ترقی کرکے اب بریگیڈیئر کے منصب پر فائز ہیں۔ حکیم محمد ابراہیم نے کپڑے کا کام چھوڑ کر دینی خدمت کو اپنی سرگرمیوں کا محور قرار دے لیا۔ یہاں یہ یاد رہے کہ انھوں نے امامت وخطابت اور درس وتدریس کا کبھی کسی سے معاوضہ نہیں لیا۔ سب کام فی سبیل اللہ کیے اور کر رہے ہیں۔ متعدد مقامات کی مساجد میں ان کا سلسلۂ خطابت وامامت جاری رہا۔ ۱۹۹۲ء سے وہ منڈی صفدر آباد کی مرکزی جامع مسجد اہل حدیث میں خطابت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

۱۹۸۰ء میں حکیم محمد حنیف امرتسری نے منڈی صفدر آباد میں ادارہ تبلیغ القرآن والحدیث قائم کیا تھا۔ اس

Marfat.com

ادارے کے تحت وہاں کی اہلِ حدیث مساجد اور ان میں قائم مدارس اور طلبا و طالبات کی نگرانی اور نظام کا سلسلہ جاری رہا۔ ۵۔مئی ۱۹۹۴ء کو حکیم محمد حنیف امرتسری نے وفات پائی تو یہ پورا نظام حکیم محمد ابراہیم طارق کے سپرد ہوا جو اللہ کے فضل سے بہترین طریقے سے جاری ہے۔ صفدر آباد کے اردگرد کے دیہات میں بھی مساجد کی تعمیر، کتاب و سنت کی تبلیغ کا کام ہو رہا ہے۔ اس کے نظم و نسق کی باگ ڈور حکیم محمد ابراہیم صاحب کے ہاتھ میں ہے۔ ان کا نام منڈی صفدر آباد اور اس کے قرب و جوار میں اہل حدیث کی پہچان ہے۔ ان کی تبلیغی مساعی سے اس علاقے میں ۳۴ مسجدیں تعمیر ہوئیں اور تقریباً ہر مسجد کا سنگِ بنیاد انھوں نے اپنے ہاتھ سے رکھا۔

حکیم ابراہیم طارق صاحب کو ۱۹۸۵ء میں تحصیل صفدر آباد کی جمعیت اہل حدیث کے امیر منتخب کیا گیا تھا۔ اس کے بعد اب تک وہ ہر انتخاب میں بلا مقابلہ امیر منتخب ہوتے آرہے ہیں۔ ان کے تیئیس سالہ دورِ امارت میں اس تحصیل کی جمعیت کے کئی ناظم ہوئے، ان میں حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی (مدرس جامعہ سلفیہ و مدیر ترجمان الحدیث فیصل آباد) بھی شامل ہیں، حکیم صاحب ممدوح کا بیان ہے کہ جو مسرت یزدانی صاحب کے عہدِ نظامت میں ہوئی، وہ کسی ناظم کے عہد میں نہیں ہوئی۔ یزدانی صاحب جماعتی کاموں میں ہمیشہ سرگرم رہتے ہیں۔ جماعت اہل حدیث اور اس مسلک سے انھیں بہ درجہ غایت قلبی لگاؤ ہے۔ ان کے شب و روز کسی نہ کسی انداز میں اس کی خدمت میں گزرتے ہیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے ایک مہینے میں تحصیل صفدر آباد میں ایک سو پروگرام کیے۔ مختلف ذی وقار علما کی تقریروں کی بنا پر ہر مقام کا ہر پروگرام اپنی ایک شان رکھتا تھا اور لوگوں نے علما کی تقریریں بڑی دلجمعی سے سنی تھیں اور بہت متاثر ہوئے تھے۔

یہ بات حکیم ابراہیم صاحب نے جامعہ سلفیہ کے پرنسپل چودھری محمد یاسین ظفر کو بتائی تو انھوں نے کہا کہ جامعہ سلفیہ میں بھی یزدانی صاحب کا یہی معاملہ ہے۔ جو کام ان کے ذمے لگایا گیا، اگرچہ وہ کتنا ہی مشکل ہو، انھوں نے نہایت محنت اور بہتر طریقے سے اس کی تکمیل کی۔ بس ایک دفعہ کہا اور کام مکمل ہو گیا۔ دوبارہ کہنے کی کبھی ضرورت نہیں پڑی۔ چودھری صاحب نے کہا جامعہ سلفیہ میں خدمت کے پچیس سالوں میں بہت سے رفقا کے ساتھ کام کرنے کے مواقع ملے، لیکن یزدانی جیسے خادم جماعت و جامعہ بہت کم ہوں گے۔ وہ باہمت، حوصلہ مند اور محنتی کارکن ہیں۔ اللہ ہمارے اس مخلص ترین بھائی کی زندگی دراز فرمائے اور یہ اسی طرح خدمت انجام دیتے رہیں۔

حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی کے بارے میں حکیم ابراہیم طارق اور چودھری یاسین ظفر کا یہ فرمان بالکل صحیح ہے۔ ان سطور کے راقم کا بھی ان کے متعلق یہی تجربہ ہے۔ میں کئی سالوں سے برصغیر کے اہل حدیث علمائے کرام کے حالات لکھ رہا ہوں۔ جو کتابی صورت میں اللہ کے فضل سے شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں سے

Marfat.com

پاکستان کے متعدد علمائے دین کے تذکار مجھے یزدانی صاحب کی وساطت سے موصول ہوئے۔ وہ نہایت شوق اور دلچسپی سے اہل حدیث علما کے واقعاتِ حیات خود لاہور آکر مجھے عنایت کرتے ہیں۔ اس پر میں ان کا شکرگزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اس عزیز القدر دوست کو خوش رکھے اور یہ ہمیشہ قرآن وحدیث کی خدمت میں مشغول رہیں۔

یزدانی صاحب کی بات بیچ میں آگئی، تذکرہ دراصل حکیم محمد ابراہیم طارق کا ہورہا تھا۔ حکیم صاحب سے بے شمار طلباء نے اکتسابِ علم کیا اور کر رہے ہیں۔ گیارہ عیسائی خاندانوں نے ان کی تبلیغ سے اثرپذیر ہوکر اسلام قبول کیا۔ قبول اسلام کے بعد انھیں یوں ہی نہیں چھوڑ دیا گیا، بلکہ کوشش کر کے ان سب خاندانوں کے لوگوں کو کسی نہ کسی چھوٹے بڑے کاروبار پر لگایا اور ان کا پورا خیال رکھا۔

حکیم صاحب ممدوح منڈی صفدر آباد کے سیاسی اور رفاہی کاموں میں بھی دلچسپی لیتے ہیں۔ وہ عرصہ دراز تک صفدر آباد کی بلدیہ کے کونسلر رہے۔ امن کمیٹی کے رکن بھی بنائے گئے۔ عشر اور زکوٰۃ کمیٹی کے بلامقابلہ چیئرمین منتخب ہوئے۔ وہ اس شہر اور علاقے کی ممتاز علمی اور سماجی شخصیت ہیں اور ہر حلقے میں انھیں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ لوگ ان کی بات غور سے سنتے اور اسے خاص اہمیت دیتے ہیں۔

وہ کئی سال سے دل کے مرض میں مبتلا ہیں، لیکن اس کے باوجود سرگرمی سے قرآن وحدیث کی تبلیغ کر رہے ہیں اور لوگوں سے میل جول رکھتے ہیں۔

ان کی اہلیہ بڑی صالحہ خاتون تھیں اور سانگلہ ہل میں خواتین کے ڈگری کالج میں پروفیسر تھیں۔ انھوں نے ۳۱۔ جولائی ۲۰۰۷ء کو مختصر علالت کے بعد وفات پائی۔ یہ بہت بڑا صدمہ تھا جو حکیم صاحب کو پہنچا، لیکن انھوں نے نہایت صبر سے کام لیا اور اللہ کی رضا پر راضی رہے۔

اپنے اہل خانہ کے ساتھ حکیم صاحب کو اللہ نے حج بیت اللہ کی توفیق مرحمت فرمائی اور انھیں ۲۸ منٹ بیت اللہ شریف کے اندر رہنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ ان کی اولاد تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ دو بیٹیاں پی ایچ ڈی ڈاکٹر ہیں۔ ایک بیٹی نے ایم اے اسلامیات کیا ہے اور چوتھی بی ایس آنرز ہیں۔

بیٹوں میں سے ایک بیٹے کا نام حافظ حماد طارق ہے، دوسرے کا جواد طارق اور تیسرے کا سجاد طارق ہے۔ ان تینوں کی تعلیم کا علم نہیں ہوسکا۔ اُمید واثق ہے وہ بھی عالم فاضل باپ کے پڑھے لکھے بیٹے ہوں گے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ مولانا حکیم محمد ابراہیم طارق کی زندگی صحت وعافیت کے ساتھ طویل فرمائے اور وہ کتاب وسنت کی تبلیغ واشاعت میں مصروف رہیں۔ ان کی آل اولاد بھی ترویج دین کے باب میں ماں باپ کے نقشِ قدم پر گام زن رہے۔ آمین یا رب العالمین۔ (۲۸۔ نومبر ۲۰۱۳ء)

Marfat.com

پروفیسر ڈاکٹر محمد عبداللہ قاضی

(ولادت یکم مئی ۱۹۵۲ء)

قد میانہ، بدن گداز، گندمی رنگ میں سرخی کی جھلک، اچھی صحت، کھلی پیشانی، ابتدا ہی سے تحصیل علم کے شائق، مناسب خدوخال، شلوار قمیص میں ملبوس، آنکھوں پر نظر کی عینک۔ یہ ہیں ڈاکٹر عبداللہ قاضی۔ والد کا نام عبدالخالق تھا۔ وہ پورے قد کے خوب رو اور نیک خصال بزرگ تھے۔ وہ چار بھائی تھے۔ ایک کا نام مولانا محمد صادق تھا۔ وہ کچھ عرصہ چینیاں والی مسجد (لاہور) میں درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے رہے تھے۔ تقسیم ملک کے زمانے میں سکھوں نے ان کو شہید کر دیا تھا۔ ان کا تذکرہ میں نے اپنی ایک کتاب ''برصغیر میں اہل حدیث کی سرگزشت'' میں ان تیرہ علمائے اہل حدیث میں کیا ہے جو اگست ۱۹۴۷ء کے خوں ریز ہنگاموں میں جام شہادت نوش کر گئے تھے۔ [1]

ایک بھائی مولانا محمد عثمان تھے۔ اچھے خطیب، بھرے ہوئے جسم کے خوش مزاج پنجابی ذہن کے عالم۔ صاف کلام اور کھنک دار آواز۔

ان سے چھوٹے کا نام عبدالرحیم تھا۔ یہ گورے سے رنگ کے دبلے پتلے نیک کردار شخص تھے۔ نرمی سے بات کرتے اور علما کے قدر دان تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد بورے والا (ضلع وہاڑی) کے ایک گاؤں میں آ گئے تھے، وہیں وفات پائی۔

یہ خاندان ضلع فیروز پور کے ایک گاؤں ''کوہاڑیاں والا'' کا رہنے والا تھا۔ شرافت ونجابت میں ممتاز۔

ڈاکٹر عبداللہ قاضی کی ولادت یکم مئی ۱۹۵۲ء کو ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مروجہ درس نظامی کی تکمیل دارالعلوم تعلیم الاسلام چک نمبر ۴۹۳ گ ب اوڈاں والا ضلع فیصل آباد میں کی۔ یہ دارالعلوم ایک بزرگ صوفی عبداللہ مرحوم نے ۱۹۲۲ء کے لگ بھگ قائم کیا تھا۔

ڈاکٹر عبداللہ قاضی نے دارالعلوم تعلیم الاسلام (اوڈاں والا) کے علاوہ بھی بعض مدارس میں تعلیم حاصل کی۔ ان مدارس میں انھوں نے جن اساتذہ کے حضور زانوئے شاگردی تہ کیے، ان میں سے چند حضرات کے

---

[1] یہ کتاب مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور نے فروری ۲۰۱۲ء میں شائع کی تھی۔ مشتمل بر ۳۴۴ صفحات۔ اس میں بہت سے علمائے کرام کا تذکرہ کیا گیا ہے اور برصغیر کی جماعت اہل حدیث سے متعلق بے شمار واقعات اس میں مندرج ہیں۔

Marfat.com

اسمائے گرامی یہ ہیں: (۱) محدث العصر حضرت حافظ محمد گوندلوی (۲) مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی (۳) جناب پیر محمد یعقوب قریشی (۴) مولانا محمد صادق خلیل (۵) مولانا فاروق احمد راشدی شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ گوجراں والا (۶) مولانا عبدالرشید راشد شیخ الحدیث مدرسہ دارالحدیث اوکاڑہ (۷) مفتی محمود اور (۸) مولانا محمد شمعون۔

ان اساتذہ گرامی سے اخذ فیض کے بعد کراچی کا عزم کیا اور جامعہ کراچی کے شعبہ عربی میں داخلہ لیا۔ وہاں جن اصحابِ علم سے استفادے کا شرف حاصل ہوا، ان میں ڈاکٹر جمیل احمد، ڈاکٹر احسان الحق، ڈاکٹر عبدالشہید نعمانی اور عربی علم وادب کے ماہر علامہ خلیل عرب کی صاحب زادی ڈاکٹر عطیہ خلیل شامل ہیں جو عربی کے علاوہ دیگر علوم متداولہ میں بھی مہارت رکھتی تھیں۔ ڈاکٹر عبداللہ قاضی کی خوش نصیبی کہنا چاہیے کہ انھیں ڈاکٹر جواد خلف عبدالجواد مصری اور شیخ حسن سید الہادی سوڈانی سے بھی اخذِ فیض کے مواقع میسر آئے۔

کچھ عرصہ یہ جامعہ ملک سعود (ریاض) کے اساتذہ کرام سے بھی اکتسابِ علم کرتے رہے۔ ان اساتذہ میں شامی، ایرانی، سعودی، فلسطینی، ہندی اور بعض دیگر ممالک کے حضرات شامل ہیں۔

اللہ نے ان پر کرم فرمایا کہ میٹرک سے ایم اے اسلامیات اور ایم اے عربی تک کے امتحانات دیے اور ان میں نمایاں طور سے کامیابی حاصل کی۔

۱۹۸۸ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے "الحدود والتعزیرات الشرعیہ" میں پی ایچ ڈی کیا۔ اس مقالے کی تیاری میں علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید کے سیکرٹری عطاء الرحمٰن ثاقب مرحوم نے ان کے ساتھ بہت سا قلمی اور علمی تعاون کیا۔ عطاء الرحمٰن ثاقب بہت با صلاحیت نوجوان تھے۔ انھوں نے علامہ مرحوم کی شہادت کے کچھ سالوں کے بعد لاہور میں "فہم قرآن" کے نام سے ترجمہ وتفسیر کا سلسلہ شروع کیا۔ ہمارے محترم دوست اور ممتاز معالج ڈاکٹر محمد ارشد رندھاوا اس ادارے میں ان کے دست وبازو بنے۔ اپنے مربی اور محسن علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید کی طرح عین بھری جوانی میں عطاء الرحمٰن ثاقب کو شہید کر دیا گیا، جب وہ اے جی آفس (لاہور) میں ترجمہ وتفسیر کی کلاس کے بعد باہر نکل رہے تھے۔ ان کے قاتلوں کا تعلق اسی گروہ سے تھا جو اہل حدیث کو گستاخ اور بے ادب قرار دیتے ہیں کہ جب ان قاتلوں کو پکڑا گیا تو انھوں نے کہا کہ ہمیں مولویوں نے انہیں قتل کرنے کی ترغیب دی تھی۔

۲۰۰۸ء میں ڈاکٹر عبداللہ قاضی نے اینسٹیڈ یونیورسٹی یو کے سے لسانیات میں پی ایچ ڈی کیا۔ ۱۷۔ تمبر ۱۹۸۵ء کو جامعہ اسلامیہ بہاول پور کے شعبہ عربی سے بہ حیثیت ریسرچ سکالر ملازمت کا آغاز کیا۔ پھر مختلف مقامات کے کالجوں میں اسلامیات کے لیکچرار اور ایسوسی ایٹ پروفیسر کے طور پر خدمات سرانجام دیتے

Marfat.com

ہوئے ۵۔جولائی ۲۰۰۸ء کو گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج بہاول نگر کے پرنسپل کے منصب تک پہنچے اور یکم مئی ۲۰۱۲ء کو اسی منصب سے ریٹائرمنٹ ہوئی۔

اب آیئے ان کی قلمی اور تحریری مساعی کی طرف!

انھوں نے عربی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھا اور تحقیقی انداز میں مختلف موضوعات کو ہدفِ بحث ٹھہرایا۔ جن مجلات میں ان کے رشحاتِ قلم معرض اشاعت میں آئے وہ یہ ہیں (۱) صوت الامہ (عربی۔ بنارس ہندوستان ۱۹۸۹ء) (۲) اورینٹیل کالج میگزین سیرت نمبر ۱۹۹۰ء جامعہ پنجاب لاہور (۳) افکارِ معلم لاہور (۴) تحقیقی مجلہ علوم اسلامیہ، اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور، ۱۹۹۲ء (۵) سہ ماہی منہاج، لاہور، ۱۹۹۳ء (۶) ماہنامہ آگہی کراچی، جنوری، ۱۹۹۳ء (۷) مجلہ قافلۂ ادبِ اسلامی، لاہور ۲۰۰۴ء

ان میں سے بعض مجلات کے کئی کئی شماروں میں ان کے مقالات کی اشاعت ہوئی۔ متعدد اہل علم کے اردو اور انگریزی مقالات کی ترتیب کا فریضہ بھی سرانجام دیا۔

ان مجلات میں مقالات کے علاوہ ڈاکٹر عبداللہ قاضی نے کتابی صورت میں بھی بڑا اہم کام کیا جو درج ذیل ہے:

۱۔ بدر سے تبوک تک: ...... یہ کتاب ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ مکتبہ قدوسیہ غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور نے شائع کی۔

۲۔ امین کعبہ: ...... یہ کتاب ۶۰۰ صفحات پر محیط ہے۔ کمپوز ہو چکی ہے۔ ابھی طبع نہیں ہوئی۔ (یہ بھی شائع ہو چکی ہے)

۳۔ تفسیر منار القرآن: ...... یہ قرآن مجید کی تفسیر ہے۔ تقریباً مکمل ہو چکی ہے۔ ابھی شائع نہیں ہوئی۔

۴۔ شرح صحیح بخاری: ...... مندرجہ بالا تینوں کتابیں اردو زبان میں ہیں، لیکن شرح بخاری عربی میں ہے اور اٹھارہ جلدوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس کی کمپوزنگ بھی ہو گئی ہے اور پروف خوانی بھی کر لی گئی ہے۔ چوں کہ ضخیم کتاب ہے۔ اس لیے طباعت میں کچھ تاخیر ہو رہی ہے۔ امید ہے ان شاء اللہ مستقبل قریب میں اشاعت کا مرحلہ طے کر لے گی۔

ڈاکٹر صاحب خود کو ''بنیادی طور پر مرتب'' قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ''میرا کام ایک موضوع پر مواد کو ترتیب دینا ہے۔'' صحیح بخاری کی اس شرح کے بارے میں وہ فرماتے ہیں: ''یہ بھی ایک مرتب کتاب ہے جو ۱۸ مجلات پر مشتمل ہے۔ کتاب عربی زبان میں ترتیب دی گئی ہے۔'' ان کا خیال ہے کہ ''یہ کتاب مبتدی اور عالم دونوں کے لیے یکساں افادیت کی حامل ہے۔'' انھوں نے ''کتاب کا مواد'' چار کتابوں سے

Marfat.com

اخذ کیا ہے، وہ ہیں فتح الباری، عمدۃ القاری، ارشادالساری اور الکرمانی۔ صحیح بخاری کی ان شروحِ اربعہ کو وہ ''اکبرالشروح'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے مطابق صحیح بخاری کی یہ شرح مکمل کر کے جب انھوں نے اہل زبان اور رجالِ حدیث پر پیش کیا تو الحمد للہ جمیع اہل علم اور اہل قلم نے کتاب کو پسند فرمایا۔

صحیح بخاری کی اب تک جو شروح لکھی گئی ہیں، ان کی تعداد ڈھائی سو کے قریب ہوگی۔ پہلی شرح کا نام ''اعلام السنن'' ہے۔ اس کے مصنف کا اسم گرامی ابوسلیمان احمد بن محمد البیمتی ہے جو''خطابی'' کے عرف سے معروف ہیں۔ ان کا اصل نام تو ''حمد'' ہے، لیکن لوگوں میں یہ حمد کے بجائے احمد مشہور ہوگیا۔ ۳۱۹ھ میں پیدااور ۳۸۶ھ (یا ۳۸۸ھ) میں فوت ہوئے۔ شروح صحیح بخاری کی ترتیب کے اعتبار سے فتح الباری ۳۲ویں شرح ہے۔

اس کی ڈھائی سو کے قریب وہ شروح اور تراجم وغیرہ ہیں، جو عربی، فارسی اور اردو میں ہیں۔ میری معلومات کے مطابق دو انگریزی میں ہیں اور ایک فرانسیسی زبان میں۔ سندھی زبان میں مولانا دین محمد وفائی نے صحیح بخاری کا ترجمہ کیا۔ خیال یہ ہے کہ بنگلہ، پشتو اور ہندی وغیرہ زبانوں میں بھی اس کے متعلق کسی اہل علم نے تفصیل یا اختصار سے ضرور کچھ لکھا ہوگا، لیکن ہمیں اس کا علم نہیں ہوسکا۔

برصغیر کے اصحاب علم نے صحیح بخاری کے جو ترجمے کیے یا اردو، عربی یا فارسی میں شرحیں لکھیں یا اس موضوع سے متعلق کوئی اور علمی خدمات سرانجام دیں، ان کی تعداد پچاس سے زیادہ ہے۔

(یہ سطور ۲۔ دسمبر ۲۰۱۳ء میں لکھی گئیں۔)

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا محمد ھود

(ولادت ۱۱۔ جون ۱۹۵۲ء)

صاحب ترجمہ مولانا محمد ہود کے خاندان کا تعلق سکونت ضلع امرتسر سے تھا۔ یہ لوگ تقسیم ملک سے پہلے ہی ضلع فیصل آباد کی تحصیل جڑانوالہ کے ایک گاؤں بڈھے چک نمبر ۱۰۲ میں آ گئے تھے۔ان کے والد کا نام محمد عبداللہ تھا۔ وہ عالم تو نہ تھے لیکن تقسیم ملک کے بعد جڑاں والا میں حافظ عبدالقادر روپڑی کے ساتھ مل کر کاروبار کرتے تھے اور ان کے ساتھ ان کے گہرے تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔

مولانا محمد ہود کے بارے میں جو معلومات مجھے موصول ہوئی ہیں،وہ حبیب الرحمٰن خلیق مدرس کلیتہ دارالقرآن والحدیث (فیصل آباد) کی فراہم کردہ ہیں۔ان میں بتایا گیا ہے کہ

> ”ڈھیسیاں میں تین روزہ کانفرنس تقسیم ہند سے قبل ہی منعقد ہوا کرتی تھی، جس میں وہ (یعنی مولانا محمد ہود کے والد محمد عبداللہ صاحب) بڑے ذوق وشوق سے شریک ہوتے اور اس کانفرنس میں تمام ملک سے جید علمائے اہل حدیث بھرپور شرکت فرماتے تھے۔نتیجتاً والد صاحب کو بھی علمی ذوق خوب پیدا ہوا اور مناظرانہ ذہن بن گیا۔“

یہ سطور واقعات کے بالکل خلاف ہیں۔ میں خود ڈھیسیاں کا رہنے والا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ تقسیم ملک سے قبل ہمارے گاؤں چک نمبر ۵۳ گ ب ڈھیسیاں میں تمام آبادی سکھوں کی تھی۔ یہ آبادکار سکھ تھے جو تقسیم سے کم وبیش پچاس برس پہلے مشرقی پنجاب کے دوضلعوں سے آ کر یہاں آباد ہوئے تھے،ایک ضلع ہوشیار پور کے موضع منصور پور سے، دوسرے ضلع جالندھر کے موضع ڈھیسیاں سے۔منصور پور کے سکھ اسی وقت اس چک میں آ گئے تھے، جب ضلع لائل پور میں چک بندی ہوئی اور آبادکاری کا سلسلہ شروع ہوا،اس لیے وہ اسے چک نمبر ۵۳ منصور پور کہنے لگے اور محکمہ مال کے کاغذات میں منصور پور نام درج ہوا۔ بعد ازاں ضلع جالندھر کے گاؤں ڈھیسیاں کے سکھ آئے جو منصور پور کے سکھوں سے زیادہ تعداد میں تھے۔انھوں نے اسے چک نمبر ۵۳ گ ب ڈھیسیاں کہنا شروع کر دیا۔ یہ نام بھی محکمہ مال کے کاغذات میں درج کیا گیا اور اسی نے زیادہ شہرت پائی۔ ہم لوگ یہاں مشرقی پنجاب کے شہر کوٹ کپورہ سے آئے تھے اور مسلکی اعتبار سے سب اہل حدیث تھے۔ میری عمر اس وقت بائیس تئیس سال کی تھی۔ہم نے یہاں چھوٹی سی مسجد بنائی جو اب ماشاء اللہ

Marfat.com

بہت بڑی مسجد ہے۔ اس مسجد کے علاوہ چار مسجدیں اور ہیں۔ جن میں پانچوں وقت کثیر تعداد میں نمازی با جماعت نماز ادا کرتے ہیں۔ ہماری آمد سے پہلے یہاں کوئی مسجد نہ تھی البتہ ایک گوردوارہ تھا، جس میں ہم نے جمعہ پڑھنا شروع کیا اور جمعہ یہ فقیر پڑھایا کرتا تھا۔

کوٹ کپورہ میں ہماری پیدائش سے پہلے ہر سال سالانہ تبلیغی جلسہ منعقد ہوتا تھا جو تین روز جاری رہتا تھا، اس میں بہت سے علمائے کرام تشریف لاتے اور تقریریں کرتے تھے۔ حافظ عبداللہ روپڑی اور ان کے دونوں بھتیجوں (حافظ اسماعیل روپڑی اور حافظ عبدالقادر روپڑی) کو بھی دعوت دی جاتی تھی اور وہ ان جلسوں میں آتے اور تقریریں فرماتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے مارچ میں وہاں چوبیسواں سالانہ جلسہ ہوا تھا جو آخری جلسہ تھا۔ تقسیم ملک کے بعد ہم تحصیل جڑاں والا کے چک نمبر ۵۳ گ ب ڈھیسیاں آئے تو دو یا تین سالانہ تبلیغی جلسے یہاں بھی کیے گئے۔ ان میں بھی روپڑی حضرات شرکت کرتے تھے۔ ان کے عقیدت مند بھی ان کے ساتھ آتے تھے، جن میں مولانا محمد ہود کے والد گرامی جناب محمد عبداللہ صاحب بھی ہوں گے۔ ہمارے یہاں آنے سے پہلے مسلمانوں کے جو چند گھر آباد تھے، وہ سکھوں کے ''کمین'' تھے اور انھیں نماز، روزے سے کوئی خاص تعلق نہ تھا، وہ ہمارے تبلیغی جلسے دیکھ کر اور علما کی تقریریں سن کر حیران ہوتے تھے کہ یہ کیا سلسلہ ہے۔ اللہ نے مہربانی فرمائی، آہستہ آہستہ وہ بھی نماز روزے کے پابند ہو گئے اور ان کی اولاد نے بھی علم حاصل کر لیا۔ اب ماشاءاللہ ان کی زندگی بالکل بدلی ہوئی ہے۔ کاروبار میں بھی اور علم و عمل میں بھی۔

بہرکیف مولانا محمد ہود کے والد کا جن علمائے کرام سے زیادہ تعلق رہا اور جن کی تقریریں وہ شوق سے سنا کرتے تھے، وہ تھے حافظ عبدالقادر روپڑی، حافظ اسماعیل روپڑی، مولانا احمد الدین گکھڑوی، مولانا عبداللہ ثانی (خطیب جامع مسجد اہل حدیث جڑاں والا)، سید عبدالغنی شاہ (کاموں کے) اور مولانا محمد یحییٰ حافظ آبادی۔ مولانا محمد ہود کے بقول ان کے والد کو شکار کا بھی شوق تھا اور وہ اپنے تعلق دار علمائے کرام کو شکار کردہ جانوروں کا گوشت کھلایا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے گھر میں سپیکر رکھا تھا۔ ان کے گاؤں بڈھے چک نمبر ۱۰۲ میں آ کر کوئی مقرر اہل حدیث کے خلاف تقریر کرتا تو اس کی تقریر ختم ہونے کے بعد وہ اس کا جواب دیتے جسے سپیکر کے ذریعے پورے گاؤں کے لوگ سنتے۔ انھوں نے ۲۰۰۹ء کے آخر میں وفات پائی۔

ایک مرتبہ ۱۹۶۵ء میں مولانا محمد ہود کے گاؤں میں جھوک دادو کے مشہور عالم میاں محمد باقر تشریف لائے اور تقریر کی، جس سے یہ بہت متاثر ہوئے اور حصول علم کے لیے اپنے والد کے ساتھ ان کے گاؤں جھوک دادو چلے گئے۔ میاں صاحب ان پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ چند ابتدائی درسی کتابیں ان کو خود پڑھائیں اور بعض کتابیں انھوں نے حافظ ذکاء اللہ صاحب سے پڑھیں۔ ۱۹۷۱ء میں حافظ ذکاء اللہ انھیں فیصل آباد کے

Marfat.com

کلیۃ دارالقرآن والحدیث لے گئے اور مولانا عبداللہ ویروو الوی مرحوم سے سفارش کر کے اس میں داخل کرا دیا۔ مولانا مرحوم ان کی محنت، تحصیل علم کے شوق اور نیکی سے اتنے متاثر ہوئے کہ چھ مہینے بعد انھیں اپنے مدرسے کی مسجد کا امام مقرر کر دیا۔ پھر جلد ہی مدرسے کا حساب کتاب بھی ان کے سپرد کر دیا جو مولانا کی وفات تک ان کے پاس رہا۔ جب یہ مدرسے کے نصاب کے مطابق آخری جماعت میں پہنچے اور صحیح بخاری پڑھنے لگے تو ان کو مدرسے کی ابتدائی جماعتوں کے طلباء کے اسباق پڑھانے کا حکم بھی صادر فرما دیا۔ پھر ان کو انھوں نے کہیں نہیں جانے دیا۔ ۱۹۸۲ء میں یہ مدرسے سے فارغ ہوئے تو وہیں بطور مدرس ان کا تقرر فرما دیا۔ ان پر اور صوفی گلزار احمد پر ان کی شفقت اور اعتماد کا یہ حال تھا کہ ان دونوں سے عہد لیا کہ وہ ہمیشہ اسی مدرسے میں پڑھائیں گے اور تنخواہ میں اضافے کا مطالبہ بھی نہیں کریں گے۔ اپنے صاحب زادوں حافظ محمد داؤد اور حافظ عبدالرحمٰن کی موجودگی میں یہ بات کی۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات اس عہد پر قائم ہیں اور باقاعدہ مدرسے میں طلبا کو پڑھا رہے ہیں۔ صوفی گلزار احمد شیخ الحدیث کے منصب پر متمکن ہیں۔

مولانا عبداللہ ویروو الوی نے ۳۔ فروری ۱۹۹۱ء کو وفات پائی۔ ان کے صاحب زادوں کے کہنے پر ان کو غسل بھی انھی دونوں شاگردوں نے دیا اور تکفین و تجہیز بھی انھی نے کی۔ مولانا محمد ہود نے جن حضرات سے تعلیم حاصل کی ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: میاں محمد باقر، حافظ ذکاء اللہ، مولانا محمد حسین طور، مولانا عطاء اللہ تاندلیاں والا۔ ان حضرات سے انھوں نے جھوک دادو میں استفادہ کیا۔ کلیۃ دارالقرآن والحدیث میں جن اساتذہ کرام سے اخذ فیض کیا، وہ ہیں مولانا عبداللہ ویروو الوی، مولانا محمد خان صاحب، مفتی غلام اللہ رحمانی، مولانا داؤد سیف، حافظ عبدالرحمٰن، حافظ عبداللہ بڈھیمالوی۔

جن اصحاب علم نے مولانا محمد ہود کے حضور زانوئے شاگردی تہ کیے، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ مولانا عبدالحیی انصاری (ادارہ علوم اثریہ فیصل آباد)، مولانا محمد یٰسین ظفر (پرنسپل جامعہ سلفیہ فیصل آباد)، مولانا عبدالرحمٰن ضیاء (شیخ الحدیث جامعہ ابن تیمیہ)، سید ضیاء اللہ شاہ بخاری (ساہی وال)، مولانا ابوسعد محمد صدیق (مدرس جامعہ سلفیہ)، مفتی عبدالرحمٰن عابد (مریدکے)، مولانا محمد ادریس سلفی، قاری نسیم اللہ حجازی اور دیگر بے شمار علمائے کرام۔

مولانا محمد ہود جہاں بہت اچھے مدرس اور صالح عالم دین ہیں، وہاں اچھے خطیب بھی ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں انھوں نے فیض آباد کی جامع مسجد محمدی میں خطبہ جمعہ دینا شروع کیا تھا۔ جو ۱۹۸۷ء تک (بارہ سال) جاری رہا۔ پھر اس کے قریب ہی مسجد عمر (جمیل ٹاؤن) میں خطبہ ارشاد فرمانے لگے جس کا سلسلہ اللہ کے فضل سے اب تک جاری ہے۔ تدریس کی ذمہ داریوں کی وجہ سے تصنیفی کام کی طرف ان کی زیادہ توجہ نہیں ہو سکی۔ البتہ

Marfat.com

شرح الفیہ ابن مالک کا ترجمہ کیا ہے جو ابھی چھپا نہیں۔ بلوغ المرام کی شرح بھی لکھی ہے۔ یہ بھی طبع نہیں ہو سکی۔ ایک رسالہ ''بچوں کی تربیت کتاب وسنت کی روشنی میں'' لکھا جو اردو اور انگریزی میں ہے۔ یہ مکتبہ دارالاندلس کی طرف سے چھپ چکا ہے۔

ان کے جھوک دادو کے زمانۂ طالب علمی کا ایک واقعہ سنیے!

اس وقت دیہات میں بجلی نہیں تھی، طلبا رات کو سرسوں کے دیئے کی روشنی میں مطالعہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ یہ رات کو نماز عشاء کے بعد مطالعہ کر رہے تھے، اور بھی طلبا موجود تھے۔ اچانک دیئے کا تیل ختم ہو گیا اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ اب طلبا نے اچھل کود شروع کر دی اور ایک دوسرے کو اندھیرے میں پکڑنے لگے۔ ان کے استاد حافظ ذکاء اللہ بھی وہیں تھے، لیکن محمد ہود صاحب کو اس کا علم نہیں تھا۔ انھوں نے بے خبری میں استاد صاحب کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ جب انھوں نے کہا تم کیا کر رہے ہو تو ان کی آواز پہچانی اور مارے ندامت کے باہر نکل گئے۔ دوسرے دن سبق پڑھنے بھی ان کے سامنے نہیں آئے اور ندامت سے روتے رہے۔ پھر شام کو وہ انھیں باہر لے گئے۔ چند باتیں کیں اور واپس آ کر وہ سبق پڑھایا جس میں یہ شامل نہیں ہوئے تھے۔ اس کے بعد اس قسم کی شرارتوں سے توبہ کی۔

اس سے ملتا جلتا ایک واقعہ امام نسائی رحمہ اللہ کو بھی پیش آیا تھا۔ ان کے استاد شیخ حارث بن مسکین ان سے کسی بات پر ناراض ہوئے اور طلبا کی جماعت سے انھیں باہر نکال دیا۔ لیکن امام ممدوح باہر جا کر کسی طرح استاد کا سبق سنتے رہے جو وہ طلبا کو پڑھا رہے تھے۔ اس لیے جب وہ روایت کرتے ہیں تو فرماتے ہیں: حدثنی حارث بن مسکین قراءۃ علیه وانا اسمع.

اب آخر میں مولانا محمد ہود صاحب کی اولاد کی طرف آئیے۔

یہ سطور ۱۹۔ فروری ۲۰۱۳ء کو لکھی گئی ہیں۔ ان کی اولاد ماشاءاللہ چار بیٹے ہیں اور پانچ بیٹیاں۔ سب دینی تعلیم سے آراستہ ہیں اور بعض بچے قرآن کے حافظ ہیں۔ شادی شدہ ہیں، بیٹوں کی بیویاں بھی ''عالمات'' ہیں۔ مولانا کی پہلی بیوی وفات پا گئی تھی۔ دوسری شادی انھوں نے ۲۱۔ نومبر ۲۰۱۲ء کو کی۔ مذکورہ بالا اولاد ان کی پہلی بیوی سے ہے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ اس گھرانے کو خوش رکھے اور یہ لوگ اس کے دین کی خدمت کرتے رہیں۔

❀❀❀

Marfat.com

مولانا ابوحمزہ عبدالحمید المری

(ولادت ۳۔نومبر ۱۹۵۲ء)

میانہ قد، متوازن جسم، نہ اتنے موٹے کہ چلنا پھرنا مشکل ہو، نہ ایسے دبلے پتلے کہ تیز ہوا اڑا کر لے جائے۔گندم گوں، خوش مزاج، سادہ لباس، علم دوست، کئی سال ہوئے میری پہلی ملاقات ان سے مکتبہ قدوسیہ (اردو بازار) میں ہوئی۔گفتگو کرتے ہوئے انھیں پتا چلا کہ میں قرآن مجید کے مختلف زبانوں کے تراجم سے دلچسپی رکھتا ہوں تو فرمایا میرے پاس سرائیکی زبان کے ترجمے والا قرآن مجید موجود ہے، وہ ترجمہ کسی وقت میں تمھیں تحفتاً دوں گا۔ وہ ضلع مظفر گڑھ کے قصبہ علی پور میں قیام پذیر ہیں۔چند روز کے بعد تشریف لائے اور سرائیکی زبان کے ترجمے والا قرآن مجید مجھے عنایت فرمایا۔ازراہ کرم رات میرے پاس ہی رہے۔

کسی زمانے میں ان کے اسلاف کا تعلقِ سکونت ملک یمن کے شہر صنعا سے تھا اور ان کے قبیلے کا نام بنوقضاعہ تھا۔ان کے خاندان کے زیادہ تر لوگ تجارت پیشہ تھے اور کشتی کے ذریعے سمندر کے ساحلی علاقوں میں اُدھر سے سامان تجارت لاتے اور اِدھر سے بعض تجارتی چیزیں اُدھر لے جاتے۔جن علاقوں میں اس سلسلے میں ان کی آمدورفت رہتی تھی، ان میں موجودہ بلوچستان کا ساحل مکران بھی شامل تھا۔اس قبیلے کے ایک بزرگ نے مکران ہی میں رہائش اختیار کر لی تھی اور وہ اپنے اہل وعیال کو بھی یہیں لے آئے تھے۔پھر ان کی اولاد میں سے ایک شخص پنجاب آ گئے اور ریاست بہاول پور کے قصبہ کوٹ مٹھن میں رہنے لگے۔یہیں ان کی شادی مری قوم کے ایک قبیلے بڈانی میں ہوئی۔

بہرحال مولانا ابوحمزہ عبدالحمید المری کا خاندانی سلسلہ یمن کے قبیلہ بنوقضاعہ سے ملتا ہے۔ان کے والد کا اسم گرامی عبدالکریم تھا۔انھوں نے خیر پور سادات تحصیل علی پور ضلع مظفر گڑھ کے مڈل سکول سے مڈل پاس کیا اور اس کے بعد دارالحدیث محمدیہ جلال پور پیروالا میں حضرت مولانا سلطان محمود کی خدمت میں گئے اور ان سے دینی تعلیم حاصل کی۔تعلیم کے بعد حج بیت اللہ کیا اور ۲۰۔فروری ۱۹۵۶ء کو وفات پا گئے۔

مولانا عبدالحمید کی ولادت ۳۔نومبر ۱۹۵۲ء کو ہوئی۔ والد مکرم کی وفات کے وقت یہ صرف تین سال دو مہینے کے بچے تھے۔

کچھ بڑے ہوئے تو اپنی لائق اکرام دادی سے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔ساتھ ہی موضع محمد والی کے

Marfat.com

پرائمری سکول میں داخل کرا دیئے گئے۔ چوتھی جماعت میں قصبہ خیر پور سادات کے مڈل سکول میں آ گئے اور ۱۹۶۵ء میں مڈل کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں جامعہ اسلامیہ بہاول پور چلے گئے، جس کی حیثیت اس وقت ایک دینی مدرسے کی تھی اور اس کا نام جامعہ عباسیہ تھا۔ وہاں نویں جماعت میں داخل ہوئے۔ مدرسین اس ادارے میں حنفی تھے اور طلبا بھی حنفی۔ عبدالحمید مری نے ایک دن جامعہ کے سبزہ زار میں اذان دی اور اپنے مسلک کے مطابق نماز پڑھنے لگے۔ دوسرے دن چند اور طالب علم بھی ان کے ساتھ مل گئے، وہ تھے مولانا محمود احمد میر پوری، مولانا محمد حنیف (جو بعد میں جامعہ سلفیہ فیصل آباد چلے گئے تھے) اور چند دیگر طلبا۔ یہ سب الگ الگ نماز پڑھتے تھے، اب اکٹھے پڑھنے لگے۔ ان میں سے کبھی محمود احمد میر پوری امامت کراتے، کبھی محمد حنیف اور کبھی کوئی اور صاحب۔ پھر حالات ایسے پیدا ہوئے کہ عبدالحمید وہاں سے دارالحدیث محمدیہ جلال پور پیروالا چلے گئے۔ وہاں مولانا سلطان محمود صاحب سے شرح نخبۃ الفکر، جامع ترمذی اور بعض دیگر درسی کتابیں پڑھیں۔ مولانا اللہ یار صاحب سے مشکوٰۃ شریف پڑھی۔ لیکن صحت خراب ہوگئی، اس لیے زیادہ عرصہ وہاں نہیں رہ سکے۔

اب وہ کراچی گئے اور دارالحدیث رحمانیہ میں داخلہ لیا۔ وہاں مولانا حاکم علی دہلوی سے سنن ابی داؤد، مولانا عبدالستار صاحب سے بلوغ المرام، مولانا عبدالرشید ندوی لداخی سے سنن نسائی، مولانا عبدالجبار صاحب سے بعض کتب حدیث اور مولانا عبداللہ مسعود بلتستانی سے صرف ونحو کی کتابیں پڑھیں۔ لیکن کراچی کی آب و ہوا موافق نہ آئی اور بیمار پڑ گئے۔ اطبا سے رجوع کیا اور علاج کرایا، مگر افاقہ نہ ہوا۔ اطباء کے مشورے سے کراچی سے نکلے اور دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں لاہور آ گئے۔ یہاں حضرت حافظ محمد اسحاق حسینوی سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا درس لیا اور حافظ عبدالرشید گوہڑوی سے تفسیر بیضاوی، سنن ابن ماجہ اور چند دیگر نصابی کتابیں پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔ مولانا محمد حنیف ندوی اور مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے بھی استفادے کا موقع ملا۔ مطالعہ کتب کا شوق تھا اور مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کی خدمت میں (مکتبہ سلفیہ میں) حاضری کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

مولانا عطاء اللہ صاحب مطالعہ کے شائق طالب علم کی تربیت اور رہنمائی ضروری سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنے صاحب زادے حافظ احمد شاکر سے کہا کہ جو کتاب یہ مطالعہ کے لیے مانگیں انھیں ضرور دی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں تحریر و کتابت سے دلچسپی ہوئی اور پھر عربی اور اردو زبانوں میں یہ خدمت سرانجام دی (جس کی تفصیل آئندہ سطور میں آئے گی) دارالعلوم تقویۃ الاسلام سے انھوں نے سند فراغت لی۔

بعد ازاں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے حسب فرمان فیصل آباد گئے اور وہاں ادارہ علوم اثریہ میں

Marfat.com

مولانا عبداللہ لائل پوری، اور مولانا محمد عبدہ الفلاح سے خوب اخذ فیض کیا۔ وہیں مولانا ارشاد الحق اثری تدریسی خدمت انجام دیتے تھے، ان سے بھی مستفید ہوئے۔

دارالعلوم تقویۃ الاسلام لاہور کے علاوہ مولانا عبدالحمید المری نے جن حضرات علما سے اجازۂ حدیث حاصل کیا، وہ ہیں مولانا محمد یوسف کلکتوی، مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، مولانا عبدالکریم اور مولانا عبدالعزیز (شاگرد شیخ الہند مولانا محمود حسن) مولانا حبیب اللہ گمانی (استاد حضرت مولانا سلطان محمود جلال پوری) سید محبّ اللہ شاہ راشدی، سید بدیع الدین شاہ راشدی، مولانا عبدالحق ہاشمی۔

۱۹۷۰ء میں مولانا عبدالحمید المری نے فریضہ حج ادا کیا اور شیخ عبداللہ بن السبیل اور حافظ فتحی کی پرخلوص کوشش سے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلے کا شرف حاصل ہوا۔ وہاں جن حضرات سے اخذ فیض کیا، ان میں شیخ عبدالعزیز بن باز رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

مولانا عبدالحمید المری نے مختلف مقامات میں تدریسی خدمات سرانجام دیں۔ اس کا آغاز دارالعلوم تقویۃ الاسلام لاہور میں اساتذہ کرام کی نگرانی ہو گیا تھا۔ درسی کتابوں پر انھیں اللہ کے فضل سے عبور حاصل ہے، اس لیے اساتذہ اور طلبا ان کے طریق تدریس سے خوش تھے۔

کچھ عرصہ لاہور میں مولانا عبدالرشید مجاہد آبادی کے مدرسے میں پڑھاتے رہے۔ اس کے بعد صوبہ سندھ کے پڈعیدن میں ایک گوٹھ (بستی) میں امامت و خطابت کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کا علم سید محبّ اللہ شاہ راشدی کو ہوا تو انھوں نے اپنے مدرسہ دارالرشاد میں آنے کی دعوت دی اور یہ پانچ سال وہاں سندھی زبان میں تفسیر، حدیث اور مختلف فنون کی کتابیں طلبا کو پڑھاتے رہے۔ جن طلبا نے ان سے وہاں تعلیم حاصل کی ان میں سید محبّ اللہ شاہ راشدی مرحوم و مغفور کے تینوں فرزندان گرامی محمد یٰسین، محمد راشد اور محمد قاسم بھی شامل ہیں۔ تدریس کے علاوہ ان کے کتب خانے کی مکمل فہرست تیار کی اور تحقیق و تخریج کا کام شروع کیا۔ وہاں رہ کر انھیں بہت علمی فائدہ ہوا۔

اس کے بعد انھیں پروفیسر ظفر اللہ چودھری مرحوم نے اپنے قائم کردہ تدریسی ادارے جامعہ ابوبکر (کراچی) آنے کی دعوت دی۔ وہاں شعبہ تصنیف و تالیف میں بھی کام کیا اور تدریس بھی جاری رکھی۔ ترجمہ قرآن یہ بیک وقت عربی، فارسی، اردو، سندھی، سرائیکی اور پنجابی چھ زبانوں میں پڑھاتے تھے۔ یہ بہت بڑی خدمت قرآن تھی جو یہ انجام دیتے رہے۔ وہاں تین سال اس خدمت پر مامور رہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اللہ نے ان کو بہت سی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔

جامعہ ابوبکر (کراچی) سے سبک دوش ہونے کے بعد یہ واپس گھر آ گئے اور سرکاری سکول میں ان کی

Marfat.com

تقرری ہوگئی۔سرکاری ملازمت ۱۹۸۴ء میں شروع کی اور ۲۔نومبر ۲۰۱۲ء میں اس سے ریٹائر ہوئے۔

اللہ نے ان کو توفیق بخشی۔انھوں نے ایم اے اسلامیات اور ایم اے عربی کے امتحانات دیئے اور کامیاب ہوئے۔فاضل عربی کا امتحان بھی دیا۔۱۹۸۳ء میں وفاق المدارس السّلفیہ کے امتحان میں شرکت کی اور کامیابی کی سند لی۔فاضل طب وجراحت بھی ہوئے۔

ماشاءاللہ بیٹے،بیٹیوں،پوتے،پوتیوں اور نواسے،نواسیوں سے اللہ نے نوازا ہے اور ہر اعتبار سے خوش قسمت ہیں۔

مولانا ممدوح کا مطالعہ وسیع ہے اور ان کا اچھا خاصا کتب خانہ ہے،جس میں ہر موضوع کی اہم کتابیں موجود ہیں۔تصنیف وتالیف کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔سندھی زبان میں انھوں نے جو تصنیفی کام کیا وہ یہ ہے:

(۱) رسالہ اصول حدیث (۲) سندھ اور عرب کا قبل از اسلام تعلق (۳) سندھ کے رسوم ورواج اور ان کی مختصر تاریخ (۴) تاریخ سندھ پر طائرانہ نظر۔اس کے علاوہ بھی سندھی زبان میں ان کے چند چھوٹے چھوٹے رسائل چھپے ہیں۔

آج کل سرائیکی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ترجمہ ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔اللہ کرے جلد ختم ہو اور پھر جلد ہی چھپ بھی جائے۔اس کے علاوہ مولانا موصوف کی اردو اور عربی تصانیف اور تخریج وتحقیق مندرجہ ذیل ہیں۔ملاحظہ فرمائیے۔پہلے عربی تصانیف کے نام جن کی تعداد دس تک پہنچی ہے۔

(۱) من تکلم فیه و هو موثق ، امام ذهبی تحقیق و تخریج۔

(۲) التذکره فی علوم الحدیث ، ابن ملقن تحقیق و تعلیقات

(۳) التذکره فی علوم الحدیث ، ابن ملقن ، شرح۔

(٤) جزء فی احادیث ابن عیینه ، تحقیق و تخریج۔

(٥) مالا یسع المحدث جهله للمیانجی ، تحقیق و تخریج

(٦) المغنی فی ضبط اسماء الرجال لابی طاهر پٹنی ، زیادات و استدراك

(٧) علل الحدیث لابن ابی حاتم ، تعلیقات و تصویبات

(٨) المعجم الکبیر للطبرانی ، تحقیق و تعلیقات

(٩) مسند عبد بن حمید (المنتخب) تحقیق و تخریج

(١٠) خلق افعال العباد للبخاری ، تخریج احادیث بنام ارشاد العباد الی تخریج خلق افعال العباد

Marfat.com

اردو زبان میں ان کی تصانیف وتراجم کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ کتاب الادب لابن ابی شیبہ، اردو ترجمہ۔

۲۔ رسالہ نکاح شغار۔

۳۔ رسالہ نکاح بنات صغار۔

۴۔ رسالہ حلت خیل (بنام احسن الغرس فی حلت الفرس)۔

۵۔ سوانح حیات ابن عیینہ، امام طبرانی، ابن ملقن۔

۶۔ تہذیب وترجمہ کتاب برہان العجاب فی فرضیۃ ام الکتاب (از مولانا محمد بشیر سہسوانی۔)

۷۔ ترجمہ رسالہ ابن تیمیہ بسم اللہ کے بارے میں۔

۸۔ مجموعہ مقالات (عناوین مختلفہ، تحریری مناظرات وغیرہ)۔

۹۔ حکم اجتماعی دعآء بعد الصلاۃ۔

۱۰۔ کتاب الزہد ابو عاصم النبیل۔

۱۱۔ کتاب الزہد امام ابوداوٗد۔

۱۲۔ المختصر المومل فی الرد الی الامر الاول ابوشامہ۔

۱۳۔ کتاب الایمان ابن ابی شیبہ

اللہ کا ان پر یہ عظیم احسان ہے کہ یہ تدریس میں بھی مشغول رہے اور تصنیف وتالیف اور تراجم میں بھی۔

یہ سطور ۱۸۔ مارچ ۲۰۱۳ء کو لکھی گئی ہیں اور ماشاء اللہ ان کا سلسلہ تصنیف وتدریس جاری ہے۔ اللہ کرے قرآن کا سرائیکی ترجمہ جلد تکمیل کو پہنچے۔

Marfat.com

مولانا عبیداللہ اظہر

(ولادت یکم جون ۱۹۵۳ء)

مولانا عبیداللہ اظہر یکم جون ۱۹۵۳ء کو ضلع فیصل آباد کے چک نمبر ۷ ج۔ب پنج وڑ میں پیدا ہوئے۔ والدہ نے بیٹے کا نام طالب علی رکھا۔ سکول میں داخل ہوئے تو طالب حسین ہو گئے۔ جامعہ سلفیہ میں داخلہ ملا تو اس کے مدرس حافظ بنیامین طور مرحوم نے عبیداللہ نام رکھ دیا اور پھر ''اظہر'' کا اضافہ انھوں نے خود ہی کر لیا۔

ان کے گاؤں ''پنج وڑ'' کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ کسی زمانے میں یہاں پانچ بھائی آباد تھے، جن کے الگ الگ ''واڑے'' یعنی پانچ ڈیرے تھے۔ اس لیے یہ گاؤں ''پنج وڑ'' کے نام سے مشہور ہو گیا۔ یعنی پانچ ڈیروں والا گاؤں۔ عبیداللہ اظہر نے ناظرہ قرآن مجید اپنے گاؤں کی مسجد میں مولوی عبدالجبار مرحوم سے پڑھا۔ ابتدائی تعلیم قریب کے گاؤں چک نمبر ۸ ج۔ب پنج گرایاں کے سکول میں پرائمری تک حاصل کی۔ ان کے نانا پختہ ذہن کے موحد اور والد گرامی رحمت اللہ بریلوی نقطۂ نظر کے حامل تھے۔ ختم وغیرہ سب کچھ کرتے تھے۔

پرائمری پاس کرنے کے بعد مولوی عبدالجبار مرحوم نے ان کے والد کو مشورہ دیا کہ اس بچے کو دینی تعلیم دلائی جائے اور اسے جامعہ سلفیہ میں داخل کرا دیا جائے۔ والد نے اس مشورے کے مطابق ۱۹۶۲ء میں بچے کو جامعہ سلفیہ میں داخل کرا دیا۔

جامعہ سلفیہ کے نصاب کے مطابق پہلی اور دوسری جماعت کی کتابیں وہیں پڑھیں۔ یعنی ابتدائی دو سال جامعہ سلفیہ میں تعلیم حاصل کی۔ اس وقت جامعہ سلفیہ کے ناظم مولانا ابوحفص عثمانی تھے۔ تیسرے سال فیصل آباد کے مدرسہ دارالقرآن والحدیث میں چلے گئے، اس کے مہتمم اس وقت مولانا عبداللہ ویروالوی تھے۔ یہاں انھوں نے مولانا محمد اسحاق خائف سے مشکوٰۃ کی جلد اول پڑھی۔ دیگر نصابی کتابیں بھی مختلف اساتذہ سے پڑھنے کا موقع ملا۔ چوتھے سال پھر جامعہ سلفیہ چلے گئے۔ اب انھیں جامعہ سلفیہ میں پیر محمد یعقوب قریشی، مولانا علی محمد حنیف سلفی اور بعض دیگر نامور اساتذہ سے اکتساب علم کی سعادت حاصل ہوئی۔ پانچویں سال مدرسہ دارالقرآن والسنہ میں داخلہ لیا۔ یہ مدرسہ مولوی احمد الدین فیروز پوری مرحوم نے ضلع فیصل آباد کے چک نمبر ۸۰ گ ب میں جاری کیا تھا جو بنگلہ ستیانہ کے قرب و جوار میں ہے۔ وہاں مولانا مفتی عبیداللہ عفیف سے جامع ترمذی پڑھی اور دیگر اساتذہ سے دوسری نصابی کتابیں پڑھیں۔ یہ مدرسہ چند سال جاری رہا۔ پھر ختم ہو گیا تھا۔ چھٹے سال پھر جامعہ سلفیہ کا رخ کیا۔ وہاں مولانا ثناء اللہ ہوشیار پوری سے سنن ابی داؤد کی تکمیل

Marfat.com

کی۔ منطق کی نصابی کتب مولانا شریف اللہ خان سواتی سے پڑھیں۔ موطا امام مالک مولانا محمد صدیق (سابق خطیب جامع مسجد اہل حدیث امین پور بازار فیصل آباد) سے پڑھا۔ صحیح مسلم پیر محمد یعقوب قریشی سے اور صحیح بخاری حافظ عبداللہ بڈھیمالوی سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔

بعد ازاں ۱۹۶۹ء میں فاضل عربی کا اور ۱۹۷۰ء میں مڈل کا امتحان پاس کیا۔ جامعہ سلفیہ سے فراغت کے بعد ان کی شادی ہوگئی اور پھر آٹھ نو سال دینوی کاروبار میں مشغول رہے۔ ۱۹۷۹ء میں جامعہ تعلیمات اسلامیہ کے درجہ تخصص میں داخلہ لیا۔ جامعہ کی طرف سے انھیں تین سو روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ ساتھ ہی چک جھمرہ (ضلع فیصل آباد) کی مسجد اہل حدیث میں خطابت وامامت کا فریضہ انجام دینے لگے اور دنیوی کاروبار سے بالکل علیحدگی اختیار کرلی۔ ۱۹۸۲ء میں جامعہ تعلیمات اسلامیہ کی طرف سے ان کا داخلہ مدینہ یونیورسٹی میں ہوگیا۔ وہاں چار سال کا نصاب مکمل کر کے ۱۹۸۶ء میں انھیں سند فراغت ملی۔ مدینہ یونیورسٹی میں جن اساتذہ گرامی سے تعلیم حاصل کی، ان میں ڈاکٹر عبداللطیف مصری، ڈاکٹر جمعہ مصری، ڈاکٹر عبداللطیف سعودی اور ڈاکٹر ابراہیم ترکی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اس وقت شیخ عبدالعزیز بن باز تھے۔

جس زمانے میں یہ مدینہ یونیورسٹی سے فارغ ہوئے، اس زمانے میں افغانستان میں ''جہاد'' کا سلسلہ جاری تھا اور لاکھوں کی تعداد میں افغان مہاجرین پاکستان آگئے تھے۔ ان کے ٹھکانوں میں بہت سے دینی مدارس جاری تھے، جن کی مالی مدد زیادہ تر سعودی حکومت کرتی تھی۔ ان مدارس میں طلباء کی تعلیم کے لیے مدینہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل حضرات کو بھیجا جاتا تھا۔ یہ اساتذہ ''مبعوث'' کہلاتے تھے۔ مولانا عبیداللہ اظہر کو بھی افغان مہاجرین کے مدارس میں بطور مبعوث بھیجا گیا تھا۔ پھر ان کے ساتھ کیا گزری۔ اس کی تفصیل خود مولانا موصوف کی زبانی سنیے!

''۱۹۸۶ء میں مجھے افغان مہاجرین کی طرف مبعوث کیا گیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب جنگ کی وجہ سے یہ لوگ افغانستان سے پاکستان ہجرت کر آئے تھے۔ ان افغان مہاجرین کے لیے جو مدارس قائم تھے، ان کی سرپرستی عبدرب رسول سیاف کر رہا تھا۔ (یہ ایک متعصب حنفی تھا۔ اس کا اصل نام ''عبد رسول'' تھا۔ شیخ ابن باز رحمہ اللہ نے اس کا نام عبد رسول سے ''عبدرب رسول'' رکھا۔ افغانی باشندہ ہے) ان مہاجرین کے لیے جب مجھے استاذ مقرر کیا گیا تو میں اپنی تقرری کا خط لے کر عبدرب رسول سیاف حنفی کے پاس آیا۔ اس حنفی کا طریقہ واردات یہ تھا کہ یہ ایسی جعلی ویڈیوز بناتا جس میں طلبا کو رفع الیدین، آمین بالجہر اور سنت نبوی کے مطابق نماز پڑھتے ہوتے دکھاتا۔ اپنے آپ کو سلفی ظاہر کرتا تھا۔ یہ ویڈیوز سعودی حکومت تک لے جاتا اور ان سے مدارس اور طلبا کے لیے چندہ وصول کرتا۔ عربوں کے لیے ایک دارالضیافہ قائم تھا، جس میں عرب مندوبین آتے تو اسی جگہ سنت نبوی کے مطابق نماز پڑھتے تھے، جب کہ اس کی دیگر مساجد میں سنت کے مطابق نماز

Marfat.com

پڑھنے والے کو سخت سزا سے نوازا جاتا تھا۔ میرے علاوہ بھی تقریباً پچاس کے قریب مقرر شدہ اساتذہ پہلے آ چکے تھے۔ چونکہ وہ سب سلفی العقیدہ اہل حدیث تھے، اس لیے اس نے ان کے تبادلے دیگر اہل حدیث کے مدارس میں کر دیئے تھے۔ میں بھی اس کے پاس گیا۔ جب اسے علم ہوا کہ میں اہل حدیث ہوں تو اس نے میرا تبادلہ جامعہ تعلیمات اسلامیہ (فیصل آباد) میں کر دیا اور مجھے تقدیم لکھ کر دی اور کہا کہ جاؤ حکیم اشرف صاحب سے طلب (درخواست) لے آؤ۔ میں سیاف حنفی کے بھیجنے پر گیا اور طلب لے آیا۔ میں نے شیخ ابن باز رحمہ اللہ کے خط، تقدیم اور طلب تینوں کی فوٹو کاپی حاصل کر لی۔ سیاف نے مجھ کو رسمی طور پر تبادلے کا خط لکھ کر دیا۔ میں نے اس کی بھی کاپی کروالی اور ان سب کاغذات کو بطور ثبوت محفوظ کر لیا۔ چار ماہ تک جامعہ تعلیمات اسلامیہ میں پڑھاتا رہا۔ چار ماہ کے بعد جا کر سیاف حنفی سے اپنا وظیفہ لے آیا۔ اس نے کہا کہ چار ماہ بعد آ کر وظیفہ لے جایا کرو۔ اگلے چار ماہ بعد گیا تو اس نے صرف دو ہزار روپے دے کر کہا کہ ہم نے اسلحہ خرید لیا ہے، صرف یہی ہیں۔ میں نے مطالبہ کیا تو اس نے کہا کہ تم ابن باز کو خط لکھ دو کہ سیاف کہتا ہے کہ اس نے رقم کا اسلحہ خرید لیا ہے۔ جب میں اس کے پاس گیا تھا تو اسی دوران اس کے کارندوں نے ایک اہل حدیث مسجد کو بارود سے اڑانے کی کوشش کی تھی۔ ان کا وہ کارندہ اہل حدیث حضرات نے پکڑ لیا تھا۔ میں نے سعودیہ خط لکھا مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ اللہ پر توکل کیا اور خاموش ہو گیا۔

پہلے تعلیمات اسلامیہ فیصل آباد اور پھر جامعہ سلفیہ میں مدرسے کی تنخواہ پر پڑھاتا رہا۔ اسی عرصے میں جامعہ سلفیہ میں موسسہ حرمین شریفین کی طرف سے مبعوث ہو گیا۔ ان دنوں عربی ریفریشر کورس ہوتا تھا۔ اس کے لیے سعودیہ سے شیوخ آتے تھے۔ مولانا یٰسین ظفر صاحب (موجودہ مدیر تعلیم جامعہ سلفیہ فیصل آباد) نے میری ڈیوٹی لڑکوں کی حاضری لگانے پر لگا دی تھی۔ کورس کے اختتام سے ایک دن قبل سعودی شیوخ مجھے اپنے ساتھ بازار لے گئے۔ واپسی پر میرے بارے میں دریافت کیا تو میں نے اپنی آپ بیتی سنائی۔ وہ بہت حیران ہوئے۔ میں نے ان کو کاغذی ثبوت بھی دکھلائے۔ پاکستان میں ان شیوخ کے رئیس ڈاکٹر علی سلطان الحکمی تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے بات کی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے طلب کیا۔ میں ان کے پاس ثبوت لے کر حاضر ہو گیا۔ ثبوت دیکھنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فون پر شیخ عبدالرحمٰن الاوشین (مدیر مکتب الدعوۃ اسلام آباد) سے رابطہ کیا۔ شیخ صاحب (مدیر مکتب الدعوۃ) نے مجھے طلب فرمایا۔ میں نے حاضر ہو کر سارے حالات سنائے تو انھوں نے مجھے سیاف حنفی کے پاس جانے کو کہا اور مجھے اپنا سیل بند خط بھی دیا۔ میں نے جا کر یہ خط سیاف کو دیا تو اس نے مجھے اس خط کے جواب میں خط لکھ کر دے دیا۔ شیخ عبدالرحمٰن نے سعودی حکومت کی طرف یعنی ریاض میں مکتب الدعوۃ کو خط لکھا۔ خط لکھنے کے بعد اسے ٹائپ کرنے والے کو دے دیا۔ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ شیخ عبدالرحمٰن کا تبادلہ ہو گیا اور میرا کام وہیں رک گیا۔

Marfat.com

میں جامعہ سلفیہ میں پڑھاتا رہا۔ کچھ عرصے کے بعد میرے دوست قاری صدیق اتفاقاً پاکستان تشریف لائے انھیں پتا چلا تو مجھے سیاف حنفی کے پاس دوبارہ جانے کو کہا۔ میں نے اپنی جان کے خطرے کا ذکر کیا تو وہ بھی میرے ساتھ چل پڑے۔ انھوں نے اپنے آپ کو شیخ ابن باز رحمہ اللہ کا مندوب ظاہر کیا۔ سیاف نے وہی پرانے جوابات دیئے۔ خیر قاری صدیق میرے کاغذات اپنے ساتھ سعودیہ لے گئے۔ کافی عرصہ میرے پچھلے وظیفے کے بارے میں دارالافتاء میں کوشش کرتے رہے۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ لیکن ان کے دوست شیخ ابراہیم القعود (مدیر دعوۃ فی الخارج) نے کہا کہ پچھلا وظیفہ تو نہیں مل سکتا۔ اگر آپ کہیں تو آئندہ کے لیے میں راستہ ہموار کیے دیتا ہوں۔ شیخ صاحب (مدیر الدعوۃ فی الخارج) نے مجھے دوبارہ مبعوث کر دیا جس کی اطلاع مدیر مکتب الدعوۃ اسلام آباد نے انٹرویو لینے کے بعد بذریعہ ڈاک دی۔

جامعہ سلفیہ فیصل آباد میں مبعوث کی حیثیت سے تقریباً ۸ سال پڑھایا۔ پھر ۲۰۰۰ء میں جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن بھیج دیا گیا، پھر ۲۰۰۶ء میں کلیۃ دارالقرآن والحدیث فیصل آباد میں مبعوث کر دیا گیا۔ تاحال اسی ادارے میں درس و تدریس کے فرائض سرانجام دے رہا ہوں۔"

مولانا عبیداللہ اظہر کی تحریر ختم ہوئی۔

مولانا عبیداللہ اظہر کے بعض اساتذہ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ یہاں سب کا کیا جاتا ہے اور وہ ہیں حافظ عبداللہ بڈھیمالوی، پیر محمد یعقوب قریشی، مولانا مفتی عبیداللہ عفیف، مولانا محمد صادق خلیل، مولانا قدرت اللہ فوق، مولانا شریف اللہ خاں سواتی، حافظ بنیامین طور، مولانا علی محمد حنیف سلفی، شیخ حسین مصری، شیخ غراب مصری، ڈاکٹر سالم مصری، مولانا محمد صدیق (سابق خطیب جامع مسجد اہلِ حدیث فیصل آباد)، مولانا فاروق احمد (موجودہ شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ گوجراں والا)۔

مولانا ممدوح کے تلامذہ کی تعداد بھی کافی ہے۔

مولانا عبیداللہ اظہر کی تحریر سے پتا چلا کہ

☆...... افغانستان کے "جہاد" کو افغانی قائدین نے پیسا کمانے کا بہت بڑا ذریعہ بنا لیا تھا۔

☆...... پیسے کے لیے وہ جھوٹ بولتے اور لوگوں کو دھوکا دیتے تھے۔

☆......سعودی اور دیگر عرب رہنماؤں کے سامنے وہ کذب بیانی کرتے اور انھیں فریب دیتے تھے۔

☆......اہلِ حدیث کو وہ سخت برا سمجھتے تھے اور ان کی مسجدوں کو منہدم کرنا اور جلانا ان کے نزدیک ضروری تھا۔

بے شمار اہلِ حدیث حضرات نے اس "جہاد" میں حصہ لیا، محض ثواب حاصل کرنے کے لیے۔ ہم چوں کہ ہر کام "ثواب" کے لیے کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ثواب دیتا ہوگا۔ لیکن کوئی کام کرنے سے پہلے سوچنا بھی

Marfat.com

چاہیے کہ جو کام ہم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ۱۹۷۷ء میں جمہوری حکومت کو ختم کرنے کے لیے بعض سیاسی اور مذہبی جماعتوں نے تحریک چلائی، جسے امریکہ کی شہ حاصل تھی۔ اس میں شاہ احمد نورانی صاحب شامل ہوئے تو انھوں نے اسے تحریک نظام مصطفیٰ کا نام دیا جو سراسر خلاف حقیقت تھا۔ اب اہل حدیث بھی حصول ثواب کے لیے اس میں کود پڑے اور پولیس کے ڈنڈوں اور لاٹھیوں کا شکار ہوئے۔ حکومت ختم ہوئی اور ضیاالحق کا مارشل لا آیا تو اس نے حکومت بنائی جس میں جماعت اسلامی، مسلم لیگ، جمعیت علمائے اسلام اور پاکستان جمہوری پارٹی وغیرہ کو شامل کیا اور ان کے دو دو تین تین آدمیوں کو وزیر بنالیا گیا اور ہمیں ثواب تو پتا نہیں ملا یا نہیں ملا، لیکن یہ ہم نے دیکھا کہ بہت سے دوست پولیس کی لاٹھیوں کی زد میں آ گئے۔ اسپتالوں میں پہنچ گئے اور کسی جماعت کے کسی شخص نے کسی سے بات کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا، اس لیے کہ سب جماعتیں شاہی خاندان بن چکی تھیں۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد ضیاء الحق نے ان کی شاہی خاندانی بھی ختم کردی تھی۔ مئی ۲۰۱۳ء کے الیکشن میں جماعت اہل حدیث نے مسلم لیگ نون کو ووٹ دینا ضروری قرار دیا ،جس نے مہنگائی کو اس قدر آسمان پر پہنچا دیا کہ لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ [1] آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔

❀❀❀❀

[1] افغانستان میں اہلحدیث کے ساتھ نفرت اور تعصب کی کہانی نئی نہیں۔ مولانا عبداللہ غزنوی کو اس ''جرم اہل حدیثیت'' کی پاداش میں غزنی سے ہجرت کرنا پڑی۔ ماضی قریب میں طالبان (جن کے امیر ملا محمد عمر تھے) کی افغانستان میں حکومت تھی۔ جب کابل پر طالبان کا قبضہ ہوا تو کابل یونیورسٹی کی لائبریری سے تین بزرگوں کی کتب نکال کر نذر آتش کردی گئیں۔ ان کے نام ہیں:

۱۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ

۲۔ ان کے تلمیذ رشید امام ابن قیم

اور ۳۔ شیخ الاسلام امام محمد بن عبدالوہاب۔

اس تعصب میں طالبان تنہا نہیں تھے، دیگر افغان قائدین مثلاً انجینئر گلبدین حکمت یار کی چند تحریریں نظر سے گزریں جن میں وہابیت سے سخت بیزاری کا اظہار کیا گیا تھا۔ ماضی قریب کی بات ہے۔ طالبان دور میں ہمارے پاس ایک بے حد متقی اور نیک نوجوان عبدالقدوس بدخشاں ملازمت کرتے تھے۔ تقویۃ الاسلام شیش محل روڈ لاہور سے سند فراغ لی ہوئی تھی۔ ایک بار وہ اپنے وطن چھٹیاں گذارنے گئے۔ کسی کام سے انہیں کابل آنا پڑا۔ متعلقہ محکمے کے وزیر صاحب کے پاس وہ گئے۔ گفتگو ہوئی تو وزیر صاحب نے پوچھا آپ نے کہاں سے تعلیم حاصل کی؟ عبدالقدوس کہنے لگے لاہور سے۔ وزیر صاحب بے ساختہ بول اُٹھے جامعہ اشرفیہ سے؟ عبدالقدوس نے کہا: جی نہیں۔ مدرسہ غزنویہ یعنی تقویۃ الاسلام سے۔ وہ کہنے لگے میں نے یہ نام نہیں سنا۔ عبدالقدوس نے انہیں بتایا کہ یہ اہل حدیث کا مدرسہ ہے۔ وزیر صاحب نے یہ سنا تو ان کی طبیعت میں خاصا انقباض پیدا ہوا۔ چہرے پر ناخوشگواری کے تاثر تھے۔ کہنے لگے: آپ نے مجھے تو بتا دیا ہے لیکن کسی اور کو نہ بتانا کہ آپ اہل حدیث کے مدرسے سے پڑھے ہوئے ہو۔ عبدالقدوس ہی بتاتے ہیں کہ دورانِ جہاد ہم جس تربیتی مرکز میں تھے، وہاں ہمیں سختی سے منع تھا کہ ہم نے نمازِ حنفی فقہ کے مطابق ادا کرنی ہے۔ کسی صورت بھی رفع یدین نہیں کرنی اور نہ سینے پر ہاتھ باندھنے ہیں، نہ آمین بالجہر کے نبوی طریقے پر عمل کرنا ہے۔ (عمر فاروق قدوسی)

Marfat.com

مولانا محمد اکرم مدنی

(ولادت ۱۲ ستمبر ۱۹۵۳ء)

صاحبِ ترجمہ مولانا محمد اکرم کی ولادت ۱۲۔ ستمبر ۱۹۵۳ء کو ضلع گجرات (پنجاب) کے ایک گاؤں خواجہ چک میں ہوئی جو ''میانہ چک'' کے نام سے معروف ہے۔ والد کا اسم گرامی حاجی محمد فیروز ہے۔ اپنے گاؤں کے قریب موضع نور جمال کے مڈل سکول میں تعلیم کا آغاز کیا۔ ساتویں جماعت میں پہنچے تو والد نے سکول کی تعلیم بند کر کے دینی تعلیم دلانے کا فیصلہ کیا، اس لیے کہ وہ علمائے کرام کی مجلسوں میں بیٹھتے اور ان کے مواعظ سنتے تھے۔ ان کے دل میں بیٹے کو بھی اسی راہ پر لگانے کا جذبہ پیدا ہوا۔ کچھ عرصہ یہ اسی علاقے کے موضع ''چھوہراں والا'' کے مولانا عبداللہ سے پڑھتے رہے۔ پھر گوجراں والا میں شیخ الحدیث مولانا عبداللہ گجراتی مرحوم و مغفور کے مدرسے میں داخلہ لیا جو انھوں نے ''دارالحدیث مدینۃ العلم'' کے نام سے جاری کیا تھا۔ اس مدرسے میں انھوں نے مولانا موصوف سے ابواب الصرف اور کتاب الصرف اور مولانا بشیر الرحمٰن اور قاضی مقبول احمد سے بعض دیگر درسی کتابیں پڑھیں۔ یہ ان کا دینی تعلیم کا پہلا سال تھا۔

دوسرے سال یہ مدرسہ جی ٹی روڈ پر نئی عمارت میں منتقل ہو گیا۔ حضرت حافظ محمد گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تجویز سے اس کا نام مدینۃ العلم کے بجائے جامعہ شرعیہ رکھ دیا گیا۔ بعد ازاں اسے جامعہ محمدیہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ وہاں بلوغ المرام، ہدایۃ النحو اور زنجانی کا کچھ حصہ حافظ عبدالمنان نور پوری سے پڑھا۔ ترجمہ قرآن مولانا عبداللہ صاحب پڑھاتے تھے جس میں صرفی نحوی مسائل بھی سمجھاتے تھے۔ مراح الارواح اور شرح مائۃ عامل بعض دیگر اساتذہ سے پڑھیں۔

آئندہ سال گوجراں والا کی جامعہ اسلامیہ میں داخلہ لیا، جس کے مہتمم مولانا ابوالبرکات احمد مرحوم تھے۔ یہاں یہ ایک سال رہے اس اثناء میں مشکوٰۃ، کافیہ، القراۃ الرشیدہ، عربی کا معلم اور فصول اکبری وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ اساتذہ کرام میں مولانا نذیر احمد اور مولانا فاروق احمد صاحب راشدی شامل تھے۔ مولانا نذیر احمد وفات پا چکے ہیں اور مولانا فاروق احمد صاحب راشدی اس وقت جامعہ اسلامیہ میں بطور شیخ الحدیث خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ماشاء اللہ بہت محنتی اور لائق استاد ہیں۔ علم کے ساتھ اللہ نے ان کو عمل کی نعمت سے بھی نوازا ہے۔

Marfat.com

جامعہ اسلامیہ سے یہ جامعہ اثریہ جہلم چلے گئے، جو حافظ عبدالغفور صاحب مرحوم نے جاری کیا تھا اور وہی اس کے ناظم ومہتمم تھے۔جلیل القدر عالم شخص تھے۔طلبا کے ساتھ بے حد محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔جہلم اور اس کے گرد ونواح میں ان کا بہت اثر تھا۔ ماشاء اللہ یہ بہت مشہور دارالعلوم ہے۔اب اس کے مہتمم وناظم حافظ عبدالغفور مرحوم کے صاحب زادے حافظ عبدالحمید عامر ہیں، جو بہتر طریقے سے اسے چلا رہے ہیں۔ یہاں محمد اکرم صاحب نے دو سال تعلیم حاصل کی۔

جہلم سے یہ حضرت صوفی عبداللہ مرحوم ومغفور کی قائم کردہ جامعہ تعلیم الاسلام (ماموں کانجن) کو روانہ ہوئے۔ یہاں انھوں نے مندرجہ ذیل اساتذہ کرام سے مندرجہ ذیل کتابیں پڑھیں۔

- مولانا محمد صادق خلیل سے تفسیر بیضاوی۔
- مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی سے صحیح مسلم۔
- حافظ بنیامین طور سے ابوداؤد اور مختصر المعانی۔
- پیر محمد یعقوب قریشی سے صحیح بخاری، موطا امام مالک اور تاریخ الادب العربی۔
- مولانا عبدالرشید ہزاروی سے متنبّی۔

اساتذہ کی یہ مشہور جماعت تھی۔ مولانا عبدالرشید ہزاروی کے سوا باقی تمام حضرات اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔مولانا ممدوح بہت سالوں سے ساہی وال میں مقیم ہیں اور اوکاڑہ کے مدرسہ دارالحدیث میں شیخ الحدیث کے منصب عالی پر فائز ہیں۔

ماموں کانجن میں مولانا محمد اکرم دو سال حصول علم کرتے رہے۔اس اثنا میں انھیں حضرت صوفی عبداللہ مرحوم کی مجلسوں میں بیٹھنے اور ان کی باتیں سننے کا بھی اتفاق ہوا، جس سے یہ بہت متاثر ہوئے۔صوفی صاحب مستجاب الدعوات بزرگ اور مجاہدین کی جماعت کے اہم رکن تھے۔طویل عرصے تک مرکز مجاہدین میں ان کا قیام رہا اور اس جرم میں انگریزی حکومت نے ان کو شدید سزائیں دیں۔

جامعہ تعلیم الاسلام سے محمد اکرم صاحب ۱۹۷۱ء میں فارغ ہوئے اور مستحق سند قرار پائے۔اسی سال انھوں نے فیصل آباد کے ادارہ علوم اثریہ میں داخلہ لیا۔ اس وقت اس کے ناظم تھے مولانا محمد اسحاق چیمہ اور معلم تھے، مولانا عبداللہ جھال خانوالے اور مولانا محمد عبدہ الفلاح۔ تینوں علمائے دین وفات پا چکے ہیں۔ اناللہ و انا الیہ راجعون۔

اس وقت جو طلبا وہاں تعلیم حاصل کرتے تھے، وہ تھے مولانا ارشادالحق اثری، مولانا محمد خالد سیف، مولانا عبدالحمید، مولانا محمد صدیق، مولانا عبدالرحمٰن بلتستانی اور بعض دیگر طلبا۔ دارالعلوم اثریہ میں حدیث سے متعلق

Marfat.com

تحقیق کرائی جاتی تھی اور حدیث کے کسی موضوع پر طلبا سے مقالے لکھوائے جاتے تھے۔ محمد اکرم صاحب کو دو موضوع دیے گئے تھے، ایک حدیث اور اس کے مراجع، دوسرا امام دارمی اور ان کی سنن۔ یہ مقالے شائع بھی ہوئے۔ اب بہت عرصے سے ادارہ علوم اثریہ کے ناظم مولانا ارشاد الحق اثری ہیں اور متعدد اہل علم وہاں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ بہت سی اہم تحقیقی کتابیں ادارے کی طرف سے معرض اشاعت میں آ چکی ہیں جو قارئین کرام کے مطالعہ میں آئیں۔

ادارہ علوم اثریہ سے فراغت کے بعد مولانا محمد اسحاق چیمہ کے فرمان کے مطابق مولانا محمد اکرم نے ڈچکوٹ کی مسجد اہل حدیث میں خطابت کا سلسلہ شروع کیا۔ اس وقت سرگودھا کی جامع مسجد اہل حدیث بلاک نمبر۱۹ میں حافظ محمد ابراہیم کمیرپوری مرحوم خطبہ جمعہ دیتے تھے۔ وہ شدید بیماری کی زد میں آئے تو چیمہ صاحب نے اکرم صاحب کو وہاں بھیج دیا۔ وہاں ایک مدرسہ بھی تھا، اس میں تدریس کی ذمہ داری بھی ان کے سپرد ہوئی۔ لیکن وہاں ان کا جی نہیں لگا، لہٰذا دوبارہ ڈچکوٹ آ گئے۔ ڈچکوٹ کے زمانۂ قیام میں انھوں نے میٹرک کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔

اسی اثنا میں حکیم عبدالرحیم اشرف کی قائم کردہ جامعہ تعلیمات اسلامیہ (فیصل آباد) کے لیے مدرس کی ضرورت کے متعلق کسی اخبار میں اشتہار چھپا تو یہ حکیم صاحب موصوف کی خدمت میں پہنچے۔ انھوں نے چند باتیں پوچھیں اور انھیں مدرس مقرر کر لیا گیا۔ جامعہ تعلیمات اسلامیہ میں انھوں نے تین سال فریضہ تدریس انجام دیا اور جامع ترمذی، صحیح مسلم، حجۃ اللہ البالغہ اور علم نحو کی ہدایۃ النحو وغیرہ کتابیں پڑھائیں۔ حکیم صاحب کے طبیہ کالج میں بھی طلبا کو پڑھاتے تھے۔ اس وقت ان کا قیام ڈچکوٹ میں تھا۔

روزانہ بس کے ذریعے صبح کو وہاں سے فیصل آباد پہنچتے اور عصر کے بعد واپس جاتے اور بچوں کو پڑھاتے۔

حکیم صاحب کی کوشش سے انھیں مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ ملا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ان پر خاص کرم تھا۔ ۱۹۷۸ء میں انھیں مدینہ یونیورسٹی کے کلیۃ الدعوۃ واصول الدین میں داخل کیا گیا۔ یونیورسٹی میں انھوں نے سعودی عرب، مصر، شام، سوڈان وغیرہ مختلف ملکوں کے اساتذہ سے تعلیم پائی اور ان کے ساتھی طلباء بھی مختلف ملکوں سے تعلق رکھتے تھے۔ تعلیم کے آخری سال دفاع عن السنۃ، حضرت ابن عباس کا علمی مقام، حضرت عائشہ کا علمی مقام اور حجۃ السنۃ النبویہ کے عنوان پر مقالہ لکھا، جس میں منکرین حدیث کے ان اعتراضات کا جواب دیا گیا جو وہ حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر کرتے ہیں۔

مدینہ یونیورسٹی جاتے وقت حکیم عبدالرحیم اشرف مرحوم نے ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہاں سے فارغ ہو کر جامعہ تعلیمات اسلامیہ میں تدریسی خدمات سرانجام دیں گے۔ چنانچہ ۱۹۸۳ء میں واپس آئے تو حسب وعدہ

Marfat.com

جامعہ تعلیمات میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ دو سال وہاں تدریس کی تھی کہ مکتب الدعوۃ کی طرف سے ان کا تبادلہ کاموں کی ہائر سیکنڈری سکول میں کر دیا گیا۔ وہاں کی مختلف مساجد میں یہ خطبات جمعہ اور درس قرآن بھی دیتے تھے، نیز دیہات میں دعوت وتبلیغ کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ وہیں کے زمانۂ قیام میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے عربی اور ایم اے اسلامیات کے امتحانات پاس کیے۔ بعد ازاں مکتب الدعوۃ کی طرف سے مختلف مقامات میں ان کے تبادلے ہوتے رہے۔ جہاں گئے محنت اور انہماک سے تدریس کی اور احترام واکرام سے وقت گزارا۔ ۱۹۹۷ء سے یعنی پندرہ سولہ سال سے جامعہ سلفیہ میں اقامت فرما ہیں اور تفسیر سعدی، تفسیر بیضاوی، تفسیر فتح القدیر، جامع ترمذی، متنبّی اور مفتاح الانشاء وغیرہ کتابیں پڑھاتے ہیں۔ اس سے قبل سنن ابی داؤد، صحیح مسلم اور حجۃ اللہ البالغہ جیسی کتابیں پڑھا چکے ہیں۔

جامعہ سلفیہ میں تدریس کے ساتھ ساتھ وہ بہت سالوں سے فیصل آباد شہر کے محلّہ افغان آباد کی جامع مسجد کوثر اہل حدیث میں خطبہ جمعہ کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ امین کوٹ کی مسجد اہل حدیث میں روزانہ درس قرآن دیتے ہیں۔ شروع سے آخر تک ایک مرتبہ پورے قرآن کا درس مکمل ہو چکا ہے۔ دوسری دفعہ شروع ہے۔ نماز عشاء کے بعد مسجد طیبہ میں صحیح بخاری کا درس دیتے ہیں۔ ان کا یہ سلسلہ درس وتدریس مختلف مقامات میں جاری ہے۔

ان کی اولاد ایک بیٹا ہے اور دو بیٹیاں تھیں۔ چھوٹی بیٹی ۲۱۔ مئی ۲۰۱۲ء کو اکیس برس کی عمر میں وفات پا گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بڑی بیٹی نے بی اے پاس ہے اور ہومیوپیتھک ڈاکٹری کا کورس بھی کر چکی ہے۔ قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر بھی اللہ کی مہربانی سے پڑھ لی ہے۔

بیٹے کا نام النجم الثاقب ہے۔ میٹرک کرنے کے بعد اس نے جامعہ سلفیہ میں کچھ تعلیم حاصل کی۔ پرائیویٹ ایف اے کر کے پنجاب یونیورسٹی کے اسلامک سینٹر سے بی اے آنر کیا۔ پھر عالمی یونیورسٹی اسلام آباد سے پولیٹیکل سائنس اور انٹرنیشنل ریلیشن (بین الاقوامی تعلقات عامہ) میں ایم اے کیا۔ اب نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم فل کر رہے ہیں۔

یہ سطور ۱۴۔ فروری ۲۰۱۳ء کو لکھی گئی ہیں۔ اس کتاب کی طباعت تک وہ ایم فل سے فارغ ہو چکے ہوں گے۔ ان شاء اللہ

مولانا محمد اکرم مدنی کے رشحاتِ قلم جامعہ سلفیہ کے ماہنامہ ''ترجمان الحدیث'' میں باقاعدگی سے شائع ہوتے ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں کتاب وسنت کی زیادہ سے زیادہ خدمت کے مواقع عطا فرمائے۔

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا ابویحییٰ محمد زکریا زاہد

(ولادت دسمبر ۱۹۵۳ء)

ضلع قصور میں پاکستان اور ہندوستان کی سرحد کے قریب متعدد دیہات میں اہل حدیث حضرات کثیر تعداد میں آباد ہیں۔ ان دیہات میں فتوحی والا، برج کلاں، شام کوٹ، چھبر، حسین خاں والا، کنگن پور، تاراگڑھ، جوڑا وغیرہ ہیں۔ یہ سب دیہات دریائے ستلج کے کنارے واقع ہیں۔ ان مقامات میں رہنے والے لوگ زیادہ تر لکھوی، غزنوی اور بھوجیانی علمائے کرام سے متاثر ہیں۔ ان میں ایک گاؤں کا نام بازید پور ہے۔

تقسیم ملک سے قبل بازید پور میں ایک شخص فتح محمد سکونت پذیر تھے جو اس دور کے مطابق مالی اعتبار سے آسودہ حال تھے اور گاؤں میں احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے، محمد ابراہیم اور محمد اسماعیل۔ یہ دونوں بھائی ابھی کم عمر تھے کہ حالات نے پانسا پلٹا اور فتح محمد کا کاروبار ختم ہوگیا اور وہ سخت پریشانی کی گرفت میں آگئے۔ اسی اثنا میں فتح محمد وفات پاگئے، محمد ابراہیم اور محمد اسماعیل کی والدہ بھی انتقال کرگئیں۔ ان کے ایک چچا تھے، وہ بھی اپنے آبائی گاؤں بازید پور کی سکونت ترک کرگئے۔

فتح محمد کو شاید احساس ہوگیا تھا کہ وہ اب زیادہ عرصہ اس دنیا میں نہیں رہیں گے، اس لیے انھوں نے اپنے دونوں بیٹوں (محمد ابراہیم اور محمد اسماعیل) کو گاؤں کے نمبردار علی محمد کے سپرد کردیا۔ نمبردار صاحب خوش حال اور شریف آدمی تھے۔ انھوں نے ان دونوں بھائیوں کی اپنے بیٹوں کی طرح پرورش کی اور ہر اعتبار سے ان کا خیال رکھا، لیکن انھیں تعلیم نہ دلائی جاسکی۔

اس وقت وہاں ایک بزرگ حاجی عبدالغنی اقامت پذیر تھے۔ وہ زمین جائداد کے مالک تھے اور جماعت مجاہدین سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا صوفی ولی محمد (ساکن فتوحی والا) سے وہ خاص طور پر متاثر تھے۔ انھیں لوگوں کو تعلیم دلانے کا بھی شوق تھا۔ چناں چہ انھوں نے محمد ابراہیم اور محمد اسماعیل کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ کی اور اس کے بہت اچھے نتائج نکلے۔ پھر محمد ابراہیم جوان ہوئے تو ان کی شادی فتوحی والا میں اس خاتون سے ہوئی جس نے صوفی ولی محمد کی زوجہ محترمہ (اماں عائشہ بی بی مرحومہ) سے تعلیم حاصل کی تھی۔ ہمارے ممدوح مولانا ابویحییٰ محمد زکریا زاہد دسمبر ۱۹۵۳ء میں اسی صالحہ خاتون کے بطن سے پیدا ہوئے جو صوفی ولی محمد مرحوم و مغفور کی اہلیہ محترمہ کے دائرۂ شاگردی میں رہی تھیں۔

Marfat.com

اب آیئے آئندہ سطور میں مولانا ابویحییٰ محمد زکریا زاہد کے دست یاب حالات کی طرف!

مولانا ممدوح نے مارچ ۱۹۶۵ء تک اپنے گاؤں (بازید پور) میں پرائمری تک تعلیم حاصل کی۔ اگلے مہینے اپریل ۱۹۶۵ء میں گورنمنٹ ہائی سکول گنڈا سنگھ والا میں چھٹی جماعت میں داخلہ لیا۔ ۱۹۶۸ء میں دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ان مدارس کی تعلیم کے دوران میں ادیب عربی اور میٹرک کے امتحانات پاس کیے۔ ۱۹۷۴ء میں جامعہ سلفیہ فیصل آباد سے ثانویہ عامہ کی اسناد حاصل کیں۔

۲۔ جنوری ۱۹۸۶ء کو انھوں نے مملکت سعودیہ کے ''مکتب الدعوۃ والارشاد'' (لاہور) میں ملازمت اختیار کی۔ ملازمت کے دوران ہی میں بی اے، وفاق المدارس اور فاضل عربی کے امتحانات دیے۔ اپریل ۱۹۸۷ء تک اسی مکتب سے وابستہ رہے۔ پھر سعودی وزارت العدلہ میں مترجم کی حیثیت سے ان کا تعین ہوا اور یہ انھی دنوں یعنی کوئی ۱۹۸۷ء (شعبان ۱۴۰۷ھ) میں مملکت سعودیہ کے شمالی صوبائی شہر عرعر جا کر کام کرنے لگے۔ عرعر ہائی کورٹ میں آٹھ سال خدمت سرانجام دینے کے بعد دسمبر ۱۹۹۴ء میں پاکستان واپس آئے۔

اب ان کا کاروانِ حیات ایک اور منزل میں داخل ہوتا ہے۔ اپریل ۱۹۹۵ء میں لاہور میں وی، آئی، پی سکول کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا۔ اس کے ساتھ ہی بعض اور ذمے داریاں سر پر آن پڑیں، جن کی وجہ سے وی، آئی، پی ہائی سکول کی طرف صرف تین سال توجہ دے سکے اور وی، آئی، پی ہائی سکول کے تعلیمی ادارے کو اپنے سٹاف کے سپرد کر کے ترجمہ وتصنیف اور دعوتی سرگرمیوں میں مشغول ہو گئے۔

سعودی عرب سے واپسی کے ۹ سال بعد ۲۰۰۳ء کے رمضان المبارک میں عمرے کے لیے گئے تو وہاں پرانے ساتھیوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور منطقہ حدودِ شمالیہ بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ اس کے بعد ۲۰۰۵ء کے ماہِ رمضان المبارک میں والدہ محترمہ کے ساتھ پھر عمرے کے لیے جانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس دوران ''قول ثابت شرح مؤطا امام مالک'' کا کام شروع کیا گیا۔ بعدازاں جنوری ۲۰۰۷ء میں سعودی عرب کے تجارتی دورے کا ویزہ لیا اور آٹھ مہینے وہاں قیام رہا۔ اسی اثنا میں ادارۃ الدعوۃ السّلفیہ دہلی کے اشراف میں موسوعۃ الحدیث الترجمہ (باللغۃ العربیہ) والے پروجیکٹ کے لیے انھیں تحقیقی کمیٹی کے رکن بنالیا گیا۔ اسی دوران آل سعود کے شہزادہ امیر سعود بن سلمان بن محمد سے تعارف ہوا اور ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ مختلف کتابوں کے ترجمے کا کام بھی جاری رہا۔

اس مدتِ قیام کے دوران مملکت سعودیہ کی وزارۃ الشؤن الاسلامیہ کے اشراف میں کام کرنے والے محافظۂ ینبع منطقۃالمدینۃ المنورہ کے المکتب التعاونی للدعوۃ والارشاد وتوعیۃ الجالیات کے مدیر، نائب مدیر اور دیگر احباب کے اصرار پر ینبع میں بہ طور داعی الی اللہ کام کرنے کی ہامی

Marfat.com

بھرلی اور رمضان المبارک ۲۰۰۸ء کو بہ طور مترجم وداعی خدمت انجام دینے کے لیے وہاں پہنچ گئے۔

چار سال محافظہ ینبع (YANBU COMISSIONERY) میں کام کرنے کے بعد ۲۰۔ستمبر ۲۰۱۲ء کو سعودی عرب سے اس حال میں واپسی ہوئی کہ اللہ کے فضل سے تفسیر السعدی، مؤطا امام مالک، جامع ترمذی، سننِ نسائی، سنن ابن ماجہ اور اس درجے کی بعض بڑی کتابوں کے ترجمہ وفوائد کی تکمیل کے ساتھ ساتھ دوسری کتابوں کی تصنیف وترجمے کا کام بھی ہوگیا۔ان کی اب تک کل کتابوں کی تعداد ۵۴ ہے، جن میں سے اکثر طبع ہوچکی ہیں۔بعض کے انگریزی ترجمے بھی چھپ چکے ہیں۔آگے ماشاء اللہ کام کا سلسلہ جاری ہے۔

اب لاہور لیڈز یونیورسٹی (LAHORE LEADS UNIVERSITY) میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے باقاعدہ داخلہ لے کر تیاری کر رہے ہیں۔

اندازہ کیجیے ایک غریب دیہاتی خاندان کا پس منظر رکھنے والے شخص کو اللہ تعالیٰ نے کتنی بڑی علمی خدمات سرانجام دینے کی توفیق بخشی۔ مجھے ان کی ۵۴ کتابوں میں سے اب تک کسی کتاب کو دیکھنے اور پڑھنے کا شرف حاصل نہیں ہوا۔

مولانا ابویحییٰ محمد زکریا زاہد لاہور کے اردو اور عربی کے نامور کمپوزر حافظ عبدالرؤف کے (جو ماشاء اللہ دار المعرفہ کے نام سے خوبصورت اور بے حد معیاری مطبوعات شائع کر رہے ہیں) بڑے بھائی ہیں۔

اب ملاحظہ فرمایئے جناب مولانا ابویحییٰ زکریا زاہد کی تصنیفی خدمات کا مختصر سا خاکہ:

۱۔ الجریمۃ والقضاء.....عربی زبان میں عدل اسلامی کے موضوع پر یہ کتاب ہے۔

۲۔ خیر القرون ......اس کا موضوع تاریخ اسلام ہے۔سات جلدوں پر مشتمل ہوگی لیکن صرف ایک جلد ہی طبع ہوئی ہے۔

۳۔ سیرت جدالانبیاء ابراہیم علیہ السلام

۴۔ تعلیم بصیرت......شرح

۵۔ مسنون وظائف واذکار

۶۔ دعوتی نصابِ تربیت

۷۔ دہشت گردی اور جہاد میں فرق

۸۔ عقیدہ، ایمان اور منہج اسلام

۹۔ حسن معاشرت سے شوہر کی اصلاح

۱۰۔ رسول اللہ ﷺ کے فتاویٰ

۱۱۔ اسلام میں تصویر کا حکم

۱۲۔ تمباکو نوشی مضر صحت

۱۳۔ سود کی اقسام

۱۴۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کے تقاضے

۱۵۔ میں نے ہدایت کیسے پائی

۱۶۔ گناہوں کی نشانیاں

Marfat.com

۱۷۔ اللہ کی پسند اور ناپسند
۱۸۔ نبی کریم ﷺ کی پسند و ناپسند
۱۹۔ قرآن میں خواتین کے واقعات
۲۰۔ دعائیں اور اذکار و نصائح
۲۱۔ علاج بذریعہ دم
۲۲۔ اصحابِ صفہ
۲۳۔ نجد و حجاز
۲۴۔ اللہ کی تلوار
۲۵۔ نجات یافتہ کون
۲۶۔ غم کا علاج
۲۷۔ شیطانی وسوسے
۲۸۔ اسلام کا پیغام حق
۳۰۔ سنن ابن ماجہ
۳۱۔ جامع الترمذی
۳۲۔ سنن النسائی
۳۳۔ مؤطا امام مالک
۳۴۔ تقلید و تفرقہ نہیں
۳۵۔ تفسیر السعدی
۳۶۔ امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے خطوط
۳۸۔ ''روزہ'' جو ایک ڈھال ہے
۳۹۔ علاج بذاتِ خود
۴۰۔ نبی مصطفیٰ ﷺ کی جامع سیرت
۴۱۔ لا الہ الا اللہ کا درخشاں معنی عقیدہ توحید
۴۲۔ تفسیر سورۃ الفاتحہ
۴۳۔ اسلام کا تعارف
۴۴۔ مسلمان مرد اور عورت کے فرائض
۴۵۔ سوالات و جوابات
۴۶۔ ایمان و عقیدہ کی تابناک روشنی
۴۷۔ قرآنی تحریف کا رد و دفاع تعلیم و اصلاح
۴۸۔ باطل فرقے
۴۹۔ نیکی اور برائی
۵۰۔ مقدمۃ الحدیث
۵۱۔ عقیدۂ اہل الاثر
۵۲۔ اسلامی قیادتِ اعلیٰ کے اوصاف
۵۳۔ بابل سے بطحاء تک

ENGLISH BOOKS

The Object of ALLAH'S Love

خوانندگانِ محترم نے مولانا ابو یحییٰ محمد زکریا زاہد کے حالات کا مطالعہ بھی کر لیا اور ان کی تصانیف و تراجم کی خدمات سے بھی آگاہی حاصل کر لی۔ اس پر مولانا کو داد دیجیے اور ان سے متعلق معلومات قلم بند کرنے والے اس فقیر کے لیے علم و عمل اور صحت و عافیت کی دعا فرمایے۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ آمین یا رب العالمین۔

(یہ سطور ۱۲۔ ستمبر ۲۰۱۴ء کو لکھی گئیں)

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا حبیب الرحمٰن خلیق

(ولادت ۱۳ نومبر ۱۹۵۵ء)

تقسیم ملک سے قبل مولانا موصوف کے آباواجداد کا مسکن ضلع امرتسر کی تحصیل ترنتارن کا گاؤں ''چوہلہ'' تھا۔ ان کے دادا کا نام مولوی نیک محمد تھا۔ وہ سید محمد شریف شاہ گھڑیالوی کے شاگرد تھے اور تقسیم ملک سے پہلے وفات پا گئے تھے۔ گاؤں کی بڑی مسجد میں وہ امامت و خطابت کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام محمد یوسف تھا اور دوسرے کا عبدالرحمٰن۔ صاحب ترجمہ مولانا حبیب الرحمٰن خلیق، محمد یوسف کے فرزند گرامی ہیں۔

عبدالرحمٰن بڑے جوشیلے اور نڈر تھے۔ ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف ہر وقت جہاد کے لیے تیار رہتے تھے اور گتکے کے کھیل میں مہارت رکھتے تھے۔ اردو میں اسے ''بنوٹ'' کہا جاتا ہے۔ اب اس کا رواج نہیں رہا۔ موجودہ دور کے جوڈو کراٹے شاید اس کی ترقی یافتہ (یا جدید) شکل ہوں گے۔ عبدالرحمٰن نے ''تنظیم الجہاد'' کا بورڈ اپنے مکان کے دوازے پر لگا رکھا تھا۔ ان کی والدہ بیٹے کو کہا کرتی تھی کہ تم ہندوؤں اور سکھوں کی اتنی مخالفت نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ وہ تمھیں قتل کر دیں۔ وہ جواب دیتے ماں جی آپ فکر نہ کریں۔ میں جب مرا، آپ کے سامنے ہی مروں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، قیام پاکستان کا اعلان ہوا تو گاؤں کے سکھوں نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ عبدالرحمٰن نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ کئی سکھوں کو قتل اور متعدد کو زخمی کیا۔ ادھر سکھوں نے مسلمانوں کو بڑی بے دردی سے قتل کیا۔ بے شمار مسلمان مسجد میں شہید کر دیے گئے۔

اب سنیے! مولانا حبیب الرحمٰن خلیق کے والد گرامی محمد یوسف کے بارے میں!

ضلع سرگودھا کی تحصیل بھاگٹاں والا کے چک نمبر ۲۶ جنوبی کے بعض لوگوں کی مولوی نیک محمد سے جان پہچان تھی۔ انھوں نے ایک مرتبہ رمضان المبارک سے قبل ان کو خط لکھا کہ نماز تراویح پڑھانے کے لیے کسی حافظ قرآن کا انتظام کر دیا جائے۔ انھوں نے جواب دیا کہ یہاں حافظ قرآن تو کوئی نہیں ہے، البتہ میرا لڑکا محمد یوسف جو کپڑے کا کاروبار کرتا ہے تمھیں نماز تراویح بھی پڑھا دے گا اور خطبہ جمعہ بھی دے دیا کرے گا۔ اگر تم کہو تو اسے بھیج دیتا ہوں۔ اس کے بعد محمد یوسف وہاں پہنچ گئے۔ جب ملک تقسیم ہوا تو وہ وہیں (چک نمبر ۲۶ جنوبی میں) تھے۔

Marfat.com

مشرقی پنجاب سے سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتل و غارت کی خبریں آنے لگیں تو انھیں نہایت تشویش ہوئی اور وہ اپنے والدین اور عزیزوں کے پاس موضع چوہلہ جانے کے لیے تیار ہوئے۔لیکن وہاں پہنچنے کی کوئی صورت نہ بنی۔ لٹے پٹے مسلمانوں کے قافلے پاکستان آنے لگے تو وہ مختلف مقامات میں اپنے عزیزوں اور رشتے داروں کو تلاش کرنے کے لیے گھر سے نکلے۔خانیوال پہنچے تو وہاں ریلوے سٹیشن پر ان سے ملاقات ہوگئی اور وہ انھیں چک نمبر ۲۶ جنوبی لے آئے اور وہاں سکونت اختیار کر لی۔مولانا حبیب الرحمٰن کی ولادت وہیں ہوئی۔

پھر حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ یہ لوگ وہاں کی سکونت ترک کر کے فیصل آباد آ گئے اور سمن آباد میں رہنے لگے جسے پہلے لیبر کالونی کہا جاتا تھا۔ان کے مکان کے قریب ہی مسجد مبارک ہے۔اس وقت وہاں خطبۂ جمعہ مولانا محمد صادق خلیل ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ان کے بعد یہ ذمہ داری مولانا عبداللہ ثار کے سپرد ہوئی، جن کے ساتھ ان کے والد محمد یوسف کے اچھے مراسم تھے۔

مولانا حبیب الرحمٰن خلیق نے سمن آباد ہی میں ۱۹۶۷ء میں پرائمری پاس کی۔اس کے بعد انھیں مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف کی جاری کردہ ''جامعہ تعلیمات اسلامیہ'' میں داخل کرا دیا گیا۔یہ تدریسی ادارہ اس وقت جناح کالونی میں کرائے کی بلڈنگ میں جاری تھا۔حکیم صاحب مرحوم بڑے باہمت عالم دین تھے۔وہ یہ ادارہ بھی چلا رہے تھے۔مقامی سیاست میں بھی سرگرم رہتے تھے۔معروف طبیب بھی تھے اور ان کی اشرف لیبارٹری بھی تھی۔ہفت روزہ ''المنبر'' اور پندرہ روزہ ''رہنمائے صحت'' (دو اخبار بھی) ان کی ادارت میں جاری تھے۔ان کا ایک طبیہ کالج بھی تھا، بیک وقت وہ کئی ادارے چلا رہے تھے اور سب ادارے بہتر طریقے سے چل رہے تھے۔اللہ نے ان کو بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔

جب حبیب الرحمٰن جامعہ تعلیمات اسلامیہ میں داخل ہوئے، اس وقت جو حضرات وہاں فرائض تدریس سرانجام دے رہے تھے، ان میں مولانا محمود احمد غضنفر مرحوم بھی شامل تھے۔مولانا مرحوم ان پر بے حد شفقت فرماتے تھے۔یہ وہاں پڑھنا نہیں چاہتے تھے اور ان کے بزرگ ہر حال میں انھیں دینی تعلیم دلانا چاہتے تھے۔مولانا محمود احمد غضنفر نے بڑی مشکل اور محبت سے ان کو سمجھایا اور اس راہ پر لگایا۔ان کے نام (حبیب الرحمٰن) کے ساتھ ''خلیق'' کا اضافہ انہی نے کیا۔

مولانا محمود احمد غضنفر کے علاوہ جامعہ تعلیمات اسلامیہ میں انھوں نے جن اساتذہ سے استفادہ کیا وہ تھے: حافظ عبدالعزیز علوی (موجودہ شیخ الحدیث جامعہ سلفیہ فیصل آباد)، مولانا بشیر احمد سیالکوٹی (اسلام آباد)، مولانا غلام محمد مرحوم (سابق شیخ الحدیث دارالعلوم کورنگی کراچی)، وہیں انھیں فارسی کے چند اسباق مولانا محمد مدنی بن

Marfat.com

حافظ عبدالغفور جہلمی مرحوم سے پڑھنے کا موقع ملا، نیز پروفیسر غلام احمد حریری مرحوم سے کچھ عرصہ پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ مولانا فاروق احمد راشدی (موجودہ شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ گوجراں والا) سے بھی اخذ فیض کیا۔

جامعہ تعلیمات اسلامیہ سے فراغت کے بعد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلہ ملا۔ وہاں سعودی، مصری اور دیگر متعدد ملکوں کے اساتذہ کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیے۔

۱۹۷۹ء میں مدینہ یونیورسٹی سے فراغت کے بعد جامعہ تعلیمات اسلامیہ ہی میں واپس آئے اور یہیں تدریس کا آغاز کیا۔ پھر جامعہ سلفیہ چلے گئے اور ۱۹۸۴ء تک وہاں تدریسی خدمات سرانجام دیں۔ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں بھی بطور اعزازی استاد دو سال پڑھاتے رہے۔ ۱۹۸۷ء میں دوبارہ جامعہ سلفیہ آ گئے۔ جامعہ میں تدریس کے ساتھ خالص عربی پروگراموں میں بھی شرکت کی۔ ایک مرتبہ ایک کانفرنس میں شیخ عبداللہ ابن سبیل امام حرم مکی اور ڈاکٹر عبداللہ الزائد کی خدمت میں عربی میں سپاس نامہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

شیخ عبدالرحمٰن السعید نے اصرار کر کے انھیں جامعہ سلفیہ سے مکتب الدعوۃ اسلام آباد میں ڈاکٹر حافظ عبدالرشید اظہر مرحوم اور مولانا خلیل الفضلی اور حافظ عبدالحمید ازہر کے پاس بھیج دیا۔ وہاں یہ دفتری کام کرتے رہے۔ ایک سال کے بعد ۲۰۰۱ء میں مکتب الدعوۃ سے کلیۃ دارالقرآن والحدیث فیصل آباد میں ان کا تبادلہ کر دیا گیا۔ اب تک وہیں تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی جامع مسجد توحید اہل حدیث خیاباں کالونی نمبر ۱ میں خطبہ جمعہ کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ تدریس و خطابت کے علاوہ مولانا موصوف کو ترجمہ و تصنیف سے بھی دلچسپی ہے، جس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ کتاب عقیدۃ اہل السنۃ والجماعۃ کا اردو ترجمہ کیا، جو جامعہ سلفیہ اور بعض مدارس کے نصاب میں شامل ہے۔

۲۔ قرآنی دعائیں اور ان کی تاثیر۔ (مطبوعہ)

۳۔ نواب صدیق حسن خاں کے فتاویٰ جات کی تسہیل و ترتیب (غیر مطبوعہ)

۴۔ شیخ عبدالعزیز المنجد کی کتاب عداوۃ الشیطان للانسان کا اردو ترجمہ۔ (مطبوعہ)

انسان زندگی میں بسا اوقات کئی قسم کی ذہنی اور مالی و جسمانی تکلیفوں سے دوچار ہوتا ہے، مولانا حبیب الرحمٰن خلیق کو بھی ۱۹۷۷ء میں ایک بہت بڑی مشکل پیش آئی۔ یہ مدینہ یونیورسٹی سے رخصت پر وطن آئے۔ واپس جانے کے لیے کراچی پہنچے۔ ایک مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے وضو کرنے لگے تو بیگ اپنے بھتیجے عتیق الرحمٰن کو دیا۔ اس بیگ میں ان کا پاسپورٹ، ویزا، جہاز کا ٹکٹ، ضروری کاغذات اور رقم سب چیزیں تھیں۔ ایک شخص آیا اور عتیق الرحمٰن سے بیگ چھین کر بھاگ گیا۔ یہ سخت پریشان کن معاملہ تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا

Marfat.com

کیا جائے۔ دوسرے دن مدینہ منورہ کے لیے جہاز پر سوار ہونا تھا۔ ایئرپورٹ پر گئے تو اپنے ساتھی طلبا سے ملاقات ہوئی جو چھٹیاں گزار کر واپس جا رہے تھے۔ ان سے واقعہ بیان کیا۔ انھوں نے دعا کی اور یونیورسٹی جا کر متعلقہ حضرات کو صورتِ حال سے مطلع کیا۔ وہاں سے نیا ویزا آیا تو یہ مدینہ یونیورسٹی پہنچے۔ پھر حالات نے ایسی کروٹ لی کہ مالی نقصان بھی پورا ہو گیا، بلکہ نقصان سے بھی اللہ تعالیٰ نے زیادہ عطا فرما دیا۔

مولانا ممدوح ۱۹۷۹ء سے خدمت تدریس انجام دے رہے ہیں۔ یہ سطور ۲۸۔ فروری ۲۰۱۳ء کو لکھی گئی ہیں۔ اس حساب سے تقریباً چونتیس برس سے ان کا سلسلہ درس و تدریس جاری ہے۔ اس طویل مدت میں ان سے بے شمار تشنگان علوم نے اپنی علمی پیاس بجھائی، جن میں مندرجہ ذیل حضرات نمایاں طور پر شامل ہیں۔

۱۔ مولانا عبدالخالق مدنی جمعیت احیاء التراث الاسلامی، کویت۔

۲۔ حافظ شہزاد بٹ مدرس کلیتہ دارالقرآن والحدیث، فیصل آباد

۳۔ مولانا عبدالرشید مدرس جامعہ تعلیمات اسلامی، فیصل آباد

۴۔ حافظ شفیق کاشف چیف ایگزیکٹو خدام الحرمین، فیصل آباد

۵۔ پروفیسر عبدالرزاق ساجد گورنمنٹ ملت کالج، فیصل آباد

۶۔ قاری نوید الحسن لکھوی مدرس جامعہ سلفیہ، فیصل آباد

۷۔ مولانا عبدالعزیز بٹ مدرس جامعہ سلفیہ، فیصل آباد

۸۔ حکیم کرامت اللہ لاہور۔ ایک ٹریول ایجنسی میں کام کرتے ہیں۔

۹۔ قاری ظہیر احمد بٹ، پروفیسر ڈی، پی، ایس، فیصل آباد

۱۰۔ مولانا زبیر احمد عقیل بن مولانا قدرت اللہ فوق۔ مدینہ یونیورسٹی کے فاضل ہیں۔ مولانا ابوالحسن سیالکوٹی کی معرکہ آراء کتاب ''الظفر المبین فی مغالطات المقلدین'' کی تحقیق اور تخریج کی ہے۔ ان دنوں لاہور میں سمن آباد موڑ پر تکبیر ٹریولز کے نام سے اپنے معاش کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں اور اُردو بازار لاہور کی محمدی مسجد میں بلا معاوضہ خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے ہیں۔ بلکہ ضرورت پڑے تو خود بھی مسجد کے مالی مسائل میں اعانت کرتے ہیں۔ خوش مزاج اور شریف النفس ہیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن خلیق کی اولاد تین بیٹے ہیں اور دو بیٹیاں۔ دونوں بڑے بیٹے قرآن کے حافظ ہیں اور ایک ٹریول ایجنسی چلا رہے ہیں۔ چھوٹا بیٹا جامعہ سلفیہ میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان سب کو کامیابی عطا فرمائے۔

(یہ تحریر ۲۸۔ فروری ۲۰۱۳ء کو لکھی گئی۔)

Marfat.com

مولانا عبدالوہاب خلجی

(ولادت ۴۔جنوری ۱۹۵۶ء)

پورا قد، گداز جسم، موٹی آنکھیں، چوڑا سینہ، کشادہ پیشانی، گول چہرہ، سرخی آمیز گندمی رنگ، سر پر قراقلی ٹوپی، نرم اندازِ کلام، شلوار قمیص میں ملبوس۔ یہ ہیں مولانا عبدالوہاب خلجی جو کئی سال پہلے رانا شفیق خاں پسروری کے ساتھ غریب خانے پر تشریف لائے۔ دہلی کی مٹھائی کا ڈبا عنایت فرمایا اور نہایت اپنایت کا اظہار کرتے ہوئے پنجابی میں گفتگو کا آغاز کیا۔ ان کے صاحب زادے عزیز القدر محمد خلجی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ باپ کی طرح قد آور اور خوب صورت جوان۔ اس وقت ان کی عمر بائیس تیئیس برس کی ہوگی۔

مولانا عبدالوہاب خلجی کا نام میں نے اس سے قبل مختلف حضرات سے کئی دفعہ سنا تھا لیکن ملاقات آج پہلی مرتبہ ہوئی۔

مولانا ممدوح ۴۔جنوری ۱۹۵۶ء کو مالیر کوٹلہ (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ملک سے قبل کے ہندوستان میں چھوٹی بڑی ساڑھے پانچ سو سے زیادہ ریاستیں تھیں، جن میں نواب اور راجے مہاراجے حکومت کرتے تھے۔ پنجاب میں آٹھ ریاستیں تھیں اور وہ تھیں پٹیالہ، نابھہ، فرید کوٹ، سنگرور، مالیر کوٹا، کپورتھلہ، کلسیہ اور نالاگڑھ۔ ہندوستان کی کسی ریاست میں سیاسی جلسے جلوس کی اجازت نہ تھی، جب کہ انگریزی علاقوں میں (جو براہِ راست انگریزی حکومت کے ماتحت تھے) سیاسی جلسوں کے انعقاد اور حکومت کے خلاف تقریریں کرنے اور جلوس نکالنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ انگریزوں کے مقابلے میں ریاستوں کے حکمران سیاسی اعتبار سے رعایا کے لیے نہایت سخت تھے۔

ریاست مالیر کوٹلہ پنجاب میں مسلمانوں کی ایک ہی ریاست تھی، تقسیم ملک کے وقت اس کے منصب حکومت پر نواب احمد علی خاں متمکن تھے۔ فروری ۱۹۴۸ء کے آخر میں ان کا انتقال ہوا تو ان کی جگہ یہ منصب ان کے بیٹے نواب افتخار علی خاں کے سپرد ہوا۔ پھر کچھ مدت کے بعد حکومت ہند نے تمام ریاستیں ختم کر دی تھیں اور ہر ریاست کا پورا علاقہ حکومت کی تحویل میں آ گیا تھا۔

تقسیم ملک کے زمانے میں سارا پنجاب خوں ریز فسادات کی زد میں تھا۔ بالخصوص مشرقی پنجاب میں سکھوں نے مسلمانوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے۔ کہا جاتا ہے کہ اب وہ ان مظالم پر نادم ہیں۔ اب ندامت کا

Marfat.com

کیا فائدہ۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زودپشیماں کا پشیماں ہونا

بعض تاریخی اسباب کی بنا پر سکھ مذاہب کے لوگ ریاست مالیر کوٹلہ کے حکمران خاندان کا بہت احترام کرتے تھے اور وہاں کے مسلمانوں کو بھی لائق تکریم گردانا جاتا تھا، چناں چہ ۱۹۴۷ء کے شدید ترین فسادات کے دنوں میں بھی جو مسلمان ریاست مالیر کوٹلہ کے ملحقہ علاقوں (جالندھر، سنگرور، پٹیالہ، لدھیانہ وغیرہ) سے بھاگ کر مالیر کوٹلہ کی حد میں داخل ہو جاتے تھے۔ انھیں کچھ نہیں کہا جاتا تھا۔ یہ ریاست ایک سو دس قصبات و دیہات پر مشتمل تھی۔ شنید ہے کہ اب وہاں ۷۰ ہزار کے لگ بھگ مسلمان آباد ہیں۔ جو کل آبادی کا ۵۷ فی صد حصہ ہیں اور امن کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

بات کا آغاز مولانا عبدالوہاب خلجی سے ہوا تھا، لیکن چوں کہ ان کا آبائی تعلق مشرقی پنجاب کی سابق مسلمان ریاست مالیر کوٹلہ سے ہے، اس لیے ذہن میں وہاں کے خواب دیدہ واقعات نے کروٹ لی اور قلم کا رخ اس طرف کو ہو گیا۔ بہرکیف مولانا ممدوح کی ولادت ۴۔جنوری ۱۹۵۶ء کو مالیر کوٹلہ کے صاحبِ علم اور صالحیت پسند گھرانے میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن میں حاصل کی۔ اس کے بعد دہلی چلے گئے، وہاں مدرسہ سبل السلام کے اساتذہ کے حضور زانوئے ادب تہ کیے۔ دہلی سے بنارس کا عزم کیا اور وہاں کی جامعہ رحمانیہ میں داخلہ لیا۔ پھر مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے اور وہاں کے مدرسہ دارالحدیث کے لائق احترام اساتذہ سے استفادہ کیا۔ بعدازاں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخل ہوئے اور وہاں کے نصاب کے مطابق تحصیل علم کی۔

خلجی صاحب نے جن اساتذہ کرام سے حصول فیض کیا، ان میں سے بعض کے اسمائے گرامی یہ ہیں: مولانا عبدالصمد رحمانی، مولانا فضل الرحمٰن، مولانا عزیز احمد ندوی، مولانا امراللہ رحمانی، شیخ محمد عمر فلاتہ، شیخ عبدالصمد الکاتب۔ ان کے علاوہ دیگر متعدد حضراتِ کرام مولانا عبدالوہاب خلجی بڑے متحرک اور فعال عالم دین ہیں اور مندرجہ ذیل کمیٹیوں کے رکن یا عہدے دار ہیں۔

۱۔ ۱۹۹۰ء میں انھیں مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے ناظم اعلیٰ منتخب کیا گیا، کئی سال وہ اس منصب پر فائز رہے۔
۲۔ صدر معہد الامام ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری مالیر کوٹلہ (مشرقی پنجاب)
۳۔ رکن مجلس انتظامیہ جامعہ سلفیہ بنارس

Marfat.com

۴۔ رکن عالمی اسلامی کونسل لندن

۵۔ رکن مجلس عاملہ اسلامی ایشین اسلامک کونسل سری لنکا

۶۔ رکن آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

۷۔ رکن کل ہند مسلم مجلس مشاورت

۹۔ نائب صدر آل انڈیا ملی پولیٹکل فورم دہلی

انھوں نے مختلف اوقات میں اپنے ملک ہندوستان کی بے شمار دعوتی اور تعلیمی کانفرنسوں میں شرکت کی اور مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے بہت سے مشترکہ سیمیناروں میں بھی شمولیت کی اور لوگوں کو اسلام کی حقانیت کا پیغام پہنچایا۔ اس کے علاوہ بیرونِ ہند میں انھیں مندرجہ ۱۷ ملکیوں میں متفرق کانفرنسوں میں شرکت کا اعزاز حاصل ہے۔

(۱) مکہ مکرمہ (۲) ریاض (۳) سری لنکا (۴) بنگلہ دیش (۵) پاکستان (۶) مصر (۷) برطانیہ (۸) انڈونیشیا (۹) ملیشیا (۱۰) ماسکو (۱۱) اردن (۱۲) جبل الطارق (۱۳) کویت (۱۴) تھائی لینڈ (۱۵) ہالینڈ (۱۶) فرانس (۱۷) جرمنی۔

متعدد اہم کتابوں کی اشاعت کا فریضہ بھی انھوں نے انجام دیا اور حدیث اکیڈمی اور الدار العلمیہ کے ذریعے سے عربی کی تقریباً سو کتابیں شائع کیں۔

وہ لاہور تشریف لائیں تو بالعموم مختلف اداروں کی طرف سے انھیں کھانے یا چائے کے لیے دعوت دی جاتی ہے۔ ایک مرتبہ جناب مجیب الرحمٰن شامی نے انھیں اپنے اخبار روزنامہ ''پاکستان'' میں دوپہر کے کھانے پر بلایا تو مجھے بھی حاضر ہونے کے لیے کہا گیا۔ وہاں ان سے ہندوستان کے حالات بالخصوص وہاں کے مسلمانوں کے متعلق گفتگو ہوئی۔

پھر مرکزی جمعیت اہل حدیث کے دفتر میں ان کے اعزاز میں چائے نوشی کا پروگرام بنا تو اس موقعے پر بھی اس فقیر کو یاد فرمایا گیا اور وہاں ان کے ارشادات سننے کا موقع ملا۔

حافظ احمد شاکر نے ان کو دفتر ''الاعتصام'' آنے کی دعوت دی تو وہاں بھی ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر سے استفادے کی سعادت حاصل ہوئی۔

بہرحال مولانا عبدالوہاب خلجی کا جب بھی لاہور میں ورود ہوا، اس فقیر کو یاد فرمایا اور غریب خانے پر ان کی تشریف آوری ہوئی۔ ان کے صاحب زادے عزیزی محمد خلجی صاحب نے بھی یہاں آمد کے موقعے پر اپنے والد گرامی کی روایت پر عمل کیا۔ اللہ انھیں خوش رکھے۔

Marfat.com

ایک مرتبہ مولانا عبدالوہاب خلجی نے مجھے کہا کہ میں چار آدمیوں کو دہلی لے جانا اور ہندوستان کی سیر کرانا چاہتا ہوں، وہ چار آدمی تھے: ایک حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری کے پڑپوتے مولانا عرفان اللہ ثنائی (سرگودھا)، دوسرے مولانا ارشاد الحق اثری (فیصل آباد)، تیسرے رانا محمد شفیق خاں پسروری اور چوتھا ان سطور کا راقم (محمد اسحاق بھٹی)۔ فرمایا: تم مجھے اپنا پاسپورٹ دو، میں اسلام آباد جا رہا ہوں، وہاں ہندوستان کے سفارت خانے میں متعلقہ اہل کار سے بات کروں گا اور ویزا بن جائے گا۔ کل شام کو واپس آؤں گا اور پاسپورٹ تمھیں واپس کر دیا جائے گا۔ میں پاسپورٹ دینے سے گھبراتا تھا کہ کہیں گم نہ ہو جائے۔ لیکن میں نے انھیں اپنا پاسپورٹ دے دیا۔ دوسرے دن وعدے کے مطابق شام کو پاسپورٹ مل گیا اور ویزے کا مسئلہ حل ہو گیا۔ مجھے کہا: میں خود اپنے خرچ پر تمھیں تمھارے پرانے مسکن کوٹ کپورے لے کر جاؤں گا اور تمھارا گھر تمھیں دکھاؤں گا۔ اپنی جنم بھومی ہر شخص کا دیکھنے کو جی چاہتا ہے، میرا بھی چاہتا تھا اور میں بہت خوش تھا کہ اپنے قدیم وطن کی وہ گلیاں دیکھیں گے جن میں بچپن سے لے کر بائیس تیئیس سال تک گھومتے رہے اور جن سے بہت سی خوش گوار و ناخوش گوار یادیں وابستہ ہیں، لیکن اس سے چند روز بعد نومبر ۲۰۰۸ء میں بمبئی کا واقعہ پیش آ گیا اور دونوں ملکوں کے حالات نازک صورت اختیار کر گئے۔

اس سے کچھ دن بعد انھوں نے دہلی سے ٹیلی فون کیا کہ تم تیار رہو، میں تمھیں دہلی ضرور بلاؤں گا اور تمھارے قدیم مسکن لے کر جاؤں گا، لیکن اب میرے پاسپورٹ کی پانچ سالہ مدت ختم ہونے کے قریب آ گئی تھی۔ تاہم وہ بار بار بذریعہ ٹیلی فون مجھے کہتے رہے کہ پاسپورٹ کی تجدید کراؤ۔ لیکن میں تجدید نہ کرا سکا اور مدت ختم ہو گئی۔ پھر نیا پاسپورٹ بنایا جو دس سال کی مدت پر مشتمل ہے۔ لیکن پھر معاملہ یہ ہوا کہ خود مولانا موصوف بیمار ہو گئے۔ ان پر فالج کا حملہ ہو گیا تھا۔ اب ماشاء اللہ کافی افاقہ ہے ٹیلی فون پر ان سے رابطہ رہتا ہے، آواز میں بیماری کی جھلک صاف سنائی دیتی ہے اور بولتے ہیں تو کمزوری کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔ گزشتہ دنوں ان کے صاحب زادے عزیزی محمد خلجی لاہور آئے تھے، ان سے کئی دفعہ ملاقات ہوئی۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مولانا ممدوح کو صحت و عافیت سے نوازے۔

بے شبہ ہندوستان کے سرکاری حلقوں میں ان کا کافی اثر ہے اور مختلف محکموں میں انھیں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، جیسا کہ گزشتہ سطور سے معلوم ہوا، وہ اپنے ملک کے کئی مذہبی اور سماجی اور سیاسی نوعیت کے اداروں کے رکن ہیں۔

(یہ سطور ۶۔ اگست ۲۰۱۴ء کو لکھی گئیں۔)

❀❀❀❀

Marfat.com

حافظ محمد شریف

(ولادت ۱۹۵۸ء)

ضلع قصور کے قصبہ راجہ جنگ کے قریب ایک گاؤں ''بھمبہ کلاں'' کے نام سے موسوم ہے۔ اس گاؤں کے سندھو جاٹ خاندان سے تعلق رکھنے والے ایک زمیندار فتح محمد کے گھر ۱۹۵۸ء میں ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام محمد شریف رکھا گیا۔ محمد شریف پانچ چھے سال کے ہوئے تو انھیں سرکاری سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ پرائمری پاس کی تو محمد شریف کے دل میں قرآن مجید حفظ کرنے کا داعیہ ابھرا۔ ان کے گاؤں سے تقریباً چار میل کے فاصلے پر ایک گاؤں ''میر محمد'' ہے، جس میں قیامِ پاکستان کے قبل سے ایک دینی مدرسہ جاری تھا۔ اس مدرسے میں حفظِ قرآن کا شعبہ بھی قائم تھا جس کے سربراہ قاری صدیق الحسن تھے اور وہ اپنے دور کے مشہور قاری تھے، بے شمار طلبا نے ان سے قراءت و تجوید کا فن سیکھا۔ مدرسے کے نگران حافظ محمد یحییٰ عزیز میر محمدی تھے جو اس نواح کے نیک خصال خانوادے کے نیک خصال فرد تھے۔

محمد شریف ایک دن گھر سے نکلے اور میر محمد جا کر حفظِ قرآن کے مدرسے میں داخل ہو گئے۔ ان کے والد فتح محمد کو اس کا پتا چلا تو گھوڑے پر سوار ہوئے اور میر محمد پہنچے۔ مدرسے میں گئے تو دیکھا کہ بیٹا بچوں کے ساتھ صف پر بیٹھا قرآن مجید حفظ کر رہا ہے۔ غصے کی حالت میں بیٹے کو آواز دی اور کہا: کیا ہمارے گھر میں دانے ختم ہو گئے ہیں کہ تم یہاں آ بیٹھے ہو؟ ہمیں مولوی بننے کی ضرورت نہیں۔ بیٹے کو گھوڑے پر بٹھایا اور گھر لے آئے۔

اب آگے کی کہانی سنیے!

سورج غروب ہوا اور رات کا اندھیرا چھانے لگا تو فتح محمد بخار کی لپیٹ میں آ گئے اور بخار نے اتنی شدت اختیار کی کہ آناً فاناً زندگی سے مایوسی تک نوبت پہنچ گئی۔ خیال گزرا کہ یہ سزا ہے جو اللہ کی طرف سے انھیں بیٹے کو قرآن حفظ کرنے سے روکنے کی وجہ سے دی گئی ہے۔ دعا کی کہ اللہ تعالیٰ بخار سے نجات فرما دے تو کل صبح بیٹے کو حفظِ قرآن کے لیے میر محمد چھوڑ آؤں گا۔ اللہ کے رنگ ملاحظہ ہوں کہ بارگاہِ الٰہی سے دعا قبول ہوئی۔ بخار اتر گیا اور وہ صبح ہوتے ہی بیٹے کو لے کر میر محمد گئے۔ حافظ محمد یحییٰ سے ملے، سارا واقعہ بیان کیا اور دعا کی درخواست کی۔ حافظ صاحب نے دعا فرمائی۔ محمد شریف نے قرآن حفظ کرنا شروع کیا اور صرف چھے مہینے میں

Marfat.com

حفظ کرلیا۔ اب انھیں حافظ محمد شریف کہا جانے لگا۔

حفظِ قرآن کے بعد محمد شریف نے اسی مدرسے میں حافظ محمد یحییٰ مرحوم ومغفور سے درس نظامی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اس وقت راجہ جنگ میں ''ضیاء السنہ'' کے نام سے ایک مدرسہ جاری تھا۔ حافظ محمد شریف نے اس مدرسے میں داخلہ لیا اور وہاں کے نصاب کے مطابق تعلیم حاصل کرنے لگے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ سکول میں پرائمری پاس کرکے گھر سے نکلنے کے بعد محمد شریف کی پہلی منزل موضع میر محمد تھی، جس کی مسافت زیادہ سے زیادہ چار میل ہوگی۔ دوسری منزل جو میر محمد گاؤں سے شروع ہوئی اور راجہ جنگ جا کر اختتام کو پہنچی، دو میل ہوگی۔ اب آیئے تیسری منزل کی طرف۔ اس منزل کا آغاز راجہ جنگ سے ہوا اور گوجراں والا جا کر ختم ہوا۔ موجودہ اعشاری نظام کی رو سے یہ منزل ممکن ہے ۹۰ یا ۱۰۰ کلومیٹر کی مسافت پر ہو۔ گوجراں والا میں ''جامعہ محمدیہ'' کے نام سے دارالعلوم قائم ہے۔ اس جامعہ میں اس وقت حضرت محدث حافظ محمد گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ کا فیضان علمی جاری تھا، حافظ محمد شریف نے وہاں ڈیرے ڈال لیے۔ حضرت حافظ صاحب سے صحیح بخاری کا درس لیا اور وہاں کے دیگر حضرات معلمین میں سے حافظ عبدالمنان نور پوری سے علم نحو کی کتاب کافیہ اور بعض دوسری کتابوں کی تکمیل کی۔ مولانا جمعہ خاں سے علوم عقلیہ کی کتابیں پڑھیں۔ مولانا عبدالحمید ہزاروی اور مولانا عبداللہ صاحب مرحوم سے بھی استفادہ کیا۔ حافظ محمد شریف کو اللہ تعالیٰ نے قوتِ حفظ سے خوب نوازا ہے۔ انھوں نے جامعہ محمدیہ میں ایک ہفتے میں علم نحو کی درسی کتاب ''ہدایۃ النحو'' حفظ کرلی تھی اور حدیث کی کتاب ''بلوغ المرام'' سترہ (۱۷) روز میں زبانی یاد کرلی۔ اسی طرح تھوڑے عرصے میں ''مختصر صحیح بخاری'' اور ''الفیہ ابن مالک'' بھی حفظ کرلی گئیں۔

جامعہ محمدیہ (گوجراں والا) سے فراغت کے بعد حافظ محمد شریف فیصل آباد گئے اور جامعہ سلفیہ میں داخلہ لیا۔ وہاں اس وقت حافظ ثناء اللہ مدنی شیخ الحدیث کی مسندِ علیا پر متمکن تھے، حافظ محمد شریف نے ان سے دوبارہ صحیح بخاری کا درس لیا۔ وہیں ڈاکٹر حافظ عبدالرشید اظہر تشریف فرماتے، ان سے مستفید ہوئے اور سند لی۔

پاکستان کے مندرجہ بالا اساتذہ کرام سے تحصیل علم کے بعد حافظ محمد شریف صاحب عازمِ مدینہ منورہ ہوئے اور وہاں کی جامعہ اسلامیہ کے کلیۃ الحدیث میں داخلہ ملا۔ وہاں کے چار سالہ نصاب کی جن لائق تکریم شیوخ سے تکمیل فرمائی ان میں ڈاکٹر شیخ ربیع بن ہادی مدخلی، شیخ عبدالفتاح العشور، شیخ عبدالموجود، شیخ عمر فلاتہ، شیخ عبدالمحسن العباد اور ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی شامل ہیں۔

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے حافظ صاحب ۱۹۸۵ء میں واپس آئے اور جامعہ ابوبکر اسلامیہ کراچی (قائم کردہ پروفیسر ظفر اللہ چودھری مرحوم) میں سلسلۂ تدریس شروع کیا۔ پانچ سال جامعہ ابوبکر میں خدمتِ

Marfat.com

تدریس سرانجام دیتے رہے۔ اس اثنا میں انھوں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے عربی کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔

بعدازاں فیصل آباد تشریف لائے اور دس سال جامعہ سلفیہ میں مصروفِ درس وتدریس رہے۔ جامعہ ابوبکر کراچی اور جامعہ سلفیہ فیصل آباد کی پندرہ سالہ تدریس کے زمانے میں ان سے بے شمار تشنگانِ علوم نے اپنی علمی پیاس بجھائی۔

اب ان کے ذہن میں اس خیال نے کروٹ لی کہ ایک ایسا ادارہ قائم ہونا چاہیے، جس میں جامعات ومدارس کے فارغ التحصیل طلبا کی تدریسی اور تبلیغی تربیت کا اہتمام کیا جائے۔ اس کے قیام کے لیے انھوں نے فیصل آباد شہر کا انتخاب کیا اور ۲۲۔ جولائی ۱۹۹۵ء کو گلستان ٹاؤن نزد اکبر چوک (فیصل آباد) میں ''مرکز التربیۃ الاسلامیہ'' کے نام سے ادارہ قائم کر کے تدریس کا آغاز کر دیا۔ اس ادارے کی مجلسِ نظامت، جسے یہ حضرات ''مجلس ادارت'' سے تعبیر کرتے ہیں، پانچ ارکان پر مشتمل ہے، جس کی تفصیل اس طرح ہے۔

۱۔ حافظ محمد شریف صاحب: رئیس مرکز التربیۃ الاسلامیہ
۲۔ محترم محمد بنیامین: نائب رئیس
۳۔ حافظ مسعود عالم: جنرل سیکرٹری
۴۔ مولانا عبدالرزاق ساجد: مدیر تعلیم
۵۔ حافظ منیر احمد اظہر: ناظم نشرواشاعت

اس ادارے میں نصاب تعلیم تین سال پر مشتمل ہے اور اس میں وہ بیس طلبا کو داخل کرتے ہیں۔ داخلے کا معیار بڑا سخت ہے۔ مثلاً طالب علم کسی جامعہ کا فارغ التحصیل ہو، عربی لغت میں مہارت رکھتا ہو، اچھے اخلاق کا مالک ہو۔ داخلہ بذریعہ ٹیسٹ ہوتا ہے۔ جو ان کے معیار پر اترے اسے فوراً داخل کر لیا جاتا ہے۔

حافظ محمد شریف صاحب کے علاوہ جو حضرات وہاں تدریسی خدمت سرانجام دیتے ہیں، ان میں مولانا ارشاد الحق اثری اور حافظ مسعود عالم صاحب بھی شامل ہیں۔

بانی ادارہ حافظ محمد شریف صاحب ماشاء اللہ بہترین مدرس، طلبا کے ہم درد، صالح فطرت، خوش اخلاق اور صاحب ورع وتقویٰ عالم ہیں۔ انھوں نے آج سے تیس برس پہلے ۱۹۸۵ء میں جامعہ ابوبکر کراچی سے تدریس کا آغاز کیا تھا، اب تک ان سے بے شمار علما وطلبا نے تحصیل علم کی، جن میں مندرجہ ذیل حضرات شامل ہیں۔

پروفیسر عبدالرزاق ساجد گورنمنٹ کالج فیصل آباد۔ حافظ منیر احمد اظہر مدرس جامعہ سلفیہ فیصل آباد، مولانا عبدالعلیم فاضل مدینہ یونیورسٹی مدرس مرکز المودہ ڈیرہ غازی خاں، مولانا عبدالماجد فاضل مدینہ یونیورسٹی،

Marfat.com

مولانا نعمان لکھوی مدرس جامعہ رحمانیہ لاہور، پروفیسر عبدالرحمٰن ناصر، مولانا عبدالستار فاضل مدینہ یونیورسٹی مدرس جامعہ محمدیہ خان پور، حافظ عطاء الرحمٰن سفارت خانہ سعودی عرب اسلام آباد، حافظ عثمان منیب ریسرچ سکالر دارالسلام لاہور۔

حافظ ریاض احمد عاقب شیخ الحدیث مرکز ابن القاسم الاسلامی ملتان۔ حافظ ریاض احمد نے مرکز التربیۃ الاسلامیہ میں حافظ محمد شریف صاحب سے جو کتابیں پڑھیں وہ ہیں: سبل السلام شرح بلوغ المرام، صحیح بخاری، الباحث الحثیث، اختصار علوم الحدیث، اصول الشاشی، المرقات فی المنطق، اربعین نووی، فتح الباری کے بعض اجزاء۔ ان کتابوں کے علاوہ حافظ ریاض احمد عاقب نے حافظ صاحب سے بلوغ المرام زبانی حفظ کی۔

حافظ محمد شریف صاحب طلبا پر نہایت شفقت فرماتے ہیں۔ ان کا پورا نام لے کر بلاتے اور آخر میں لفظ ''صاحب'' لگاتے ہیں۔ جس طرح وہ خود صادق اللہجہ، وعدے کے پابند اور عامل کتاب وسنت ہیں، یہ ہی اوصاف وہ طلبا میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

ادارے کے تین سالہ نصاب میں طالب علم بہت کچھ حاصل کر لیتا ہے۔ وہ مختلف موضوعات کی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کا ذوق خالص علمی ہو جاتا ہے۔

حافظ صاحب کی نرینہ اولاد ماشاء اللہ پانچ بیٹے ہیں اور پانچوں حافظ قرآن اور دینی ذہن کے مالک ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:

(۱) حافظ محسن (۲) حافظ مہین (۳) حافظ نعمان (۴) حافظ عثمان اور (۵) حافظ حسان۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ اس ادارے اور اس قسم کے دیگر علمی اداروں کو ہمیشہ قائم رکھے اور ان کے معلمین ومتعلمین کو قرآن وحدیث کی خدمت کے زیادہ سے زیادہ مواقع عطا فرمائے۔ ان سطور کے گناہ گار راقم کو بھی عمل کی توفیق سے نوازے۔ آمین یارب العالمین۔

(یہ سطور ۲۵۔ مارچ ۲۰۱۴ء کو لکھی گئیں۔)

❀❀❀❀

Marfat.com

مفتی عبدالحنان زاہد

(ولادت ۱۵۔دسمبر ۱۹۶۰ء)

انھوں نے ابتدائی تعلیم ضلع قصور کے قصبہ کنگن پور کے ایک نواحی گاؤں فتح محمد کلاں میں حاصل کی۔ یہ ان کا آبائی گاؤں ہے۔قرآن مجید وہاں کے امام مسجد مولانا محمد یوسف سے پڑھا۔کھڈیاں خاص ضلع قصور کے مدرسہ تعلیم القرآن میں مولانا محمد صادق سے بعض درسی کتابیں پڑھیں۔ پھر راجووال (ضلع اوکاڑہ) کے دارالحدیث میں داخلہ لیا جو مولانا محمد یوسف صاحب نے جاری کیا تھا۔ اس میں بے شمار شائقین علم نے اکتساب علم کیا اور اللہ کے فضل سے کر رہے ہیں۔یہاں سے استفادے کے بعد یہ جامعہ محمدیہ (اوکاڑہ) میں داخل ہوئے۔

۱۹۷۹ء میں وفاق المدارس السّلفیہ کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔مولانا عبداللہ امجد چھتوی سے انھوں نے اخذ فیض کیا تھا۔ ان کے فرمان کے مطابق جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں حاضری دی اور ۱۹۸۰ء میں جامعہ سلفیہ ہی سے سند فراغت لی۔

جامعہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد سانگلہ ہل گئے اور وہاں مولانا سید عبدالشکور شاہ اثری مرحوم کے جاری کردہ مدرسے میں سلسلہ تدریس کا آغاز کیا۔لیکن اس مدرسے میں تھوڑا عرصہ ہی رہے۔اس زمانے میں مولانا عبداللہ امجد چھتوی عارف والا کے قریب چک نمبر ۱۴۹۔ میں بطور شیخ الحدیث خدمت تدریس انجام دیتے تھے اور وہ مفتی صاحب کے استاد تھے۔مفتی صاحب وہاں پہنچے اور اس مدرسے میں مولانا عبداللہ امجد کے درس صحیح بخاری میں شامل ہوئے۔ساتھ ہی مولانا ممدوح کی نگرانی میں وہاں تدریس بھی کرنے لگے۔

کچھ عرصہ وہاں ان کا قیام رہا۔ پھر ۱۹۸۲ء میں جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) چلے گئے اور مولانا ثناء اللہ ہوشیارپوری کے حکم سے خطابت و تدریس میں مصروف ہوگئے۔

۱۹۸۳ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلہ ملا۔ وہاں کا نصاب مکمل کرکے ۱۹۸۸ء میں ایم اے کی سند لی۔وہاں سے واپس آکر جنوری ۱۹۹۰ء میں جامعہ سلفیہ میں بطور مدرس کام کرنے لگے۔وہاں تدریس کے علاوہ جامعہ کے دارالافتا میں بھی خدمت انجام دیتے ہیں۔دارالافتا کے سربراہ جامعہ کے شیخ الحدیث مولانا عبدالعزیز علوی ہیں۔اس اہم شعبے میں مولانا محمد یونس بٹ بھی منسلک ہیں۔

Marfat.com

مفتی عبدالحنان زاہد فیصل آباد کی ایک مسجد میں نماز فجر کے بعد درس قرآن بھی دیتے ہیں۔ ایک اور مسجد میں ان کے خطبہ جمعہ کا سلسلہ کئی سال سے جاری ہے۔ علاوہ ازیں فیصل آباد کے اردگرد کے بعض دیہات میں وعظ وتبلیغ کے لیے بھی جاتے ہیں۔

مفتی صاحب ممدوح کے والد کا اسم گرامی مولانا رحمت اللہ تھا اور وہ مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی کے شاگرد تھے۔ ان کے دادا حافظ عبدالرحمٰن تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر لکھوی علمائے کرام سے متاثر تھے اور ان سے انھوں نے بڑا فیض پایا تھا۔ بالخصوص حضرت مولانا محمد علی لکھوی مرحوم ومغفور سے ان کے بے حد نیاز مندانہ مراسم تھے۔

مفتی صاحب کے والد اور دادا اپنے گاؤں فتح محمد کلاں میں امامت وخطابت کا فریضہ انجام دیتے رہے تھے۔ اس علاقے کے مختلف دیہات میں ان کے وعظ وتبلیغ کا سلسلہ جاری رہا۔ اب مفتی صاحب بھی اس نواح میں آمدورفت رکھتے ہیں اور اپنے ددھیال ونھیال سمیت وہاں کے عام لوگوں سے بھی ان کا میل جول رہتا ہے۔

❁❁❁❁

Marfat.com

مولانا فاروق احمد قصوری

(ولادت ۸۔مئی ۱۹۶۱ء)

موجودہ ضلع قصور کے لائق تکریم علماء میں سے ایک عالم دین کا اسم گرامی مولانا فاروق احمد ہے۔ ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے: فاروق احمد بن عبداللطیف بن محمد دین بن علی محمد بن اکبرعلی بن جیون بن روڈا۔ یہ لوگ راجپوت بھٹی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ فاروق احمد کے نانا اوکاڑہ رہتے تھے اور اوکاڑہ کے قریب ایک ریلوے اسٹیشن کا نام ''کسان'' ہے، وہاں وہ نہر پر پنسال نویس تھے یعنی نہر کے پانی کے بہاؤ کو کم یا زیادہ کرنا ان کی ڈیوٹی تھی۔ فاروق احمد وہیں اپنے ننہیال میں ۸۔مئی ۱۹۶۱ء کو پیدا ہوئے۔

ان کے والد صاحب مولوی عبداللطیف ضلع قصور کے موضع قلعہ داؤ کے کی مسجد کے خطیب اور امام تھے۔ وہ اپنے علاقے کے مشہور طبیب بھی تھے۔ فاروق احمد کے دادا مولوی محمد دین بھی طبیب تھے اور اس کے ساتھ عالم دین بھی تھے۔ انھوں نے علوم دینیہ اور علم طب کی تعلیم دہلی میں حاصل کی تھی، لیکن یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ علوم دہلی میں انھوں نے کس استاذ سے پڑھے تھے۔

فاروق احمد نے پرائمری تک اپنے گاؤں قلعہ داؤ کے میں تعلیم پائی۔ پرائمری کے بعد ضلع قصور کے قصبہ منڈی عثمان والا کے گورنمنٹ ہائی سکول میں داخلہ لیا اور سکول میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ فاروق احمد کے والد خطابت وامامت اور طبابت کے ساتھ کاشت کاری بھی کرتے تھے اور خود فاروق احمد فجر سے پہلے اپنی زمین میں ہل چلاتے اور ایک ایکڑ زمین میں ہل چلا کر سکول جاتے۔ سارے گاؤں میں یہ بات مشہور تھی کہ یہ لڑکا روزانہ ہل بھی چلاتا ہے اور سکول میں تعلیم بھی حاصل کرتا ہے۔ ان کے سوا دوسرے لڑکے والدین سے کہتے تھے کہ یا کام کراؤ یا پڑھاؤ۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ گھر کے کام بھی کریں اور اس کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی حاصل کریں۔

۱۹۷۷ء میں فاروق احمد نے میٹرک کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد یہ کالج میں جانا چاہتے تھے اور گورنمنٹ کالج قصور میں داخلہ بھی لے لیا تھا، لیکن والد بیٹے کو عالم دین بنانے کے خواہاں تھے۔ چناں چہ ایک دن انھوں نے اس سلسلے میں موضع پیال کلاں کے حافظ منیر صاحب سے مشورہ کیا جو جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) کے فارغ التحصیل تھے۔ حافظ صاحب نے جامعہ سلفیہ میں داخل کرانے کا مشورہ دیا۔ اب ان کے والد اور حافظ منیر صاحب انھیں جامعہ سلفیہ لے گئے۔ اس وقت جامعہ سلفیہ کے ناظم مولانا ابوحفص عثمانی

Marfat.com

تھے جو بڑے سخت مزاج تھے۔ فرمایا: یہ بچہ بہت تاخیر سے آیا ہے اور داخلے کا سلسلہ بند ہوگیا ہے۔ اب یہ جامعہ میں داخل نہیں ہوسکتا۔ اس سے چند منٹ بعد فاروق احمد سے کہا: سر سے کپڑا اتارو۔ کپڑا اتارا تو دیکھا کہ اس کے بال منڈے ہوئے ہیں جو گھر سے روانگی سے قبل ان کے والد صاحب نے منڈوا دے تھے۔ مولانا ابوحفص عثمانی نے سر منڈا ہوا دیکھا، تو فرمایا: یہ بچہ جامعہ میں داخل ہوسکتا ہے۔ چناں چہ انھیں اسی وقت داخل کرلیا گیا...... خوانندا گانِ محترم نے غور فرمایا کہ بعض علماے کرام کے نزدیک دینی مدارس میں داخلے کا کیا معیار ہے، نہ بچے کی ذہنی صلاحیت کا اندازہ کیا، نہ یہ دیکھا کہ بچہ میٹرک پاس ہے اور جامعہ کے دیگر لڑکوں سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے، نہ اس سے کوئی علمی سوال پوچھا، نہ اس کے شوقِ تحصیلِ علم پر توجہ فرمائی۔ بس یہ خیال کیا کہ یہ میٹرک پاس کر کے ہائی سکول سے آیا ہے، اس نے ضرور انگریزی طرز کے بال رکھے ہوں گے، اس لیے حکم ہوا کہ سر سے کپڑا اتارو۔ جب دیکھا کہ سر منڈا ہوا ہے تو فوراً داخل کرلیا گیا۔ اگر سر منڈا نہ ہوتا تو داخلے کا دروازہ بند اور بچے کا مستقبل اللہ کے حوالے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ اس طرح ہم کتنے ہونہار طلبا کو ضائع کر چکے ہیں۔

جامعہ کے نصاب کے مطابق فاروق احمد کو پہلی جماعت میں داخل کیا گیا۔ اس جماعت کے لڑکے اگرچہ ان سے کافی آگے نکل گئے تھے، لیکن انھوں نے محنت کی اور چند روز میں ان کے ساتھ جا ملے۔ ان کے استاذ اس وقت مولانا محمد یاسین ظفر تھے۔ وہ ان کی تعلیم اور محنت سے بہت خوش ہوئے۔ وہ طلباء سے اکثر کہا کرتے تھے کہ یہ لڑکا تم سے بعد میں داخل ہوا ہے اور محنت کر کے تمھارے ساتھ آملا ہے۔ یہ جامعہ کا ہونہار طالب علم ہے۔

فاروق احمد دوسری جماعت میں پہنچے تو طلبا کا تقریری مقابلہ ہوا، جس کا موضوع تھا ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت داعی انقلاب''۔ اس مقابلے میں فاروق احمد بھی حصہ لینا چاہتے تھے۔ اسی موضوع پر جامعہ کے آخری سال کے ایک طالب علم عبدالحمید حمزہ کی ایک تحریر تھی جو انھوں نے فاروق احمد کو دے دی۔ فاروق احمد نے (بقول خود) یہ تحریر زبانی یاد کرلی اور طلبا کے ہفت روزہ اجلاس میں سنا دی جس کی انھیں بڑی داد ملی۔ اور انھیں اچھا مقرر سمجھا جانے لگا۔

فاروق احمد نے اپنے طالب علمی کے واقعات بیان کرتے ہوئے یہ بات بڑے فخر سے بیان کی ہے، لیکن انھوں نے اس پر غور نہیں فرمایا کہ اس تقریر کا خود ان سے کیا تعلق ہے؟ یہ ان کی تقریر تو نہ ہوئی، آخری درجے کے ایک طالب علم کی تحریر تھی جو انھوں نے اچھی طرح رٹ لی اور جوش وخروش سے طلبا کے اسبوعی اجلاس میں سنا دی۔ بہرکیف اب انھیں تقریریں کرنے کا شوق پیدا ہوگیا تھا۔ اس شوق میں ان کے تین ساتھی

Marfat.com

اور تھے۔ وہ تھے سیف اللہ خالد، ابوبکر حمزہ اور رفیع الدین قصوری۔ ان ارکانِ اربعہ نے ایک گروپ کی شکل اختیار کی اور رخصت ایام میں جامعہ کے قرب وجوار کے مختلف مقامات میں تبلیغ دین کا سلسلہ شروع کردیا اور بعض دیہات میں خطبات جمعہ بھی دینے لگے۔ ان کے خیال میں یہ کامیاب سلسلہ تھا جو کچھ عرصے تک جاری رہا۔

یہ آج سے کم وبیش تیس برس قبل کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد یہ لوگ جامعہ کی نصابی تعلیم سے فارغ ہوئے اور مختلف مقامات میں بکھر گئے۔ مولانا فاروق احمد قصوری نے اچھا کیا کہ اپنی زندگانی کی ان راہوں کی نشان دہی کردی، جن سے ان کا گزر ہوا اور اپنے بعض ساتھیوں کی سرگرمیوں کا بھی مناسب الفاظ میں تذکرہ کردیا۔ یہ حقِ دوستی بھی ہے اور واقعات کو تاریخ کے قالب میں ڈھالنے کا ایک مخصوص انداز بھی!

ایک مرتبہ جامعہ سلفیہ کے طلبا کا ایک وفد مطالعاتی دورے پر کراچی کی جامعہ ابوبکر الاسلامیہ پہنچا۔ اس وفد کے ایک رکن یہ ہی مولانا فاروق احمد قصوری تھے۔ وہاں ان کی ملاقات جامعہ کے استاذ مولانا خلیل الرحمٰن لکھوی سے ہوئی۔ وہ ان کی آمد پر بہت خوش ہوئے اور وہاں کی مختلف مساجد میں خطبات جمعہ سرانجام دینے کا فریضہ ان کے سپرد کیا گیا۔ پھر ان لوگوں نے جامعہ ابوبکر ہی میں داخلہ لے لیا اور تعلیم شروع کردی۔ اس کا علم جامعہ سلفیہ کے اساتذہ کو ہوا تو وہ سخت ناراض ہوئے اور یہ لوگ واپس جامعہ سلفیہ پہنچ گئے اور وہاں حسبِ سابق تعلیم حاصل کرنے لگے۔

بعدازاں ۱۹۸۲ء میں جامعہ سلفیہ سے اجازت لے کر فاروق احمد قصوری جامعہ ابوبکر الاسلامیہ کراچی گئے اور دو سال بعد ۱۹۸۴ء میں عربی فاضل کا امتحان دیا اور اوّل درجے میں کامیاب ہوئے۔

وفاق المدرس کے امتحان میں بھی پورے وفاق میں اول پوزیشن کے حق دار قرار پائے اور شہادۃ العالیہ کی سند حاصل کی۔ اس وقت جامعہ ابوبکر کے ناظم پروفیسر ظفر اللہ چودھری تھے۔ انھوں نے اس پر بے حد مسرت کا اظہار کیا اور سعودی عرب سمیت بہت سے تدریسی حلقوں میں یہ اعلان کیا کہ پورے وفاق کے امتحان میں ان کے جامعہ کے طالب علم فاروق احمد قصوری نے پہلی پوزیشن حاصل کی ہے۔

۱۹۸۶ء میں انھوں نے کلیۃ الحدیث کی سند لی۔ اس میں بھی یہ درجہ اوّل میں کامیاب ہوئے۔

واقعہ یہ ہے کہ فاروق احمد قصوری ذہین اور محنتی طالب علم تھے۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ابتدا ہی سے جامعہ سلفیہ کے اساتذہ ان کے تعلیمی شوق سے خوش تھے۔ انھوں نے ان کے والد صاحب کو بذریعہ خط اس پر مبارک باد بھی دی، جس سے والد صاحب کو بے حد مسرت ہوئی۔ انھوں نے چھے سال جامعہ سلفیہ میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۸۰ء میں یہیں پرائیویٹ طور پر ایف اے کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔

Marfat.com

تعلیم کے علاوہ یہ جامعہ سلفیہ کے طلبا کے مباحثوں اور مناظروں میں بھی حصہ لیتے رہے، کشتی اور کبڈی، والی بال اور فٹ بال وغیرہ کھیلوں میں بھی یہ پیش پیش رہے۔

جامعہ سلفیہ میں انھوں نے جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، ان میں حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی، حافظ ثناء اللہ مدنی، مولانا محمد اکال گڑھی، مولانا علی محمد مسلم، حافظ مسعود عالم، مولانا قدرت اللہ فوق، مولانا محمد یاسین ظفر، مولانا محمد داؤد مدنی، مولانا عبدالرحمٰن، مولانا عبدالسلام کیلانی، مولانا محمد صدیق اور مولانا محمد مالاہی شامل ہیں۔ ان میں زیادہ اساتذہ وفات پاچکے ہیں، اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور جو زندہ ہیں، ان کی عمر وصحت میں برکت عطا فرمائے اور یہ ہمیشہ خدمت دین میں مصروف رہیں۔

مولانا فاروق احمد قصوری نے جن اساتذہ کرام سے جامعہ ابوبکر کراچی میں استفادہ کیا، ان کے اسمائے گرامی کا پتا نہیں چل سکا۔

جامعہ ابوبکر میں انھوں نے تعلیم سے فراغت پائی تو وہیں انھیں مدرس مقرر کر لیا گیا۔ ۱۹۹۰ء میں انھوں نے جامعہ ابوبکر میں قیام کے دوران بی اے کا امتحان دیا اور فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئے۔ اس سے کچھ عرصہ بعد دوران تدریس میں ایم اے کا امتحان دیا، اس میں بھی فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ جامعہ ابوبکر کراچی میں بہ طور مدیر مرکز اللغۃ العربیہ ان کا تقرر ہوا تھا۔ طلبا کو جامعہ میں داخل یا خارج کرنا بھی ان ہی کا کام تھا۔

جامعہ ابوبکر کے زمانۂ تدریس میں مولانا فاروق احمد قصوری نے بڑی دینی خدمات سرانجام دیں۔ مدرسہ عائشہ صوبہ سندھ کا مشہور تدریسی ادارہ ہے، اس کی نگرانی ان کے سپرد رہی۔ مسجد الفاروق کی خطابت اور نمازِ فجر کے بعد درس قرآن جیسے اہم امور کی انجام دہی بھی ان ہی کے ذمے تھی۔ اس زمانے میں قصور، چھانگا مانگا، منڈی عثمان والا اور بعض دیگر مساجد کی تعمیر ان کی کوشش سے ہوئی۔ کراچی کی بعض مسجدوں کی تعمیر میں بھی یہ کوشاں رہے۔ اللہ تعالیٰ ہی انھیں ان امورِ خیر کی انجام دینے کا اجر عطا فرمانے والا ہے۔

دو سال یہ کراچی کی مرکزی جمعیت اہل حدیث کے منصب صدارت پر فائز رہے۔

کچھ عرصہ پیشتر ایک دوست کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ پاکستان میں جماعت اہل حدیث کی جو مختلف تنظیمیں قائم ہیں، ان میں بعض حضرات کے نزدیک اضافے کی ضرورت تھی، چناں چہ ایک نئی تنظیم عالم وجود میں لائی گئی ہے، جس کا نام ''تحریک اہل حدیث'' رکھا گیا ہے۔ مولانا فاروق احمد قصوری فرماتے ہیں: ''میں تحریک اہل حدیث کا ناظم اعلیٰ ہوں۔'' سبحان اللہ۔

یہ فقیر تصنیف وتالیف کے عمل میں مصروف رہتا ہے اور جماعت کے اکھاڑ پچھاڑ قسم کے کاروبار سے دلچسپی نہیں رکھتا اور دلچسپی رکھنے کا وقت بھی نہیں ملتا۔ تاہم مولانا فاروق احمد قصوری کو اس نئی تنظیم کے قیام اور

Marfat.com

اس کی نظامتِ علیا کی باگ ڈور سنبھالنے پر مبارک باد پیش کرتا ہے۔ مولانا نے (جیسا کہ گزشتہ سطور سے پتا چلا) بہت سے نیک کام کیے، یہ کام بھی جو تمام نیک کاموں کا سردار اور شاید ذریعہ نجات بھی ہو، کرنا ضروری تھا۔ بحمداللہ مولانا ممدوح نے کر دیا۔ اب ماشاء اللہ خیر ہی خیر ہے۔ بلکہ پنجابی محاورے کے مطابق ستّے خیراں۔

اب مولانا فاروق احمد قصوری کی شادی اور اولاد کے متعلق سنیے!

۱۹۸۹ء کے قریب ان کی شادی اوکاڑہ میں ہوئی، لیکن اس خاتون سے اولاد نہ ہوئی تو بعض حضرات نے مشورہ دیا کہ کراچی کے مولانا عبدالقہار یا مولانا قاری عبدالخالق رحمانی سے تعویذ لے لو۔ لیکن مولانا نے فرمایا: ''ہمیں تعویذ والا بچہ نہیں چاہیے۔'' پھر ۱۹۹۷ء میں ٹنڈو آدم (سندھ) کے ایک خاندان میں دوسری شادی کی تو سولہ سال میں ماشاء اللہ بارہ بچے پیدا ہوئے جن میں سے سات بیٹے ہیں اور پانچ بیٹیاں۔

اب مولانا ممدوح کا کسی صاحب کے تدریسی حلقے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انھوں نے کراچی میں اپنا مدرسہ جاری کر رکھا ہے۔ تبلیغ و خطابت کا سلسلہ بھی چل رہا ہے اور اللہ کی مہربانی سے اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

مولانا فاروق احمد قصوری نے اپنے متعلق چند واقعات خود لکھ کر بدست عزیز القدر حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی مدرس جامعہ سلفیہ فیصل آباد مجھے ارسال فرمائے ہیں جس پر میں ان کا شکر گزار ہوں۔ ان واقعات میں سے ضروری باتیں اپنے الفاظ میں لکھ کر خوانندگانِ محترم کی خدمت میں پیش کر دی گئی ہیں۔

(یہ سطور ۱۶۔ جولائی ۲۰۱۴ء کو لکھی گئیں۔)

❀❀❀❀

Marfat.com

پروفیسر ڈاکٹر سعید احمد چنیوٹی

(ولادت ۱۹۶۱ء)

بعض دوستوں سے گہرے تعلقات کے باوجود یہ یاد نہیں رہتا کہ ان سے پہلی ملاقات کب ہوئی؟ کہاں ہوئی اور کس پس منظر میں ہوئی اور یہ ملاقات دوستی کے قالب میں کیسے ڈھلی؟ پروفیسر سعید احمد چنیوٹی کے بارے میں بھی یہی صورتِ حال پیش آ رہی ہے۔ ان سے بے شمار مرتبہ جماعتی جلسوں میں ملنے اور دیر تک باتیں کرنے کا اتفاق ہوا، کتنی ہی مرتبہ ان سے فیصل آباد میں مختلف موضوعات سے متعلق گفتگو کا سلسلہ جاری رہا، ان کے مکان پر ایک دفعہ ناشتہ بھی کیا۔ ازراہِ کرم وہ بھی بارہا غریب خانے پر لاہور تشریف لائے، لیکن حافظے نے ایسا دھوکا دیا کہ اولیں ملاقات کا دور دور تک کہیں سراغ نہیں ملتا۔ کہنا چاہیے کہ دوستی یادداشت پر غالب آ گئی اور یادداشت کو پیچھے چھوڑ کر خود آگے نکل گئی۔ وہ لاہور آئیں تو مجھے یاد رکھتے ہیں اور اس گوشہ گیر سے ملاقات کے لیے غریب خانے پر تشریف لاتے ہیں۔

میانہ قد، متوازن جسم، بات چیت میں اعتدال، علما کے قدردان، مطالعہ کتب کے شائق، سادگی کا مجسمہ، صالحیت سے لگاؤ، گندم گوں، خوش مزاج۔ یہ ہیں ہمارے دوست پروفیسر سعید احمد چنیوٹی۔ پتا نہیں وہ سب سے شیریں زبان سے مخاطب ہوتے ہیں یا یہ سعادت اس فقیر کے لیے خاص ہے۔

تقسیم ملک سے قبل سعید احمد چنیوٹی کے آبا و اجداد مشرقی پنجاب کے ضلع امرتسر کی تحصیل ترنتارن میں سکونت پذیر تھے۔ شہر امرتسر بھی سکھوں کا مشہور مذہبی مقام ہے اور ترنتارن کو بھی ان کے نزدیک بہت بڑے تیرتھ کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ وہاں کے تالاب میں اشنان کرتے ہیں تاکہ اس کے جل (پانی) سے ان کے پاپ دھل جائیں اور یہ پاک صاف ہو جائیں۔

سعید احمد کے والد کا نام عبدالرحمٰن اور دادا کا نام علی محمد تھا۔ تقسیم سے قبل ان لوگوں کا پیشہ تجارت تھا، چنانچہ ان کے دادا ملائشیا رہتے تھے اور وہاں کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ تقسیم کے بعد ۱۹۴۷ء میں یہ لوگ ضلع جھنگ کے قصبہ چنیوٹ آئے تو ان کے والد (عبدالرحمٰن) نے یہاں بھی سلسلۂ تجارت شروع کیا۔ تعلیمی لحاظ سے اگرچہ ان کا مقام زیادہ اہم نہ تھا، لیکن اہل علم سے محبت، احکامِ الٰہی کی پابندی اور کتاب و سنت پر عمل پیرا ہونے کی اللہ تعالیٰ نے ان کو توفیق بخشی تھی۔ مشہور عالم مولانا عبداللہ ویروالوی سے ان کی رشتے داری

Marfat.com

تھی، اس بنا پر بھی یہ لوگ قرآن وحدیث سے قلبی رغبت رکھتے تھے۔

سعید احمد ۱۹۶۱ء میں چنیوٹ میں پیدا ہوئے۔ والدین بیٹے کو دینی تعلیم دلوانے کے متمنی تھے۔ یہ سکول کی دوسری یا تیسری جماعت میں پڑھتے تھے کہ والد انتقال کر گئے اور گھر کی مالی حالت جو پہلے ہی کمزور تھی، مزید کمزور ہو گئی، لیکن سعید احمد نے تعلیم جاری رکھی۔

مولانا عبداللہ ویرووالوی کی اہلیہ سعید احمد کی پھوپھی تھیں اور فیصل آباد رہتی تھیں۔ وہاں مولانا ممدوح کا دارالقرآن والحدیث کے نام سے مدرسہ جاری تھا۔ سعید احمد ایک مرتبہ اپنی پھوپھی سے ملنے فیصل آباد گئے تو مولانا ممدوح نے انھیں وہیں رکھ لیا اور مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے کا حکم دیا۔ کچھ عرصہ یہ ان کے گھر میں رہے۔ پھر دیگر طلبا کے ساتھ مدرسے میں رہنے لگے۔ مدرسے میں سخت پابندی تھی۔ کہیں آنا جانا ممنوع تھا۔ جمعۃ المبارک سمیت تمام نمازیں باجماعت پڑھنا بلکہ تکبیر اولیٰ میں حاضر ہونا ضروری تھا۔ مولانا خود جماعت کرواتے اور طلبا پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ بغیر کچھ کھائے پیے پڑھائی کا پہلا دور نماز فجر کے بعد شروع ہو جاتا تھا اور ساڑھے گیارہ بجے تک جاری رہتا تھا۔ اس کے بعد کھانے کا وقفہ۔ دوسرا دور نماز ظہر سے لے کر نماز عصر تک چلتا تھا اور طلبا اس کے عادی ہو گئے تھے۔

بعض پابندیاں بالکل صحیح ہوتی ہیں مثلاً ادھر اُدھر گلیوں میں گھومنا، بازاروں میں سیر سپاٹے کرنا، بے مقصد باتیں کرنا، غلط ہے۔ اس قسم کی حرکتوں پر پابندی لگانا اور اس سے طلبا کو روکنا ان کی تربیت واصلاح اور کردار سازی کے لیے نہایت ضروری ہے اور مولانا عبداللہ مرحوم اس سے روکتے تھے، لیکن مختلف جماعتوں کے جلسوں میں جانے اور مقررین کی تقریریں سننے کی اجازت تھی۔

مدرسہ دارالقرآن والحدیث کے سالانہ امتحان کے لیے ہمیشہ مولانا حافظ محمد اسحاق حسینوی تشریف لے جاتے تھے جو اس وقت دارالعلوم تقویۃ الاسلام (لاہور) کے منصب شیخ الحدیث پر فائز تھے۔ وہ جلیل المرتبت عالم، اونچے درجے کے مدرس، بہت اچھے مترجم اور مصنف تھے۔ جس طرح عربی میں مہارت رکھتے تھے، اسی طرح اردو میں ان کا قلم تیزی سے چلتا تھا، نیکی اور صالحیت سے بھی اللہ نے ان کو خوب نوازا تھا۔ نہایت سادہ مزاج اور حسنِ اخلاق کے مالک۔ حالات نے ایسی کروٹ لی کہ مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی وفات سے کئی سال بعد انھیں دارالعلوم تقویۃ الاسلام کی تدریس سے الگ کر دیا گیا۔ اللہ بھلا کرے حافظ عبدالغفار روپڑی اور حافظ عبدالوہاب روپڑی کا کہ وہ انھیں جامعہ قدس اہل حدیث لے گئے اور وہیں اس عالم عالی منزلت عالم نے ۴۔ جولائی ۲۰۰۲ء کو وفات پائی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

سعید احمد چنیوٹی کو طالب علمی کے زمانے میں علما کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان کی تقریریں سننے کا

Marfat.com

بڑا شوق تھا، چنانچہ انھوں نے شیعہ حضرات کے بعض جلسوں میں بھی شرکت کی اور ان کے متعدد مشہور مقرروں کی تقریریں سنیں۔ ایک دفعہ بعض دوستوں کے ساتھ ربوے بھی گئے۔ (جسے اب چناب نگر کہا جاتا ہے) وہاں مرزائیوں کے جلسے میں مرزا غلام احمد قادیانی کے پوتے اور مرزا محمود کے بیٹے مرزا ناصر کی تقریر سنی۔ بعض مرزائیوں سے گفتگو بھی کی۔ بریلوی حضرات کے جلسوں میں جانے کا بھی اتفاق ہوا۔

حافظ عبدالقادر روپڑی، مولانا محمد صدیق (سابق خطیب جامع مسجد اہل حدیث، امین پور بازار فیصل آباد) اور مولانا احمد الدین گکھڑوی سے بھی ان کی ملاقات رہی اور ان کی تقریروں اور مناظروں میں شرکت کے مواقع ملے۔ اور بھی بے شمار علمائے کرام سے ان کے قریبی تعلقات رہے اور ان کی گفتگو سے استفادہ کرنے کا شرف حاصل ہوا۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ حصولِ تعلیم کے لیے طلبا کو ایک یا دو مقامات پر صبر نہیں آتا، وہ مختلف مقامات میں گھومتے رہتے ہیں، لیکن سعید احمد چنیوٹی نے جم کر ایک ہی مدرسے میں تعلیم حاصل کی اور وہ مدرسہ ہے فیصل آباد کا دار القرآن والحدیث۔ ان کے زمانے میں یہ شہر ''مسلمان'' نہیں ہوا تھا ''لائل پور'' ہی تھا یعنی اسماً عیسائی ''لائل'' کا بنایا ہوا۔ سعید احمد نے ۱۹۶۸ء میں اس مدرسے میں قدم دھرا اور پھر پورے استقلال سے ۱۹۷۵ء تک یہاں رہے اور درس نظامی کی مروجہ تعلیم مکمل کی۔

اس کے فوراً بعد تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس کے لیے بھی زیادہ مدارس کے چکر نہیں لگائے۔ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۹۲ء تک کم و بیش سولہ سال درس نظامی کی تدریس کی۔ اس کا آغاز جامعہ رحمانیہ سرگودھا سے کیا۔ وہیں جامعہ علمیہ میں یہ فریضہ انجام دیا۔ ۱۹۸۹ء میں اپنے استاذِ عالی منزلت مولانا عبداللہ ویروالوی کے حکم سے مدرسہ دار القرآن والحدیث میں آ گئے، جہاں تعلیم حاصل کی تھی۔ وہاں کچھ عرصہ تدریس میں گزرا اور کچھ مدت انتظامی معاملات میں بسر ہوئی۔ اسی مدرسے میں دو سال نائب شیخ الحدیث کی ذمے داری بھی ان کے سپرد رہی۔

مولانا عبداللہ ویروالوی کی وفات کے بعد ۱۹۹۲ء کے آخر میں انھوں نے سرکاری ملازمت اختیار کی اور سکول ٹیچر کے طور پر کام کرنے لگے۔ شاید مولانا عبداللہ مرحوم نے جو ان کے استاذ بھی تھے اور سسر بھی، اپنی زندگی میں ان کو مدرسہ چھوڑ کر سرکاری سکول میں نہیں جانے دیا۔ ان کی وفات کے بعد آزادی ملی اور یہ سکول ماسٹر بن گئے۔ اس کے بعد اور قدم آگے بڑھے تو ۲۰۰۹ء میں گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ تعلیم الاسلام کالج چناب نگر (سابق ربوہ) میں لیکچرار مقرر ہو گئے اور اب بھی وہیں فریضہ تدریس انجام دے رہے ہیں۔ سکونت حکیم کلیم شہید کالونی نمبر ۲ فیصل آباد میں ہے۔ تدریس معزز ترین پیشہ ہے جو اللہ کی مہربانی سے انھوں نے

Marfat.com

اختیار کیا ہے۔اپنی قیام گاہ سے قریب کی مسجد میں خطبہ جمعہ بھی ارشاد فرماتے ہیں۔

اب آیئے ان کے درس نظامی کے اساتذہ کرام کے اسمائے گرامی کی طرف۔ان میں سے زیادہ وفات پا گئے ہیں اور بعض اللہ کی مہربانی سے زندہ ہیں۔ یہ سطور ۱۴۔۱۶ مئی ۲۰۱۳ء کو لکھی جا رہی ہیں، پہلے وفات شدگان کے اسمائے گرامی ملاحظہ ہوں۔

۱۔ مولانا عبداللہ صاحب ویرووالوی

۲۔ مولانا محمد خاں (سابق مدرس مسجد قدس امرتسر)

۳۔ مولانا محمد اسحاق خائف

۴۔ مولانا مفتی غلام اللہ رحمانی

۵۔ مولانا بشیر احمد (رحیم یار خاں)

۶۔ مولانا ثناء اللہ فہیم

۷۔ پروفیسر غلام احمد حریری (فیصل آباد)

۸۔ مولانا محمد داؤد سیف (فیصل آباد)

۹۔ مولانا محمد یعقوب (گوجرہ)

۱۰۔ مولانا ابوالسلام محمد صدیق (سرگودھا)

۱۱۔ مولانا عبدالغفار حسن (سابق استاذ مدینہ یونیورسٹی)

اب زندہ حضرات کے نام......اللہ ان کی زندگی دراز فرمائے اور یہ خدمتِ تدریس سرانجام دیتے رہیں۔

۱۲۔ مولانا حافظ عبدالعزیز علوی (شیخ الحدیث جامعہ سلفیہ فیصل آباد)

۱۳۔ مولانا محمد اکال گڑھی (فیصل آباد)

پروفیسر ڈاکٹر سعید احمد چنیوٹی کو تصنیف و تالیف اور مقالہ نگاری سے بھی بڑا شغف ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے بہت اچھی خدمات سرانجام دی ہیں، اردو میں بھی، عربی میں بھی اور عربی سے اردو ترجمے کی صورت میں بھی۔ تفصیل درجِ ذیل ہے:

۱۔ مولانا محمد عبداللہ ویرووالوی۔حیات و خدمات: مولانا ممدوح کے حالات میں یہ ان کی پُر از معلومات کتاب ہے۔

۲۔ سفر نامہ حجاز شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری: یہ سفر نامہ پروفیسر سعید احمد نے اخبار ''اہل حدیث'' (امرتسر) کے مختلف شماروں کی مدد سے ترتیب دیا ہے جو فاضل مرتب کی قابلِ قدر اور لائق ستائش

Marfat.com

کوشش ہے۔

۳۔ میلاد کی شرعی حیثیت: یہ شیخ ابن باز رحمہ اللہ کی عربی تصنیف التحذیر عن البدع کا اردو ترجمہ ہے۔

۴۔ اتحاد ملت کا نقیب فکرِ اہل حدیث ہی کیوں؟

۵۔ ماہ ربیع الاول اور جشن میلاد

۶۔ احکام الزکوۃ

۷۔ اختلافِ امت اور فرقہ واریت کا المیہ: یہ مشہور محقق و مصنف مولانا ارشاد الحق اثری کی قلمی کاوشیں ہیں جو سعید احمد چنیوٹی نے مرتب کیں۔

۸۔ مواعظ حسنہ: خطبات مولانا محمد زکریا روپڑی، ترتیب و تالیف سعید احمد چنیوٹی۔

۹۔ الاعجاز البیان لجوامع الکلم: عربی، مقالہ ایم فل۔

۱۰۔ مدنی التاثیر اللغوی فی تعیین معانی القرآن الکریم: (عربی) یہ ان کا پی، ایچ، ڈی کا مقالہ ہے۔

اب آخر میں ان کے تلامذہ کے نام جنھوں نے ان کے زمانۂ تدریس میں ان کے سامنے زانوے ادب تہہ کیے۔

۱۔ ڈاکٹر عبدالقادر عبدالکریم: الجامعۃ العالیہ الاسلامیہ اسلام آباد

۲۔ ڈاکٹر حافظ عبدالغفار عبدالکریم: ریاض (سعودی عرب)

۳۔ مولانا عبدالستار سلفی بھٹی: خطیب جامع مسجد اہل حدیث راولپنڈی

۴۔ رانا محمد شفیق پسروری

۵۔ رانا محمد خلیق پسروری

۶۔ مولانا عبدالمجید یزدانی: فاضل مدینہ یونیوسٹی۔ سرگودھا

۷۔ پروفیسر عبدالغفار: سرگودھا

۸۔ مولانا عبدالحئی انصاری: ادارہ علوم اثریہ فیصل آباد

۹۔ حافظ منیر احمد بھٹی: سرگودھا

۱۰۔ حافظ محمد نعیم صدیقی: سرگودھا

اب بہ ترتیب نمبر شماران کے مرحومین تلامذہ۔

۱۱۔ حافظ محمد ابراہیم سلفی مرحوم: ٹاؤن شپ لاہور

۱۲۔ پروفیسر عبید السلام مرحوم بن مولانا ابوالسلام محمد صدیق: سرگودھا

Marfat.com

۱۴۔ مولانا عبدالرشید راشد مرحوم: فاضل مدینہ یونیورسٹی۔ (پسرور)

ہمارے دوست پروفیسر ڈاکٹر سعید احمد چنیوٹی کو اللہ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا ہے۔ وہ معلم بھی ہیں اور تصنیف و تالیف کا بھی ذوق رکھتے ہیں۔ وہ اپنے نقطۂ نظر کا اظہار سلجھے ہوئے علمی انداز میں کرتے ہیں۔ خطابت و تقریر میں بھی ان کا ایک مقام ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں اپنے دین کی مخلصانہ خدمت کے زیادہ سے زیادہ مواقع عطا فرمائے۔

(یہ سطور ۱۴۔ مئی ۲۰۱۳ء کو تحریر کی گئیں۔)

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا محمد ادریس سلفی

(ولادت ۱۹۶۲ء)

قیام پاکستان سے قبل صاحب ترجمہ مولانا محمد ادریس کے اسلاف موجودہ ہندوستانی پنجاب کے ضلع گورداس پور کی ایک بستی ''ویمبوٹی'' میں سکونت پذیر تھے۔ جاٹوں کی ''بٹر'' برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کے گاؤں میں سکھوں کی اکثریت تھی، لیکن ان کے دادا حاجی محمد عالم سے ان کے اچھے مراسم تھے۔ تقسیم ملک کے اعلان کے بعد جب یہ لوگ اپنے گھروں سے نکلے تو سکھ انھیں سرحد تک چھوڑنے آئے اور اس قافلے کے تمام افراد خیریت سے پاکستان پہنچ گئے۔اس وقت حاجی محمد عالم کے دو بیٹے تھے اور دو بیٹیاں۔ بڑے بیٹے کا نام حاجی محمد طفیل تھا اور چھوٹے کا چودھری رحمت اللہ بٹر۔ پاکستان میں داخل ہونے کے بعد ان کے قافلے اور گاؤں کے لوگ مختلف مقامات میں چلے گئے اور حاجی محمد عالم ضلع لائل پور کے موضع چک نمبر ۵۰ ج ب سٹھیالہ پہنچے اور وہیں رہائش اختیار کی۔ وہاں جن علمائے دین سے ان کا تعارف ہوا وہ تھے مولانا عبداللہ ویرووالوی اور مولانا محمد ابراہیم۔ یہ دونوں حضرات ممتاز علما بھی تھے اور متقی و پرہیز گار بھی۔ان سے تعارف و تعلق سے اس خاندان کی زندگی بالکل بدل گئی اور یہ کتاب و سنت کی سیدھی راہ پر گامزن ہو گئے۔

حاجی محمد عالم کے دو بیٹوں میں سے حاجی محمد طفیل کاشت کاری میں مصروف ہو گئے اور چودھری رحمت اللہ تعلیم حاصل کرنے لگے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوئے اور لاہور آ گئے۔ یہاں اے جی آفس میں ملازمت اختیار کی اور اکیسویں گریڈ میں ریٹائر ہوئے۔ان کا تعلق تنظیم اسلامی سے ہے۔

حاجی محمد طفیل کچھ پڑھے لکھے نہ تھے، ان کی نرینہ اولاد چھ بیٹے تھے، لیکن انھوں نے کسی بیٹے کو کاشت کاری کی طرف نہیں آنے دیا۔ وہ انھیں تعلیم دلانے کے خواہاں تھے۔ چنانچہ ان کے تمام بیٹے شعبہ تعلیم سے وابستہ ہیں۔ بڑے بیٹے چودھری لیاقت علی چنیوٹ کے کالج آف کامرس کے پرنسپل ہیں۔

ہمارے ممدوح مولانا محمد ادریس سلفی چک نمبر ۵۰ ج ب سٹھیالہ میں ۱۹۶۲ء میں پیدا ہوئے۔ عمر کی چند منزلیں طے کیں تو گاؤں کے پرائمری سکول میں داخل کرا دیے گئے۔ پرائمری پاس کی تو مولانا محمد ابراہیم نے انھیں لائل پور میں جامعہ تعلیمات اسلامیہ میں داخل کرا دیا۔ وہاں کے اساتذہ کی جماعت میں جامعہ سلفیہ کے موجودہ شیخ الحدیث حافظ عبدالعزیز علوی بھی شامل تھے۔ ان سے ''القراءۃ الرشیدہ'' پڑھنا شروع کی۔

Marfat.com

دیگر اساتذہ کرام میں مولانا محمد بشیر سیالکوٹی، مولانا معاذ الرحمٰن خاں، مولانا فاروق احمد راشدی کے اسماے گرامی قابل ذکر ہیں۔ محمد ادریس سلفی نے ان سب سے کچھ نہ کچھ استفادہ کیا۔ اس سے چند روز بعد جامعہ تعلیمات اسلامیہ سرگودھا روڈ پر منتقل کر دیا گیا اور اساتذہ وطلباء وہاں چلے گئے۔

پھر حالات میں کچھ تبدیلی آئی اور مولانا محمد ابراہیم نے ان کو دار القران والحدیث میں داخلہ دلوا دیا۔ یہاں یہ دو سال رہے اور اس عرصے میں حافظ عبدالرحمٰن، صوفی گلزار احمد، مولانا محمد ہود، مولانا محمد داؤد بن شیخ الحدیث مولانا عبداللہ ویروالوی اور خود مولانا ویروالوی سے اخذ فیض کی سعادت حاصل کی۔ بعد ازاں جامعہ سلفیہ میں داخلہ لے لیا۔ وہاں مندرجہ ذیل اساتذہ سے مندرجہ ذیل کتابیں پڑھیں۔

مولانا محمد اکالگڑھی سے نسائی شریف، مولانا قدرت اللہ فوق سے ترمذی شریف، حافظ ثناء اللہ مدنی سے ابوداؤد شریف، حافظ مسعود عالم سے ارشاد الفحول۔ مولانا علی محمد حنیف سلفی سے عربی ادبیات کے بعض اسباق، مولانا محمد داؤد سے المحاضرات الاسلامیہ۔ مولانا محمد خالد سیف سے الفیہ، شاہ عبدالخالق سے نخبۃ الفکر۔ مولانا محمد صدیق سے موطا امام مالک، شیخ محمد اسماعیل مالدہی سے عقیدے سے متعلق کتابیں پڑھیں۔

مولانا محمد صدیق طلبا سے نہایت شفقت کا برتاؤ کرتے تھے اور انھیں اپنے بچے قرار دیتے تھے۔ باورچی کو بلا کر حکم دیتے کہ طلباء کے لیے اچھا کھانا تیار کیا جائے۔ روٹی بھی اچھی طرح پکائی جائے اور سالن بھی بہترین ہو۔ نمک، مرچ نہ زیادہ ہو نہ کم ہو۔ وہ طلبا کو پڑھاتے بھی شوق اور محبت سے تھے۔ عام گفتگو میں بھی انھیں خوش رکھتے اور انھیں مجمع عام میں تقریر کرنے کا طریقہ بھی سکھاتے۔

محمد ادریس سلفی نے ۱۹۸۱ء میں جامعہ سلفیہ کا نصاب مکمل کر کے سند فراغ لی اور گھر چلے گئے۔ اس سے تھوڑا عرصہ بعد ان کے استاذ مکرم حافظ ثناء اللہ مدنی نے تدریس کے لئے انھیں گاؤں سے بلایا اور جامعہ رحمانیہ میں مدرس مقرر کر دیا۔ پھر جلد ہی وقت نے کروٹ لی اور ۱۹۸۲ء میں جامعہ سلفیہ کی طرف سے مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا اور یہ وہاں پہنچ گئے۔ اس سلسلے میں میاں فضل حق مرحوم نے (جو اس وقت جامعہ سلفیہ کمیٹی کے صدر تھے) ان کے ساتھ بڑا تعاون کیا۔ مدینہ یونیورسٹی میں مختصر سے انٹرویو کے بعد انھیں کلیۃ الحدیث میں داخل کیا گیا۔

یہ ایک بالکل نیا ماحول اور نیا انداز تعلیم تھا۔ وہاں ان کو سعودی عرب، الجزائر، مصر اور دیگر عرب ملکوں کے فاضل اساتذہ سے کسب علم کا موقع ملا اور پتا چلا کہ مختلف موضوعات کی کتابوں کے متعلق ان کا کیا طریق تدریس اور کیا اسلوب تفہیم ہے۔ یونیورسٹی میں بعض پاکستانی اصحاب علم سے بھی انھوں نے اکتساب فیض کیا۔

یہ ۱۹۸۲ء میں مدینہ یونیورسٹی میں داخل ہوئے تھے، ۱۹۸۶ء میں وہاں سے فارغ ہوئے اور حافظ محمد

Marfat.com

اسماعیل ذبیح کے مدرسہ تدریس القرآن (راولپنڈی) میں تدریس کرنے لگے۔ ان کے جامعہ تعلیمات اسلامیہ کے پرانے استاذ مولانا حافظ عبدالعزیز علوی بھی وہیں خدمت تدریس انجام دے رہے تھے۔ ان کے علاوہ حافظ عبدالحمید ازہر، مولانا محمد مسکین اور مولانا محمد افضل بھی وہیں تھے۔ اس مدرسے میں آئے ہوئے ایک ہی سال ہوا تھا کہ مدرسے کو جامعہ سلفیہ (اسلام آباد) میں منتقل کر دیا گیا۔ اب دو سال یہ جامعہ سلفیہ (اسلام آباد) رہے۔ بعد ازاں جامعہ تعلیمات اسلامیہ (فیصل آباد) آ گئے۔ وہاں انھیں حکیم عبدالرحیم اشرف اور مولانا عبدالغفار حسن کی سرپرستی میں رہنے اور ان حضرات سے درس و تدریس کا طریقہ سیکھنے کا موقع میسر آیا۔

۱۹۹۲ء میں جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں آ گئے اور یہاں مولانا محمد یٰسین ظفر اور دیگر بہت سے اساتذہ کے ساتھ خدمت تدریس انجام دینے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اب تک یہیں ہیں اور اللہ کے فضل سے بہتر طریقے سے اپنی ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔

ان کی تدریس کا آغاز ۱۹۸۶ء میں ہوا۔ یہ سطور ۲۸۔ فروری ۲۰۱۳ء کو لکھی جا رہی ہیں۔ یہ کم و بیش ستائیس برس کا عرصہ بنتا ہے۔ اس عرصے میں ان سے بے شمار طلباء نے استفادہ کیا۔ استفادہ کرنے والوں میں سے کتنے ہی لوگ اب خود مسند درس پر متمکن ہوں گے اور طالبان علم ان سے حصول فیض کر رہے ہوں گے۔ صدقہ جاریہ کا یہ سلسلہ ان شاء اللہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا۔

مولانا محمد ادریس سلفی نے اب تک مختلف علوم و فنون کی کتابیں طلبا کو پڑھائیں۔

جامعہ سلفیہ میں تدریس کے دوران تقریباً پانچ سال حافظ محمد شریف صاحب کے ادارہ تربیۃ الاسلامیہ (فیصل آباد) میں عقیدہ، تقابل ادیان اور شذا العرف فی فن الصرف کی تدریس بھی کی۔

فیصل آباد کی جامعہ تعلیم البنات میں پانچ سال صحیح مسلم، حجۃ اللہ البالغہ اور بعض دیگر کتابیں پڑھاتے رہے۔

ایک مسجد میں خطبہ جمعہ کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ نیز درس قرآن بھی دیتے ہیں۔

مختلف موضوعات کی کتابوں کا مطالعہ بالالتزام جاری رکھتے ہیں۔ صوفیاے کرام کی کتابیں بھی پڑھتے ہیں اور ان کے واقعات زندگی سے مطلع رہنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ علماے کرام کے تذکار سے بھی انھیں دلچسپی ہے۔ امام ابن تیمیہ کی تصانیف کا بالخصوص مطالعہ جاری رکھتے ہیں۔ یہ سطور ۲۸۔ فروری ۲۰۱۳ء کو لکھی گئی ہیں۔ اب تک ان کی اولاد دو بیٹے ہیں اور دو بیٹیاں ہیں۔

❀❀❀❀

Marfat.com

حافظ محمد عبداللہ رفیق

(ولادت یکم اپریل ۱۹۶۳ء)

قیام پاکستان کے بعد لاہور میں اہل حدیث کے متعدد دینی مدارس قائم ہوئے جن میں اللہ کے فضل سے باقاعدگی سے تدریس کا سلسلہ جاری ہے اور ہر مدرسے میں اچھی خاصی تعداد میں مدرسین کرام یہ فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ ان مدارس میں ایک مدرسہ لوکو ورکشاپ مغل پورہ میں دارالعلوم المحمدیہ کے نام سے قائم ہے۔ اس میں گیارہ مدرس مختلف علوم کی کتابیں پڑھا رہے ہیں اور تقریباً اڑھائی سو کی تعداد میں طلباے علم ان حضرات سے حصول علم میں مصروف ہیں۔

دارالعلوم المحمدیہ لوکو ورکشاپ کے اساتذہ گرامی میں ایک فاضل مدرس کا اسم گرامی حافظ محمد عبداللہ رفیق ہے، جو وہاں کے منصب شیخ الحدیث پر فائز ہیں۔ ان کی جائے پیدائش اوڈاں والا (ضلع فیصل آباد) ہے اور تاریخ پیدائش ہے یکم اپریل ۱۹۶۳ء۔ سلسلۂ نسب ہے: حافظ محمد عبداللہ بن مولانا محمد رفیق بن میاں عبدالحق بن میاں رحیم بخش۔

حافظ محمد عبداللہ نے ناظرہ قرآن مجید اپنی والدہ محترمہ سے پڑھا۔ پھر پہلی جماعت سے پانچویں جماعت تک سرکاری سکول میں جن معلمین سے تعلیم حاصل کی۔ ان میں ایک معلم ماسٹر محمد انور تھے جو چک نمبر ۲۰۹ گ ب (تحصیل سمندری) کے رہنے والے تھے۔ نہایت محنت اور شفقت سے تعلیم دیتے تھے۔ اللہ کے فضل سے حیات ہیں۔

پرائمری پاس کرنے کے بعد عبداللہ نے جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن میں قرآن مجید حفظ کرنا شروع کیا۔ اس میں ان کے استاذ تھے قاری عبدالشکور برق۔ کچھ حصہ جنڈاں والا کے حافظ ثناء اللہ مرحوم سے بھی حفظ کیا۔

حفظ قرآن کے بعد ۱۹۷۳ء میں دینیات کی تعلیم کے لیے جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن میں داخلہ لیا۔ حافظ محمد صدیق سے ترجمہ قرآن پڑھنے کا آغاز ہوا۔ جامعہ کے نصاب کے مطابق مولانا رضی اللہ بڈھیمالوی سے ایک دو نصابی کتابیں پڑھیں۔ مولانا عبداللہ مشتاق سے بھی کچھ استفادہ کیا۔ مولانا محمد امین سے چند ابتدائی درسی کتابیں پڑھیں۔ مولانا رفیع الدین فردوسی سے علم نحو کی شرح "مائة عامل" اور مولانا عبداللہ کشمیری سے "شرح وقایہ" پڑھیں۔

Marfat.com

مولانا عبدالمجید فردوسی سے سورۃ الکہف سے آخر تک ترجمہ قرآن پڑھا۔ علاوہ ازیں کافیہ، مشکوٰۃ (حصہ ثانی) حماسہ، اصول فقہ کی اصول شاشی وغیرہ کتابیں ان سے پڑھیں۔

مولانا خلیل احمد سے سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، الفوز الکبیر اور اصول فقہ کی نورالانوار پڑھنے کا موقع ملا۔

اوڈاں والا میں مولانا عبدالصمد رؤف سے جو کتابیں پڑھیں وہ ہیں:

صحیح مسلم، تاریخ الادب العربی، کامل للمبرد، محیط الدائرہ اور متنبی۔

مدرسہ تقویۃ الاسلام اوڈاں والا میں حافظ عبداللہ رفیق نے مولانا محمد یعقوب ملہوی سے جن کتابوں کا درس لیا وہ یہ ہیں: تفسیر جامع البیان، جامع ترمذی، ابوداؤد، مختصر المعانی اور مطول کا کچھ حصہ۔

حضرت حافظ محمد گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی انھوں نے استفادہ کیا۔ یہ ۸۳،۱۹۸۲ء کی بات ہے۔ اس وقت حضرت حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت کم زور ہو چکے تھے اور چند طلبا جامعہ محمدیہ (جی ٹی روڈ) سے ان کے دولت خانہ پر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ان طلبا نے ان سے صحیح بخاری پڑھی اور سند لی۔ ان طلبا میں حافظ عبداللہ رفیق بھی شامل تھے۔

جامعہ محمدیہ (گوجراں والا) میں حافظ صاحب نے مولانا عبدالحمید ہزاروی سے حجۃ اللہ البالغہ پڑھی۔

جامعہ محمدیہ گوجراں والا ہی میں مولانا جمعہ خاں مرحوم سے توضیح تلویح، تصریح اور ملا جلال وغیرہ کتابوں کی تکمیل کی......اسی جامعہ میں حافظ عبدالسلام بھٹوی سے ہدایہ اخیرین اور تاریخ الادب العربی پڑھنے کا اعزاز حاصل ہوا۔

۱۹۸۳ء میں جامعہ محمدیہ (گوجراں والا) میں رمضان المبارک کی تعطیلات کے دوران فارغ التحصیل حضرات کے لیے تربیتی کورس کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس میں جن علمائے کرام کی تقریر وتدریس کے لیے خدمات حاصل کی گئی تھیں، ان میں مولانا عبداللہ امجد بھی شامل تھے۔ انھوں نے احناف اور اہل حدیث کے درمیان اختلافی مسائل مثلاً فاتحہ خلف الامام اور رفع الیدین وغیرہ سے متعلق تفصیلات بیان کی تھیں، نیز شیعہ حضرات کے بارے میں چند امور کا تذکرہ فرمایا تھا۔ اس تربیتی کورس میں حافظ عبداللہ رفیق بھی بہ طور طالب علم شامل تھے اور انھیں مولانا عبداللہ امجد کے ارشادات سے استفادے کا شرف حاصل ہوا تھا۔

حافظ عبداللہ رفیق نے گوجراں والا کی جامعہ محمدیہ میں حضرت حافظ عبدالمنان نورپوری رحمہ اللہ سے بھی استفادہ کیا، لیکن ان سے کس موضوع کی کون سی کتابیں پڑھیں، اس کا پتا نہیں چلا۔ بہر حال حافظ صاحب ممدوح نے جن مدارس میں تعلیم حاصل کی، وہ ہیں مدرسہ تقویۃ الاسلام اوڈاں والا (ضلع فیصل آباد)، جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن (ضلع فیصل آباد) اور جامعہ محمدیہ (گوجراں والا)۔

Marfat.com

۱۹۸۳ء میں انھوں نے سند فراغت لی۔ اسی سال رمضان المبارک کی چھٹیوں کے بعد قاری عبدالہادی صاحب کے ذریعے لاہور کے علاقہ باغ بان پورہ میں حاجی عبدالقیوم صاحب سے تعارف ہوا اور ان کی تدریسی خدمات دارالعلوم المحمدیہ کے لیے حاصل کرلی گئیں اور یہ لاہور تشریف لے آئے۔ اس وقت یہ دارالعلوم دھرم پورہ میں تھا۔ اس کے بعد ۱۹۹۱ء میں مین گیٹ لوکوورکشاپ سے متصل جامع مسجد اہل حدیث میں منتقل ہوگیا اور عبداللہ بھی وہیں چلے گئے۔

لاہور آکر انھوں نے تدریس کے ساتھ ساتھ ۱۹۸۴ء میں میٹرک کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔ ۱۹۸۶ء میں ایف اے پاس کیا۔ پھر بی اے اور بعدازاں ایم اے اسلامیات تک پہنچے۔

انھوں نے استفادے کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھا۔ لاہور میں قاری محمد ادریس عاصم سے علم تجوید پڑھنے کا شرف بھی حاصل ہوا۔

حافظ عبداللہ رفیق صاحب اگست ۱۹۸۳ء سے دارالعلوم المحمدیہ میں بہ طور شیخ الحدیث خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں جامع مسجد محمدی اہل حدیث میں انیس برس سے خطبہ جمعہ ارشاد فرما رہے ہیں۔ سترہ اٹھارہ سال سے مدرسہ تدریس القرآن والحدیث للبنات وسن پورہ میں بھی خدمت تدریس کا سلسلہ جاری ہے۔

حافظ عبداللہ رفیق کو اللہ تعالیٰ نے بڑی ہمت سے نوازا ہے۔ وہ بڑی مستعدی اور نہایت ذمہ داری سے تدریسی خدمات میں مشغول ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا حامی وناصر ہو۔

(یہ سطور ۱۰۔ دسمبر ۲۰۱۵ء کو لکھی گئیں)

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا محمد انس سلفی

(ولادت ۱۹۶۴ء)

زیب عنوان عالم دین مولانا محمد انس سلفی ۱۹۶۴ء کے لگ بھگ موضع اوباڑہ جنوبی میں پیدا ہوئے جو جلال پور پیروالا (ضلع ملتان) سے تقریباً پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اسی گاؤں کے مدرسے میں ناظرہ قرآن مجید پڑھا اور چند پارے حفظ کیے۔ پھر مختلف حفاظ کی خدمت میں حاضری دی۔ آخری نو پارے مدرسہ دارالحدیث محمدیہ عام خاص باغ ملتان میں قاری محمد اقبال سے حفظ کیے۔

حفظِ قرآن کے بعد شوال ۱۳۹۹ھ (ستمبر ۱۹۷۹ء) میں مدرسہ دارالحدیث محمدیہ جلال پور پیروالا میں داخلہ لیا۔ اگلے سال شعبان ۱۴۰۰ھ (جون ۱۹۸۰ء) میں مدرسے کا سالانہ تقریری امتحان مولانا حافظ محمد اسحاق حسینوی مرحوم نے لیا، جس میں محمد انس سلفی اپنی جماعت میں دوسرے نمبر پر آئے اور انھیں چار روپے انعام ملے۔ یہ محنتی طالب علم تھے اور پڑھنے کا شوق بھی تھا۔ اپنی جماعت میں ہمیشہ پہلی یا دوسری پوزیشن حاصل کی۔ مدرسے کے نصاب کے مطابق آخری سال کے امتحان میں اول پوزیشن حاصل کی اور مختلف موضوع کی کتابوں کی صورت میں انعام ملا۔ یہ کتابیں ان کے پاس محفوظ ہیں۔ دارالحدیث محمدیہ میں انھوں نے جن اساتذہ کرام سے استفادہ کیا، ان میں مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

۱۔ مولانا سلطان محمود صاحب:......ان سے صحیح بخاری، جامع ترمذی اور شرح جامی پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ فراغت کے بعد دورانِ تدریس میں ان سے شرح نخبۃ الفکر کے اکثر حصے پڑھے۔

۲۔ مولانا محمد رفیق اثری:......ان سے موطا امام مالک، سنن ابی داؤد اور مختلف فنون کی بعض کتابیں پڑھیں۔

۳۔ مولانا اللہ یار:......ان سے بلوغ المرام، صحیح مسلم، کافیہ اور بعض دیگر نصابی کتابیں پڑھیں۔ ایک دن جب یہ کافیہ پڑھ رہے تھے تو مولانا سلطان محمود صاحب تشریف لائے اور ان کے رفقائے سبق سے ''راشد الھدیا'' کی ترکیب پوچھی۔ وہ نہ بتا سکے تو محمد انس سلفی سے پوچھی۔ انھوں نے بتا دی تو مولانا نے دس روپے عنایت فرمائے۔ ایک روپیہ مولانا اللہ یار صاحب نے دیا۔

۴۔ مولانا حافظ ابوعبدالستار عبدالحق محمدی:......ان سے مشکوٰۃ شریف جلد اول اور نسائی شریف کا درس لیا۔

۵۔ مولانا عبداللہ جاوید مظفر گڑھی:......ان سے مشکوٰۃ شریف جلد ثانی اور سنن ابن ماجہ پڑھنے کی

Marfat.com

سعادت حاصل کی۔

مولانا سلطان محمود مرحوم مغفور اور مولانا محمد رفیق اثری سے انھوں نے تمام کتب حدیث کی اجازۃ الروایہ لی۔ ان کے علاوہ مولانا فیض الرحمٰن ثوری، مولانا محمد حیات لاشاری، حافظ مفتی ثناء اللہ مدنی اور مولانا مفتی عبیداللہ خاں عفیف کی طرف سے بھی انھیں اجازۃ الروایہ مرحمت کی گئی۔

مولانا محمد انس سلفی نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے استاذ مکرم مولانا سلطان محمود رحمہ اللہ کے حکم سے ۱۹۸۷ء میں مدرسہ دارالحدیث محمدیہ جلال پور پیروالا میں تدریس کا آغاز کیا اور اب تک جب کہ ۲۴۔ اگست ۲۰۱۵ء کو یہ سطور لکھی جا رہی ہیں، اسی دارالحدیث میں مختلف علوم کی کتابیں پڑھا رہے ہیں۔ ان علوم میں ترجمہ قرآن مجید، سنن ابی داود، سنن نسائی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ المصابیح، بلوغ المرام، الفوز الکبیر، حجۃ اللہ البالغہ، بدایۃ المجتہد، الفیۃ الحدیث، شرح نخبۃ الفکر، تفسیر جلالین، شرح ابن عقیل، شرح وقایہ، تلخیص المفتاح، اصول الشاشی، ایساغوجی، دیوان حماسہ، بدالیہ، قدوری، کافیہ، ہدایۃ النحو، شرح مائۃ عامل، مقامات حریری، علم الصیغہ، عقیدہ واسطیہ، گلستان سعدی، کریما، پندنامہ اور روضۃ الادب قابل ذکر ہیں۔

خوانندگانِ محترم نے ملاحظہ فرمایا درسی کتابوں کی اس فہرست میں قرآن مجید، تفاسیر، حدیث، فقہ، اصول حدیث، اصول فقہ، عربی ادبیات (نظم ونثر)، علم نحو، علم صرف، منطق، عقائد اور فارسی کی کتنی ہی کتابیں آگئی ہیں۔ اندازہ فرمایئے عربی مدارس کا ایک استاذ بہ یک وقت متعدد فنون کی کتابیں پڑھاتا ہے اور نہایت محنت اور شوق سے یہ خدمت سرانجام دیتا ہے۔ اس ہمہ وقتی خدمت کا جو کچھ انھیں ملتا ہے، اس کا ذکر نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ عالی مقام اساتذہ اور مدارس کے ارکانِ انتظامیہ کے احترام کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے متعلق خاموشی اختیار کی جائے۔

تدریس کے ساتھ ساتھ مولانا محمد انس سلفی نے قلم وقرطاس سے بھی رابطہ رکھا۔ ان کا زیادہ تر کام علم حدیث کے متعلق ہے اور عربی زبان میں ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ منتہ المتعال العالی فی معرفۃ الاسانید النوازل والعوالی: یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور اس میں موطا امام مالک اور صحاح ستہ کی وہ احادیث جمع کی گئی ہیں جو عالی اور نازل سند سے مروی ہیں۔ کتاب کے آغاز میں مولانا حافظ عبدالمنان نور پوری، مولانا محمد رفیق اثری، مولانا عمر فاروق سعیدی کی تقاریظ اور پروفیسر سعید مجتبیٰ سعیدی کا مقدمہ ہے۔ یہ کتاب اشاعت کے لیے مکتبہ سلفیہ لاہور کو دی گئی ہے۔

۲۔ فرحۃ السالک فی رباعیات الامام مالک: یہ بھی عربی میں ہے اور اس میں موطا امام مالک کی

Marfat.com

مرفوع متصل رباعی سند سے مروی احادیث جمع کی گئی ہیں۔

۳۔ منحة السلام فی حل بلوغ المرام : یہ کتاب بھی عربی میں ہے۔اس میں بلوغ المرام کے تین ابواب تک مرتبۃ الحدیث، سبب ورودالحدیث اور اعراب حدیث وغیرہ کے متعلق بحث کی گئی ہے۔علماو طلبا کے لیے یہ بڑی مفید بحث ہے۔

۴۔ منحة المعبود فی التعلیق علیٰ سنن ابی داؤد : مولانا محمد انس سلفی نے صحاح کی مشہور کتاب سنن ابی داؤد پر عربی میں تعلیقات کا سلسلہ شروع کیا ہے جو تدریس کے ساتھ ساتھ خاص رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے۔

۵۔ نصرة الهادی فی تحقیق احادیث ذم الملاهی : یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے جس میں موسیقی کے متعلق نو (۹) احادیث کی صحت اور ضعف کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

جلال پور پیروالا کی ایک مسجد میں مولانا ممدوح خطبہ جمعہ بھی ارشاد فرماتے ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا کی زندگی دراز فرمائے، وہ درس وتدریس، تصنیف و تالیف اور وعظ وخطابت کے ذریعے سے کتاب وسنت کی جو خدمات سرانجام دے رہے ہیں، وہ بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہوں اور لوگ ان سے استفادہ کریں۔

(یہ سطور ۲۴۔اگست ۲۰۱۵ء کو لکھی گئیں)

Marfat.com

مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری

(ولادت ۱۷۔ مارچ ۱۹۶۷ء)

فروری ۲۰۰۰ء میں حج بیت اللہ کے موقع پر مدینہ منورہ میں مدینہ یونیورسٹی کے جن بہت سے طلبا سے ملاقات ہوئی، ان میں ایک طالب علم فیصل آباد کے طاہر محمود تھے جو اس وقت کسی موضوع پر یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔ ایک روز انھوں نے مجھے یونیورسٹی کے پاکستانی اور ہندوستانی طلبا سے خطاب کرنے کی دعوت دی۔ موضوع تھا ان عظیم القدر علمائے کرام کا تذکرہ جن کی خدمت میں کچھ عرصہ گزارنے کی مجھے سعادت حاصل ہوئی۔ طلبا کا یہ اچھا خاصا اجتماع تھا، جن سے مل کر بے حد مسرت ہوئی اور مجھے شبہ پڑتا ہے کہ متعلقہ موضوع پر میری گزارشات سن کر انھوں نے بھی کسی قدر خوشی کا اظہار کیا تھا، جس کی وجہ سے میرے ذہن میں کچھ توانائی کے اثرات نمودار ہوئے تھے، اور ان اثرات کا نشہ کافی مدت تک میرے دماغ میں انگڑائیاں لیتا رہا تھا۔ چودہ سال کے بعد اب بھی مجھے اس نشے کا احساس ہو رہا ہے۔ اس طویل عرصے میں کئی "ترش" واقعات پیش آئے، لیکن کوئی ترشی اس نشے کو ذہن کی سطح سے اتار نہ سکی اور مدینے کی فضاؤں میں چڑھے ہوئے نشے کو کوئی اتار بھی نہیں سکتا۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے:

یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

میرے عزیز دوست طاہر محمود جن کی تحریک سے میں مدینہ یونیورسٹی گیا تھا، وہ ماشاء اللہ اب پروفیسر ڈاکٹر طاہر محمود ہیں اور اسلام آباد میں اقامت فرما ہیں۔ وہاں کی جامعہ سلفیہ سے ان کا گہرا تعلق ہے۔ ان کی دعوت پر میں وہاں بھی جا چکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ انھیں خوش رکھے۔

یہاں عرض یہ کرنا مقصود ہے کہ مدینہ یونیورسٹی کے طلبا کے علاوہ آج سے چودہ سال پیشتر (فروری ۲۰۰۰ء میں) دو اور حضرات سے بھی وہاں ملاقات ہوئی تھی جو برطانیہ کے شہر برمنگھم سے تشریف لائے تھے، ان میں سے ایک کا نام شعیب احمد تھا جو آزاد کشمیر میرپور کے رہنے والے ہیں اور انھیں مولانا شعیب احمد میرپوری کہا جاتا ہے۔ اکھرے بدن اور نکھرے ہوئے گندمی رنگ کے یہ صاحب نہایت تپاک سے ملے۔

دوسرے یہی زیب عنوان مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری تھے، جن کے متعلق ان سطور میں چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یاد پڑتا ہے وہ طویل قامت جوان تھے اور ان کے چہرے کی رنگت قدرے مائل بہ

Marfat.com

''سانولیت'' تھی۔ ان دونوں حضرات سے یہ پہلی (اور اب تک آخری) ملاقات ہے۔ اس کے بعد میں نے ایک یا دو مرتبہ دونوں کو ماہنامہ ''صراط مستقیم'' برمنگھم کے پتے پر خطوط لکھے۔ ایک مرتبہ مولانا ثناء اللہ سیالکوٹی کو بھی اسی پتے پر خط لکھا، لیکن کسی صاحب کی طرف سے جواب نہیں آیا۔ میں اس قسم کے معاملات میں معذرتی پہلو تلاش کرنے کا عادی ہوں، اس لیے ان کی طرف سے جواب نہ آنے پر یہ معذرتی پہلو ذہن میں آیا کہ انھیں میرے خطوط ملے نہیں ہوں گے، ممکن ہے مجھ سے ان کا پتا لکھنے میں کوئی غلطی ہوئی ہو اور انھیں خط نہ پہنچے ہوں۔

اس تمہید کے بعد آیے مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری کے قدرے تفصیلی حالات کی طرف۔!

ان کا مختصر سلسلۂ نسب یہ ہے: شیر خاں جمیل احمد بن شیر خاں محمد اسحاق بن شیر خاں احمد حسین بن شیر خاں عبدالرحمٰن۔ قارئین کرام نے ملاحظہ فرمایا، ان کے سلسلۂ نسب کے ہر شخص کے تسمیہ سے پہلے شیر خاں کا لاحقہ آتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا صحیح طور سے علم خود جمیل احمد صاحب کو بھی نہیں ہے۔ انھیں صرف اتنا پتا ہے کہ یہ سلسلہ مدت سے اسی طرح چلا آرہا ہے اور ہم اپنے نام اسی طرح لکھتے ہیں۔ ممکن ہے کسی حکمران نے ان کے کسی بڑے کو کسی خصوصیت کی بنا پر یہ لقب دیا ہو، جو اب تک ان کے ساتھ وابستہ ہے۔

جمیل احمد بمقام ادھونی ضلع کرنول، صوبہ آندھرا پردیش (جنوبی ہند) میں ۱۷۔ مارچ ۱۹۶۷ء کو ایک کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ادھونی ایک قدیم تاریخی شہر ہے جو حیدرآباد (دکن) سے تین سو کلومیٹر، مدراس سے تقریباً پانچ سو کلومیٹر اور بنگلور سے دو سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ ابتدا سے لے کر میٹرک تک کی تعلیم انھوں نے اپنے آبائی شہر ادھونی میں حاصل کی۔

میٹرک کے بعد دینیات کی تعلیم دلانے کے لیے ۱۹۸۱ء میں ان کے نانا مولانا پروفیسر عبدالعزیز جامی عمری اور والد مکرم جناب شیر خاں محمد اسحاق نے ان کو جامعہ دارالسلام عمرآباد میں داخل کرادیا۔ وہاں انھوں نے جامعہ کے نصاب کے مطابق عالمیت اور فضیلت کی تعلیم مکمل کر کے ۱۹۸۸ء میں فراغت پائی۔ وہیں دوران تعلیم میں مدراس یونیورسٹی سے ''افضل العلماء'' (بی اے) کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔

جامعہ دارالسلام عمرآباد ضلع آرکاٹ (مدراس) میں انھوں نے جن لائق تکریم اساتذہ کے حضور زانوئے شاگردی تہ کیے، ان میں سے چند مشہور اساتذہ کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

۱۔ مولانا حافظ عبدالواجد عمری رحمانی

۲۔ مولانا عبدالسبحان اعظمی عمری

Marfat.com

۳۔ مولانا ظہیر الدین اثری رحمانی

۴۔ مولانا حافظ ابوسعید عبدالکبیر عمری

۵۔ مولانا ابوالبیان عبدالرحمٰن حماد عمری

جامعہ دارالسلام عمر آباد سے فراغت کے بعد وہ مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے، لیکن فوری طور پر عملی زندگی کا آغاز کردیا گیا۔ وہ اس طرح کہ جمعیت اہل حدیث صوبہ آندھراپردیش کی دعوتی وتبلیغی سرگرمیوں میں مصروف ہوگئے۔ نیز اپنے آبائی شہر ادھونی کی جامع مسجد اہل حدیث میں خطباتِ جمعہ کا سلسلہ شروع کردیا۔ اس مسجد کی زمام تولیت واہتمام ڈیڑھ سوسال سے بھی زیادہ مدت سے شیرخاں خاندان کے ہاتھ میں ہے اور مسجد خاصے رقبے میں پھیلی ہوئی ہے، اس کے ساتھ ہی مولانا جمیل احمد نے مسجد میں مدرسہ محمدیہ کے نام سے مدرسہ جاری کرکے اس میں تدریس کا آغاز بھی کردیا تھا۔ گھر کی مالی حالت بہت اچھی تھی، اس لیے دعوت وتبلیغ اور خطابت وتدریس کا کام بلا معاوضہ فی سبیل اللہ کیا جارہا تھا۔

اسی اثنا میں انھیں مرکزی جمعیت اہل حدیث برطانیہ کی طرف سے دعوت آگئی کہ یہاں آکر دعوتی کام کریں۔ چناں چہ یہ نومبر ۱۹۸۸ء میں برطانیہ چلے گئے۔ یہ دعوت نامہ مولانا محمود احمد میرپوری اور مولانا محمد عبدالہادی عمری کی وساطت سے بھیجا گیا تھا۔ مولانا محمود احمد میرپوری تو ان کے برطانیہ جانے سے پہلے ہی ۹ اور ۱۰۔ اکتوبر ۱۹۸۸ء کی درمیانی شب کو ٹرک کے ایک حادثے میں وفات پاگئے تھے لیکن دوسرے حضرات وہاں موجود تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی اور طے کردہ منصوبے کے تحت یہ تبلیغی سلسلے میں مشغول ہوگئے۔ ان کے ویزے کی مدت چھے ماہ کی تھی۔ چھے ماہ کے بعد مئی ۱۹۸۹ء میں یہ واپس ہندوستان چلے گئے۔ برطانیہ کی جمعیت اہل حدیث تبلیغی خدمات کے لیے انھیں مستقل طور پر وہاں رکھنا چاہتی تھی، اس لیے انھوں نے ہندوستان آکر دوبارہ ویزہ حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن اس دوران میں ان کو مدینہ یونیورسٹی میں داخلے کی اطلاع مل گئی اور یہ کچھ عرصہ کے بعد مدینہ یونیورسٹی پہنچ گئے۔ وہاں داخلے کا انٹرویو ہوا تو انھیں کلیۃ الحدیث میں داخلہ ملا۔

کلیۃ الحدیث کے پہلے سالانہ امتحانات میں یہ بہت اچھے نمبروں میں کامیاب ہوئے اور حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل کی۔ بعدازاں سالانہ تعطیلات کے موقعے پر وطن آئے تو بعض گھریلو کاموں میں ایسے الجھے کہ دوبارہ وہاں نہ جاسکے اور مدینہ یونیورسٹی کی تعلیم مکمل نہ ہوسکی۔ وہاں انھوں نے مندرجہ ذیل اساتذہ کرام سے اخذِ علم کیا۔

۱۔ شیخ عبداللہ بن محمد الغنیمان

Marfat.com

۲۔ ڈاکٹر موسیٰ بن سلیمان الدویش

۳۔ ڈاکٹر محمد بن مطر الزہرانی

۴۔ شیخ عبدالحکیم بن عبدالسلام خاطر

۵۔ ڈاکٹر عبدالعزیز محمد القائدی

۶۔ ڈاکٹر سلیمان بن علی السعود

۷۔ ڈاکٹر احمد بن محمد العبید

۸۔ ڈاکٹر خالد محمد علیان الصاعدی

۹۔ ڈاکٹر ابراہیم بن عامر السہیلی

۱۰۔ ڈاکٹر ابوانس فرج بن فریح العوفی

۱۱۔ ڈاکٹر حافظ احمد الحکمی

تعطیلات کے دنوں میں وطن آنے کے چند ماہ بعد ۱۳۔جنوری ۱۹۹۱ء کو بمبئی میں ان کی حضرت مولانا مختار احمد ندوی مرحوم کی (بقول ان کے) ''عالمہ فاضلہ صاحب زادی عائشہ مختار سے شادی ہوگئی۔''

مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری نظم ونسق کے فن سے بھی خوب آگاہ ہیں۔اس سلسلے کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

مولانا مختار احمد ندوی نے ۱۹۷۸ء میں بمبئی سے ساڑھے تین سو کلومیٹر کے فاصلے پر صوبہ مہاراشٹر کے شہر مالیگاؤں میں جامعہ محمدیہ اور لڑکیوں کے کالج کلیہ عائشہ منصورہ کی بنیاد رکھی۔یہ جامعہ تقریباً ساٹھ ایکڑ زمین میں پھیلی ہوئی ہے اور ہندوستان میں اہل حدیث کی اس دینی درس گاہ کو تعلیمی اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ایک مرتبہ کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ جامعہ کے طلبا نے ہڑتال کردی اور اس کے تدریسی سلسلے میں جواب تک صحیح طور پر چل رہا تھا، بدنظمی سی پیدا ہوگئی۔ یہ مولانا جمیل احمد کی شادی سے چھ ماہ بعد کی بات ہے۔اب مولانا مختار احمد ندوی نے اپنے اس داماد مولانا شیر خاں جمیل احمد کو وہاں بلایا اور انھیں جامعہ محمدیہ منصورہ (مالیگاؤں) کا معاون ناظم اعلیٰ اور شیخ الجامعہ مقرر کردیا۔ستمبر ۱۹۹۱ء سے نومبر ۱۹۹۴ء تک وہ یہ خدمت انجام دیتے رہے اور اللہ کے فضل سے تمام معاملات ٹھیک ہوگئے اور انتظامی گاڑی صحیح رخ پر چل پڑی۔

جامعہ محمدیہ منصورہ (مالیگاؤں) ایک کامیاب جامعہ ہے اور اس کا اسلوبِ تعلیم اتنا عمدہ اور قابلِ رشک ہے کہ اس کے متعلق ڈاکٹر افضل علی (استاذ جامعہ محمدیہ) نے ''فردوس برروئے زمیں'' کے عنوان سے مضمون لکھا، جس میں جامعہ کے اساتذہ کا خوب صورت الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری نے وہاں جو انتظامی اور تدریسی خدمات انجام دیں، ان کا خصوصیت سے تذکرہ فرمایا گیا ہے۔یہ مضمون باریک قلم

Marfat.com

کے چھے فل سلیپ صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔

ان ہی کے دورِ نظامت میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی طرف سے ہندوستان کے تمام مدارس اسلامیہ کے فارغین کے لیے ایک مہینے پر مشتمل ''دو رہ تدریب العلمی اللغہ العربیۃ و الثقافتہ الاسلامیہ'' کا انعقاد عمل میں آیا۔ ملک کے ڈیڑھ سو فارغین نے اس دورے میں شرکت کی۔ اختتامی اجلاس میں شرکائے دورہ کو سندیں دی گئیں اور چالیس طلبا کو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلے کے لیے منتخب کیا گیا۔ دورے کا انتظام جامعہ محمدیہ منصورہ مالیگاؤں میں کیا گیا تھا۔ لہٰذا اس کے حسنِ انتظام کے اعتراف میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی طرف سے مدیرِ دورہ ڈاکٹر محمد بن ربیع مدخلی نے جامعہ محمدیہ منصورہ کو شیلڈ اور سند عطا کی۔

مولانا جمیل احمد عمری جنوری ۱۹۹۵ء سے مئی ۱۹۹۶ء تک جامعہ محمدیہ ایجوکیشن سوسائٹی بمبئی کے تحت بنگورہ مدراس اور ادھونی میں دعوتی، تعلیمی اور تنظیمی خدمات انجام دیتے رہے۔

۸۔ جون ۱۹۹۶ء کو وہ اپنے اہل وعیال سمیت برطانیہ چلے گئے اور اب تک وہیں ہیں۔ برطانیہ میں انھوں نے جو خدمات سرانجام دیں وہ حسب ذیل ہیں:

☆......امامت وخطابت مرکزی جامع مسجد اہل حدیث گرین لین، سیال ہتھ، برمنگھم ۱۹۹۶ء سے ۲۰۰۹ء تک۔

☆......درس وتدریس مرکزی مدرسہ سلفیہ گرین لین اور برمنگھم ۱۹۹۶ء سے ۲۰۰۸ء تک

☆......نائب ناظم مرکزی جمعیت اہل حدیث برطانیہ اپریل ۱۹۹۷ء سے مئی ۱۹۹۸ء تک مولانا شعیب احمد میرپوری کے مختلف مقامات کے دوروں کی وجہ سے ان کی عدم موجودگی میں قائم مقام ناظم اعلیٰ کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔

☆......صدر مدرس مرکزی مدرسہ سلفیہ برمنگھم مارچ ۲۰۰۵ء سے دسمبر ۲۰۰۸ء تک۔

☆......ناظم تعلیمات مرکزی جمعیت اہل حدیث برطانیہ ۲۰۰۱ء سے ۲۰۰۴ء تک۔ دوبارہ یہ ہی منصب ۲۰۰۷ء سے ۲۰۱۲ء تک۔

☆......رکن مجلس القضاء الاسلامی برطانیہ (شریعہ کونسل) ۱۹۹۶ء سے مئی ۲۰۱۴ء تک جب یہ سطور لکھی جارہی ہیں وہ اس منصب پر فائز ہیں۔

☆......رکن مجلس ادارت ماہنامہ ''صراط مستقیم'' (برمنگھم) ۲۰۰۷ء سے تاحال (مئی ۲۰۱۴ء)

ان مصروفیات کے علاوہ دیگر چند مشغولیات مندرجہ ذیل ہیں۔

ا۔ مذہبی مشیر (RELIGIOUS ADVISOR) برائے لارڈ نذیر احمد رکن ایوان بالا (HOUSE

Marfat.com

(HOUSE OF LORDS) برطانیہ۔ یہاں یہ یاد رہے کہ لارڈ نذیر احمد برطانوی مسلمانوں کے صف اول کے سیاسی رہنما ہیں جو برطانوی ایوان بالا کے اولیں مسلمان رکن ہیں۔ مسلکی اعتبار سے اہل حدیث ہیں۔ عالی کردار اور مسلمانوں کے مخلص تریں خادم۔ مولانا جمیل احمد گزشتہ دس سال سے ان کے مذہبی مشیر ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا برطانوی پارلیمنٹ میں اکثر آنا جانا رہتا ہے۔

۲۔ رکن یونیورسل پیس فیڈریشن یوکے (Universal Peace Federation)

۳۔ رکن فیڈریشن آف انڈین مسلم (FIMO) برمنگھم

۴۔ رکن ایسوسی ایشن آف برٹش حجاج یوکے

۵۔ گوانز وینڈ کلف پرائمری سکول برمنگھم (یہ حکومتی سٹیٹ سکول ہے)

۶۔ رکن برٹش مسلم انیشیٹو (British Muslim Initiative) اس ادارے کے تحت لارڈ نذیر احمد کے زیر قیادت دارفور سوڈان میں قیام امن کے لیے دس رکنی وفد تشکیل دیا گیا، جس کے ایک رکن مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری تھے۔ اس امن وفد (Peace Delegation) نے دارفور سوڈان کا دورہ کیا۔

۷۔ ڈاکٹر بہاء الدین صاحب تحریک ختم نبوت اور تاریخ اہل حدیث کے سلسلے میں برطانیہ میں جو تحریری کام کر رہے ہیں۔ مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری اس میں ان کے بہت بڑے معاون ہیں۔ ہندوستان میں اس موضوع کے متعلق انھیں کہیں سے جو مواد ملتا ہے، وہ ڈاکٹر صاحب ممدوح کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں۔ اس طرح ان کا یہ تحریری سلسلہ آگے بڑھ رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ان خدمات کا تذکرہ میں اپنی بعض کتابوں میں کر چکا ہوں۔ میں نے تحریک ختم نبوت کی پہلی جلد میں طویل مقدمہ لکھا تھا۔ ''چمنستان حدیث'' میں بھی میں نے ڈاکٹر صاحب پر مضمون لکھا ہے۔

مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری جماعت اہل حدیث کے سرگرم رکن ہیں اور اس کے جلسوں میں بڑے شوق سے شرکت فرماتے اور تقریریں کرتے ہیں، علاوہ ازیں عالمی کانفرنسوں میں شریک ہونا بھی ان کے نزدیک ضروری ہے۔

مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری کو محض کانفرنسوں میں شریک ہونے اور ان میں تقریریں کرنے کا ہی شوق نہیں ہے بلکہ تحریر و نگارش سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ طالب علمی کے دور ہی میں انھوں نے قلم سے رابطہ پیدا کرلیا تھا اور مختلف موضوعات پر چھوٹے چھوٹے مضامین لکھنا شروع کر دیے تھے۔ یہ مضامین ''جریدہ ترجمان'' دہلی اور ماہنامہ ''صوت الحق'' مالیگاؤں میں چھپتے رہے۔ انھوں نے ''صراط مستقیم'' (برمنگھم) میں بھی درس قرآن اور درس حدیث کے متعلق بہت کچھ لکھا۔

Marfat.com

دہلی اور نیپال وغیرہ کی کانفرنسوں میں شرکت کے بعد اس نواح کے سفرنامے ضبط تحریر میں لانا ضروری سمجھا۔ ان کانفرنسوں کے تاثرات کی صورت میں بھی ان کے مضامین اخباروں میں شائع ہوئے۔

جامعہ دارالسلام (عمر آباد) سے سند فضیلت حاصل کرنے کے لیے ”عہد فاروقی کے کارنامے“ کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا۔ اب اس کے مراجع ومآخذ مکمل کرکے اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ ہے۔

جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ میں طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے آٹھ دس مقالے لکھے، جن میں ایک مقالے کا عنوان تھا ”مسئلہ وضع الیدین حال القیام“ یعنی رکوع کے بعد سجدے میں جانے تک کے وقفے میں ہاتھ دوبارہ باندھنا چاہئیں یا نہیں۔ مولانا ممدوح اس عربی رسالے کا اردو ترجمہ کرکے اسے شائع کرنا چاہتے ہیں۔ میرے خیال میں مولانا کو رکوع کے بعد ہاتھ باندھنے یا نہ باندھنے اس قسم کے مضامین لکھنے اور شائع نہیں کرنا چاہئیں۔ اس نوع کے مضامین کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ انھیں کوئی ٹھوس اور اہم تحریری کام کرنا چاہیے۔

اگر گستاخی پر محمول نہ کیا جائے تو یہ فقیر حضرت مولانا کی خدمت میں عرض گزار ہوگا کہ اس قسم کے مباحث میں پڑنے کے بجائے برطانیہ کے حالات کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ وہاں انگریزی میں اسلام کی روشنی میں اخلاقیات پر لکھنا چاہیے۔ مستشرقین اسلام پر جو اعتراض کرتے ہیں، ان کا جواب دینا چاہیے، صحابہ کرام اور صحابیات رضی اللہ عنھن کے پاکیزہ کردار اور اعمال سے وہاں کے لوگوں کو متعارف کرانا چاہیے۔ اسلام میں امن وامان کے متعلق جو احکام بیان کیے گئے ہیں، تحریری اور تقریری صورت میں ان کی وضاحت کرنی چاہیے۔ اسلام کے اقتصادی ومعاشرتی اصول سے وہاں کے لوگوں کو آگاہ کرنا چاہیے، ان کو ارکانِ اسلام کے متعلق واقفیت بہم پہنچانا چاہیے، انھیں بتانا چاہیے کہ علامہ محمد اسد اور دیگر بہت سے لوگ یہودیت یا عیسائیت ترک کرکے اسلام کی کن خوبیوں کی وجہ سے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ اس قسم کی بہت سی باتیں ہیں، جن کی اس ماحول میں اشاعت ضروری ہے، اس کی تفصیل مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری اور ان کے رفقائے کار ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔

اللہ نے ان لوگوں کو موقع دیا ہے، اس سے یہ اپنی ہمت کے مطابق فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اسلام کی تبلیغ میں سرگرم ہیں۔ دیارِ غیر میں اشاعت اسلام کی جدوجہد ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے، اللہ ہی انھیں اس کا بدلہ دینے والا ہے۔

اہل حدیث حضرات کے سامنے تبلیغ کا بڑا ہدف ہونا چاہیے، جس پر وہ پہنچنے کی کوشش کریں۔ قرآن مجید

Marfat.com

کا انگریزی میں ترجمہ کریں اور اسے مغربی ممالک میں پھیلائیں۔ ترجمے کے لیے ان کے پاس اہل علم کی ایک جماعت ضرور ہوگی، جن میں ڈاکٹر صہیب حسن کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔ حدیث کی کتابوں میں سے مشکوۃ یا کسی اور کتاب کا انگریزی ترجمہ ہونا چاہیے۔ یہ کام یقیناً ان کے پیش نظر ہوں گے اور ان پر عمل کا انھوں نے منصوبہ بنایا ہوگا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کا حامی وناصر ہو اور اعمالِ خیر میں انھیں کامیابی سے ہم کنار فرمائے۔

بات مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری کے بارے میں ہو رہی تھی۔ جماعت کے اس سرگرم رکن کے کئی انٹرویو ہندوستان، نیپال اور برطانیہ کے اخبارات میں شائع ہوئے۔ ان اخبارات میں روزنامہ انقلاب لکھنؤ، روزنامہ صحافت دہلی ہفت روزہ کشمیر پوسٹ برمنگھم شامل ہیں۔

مرکزی جمعیت اہل حدیث برطانیہ کے شعبۂ تعلیم میں بہ حیثیت ناظم تعلیم نمایاں کارکردگی کے اعتراف میں مولانا عبدالہادی عمری امیر جمعیت اور مولانا شعیب احمد میر پوری ناظم جمعیت کی جانب سے توصیفی سند اور جمعیت کی شیلڈ ۱۱۔ اپریل ۲۰۰۴ء کو کل برطانوی مدارس سلفیہ کی عظیم الشان تقریب تقسیم انعامات کے موقعے پر ملی۔

مرکزی مدرسہ سلفیہ برمنگھم میں ۲۰۰۵ء سے ۲۰۰۸ء تک صدر مدرس کی حیثیت سے انھوں نے جو خدمات انجام دیں، اس کے اعتراف میں برمنگھم سٹی کونسل کی جانب سے کونسل ہاؤس برمنگھم کے سنٹرل ہال میں ایک تقریب کے موقعے پر مدرسہ سلفیہ کو گولڈ سرٹیفکیٹ ایوارڈ سے نوازے گئے۔ نیز مدرسے میں نظم ونسق اور قوانین کے نفاذ پر مولانا کو سرٹیفکیٹ آف اچیومنٹ ایوارڈ دیا گیا۔

مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری کو اساتذہ کے علاوہ جن عالمی سطح کے مشہور علما وشیوخ کی مجلسوں میں حاضر ہونے اور ان کے دروس سے استفادہ کے مواقع میسر آئے، وہ گیارہ اصحاب علم ہیں۔ ان میں سے جن چھے حضرات سے مدینہ منورہ میں مستفید ہوئے، وہ ہیں:

(۱) شیخ محمد ناصر الدین البانی (۲) شیخ حماد انصاری (۳) شیخ عبدالمحسن حمد العباد (۴) ڈاکٹر ربیع بن ہادی مدخلی (۵) شیخ محمد عمر فلاتہ (۶) ڈاکٹر عطیہ سالم۔

جن سے مکہ مکرمہ میں استفادہ کیا وہ صرف ایک ہیں (۷) شیخ محمد بن صالح العثیمین۔

جن ہندوستانی فضلاء سے اخذِ فیض کیا وہ مندرجہ تحت چار شخصیات ہیں۔ (نمبروں کی ترتیب کے ساتھ)

(۸) حضرت مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری، ان کی خدمت میں ان کے مسکن مبارک پور میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔

(۹) حافظ حفیظ الرحمٰن اعظمی مدنی، ان سے عمر آباد، مدراس اور بعض دیگر مقامات میں کسبِ فیض کیا۔

(۱۰) مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری کی مجلس میں ہندوستان میں بھی حاضر ہوئے اور برطانیہ میں بھی ان کے

Marfat.com

ارشادات کی سماعت کی۔

(۱۱) ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کا شمار ہندوستان کے ممتاز علما میں ہوتا تھا مولانا جمیل احمد عمری کو ان کی مجلس علمیہ میں حاضری کا موقع ہندوستان میں بھی ملا اور برطانیہ میں بھی۔

یہاں یہ بھی بتادیں کہ حضرت شیخ علامہ عبدالعزیز بن باز کے دروس عالیہ سے مولانا جمیل احمد نے برطانیہ میں بذریعہ ٹیلی فون استفادہ کیا۔

۱۹۹۰ء میں مولانا ممدوح کو علامہ شیخ محمد ناصرالدین البانی کے ساتھ فریضہ حج ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

ماشاء اللہ مولانا ممدوح ابتدائے عمر سے منظم زندگی گزار رہے ہیں۔ وقت اور وعدے کے پابند ہیں۔ تنظیمی معاملات سے خاص طور پر دلچسپی رکھتے ہیں۔ جماعتی، ذاتی اور معاشرتی سلسلے میں نظم ونسق قائم رکھنے کے عادی ہیں، جس کی بنا پر بعض بڑی شخصیتوں اور اداروں کی طرف سے اسناد حاصل کر چکے ہیں۔ عمر رسیدہ لوگوں اور بچوں سے انھیں بے حد لگاؤ ہے۔ دوسروں کا کام کر کے خوشی محسوس کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ''ظاہر سے سخت اور اندر سے بہت نرم ہیں۔'' کسی کی تکلیف برداشت کرنا ان کے لیے مشکل ہے۔ مصیبت زدہ کو دیکھ کر آنکھیں چھلک جاتی ہیں۔

علمائے دین، بزرگان کرام اور معاشرے کے بے سہارا اور غریب لوگوں کی خدمت ان کے نزدیک باعثِ سعادت ہے۔

یہ اوصاف حمیدہ ہیں جو مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری میں پائے جاتے ہیں، اسلام اس قسم کے اوصاف سے بہرہ ور ہونے کی خاص طور پر تاکید کرتا ہے، بڑوں کی تکریم اور چھوٹوں پر شفقت اسلام کا حکم ہے۔ ایفائے عہد بھی اسلام کے نزدیک ضروری ہے۔ ایفائے عہد نہ کرنا منافقت کی علامت ہے۔ معاشرے میں احترام کی نظر سے ان ہی لوگوں کو دیکھا جاتا ہے جو زبان کے پکے اور عہد کے کھرے ہیں۔ مولانا ممدوح خوش نصیب ہیں کہ ان میں یہ خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ وہ ان خوبیوں کو اختیار کرنے کے لیے لوگوں کو صرف وعظ ہی نہیں فرماتے بلکہ خود ان پر عامل ہیں اور عامل کی بات سب کو متاثر کرتی ہے۔ جو شخص اپنی زبان سے بیان کردہ خود کسی اچھائی پر عمل نہیں کرتا، اس سے لوگ دور ہٹ جاتے ہیں اور عمل کرنے والے کو اپنا مرکزِ عقیدت قرار دے لیتے ہیں۔

مولانا کے اسلاف بھی اس قسم کے اوصافِ حسنہ سے متصف تھے اور عزت واکرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ جائدادوں کے مالک اور علاقے کے اچھے خاصے زمیندار تھے۔ آسودہ حال اور خوش گفتار وخوش کردار لوگ۔

Marfat.com

مولانا کا خاندانی پس منظر ان ہی اوصاف حمیدہ کی نشان دہی کرتا اور ان کی حسنات کو اجاگر کرتا ہے۔ ان کے دادا نے تقریباً سو سال کی عمر پائی اور صالحیت کی فضاؤں میں لوگوں کی خدمت کرتے ہوئے بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہوئے۔ وہ تہجد گزار اور سراپا خیر بزرگ تھے۔ بقول مولانا کے ''دین دار، کٹر قسم کے اہل حدیث اور مردِ مجاہد تھے۔''

مولانا کے دادا کی اولاد میں اب صرف ان کے والد محترم بقید حیات ہیں، جن کا نام نامی شیر خاں محمد اسحاق ہے۔ وہ عبادت گزاری اور سماجی خدمت میں اپنے والد مکرم شیر خاں احمد حسین کا عکس ہیں۔ ان ہی کی طرح متبع کتاب وسنت، شبِ زندہ دار، خادم علماء، سخاوت پیشہ، نرم خو، ذکر واذ کار اور تلاوتِ قرآن کرنے والے اور مہمان نواز۔ خود مسجد کے متولی ہونے کے باوصف مسجد کی صفائی میں مشغول اور خادمِ مسجد۔ حصولِ ثواب کے لیے برسوں سے خود اذان دیتے ہیں اور امام کی عدم موجودگی میں امامت بھی کراتے ہیں۔ اگرچہ عمر کی رفتار کے ساتھ جسمانی کمزوری بڑھ گئی ہے، لیکن بغیر سہارے کے پانچ وقت مسجد میں آتے اور باجماعت نماز ادا فرماتے ہیں۔

مولانا کی والدہ مکرمہ بھی اللہ کے فضل سے زندہ ہیں اور مدراس کے معروف عالم دین پروفیسر مولانا عبدالعزیز جامی عمری مرحوم کی صاحب زادی ہیں۔ مولانا جمیل احمد کی حسن تربیت میں ان کے دادا اور والدین کے ساتھ ان کے نانا مرحوم کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔

ہم عاجز بندوں کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عامل بالخیر خانوادے کے فوت شدگان کو جنت نصیب فرمائے اور زندوں کو صالحیت کی نعمتِ عظمیٰ سے نوازے رکھے۔ آمین۔

اب مولانا ممدوح کی شادی اور ان کی اہلیہ مکرمہ کے بارے میں چند باتیں۔

مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری کی شادی ۱۳۔ جنوری ۱۹۹۱ء کو حضرت مولانا مختار احمد ندوی کی صاحب زادی محترمہ عائشہ مختار سے ہوئی۔ ان کے فرمان کے مطابق یہ رشتہ صرف جماعت اور مسلک [اہل حدیث] کی بنیاد پر طے ہوا۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ مولانا مختار احمد ندوی نے ان کو بتایا کہ انھوں نے 'دو مرتبہ حرم مکی میں استخارے کے بعد یہ رشتہ طے کیا۔''

مولانا جمیل احمد اپنی اہلیہ محترمہ کی تعلیم اور قابلیت کا نہایت مسرت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ عائشہ مختار نے خود اپنے مرحوم والد محترم کے قائم کردہ کلیۃ عائشہ صدیقہ منصورہ مالیگاؤں سے عالمیت اور فضیلت کا نصاب مکمل کیا۔ اس کے بعد بمبئی کے ایک مشہور انگریزی کالج سے عصری تعلیم حاصل کی۔

مولانا جمیل احمد اپنی اہلیہ کی تدریسی قابلیت کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے ''میرے جامعہ محمدیہ منصورہ مالیگاؤں میں بحیثیت شیخ الحدیث خدمت کے تین سالہ دور میں کلیہ عائشہ صدیقہ یعنی اپنی مادر علمی میں

Marfat.com

بچیوں کو سنن ابی داؤد، علم الفرائض اور الادیان والفرق والمذاہب المعاصرہ وغیرہ کی تدریس کا فریضہ انجام دیا۔''

شادی کے بعد وہ اپنے شوہر نام دار کے ساتھ برطانیہ گئیں تو وہاں بھی حصول تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ برمنگھم یونیورسٹی سے انھوں نے اسلامیات میں بی اے آنرز کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے ''اسلامی قانون وراثت اور برطانوی قانونِ وراثت کا تقابلی جائزہ'' کے عنوان سے مقالہ (تھیسس) لکھا اور درجہ اول میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد علم میراث میں ایم فل میں پہنچ کر حصولِ علم میں وقفہ کیا۔

اپنے شوہر کی طرح اسلام کی دعوت میں عائشہ مختار بھی سرگرم رہتی ہیں اور برطانوی معاشرے میں یہ بہت مشکل کام ہے، جو یہ بلند ہمت خاتون باقاعدگی سے کر رہی ہیں۔ وہ برطانیہ کی جمعیت اہل حدیث اور بعض دیگر پلیٹ فارموں کے ذریعے خواتین کو دعوت تبلیغ، درس وتدریس اور جلسوں میں خطاب کرتی ہیں اور سوال وجواب کی نشستوں میں ان مختلف اعتراضات کے جواب دیتی ہیں جو کسی طرف سے اسلام پر کیے جاتے ہیں۔

ان کا ہفتہ وار انگریزی زبان میں کئی سال سے درسِ قرآن بھی جاری ہے جس میں تعلیم یافتہ خواتین شرکت کرتی ہیں۔ یہ سلسلہ بڑا موثر اور قرآن وحدیث کی تبلیغ کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔

علاوہ ازیں محترمہ عائشہ مختار نے برطانیہ سے کونسلنگ کا کورس بھی کیا ہے اور وہ پریشان حال خواتین کی کونسلنگ بھی کرتی ہیں۔ ایسی بہت سی خواتین ہیں جو باقاعدہ مطالعہ کر کے دروس وغیرہ دیتی ہیں اور عائشہ مختار اس باب میں ان کی رہنمائی کرتی ہیں۔

ایک اہم خصوصیت اس لائقِ احترام خاتون میں یہ پائی جاتی ہے کہ یہ علم میراث میں مہارت رکھتی ہیں اس مہارت کی وجہ سے انفرادی طور پر بھی اس کے متعلق استفاء کے تحریری جواب دیتی ہیں اور برطانیہ کی مختلف شرعی کونسلوں میں بھی فتوے لکھتی ہیں۔ وراثت کے موضوع پر اب تک یہ خاتون بقول مولانا ممدوح ''سیکڑوں فتوے لکھ چکی ہیں۔'' ڈاکٹر صہیب حسن صاحب جنرل سیکرٹری شریعہ کونسل لندن نے بھی اپنی کثرت کار کی وجہ سے کئی مرتبہ محترمہ عائشہ مختار سے وراثت کے بارے میں فتوے لکھوائے۔ خود محترمہ کے والدِ مکرم مولانا مختار احمد ندوی بھی ان سے وراثت کے فتوے لکھوایا کرتے تھے۔

عائشہ مختار کے بارے میں مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری مزید فرماتے ہیں:

''اہلیہ محترمہ کا امور خانہ داری میں مہارت کے ساتھ ساتھ مختلف علوم وفنون میں دست رس رکھنا میرے لیے اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ثابت ہو رہی ہے۔ میرے تعلیمی، تبلیغی اور تحقیقی کاموں میں ان کا تعاون مثالی ہے۔ چوں کہ یہ اصلاً شمالی ہندوستان مؤناتھ بھنجن کی ہیں، اس لیے ان کا اردو ادب مجھ سے بہت اچھا ہے۔ شعر فہمی اور اردو ادب میں مہارت رکھتی ہیں، اس لیے میں اپنی

Marfat.com

تحریروں کو ایک مرتبہ ضرور ان کی نگاہوں سے گزار لیتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں دو پھول جیسی ذہین بیٹیاں عنایت کی ہیں ماشاء اللہ۔ شفیق جمیل سلمہا اللہ جو برمنگھم یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم ہیں، جب کہ دوسری لبنیٰ جمیل سلمہا اللہ برطانیہ کے ایک ممتاز گرامر گرلز سکول میں سیکنڈری ایجوکیشن پا رہی ہیں۔''

جیسا کہ ابتدائے مضمون میں عرض کیا گیا مولانا شیر خان جمیل احمد عمری اور مولانا شعیب احمد میرپوری سے میری فروری ۲۰۰۰ء میں مدینہ یونیورسٹی میں ملاقات ہوئی تھی جو پہلی (اور اب تک) آخری ملاقات ہے۔ ''اب تک'' نہ بھی لکھا جائے تب بھی آخری ہے۔ میرا برطانیہ جانا ناممکن، ان کا میرے پاس آنا مشکل۔ لیکن بہ طور لطیفہ عرض کر دوں کہ مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری فرماتے ہیں کہ وہ کسی سے جو وعدہ کریں اسے پورا کرتے ہیں، ضرور کرتے ہوں گے، لیکن انھوں نے مجھ سے دیارِ رسول میں قائم یونیورسٹی میں (جہاں خالص قرآن وحدیث کی تعلیم دی جاتی ہے) میرے کہے بغیر وعدہ فرمایا تھا کہ ہم تمھیں برطانیہ آنے کی دعوت دیں گے، وہ وعدہ آج تک پورا نہیں ہوا، بلکہ اس دن کے بعد مجھے یاد بھی نہیں فرمایا، کیا اس سیاق میں مَیں کہہ سکتا ہوں۔

وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا

وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ''میں بوڑھوں کا بہت احترام کرتا ہوں۔'' انھیں پتا ہوگا کہ میں بوڑھا ہوں، لیکن انھوں نے میرے ساتھ جو وعدہ کیا تھا، اس کی روشنی میں میرا کیا احترام کیا؟

اس موقعے پر مجھے اکبر الہ آبادی کے چند شعر یاد آ رہے ہیں اور اصرار کر رہے ہیں کہ انھیں مولانا کی خدمت میں پیش کیا جائے لیکن میں ان کے اصرار پر عمل کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ اسے ہلکا سا لطیفہ ہی سمجھا جائے، طلبِ دعوت برطانیہ پر ہرگز محمول نہ کیا جائے۔

یہاں یہ عرض کر دوں کہ تقسیم ملک کے زمانے میں میری عمر بائیس تیئیس سال کی تھی، اس وقت تک میں ہندوستان کے بہت سے مقامات کے چکر لگا چکا تھا اور ایسے ایسے مقامات میں جا چکا تھا، جہاں مولانا شیر خاں جمیل احمد اور ان کے رفقا میں سے آج تک کوئی بھی نہیں گیا ہوگا۔ تقسیم کے بعد بائیس تیئیس سال کی عمر میں بوڑھا ہو گیا۔ سوائے دو دفعہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ جانے کے اور ایک مرتبہ کویت جانے کے اور کہیں نہیں گیا۔ ہندوستان کے مختلف اداروں کی طرف سے (جن میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ شامل ہے) سیمیناروں میں شمولیت اور کسی موضوع پر مقالہ پڑھنے کی دعوت آئی، لیکن میں نہیں جا سکا۔ ایک مرتبہ چندی گڑھ میں پنجاب سرکار کی طرف سے پنجابی زبان کے سلسلے کی ایک میٹنگ میں شامل ہونے کا ٹکٹ بھی آیا، لیکن میں نہیں گیا۔ ہندوستان کے ایک صدر گیانی ذیل سنگھ تقسیم سے قبل میرے ہم وطن تھے۔ پنجاب کی ریاستوں کی ایک سیاسی

Marfat.com

جماعت ''پرجامنڈل'' تھی۔ فرید کوٹ ریاست کی پرجامنڈل کے وہ صدر اور میں سیکرٹری جنرل تھا۔ ہندوستان کے منصبِ صدارت پر فائز ہونے کے کچھ عرصے بعد انھوں نے مجھے ہندوستان آنے کی دعوت دی، لیکن میں نہیں جاسکا۔ مولانا ابوالکلام آزاد ۲۲۔ فروری ۱۹۵۸ء کو فوت ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ سرکاری طور پر مجھے ان کی برسی میں شرکت کا پیغام آیا، لیکن میں نہیں گیا۔ دراں حالیکہ اس وقت صحت بھی ٹھیک تھی اور عمر کا بھی جسم پر زیادہ بوجھ نہیں پڑا تھا۔ میرے بعض ہندوستانی دوست کہا کرتے ہیں کہ تم اپنے دوست گیانی ذیل کی دعوت پر ہندوستان نہیں آئے تو اب کبھی یہاں نہیں آسکو گے۔ ان کی بات بالکل صحیح ہے۔

میں نے ۱۹۴۹ء سے قلم وقرطاس سے دوستی قائم کر لی تھی، اسے چھوڑ کر میں کہیں نہیں جا سکتا۔

خوانندگانِ محترم معاف فرمائیں مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری کی طرف سے دعوتِ برطانیہ کے تذکرے میں قلم اصل راستے سے بھٹک کر دوسرے راستے پر چل پڑا۔ وہ اگر برطانیہ آنے کی باقاعدہ دعوت بھی دیتے (یا اب دیں) تو میں اپنے قلم وقرطاس کو چھوڑ کر ہرگز وہاں نہیں جاسکتا۔

اب آیے دوبارہ مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ صالحین کی صحبت، دل میں صالحیت کا جذبہ پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔

مولانا ممدوح کے بارے میں مضمون لکھنے کا پس منظر بھی سنتے جایے۔

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے شہر (یا قصبہ) کاسگنج کے رہنے والے جناب ڈاکٹر عبدالوہاب انصاری کا شمار ہندوستانی حضرات میں ہوتا ہے جو ازراہِ کرم اس فقیر کی کتابوں کے قاری ہیں اور جن سے خط کتابت یا ٹیلی فون کے ذریعے سے رابطہ رہتا ہے۔ وہ حضرات جن الفاظ میں میری تحریروں کا تذکرہ کرتے ہیں، میری کسرنفسی مجھے وہ الفاظ یہاں نقل کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ ایک دن ڈاکٹر انصاری صاحب نے ٹیلی فون پر ہندوستان کے چند علما کے بارے میں فرمایا کہ میں ان کے حالات ضرور لکھوں۔ ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہوا کہ مولانا شبیر خاں جمیل احمد عمری پر بھی لکھا جائے۔ اس وقت میری کتاب ''چمنستان حدیث'' کمپوزنگ کے آخری مرحلے سے گزر رہی تھی۔ میں نے عرض کیا میں خود بھی چاہتا ہوں کہ برصغیر کے جو علمائے کرام برطانیہ یا عرب ملکوں میں دینی خدمات انجام دے رہے ہیں ان کا تذکرہ کیا جائے۔ لیکن ان سے رابطہ کیسے ہو؟ جن حضرات کے متعلق میں کچھ معلومات رکھتا ہوں، ان کا تذکرہ مختلف کتابوں میں کر دیا ہے اور کر بھی رہا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب ممدوح نے وعدہ فرمایا کہ وہ ان کے حالات بھجوانے کی کوشش کریں گے، چناں چہ انھوں نے وعدہ وفا کیا اور ان کے نامزد کردہ علما کے حالات مجھے پہنچ گئے اور ''چمنستان حدیث'' میں درج ہوگئے جو بڑے سائز کے آٹھ سو سے زائد صفحات پر محیط ہے۔ لیکن مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری کے حالات نہ پہنچے،

Marfat.com

میں نے ڈاکٹر صاحب کو انڈیا فون کیا کہ ان کے حالات نہیں ملے۔ اب ''چمنستان حدیث'' کمپوزنگ کی منزل سے گزر کر ناشر کے قبضے میں چلی گئی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ''بوستان حدیث'' کی کمپوزنگ جاری ہے جو کم وبیش پانچ سو صفحات کی مسافت طے کر چکی ہے، اگر مولانا شیر خاں کے افکار عالیہ موصول ہو گئے تو ان شاء اللہ ''بوستان حدیث'' میں شامل کر دیے جائیں گے۔

اس اثنا میں یکے بعد دیگرے مولانا کے بھی برطانیہ سے تین ٹیلی فون آئے۔ بہرکیف تقریباً دو مہینوں کے شدید انتظار کے بعد ان کا مضمون بذریعہ ای میل موصول ہوا جو فل سکیپ کے ایک سو ایک صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ مولانا جہاں کہیں گئے، جن سیمیناروں یا اجلاسوں میں شرکت کی اور جو کچھ ارشاد فرمایا، جو مضمون کسی کتاب یا شخصیت کے بارے میں رقم فرمایا، جن اخبارات کو انٹرویو دیے، جو کچھ کسی نے ان کے متعلق لکھا اور ان کی تقریروں اور تحریروں پر جس ردِعمل کا اظہار ہوا، اس تمام مواد کی فوٹو کرائی اور مجھے ارسال فرمادی۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے متعلق اتنی معلومات پڑھ کر میں بہت خوش ہوا۔ اپنا خاندانی پس منظر بھی انھوں نے تفصیل سے بیان کر دیا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ ان کی تمام نگارشات بہت سی اہم معلومات پر مشتمل ہونے کے باوجود کتاب میں درج کرنا مشکل ہے۔ یہ نگارشات کتاب کے کم از کم ڈیڑھ سو صفحات کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گی، جس کی کتاب میں گنجائش نہیں ہے۔

غالباً شخصیات کے متعلق اس فقیر کی (چودہ پندرہ کتابوں میں سے) کوئی کتاب مولانا کی نظر سے نہیں گزری۔ میں نے مختلف کتابوں میں برصغیر کے سیکڑوں نہیں، ہزاروں علمائے کرام اور زعمائے عظام کے حالات لکھے ہیں۔ ''چمنستان حدیث'' میں پورے سو (۱۰۰) مرحومین وموجودین کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ میں کسی صاحب کے بارے میں موصول شدہ حالات میں سے اس طرح واقعات کو چھانٹ لیتا ہوں کہ ان کی تمام سرگرمیاں اس کے خاندانی پس منظر کے ساتھ کتاب کے صفحات پر مرتسم ہو جائیں۔ چناں چہ میں نے مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری کی تحریر غور سے پڑھی اور اس میں سے ان کے بارے میں واقعات کو اس نہج سے کشید کر لیا کہ ان میں ان کا خاندانی پس منظر بھی آ گیا، ان کے آباؤ اجداد کا تذکرہ بھی ہو گیا، ان کی تعلیم اور مقاماتِ تعلیم کے ساتھ اساتذہ کے اسمائے گرامی بھی درج ہو گئے۔ باقاعدہ اساتذہ کے علاوہ جن علما وشیوخ سے انھوں نے کہیں استفادہ کیا، ان کے نام بھی درج ہو گئے۔ ان کی تدریسی، تبلیغی، معاشرتی، تحریری سرگرمیاں جہاں جہاں جاری رہیں اور جس انداز سے جاری ہیں اور ان کے جو نتائج نکلے، وہ سب کتاب میں آ گئے۔ ان کی عادات واطوار کی نشان دہی بھی کر دی گئی ہے۔

مجھے مولانا ممدوح کے اس طویل مضمون سے جو بہت سے دائروں میں پھیلا ہوا ہے، چند ایسی چیزیں ملی

Marfat.com

ہیں جن کی مجھے سخت ضرورت تھی۔ مولانا عبدالحمید رحمانی نے ۲۰۔اگست ۲۰۱۳ء کو وفات پائی۔ وہ دہلی سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''التوعیہ'' کے مالک و مدیر تھے۔ یہ ماہنامہ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ میں باقاعدگی سے آتا اور دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ بالخصوص اس کے وہ مضامین جو جناب سید ابن احمد نقوی تحریر فرماتے تھے، وہ زبان واسلوب اور فراوانیٔ معلومات کے اعتبار سے نہایت اہمیت کے حامل ہوتے تھے اور مولانا محمد حنیف ندوی سمیت سب رفقائے ادارہ ان کا مطالعہ کر کے بے حد مسرت کا اظہار کرتے تھے۔ میں ''بوستانِ حدیث'' میں مولانا عبدالحمید رحمانی کے حالات لکھنا چاہتا تھا، لیکن کہیں سے ان کے حالات کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ نہایت خوشی ہوئی کہ مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری کے مضمون میں ان کے رقم فرمودہ حالات مندرج ہیں، جو میں نے اس کتاب ''بوستانِ حدیث'' میں ان کے حوالے سے مستقل عنوان کے تحت درج کر دیے ہیں۔

میں بہت دنوں سے مولانا مختار احمد ندوی کے حالات کا بھی متلاشی تھا۔ ایک دن دفعتۃً خیال آیا کہ اس کے لیے مولانا محمد اسرائیل سلفی ندوی کی کتاب ''تراجم علمائے اہل حدیث میوات دیکھنی چاہیے۔ چناں چہ اسے دیکھا تو اس میں مولانا مختار احمد ندوی کے حالات مرقوم تھے۔ اس کے بعد مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری کا مضمون موصول ہوا تو اس میں بھی ان کے واقعاتِ حیات موجود ہیں۔

اس سلسلے میں ذہن پر ایک اور کتاب کی طرف رجوع کرنے کے لیے دستک ہوئی اور وہ بہ درجہ غایت اہم کتاب ہے جو مولانا رفیق احمد رئیس سلفی نے مولانا عبدالمعید مدنی کی نگرانی میں مرتب کی اور نومبر ۱۹۹۹ء میں علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ مجھے یہ کتاب مولانا رفیق احمد رئیس سلفی نے اشاعت سے تین مہینے بعد ۱۲۔فروری ۲۰۰۰ء کو یہ الفاظ لکھ کر بھجوائی، ''نقوشِ عظمت رفتہ، بزم ارجمنداں اور کاروانِ سلف کے عظیم مصنف محترم مولانا محمد اسحاق بھٹی حفظہ اللہ کی خدمت میں سرسید کی ''سرزمین'' کا ایک علمی تحفہ۔

نیاز مند

رفیق احمد رئیس سلفی۔علی گڑھ''

اس کتاب کا نام ہے: ''علم الحدیث۔مطالعہ وتعارف۔''

یہ کتاب بلاشبہ سرسید کی سرزمین کا علمی تحفہ ہے، جس کا مطالعہ کر کے بے حد مسرت ہوئی۔ کتاب کیا ہے بے شمار معلومات کا گنجینہ ہے جو بڑے سائز کے ۵۲۸ صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کے صفحہ ۴۸۵ اور ۴۸۶ پر حضرت مولانا مختار احمد صاحب فیضی ندوی مئوی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ انھوں نے مئوناتھ بھنجن کی جامعہ اسلامیہ فیض عام سے تعلیم حاصل کی تھی اور ان کا شمار فیضی علماء میں ہوتا تھا، اس لیے انھیں فیضی لکھا گیا ہے۔ اب یہ کتاب دارالکتب السّلفیہ غزنی سٹریٹ، اردو بازار نے شائع کر دی ہے اور پاکستانی شائقین کے مطالعہ کے لیے

Marfat.com

اس کا حصول آسان ہوگیا ہے۔ حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف کے پوتے اور حافظ احمد شاکر کے بیٹے عزیز القدر رہنا دشاکر اس مکتبے کے مدیر ہیں۔

میں نے ان تینوں حضرات کے مضامین سے استفادہ کیا اور ''بوستان حدیث'' میں مولانا مختار احمد ندوی کا مستقل عنوان سے تذکرہ کردیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان سب حضرات کو اپنے زیر سایہ رکھے اور یہ ہمیشہ اس کے دین کی تبلیغ میں مشغول رہیں۔

مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری کی اہلیہ محترمہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں اور ان کا تذکرہ انھوں نے بڑے احترام سے کیا ہے اور احترام ہی سے کرنا چاہیے تھا۔ مولانا نے اپنی اہلیہ کی تمام علمی جہتوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر مجھے ان کی تاریخ ولادت کا پتا چل جاتا تو ان کا تذکرہ الگ عنوان کے ساتھ درجِ کتاب کیا جاتا۔ اس سے قبل میں برصغیر کی بعض خواتین کی علمی سرگرمیوں کی وضاحت مستقل عنوان کے تحت اپنی بعض کتابوں میں کرچکا ہوں۔ جو لائق تکریم خواتین علم وتحقیق میں دلچسپی رکھتی اور تحریر وتقریر کی صورت میں اس کا اظہار کرتی ہیں، ان کا تعارف کرانا اور ان کی علمی مساعی سے لوگوں کو آگاہ کرنا ضروری ہے تاکہ دوسری خواتین اس سے اثر پذیر ہوکر قرآن وحدیث کی تبلیغ کو اپنا مطمحِ نظر ٹھہرائیں۔

علمائے کرام مطمئن رہیں اس سے ارشادِ قرآنی اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ کی مخالفت ہرگز نہیں ہوتی، بلکہ مردوں کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ تم کہاں سوئے ہوئے ہو، علمی سرگرمیوں میں عورتیں تم سے آگے نکل گئیں، اٹھو تم بھی کوئی تحقیقی کام کرو۔

خواتین کی علمی اور تبلیغی تگ وتاز کا سلسلہ صدر اول یعنی ازواج مطہرات اور صحابیات وتابعات سے چلا آرہا ہے۔ عربی اور اردو میں بہت سی کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں، جن کا مطالعہ دلچسپی سے کیا جاتا ہے۔

مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری کا اردو اور انگریزی کا خط (ہینڈ رائیٹنگ) ماشاء اللہ بہت اچھا ہے۔ ان کی لکھائی دیکھ کر جی خوش ہوا۔ حسن کتابت بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے جو مولانا کے حصے میں آئی۔

مولانا اپنے مرسلہ مضمون کے صفحہ ۱۹ پر اپنی اہلیہ محترمہ کے بارے میں فرماتے ہیں: ''چوں کہ یہ اصلاً شمالی ہندوستان مئوناتھ بھنجن کی ہیں...... شعرفہمی اور اردو ادب میں مہارت رکھتی ہیں، اس لیے میں (اپنی) تحریروں کو ایک مرتبہ ضرور ان کی نگاہ سے گزار لیتا ہوں۔''

لگتا ہے مولانا نے اس مضمون کے بعض حصے اہلیہ محترمہ کی نگاہ سے نہیں گزارے، اگر گزارے ہیں تو بس گزارنے کے موافق۔ دراں حالیکہ سارے حصے گزارے بغیر گزارا نہ تھا۔ میرا کام یہاں ان حصوں کی نشان دہی کرنا نہیں ہے۔ میں نے ان کی تحریر کی مدد سے اپنے مطلب کی چند چیزیں بیان کرنا تھیں اور وہ کردی گئیں۔

Marfat.com

☆...... مضمون کے صفحہ ۷ پر مولانا نے برطانیہ کے ہاؤس آف لارڈز کا ترجمہ ''اعوان بالا'' کیا ہے۔ آگے لکھا ہے لارڈ نذیر احمد ''پہلے مسلمان رکن اعوان بالا'' ہیں۔ یعنی ''ایوان'' کو ''اعوان'' بنا دیا۔ مولانا کو پتا ہوگا ''اعوان'' برصغیر کی ایک برادری کا نام ہے۔ اس برادری کے لوگ کشمیر، سرگودھا، جہلم، راولپنڈی، گوجراں والا، سیالکوٹ وغیرہ اضلاع میں اچھی خاصی تعداد میں آباد ہیں۔ دیگر اضلاع کے مختلف علاقوں میں بھی یہ سکونت پذیر ہیں۔ مشہور عالم اور حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد مولانا غلام رسول قلعوی، جماعت مجاہدین کے معروف رکن اور جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن کے بانی صوفی عبداللہ اور ممتاز مورخ اور محقق مولانا غلام رسول مہر اعوان برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ان حضرات کا دعویٰ ہے کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہیں۔ ''اعوان'' کے نام سے لاہور سے اس برادری کا ماہانہ رسالہ بھی شائع ہوتا تھا۔ اس طرح ملتان روڈ پر ایک بستی ''اعوان ٹاؤن'' کے نام سے بھی ہے۔

☆...... جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان ہوا، مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری کی شادی حضرت مولانا مختار احمد ندوی کی صاحب زادی عائشہ مختار سے ہوئی تھی۔ صفحہ ۱۸ پر مولانا لکھتے ہیں: ...... ہمارے رشتہ کو طے کیا تھا'' یہاں ''کو'' لانے کی ضرورت نہ تھی۔ ''ہمارا رشتہ طے کیا تھا''۔ ہونا چاہیے۔

زبان وانداز کے سلسلے کی اور بھی کئی باتیں ہیں، جس سے شبہ پڑتا ہے کہ شاید انھوں نے اپنی اہلیہ محترمہ کی نگاہ سے اس کے بعض حصے نہیں گزارے۔

آخر میں مولانا شیر خاں جمیل احمد عمری کی خدمت میں یہ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ انھوں نے مختلف سرگرمیوں پر مشتمل جو مضمون تحریر فرمایا ہے، اس پر ناقدانہ انداز میں نظر ثانی کر کے اسے کتابی صورت میں شائع کردیں۔ یا اسے ہندوستان کے کسی ماہنامے یا پندرہ روزے میں قسط وار چھپوانے کا انتظام کریں۔ متعدد شخصیات پر مشتمل کتاب کے صفحات کسی ایک شخصیت سے متعلق اتنی طویل نگارشات کو اپنی تحویل میں نہیں لے سکتے۔ میرے خیال میں سب سے مناسب صورت یہ ہے کہ ''اپنی مدد آپ'' کے اصول کے تحت مولانا خود ہی کتابی شکل میں اس کی اشاعت کا منصوبہ بنائیں۔ ان کے پاس اللہ کی مہربانی سے اس قسم کے کام کی تکمیل کے لیے ذرائع بھی ہیں اور وسائل بھی۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ وہ اپنے علاقے کے مال دار اور زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی اس شائع کردہ کتاب سے میرے جیسے بے شمار لوگ استفادہ کریں گے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ مولانا ممدوح اور ان کے اہل بیت کا حامی وناصر ہو اور یہ ہمیشہ قرآن وحدیث کی خدمت میں مشغول رہیں۔

(یہ سطور ۲۵۔ مئی ۲۰۱۴ء کو لکھی گئیں۔)

Marfat.com

حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی

(ولادت ۱۹۶۹ء)

میانہ قد، گندمی سرخی مائل رنگ، خوش اخلاق، خوش گفتار، صاف کلام خطیب، کلمہ حق کہنے میں جری، مہمان نواز، فراخ حوصلہ، اساتذہ کے حضور نہایت مؤدب، رفقائے کار کے بہی خواہ، طلبا کے لیے سراپا شفقت، محنتی معلم، اپنے مسلک کے جرات مند مبلغ۔ یہ ہیں حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی جو ۱۹۶۹ء کو موضع جید چک نمبر ۱۶ (تحصیل منڈی ڈھاباں سنگھ ضلع شیخوپورہ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد درس نظامی کی تکمیل جن حضرات سے کی، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: مولانا عبدالحمید ہزاروی، مولانا حافظ عبدالعزیز علوی، حافظ عبدالرزاق سعیدی، حافظ عبدالسلام بھٹوی، مولانا حافظ عبدالمنان نورپوری، حافظ محمد عباس انجم گوندلوی، مولانا عبداللہ امجد چھتوی، مولانا محمد رفیق سلفی، مولانا جمعہ خاں، مولانا حفیظ الرحمٰن لکھوی، قاری عبدالرزاق اور قاری عبدالشکور مدنی، حافظ محمد الیاس اثری۔

یہ حضرات جلیل المنزلت علما اور رفیع المرتبت مدرس ہیں۔ ان میں سے حضرت حافظ عبدالمنان نورپوری وفات پا گئے ہیں۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

ابتدائی تعلیم کے بعد حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی نے درس نظامی کی پوری تعلیم کے لیے انہی عالی قدر اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیے۔ انھوں نے ۱۹۸۶ء میں جامعہ محمدیہ جی ٹی روڈ گوجراں والا سے تحصیل علم کا آغاز کیا تھا۔ آٹھ سال بعد ۱۹۹۳ء اسی جامعہ کے بانی و مہتمم مولانا عبداللہ مرحوم ومغفور کے دست مبارک سے سندِ فراغ حاصل کی۔

تقریر وخطابت سے دورِ طالب علمی سے ہی انھیں دلچسپی تھی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد باقاعدگی سے خطابت وتدریس کا سلسلہ ضلع گوجراں والا کے موضع ترگڑی سے شروع کیا۔ یہاں ان سے میٹرک، ایف اے، بی اے اور ایم اے کے عربی اور اسلامیات کے متعدد طلباء نے جو سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتے تھے، اپنے نصاب کی بعض کتابیں پڑھیں۔ ان کے علاوہ بھی کتنے ہی نوجوانوں نے ان سے علم حدیث اور صرف ونحو کی بعض کتابیں پڑھیں۔ اس گاؤں اور اس کے اردگرد کے دیہات کے لوگوں پر ان کی خطابت اور تدریس کا بہت اچھا اثر پڑا اور لوگ مسلک اہل حدیث سے آشنا ہوئے اور ان کے عمل وعقیدے میں تبدیلی آئی۔

Marfat.com

کچھ عرصہ ان کا قیام راہوالی میں رہا۔ وہاں کی مرکزی مسجد اہل حدیث میں ان سے بعض حضرات نے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا۔ یہاں ان سے چودھری عبدالحمید گجر، ضیاء الدین اور عبدالماجد ساہی نے بعد نماز عشاء جامع ترمذی پڑھنا شروع کی۔ پوری کتاب تو نہ پڑھی جا سکی، لیکن اس کے اثرات بہت نمایاں ہوئے اور ان حضرات کو علم حدیث سے لگاؤ پیدا ہوا۔

راہوالی سے دارالعلوم محمدیہ (پرانا لاری اڈا) شیخوپورہ میں کچھ عرصہ تدریس کا موقع ملا۔ وہاں مختلف علوم وفنون کی کتابوں کے ساتھ ساتھ مشکوٰۃ شریف اور سنن نسائی شریف پڑھانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ایک سال سنن نسائی کی آخری حدیث کا درس حضرت حافظ عبدالمنان نور پوری رحمہ اللہ نے دیا اور دوسرے سال نسائی شریف کی آخری حدیث کا درس مولانا عبداللہ امجد چھتوی نے دیا۔ وہاں دو سال قیام رہا۔ مشکوٰۃ المصابیح کے ساتھ دو سال سنن نسائی پڑھائی۔ باقی فنون کی کتابیں ان کے علاوہ ہیں۔

ایک سال حافظ محمد الیاس اثری کے حکم سے گوجراں والا کے مدرسہ علوم اثریہ میں خدمت تدریس انجام دی۔

حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی کو جن مقامات میں مستقل خطبات جمعہ دینے کے مواقع میسر آئے، اس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

☆ ترگڑی ضلع گوجراں والا میں تقریباً چار سال فریضہ خطابت سرانجام دیتے رہے۔

☆ راہوالی (گوجراں والا) کی جامع مسجد ابوبکر صدیق میں اڑھائی سال یہ خدمت انجام دی۔

☆ ایمن آباد (ضلع گوجراں والا) کی جامع مسجد اہل حدیث میں ایک سال۔

☆ شیخوپورہ کی جامع مسجد قبا اہل حدیث (جنڈیالہ روڈ) میں تین سال۔

☆ شاہ کوٹ (ضلع ننکانہ) کی جامع مسجد اہل حدیث میں ایک سال۔

☆ میر پور (ضلع ننکانہ صاحب) کی جامع مسجد توحید اہل حدیث میں پندرہ سال سے خطبہ جمعہ ارشاد فرما رہے ہیں، جس میں مقامی لوگوں کے علاوہ قرب وجوار کے کافی تعداد میں لوگ آتے اور بڑے شوق سے ان کا خطبہ سنتے ہیں۔

۲۰۰۲ء سے یزدانی صاحب جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں خدمت تدریس میں مشغول ہیں۔ جامعہ کے نصاب کے مطابق وہ مختلف فنون کی کتابیں پڑھاتے ہیں۔ ابتدائی سالوں میں ترجمہ قرآن پڑھایا اور اس کے ساتھ عقائد وسیرت اور صرف ونحو کی بعض کتابیں پڑھائیں۔

جامعہ سلفیہ کو ماشاء اللہ ہمیشہ لائق مدرسین کی خدمات حاصل رہی ہیں۔ ۴۔ اپریل ۱۹۵۵ء کو اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ وہ سارا نقشہ اب بھی میرے سامنے ہے۔ اس سے کچھ عرصہ بعد میں نے جامعہ میں باقاعدہ

Marfat.com

تدریس کا سلسلہ شروع ہوتے دیکھا اور اخبار الاعتصام میں، جس کا میں اس وقت ایڈیٹر تھا، افتتاح کی پوری روداد لکھی۔ اللہ تعالیٰ کا اس تدریسی ادارے پر یہ خاص کرم ہے کہ آغاز ہی سے اسے قابل معلمین اور لائق متعلمین کی آماجگاہ بنادیا۔ اس وقت جامعہ میں آٹھ سو طلبا تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور اساتذہ کی بڑی تعداد انھیں تعلیم دینے پر مقرر ہے۔ حفظ قرآن کا بھی انتظام ہے اور تجوید کے ساتھ قرآن مجید حفظ کرایا جاتا ہے۔

جامعہ کے پرنسپل ایک عرصے سے چودھری محمد یاسین ظفر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اور تمام معلمین کو خوش رکھے اور ان کی تنظیمی اور تدریسی مساعی کو شرفِ قبولیت سے نوازے آمین۔

حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی فاضل معلمین کی اسی لائق تکریم جماعت کے رکن ہیں جو دلجمعی اور محنت سے اپنے مفوضہ فرائض سرانجام دے رہے ہیں اور طلبا ان کے اسلوب تدریس سے مطمئن ہیں۔ فنون کی بعض کتابوں کے ساتھ ساتھ آج کل وہ صحاح ستہ کی اہم کتاب سنن ابی داؤد پڑھا رہے ہیں۔ جامعہ سلفیہ کے مجلّے ''ترجمان الحدیث'' کی ادارت بھی ان کے سپرد ہے، جب کہ اس کے رئیس التحریر چودھری محمد یاسین ظفر ہیں اور مضمون نگاروں میں جامعہ کے عالی مرتبت اساتذہ بھی شامل ہیں اور عزیز القدر طلبا بھی۔!

حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی کے دل میں جامعہ سلفیہ کے اساتذہ کرام کا احترام تو جاگزیں ہے ہی، ان کے علاوہ دیگر تدریسی اداروں کے اساتذہ کی بھی یہ قدر کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے جامعہ سلفیہ کے اساتذہ اور فیصل آباد کے دارالقرآن والحدیث کے مدرسین کے تذکار خود لاہور آکر مجھے دیے۔

یزدانی صاحب اساتذہ اور اپنے رفقائے کار سے کس تکریم سے پیش آتے اور طلبا کو کس درجے مستحق شفقت قرار دیتے ہیں، اس کی ایک مثال عرض کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ انھوں نے مجھے اپنے ہاں میرپور (شاہ کوٹ، ضلع ننکانہ) حاضر ہونے کی دعوت دی۔ وہاں یہ دیکھ کر نہایت مسرت ہوئی کہ گوجراں والا سے ان کے اساتذہ کرام میں سے حضرت حافظ عبدالمنان نورپوری رحمہ اللہ بھی تشریف فرما ہیں اور شیخ الحدیث مولانا عبدالحمید ہزاروی حفظ اللہ بھی، مرید کے مرکز طیبہ سے حافظ عبدالسلام بھٹوی صاحب اور ستیانہ بنگلہ سے مولانا محمد عبداللہ امجد چھتوی بھی تشریف فرما تھے۔ نیز جامعہ سلفیہ کے معزز اساتذہ میں سے چودھری محمد یاسین ظفر، مولانا حافظ عبدالعزیز علوی، حافظ مسعود عالم اور بعض دیگر اساتذہ بھی موجود ہیں۔ ان حضرات سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔

ایک دفعہ جمعۃ المبارک کے روز مجھے اور میرے بھائی سعید احمد بھٹی کو بلایا تو وہاں ان کے تقریباً اسی (۸۰) طالب علموں کو دیکھا جو چند روز سے گاؤں میں موجود تھے اور استاذ مکرم سے اپنی نصابی کتابیں پڑھ

Marfat.com

رہے تھے، مولانا سلیم اعظم بلوچ بھی آئے تھے، جنھوں نے خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا تھا۔فیصل آباد سے مولانا محمد رمضان سلفی کو بھی بلایا گیا تھا۔

اس طرح یزدانی صاحب علمائے کرام بالخصوص جامعہ سلفیہ کے اساتذہ وطلبا سے بہت قرب رکھتے ہیں اور طلباء بے حد شوق سے ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

میر پور کی جماعت سے خطابت کا یزدانی صاحب کوئی پیسا نہیں لیتے۔ وہاں کے لوگ ان کا بہت احترام کرتے ہیں اور یہ ان سے تکریم کے ساتھ پیش آتے ہیں۔

فیصل آباد کی بعض مساجد کی انتظامیہ کے محترم ارکان نے کئی مرتبہ ان سے کہا کہ ان کی مسجد میں وہ خطبہ جمعہ دیں گے تو ان کی توقع سے بڑھ کر انھیں تنخواہ دی جائے گی۔ایک مرتبہ ایک مسجد کے چند حضرات جامعہ کے پرنسپل چودھری محمد یاسین ظفر کے پاس آئے کہ وہ یزدانی صاحب سے ان کی مسجد میں جمعہ پڑھانے کی سفارش کریں، چودھری صاحب ممدوح نے ان سے بات کی تو انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ نہیں وہیں ٹھیک ہوں جہاں طویل مدت سے خطابت کا فریضہ سرانجام دے رہا ہوں۔اگر تنخواہ کے لیے کام کرنا ہے تو کسی نے ان سے زیادہ پیسے دینے کی کوشش کی تو انھیں چھوڑ کر وہاں جانے کو جی چاہے گا۔مناسب یہی ہے کہ ایک ہی جگہ جم کر خدمت انجام دی جائے۔

اس مادی دنیا میں ان اوصاف کے مالک علما وخطبا کا وجود بسا غنیمت ہے۔اللہ ان کا حامی وناصر ہو۔ جس سے مدرسے کے طلبا خوش ہوں اور اس کے طریق تدریس پر اطمینان کا اظہار کریں، وہ کامیاب مدرس ہے اور جس خطیب کے طرز خطابت سے اس کے سامعین مطمئن ہوں اور اس سے اثر پذیر ہوتے ہوں، وہ کامیاب خطیب ہے۔ یہ بڑی نعمت ہے جو اللہ نے اس وصف کے مدرس اور خطیب کو عطا فرمائی ہے۔اس پر اسے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

عرض یہ کرنا مقصود ہے کہ آج سے ساٹھ سال قبل اپریل ۱۹۵۵ء میں ہمارے بزرگوں نے جس مقصد کے لیے فیصل آباد میں جامعہ سلفیہ قائم کیا تھا، اللہ کے فضل سے وہ مقصد حاصل ہو رہا ہے اور یہاں کے اساتذہ نہایت محنت سے خدمت تدریس میں مشغول ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ جامعہ سلفیہ کے بانیوں، اس کے معاونوں اور مدرسین کو جو وفات پا گئے ہیں جنت الفردوس نصیب کرے اور جو زندہ ہیں، انھیں زیادہ سے زیادہ خدمت دین کی توفیق مرحمت فرمائے۔

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا محمد احسن سلفی

(ولادت ۲۳۔ مارچ ۱۹۶۹ء)

مولانا غلام رسول مہر عربی، فارسی، اردو، انگریزی کے ممتاز عالم تھے، بہت بڑے محقق اور بے شمار کتابوں کے مصنف ومترجم۔ ۱۳۔ اپریل ۱۸۹۵ء کو موضع پھول پور (ضلع جالندھر مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے اور ۱۶۔ نومبر ۱۹۷۱ء کو لاہور میں ان کی وفات ہوئی۔ ان کی تصانیف کی وسیع فہرست میں ''سیرت سید احمد شہید رائے بریلوی''، ''سرگزشتِ مجاہدین'' اور ''جماعت مجاہدین'' کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اپنے موضوع میں یہ کتابیں شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کتابوں میں سید احمد شہید رائے بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی کے ساتھی مجاہدین اور ان کی شہادت کے بعد ان کی جگہ خدمات انجام دینے والے مجاہدین اور ان کے معاونین کے واقعات نہایت خوب صورت زاویے اور محققانہ اسلوب میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہ لوگ مسلکاً اہل حدیث تھے۔ ان میں سے جو شخص جس کی کوشش سے اہل حدیث ہوا، اس کا ذکر فاضل مصنف نے خاص طور پر کیا ہے اور وضاحت کی ہے کہ اس شخص نے فلاں عالم کی تبلیغ یا اس کے عمل و کردار سے متاثر ہو کر مسلکِ اہل حدیث قبول کیا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اس زمانے کے برصغیر میں خالص کتاب وسنت کو مدارِ عمل ٹھہرانا اور اہل حدیث نقطۂ نظر کے دائرے میں داخل ہونا بہت مشکل تھا۔ دوست اور قریبی رشتے دار اس مسلک کو قبول کرنے والے کی شدید مخالفت کرتے اور اس کے درپے آزار ہو جاتے تھے۔

مولانا غلام رسول مہر کی یہ بات بالکل صحیح تھی۔ یہ آج سے کم وبیش دوسو سال قبل کی بات ہے۔ آج بھی جب زمانہ اتنی ترقی کر گیا ہے، بہت سے مقامات میں یہ ہی صورت حال ہے۔ لوگ جہالت کی گرفت اور بے سمجھی کے پنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔

اس کا اندازہ مولانا محمد احسن سلفی کے واقعاتِ زندگی سے کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے بدعات ومحدثات اور پیر پرستی کے حلقے سے نکل کر اہل حدیثیت کے دائرے میں قدم رکھا تو والد، چچا اور سب قریبی رشتے دار ان کے دشمن ہو گئے اور جو تکلیف انھیں پہنچا سکتے تھے، پہنچانے کی پوری کوشش کی اور کتاب وسنت پر عامل ہونے کی وجہ سے اس شخص کو حوادث کے سمندر میں دھکیل دیا گیا۔

آیے آئندہ سطور میں یہ معلوم کرنے کی سعی کرتے ہیں کہ انھوں نے کس طرح مسلک اہل حدیث

Marfat.com

اختیار کیا اور پھر اس کے کیا نتائج بھگتنا پڑے۔لیکن اس سے پہلے ان کے خاندان کے مذہبی پس منظر کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

محمد احسن کی ولادت ۲۳۔مارچ ۱۹۶۹ء کو قصبہ خان پہلا (تحصیل جلال پیر والا ضلع ملتان) میں ہوئی۔ ددھیال اور ننھیال کے سب لوگ بریلویت سے تعلق رکھتے اور ملتان کی مشہور گدی مولانا احمد سعید کاظمی کے وابستگان میں شمار کیے جاتے ہیں۔تمام خاندان میں محمد احسن سلفی واحد شخص ہیں جو اہل حدیث مسلک کے حامل ہیں۔

والدین نے پیدائش کے وقت ان کا نام رجب حسین رکھا تھا،لیکن بعد میں یہ محمد احسن کہلانے لگے۔

چھوٹے سائز کی ایک کتاب ''ہم اہل حدیث کیوں ہوئے؟'' شائع ہوئی ہے۔اس کے صفحہ ۱۸۹ سے ۱۹۶ تک مولانا محمد احسن سلفی کا تذکرہ خود ان کے اپنے الفاظ میں ہوا ہے۔اس میں بتایا گیا ہے کہ ان کے ددھیال ننھیال مزاروں پر جاتے، وہاں نذر و نیاز دیتے اور بکرے ذبح کرتے تھے۔یہ ان کے نزدیک نہایت پسندیدہ عمل تھا۔

مولانا بیان کرتے ہیں کہ تحصیل علی پور میں خیر پور سادات کی طرف جائیں تو راستے میں ایک درگاہ آتی ہے، جو ''محبّ پیر'' کے نام سے مشہور ہے۔ان کے سب رشتے دار وہاں جاتے ہیں۔یہ خود بھی کم عمری میں متعدد مرتبہ وہاں گئے۔اس درگاہ کی ایک خاص بات ایک بڑی کشتی ہے جو درگاہ کے ساتھ رکھی ہوئی ہے، اسے ''بیڑا'' کہا جاتا ہے۔درگاہ پر حاضری دینے والے تمام سائل اپنے اپنے مسائل پرچی پر لکھ کر اس کشتی میں ڈالتے ہیں۔اس کشتی کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ ہر جمعرات کو عشاء کی نماز کے بعد آسمان کی طرف چلی جاتی ہے اور جمعے کی صبح کو واپس آجاتی ہے۔جب واپس آتی ہے تو تمام سوالیوں کے مسائل کا حل اس میں موجود ہوتا ہے۔اس مزار پر خود ان کے رشتے داروں میں سے کتنے ہی لوگ سجدے بھی کرتے ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں: ''لیکن یہ اللہ کا خاص کرم ہے کہ اس زمانے میں بھی کبھی غیر اللہ کے سامنے سجدہ ریز نہیں ہوا۔''

مولانا محمد احسن سلفی ابتدائی زندگی ہی سے اہل حدیثیت سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے تھے۔اس کی موٹی موٹی مندرجہ ذیل وجوہ تھیں۔

ایک یہ کہ ان کے گھر میں وہابیوں کے خلاف گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور انھیں معلوم تھا کہ اہل حدیث کو بہ طور طنز ''وہابی'' کہا جاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ ان کے گھر سے بریلوی حضرات کی مسجد دور اور اہل حدیث کی مسجد قریب تھی اور اس

Marfat.com

مسجد میں ان کی آمد ورفت رہتی تھی۔

تیسری وجہ یہ کہ مقامی طور پر ان کے استاذ مولانا عبدالغفار محمدی تھے، جنھوں نے ان کی تھوڑے عرصے میں ایسی تربیت کی کہ معاملہ بالکل بدل گیا اور اہلِ حدیث مسلک کی صداقت ان کے ذہن میں پوری طرح جذب ہوگئی۔

مولانا ممدوح نے ابتدائی تعلیم دارالحدیث محمدیہ جلال پور پیروالا میں حاصل کی۔ اس دور کے ان کے اساتذہ کرام تھے (۱) مولانا سلطان محمود صاحب (۲) مولانا محمد رفیق اثری صاحب (۳) مولانا اللہ یار خاں صاحب (۴) مولانا عبدالرشید صاحب ریاستی اور (۵) مولانا عبداللہ جاوید صاحب

دارالحدیث محمدیہ جلال پوران کے آبائی مسکن قصبہ خاں بیلا سے بہت قریب ہے اوران کے رشتے دار اہل حدیثیت کی وجہ سے انھیں سخت پریشان کرتے اور ہدفِ تنقید ٹھہراتے تھے، اس لیے بعض اساتذہ کرام کے مشورے سے ۱۹۸۴ء میں ان کو دارالحدیث رحمانیہ (سولجر بازار کراچی) میں داخل کرادیا گیا۔ وہاں یہ ۱۹۸۷ء تک تین سال حصولِ علم میں مصروف رہے۔ اس اثنا میں انھوں نے جن اساتذہ حضرات کے سامنے زانوے شاگردی تہہ کیے، ان کے اسمائے گرامی مندرجہ تحت ہیں۔

۱۔ مولانا محمد افضل صاحب اثری

۲۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب چیمہ

۳۔ مولانا امان اللہ صاحب ناصر......اور

۴۔ مولانا غلام رسول صاحب

پھر یہ ۱۹۸۷ء میں جامعہ محمدیہ میں چلے گئے۔ وہاں ۱۹۸۸ء تک ایک سال قیام رہا۔ وہیں جامعہ محمدیہ میں مولانا محمد صدیق صاحب محمدی سے بخاری شریف پڑھی۔ دینیات کی تعلیم کے آخری سال کا امتحان جناب محترم المقام سید بدیع الدین شاہ صاحب راشدی نے لیا۔ اپنے دست مبارک سے دستار بندی بھی حضرت شاہ صاحب ممدوح نے کی اور سندِ فراغت پر دستخط بھی ثبت فرمائے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا محمد احسن سلفی مختلف مقامات میں تدریس وخطابت کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ آج کل جامعۃ الاحسان الاسلامیہ (کراچی) میں خدمت انجام دے رہے ہیں اور بیوی بچوں سمیت اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اب چند واقعات ملاحظہ ہوں جو انھیں کراچی جانے سے پہلے دورِ طالب علمی میں پیش آئے، اس دور کو ان کے لیے ''دورابتلاء'' سے تعبیر کرنا چاہیے۔

Marfat.com

☆...... ایک مرتبہ افرادِ خانہ نے ان کو نماز میں رفع یدین کرتے دیکھا تو پوچھا کیا تم اہل حدیث ہو گئے ہو؟

جواب دیا: مجھے نہیں معلوم اہل حدیث کیا ہوتا ہے۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ حدیث کی کتابوں میں نبی ﷺ کی نماز کا جو طریقہ بیان فرمایا گیا ہے، وہ یہ ہی ہے۔

یہ جواب سن کر ان کے چچا نے ان کے والد کو خبر دار کیا کہ یہ بچہ ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اگر اس پر سختی نہ کی گئی تو اس کا قابو میں آنا مشکل ہوگا۔ اس کے بعد ان کے چچا کے بیٹے نے کہا: بلند آواز سے سورہ فاتحہ سناؤ۔ انھوں نے سورہ فاتحہ سنانا شروع کی۔ جب ولا الضالین پر پہنچے تو دال کے تلفظ کے بجائے اسے ضاد کے تلفظ سے پڑھا تو اس نے ان کو جوتا مار کر کہا ''تو وہابی پلید تو ہو ہی گیا ہے، اب قرآن مجید بھی غلط پڑھنے لگا ہے''۔ والد صاحب نے بھی سخت غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ''جا آج سے تو میرا بیٹا نہیں ہے۔ جب تک واپس اپنے مذہب پر نہیں آجاتا، میں تجھے اپنا بیٹا نہیں مانوں گا۔''

انھوں نے کہا: ''آپ جو مرضی کہیں میں حق کو نہیں جھٹلا سکتا۔''

☆...... اس کے بعد ایک عالم دین مولانا احمد سعید صاحب کی کوشش سے یہ دارالحدیث پیروالا چلے گئے۔ وہاں تین سال تعلیم حاصل کرتے رہے، کبھی گھر جاتے تو سخت طعن و تشنیع کا نشانہ بنتے۔ چوروں کی طرح رات گئے گھر جاتے اور صبح صبح واپس جلال پور پیروالا پہنچ جاتے۔ والد صاحب اور دیگر افرادِ خانہ تو ڈانٹتے ہی تھے، دوسرے لوگ بھی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے تو والد صاحب پر مزید خفگی طاری ہو جاتی اور معاملہ بگڑ جاتا۔

☆...... ایک روز والد صاحب دارالحدیث جلال پور پیروالا پہنچے اور گفتگو میں ظاہر کیا کہ وہ بیٹے کی پڑھائی اور مسلک اہل حدیث کی قبولیت سے متعلق ''بالکل مطمئن ہیں''۔ اس قسم کی باتیں کر کے وہ انھیں گھر لے آئے اور پھر مارتے پیٹتے ہوئے کمرے میں بند کر دیا۔ اس سے کچھ دیر بعد والد صاحب اور بھائی اپنے کاموں کے سلسلے میں گھر سے چلے گئے تو یہ کمرے کا دروازہ توڑ کر وہاں سے بھاگے اور جلال پور پیروالا آگئے۔ انھوں نے تین سال جلال پور پیروالا کے دارالحدیث میں تحصیل علم کی اور اس عرصے میں تین سال ہی انھیں گھر میں آمد کے وقت کمرے میں بند کر کے مارا پیٹا گیا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ انھیں اگر پتا چل جاتا کہ جلال پور پیروالا میں ان کے قصبے کا کوئی شخص آیا ہے تو یہ فوراً کہیں چھپ جاتے تاکہ اس کی کڑوی کسیلی باتیں نہ سن سکیں۔

☆...... دارالحدیث جلال پور پیروالا میں انھیں تحصیل علم کرتے ہوئے تین سال ہو گئے تھے۔ ایک دن والد صاحب گئے اور ان کے استاذ مولانا عبدالغفار صاحب سے کہا کہ میرے بچے کو میرے ساتھ بھیج دو،

Marfat.com

میں اب اسے یہاں نہیں چھوڑ سکتا۔ چناں چہ وہ جبراً انھیں وہاں سے لے آئے اور بریلویوں کے مدرسے داخل کرا دیے گئے جس میں اس نواح کے مشہور بریلوی عالم مفتی اقبال صاحب طلبا کو تعلیم دیتے تھے۔ مفتی صاحب سے والد صاحب نے عرض کیا: حضرت جی میں اسے لے آیا ہوں، اب آپ اسے پڑھائیں۔ لیکن انھوں نے اس مدرسے میں پڑھنے سے انکار کر دیا۔

اسی اثنا میں مدرسے کے طلبا کہیں سے ختم درود پڑھ کر آئے اور چاول بھی لے آئے۔ مفتی اقبال صاحب نے ان کو اور والد صاحب کو چاول کھانے کے لیے کہا۔ والد صاحب نے تو چاول کھانا شروع کر دیے لیکن بیٹے محمد احسن نے یہ چاول کھانے سے انکار کر دیا۔ اس گستاخی پر والد صاحب نے انھیں تھپڑ مارا اور سخت ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا: تمھیں شرم نہیں آتی، یہ تبرک ہے اور حضرت کا حکم بھی۔ تم یہ تبرک کھانے سے کیوں انکار کر رہے ہو۔

یہ منظر دیکھ کر مفتی اقبال صاحب نے کہا: ''بابا جی اسے واپس لے جاؤ۔ جب تک اس کے پیٹ میں وہابیوں کا کھانا موجود ہے، یہ ہماری بات نہیں مانے گا۔'' لیکن والد صاحب نے مفتی صاحب کی منت سماجت کر کے محمد احسن کو اس مدرسے میں داخل کرا دیا۔ دوسرے دن ایک پولیس والے سے جس کا نام عبدالرحمٰن تھا یہ دھمکی بھی دلائی گئی کہ ''تمھارا داخلہ یہاں ہو چکا ہے، تم فارم پُر کر چکے ہو، اب تم یہاں سے نکلے تو پولیس کے ذریعے تمھیں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا جائے گا۔''

والد صاحب اپنے بیٹے محمد احسن کو مدرسے میں چھوڑ آئے اور ان کی وہاں سخت نگرانی کی جانے لگی کہ کہیں بھاگ نہ جائے۔ لیکن یہ بھاگنے کے لیے موقعے کی تلاش میں تھے۔

☆...... تیسرے دن مفتی اقبال صاحب طلبا کو ایک جگہ قرآن خوانی کے لیے لے گئے۔ ایک طالب علم نے جو نیا نیا مدرسے میں داخل ہوا تھا، مفتی صاحب سے کہا کہ میں نے تو قرآن مجید نہیں پڑھا، میں وہاں جا کر کیا کروں گا۔ مفتی صاحب نے فرمایا: کوئی بات نہیں تم ہمارے ساتھ چلو۔ وہاں پہنچے تو سب کے ہاتھ میں ایک ایک پارہ پکڑا دیا گیا۔ کوئی پڑھ سکتا ہے یا نہیں، بس پارہ لیے بیٹھا ہے۔ محمد احسن کہتے ہیں: ''میں ابھی صرف ایک پاؤ پڑھ سکا تھا کہ سب سے پارے لے لیے گئے اور قرآن خوانی ختم ہو گئی۔ صاحب خانہ نے کھانے کا کہا تو مفتی صاحب بولے بچے کھانا کھا چکے ہیں۔ آپ پیسے دے دیں۔ مفتی صاحب نے پیسے لے کر جیب میں ڈالے اور مدرسے آ گئے۔''

☆...... اس مدرسے میں محمد احسن سلفی کو داخل ہوئے چار دن ہوئے تھے کہ شب برات کی چھٹی ہوئی اور سب طالب علم اپنے گھروں کو چلے گئے اور محمد احسن وہاں سے نکل کر دارالحدیث جلال پور پیر والا جا پہنچے۔

Marfat.com

اس کے بعد کراچی کو روانہ ہو گئے اور دارالحدیث رحمانیہ میں داخلہ لے لیا۔ فرماتے ہیں: ''دارالحدیث سے جو وظیفہ ملتا، اسی سے کسی نہ کسی طرح گزارا کرتا۔ میرا جذبہ یہ تھا کہ کسی طرح کامیاب ہو جاؤں، کیوں کہ مشرکوں سے مقابلہ کرنا ہے۔''

☆...... جب ان کے رشتے داروں اور گھر والوں کو تعلیم کے لیے محمد احسن سلفی کے کراچی جانے کا پتا چلا تو ان کے چچا نے اپنے بیٹے کو مفتی اقبال صاحب کے مدرسے میں داخل کرا دیا، ان کا مقصد محمد احسن کے مقابلے کے لیے اپنا عالم بیٹا تیار کرنا تھا۔ چناں چہ انھوں نے اس مدرسے کے نصاب کے مطابق تعلیم حاصل کی۔

☆...... ایک مرتبہ ان کے اس چچا زاد عالم بھائی نے ان سے سوال کیا کہ شاہ اسماعیل دہلوی کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟

جواب دیا: وہ موحد اور مجاہد عالم دین تھے۔

انھوں نے کہا: ہمارے نزدیک وہ کافر تھے۔

کہا: اس قدر سنگین فتویٰ تم ان پر کس بنا پر لگا رہے ہو؟

کہا: اس لیے کہ شاہ اسماعیل نے کہا ہے کہ پوری دنیا اور اس میں جو کچھ بھی ہے، اللہ کے سامنے چمار سے بھی زیادہ ذلیل ہے، جب کہ پوری کائنات میں انبیاء بھی آتے ہیں اور انبیاء کو ذلیل کہنے والا کافر ہوا، لہٰذا شاہ اسماعیل کافر ہوئے۔

جواب دیا: ان کا مقصد یہ ہے کہ پوری دنیا اور اس کی ہر شے اللہ تعالیٰ کے سامنے کمزور اور بے حیثیت ہے۔

کہا: تمھارے علمائے اہل حدیث بھی اللہ کے سامنے ذلیل ہیں؟

جواب دیا: بلا استثناء ہر مخلوق اور ہر چیز اللہ کے سامنے کمزور و ناتواں ہے۔

☆...... مولانا محمد احسن سلفی فرماتے ہیں: ''خاندان میں میرا عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔ بات بات پر مجھے طنز و استہزا کا نشانہ بنایا جاتا اور ہر طرح مخالفت کی جاتی۔ والد صاحب نے اپنی وراثت سے بھی کوئی حصہ دینے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے اپنے کسی مولوی صاحب سے پوچھا تو انھوں نے فتویٰ دیا کہ بخاری شریف کی حدیث ہے کہ کوئی کافر مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا، جب کہ بریلوی اور اہل حدیث ایک دوسرے کو کافر کہتے ہیں، اس لیے وراثت میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔''

☆...... جب والد صاحب نے ان کو وراثت میں سے کچھ دینے سے انکار کر دیا اور باہمی میل جول کا سلسلہ

Marfat.com

بھی نہ رہا تو ان کا اپنے آبائی مسکن خان بیلا جانے کا سلسلہ بہت کم ہو گیا۔ کبھی جاتے تو مولانا عبدالغفار محمدی کے ہاں قیام کرتے۔ اب انھیں ضرورت محسوس ہوئی کہ یہاں اپنا مکان بنانا چاہیے۔ مولانا عبدالغفار محمدی کے قریب ان کے چچا کا پلاٹ تھا جو وہ فروخت کرنا چاہتے تھے۔ مولانا عبدالغفار محمدی نے ان سے پلاٹ خریدنے کی بات کی اور کہا کہ یہ پلاٹ مولانا محمد احسن خریدنا چاہتے ہیں۔ ان کا نام سنا تو انکار کر دیا۔ پھر مان گئے لیکن اس کی قیمت دوگنا مانگی جو اٹھائیس ہزار دو سو دس روپے بنتی تھی۔ اتنی رقم ان کے پاس نہیں تھی۔ بہرحال پانچ ہزار روپے بہ طور پیشگی ادا کیے اور ۲۳ ہزار دو سو دس روپے ادا کرنے کے لیے ایک سال کی مدت مقرر ہوئی، لیکن ابھی دو مہینے ہی گزرے تھے کہ چچا صاحب نے باقی رقم کا مطالبہ کر دیا۔ اگر رقم ادا نہیں کر سکتے تو پلاٹ چھوڑ دو۔ یہ بڑی پریشان کن بات تھی۔ لیکن اللہ نے مہربانی فرمائی اور بھاگ دوڑ کے بعد پوری رقم ادا کر دی گئی۔

جس طرح آج سے دو سو سال پہلے اہل حدیث حضرات کو پریشان کیا جاتا تھا، کسی نہ کسی انداز میں وہ سلسلہ اب بھی بعض مقامات میں جاری ہے۔

مولانا محمد احسن سلفی اہل و عیال سمیت کراچی میں اقامت فرما ہیں اور ماشاء اللہ کتاب و سنت کی احسن طریقے سے خدمت کر رہے ہیں۔ جامعۃ الاحسان الاسلامیہ کی نظامت بھی ان کے سپرد ہے اور اللہ کے فضل سے بعد عسر یسرا کا معاملہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کا حامی و ناصر ہو۔ آمین یارب العالمین۔

(یہ سطور ۱۹۔ جولائی ۲۰۱۴ء کو لکھی گئیں۔)

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا ندیم شہباز

(ولادت ۷؍جولائی ۱۹۶۹ء)

مولانا ندیم شہباز کے آباواجداد قیام پاکستان کے زمانے میں ضلع امرتسر کے ایک مقام جنڈیالا میں مقیم تھے۔اگست ۱۹۴۷ء میں وہاں سے لائل پور (فیصل آباد) آئے۔شیخ برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ندیم شہباز کے دادا کا نام عبدالعزیز تھا۔لیکن عزیز دین کے نام سے معروف تھے۔وہ لوہے کے ٹب اور بڑے برتن بغیر جوڑ کے بناتے تھے۔اس دور میں فیصل آباد اور اس کے نواح میں یہ پہلے شخص تھے، جنھوں نے یہ کام شروع کیا۔

ندیم شہباز کے والد کا اسم گرامی عبدالرشید تھا۔وہ کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔۱۹۹۹ء میں فوت ہوئے۔

ندیم شہباز کے ایک بھائی گورنمنٹ کالج سمندری میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ایک فیصل آباد میں ملازمت کرتے ہیں اور خود ندیم شہباز جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں مدرس ہیں۔

اب آئیے ندیم شہباز کی تعلیم کی طرف۔انھوں نے ایک قاری صاحب سے قرآن مجید پڑھا اور سکول میں مڈل تک تعلیم حاصل کی۔اس کے بعد مولانا عبدالرحمٰن راسخ مرحوم کے مشورے سے ۱۹۸۰ء میں جامعہ اسلامیہ (گوجراں والا) میں داخلہ لیا۔وہاں ۱۹۸۷ء تک سات سال تعلیم حاصل کی اور سند فراغ لی۔جن اساتذہ کرام کے حضور وہاں زانوے ادب تہہ کیے وہ تھے حضرت مولانا حافظ محمد گوندلوی، مولانا ابوالبرکات مدراسی، مولانا محمد اعظم اور قاری محمد یحییٰ بھوجیانی۔یہ سب حضرات اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

جامعہ اسلامیہ میں بقول ان کے مولانا ابوالبرکات اپنے استاد گرامی حضرت حافظ محمد گوندلوی کا بہ درجہ غایت احترام کرتے تھے۔وہ جامعہ میں تشریف لاتے تو مولانا ممدوح آگے بڑھ کر ان کے جوتے اٹھاتے، ان کے پاؤں دابتے، ان کی ٹانگیں دابتے اور ہر طرح انھیں آرام پہنچانے کی کوشش کرتے اور فرماتے حضرت میرے استاد ہیں، ان کی خدمت کرنا میرا فرض ہے۔اس احترام وتکریم ہی کا نتیجہ ہے کہ خود مولانا ممدوح کو اللہ تعالیٰ نے نہایت اکرام سے نوازا ہے اور علما وطلبا کے حلقوں میں انھیں بے پناہ اعزاز حاصل ہوا۔

جامعہ اسلامیہ سے ندیم شہباز جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) چلے گئے۔وہاں مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی، مولانا محمد عبدہ الفلاح، پروفیسر غلام احمد حریری، مولانا ثناء اللہ ہوشیارپوری اور بعض دیگر حضرات سے اخذ فیض

Marfat.com

کیا۔ ستیانہ بنگلہ کے مرکز الدعوۃ السّلفیہ میں حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کے دورہ تفسیر میں شرکت کی اور ان سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ اساتذہ کی فہرست میں مولانا حافظ محمد امین اور حافظ محمد الیاس اثری کے نام بھی شامل ہیں۔

تعلیم کے دوران ہی میں میٹرک اور ایف اے کے امتحانات دیئے۔ قرآن مجید از خود چھ ماہ میں حفظ کیا۔ وفاق المدارس السّلفیہ کا امتحان بھی دیا۔

۱۹۹۴ء میں پروفیسر ساجد میر کی کوشش سے مدینہ یونیورسٹی میں داخلے کی سعادت حاصل ہوئی۔ وہاں کلیۃ الشرعیہ میں چار سال تعلیم حاصل کی اور اس کا نصاب مکمل کر کے سند لی۔ اس کے بعد مصر کی جامعہ ازہر میں جانے اور اس میں حصول علم کا ارادہ کیا تو مولانا ابوالبرکات نے وہاں جانے سے منع فرما دیا۔

۱۹۹۷ء میں جامعہ سلفیہ میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا جو اللہ تعالیٰ کے بے پایاں کرم سے اب تک جاری ہے۔ یعنی کم وبیش پندرہ سال سے جامعہ سلفیہ میں یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ۱۹۹۸ء سے مسجد عمر سول لائن (فیصل آباد) میں خطبہ جمعہ ارشاد فرما رہے ہیں۔ اس سے قبل چار سال مغل پورہ (لاہور) کی ایک مسجد میں جمعہ پڑھاتے رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ انھیں خوش رکھے، بڑے محنتی استاد ہیں۔ مجھے ان سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں۔ اگر ان سے ملاقات یا گفتگو کا موقع ملا ہوتا تو ان کا حلیہ وغیرہ لکھنے کی کوشش کرتا۔

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا لیاقت علی باجوہ فیروز پوری

(ولادت ۱۲-فروری ۱۹۷۰ء)

میں اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ لیاقت علی باجوہ اپنے نام کے ساتھ چوں کہ ''فیروز پوری'' لکھتے ہیں، وہ ضلع فیروز پور کے کسی مقام یا شہر فیروز پور کے رہنے والے ہوں گے جو مشرقی پنجاب میں دریائے ستلج کے ہیڈ حسینی والا سے چار میل آگے ہے۔ اس شہر اور ضلعے میں بے شمار علما پیدا ہوئے، جنھوں نے بے حساب تدریسی اور تصنیفی خدمات سر انجام دیں۔ اس شہر اور علاقے سے اس سطور کے راقم کا تعلق بھی رہا ہے، طالب علمانہ بھی، تدریسی بھی، سیاسی بھی۔

یہ پنجاب کا ایک بڑا شہر ہے۔ اس کی بہت بڑی فوجی چھاونی ہے جو ''فیروز پور چھاونی'' کے نام سے مشہور ہے۔ وہاں ایک بہت بڑا قلعہ بھی ہے، جس میں قبل از تقسیم ملک دن رات جنگی اسلحہ تیار ہوتا تھا اور سیکڑوں بلکہ ہزاروں لوگ اس میں کام کرتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ لیاقت علی کا آبائی تعلق اسی علاقے کے کسی مقام سے ہوگا اور ان کے آبا و اجداد تقسیم ملک کے زمانے میں وہاں کی سکونت ترک کر کے پاکستان آ بسے ہوں گے، لیکن اب پتا چلا کہ لیاقت علی باجوہ کی ''فیروز پوری'' نسبت خالص ''پنڈوانہ'' نسبت ہے، میرے خیال کردہ فیروز پور شہر یا علاقے سے اس کا دور ونزدیک کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

بہر کیف لیاقت علی باجوہ ۱۲-فروری ۱۹۷۰ء کو ضلع نارووال کی تحصیل ظفر وال کے ایک گاؤں فیروز پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام احمد دین تھا جو بالکل ان پڑھ تھے، لیکن اس گاؤں کے پہلے شخص تھے، جنھوں نے مسلکِ اہل حدیث اختیار کیا اور اس کے نتیجے میں انھیں وہابی کہا جانے لگا اور برادری کے سب لوگوں نے ان سے تعلقات منقطع کر لیے۔ کچھ عرصہ یہ سلسلہ جاری رہا، پھر آہستہ آہستہ معاملات ٹھیک ہو گئے۔

اب سوال یہ ہے کہ لیاقت علی باجوہ نے دینی تعلیم کیسے حاصل کی؟

انھوں نے ایک سرکاری سکول سے مڈل پاس کیا اور پھر میٹرک کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ بعد ازاں ظفر وال کے کالج میں داخل ہوئے۔ ایف اے کے دوسرے سال یعنی بارھویں جماعت میں تھے کہ ۱۹۸۶ء میں ان کے گاؤں کے قریب کے ایک گاؤں ''جیو کے ٹھیٹھر'' میں مولانا حبیب الرحمٰن یزدانی تشریف

Marfat.com

لائے اور وہاں تقریر کی۔ ان کی تقریر سے یہ اتنے متاثر ہوئے کہ ایف اے پاس کرنے بعد کسی مدرسے میں دینی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ وہی مولانا حبیب الرحمٰن یزدانی ہیں جنھوں نے ۲۳-مارچ ۱۹۸۷ء کو لاہور کے علاقہ قلعہ لچھمن سنگھ میں جماعت اہل حدیث کے ایک جلسے میں بم دھماکے سے جام شہادت نوش کیا۔ دھماکے سے جماعت کے دس آدمیوں نے شہادت پائی، جن میں علامہ احسان الٰہی ظہیر، مولانا عبدالخالق قدوسی، مولانا حبیب الرحمٰن یزدانی شامل تھے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔ متعدد حضرات شدید زخمی ہو گئے تھے۔ یہ بہت بڑا حادثہ تھا جس سے جماعت اہل حدیث دوچار ہوئی اور اپنے متعدد جلیل المرتبت اصحابِ علم سے محروم ہو گئی۔

میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ مولانا حبیب الرحمٰن یزدانی کی تقریر سے اثر پذیر ہو کر لیاقت علی باجوہ نے دینی تعلیم کے حصول کا جو فیصلہ کیا اس پر عمل بھی کیا۔ انھوں نے سیالکوٹ کی جامعہ ابراہیمیہ میں داخلہ لیا۔ ۱۹۹۳ء تک اس میں تعلیم حاصل کرتے رہے اور سندِ فراغ لی۔ وفاق المدارس السّلفیہ کا امتحان بھی دیا۔ فاضل عربی بھی کیا۔ گوجراں والا بورڈ سے بی اے پاس کیا اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اردو کیا۔

دینی علوم کی تعلیم انھوں نے حافظ عبدالمجید، مولانا محمد مدنی جہلمی، مولانا محمد علی جانباز اور مولانا عطاء الرحمٰن اشرف سے حاصل کی۔ رحمۃ اللہ علیہم۔ ''صحیح بخاری'' مولانا محمد علی جانباز اور حافظ عبدالمجید سے پڑھی۔ دورۂ تفسیر مولانا عبدالحمید سے بھوپال والا میں ۱۹۹۴ء میں کیا۔

ان کے رفقائے درس میں حافظ محمد اسلم شاہدروی، عبدالحلیم جانباز اور مولانا محمد بن عطاء الرحمٰن اشرف سیالکوٹی کے نام قابل ذکر ہیں۔

ایک واقعہ سنیے! ۱۹۹۰ء کی بات ہے لیاقت علی باجوہ کا طالب علمی کا زمانہ تھا۔ ایک مرتبہ جمعرات کے دن وہ اپنے گاؤں آئے۔ ان دنوں اس گاؤں میں صرف بریلوی حضرات کی مسجدیں تھیں۔ یہ مسجد میں عصر کی نماز پڑھنے گئے۔ مسجد کے امام صاحب نہیں آئے تھے، نمازی آ گئے تھے اور جماعت کا وقت ہو گیا تھا۔ نمازیوں نے ان کو جماعت کرانے کے لیے کہا۔ یہ جماعت کرانے لگے۔ آخری رکعت میں کھڑے تھے کہ امام صاحب تشریف لے آئے۔ آتے ہی اونچی آواز میں نمازیوں سے کہنا شروع کر دیا۔ سلام پھیر دو، سلام پھیر دو۔ وہابی کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔ امام کے کہنے پر نمازیوں نے سلام پھیر دیا، لیکن انھوں نے نماز مکمل کی۔ اس کے بعد امام صاحب ان سے لڑنے لگے اور پابندی لگا دی کہ تم آئندہ ہماری مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے نہیں آ سکتے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے درس و تدریس اور خطابت کا سلسلہ شروع کیا۔ کچھ عرصہ نڈالی ورکاں میں یہ خدمت انجام دی اور کچھ عرصہ ضلع گوجراں والا کے موضع قاضی کوٹ رہے۔ بعد ازاں ضلع

Marfat.com

سیالکوٹ کے موضع کوٹلی لوہاراں مغربی تشریف لے گئے۔ وہاں سولہ سترہ سال سے تدریس و خطابت میں مصروف ہیں۔ لیکن اس ایم اے پاس اور دینیات کے فاضل مدرس و خطیب کو ماہانہ تنخواہ کیا ملتی ہے؟ ساڑھے چار ہزار (یا شاید پانچ ہزار) روپے۔ اس کے برعکس مزدور چودہ پندرہ ہزار روپے ماہانہ کماتا ہے۔

مولانا لیاقت علی باجوہ مضمون نویس بھی ہیں۔ ان کے مضامین ہفت روزہ ''الاعتصام''، ہفت روزہ ''اہل حدیث''، ہفت روزہ ''تنظیم اہل حدیث''، ''ضیاے حدیث''، ''صحیفہ اہل حدیث''، ماہنامہ ''تفہیم الاسلام'' (احمد پور شرقیہ) اور دیگر رسائل و جرائد میں چھپتے رہتے ہیں۔

انھیں مطالعہ کا شوق ہے لیکن اس تنخواہ میں کتاب خرید نہیں سکتے۔ کسی کتاب کی ضرورت ہو تو سائیکل پر بارہ کلومیٹر کا سفر کر کے سیالکوٹ مولانا محمد علی جانباز مرحوم کی لائبریری میں آتے ہیں۔ پھر ظہر کی نماز تک واپس چلے جاتے ہیں، کیوں کہ وہاں جماعت کرانی ہوتی ہے۔

یہ سطور ۳۰-نومبر ۲۰۱۲ء کو لکھی گئی ہیں۔ اب تک ان کے مطبوعہ مضامین کی تعداد ان کے بقول تقریباً دو سو کو پہنچ گئی ہے۔

❀❀❀❀

Marfat.com

ڈاکٹر عتیق الرحمٰن

(ولادت ۱۹۔ نومبر ۱۹۷۱ء)

ڈاکٹر عتیق الرحمٰن کے والد کا نام غلام اللہ اور دادا کا محمد یوسف تھا۔ ۱۹۔ نومبر ۱۹۷۱ء کو فیصل آباد کے علاقہ سمن آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حکیم عبدالرحیم اشرف مرحوم کی قائم کردہ جامعہ تعلیمات اسلامیہ (فیصل آباد) میں حاصل کی۔ وہاں کے اساتذہ میں اس وقت مولانا عبدالرحمٰن آزاد، مولانا عبدالرحمٰن طاہر ملتانی، مولانا ابراہیم خلیل فضلی اور حکیم ثناء اللہ ثاقب شامل تھے۔ ۱۹۸۳ء میں جامعہ سلفیہ میں داخلہ لیا اور ۱۹۹۱ء میں وہاں سے فراغت پائی۔ اس اثنا میں میٹرک کا امتحان بھی دیا اور فاضل عربی کا بھی، پھر ایف اے کا امتحان بھی دیا، تینوں میں کامیابی حاصل کی۔ جامعہ سلفیہ سے فراغت کے ساتھ ہی وفاق المدارس السّلفیہ میں عالیہ کا امتحان دیا اور پورے بورڈ میں اول پوزیشن حاصل کی۔

ان کے جامعہ سلفیہ کے اساتذہ میں مندرجہ ذیل حضرات شامل تھے۔

(۱) حافظ عبدالعزیز علوی (۲) حافظ محمد شریف (۳) چودھری یاسین ظفر (۴) مولانا محمد یونس بٹ (۵) مولانا ثناء اللہ ہوشیارپوری (۶) مولانا علی محمد حنیف سلفی (۷) مولانا محمد اسماعیل مالدیپی (۸) مولانا حبیب الرحمٰن خلیق (۹) مولانا داؤد مدنی (۱۰) مولانا محمد اسماعیل (۱۱) پروفیسر غلام احمد حریری۔ ان میں سے بعض حضرات وفات پاچکے ہیں اور بعض زندہ ہیں۔ فوت شدگان کی اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور زندوں کو اپنے دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی توفیق بخشے۔

جامعہ سلفیہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد تین سال وہاں کے مجلّہ ''ترجمان الحدیث'' کے مینجر کے طور پر کام کیا۔ پھر ۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۶ء تک تین سال جامعہ میں تدریس کی۔ ۱۹۹۶ء ہی میں تدریس کے دوران مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ ہوگیا۔ چناں چہ یہ مدینہ منورہ پہنچے اور کلیۃ الشریعہ میں داخل ہوئے۔ یہ چار سال کا کورس تھا جو مکمل کیا۔ ہر سال امتحان میں ممتاز پوزیشن میں کامیابی حاصل کی۔ جس کا ایک ہزار ریال انعام ملتا تھا۔

کلیہ کے بعد ۲۰۰۰ء۔ ۲۰۰۱ء میں ایم اے میں داخلہ ملا، جسے وہاں ماجستیر کہا جاتا ہے، ایم اے میں انھوں نے وراثت کے موضوع کی مشہور کتاب ''السراجی'' کی شرح ''ضوء السراج'' (تصنیف محمود بن ابوبکر

Marfat.com

الکلاباذی متوفی ۳۸۰ھ) پر تحقیقی مقالہ لکھا۔ اس کے بعد ڈاکٹریٹ کا معاملہ درپیش تھا۔ اس میں ۲۰۰۶ء میں داخلہ ملا اور ''احکام الجمع فی الفقہ الاسلامی'' کے عنوان سے مقالہ لکھا اور فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئے۔ مدینہ یونیورسٹی سے ۲۰۱۲ء میں فراغت پائی۔

۲۰۱۳ء کے اگست میں جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) آ گئے اور تدریسی خدمات انجام دینا شروع کیں۔

مدینہ یونیورسٹی کے کلیہ شریعہ سے یہ ۲۰۰۰ء میں فارغ ہوئے تھے۔ اسی سال کے ماہ جولائی میں فیصل آباد کے محلہ مومن آباد میں مولوی محمد یونس کی صاحب زادی سے ان کی شادی ہوئی۔ یہ سطور ۲۸۔ نومبر ۲۰۱۳ء کو لکھی جا رہی ہیں۔ ان کی اولاد دو بیٹے ہیں اور دو بیٹیاں۔

گزشتہ سطور میں ہم ڈاکٹر عتیق الرحمٰن کے ان اساتذہ کے اسمائے گرامی سے مطلع ہو چکے ہیں، جن سے انھوں نے فیصل آباد کی جامعہ تعلیمات اسلامیہ اور جامعہ سلفیہ میں اخذِ فیض کیا، اب ذیل میں مدینہ یونیورسٹی کے چند اساتذہ کے نام ملاحظہ ہوں۔

۱۔ شیخ عبدالمحسن العباد: ان کا شمار علمائے سلف میں ہوتا ہے۔ اور یہ مسجد نبوی میں درس حدیث دیتے ہیں۔

۲۔ شیخ سلیمان سلیم اللہ الرجیلی

۳۔ ڈاکٹر عبدالمحسن الحنیف: یہ ڈاکٹر عتیق الرحمٰن کے ایم اے کے مقالے کے مشرف یعنی سپر وائزر تھے۔

۴۔ شیخ عبدالکریم الصنیتان العمری

۵۔ ڈاکٹر عبدالعزیز الاحمدی

۶۔ ڈاکٹر عبداللہ بن معتق السہیلی

۷۔ ڈاکٹر حمود المبارکی

۸۔ ڈاکٹر محمد بن ناصر السحیبانی

۹۔ ڈاکٹر عبدالعزیز الطریقی

۱۰۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن السلیمی

اب آتے ہیں ڈاکٹر عتیق الرحمٰن کی تقریر و خطابت کی طرف۔

انھوں نے جو پہلی تقریر کسی مجلس میں کی، وہ ان کے چچا اور استاذ مولانا حبیب الرحمٰن خلیق نے لکھ کر دی تھی۔ اس تقریر کا عنوان تھا، ''آداب مجلس''۔ دوسری تقریر ایک تقریری مقابلے میں کی تھی، یہ تقریر فیصل آباد کے ایک سرکاری سکول کے عربی ٹیچر مولانا عبدالحق نور پوری نے لکھی تھی، اس کا انھیں اول انعام ملا تھا۔

جامعہ سلفیہ سے فراغت کے کچھ عرصے بعد جامعہ ہی میں ان کی تدریس کا آغاز ہو گیا تھا۔ اسی زمانے

Marfat.com

میں موضع ''نواں لاہور'' جھنگ روڈ پر خطبۂ جمعہ دینے لگے تھے۔ یہ سلسلہ تقریباً چار سال جاری رہا اور ان کے سعودی عرب جانے پر منقطع ہوا۔

پھر مدینہ یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران سعودی عرب کے تبلیغی ادارے (جالیات) کے تحت وہاں کے مختلف مقامات میں ہفتہ وار پروگراموں میں شرکت کرتے رہے۔ وہاں ان کا قیام تقریباً نو سال رہا اور اتنا ہی عرصہ ان کے تبلیغی پروگرام جاری رہے۔ ان تبلیغی اجتماعات میں نبی ﷺ کی سیرت طیبہ بیان کی جاتی تھی، قرآن مجید کے آخری پارے کے ترجمہ وتفسیر سے متعلق گفتگو کی جاتی تھی اور روزانہ پیش آنے والے مسائل واحکام کی وضاحت کی جاتی تھی۔

مدینہ یونیورسٹی کے زمانۂ تعلیم میں چار سال (۲۰۰۸ء سے ۲۰۱۲ء تک) ایک ہندوستانی رفیق مولانا مظفر الاسلام کی رفاقت میں دارالحدیث مدینہ کی جامعہ مسجد میں ہر جمعۃ المبارک کی نماز کے بعد عصر تک ان کو درس دینے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔

۲۰۰۹ء سے ۲۰۱۲ء تک یعنی تین سال یہ شرف بھی ان کے حصے میں آیا کہ موسمِ حج کے موقع پر مسجد نبوی میں ریاض الجنہ کے قریب عصر سے مغرب تک اردو جاننے والے حجاج کے لیے تقریباً ایک گھنٹا ان کا درس جاری رہتا تھا۔ پھر کم وبیش پون گھنٹا سوال وجواب کا سلسلہ چلتا۔

پانچ سال یہ مدینہ یونیورسٹی کے ایک ادارے عمادہ خدمۃ المجتمع کے مرکز تعلیم المستمر لغیر الناطقین بالفقہ العربیہ میں تدریسی خدمت سرانجام دیتے رہے ہیں۔

مدینہ یونیورسٹی میں دو سال (۲۰۱۱ء......۲۰۱۲ء میں) ان کو پی ایچ ڈی کے دو سمیسٹرز میں پڑھانے کا موقع ملا۔

آج کل جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں فرائض تدریس انجام دے رہے ہیں اور جمعۃ المبارک سرگودھا کی مرکزی جامع مسجد اہل حدیث بلاک نمبر ۱۹ میں پڑھاتے ہیں۔

(یہ سطور ۲۹۔ نومبر ۲۰۱۳ء کو لکھی گئیں۔)

❀❀❀❀

Marfat.com

مولانا عبدالحلیم علوی

(ولادت جون ۱۹۷۳ء)

صاحب ترجمہ مولانا عبدالحلیم علوی، حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی کے صاحب زادے ہیں۔ جون ۱۹۷۳ء میں بمقام چک نمبر ۳۶ گ ب (ضلعفیصل آباد) پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بعض مدارس میں حاصل کی۔ پھر ۱۹۸۸ء میں جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن بھیج دیے گئے۔ یہاں انھوں نے پہلی جماعت کی نصابی کتابیں پڑھیں۔

اس وقت ان کے والد حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی کلیۃ القرآن والحدیث فیصل آباد میں خدمت تدریس انجام دے رہے تھے۔ انھوں نے عبدالحلیم کو وہیں بلا لیا اور پہلی جماعت کا امتحان لے کر دوسری جماعت میں داخلہ ہوا۔ پھر درس نظامی کی تمام متداول کتابیں وہیں پڑھیں۔ ۱۹۹۵ء میں فارغ التحصیل ہوئے اور اول پوزیشن حاصل کی۔ فراغت کے بعد انھیں کلیۃ القرآن والحدیث ہی میں مدرس مقرر کر لیا گیا۔ اگست ۲۰۱۲ء تک وہاں پڑھاتے رہے۔ پھر ستمبر ۲۰۱۲ء میں جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن چلے گئے۔ یہ سطور ۳/ مارچ ۲۰۱۳ء کو ضبط تحریر میں لائی گئی ہیں۔ مولانا عبدالحلیم علوی آج تک جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن میں مشغول درس و تدریس ہیں۔

خطبہ جمعۃ المبارک جھنگ روڈ (فیصل آباد) کی مسجد الاشرف میں دیتے ہیں۔

مولانا عبدالحلیم علوی کے چھوٹے بھائی حافظ عبدالرحیم علوی ہیں جو ۱۹۷۴ء میں چک نمبر ۳۶ میں پیدا ہوئے۔ وہ باقاعدہ درس نظامی کی تکمیل تو نہیں کر سکے البتہ قراءت و تجوید کے ساتھ قرآن مجید کے حافظ ہیں۔

آج کل چیچہ وطنی کے مدرسہ تحفیظ القرآن میں خدمت انجام دے رہے ہیں۔

عبدالرحیم علوی سے چھوٹے حافظ عبدالکریم علوی ہیں، جو ۱۰۔ جنوری ۱۹۹۶ء کو بمقام چک نمبر ۳۶ گ ب پیدا ہوئے۔ انھوں نے بھی قرآن مجید حفظ کیا، قراءت و تجوید کا فن بھی کسی حد تک سیکھا، آج کل گاؤں ہی میں ہیں اور اپنی ذاتی زمین میں کاشت کاری میں مصروف ہیں۔

❀❀❀❀

Marfat.com

ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

(ولادت ۲۸۔نومبر ۱۹۷۳ء)

کشیدہ قامت، نکھرا ہوا گندمی رنگ، موٹی آنکھیں، کھلی پیشانی، صاف کلام، صحت مند جوان، ملنسار، بڑوں کے قدردان، علم وعمل میں اپنے اسلاف کا نمونہ، خوش اطوار وخوش اخلاق۔ یہ ہیں حافظ ڈاکٹر حسن مدنی۔ حافظ عبدالرحمٰن مدنی کے فرزند دلبند اور مولانا حافظ محمد حسین روپڑی کے حفید سعادت مند۔ ۲۸۔نومبر ۱۹۷۳ء کو بمقام جامعہ لاہور الاسلامیہ ایل، او، ایس ڈپو فیروز پور روڈ لاہور ان کی ولادت ہوئی۔

ماشاء اللہ یہ دس بہن بھائی ہیں، چار بھائی اور چھے بہنیں۔حسن مدنی چار بھائیوں میں سے دوسرے نمبر پر اور دس بہن بھائیوں میں سے چوتھے نمبر پر۔سب بہن بھائی حفاظ قرآن، چاروں بھائی جامعہ الاسلامیہ سے درس نظامی کی تکمیل کر چکے ہیں۔ان کے بہنوئیوں نے بھی مختلف مدارس سے دینی تعلیم مکمل کی۔ چاروں بھائی اور دو بہنیں علومِ اسلامیہ میں پی ایچ ڈی کے سند یافتہ ہیں۔

خاندانی روایت کے مطابق حسن مدنی نے حصولِ علم کا آغاز حفظِ قرآن سے کیا۔ساڑھے آٹھ سال کی عمر میں ۱۹۸۲ء میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔اس کے بعد تراویح میں سنانا شروع کیا اور ہر سال بالالتزام سنا رہے ہیں۔ان سطور کی ترقیم (اپریل ۲۰۱۴ء) تک سولہ مرتبہ سنا چکے ہیں۔

حفظِ قرآن کے بعد سکول میں چھٹی جماعت سے آٹھویں تک تعلیم حاصل کی۔ آٹھویں جماعت کا امتحان بورڈ میں دیا اور اول پوزیشن حاصل کی۔اس کے بعد مارچ ۱۹۸۶ء میں جامعہ لاہور الاسلامیہ میں داخلہ لیا اور ۱۹۹۲ء میں دینی تعلیم مکمل کی، جسے درس نظامی کہا جاتا ہے۔

جامعہ کی تعلیم کے آخری سال بخاری شریف حافظ ثناء اللہ مدنی سے پڑھی۔علم الفرائض بھی ان ہی سے پڑھا۔ان کے علاوہ دیگر اساتذہ کرام کی جو فہرست انھوں نے مجھے دی اس میں مولانا محمد رمضان سلفی، مولانا محمد شفیق مدنی، مولانا سعید مجتبیٰ سعیدی، مولانا زید احمد، مولانا عبدالرشید راشد، مولانا عبدالرشید خلیق، قاری عبدالحلیم اور قاری محمد ابراہیم میر محمدی کے اسمائے گرامی درج ہیں۔ممکن ہے طالب علمی کے سات سالہ دور میں ان حضرات کے علاوہ بھی کسی صاحب سے استفادہ کیا ہو، لیکن ان کی تحریر کردہ فہرست میں یہی نام مندرج ہیں۔

Marfat.com

۱۹۹۲ء میں جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں مدینہ یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام آل پاکستان دورہ لغۃ تدریبیہ کا انعقاد ہوا، جس میں حافظ حسن مدنی نے بھی شرکت کی اور اول انعام کے حق دار قرار پائے۔

جامعہ لاہور الاسلامیہ کی تعلیم کے دوران ہی میں حافظ حسن مدنی نے میٹرک، ایف اے، بی اے اور ایم اے کے پرائیویٹ امتحانات دیے۔ پھر ۲۰۰۰ء میں پی ایچ ڈی کے لیے پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور دورانِ تعلیم مسلسل سکالرشپ حاصل کرتے رہے۔ ۲۰۰۸ء میں اسلامی قانون میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔

۱۹۹۷ء میں ایم بی اے کی تعلیم کا آغاز کیا لیکن اپنے جاری کردہ دینی تعلیمات کے اداروں کی مصروفیات اتنی بڑھ گئیں کہ ایم بی اے کی تعلیم کے سلسلے کو ترک کرنا پڑا۔

۱۹۹۲ء میں تعلیم سے فراغت پائی تو اسی سال عملی زندگی میں داخل ہو گئے۔ اس کا آغاز ماہنامہ ''محدث'' کی ادارت سے ہوا، جس کے اجرا پر اس وقت بائیس برس گزر چکے تھے۔ اپریل ۱۹۹۲ء میں پہلا شمارہ حافظ حسن مدنی کی ادارت میں شائع ہوا۔ خود ان کی (یعنی مدیر صاحب کی) عمر اس وقت تیئیس برس کی تھی۔ اپنے مجلّے سے صرف ایک سال بڑے۔ اپریل ۱۹۹۲ء سے اپریل ۲۰۱۴ء تک (جب کہ یہ سطور لکھی جا رہی ہیں) ''محدث'' کی ادارت کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ یہ بڑی اہم ذمہ داری ہے جو وہ باقاعدگی سے نبھا رہے ہیں۔ موصول شدہ مضامین کو پڑھنا، انھیں قابلِ اشاعت بنانا، تعارفی الفاظ کی ضرورت ہو تو اس پر مناسب الفاظ میں لکھنا۔ مدیر کی حیثیت ڈاکیے کی نہیں ہوتی کہ جو کچھ کسی نے بھیجا، اسی طرح چھپوا کر قارئین تک پہنچا دیا یا محنت سے بچنے کے لیے لکھ دیا ''ادارے کا اس سے متفق ہونا ضروری نہیں۔''

ادارت نازک ترین کام ہے۔ اس میں مضمون نگار کے مقام و مرتبے کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اس کے افکار، طرزِ بیان اور زبان و اسلوب کا جائزہ لینا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اپنے جریدے اور مجلّے کی پالیسی اور قارئین کے رجحان کو ملحوظ رکھنا بھی پیشِ نگاہ ہوتا ہے۔ غرض بہت سے معاملات ہیں جن سے ایڈیٹر کو واسطہ پڑتا ہے۔ اس طرح بسا اوقات وہ عجیب قسم کے مخمصے میں پھنس جاتا ہے۔

حافظ حسن مدنی کے بقول انھوں نے ''۱۹۹۸ء میں ایک برس کے لیے محترم حافظ صلاح الدین یوسف کی سرپرستی میں ''محدث'' کی ادارت کی تربیت حاصل کی اور بعد کے سالوں میں حافظ صاحب اور مولانا ارشاد الحق اثری کی علمی رہنمائی اور سرپرستی مسلسل حاصل رہی۔ اس عرصے کے دوران ۱۰۰ سے زائد تحریریں شائع ہوئیں۔'' یہ تحریریں تعلیم و تعلم، نظام عدل و انصاف، سیاست شرعیہ، جدید فقہی مسائل، حدود و قوانین، تحفظِ ناموس رسالت جیسے اہم عنوانات سے متعلق ہیں، جنھیں اہل علم نے پذیرائی بخشی۔ حافظ حسن مدنی فرماتے ہیں: ''کئی مضامین [مختلف] تنظیموں اور تحریکوں نے لاکھوں کی تعداد میں شائع کروائے۔'' اس اثنا میں انھوں

Marfat.com

نے دو کتابیں بھی لکھیں، جن میں سے ایک کا نام ''قرآن فہمی کے بنیادی اصول'' ہے، جو کہ مختلف علماء کی تحریرات کا مجموعہ ہے جو حافظ حسن مدنی نے جمع کیں، لیکن انتظامی اور ادارتی مصروفیات کی وجہ سے وہ ان پر نظر ثانی نہیں کر سکے اور اس طرح یہ شائع ہوئی ہیں۔ یہ بڑی علمی خدمت ہے جو حافظ حسن مدنی قلمی صورت میں سرانجام دے رہے ہیں۔

حافظ حسن مدنی فرماتے ہیں کہ انھوں نے ''محدث'' کی ادارت کا آغاز اپریل ۱۹۹۲ء میں کیا۔ اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے ''۱۹۹۸ء میں ایک برس کے لیے حافظ صلاح الدین یوسف کی سرپرستی میں ''محدث'' کی ادارت کی تربیت حاصل کی''۔ یعنی عنانِ ادارت ہاتھ میں لینے کے چھے سال بعد ''ادارت کی تربیت حاصل کی''۔ تربیت تو کسی کام کا آغاز کرنے سے پہلے حاصل کی جاتی ہے، نہ کہ چھے سال بعد۔ اس وقت تو خود ایڈیٹر دوسروں کو تربیت دینے لگتا ہے۔

ان کا ذہن حرکت پذیر ہے اور کچھ نہ کچھ سوچنے میں مصروف رہتا ہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۹۹۲ء ہی میں انھوں نے اردو کمپوزنگ سنٹر سے علمی کام شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۹۶ء سے ۲۰۰۶ء تک مجلس التحقیق الاسلامی میں بہ طور مدیر تحقیقی منصوبوں کی نگرانی کی۔ ۲۰۰۱ء میں مجلس التحقیق الاسلامی میں شعبہ رسائل و جرائد قائم کیا۔ اس میں ایک اہم کام یہ کیا جواب تک کسی نے نہیں کیا تھا کہ برصغیر کے اہل حدیث اور دیگر مسالک کے تقریباً پچاس علمی رسائل کے موضوعاتی اعتبار سے انڈیکس (اشاریے) ترتیب دلوا کر شائع کیے۔ ان پچاس رسائل میں خود ان کا رسالہ ''محدث'' تو شامل ہے ہی، اس کے علاوہ مولانا محمد حسین بٹالوی کا ''اشاعۃ السنہ''، مولانا ثناء اللہ امرتسری کے اخبارات، ''مرقع قادیان'' اور ''اہل حدیث''، مولانا سید محمد داؤد غزنوی کا ہفت روزہ ''توحید'' اور موجودہ اخبارات میں سے ہفت روزہ ''تنظیم اہل حدیث'' اور ہفت روزہ ''الاعتصام'' شامل ہیں۔ دیوبندی حضرات کے ماہنامہ ''الحق'' (اکوڑہ خٹک) اور ماہنامہ ''القاسم'' (مانسہرہ) وغیرہ کے اشاریے بھی بنوائے گئے ہیں۔ کوئی صاحب ان جرائد و رسائل کی مدد سے کسی موضوع پر کوئی تحقیقی کام کرنا چاہیں تو آسانی سے کر سکتے ہیں۔

مجلّہ اشاعۃ السنہ کی کل تیئیس جلدیں ہیں جن کی فوٹو کاپیاں حافظ حسن مدنی نے مجھے بھی عنایت کیں۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے ہفت روزہ ''توحید'' کے شائع شدہ شماروں کے عکس بھی عطا کیے۔ اس بہت بڑے علمی سرمایے کی عنایت پر میں ان کا شکر گزار ہوں۔

مجلس التحقیق الاسلامی کا کتب خانہ جو حافظ حسن مدنی کی کوشش سے موضوعاتی صورت میں ترتیب دیا گیا ہے، تفسیر، حدیث، شروح حدیث، رجال، فقہ، تاریخ، لغات، عقائد، علم کلام، سیرت وغیرہ موضوعات کی

Marfat.com

ہزاروں کتابوں پر مشتمل ہے اور اہل علم اس سے بہ آسانی استفادہ کر سکتے ہیں۔

حافظ حسن مدنی نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد بعض دیگر علمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ جامعہ لاہور الاسلامیہ میں درس وتدریس کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ وہ کئی سال جامعہ کے نصاب کے مطابق طلبا کو قرآن وحدیث، فقہ وعقائد اور دیگر فنون کی تعلیم دیتے رہے ہیں۔

ان کے درس وتدریس کے دو ادارے ہیں۔ ایک یہ ہی جامعہ لاہور الاسلامیہ جس میں اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ دوسرا جوہر ٹاؤن میں ''بیت العتیق'' جو خاصے رقبے میں پھیلا ہوا ہے، اس میں ابتدائی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔

جامعہ کا نصابِ تعلیم اس انداز کا ہے کہ اس کے فارغ التحصیل طلباء کو مدینہ یونیورسٹی اور دیگر عرب یونیورسٹیوں میں داخلے کے مواقع آسانی سے میسر آجاتے ہیں۔ علاوہ ازیں جامعہ لاہور الاسلامیہ میں جدید تعلیم کا بھی انتظام ہے جو میٹرک سے ایم اے تک چلتا ہے۔

جامعہ میں فنِ تجوید اور قراءت سبعہ عشرہ کی تعلیم کا بھی انتظام ہے۔ یہ سلسلہ پاکستان کے مشہور وممتاز عالم جناب قاری محمد ابراہیم میر محمدی کی نظامت میں شروع ہوا تھا۔ جو حضرات جامعہ سے اس پاکیزہ فن کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، وہ رمضان المبارک میں مختلف مقامات میں نماز تراویح پڑھاتے ہیں، جس سے سامعین اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ ان میں اس فن کو سیکھنے کا شوق پیدا ہوتا اور قرآن پر عمل کا جذبہ ان کے ذہن میں ابھرتا ہے۔

حافظ حسن مدنی سرکاری طور پر قرآن کمیٹی کے رکن ہیں جو صحیح ترین مصحف تیار کرنے کے لیے پنجاب کی حکومت نے بنائی ہے۔ جون ۲۰۱۲ء سے مئی ۲۰۱۳ء تک وہ ایک سال پنجاب یونیورسٹی کے اردو دائرۂ معارف اسلامیہ کے ایڈیٹر رہے۔ اس مختصر مدت میں انھوں نے وہاں کافی کام کیا۔

مئی ۲۰۱۳ء سے وہ پنجاب یونیورسٹی کے تدریسی شعبہ علوم اسلامیہ میں بہ طور استاذ خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔

انھوں نے درجن سے زائد عرب ملکوں کے مطالعاتی سفر کیے، جن میں خلیجی ممالک سمیت مصر، اردن اور مراکش شامل ہیں۔ کئی تعلیمی اداروں کے متعدد طلبا کو مختلف یونیورسٹیوں میں داخل کرایا۔ جامعہ لاہور الاسلامیہ کے لیے مالی وسائل کے حصول میں بھی انھوں نے کوشش کی اور اس میں کامیاب رہے۔

جامعہ کے سلسلۂ تعلیم میں ایک کام یہ ہوا ہے کہ نومبر ۲۰۱۳ء سے اس میں سرکاری سطح پر منظور شدہ ایم فل کی تعلیم کا آغاز کر دیا گیا ہے، اس کی نگرانی حافظ حسن مدنی کر رہے ہیں۔

Marfat.com

حافظ صاحب موصوف کے بارے میں جو معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں، ان میں بتایا گیا ہے کہ امریکی حکومت کے محکمہ خارجہ نے ۲۰۰۶ء میں انھیں امریکی ریاستوں کا دورہ کرایا۔

۲۰۰۶ء میں برطانیہ کے شہزادہ چارلس سے پنجاب کے گورنر ہاؤس میں منعقد ہونے والے بین المذہب مکالمے میں گفتگو کے لیے حافظ حسن مدنی کو منتخب کیا گیا تھا۔

جامعہ لاہور الاسلامیہ کے مختلف اداروں میں جو مساجد قائم ہیں، حافظ صاحب ممدوح ان میں خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے ہیں، کبھی کسی مسجد میں، کبھی کسی مسجد میں۔

یہ مرکزی جمعیت اہل حدیث کی قائم کردہ وفاق المدارس السّلفیہ کی نصاب کمیٹی کے بھی رکن ہیں۔

اگرچہ حافظ حسن مدنی کے خاندانی سلسلے کا تذکرہ آغازِ مضمون میں کردیا گیا ہے لیکن یہاں باقی رشتے داروں کے متعلق بھی سنتے جایے۔

یہ حضرت حافظ عبداللہ روپڑی کے چھوٹے بھائی حافظ محمد حسین روپڑی کے پوتے اور حافظ عبدالرحمٰن مدنی کے فرزندارجمند ہیں۔

ننھیال کی طرف سے مولانا عبدالرحمٰن کیلانی مرحوم کے نواسے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ فنِ تحریر میں انھوں نے اپنے نانا مولانا کیلانی سے بہت کچھ سیکھا۔ ان کی والدہ محترمہ نے بقول ان کے ''لاہور میں خواتین کے درجنوں قرآنی مراکز قائم کیے اور ان سے تیس ہزار سے زائد خواتین نے قرآن کریم اور صحیح بخاری و صحیح مسلم پر مشتمل مجموعہ حدیث اللؤلؤ والمرجان کی تعلیم حاصل کی۔''

یہ بہت بڑی خدمتِ دین ہے جو اس قابل احترام خاتون نے گھر کی چار دیواری میں بیٹھے سرانجام دی۔ اگر اس سے آدھی بلکہ چوتھے حصے کی خدمت کی توفیق بھی کسی گھریلو خاتون کو میسر آجائے تو وہ بھی نہایت قابل قدر ہے۔ اللہ اس خدمت کو قبول فرمائے۔

سسرالی رشتے کے اعتبار سے حافظ حسن مدنی لاہور کی جماعت اہل حدیث کے ایک مخلص ترین اہل علم اور صاف بیان مبلغ اسلام پروفیسر ڈاکٹر مزمل احسن شیخ کے داماد ہیں۔

حافظ صاحب کی تعلیم و تربیت اور فکری تشکیل میں بقول ان کے ''تعلیمی مراحل سے بڑھ کر [ماہنامہ ''محدث'' کی ترتیب وادارت کی ذمے داری اور جامعہ لاہور الاسلامیہ کی نظامت و تدریس کے تجربات نے زیادہ کردار ادا کیا۔''

یہ اپنے والد گرامی جناب حافظ عبدالرحمٰن مدنی کی طرح جذبہ حرکت و عمل سے مزین اور ان کے علوم و نظریات کے مؤثر ترجمان ہیں۔

Marfat.com

عالم طفولیت ہی سے اہل علم کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے علما کی خدمت اور ان کے احترام کا داعیہ ان کے دل میں موجزن ہے۔

حافظ حسن مدنی ماشاء اللہ جوان عمر ہیں اور تادمِ تحریر ان کی اولاد دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ بیٹوں کے نام ہیں عبداللہ اور عبدالرحمٰن۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو خوش رکھے اور یہ لوگ قرآن وحدیث کی تبلیغ واشاعت میں مشغول رہیں۔

آخر میں خوانندگانِ ذی اکرام کی خدمت میں یہ عرض کرنے کو بھی جی چاہتا ہے کہ یہ فقیر پہلا شخص ہے جسے خانوادۂ روپڑ کے جلیل القدر عالم حضرت حافظ عبداللہ محدث روپڑی پر مضمون لکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ لوگ ان کی علمی گہرائی کا تو بے شک اعتراف کرتے تھے، ان کے تحقیقی وتدریسی کارناموں کی تحسین بھی ان کے وردِ زبان تھی، ان کے تدریسی کمالات بھی علما وطلبا کے لیے باعث کشش تھے اور وہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی ذہنی استطاعت کے مطابق ان سے اخذِ فیض کرتے تھے۔ جن مسائل کی تعبیر میں وہ اپنے بعض رفیع المرتبت معاصر علما سے اختلاف کا اظہار فرماتے تھے، اس میں بھی بعض معروف اصحابِ علم ان کو حق بجانب ٹھہراتے تھے۔ لیکن کسی صاحب نے ان سے متعلق کوئی ایسا مضمون تحریر نہیں فرمایا تھا جس میں ان کے واقعاتِ حیات کی نشان دہی کی جاتی۔ یہ شرف بارگاہِ الٰہی سے اس فقیر ناتواں کے حصے میں آیا۔ جس نے آج سے ۶۵ سال قبل ۲۳۔ دسمبر ۱۹۴۹ء کے ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں اپنی معلومات کی روشنی میں ان کی حیاتِ طیبہ کے بعض پہلوؤں کو اجاگر کیا۔

ان کے برادرِ صغیر حضرت حافظ محمد حسین روپڑی بھی جلیل المنزلت عالمِ دین تھے، جو ۲۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء کو اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کو رخصت ہوئے۔ ان پر ایک طویل مضمون اس فقیر ہی کے قلم سے نکلا۔ ان کے خاندان یا ان کے شاگردوں میں سے آج تک ان کے بارے میں کسی نے کچھ نہیں لکھا۔

پھر ایک وقت آیا کہ اس چھوٹے سے قلم کار کو اللہ نے توفیق بخشی اور ''روپڑی علمائے حدیث'' کے نام سے مستقل کتاب لکھ دی گئی، جس میں اس خاندان کے اکابر واصاغر تمام اصحابِ علم کا تذکرہ آگیا، نیز ان کے تلامذہ ومتعلقین کے ضروری واقعات بھی ضبطِ کتابت میں آگئے۔ یہ باتیں فخر ومباہات کے طور پر نہیں، تحدیث نعمت کے طور پر عرض کی گئی ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ اس دودمان عالی قدر کے فوت شدگان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور موجودین کو اپنے دین کی خدمت کے مواقع عطا کرے۔ آمین یارب العالمین۔

Marfat.com

حافظ ابوبکر عتیق

(ولادت ۲۴۔دسمبر ۱۹۷۳ء)

میانہ قد، جسم اعتدال کے زاویے کے اندر نہ فربہ نہ لاغر، گندمی سا رنگ، خوش کلام وخوش اخلاق۔ دوستوں کے دوست۔ ہم درد اور اخلاص پیشہ۔ آنکھوں پر نظر کی عینک۔ یہ ہیں حافظ ابوبکر عتیق۔ سلسلۂ نسب یہ ہے: ابوبکر عتیق بن محمد بشیر طیب بن عطاء اللہ بن محمد دین بن مہر علی کھوکھر۔

حافظ ابوبکر عتیق کے والد گرامی مولانا محمد بشیر طیب کا تذکرہ ''چمنستانِ حدیث'' میں کیا گیا ہے۔ انھوں نے ۱۶۔ مارچ ۲۰۱۱ء کو کویت میں وفات پائی اور ان کی میت ۱۸۔ مارچ کو ان کے گاؤں سنبھلا کلاں میں لائی گئی جو ایمن آباد (ضلع گوجراں والا) سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ نماز جنازہ حضرت حافظ عبدالمنان نورپوری مرحوم نے پڑھائی۔ جنازے میں بے شمار لوگ شامل تھے۔ اس فقیر کو بھی اپنے چھوٹے بھائی سعید احمد بھٹی کی رفاقت میں جنازے میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔

۱۹۷۳ء میں مولانا محمد بشیر طیب بدوملہی (ضلع نارووال) میں خطابت وامامت کا فریضہ سرانجام دیتے تھے، وہیں ۲۴۔ دسمبر ۱۹۷۳ء کو ابوبکر عتیق کی ولادت ہوئی۔ اس سے ڈھائی سال بعد حالات نے پلٹا کھایا اور مولانا محمد بشیر طیب کویت چلے گئے۔ اب ان کے اہل وعیال نے سنبھلا کلاں میں رہائش اختیار کر لی۔ وہاں مولانا محمد بشیر کے سسر حکیم عبیداللہ سکونت پذیر تھے جو عابد وزاہد اور متقی بزرگ تھے۔ اس نواح میں حکیم صاحب نے کتاب وسنت کی اس انداز سے تبلیغ کی کہ لوگ اس سے متاثر ہوئے اور کتاب وسنت کے احکام پر عمل کرنے لگے۔

اسی گاؤں سنبھلا کلاں میں ابوبکر عتیق کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ انھوں نے اپنے نانا حکیم عبیداللہ اور والدہ مکرمہ سے ناظرہ قرآن مجید پڑھا، چند سپاروں کا ترجمہ بھی پڑھ لیا۔ گاؤں کے سکول میں ۱۹۸۰ء میں داخلہ لیا اور ۱۹۸۵ء میں پرائمری پاس کی۔

بعدازاں ۲۰۔ اپریل ۱۹۸۵ء کو مدرسہ تعلیم القرآن (گوجراں والا) میں حفظ قرآن کا سلسلہ شروع کیا اور ۱۱۔ نومبر ۱۹۸۷ء کو پورا قرآن مجید حفظ کر لیا۔ پھر وہیں ایک سال چار مہینے (مارچ ۱۹۸۹ء) تک دہرائی کا عمل جاری رہا۔ اس طرح حفظ اور دہرائی کی سعادت سے بہرہ مند ہوئے۔ پہلی دفعہ قرآن مجید مارچ ۱۹۸۹ء کے

Marfat.com

رمضان المبارک میں اپنے گاؤں (سنبھلا کلاں) کی مسجد میں سنایا ان کے حفظ قرآن کے استاذ قاری محمد بشیر ملتانی مرحوم تھے۔

ماہ رمضان کے بعد ۱۹۸۹ء میں جامعہ محمدیہ جی ٹی روڈ (گوجراں والا) میں دینیات کی تعلیم کا آغاز کیا، جسے مدارس کی زبان میں درس نظامی کہا جاتا ہے۔ وہاں مندرجہ ذیل اساتذہ سے مندرجہ ذیل کتابیں پڑھیں۔

۱۔ شیخ الحدیث مولانا عبدالمجید ہزاروی سے ابواب الصرف، کافیہ، حجۃ اللہ البالغہ اور بدایۃ المجتہد۔

۲۔ حضرت حافظ عبدالمنان نورپوری سے جامع ترمذی، صحیح بخاری، فلسفے کی میبذی، علم منطق کی سلم العلوم اور علم مواریث کی فقہ المواریث۔

۳۔ حافظ عبدالسلام بھٹوی سے بلوغ المرام اور اصول حدیث کی تیسیر مصطلح الحدیث کا کچھ حصہ

۴۔ مولانا محمد رفیق سلفی سے صحیح مسلم، ادبِ عربی کی دیوان متنبیّ، علم نحو کی شرح قطر الندی۔

۵۔ مولانا جمعہ خاں سے منطق کی ابتدائی کتاب ایساغوجی اور بعد ازاں منطق کی متوسط درجے کی شرح التہذیب۔

۶۔ حافظ حمید اللہ سے سنن ابی داؤد۔

۷۔ قاری منظور احمد سے مشکوٰۃ المصابیح کی دوسری جلد۔ نفحۃ العرب، قرآۃ الرشیدہ اور علم صرف اور علم نحو کی بعض کتابیں۔

۸۔ حافظ محمد عمران سے مشکوٰۃ المصابیح کی پہلی جلد، اصول حدیث کی نخبۃ الفکر اور علم نحو کی ہدایۃ النحو۔

۹۔ مولانا عبدالستار راشد سے حدیث کی سنن نسائی اور اصول فقہ کی اصول شاشی۔

۱۰۔ قاضی عبدالرزاق سے قرآن مجید کا ترجمہ سورہ مریم سے آخر تک۔ علم صرف کی فصول اکبری اور عربی ادب کی مختاراتِ (تصنیف سید ابوالحسن علی ندوی)

۱۱۔ مولانا محمد مالک بھنڈر سے اصول حدیث کی شرح نخبۃ الفکر۔

۱۲۔ سید محمد شاہ سے مؤطا امام مالک۔

۱۳۔ حافظ محمد عباس انجم سے سورہ آل عمران سے سورہ انفال تک ترجمہ قرآن۔ اس کے علاوہ بعض درسی کتابیں۔

اس طرح نورالانوار، تفسیر جلالین، تفسیر بیضاوی، صرف میر، زرادی، الفیہ ابن مالک، نحو میر وغیرہ تمام درسی کتابیں مختلف اساتذہ کرام سے پڑھیں۔

حافظ ابوبکر عتیق ۱۹۹۶ء کے آخر میں جامعہ محمدیہ (گوجراں والا) سے فارغ التحصیل ہوئے۔ انھوں نے درسیات کی تمام کتابیں اسی جامعہ کے لائق احترام اساتذہ سے پڑھیں۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ اس کے

Marfat.com

برعکس دیکھا گیا ہے کہ طلبا عام طور پر کسی ایک ہی تعلیمی ادارے میں جم کر تعلیم حاصل نہیں کرتے۔ مختلف مدارس کے چکر لگاتے رہتے ہیں۔

تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے دو سال مرکز طیبہ مریدکے کے مدرسے میں تدریس کی۔ چھ مہینے پتوکی (ضلع قصور) کے ایک ادارے میں پڑھاتے رہے۔ ان مدارس میں انھوں نے مندرجہ ذیل کتابیں طلبا کو پڑھائیں۔

(۱) بلوغ المرام تقریباً نصف (۲) حصن المسلم (۳) کتاب الجامع من بلوغ المرام (۴) علم الصرف (۵) فارسی کی ایک کتاب۔ علاوہ ازیں چند اور کتابیں۔ معلوم ہوتا ہے تدریس کے اس ڈھائی سالہ مختصر دور میں انھیں کسی موضوع کی کوئی بڑی کتاب پڑھانے کا موقع نہیں ملا۔ اس اثنا میں انھیں جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں خدمت تدریس انجام دینے کی دعوت دی گئی۔ لیکن یہ وہاں نہیں گئے اور مزید تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ مزید تعلیم کے حصول کی صورت کیسے پیدا ہوئی اور کس طرح آگے بڑھی؟ سنیے!

ان کے ایک خالہ زاد بھائی محمد قاسم طاہر تھے جو جامعہ محمدیہ میں ان کے ہم جماعت تھے، وہ ایف اے پاس تھے۔ انھوں نے ان سے کہا کہ اسلام آباد کی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہیے۔ انھوں نے ان سے کہا: آپ تو ایف اے پاس ہونے کی وجہ سے اس یونیورسٹی میں کسی طرح داخل ہو سکتے ہیں، لیکن میں نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ میں صرف پرائمری پاس ہوں، انگریزی اور دیگر عصری علوم سے بے خبر۔

محمد قاسم طاہر نے جواب دیا: تم نے درس نظامی کی کتابیں پڑھی ہیں۔ وفاق المدارس کی سند پر بی اے میں داخلہ مل سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے یہ راستہ اختیار کیا اور داخلہ مل گیا۔ حسن اتفاق سے یونیورسٹی میں ان کی ملاقات حضرت مولانا محمد یوسف راجووالوی کے صاحب زادہ گرامی عبیدالرحمٰن محسن سے ہوئی تو انھوں نے کلیۃ اللغۃ العربیہ میں داخل ہونے کا مشورہ دیا جو ان کی پہلی تعلیم کے مطابق صحیح مشورہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے یہ چار سالہ نصاب مکمل کیا اور پھر انگریزی میں میٹرک اور ایف اے اور بی اے کے امتحانات دیے اور کامیاب ہوئے۔ یونیورسٹی میں انگریزی کے تقریری مقابلے میں بھی انھوں نے حصہ لیا اور دوسرے نمبر پر رہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا اور کامیابی کے دروازے کھلتے چلے گئے۔ ایک مرتبہ یونیورسٹی میں حفظ قرآن مجید کے مقابلے میں حصہ لیا اور ایک ہزار روپے انعام حاصل کیا۔ تین مرتبہ یونیورسٹی میں سکالرشپ ملا۔

علامہ اقبال یونیورسٹی اسلام آباد میں عربی ٹیچر ٹرینگ کا کورس کیا۔ اس طرح اور بھی کئی کورس کیے اور ایم اے کی سند کے مستحق قرار پائے۔

یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران ہی میں ۱۳۔ جنوری ۲۰۰۰ء کو اپنے ماموں محمد زبیر کی دختر نیک اختر سے ان کی

Marfat.com

شادی ہوگئی۔ ۲۱۔فروری ۲۰۰۲ء کو اللہ تعالیٰ نے پہلی اولاد بیٹی کی صورت میں عطا فرمائی۔

جامعہ محمدیہ گوجراں والا کی نصابی تعلیم اور اسلام آباد کی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کا کورس مکمل کر کے حافظ ابوبکر عتیق کویت چلے گئے۔لیکن کیسے پہنچے اور وہاں کیا کر رہے ہیں؟ اس کے متعلق چند باتیں۔

مارچ ۲۰۰۳ء میں ان کے والد محترم مولانا محمد بشیر طیب سالانہ تعطیلات گزارنے کے لیے کویت سے اپنے گاؤں سنبھلا کلاں آئے اور یہاں سے واپس جانے سے ایک روز پہلے اہلیہ محترمہ سے کہا کہ میں نے ساری زندگی پردیس میں گزاری ہے، میں نہیں چاہتا کہ میری اولاد میں سے کوئی پردیس میں زندگی بسر کرے۔ سب بچے یہیں اپنے وطن میں رہیں اور تعلیم حاصل کریں۔ اللہ رازق و مالک ہے۔

اس سے دوسرے دن وہ کویت پہنچ گئے اور حسب عادت سب کو خیر و عافیت کے خطوط لکھے۔ ان خطوط میں ایک خط ان کے گوجراں والا کے ایک دوست حاجی محمد ابراہیم کے نام بھی تھا جو گوجراں والا کے دال بازار میں کاروبار کرتے تھے۔ یہ خط حاجی صاحب کو دینے کے لیے حافظ ابوبکر عتیق اپنے بھائی حافظ محمد ابوسفیان سلفی کے ساتھ ان کے ہاں گئے تو حاجی صاحب نے کہا: اب تم میں سے کس کا کویت جانے کا ارادہ ہے۔ انھوں نے بتایا والد صاحب نے ہم کو کسی دوسرے ملک میں جانے سے منع کر دیا ہے۔ اس کے جواب میں حاجی صاحب نے فرمایا: مولانا محمد بشیر صاحب اب یہاں آجائیں اور تم میں سے کوئی وہاں چلا جائے۔ یہ کہہ کر ان سے مولانا ممدوح کا ٹیلی فون نمبر لیا اور انھیں کویت ٹیلی فون کر دیا۔

اس پر ایک مہینا گزرا تھا کہ کویت سے حافظ ابوبکر عتیق کا ویزا آگیا۔ یہ اسلام آباد میں کویت کے سفارت خانے گئے تو انھوں نے یہ کہہ کر ویزا لگانے سے انکار کر دیا کہ آپ کے موجودہ پاسپورٹ کی مدت صرف ڈھائی مہینے باقی ہے۔ اس پر ویزا نہیں لگ سکتا۔ پاسپورٹ کی مدت کم سے کم چھ مہینے ہونی چاہیے۔ اب نیا پاسپورٹ بناؤ اور یہ ویزا واپس بھیجو۔ نئے پاسپورٹ پر نیا ویزا لگے گا۔ اس طرح کافی بھاگ دوڑ کے بعد یہ مرحلہ طے ہوا اور یہ ۱۷۔ دسمبر ۲۰۰۳ء کو رات کے دس بجے لاہور علامہ اقبال ائیرپورٹ سے شاہین ائیرلائن پر کویت کے لیے روانہ ہوئے اور ۱۸۔ دسمبر کی رات کویت کے وقت کے مطابق بارہ بج کر پینتیس منٹ پر جہاز کویت ائیرپورٹ پر اترا۔ یہ ان کے ویزے کی آخری تاریخ تھی۔

کویت ائیرپورٹ پر ان کے والد مولانا محمد بشیر طیب اور دیگر متعدد حضرات موجود تھے۔ ائیرپورٹ سے یہ اپنے والد محترم کے ساتھ مسجد خالد بن بکیر قصر الجبر امیں پہنچے جس میں وہ خطابت و امامت کا فریضہ سرانجام دیتے تھے۔ تھوڑی دیر وہاں آرام کیا۔ پھر نماز ادا کی اور والد صاحب کے کویتی دوستوں اور نمازیوں سے ملاقات ہوئی۔ والد صاحب کے حکم سے مختلف مسجدوں میں امامت کرائی۔ درس قرآن دیے، خطباتِ جمعہ

Marfat.com

ارشاد فرمائے۔ تقریریں کیں جو خالص قرآن وحدیث کے موضوع پر مشتمل تھیں۔ کویت کی جماعت کے مرکز دعوۃ الجالیات کے ارکان سے میل جول ہوا۔ وہاں جس انداز سے تبلیغ کرنی چاہیے، اس کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ کویتی حکومت کے قوانین کے مطابق وہاں اقامت کے لیے اقامہ حاصل کیا۔ مساجد کی امامت وخطابت، اذان تبلیغ وغیرہ کے تمام معاملات وہاں حکومت کے محکمہ اوقاف کے ماتحت ہیں اور جو حضرات یہ فرائض سرانجام دیتے ہیں حکومت کی طرف سے انھیں معقول تنخواہیں دی جاتی ہیں، ان کے لیے رہائش کا انتظام کیا جاتا ہے اور انھیں حکومت اور عوام میں تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

بہرحال وہ ایک مہینا کویت میں رہنے کے بعد وطن واپس آگئے، اس لیے کہ چھوٹے بھائی اور بہن کی شادی کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ اس سلسلے میں ساڑھے چار مہینے پاکستان میں ان کا قیام رہا۔ پھر کویت چلے گئے۔

موذن، امام اور خطیب کا تقرر وہاں باقاعدہ انٹرویو اور امتحان کے ذریعے ہوتا ہے اور امتحانات اور انٹرویو کے لیے علما کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ اس کا ذکر ''چمنستانِ حدیث'' میں حافظ ابوبکر عتیق کے والد گرامی مولانا محمد بشیر طیب کے حالات میں کیا جاچکا ہے اور بتایا گیا ہے کہ امامت کے لیے مولانا ممدوح کو کن کن مشکل مراحل سے گزرنا پڑا۔ اب ان کے فرزند ابوبکر عتیق کے بارے میں سنیے کہ انھیں موذن کے منصب پر پہنچنے کے لیے کیا مشکلات پیش آئیں۔

انھوں نے ستمبر ۲۰۰۴ء میں کویت کی وزارۃ الاوقاف والشؤن الاسلامیہ میں موذن کے لیے تحریری امتحان دیا۔ یہ اس منصب کے لیے ان کے امتحان کا پہلا مرحلہ تھا جس میں یہ کامیاب رہے۔ اب امتحان کا دوسرا مرحلہ پیش آیا جو زبانی امتحان کا تھا جسے وہاں کی زبان میں ''شفوی'' امتحان کہا جاتا ہے۔ شفوی امتحان لینے والی دس آدمیوں کی کمیٹی (لجنہ) تھی۔ انھوں نے ان سے مختلف سوالات پوچھے، جن کے انھوں نے جواب دیے۔ نتیجہ آیا تو یہ امتحان میں ناکام رہے۔

اس کے بعد انھوں نے کسی اور ملازمت کی کوشش کی اور اس میں کچھ کامیابی بھی ہوئی۔ ایک سکول میں معلم مقرر ہوگئے۔ اس کے علاوہ ایک اور مدرسے میں تفسیر قرآن پڑھانے کا سلسلہ شروع ہوگیا اور بے کاری کسی حد تک ختم ہوئی، لیکن یہ کسی مسجد کے موذن بننے کے متمنی تھے اور اس کے لیے کوشاں رہے۔ چنانچہ دسمبر ۲۰۰۵ء میں دوبارہ موذن کے لیے انٹرویو کا موقع ملا۔ اب اس سلسلے میں وزارت اوقاف کے دفتر پہنچے تو پتا چلا کہ متعدد علمائے کرام انٹرویو دینے کے لیے آئے ہیں۔ ہر امیدوار کا نام لے کر انٹرویو کے لیے بلایا جاتا تھا۔ ان کے نام آواز پڑی تو یہ اندر گئے۔ پہلے قرآن مجید کی چند آیات سنی گئیں۔ پھر اذان اور اقامت سنانے کے لیے کہا گیا۔ چند اور سوالات بھی پوچھے۔ یہ بھی پوچھا کہ کتنے عرصے سے کویت میں سکونت پذیر ہو۔ اس طرح

Marfat.com

کے سوالات کے بعد کہا: ''موفق ان شاء اللہ۔''

انٹرویو ختم ہوا تو کامیابی کی کچھ امید ہوئی۔ جو لوگ انٹرویو لے رہے تھے، ان میں مولانا صلاح الدین مقبول احمد کے ایک شاگرد بھی شامل تھے۔ وہ باہر آئے تو انھوں نے ان سے نتیجے کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے بتایا کہ آپ کامیاب ہیں۔

مولانا صلاح الدین مقبول احمد کا شمار ہندوستان کے مشہور علماء و مصنّفین میں ہوتا ہے اور انھوں نے کئی اردو کتابوں کے عربی زبان میں ترجمے کیے ہیں۔ ایک مدت سے کویت میں مقیم ہیں۔ میری ایک کتاب ''برصغیر میں اہل حدیث کی اولیات'' پر انھوں نے طویل مقدمہ لکھا ہے اور اس کا عربی زبان میں ترجمہ بھی کردیا ہے۔ میں نے ان کے حالات اپنی ایک کتاب ''دبستانِ حدیث'' میں لکھے ہیں اور ان کی علمی خدمات کا تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب مکتبہ قدوسیہ نے طبع کی تھی۔

بات حافظ ابوبکر عتیق کے بارے میں ہورہی تھی۔ ان کی سرکاری ملازمت کے کاغذات کی ۳۔اپریل ۲۰۰۶ء کو تکمیل ہوئی اور انھوں نے اسی روز ایک مسجد میں جس میں ان کا تقرر عمل میں آیا تھا۔ظہر کی پہلی اذان دی۔ اس سے دو مہینے قبل ۲۰۔ فروری ۲۰۰۶ء کو اللہ تعالیٰ نے ان کو بیٹا عطا فرمایا تھا، اس سے پہلے یہ ایک بیٹی کے باپ تھے۔

اب کویت میں اذان کے علاوہ کسی نہ کسی مسجد میں یہ درس قرآن بھی دیتے ہیں اور خطبہ جمعہ کے مواقع بھی میسر آجاتے ہیں۔ ماشاء اللہ اپنے اہل وعیال سمیت آسودگی سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں جولائی ۲۰۰۸ء میں کویت گیا تو ان سے پہلی ملاقات ہوئی۔ میرا قیام مرکز دعوۃ الجالیات کے دفتر میں مولانا عبدالخالق مدنی کے کمرے میں تھا۔ حافظ ابوبکر عتیق کئی مرتبہ یہاں آئے اور ہر مرتبہ تپاک سے ملے۔ میری ان سے کچھ اس طرح کی بے تکلفی سی ہوگئی تھی جس طرح کہ میری عمر کے آدمی کی کسی نوجوان عزیز سے ہوسکتی ہے۔ یہ ہمیشہ اپنی گاڑی پر آتے۔ جسے یہ خود ہی ڈرائیو کرتے تھے۔ ایک دن دوپہر کو آئے۔ تقریباً ایک گھنٹا بیٹھے اور کہا اب اجازت چاہتا ہوں، اذان کا وقت ہوگیا ہے، مجھے مسجد میں جا کر اذان دینی ہے۔ میں حیران ہوا کہ اذان دینے کا کیا مطلب ہے؟ ان کے جانے کے بعد مولانا عبدالخالق مدنی سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ موذن کو یہاں کتنا اہم مقام حاصل ہے۔

ہمارے ہاں موذن کو ''بانگا'' کہا جاتا ہے۔ یعنی یہ فلاں مسجد کا بانگا ہے (اذان دیتا ہے) ہر نمازی اسے اپنا ماتحت سمجھتا ہے۔ بعض بانگے نماز مغرب کے بعد لوگوں کے گھروں سے روٹیاں مانگ کر لاتے ہیں۔ امام مسجد کی بھی ہمارے ملک کے بعض علاقوں میں جو حیثیت ہے، وہ سب کو معلوم ہے، لیکن اس کے برعکس کویت

Marfat.com

اور دیگر اسلامی ممالک میں موذن اور امام وخطیب کو سرکاری اور معاشرتی اعتبار سے احترام کا مقام حاصل ہے اور وہ وقار کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے عزیز دوست حافظ ابوبکر عتیق کو بھی دیارِ غیر میں اللہ تعالیٰ نے عزت واحترام کا مقام عطا فرمایا ہے۔

والد گرامی کی وفات کے بعد گھریلو ذمہ داریاں حافظ ابوبکر عتیق کے کندھوں پر آپڑی ہیں، اس لیے کہ یہ مرحوم کے بڑے بیٹے ہیں اور اپنے والد کے قائم مقام ہیں۔

ان کے والد کویت کی جس مسجد میں اردو میں خطبۂ جمعہ ارشاد فرماتے تھے، اب حافظ صاحب وہاں خطبہ دیتے ہیں۔ خطبہ وہاں وزارتِ اوقاف کے مقرر کردہ موضوع پر دیا جاتا ہے۔ خطبے کے بعد تقریباً ایک گھنٹا لوگوں کے مختلف سوالات کے جواب دینا ہوتے ہیں۔ عصر سے پہلے یہ اس مسجد سے رخصت ہو کر اپنی مسجد میں چلے جاتے ہیں، اس لیے کہ وہاں عصر کی اذان دینا ان کی ذمہ داری ہے۔ ان کے والد کی مسجد ان کی قیام گاہ سے تقریباً ۳۵ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، اس لیے صرف جمعۃ المبارک کے روز ہی وہاں جاتے ہیں۔

جس مسجد میں ان کے والد (مولانا محمد بشیر طیب) نے تقریباً تیس سال بہ طور موذن گزارے کبھی کبھی یہ اس مسجد میں بھی جاتے اور اپنے والد کے دوستوں اور مسجد کے نمازیوں سے ملاقات کرتے ہیں۔

گزشتہ سطور میں خوانندگانِ محترم کو معلوم ہو چکا ہے کہ حافظ ابوبکر کی شادی ۱۳۔ جنوری ۲۰۰۰ء کو ہوئی تھی۔ آج ۲۔ اگست ۲۱۰۵ء ہے، ماشاء اللہ ان کی چھے اولادیں ہیں، تین بیٹے اور تین بیٹیاں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ اس گھرانے کو خوش رکھے اور ان کا حافظ وناصر ہو، آمین یارب العالمین۔

مولانا محمد بشیر طیب خود بھی خوش اطوار عالم دین تھے، اپنی اولاد کی بھی انھوں نے اچھی تربیت کی۔ ان کے پانچ بیٹے ہیں اور چار بیٹیاں۔ تمام بیٹے حفاظ قرآن ہیں۔ سب سے بڑے حافظ ابوبکر عتیق جن کے تذکار پر یہ مضمون مشتمل ہے۔ دوسرے حافظ محمد ابوسفیان۔ یہ جامعہ محمدیہ گوجراں والا میں فریضہ تدریس سرانجام دے رہے ہیں۔ ایمن آباد کی ایک مسجد اہل حدیث کی خطابت ان کے ذمے ہیں۔ تیسرے حافظ ابوقتادہ ثانی۔ چوتھے حافظ ابوعبیدہ کاظمی۔ پانچویں حافظ ابوہریرہ مدنی۔

چاروں بیٹیاں تعلیم یافتہ ہیں۔

ان سب کا تذکرہ ''چمنستان حدیث'' میں کیا گیا ہے۔ قارئین کرام مزید معلومات کے لیے اس کا مطالعہ فرمائیں۔

حافظ ابوبکر عتیق جب پاکستان آتے ہیں، مجھے ضرور ملتے ہیں۔ کویت بھی ان سے ٹیلی فون پر رابطہ رہتا

Marfat.com

ہے۔ ان کے چھوٹے بھائی حافظ ابوسفیان تو پاکستان ہی میں فروکش ہیں اور تدریس وخطابت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ ان سے جہاں بھی ملاقات ہوتی ہے، بڑے احترام سے پیش آتے ہیں۔ اللہ ان سب بہن بھائیوں کو خوش رکھے۔

(یہ سطور ۲۴۔ اگست ۲۰۱۵ء کو لکھی گئیں۔)

❁❁❁❁

Marfat.com

حافظ محمد اسلم شاہدروی

(ولادت ۲۰۔ اپریل ۱۹۷۴ء)

لاہور کے جواں سال اور باہمت علمائے کرام میں حافظ محمد اسلم شاہدروی کو ترجمہ وتصنیف اور درس وتدریس کے میدان میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کی ولادت ۲۰۔ اپریل ۱۹۷۴ء کو لاہور کے علاقہ شاہدرہ میں ہوئی۔ قرآن مجید مدرسہ تجوید القرآن مسجد لسوڑے والی (لاہور) میں حفظ کیا۔ درس نظامی کی تعلیم زیادہ تر جامعہ علومِ اثریہ جہلم میں حاصل کی۔ علاوہ ازیں جامعہ اسلامیہ گوجراں والا، دارالحدیث مسجد چینیاں والی لاہور اور جامعہ سلفیہ اسلام آباد میں بھی کچھ عرصہ تحصیل علم میں مشغول رہے۔

تکمیل تعلیم کے بعد تدریس کا سلسلہ شروع کیا، جس کی تفصیل یہ ہے: تین سال جامعہ علوم اثریہ جہلم میں، ایک سال دارالعلوم تقویۃ الاسلام لاہور میں، کچھ عرصہ مرکزِ اہل حدیث لارنس روڈ لاہور میں، کچھ مدت جامعہ اسلامیہ نور شاہ لاہور میں، چند روز جامعہ محمدیہ جی ٹی روڈ گوجراں والا میں اور بعدازاں کچھ مدت جامعہ امہات المومنین شاہدرہ لاہور میں تدریس کی۔

قرآنِ مجید سے متعلق انھوں نے جو تحریری کام کیا اس کا تذکرہ یہ فقیر اپنی ایک کتاب ''برصغیر کے اہل حدیث خدامِ قرآن'' میں کر چکا ہے۔ آئندہ سطور میں ان کی ان مساعی کا ذکر کرنا مقصود ہے جو نبی ﷺ کی احادیث مبارکہ کے بارے میں کی گئیں اور اس فقیر کے علم میں آئیں۔ لیکن اس سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ انھوں نے کن اساتذہ کرام سے علوم حدیث کی تعلیم حاصل کی اور ان کی اسناد سے مفتخر ہوئے۔

☆......مولانا فیض الرحمٰن ثوری اور مولانا عزیز زبیدی سے سندِ حدیث لی اور یہ دونوں بزرگ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے عالی قدر تلمیذ حضرت مولانا احمد اللہ دہلوی کے شاگرد تھے۔ نیز مولانا فیض الرحمٰن ثوری اور مولانا عزیز زبیدی نے مولانا عبدالتواب ملتانی اور مولانا عبدالوہاب دہلوی سے بھی اکتسابِ علم کیا تھا اور وہ دونوں جلیل القدر علماء، حضرت میاں صاحب کے فیض یافتہ تھے۔ اس طرح حافظ محمد اسلم شاہدروی کی سند دو واسطوں سے حضرت میاں صاحب علیہ الرحمہ تک پہنچتی ہے۔

☆......جہلم میں حافظ محمد اسلم شاہدروی نے مولانا پیر محمد یعقوب قریشی سے سندِ حدیث لی۔

☆......جامعہ اسلامیہ گوجراں والا میں انھوں نے مولانا فاروق احمد راشدی سے صحیح بخاری پڑھی اور ان کی سند

Marfat.com

سے بہرہ یاب ہوئے۔

☆......لاہور میں مولانا مفتی عبیداللہ عفیف سے سندِ حدیث حاصل کی۔

حافظ محمد اسلم شاہدروی نے حسب ذیل کتابوں کی تدریس کی:

☆......صحیح بخاری کی تدریس انھوں نے آٹھ مرتبہ کی ہے۔صحیح مسلم، جامع ترمذی اور سنن نسائی کی ایک ایک مرتبہ تدریس کا شرف حاصل کیا، بلوغ المرام کی چار مرتبہ، اربعین نووی دو مرتبہ پڑھائی۔

آیے اب دیکھتے ہیں انھوں نے لاہور کی بعض مساجد میں درسِ حدیث کب کب دیا، یوں تو اب بھی ماشاء اللہ دے رہے ہیں۔

☆......مسجد چینیاں والی میں نمازِ عصر کے بعد ۲۰۰۲ء میں ''ریاض الصالحین'' کا درس دینا شروع کیا۔ یہ روزانہ کا سلسلہ تھا جو ۲۰۰۸ء تک (پانچ سال) جاری رہا۔ اس اثنا میں پوری کتاب ختم نہ ہوسکی، تھوڑی سی باقی تھی کہ یہ سلسلہ درس منقطع ہوگیا۔

☆......مسجد مبارک میں نمازِ عصر کے بعد ''بلوغ المرام'' کے درس کا آغاز ہوا۔ ۲۰۰۸ء سے ۲۰۱۱ء تک تین سال میں کتاب مکمل ہوئی۔

☆......۲۰۱۱ء میں اسی مسجد میں نمازِ عصر کے بعد امام بخاری رحمہ اللہ کی کتاب ''الادب المفرد'' کا درس شروع کیا، ۲۰۱۴ء (پورے تین سال) میں پوری کتاب کا درس تکمیل کو پہنچا۔

☆...... ۲۷۔ جولائی ۲۰۱۴ء (۲۸۔ رمضان المبارک ۱۴۳۵ھ) کو مسجد مبارک ہی میں بعد نمازِ عصر ''ریاض الصالحین'' کا درس شروع کیا۔ پہلی حدیث کا درس اس فقیر نے دیا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے کہ یہ بھی اپنی پوری منزل طے کرے۔

حافظ محمد اسلم شاہدروی نے حدیث شریف کے بارے میں جو تحریری کام کیا وہ مندرجہ ذیل ہے:

☆......پوری صحیح بخاری کے اعراب کی پروف خوانی کی۔ جسے حذیفہ اکیڈمی لاہور نے شائع کیا۔

☆......مشکوٰۃ شریف کا اردو ترجمہ کیا۔ اس کی اشاعت بھی (۱۹۹۹ء میں) حذیفہ اکیڈمی لاہور نے کی۔

☆......''منتقی الاخبار'' کی احادیث پر اعراب لگائے۔ یہ کام نعمانی کتب خانہ لاہور کی طرف سے کیا گیا۔

☆......موجبات الجنۃ فی ضوء السنہ کا اردو ترجمہ کیا۔ اسے ''جنت کی تلاش احادیث کی روشنی میں'' کے نام سے ادارہ دارالابلاغ لاہور نے شائع کیا۔

☆......''الرد المتقی علی الجواہر النقی'' جو کہ ''سنن کبریٰ بیہقی پر ابن الترکمانی کے اعتراضات'' کے جواب میں مولانا فیض الرحمٰن ثوری نے عربی زبان میں لکھی۔ حافظ صاحب نے قیامِ جہلم کے دوران میں ان کی

Marfat.com

معاونت کی۔

☆......سید سابق کی تصنیف ''فقہ السنہ'' کی کتاب الطہارۃ کا ترجمہ ''طہارت کے مسائل'' کے نام سے کیا۔ جسے حدیبیہ پبلی کیشنز لاہور کی طرف سے ۲۰۰۲ء میں شائع کیا گیا۔

☆......فقہ السنہ کی کتاب ''الصلوٰۃ'' کا ترجمہ بنام ''نماز کے مسائل'' طبع ۲۰۰۳ء (یہ دونوں کتابیں حدیبیہ پبلی کیشنز نے شائع کیں)

☆......شیخ محمد بن جمیل زینو کے ایک رسالے کا ترجمہ ''نبی ﷺ کی زندگی کی ایک جھلک'' شائع کردہ دارالابلاغ۔ لاہور۔ ۲۰۰۴ء

☆......''فتاویٰ علماء البلد الحرام'' (مرتب خالد الجریسی) تین ہزار صفحات سے زائد صفحات کا ترجمہ۔ اس میں بہ کثرت احادیث درج ہیں۔ یہ ترجمہ ۱۹۹۹ء میں مکتبہ سلفیہ لاہور کے لیے کیا گیا۔ (غیر مطبوعہ)

☆......امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "اغاثہ الھفان من مصائد الشیطان" کا ترجمہ (برائے ہیثم بک کارنر لاہور) ۲۰۰۸ء میں کیا۔ ابھی چھپا نہیں۔ اس میں بھی بہت سی احادیث درج ہیں۔

اب حافظ محمد اسلم کا ارادہ یہ ہے کہ صحیح بخاری کی شرح فتح الباری، ابوداؤد کی شرح عون المعبود، جامع ترمذی کی شرح تحفۃ الاحوذی اور التعلیقات السّلفیہ علی سنن النسائی میں سے کسی کا اردو ترجمہ کیا جائے۔

آج کل حافظ صاحب ''دارالمعارف'' میں کام کرتے ہیں۔ یہ ادارہ پروفیسر عبدالقیوم مرحوم ومغفور کے صاحب زادۂ گرامی (ریٹائرڈ) میجر زبیر قیوم صاحب نے ۲۰۰۸ء میں مسجد مبارک میں قائم کیا تھا۔ ادارے کی بہت بڑی لائبریری ہے، جس سے تصنیف وتالیف کا کام کرنے والے حضرات استفادہ کرتے ہیں۔ کسی زمانے میں پروفیسر صاحب مرحوم نے سیرۃ النبی ﷺ سے متعلق کام کرنے کے لیے ایک تفصیلی خاکہ تیار کیا تھا، افسوس ہے اس خاکے کی روشنی میں موت نے ان کو کام کرنے کی مہلت نہ دی۔ اب دارالمعارف کے اصحاب علم کی ایک کمیٹی اس اہم کام کی انجام دہی میں مصروف ہے اور حافظ صاحب اس کمیٹی کے رکن ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ اہم کام جلد تکمیل کی منزل کو پہنچے اور لوگ اس سے مستفید ہوں۔

حافظ صاحب ترجمہ وتصنیف اور درس وخطابت سے بالخصوص دلچسپی رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں انھوں نے اب تک جو خدمات سرانجام دیں، اس کی تفصیل خوانندگانِ محترم کے علم میں آئی۔ نیز جو تحریری کام وہ آج کل کررہے ہیں، اس کے متعلق بھی عرض کردیا گیا ہے۔ وہ محنت اور دلچسپی سے مشغولِ عمل رہے تو ان شاء اللہ اپنے نیک ارادوں میں کامیاب ہوں گے۔

❀❀❀❀

Marfat.com

حافظ ڈاکٹر عبدالرزاق ظہیر

(ولادت ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۸۱ء)

حافظ ڈاکٹر عبدالرزاق کے والد کا نام کمال دین اور دادا کا نام بگا تھا۔ تقسیم ملک سے قبل یہ لوگ مشرقی پنجاب کے ضلع فیروز پور کے موضع سوڈیوال میں سکونت پذیر تھے۔ تقسیم کے زمانے میں ضلع قصور کی تحصیل پتوکی میں ملتان روڈ پر پتوکی اور واں رادھارام کے درمیان موضع گگہ چک نمبر ۲۹ میں آ بسے۔

حافظ عبدالرزاق کے والد کمال دین نے زراعت پیشہ تھے۔ وہ پڑھے لکھے نہیں تھے، لیکن بہت سمجھ دار تھے۔ والدہ نے ناظرہ قرآن مجید پڑھا تھا اور حافظ محمد لکھوی کی پنجابی نظم کی کتاب احوال الآخرت اور اس قسم کی بعض دیگر کتابیں اپنے بزرگوں سے پڑھی تھیں اور یہ کتابیں وہ عورتوں اور اپنے بچوں کو سنایا کرتی تھیں۔

حافظ عبدالرزاق پانچ بھائی ہیں اور تین بہنیں۔ ان سے بڑے بھائی کا نام مشتاق احمد ہے۔ وہ فوج میں ملازم ہیں۔ وہ ایف اے پاس ہیں۔ انھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا ہے اور اسلامی کتابوں کا دلچسپی سے مطالعہ کرتے ہیں۔ ایک بہن درس نظامی کر چکی ہیں۔

عبدالرزاق ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو موضع گگہ چک نمبر ۲۹ میں پیدا ہوئے۔ اس گاؤں میں مسلک اہل حدیث سے تعلق رکھنے والوں کی اکثریت ہے۔ عبدالرزاق نے قرآن مجید اپنی والدہ سے پڑھا اور ابتدائی تعلیم گاؤں کی جامع مسجد اہل حدیث کے امام سے حاصل کی۔ بعدازاں پتوکی میں حافظ عبدالمنان کاشف سے قرآن حفظ کیا جو وہاں کی جامع مسجد قدس اہل حدیث پرانی غلہ منڈی میں بچوں کو قرآن حفظ کراتے تھے۔ حفظ قرآن کے بعد عبدالرزاق نے ۱۹۹۳ء میں قاری صدیق الحسن سے قرآن کا ایک دور مکمل کیا۔

اب حافظ عبدالرزاق نے درس نظامی کی تعلیم کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے اوکاڑہ کے مدرسہ دارالحدیث میں داخل ہوئے، لیکن یہاں ان کا قیام صرف چار مہینے رہا، پھر جامعہ رحمانیہ (ماڈل ٹاؤن، لاہور) چلے گئے، جسے اب جامعہ لاہور الاسلامیہ کہا جاتا ہے۔ یہاں انھوں نے کلیۃ القرآن میں داخلہ لیا۔ ان کے کیا اساتذہ میں سے محترم المقام قاری محمد ابراہیم میر محمدی اور مولانا محمد شفیق مدنی کے اسمائے گرامی لائق تذکرہ ہیں۔ یہاں انھوں نے تجوید کا دو سال کا کورس مکمل کیا۔

پھر جامعہ سلفیہ فیصل آباد چلے گئے۔ جامعہ سلفیہ کے محل وقوع، وسیع جگہ، علمی فضا، طلبا کی کثرت اور

Marfat.com

اساتذہ کی شفقت سے وہ نہایت متاثر ہوئے، بالخصوص مفتی عبدالحنان زاہد کے مشفقانہ رویے کا ان پر بہت اثر ہوا۔ بقول ان کے انھیں ”زندگی میں پہلی دفعہ ایک وسیع، صاف ستھرا اور پُرسکون ادارہ دیکھنے کا موقع ملا“۔ داخلے کا انٹرویو مولانا محمد ادریس سلفی اور مفتی عبدالحنان زاہد نے لیا اور انھیں داخل کر لیا گیا۔

جامعہ میں نصابی تعلیم کے علاوہ طلبا کے تقریری مقابلوں کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ آپس میں بھی اور دیگر تدریسی اداروں کے طلبا کے درمیان بھی۔ عبدالرزاق نے بھی ان مقابلوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ہر مقابلے میں انھیں پہلی یا دوسری پوزیشن حاصل ہوتی رہی۔ لیکن پھر کیا ہوا۔ خود ہی بتاتے ہیں: ”آٹھویں کلاس میں ایک تقریری مقابلے کے موقعے پر میرے ذہن میں یہ باطل خیال پیدا ہوا کہ ہر صورت میں میری پوزیشن آ کر رہے گی لیکن میری کوئی پوزیشن نہ آئی“۔

بہر حال جامعہ سلفیہ کی خالص علمی فضا سے یہ بہت متاثر ہیں اور اساتذہ کرام کے اسلوبِ تدریس کے بے حد مداح۔

موسم گرما میں جامعہ کے اساتذہ وطلبا پر مشتمل ایک وفد ہر سال علاقہ گلیات میں دعوتی وتفریحی دورے پر جایا کرتا تھا۔ حافظ عبدالرزاق ظہیر کو بھی دو مرتبہ اس وفد کی رفاقت کا موقع ملا۔ معلوم نہیں یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے یا ختم ہو گیا ہے۔

جامعہ سلفیہ میں ایک بہت ضروری سہولت یہ حاصل ہے کہ اس کے نصاب کے مطابق تعلیم کے ساتھ ساتھ اگر کوئی طالب علم چاہے تو عصری تعلیم سے بھی بہرہ مند ہو سکتا ہے اور ایسے طالب علم کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، چنانچہ حافظ عبدالرزاق نے جامعہ میں رہ کر میٹرک اور ایف اے کے امتحانات پاس کیے، فاضل عربی کا امتحان بھی دیا اور کامیاب ہوئے۔ اے۔ ٹی۔ سی کے امتحان میں بھی کامیابی حاصل کی۔

۲۰۰۳ء میں وہ جامعہ سلفیہ سے فارغ ہوئے، اسی سال انھوں نے بی اے کی تیاری شروع کر دی۔ امتحان دیا تو چودھری محمد یاسین ظفر (پرنسپل جامعہ) کا پیغام پہنچا کہ جامعہ کی طرف سے ایوبیہ جا کر وہاں کی جامع مسجد اہل حدیث میں خطابت وامامت کا فریضہ سرانجام دیں، چنانچہ یہ وہاں گئے اور چھ مہینے وہاں خطابت وامامت کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کا ترجمہ بھی پڑھاتے رہے۔ رمضان المبارک میں نماز تراویح بھی پڑھائی، لیکن یہ سلسلہ صرف چھ مہینے جاری رہا۔

بعدازاں چودھری محمد یاسین ظفر کے مشورے سے انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبہ دعوت اکیڈمی کے سہ ماہی ائمہ کورس میں شامل ہوئے۔ اس میں بعض عرب ممالک کے لوگ بھی تھے۔ وہاں ان سے عربی میں گفتگو ہوتی تھی، جس کا انھیں بہت فائدہ پہنچا۔

Marfat.com

کچھ عرصہ جامعہ کے پرنسپل چودھری محمد یاسین ظفر کے کہنے پر انھیں بالاکوٹ کی جامع مسجد اہل حدیث کے منصب خطابت پر متمکن رہنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ یہ وہی مقام ہے جہاں ۶۔ مئی ۱۸۳۱ء کو مولانا اسماعیل دہلوی، سید احمد رائے بریلوی اور ان کے ساتھ بہت سے مجاہدین نے جہاد کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا تھا۔ رحمہم اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃ۔

ایوبیہ اور بالاکوٹ کی خطابت وامامت کے زمانے کا وظیفہ انھیں جامعہ سلفیہ کی طرف سے ملتا تھا۔

جامعہ سلفیہ کے زمانۂ طالب علمی میں حافظ صاحب فیصل آباد کی مختلف مساجد میں خطبہ جمعہ بھی ارشاد کرتے رہے۔ اپنے بعض اساتذہ کرام (مثلاً حافظ مسعود عالم، مولانا محمد یونس بٹ اور مفتی عبدالحنان زاہد) کی جگہ پر بھی ان حضرات کے فرمان کے مطابق انھیں جمعہ پڑھانے کا شرف حاصل ہوا۔

۲۰۰۴ء میں انھیں جامعہ سلفیہ میں مدرس مقرر کرلیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی فیصل آباد کی جی سی یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں ایم فل میں داخلہ لے لیا اور اپنی کلاس میں اول پوزیشن حاصل کی۔

اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے بی ایڈ اور سرگودھا یونیورسٹی سے فسٹ ڈویژن میں ایم اے عربی کیا۔

۲۰۰۹ء میں پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا۔ عربی مقالے کا عنوان ”القصة القرآنية واثرها في الغصة الاردية“ ستمبر ۲۰۱۴ء میں یہ مرحلہ بھی طے ہوگیا اور یہ حافظ ڈاکٹر عبدالرزاق ظہیر بن گئے۔ مبارک ہو جامعہ کے پرنسپل چودھری محمد یاسین ظفر سمیت تمام اساتذہ کو اور ڈاکٹر صاحب کو۔!

ڈاکٹر صاحب ممدوح فیصل آباد کی ایک مسجد میں جمعہ بھی پڑھاتے ہیں اور قرآن مجید کا درس بھی دیتے ہیں۔

ان کے اساتذہ کے اسمائے گرامی اس مضمون کے مختلف مقامات میں مذکور ہیں۔ ان میں سے جو حضرات وفات پاچکے ہیں، اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور جو لائق احترام حضرات زندہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو خدمت دین کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

امید رکھنی چاہیے کہ جامعہ سلفیہ کے لائق تکریم اساتذہ کی کوشش اور حوصلہ افزائی سے دیگر طلبا بھی اس قسم کی تعلیمی منازل طے کرنے کا عزم کریں گے اور جامعہ کی شہرت کا باعث بنیں گے۔

❀❀❀❀

Marfat.com

قاری عزیز احمد راشد

(ولادت ۱۰۔ اپریل ۱۹۸۲ء)

عزیز احمد راشد کے والد کا نام زبیر احمد اور دادا کا نام محمد حسن تھا۔ یہ خاندان دراصل مشرقی پنجاب کے ضلع فیروز پور کے ایک گاؤں ''کھڈور'' کا رہنے والا تھا۔ تقسیم ملک کے زمانے میں عزیز احمد راشد کے دادا محمد حسن ایک قافلے کے ساتھ اپنے مسکن سے روانہ ہوئے تو راستے میں سکھوں نے قافلے پر حملہ کر دیا اور وہ زخمی ہو گئے۔ اس وقت ان کا ایک چھوٹا سا بیٹا بھی ان کے ساتھ تھا۔ کسی کے پاس کھانے پینے کو کوئی چیز نہ تھی۔ چلتے چلتے یہ لوگ رات کو ایک جگہ ٹھہرے تو بھوک اور پیاس کی وجہ سے بچہ رونے لگا۔ سکھ بھی ان کے اردگرد چکر لگا رہے تھے۔ محمد حسن کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ بچے کے رونے کی آواز سن کر سکھ قافلے پر حملہ کر دیں گے اور بہت سے لوگ مارے جائیں گے۔ اس خطرے کی وجہ سے انھوں نے بچے کا گلا دبا کر اسے مار دیا اور پھر وہیں دفن کر کے سکھوں سے چھپتے چھپاتے قافلے کے آگے کو روانہ ہو گئے۔

پاکستان آ کر محمد حسن نے ننکانہ شہر کے قریب چک ۱۴۱ پنسیاں والا میں سکونت اختیار کی۔ وہیں ۱۹۵۱ء میں ان کے بیٹے زبیر احمد کی ولادت ہوئی۔ کچھ عرصہ ننکانہ صاحب رہنے کے بعد محمد حسن اپنے اہل و عیال کے ساتھ ڈیرہ غازی خاں چلے گئے۔ وہاں تقریباً بیس سال ان کا قیام رہا۔ پھر وہاں کی زمین فروخت کر کے ضلع مظفر گڑھ کے ایک گاؤں چک نمبر ۱۲۸ میں آ گئے۔

زبیر احمد کچھ بڑے ہوئے تو انھوں نے دینیات کی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں داخل ہوئے۔ چھ سال وہاں کے لائق احترام اساتذہ سے تحصیل علم کرتے رہے۔ پھر جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن چلے گئے۔ وہیں سے سند فراغت لی۔

جامعہ سلفیہ میں مولانا زبیر احمد کے ایک استاذ مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی تھے۔ جن سے زبیر احمد بہت متاثر تھے۔ حافظ صاحب جامعہ سلفیہ سے منڈی تاندلیاں والا چلے گئے تھے اور وہاں انھوں نے تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، مولانا زبیر احمد نے ماموں کانجن سے فراغت کے بعد تاندلیاں والا میں حافظ صاحب ممدوح کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے دوبارہ صحیح بخاری پڑھی۔

فارغ التحصیل ہونے بعد مولانا زبیر احمد ضلع قصور میں پتوکی کے قریب موضع سریسر چک نمبر ۲۱ میں

Marfat.com

خطابت وامامت کا فریضہ سرانجام دینے لگے تھے۔ وہیں ۱۰۔اپریل ۱۹۸۲ء کو عزیز احمد راشد پیدا ہوئے۔

چار سال کی عمر میں عزیز احمد کو سریسر کے گورنمنٹ پرائمری سکول میں داخل کرادیا گیا۔ پرائمری پاس کرنے کے بعد والد نے ان کو قرآن مجید حفظ کرنے کے لیے منڈی تاندلیاں والا کے قریب موضع کمیانہ چک بھیج دیا۔ وہاں انھوں نے قاری عبدالخالق سے سات پارے حفظ کیے۔ پھر جامعہ رحمانیہ ماڈل ٹاؤن لاہور آگئے۔ وہاں قاری محمد اشرف صاحب سے پورا قرآن مجید حفظ کیا۔ اسی جامعہ میں دوسالہ تجوید کا کورس مکمل کیا۔

بعدازاں جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں داخلہ لیا۔ جامعہ سلفیہ کی تعلیم کے دوران ہی میں میٹرک اور ایف اے کے امتحانات دیے۔ فاضل عربی بھی میں کیا۔ اسی اثنا میں اے۔ٹی۔سی کا کورس بھی کرلیا اور ۲۰۰۲ء میں جامعہ سلفیہ سے فارغ ہوگئے۔

جامعہ سلفیہ کی طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے متعدد تقریری اور تحریری مقابلوں میں حصہ لیا، جن میں زیادہ تر اول پوزیشن حاصل کی اور انعامات کے مستحق قرار پائے۔ مروّجہ تعلیم سے فراغت کے بعد عزیز احمد راشد نے ایک سال گھر میں گزارا۔ پھر دوسال ۲۰۰۴ء سے ۲۰۰۶ء تک دارالسلام کے شعبہ ریسرچ میں کام کیا۔ پھر ۲۰۰۶ء میں جامعہ سلفیہ میں بہ طور استاذ خدمت سرانجام دینے لگے۔ یہ سلسلہ اگست ۲۰۰۹ء تک جاری رہا۔ پھر بہ طور عربی ٹیچر سرکاری سکول میں ملازمت کرنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی جمعۃ المبارک کی خطابت کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ جامعہ سلفیہ کی طالب علمی کے زمانے میں بھی یہ فیصل آباد کی بعض مساجد میں خطبہ جمعہ دیتے رہے تھے۔

قاری عزیز احمد راشد تحریر ونگارش سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں (جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا) دارالسلام سے دوسال ان کا تعلق رہا۔ اب تک ان کی قلمی کاوشیں مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ دارالسلام کی طرف سے تفسیر ابن کثیر کا اردو ترجمہ شائع ہوا ہے۔ قاری صاحب نے اس تفسیر کے دس پاروں کی تخریج کا کام کیا۔

۲۔ صحیح اسباب النزول (اردو) ادارہ دارالسلام کے ارباب انتظام (بقول قاری صاحب) قرآن مجید کے صحیح اسباب النزول پر اردو میں کتاب شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ کام قاری صاحب نے مکمل کرکے مسودہ انھیں دے دیا ہے۔

۳۔ آسان تجوید: عام لوگوں کو آسان صورت میں تجوید کے قواعد پڑھانے کے لیے کتابچہ شائع کیا گیا ہے۔

۴۔ آسان نحو: اس کتابچے میں علم نحو کو سمجھنے کے لیے آسان طریقے سے قواعد ترتیب دیے گئے ہیں۔

۵۔ آسان صرف: اس میں علم صرف کو آسان طریقے سے سمجھنے کے لیے کچھ قواعد بیان کیے گئے ہیں۔

Marfat.com

یہ تینوں کتابچے (آسان تجوید، آسان نحو، آسان صرف) الفرقان اکیڈمی پتوکی (ضلع قصور) میں پڑھائے جاتے ہیں۔

تو قاری عزیز احمد راشد جامعہ سلفیہ کے تمام اساتذہ کے احسان منداور مداح ہیں اور نہایت احترام سے ان کے نام لیتے اور وہاں کے خالص علمی ماحول کا بہترین انداز میں تذکرہ کرتے ہیں۔ ان کے اساتذہ کرام کے اسمائے سامی مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) مولانا حافظ عبدالعزیز علوی
(۲) حافظ مسعود عالم
(۳) مولانا محمد یونس بٹ
(۴) مولانا محمد اکرم مدنی
(۵) مفتی عبدالحنان زاہد
(٦) چودھری محمد یٰسین ظفر
(۷) قاری محمد ابراہیم محمدی
(۸) قاری محمد اشرف
(۹) قاری عبدالخالق
(۱۰) حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی

Marfat.com

قاری ذکاء اللہ حافظ آبادی

(ولادت ۱۹۸۵ء)

جن لوگوں نے نہایت مشکل حالات میں تعلیم حاصل کی، ان میں قاری ذکاء اللہ حافظ آبادی کا نام بالخصوص قابل ذکر ہے۔ یہ ضلع حافظ آباد کے ایک گاؤں طوطرہ میں ۱۹۸۵ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد حیات تھا۔ پانچ برس کے ہوئے تو گھر میں والدہ سے ناظرہ قرآن پڑھنا شروع کیا۔ آٹھ برس کی عمر کو پہنچے تو گورنمنٹ پرائمری سکول طوطرہ میں داخل کرا دیے گئے۔ والدین ان پڑھ تھے اور گھر میں غربت بھی تھی، اس لیے تعلیم کے سلسلے میں خرچ کرنا ممکن نہ تھا۔ انتہائی کس مپرسی کی حالت میں حصولِ علم کا شوق پورا کیا۔

اسی شوق کی وجہ سے ہر سال اپنی جماعت میں اوّل پوزیشن میں کامیاب ہوتے رہے۔ پانچویں جماعت میں علاقے کے دس سکولوں کے مشترکہ امتحان میں پورے سینٹر میں اول پوزیشن حاصل کی۔

پرائمری پاس کرنے کے بعد حافظ آباد میں دیوبندی حضرات کے مدرسہ اشرفیہ میں حفظ قرآن کے لیے داخلہ لیا۔ یہاں قاری سلطان محمود کاموں کی والے ان کے استاذ تھے۔ ازاں بعد قاری طاہر پانی پتی کے مدرسے میں چلے گئے۔ پھر حالات ایسے پیدا ہوئے کہ حافظ آباد کے دار الحدیث محمدیہ میں داخلہ لیا۔ یہاں قاری محمد یاسین سے پورا قرآن مجید حفظ کیا۔ حفظِ قرآن کے بعد تجوید و قراءات کا شوق پیدا ہوا، اس کے لیے جامعہ اسلامیہ سلفیہ ماڈل ٹاؤن گوجراں والا میں داخل ہوئے۔ وہاں تھوڑا عرصہ ہی رہے، پھر مدرسہ عالیہ تجوید القرآن لسوڑے والی لاہور میں حضرت قاری محمد ادریس عاصم کی خدمت میں حاضری دی۔ یہاں دو سال قاری صاحب کے حلقۂ شاگردی میں رہنے کا شرف حاصل ہوا۔ قاری نجم الصبیح تھانوی سے ''جمال القرآن'' اور بعض دیگر کتابیں پڑھیں۔

پھر محکمہ اوقاف کے تین ماہ کے تجویدی کورس میں شرکت کے لیے رنگ محل لاہور کے ایک مدرسے میں قاری مومن شاہ صاحب کے ہاں گئے اور تجویدی کورس کی سند لی۔

اس کے بعد قرآن فہمی کا شوق انھیں جناب عطاء الرحمٰن ثاقب کی خدمت میں لے گیا۔ اس وقت ثاقب مرحوم اے جی آفس میں فہم قرآن کے موضوع پر لیکچر دیا کرتے تھے، جس میں بہت سے لوگ حاضر ہوتے تھے۔ وہاں یہ امتحان تو نہ دے سکے لیکن عربی گریمر کی خاصی سوجھ بوجھ پیدا ہوگئی۔

Marfat.com

۲۰۰۲ء میں یہ پھر قاری محمد ادریس عاصم کے مدرسے میں داخل ہوئے اور ان سے سندِ فراغت لی۔ سند ملنے کے بعد امامیہ کالونی میں مولانا محمد سرور مرحوم کی مسجد محمدی میں مدرس کے طور پر خدمات سرانجام دینے لگے۔ وہاں ان کی ماہانہ تنخواہ ڈھائی ہزار روپے تھی۔ اس تنخواہ پر یہ بہت خوش تھے۔ لیکن پھر جی میں آیا کہ درس نظامی کی تکمیل کرنی چاہیے۔ جب تک تمام دینی علوم سے آشنائی نہ ہو، بات نہیں بنے گی۔ اس کا اظہار انھوں نے فیروز وٹواں کے حکیم محمد طارق سے کیا تو وہ انھیں موضع مرید کے لے گئے اور وہاں کے مدرسے میں داخل کرا دیا۔ اب یہ تدریس قرآن کی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو کر دینیات کی کتابیں پڑھنے لگے، جسے دینی مدارس کی بولی میں درس نظامی کہا جاتا ہے۔ یہاں دو سال ان کا قیام رہا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ یہاں جہاد کی ٹریننگ، تیراکی، گھوڑ دوڑ وغیرہ میں بھی حصہ لیتے رہے۔

اللہ تعالیٰ نے قاری ذکاء اللہ حافظ آبادی کو محنت اور توجہ سے پڑھنے کی وجہ سے کامیابی عطا فرمائی۔ وہ ہر امتحان میں اول پوزیشن میں پاس ہوتے تھے۔ مرکز طیبہ مرید کے میں ایک سالانہ امتحان بڑے مدارس کے درمیان بہ صورتِ مقابلہ ہوتا ہے، قاری ذکاء اللہ اس امتحان میں بھی اول رہے۔ اس کا نتیجہ مرکز یرموک پتوکی میں منعقدہ اجتماع میں سنایا گیا۔

ان امتحانی کامیابیوں کے ساتھ ساتھ قاری ذکاء اللہ معاشی پریشانی میں بھی مبتلا رہے۔ مرید کے میں پڑھائی کے دوران خرچ کے لیے ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت ماہانہ تین چھٹیوں میں یہ تین دن مزدوری کرتے تھے اور ٹھیکے دار انھیں ۸۰ روپے دیہاڑی دیتا تھا۔ اسی رقم سے یہ اپنے اخراجات پورے کرتے تھے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یہ لوگوں کی جوتیاں مرمت کرنے پر مجبور ہوئے۔ حسنِ اتفاق سے یہ اس کام سے تھوڑا بہت تعلق رکھتے ہیں، اس لیے کہ یہ اسی محنت کش برادری کے فرد ہیں۔

قیامِ مرید کے کے زمانے میں انھوں نے ایک دوست سے سو روپے قرض لیے اور مولانا مبشر احمد ربانی کے مدرسہ ام القریٰ میں لاہور آ گئے اور حصولِ علم کرنے لگے۔ ساتھ ہی ایک مسجد میں امامت کا سلسلہ شروع کر دیا، اس مسجد سے انھیں ڈیڑھ سو روپے تنخواہ ملتی تھی۔ لیکن ساتھ ساتھ اضافہ بھی ہوتا رہتا تھا۔ جب ایک ہزار روپے تنخواہ مقرر ہوئی تو بغیر کسی وجہ سے امامت کا معاملہ ختم ہو گیا۔

مولانا مبشر احمد ربانی سے تعلیم کے زمانے میں انھیں مناظرے کے فن سے بھی آگاہی ہوئی۔ تحقیق و تخریج سے بھی تعلق پیدا ہوا اور دل میں تصنیف و ترجمہ کے شوق نے بھی انگڑائی لی۔

پھر وہ لاہور جامعہ الاسلامیہ میں داخل ہوئے۔ ایک سال وہاں رہے۔ پانچ سو روپے ماہانہ کی ایک ٹیوشن مل گئی، لیکن مجموعی طور پر حالات نامساعد ہی تھے۔

Marfat.com

ایک دن ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ ٹیوشن سے پانچ سو روپے ماہانہ ملنے والی رقم مہینا ختم ہونے سے ایک دن پہلے ختم ہوگئی اور ان کے پاس کھانے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ بھوک کی شدت سے برا حال تھا۔ یہ ایک مسجد میں نماز پڑھنے گئے۔ وہاں مسجد کے ایک کونے میں بیٹھے اللہ سے دعا بھی مانگ رہے تھے اور رو بھی رہے تھے۔ اتنے میں ایک شخص مسجد میں آیا جس کا نام سلیم تھا۔ اس نے ان سے پوچھا: اذان دو گے؟ انھوں نے ہاں میں جواب دیا تو اس نے کہا: اذان دو۔ انھوں نے اسی طرز میں اذان دی جس طرز میں حرم شریف میں دی جاتی ہے۔ اذان دے کر دو رکعت نماز پڑھی اور اللہ سے دعا کرنے لگے۔ اتنے میں ایک خاتون آئی، اس نے سلیم سے پوچھا: اذان کس نے دی ہے؟ اس نے کہا: اس لڑکے نے اذان دی ہے۔ خاتون نے کہا میں عمرہ کر کے آئی ہوں۔ حرم شریف میں اسی طرح اذان دی جاتی ہے، جس طرح اس لڑکے نے دی ہے۔ اس خاتون نے ان کی آواز سے متاثر ہو کر انھیں تین سو روپے بہ طور انعام دیے۔ یہ رقم اس وقت قاری ذکاء اللہ کے لیے اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا عطیہ تھا۔ اس پر انھوں نے اللہ کا بے حد شکر ادا کیا۔

بعدازاں وہ جامع مسجد ریاض الجنۃ ملتان روڈ (لاہور) میں امامت کرانے لگے۔ دس مہینے وہاں امامت کرائی۔ پھر مسجد ایمان (مولانا عبدالرحمٰن کیلانی والی) میں کچھ عرصہ سلسلہ امامت جاری رہا۔ اس کے بعد جامعہ اسلامیہ صادق آباد چلے گئے۔ وہاں حافظ ثناء اللہ زاہدی کے حلقہ شاگردی میں داخل ہوئے اور ان سے مختلف علوم کی کتابیں پڑھیں۔ پھر اسی مدرسے میں حافظ ثناء اللہ زاہدی نے انھیں تدریسی خدمات انجام دینے پر مامور کر دیا۔ چار سال وہاں ان کا سلسلہ درس جاری رہا۔

اب اللہ نے ان پر ایسا کرم فرمایا کہ وہ ۱۰۔ مارچ ۲۰۱۱ء کو اپنی بوڑھی والدہ کے ساتھ مکہ مکرمہ گئے۔ وہاں عمرہ ادا کیا اور بیت اللہ شریف کی زیارت سے بہرہ یاب ہوئے۔ پھر مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے اور کئی دن ان کا دیار پاک میں قیام رہا۔ اسی سفر میں شیخ عبدالمحسن العباد سے صحیح بخاری کا کچھ حصہ سننے کی سعادت حاصل ہوئی۔

عمرہ ادا کر کے جامعہ اسلامیہ صادق آباد گئے اور اپنے استاذِ مکرم حافظ ثناء اللہ زاہدی کی خدمت میں حاضری دی اور آئندہ تدریس سے معذرت کی۔ بعدازاں المعہد الشریعہ کوٹ ادو میں تدریس شروع کی۔ کچھ عرصے کے بعد یہاں سے بھی کوچ کیا اور مدرسہ بدرالہدیٰ موضع واہنڈو (ضلع گوجراں والا) میں ڈیرا لگا لیا۔ اب وہیں خدمت تدریس انجام دے رہے ہیں۔

تصنیف و تالیف اور مضمون نگاری کا ذوق بھی رکھتے ہیں۔ پہلا مضمون ''بیماریوں کے فائدے'' کے عنوان سے ۲۰۰۷ء میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں چھپا۔ ایک عربی رسالے کا ''مریض کے احکام'' کے نام

Marfat.com

سے اردو ترجمہ کیا۔ ایک مقالہ حیدر آباد کے ''دعوت اہل حدیث'' کے ختم نبوت نمبر میں شائع ہوا۔ علاوہ ازیں اور بھی مختلف مضامین بعض جماعتی رسائل و جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔

کتابی صورت میں ان کی مساعی یہ ہیں: (۱) مسئلہ مسواک کے متعلق بہت سی احادیث (۲) شرح عقیدہ واسطیہ اردو ترجمہ و فوائد (۳) نماز محمدی مع مسنون دعائیں (۴) فوائد الصلوٰۃ (۵) فوائد التوبہ والاستغفار (۶) جشن عید میلاد النبی (یہ ایک بریلوی عالم کی کتاب کا جواب ہے۔) (۷) عقیدہ نور و بشر (۸) حمایۃ النحو حاشیہ علی ہدایۃ النحو، عربی (۹) عربی، اردو، انگلش بول چال (۱۰) التحقیق للنووی للرجال المسلم للنووی (۱۱) الجہد للکافی فی شرح مسند الامام الشافعی، مسند الامام شافعی کا اردو ترجمہ (۱۲) حیات الشیخ محمد علی جانباز و خدماتہ العلمیہ، عربی (۱۳) سلطان باہو کے عقائد و نظریات۔ ان کے علاوہ بھی بعض کتابیں عربی اور اردو میں لکھیں، جن میں سے بعض چھپ گئی ہیں اور بعض ابھی نہیں چھپیں۔

ان کے اساتذہ کی فہرست بڑی وسیع ہے۔ ان میں سے بعض کے نام گزشتہ سطور میں آ چکے ہیں، جو نہیں آئے ان میں مولانا عبدالرحمٰن ثانی بن حافظ عبدالمنان نور پوری، مولانا عباد بھٹوی، مولانا عبدالحمید سندھی، مولانا عبدالرحمٰن ثاقب، مولانا محمد رمضان سلفی شیخ الحدیث جامعہ رحمانیہ لاہور، مولانا نعمان لکھوی، مولانا عامر لکھوی اور دیگر متعدد حضرات شامل ہیں۔

(یہ سطور ۳۰۔ جولائی ۲۰۱۳ء کو لکھی گئیں۔)

❀❀❀❀

Marfat.com

تذکرۂ خاص

تحریر: عمر فاروق قدوسی

سعید احمد بھٹی مرحوم

جناب سعید احمد بھٹی محترم مولانا محمد اسحاق بھٹی کے برادر خورد تھے۔ انھوں نے بھٹی صاحب کی زیر سرپرستی زندگی کا سفر طے کیا۔ وہ بھٹی صاحب کے برادر خورد ہی نہیں تھے بلکہ ان کے خدمت گار اور معاون بھی تھے۔ بھٹی صاحب کے بڑھاپے میں ان کے آرام وسکون کا خیال رکھا۔ راقم السطور نے مناسب سمجھا کہ سعید احمد بھٹی مرحوم کی وفات پر اپنی اس تحریر کو جناب بھٹی صاحب کی آخری کتاب کے آخر میں شامل کر دوں۔ اس لیے کہ سعید احمد بھٹی محترم محمد اسحاق بھٹی صاحب کی کتاب زندگی کا ایک باب ہی تو تھے.......... آخری باب!

حضرت بھٹی صاحب کے برادر خورد سعید احمد بھٹی بھی چل بسے۔ ان کی وفات کی خبر بالکل غیر متوقع تھی۔ بلکہ ایک اعتبار سے ان کی وفات کا سن کر بھٹی صاحب سے بھی زیادہ دھچکہ لگا۔ اس لیے کہ بھٹی صاحب تو طویل عمر پا چکے تھے۔ اگر چہ مختصر سی علالت کے بعد انھوں نے وفات پائی۔ بھٹی صاحب کی پیرانہ سالی سے دل میں یہ وساوس اٹھتے ہی رہتے تھے کہ خدا جانے کب ان کی طرف سے خبر آ جائے۔ لیکن سعید احمد بھٹی صاحب کی وفات کا تو سان گمان بھی نہ تھا۔ شوگر تو اب ایک روایتی بیماری ہو چکی ہے۔ شوگر ہائی ہونے سے سعید بھٹی کی وفات ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں۔

جب بھٹی صاحب کے ہاں جانا ہوتا تو سعید صاحب سے ضرور ملاقات ہو جاتی۔ بلکہ اکثر اوقات دروازہ بھی وہی کھولتے۔ بھٹی صاحب کو اطلاع کرتے اور بھٹی صاحب اپنے ناتواں مگر مضبوط وجود کو سنبھالتے ہوئے بیٹھک میں تشریف لے آتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بھٹی صاحب گرمیوں کے دنوں میں ایک بنیان اور تہبند زیب تن کیے اپنی یادداشتوں کے سمندر میں غوطہ زن ہوتے اور جواہرات تلاش کر رہے ہوتے، سعید صاحب پاس جا کر قدرے بلند آواز سے کہتے ابو جی! عمر صاحب آئے ہیں۔ بھٹی صاحب مجھے دیکھ کر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جلدی سے اٹھ کھڑے ہوتے، مصافحہ بھی کرتے اور معانقہ بھی۔ اوکی حال اے! پھر بھٹی صاحب ضرور کوئی جملہ چست کرتے اور میں وضاحت کرتا ہوا بیٹھ جاتا۔ سعید صاحب پاس کھڑے مسکرا رہے ہوتے۔ پھر بھٹی صاحب انہیں کہتے کہ جاؤ کوئی چائے پانی لے کر آؤ۔ سعید صاحب کہتے کہ چائے بن رہی ہے یا سخت گرمیوں میں سرخ رنگ کے مشروب سے مہمان نوازی ہوتی۔ اب یہ میزبان ماضی کا قصہ بن چکے ہیں اور مہمان کی یادوں میں ان کا بسیرا ہے۔

Marfat.com

سعید صاحب جناب بھٹی صاحب کے نہ صرف معاون تھے بلکہ بھٹی صاحب کی تخلیقات کی تفصیلات بھی انہیں بہت اچھی طرح یاد تھیں۔ وہ بھٹی صاحب کے قدیم و جدید مضامین ہی نہیں بلکہ ان کا ایک ایک کاغذ بھی سنبھال کر رکھتے۔ کسی دور میں بھٹی صاحب نے روزنامہ امروز میں خواتین کے ہفتہ وار ایڈیشن میں نامور مسلم خواتین کے بارے میں تعارفی خاکے لکھنے شروع کیے۔ اس کا عنوان ''بنات الاسلام'' تھا۔ مختصر مگر جامع خاکے تھے جو بے حد پسند کیے گئے۔ یہ مضامین سعید بھٹی نے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے اور بڑے سلیقے سے ترتیب لگائی ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ بھٹی صاحب نے ذکر کیا کہ میرے کچھ مضامین خواتین اسلام کے بارے میں تھے، معلوم نہیں کہاں رکھے گئے ہیں۔ اگر وہ مل جائیں تو بہت عمدہ بات ہے۔ میں نے عرض کی آپ تلاش کریں، ہم انھیں شائع کریں گے۔ سعید صاحب نے فوراً کہا کہ آپ ان کی ترتیب کا کام کریں، مضامین میرے پاس محفوظ ہیں۔ چند دنوں بعد سعید صاحب نے مطلوبہ مضامین بھٹی صاحب کے سپرد کیے اور مجھے اطلاع کر دی۔ میں بھٹی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے عرض کی کہ بس آپ ترتیب دے دیں تاکہ میں کمپوزنگ شروع کروا سکوں۔ پھر ان مضامین کو بھٹی صاحب نے ترتیب دیا۔ کچھ ردو بدل کیا اور کچھ حک و اضافہ۔ اس طرح وہ کتاب ''اسلام کی بیٹیاں'' کے نام سے شائع ہو گئی۔ یہ کتاب چھ سو صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ۱۴۳ خواتین کا تذکرہ ہے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جناب بھٹی صاحب کی اس عمدہ کاوش کی اشاعت ان کے چھوٹے بھائی سعید احمد بھٹی کی ذاتی دلچسپی کے نتیجے میں ہوئی۔ اخبارات میں ان مضامین کی اشاعت اور کتابی صورت میں اشاعت کے درمیان تقریباً اڑتیس برس کا طویل فاصلہ تھا۔

سعید بھٹی اپنے برادر بزرگ مولانا اسحاق بھٹی صاحب کے مسودات اور تحریروں کو بہت حفاظت سے رکھتے تھے۔ بلکہ ان پر گہری نظر رکھتے تھے۔ کون سا خط ضروری ہے اور کون سا غیر اہم، کس تحریر کی کس وقت ضرورت پڑ سکتی ہے اور کون سا مضمون بھٹی صاحب طلب کر سکتے ہیں، انہیں اس کا اندازہ ہوتا تھا۔ کتنی ہی بار ایسا ہوا کہ بھٹی صاحب کے ہاں گیا۔ انہیں کسی کتاب یا تحریر کی ضرورت پڑی، سعید صاحب کو آواز دی۔ اوئے سعید! سعید! سعید صاحب پلک جھپکتے حاضر! جی ابو جی! او یار یہاں میرے نام فلاں کا خط آیا تھا، مل نہیں رہا۔ عمر کو میں نے پڑھانا ہے۔ ابو جی! یہیں پڑا تھا اور جناب بھٹی صاحب کو ان کی مطلوبہ چیز دے دیتے۔ پھر مسکرا کر میری طرف دیکھتے اور کہتے ابو جی کی چیزوں کا مجھے پتا ہوتا ہے، اور مجھے یہ بھی پتا تھا کہ آپ نے آنا ہے اور ابو جی آپ کو یہ خط دکھائیں گے۔ کبھی بھٹی صاحب کو کسی کتاب کی ضرورت پیش آتی تھی تو سعید صاحب سے کہتے کہ فلاں جگہ کتاب پڑی ہے۔ لے کر آؤ۔ اس طرح سعید صاحب بھٹی صاحب کے بھائی ہی نہیں بلکہ ان کے خدمت گار بھی تھے اور ان کے مسودات کے محافظ بھی۔

Marfat.com

جو دوست بھٹی صاحب کے ہاں مستقل جانے والے تھے، انہیں علم ہے کہ وہاں میز پر کاغذات کا انبار لگا ہوتا تھا۔ جن دنوں بھٹی صاحب کوئی تحقیقی مضمون لکھ رہے ہوتے، اس مضمون سے متعلق مصادر و مراجع ان کی میز اور صوفے پر ہوتے، پھر اعزازی رسائل و جرائد الگ سے آئے ہوتے۔ درجنوں کے حساب سے خطوط علیحدہ بکھرے ہوتے۔ بھٹی صاحب کا وہی ڈرائنگ روم تھا، وہیں مہمانوں کے لیے چائے پانی اور کھانے کا انتظام ہوتا اور وہیں بھٹی صاحب تحریر و تصنیف میں مشغول نظر آتے۔ اس کی تفصیل تو اس مضمون میں ذکر کروں گا جو حضرت بھٹی صاحب کے بارے میں لکھوں گا۔ تا حال ابھی ان کے بارے میں لکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی۔ کتنی ہی مرتبہ ارادہ کیا کچھ لکھنے کا مگر لکھ نہ پایا۔ ان کا ہنستا مسکراتا چہرہ سامنے آ جاتا اور خیالوں ہی خیالوں میں ان سے باتوں میں مصروف ہو جاتا۔ دیکھیے کیسی عجیب بات ہے! سعید بھٹی رحمہ اللہ سے ہمارا تعلق واسطہ محترم بھٹی صاحب کی وجہ سے تھا۔ بھٹی صاحب کے بارے میں دو سطریں نہیں لکھ سکا اور سعید بھٹی رحمہ اللہ کی یاد میں بے اختیار قلم اٹھا لیا ہے۔ وہ اپنے برادر بزرگ کی طرح ہی مخلص اور بے ضرر قسم کے انسان تھے۔

ان کے پاس ایک سائیکل ہوا کرتی تھی۔ اس پر آتے جاتے۔ ایک مرتبہ وہ سائیکل پر اردو بازار ہماری دکان پر آئے ہوئے تھے۔ دکان کے باہر سائیکل کھڑی کی اور کوئی علم دوست ان کا سائیکل مسودے سمیت اٹھا کر بھاگ نکلا۔ با ادب اور صاحب ذوق اس لیے کہ سائیکل کے کیریئر پر بھٹی صاحب کا مسودہ اور پروف کا لفافہ تھا۔ سعید بھٹی کا سائیکل کے ساتھ برسوں پرانا رشتہ تھا۔ کبھی بقرعید پر وہ میرے ہاں گوشت دینے آتے تو سائیکل پر ہی آتے۔ انہیں واپسی کی جلدی ہوتی۔ اندر نہ آتے کہ بیٹھنے کا وقت نہیں اور وہیں دروازے پر ہی دس پندرہ منٹ باتوں میں گزر جاتے۔

ان کی ایک بیٹی بیمار تھی اور جواں مرگی کا شکار ہوئی۔ میرے گھر کے پاس ہی قبرستان ہے جس میں اس بچی کی تدفین کی گئی تھی۔ سعید صاحب اس وقت بڑے حوصلے میں تھے۔ چند روز بعد صبح کے وقت میرے گھر کی بیل بجی۔ باہر نکلا تو سعید صاحب تھے۔ کہنے لگے صبح کا وقت تھا۔ میں نے سوچا بیٹی کے پاس سے ہو آؤں۔ ذرا قبرستان تک گیا ہوا تھا۔ واپسی پر آپ سے ملنے کو جی چاہا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ ایک باپ اپنی بیٹی کے غم پر تسلی اور ہمدردی کے دو بول چاہتا تھا۔

کبھی کبھی میں سعید صاحب سے کہتا کہ آپ کی وجہ سے ''اسلام کی بیٹیاں'' مرتب ہوئی ہے۔ بہت خوش ہوتے اور فخریہ لہجے میں کہتے کہ ابھی میرے پاس بہت کچھ ہے جو سنبھالا ہوا ہے۔ آہستہ آہستہ باہر نکالوں گا۔ بس بھٹی صاحب لکھتے جائیں۔

ان کے بیٹے عزیزم لقمان اور حافظ حسان ماشاء اللہ جوان ہو چکے ہیں۔ بچوں نے اپنے باپ کی سائیکل

Marfat.com

چھڑوا دی۔ اب سعید صاحب حسان کے ساتھ موٹر سائیکل پر اردو بازار آیا کرتے تھے۔

محترم اسحاق بھٹی صاحب بے حد خوددار اور محنتی انسان تھے۔ میں نے ان جیسا فقر و استغنا کا پیکر نہیں دیکھا اور نہ ان ایسا با اخلاق اور با مروت۔ اس کی تفصیل اس مضمون میں آئے گی جو ان پر ان شاء اللہ لکھوں گا۔ لیکن ضروریات بہرحال ہر کسی کو لاحق ہوتی ہیں۔ کبھی کبھار بھٹی صاحب کو بھی ''غیبی مدد'' آ جاتی تھی۔ بلکہ ایک مرتبہ میرے ذریعے یہ غیبی مدد اس طرح آئی کہ محترم پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی حفظہ اللہ کو بھٹی صاحب کی ایک کتاب بھیجی، شاید قافلہ حدیث تھی۔ ڈاکٹر صاحب بھی محترم بھٹی صاحب کے چاہنے والے تھے۔ ہمارے یہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کا بے حد احترام کرتے۔ بلکہ بھٹی صاحب شفقت فرماتے اور ڈاکٹر صاحب عقیدت کا اظہار فرماتے۔ ''قافلہ حدیث'' علماء اہل حدیث کے خاکوں اور تذکرے کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب کو یہ کتاب بے حد پسند آئی۔ انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں ان کے حساب میں سے مبلغ پانچ ہزار روپے بھٹی صاحب کو ہدیہ کروں اور اس بات کی صراحت کر دوں کہ یہ ان کی کتاب کی خوشی میں مٹھائی ہے۔ میں نے بھٹی صاحب کی خدمت میں یہ بیش قیمت ''مٹھائی'' پیش کی۔ بہت خوش ہوئے۔ بات ہی خوشی کی تھی کہ ڈاکٹر فضل الٰہی ایسے عدیم الفرصت انسان نے بھٹی صاحب کی کتاب نہ صرف پڑھی بلکہ حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ایک معقول رقم بطور تحفہ بھیجی۔ مصنف کا تو ڈھیروں خون بڑھنا تھا۔ ویسے بھی ہمارے معاشرے میں اس قسم کی حوصلہ افزائی کا زیادہ رواج نہیں۔ بلکہ لوگ تو اظہار خیال میں بھی بخل کا مظاہرہ کرتے ہیں، اور جو خود نامور مصنفین ہوں، وہ بھلا کیوں کسی کو خاطر میں لائیں۔ جو لوگ ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب کو جانتے ہیں، وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی تعریف رسمی یا مبالغہ پر مبنی نہیں ہوتی۔ وہ لگی لپٹی رکھے بغیر رائے دیتے ہیں یا خاموش رہتے ہیں۔ تصنع اور دل رکھنے کے لیے جھوٹی تعریف کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے بھٹی صاحب بہت خوش تھے۔

بات کچھ لمبی ہو گئی۔ عرض یہ کرنا چاہتا تھا کہ بھٹی صاحب کو کبھی کبھی ''غیبی مدد'' بھی آ جایا کرتی تھی۔ ایسے ہی ایک غیبی مدد آئی اور غالباً کچھ رائلٹی بھی ملی۔ میں بھٹی صاحب کے ہاں گیا تو کہنے لگے یار گرمی بہت ہے۔ UPS لگوانا ہے میں نے۔ بس سعید ہی کچھ کرے گا۔ سعید صاحب چونکہ وائرنگ اور بجلی کا کام بہت عمدہ جانتے تھے بلکہ ان کا روزگار بھی یہی رہا تھا۔ اس لیے میں نے زیادہ توجہ نہ کی۔ چند روز بعد میں دوبارہ بھٹی صاحب کے ہاں گیا تو وہاں ایک بڑے سائز کا UPS لگا ہوا تھا اور ساتھ دو بڑی بڑی بیٹریاں بھی تھیں۔ میں نے پوچھا تو بتایا تیس ہزار سے زائد خرچہ آ چکا ہے۔ میں نے کہا یہ تو آپ نے غلط کیا ہے۔ ایک بیٹری خراب ہو گئی تو دوسری بھی تبدیل کرنا پڑے گی۔ بھٹی صاحب نے اسی وقت سعید صاحب کو آواز دی۔ سعید صاحب لمحے بھر میں آن موجود ہوئے۔ یہ عمر فاروق کیا کہہ رہا ہے؟ ابو جی ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں عمر صاحب۔

Marfat.com

کیا مطلب؟ یہ تو ایک بیڑی دوسری کو بھی لے بیٹھے گی۔ تم نے یہ والا UPS لگوایا ہے؟ اچھی خاصی دلچسپ صورت حال بن چکی تھی اور سعید صاحب مجسمہ ادب واحترام بنے کھڑے تھے، کن اکھیوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے اور اپنے UPS کے فضائل و خصائل بیان کر رہے تھے۔

بھٹی صاحب اپنی وفات سے کچھ دن قبل پاک و ہند میں علماء اہل حدیث کی خدمات حدیث کے سلسلے کی آخری کتاب ''بوستان حدیث'' مکمل کر چکے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ اس سلسلے کو یہیں تمام کر کے اہل حدیث کی سیاسی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا جائے۔ افسوس کہ یہ کام نہ ہو سکا اور مصنف اپنے رب کے حضور جا پہنچے۔ ان کی وفات کے بعد بوستان حدیث کی کمپوزنگ مکمل ہوئی تو اس کے پروف عزیزم حسان سعید اور ان کی ہمشیرہ نے پڑھے اور بہت عمدہ پروف خوانی کی۔ آخری پروف میں نے پڑھا۔ مجھے اس بات کا بہت افسوس رہے گا کہ جناب سعید احمد بھٹی اس کتاب کی اشاعت سے پہلے ہی عالم فنا سے دارالبقاء کی جانب کوچ کر گئے۔ بلکہ صرف اس کتاب کی بات نہیں، وہ تو ابھی اور بھی کتابیں شائع کرنا چاہتے تھے بھٹی صاحب کی۔ اب تک دو کتب شائع کر چکے تھے۔ ایک ''محفل دانش منداں'' کے نام سے اور دوسری ''مولانا عطاء اللہ حنیف'' کے بارے میں۔ اب ان کا ارادہ تھا کہ بھٹی صاحب کی دیگر مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتب آہستہ آہستہ زیور طباعت سے آراستہ کی جائیں۔ ان کے پاس بھٹی صاحب کے غیر مطبوعہ اور مطبوعہ لیکن مختلف رسائل و جرائد میں بکھرے ہوئے مضامین خاصی تعداد میں تھے۔ ان کا ارادہ انہیں مناسب ترتیب دے کر شائع کرنے کا تھا۔ لیکن وہی حقیقت جو کسی شاعر نے بیان کی ہے، جتنی بھی پرانی ہو جائے، ابدی حقیقت ہے۔

سامان سو برس کا پل کی خبر نہیں

سعید احمد بھٹی شوگر کے مریض تھے۔ وہ جڑانوالہ اپنے گاؤں گئے ہوئے تھے۔ وہیں ان کی طبیعت خراب ہوئی اور وقت موعود آن پہنچا۔ یہ ۱۱ مئی ۲۰۱۷ء کی بات ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ جڑانوالہ میں اپنی جگہ پر ایک لائبریری بنائی جائے جہاں سے خاص و عام استفادہ کریں۔ لیکن جہاں ان کے دوسرے منصوبے ادھورے رہ گئے، وہیں یہ آرزو بھی ناتمام رہی۔ اے آرزو بسا کہ خاک شد

سو اب ہم مرحوم سعید احمد بھٹی صاحب کے لیے دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائیں اور ان کے درجات بلند فرمائیں۔ انہیں اور حضرت بھٹی صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائیں۔ اپنے رب کی رحیمی کریمی سے ان شاء اللہ ایسی ہی خوبصورت امید ہے ان دونوں بھائیوں کے لیے۔ جس طرح سعید صاحب نے بھٹی صاحب کی تقریباً ساٹھ سال خدمت کی، دعا ہے اللہ تعالیٰ انہیں اس خدمت کا اجر عظیم عطا فرمائیں۔ (آمین)

Marfat.com

سلسلہ تاریخ اہل حدیث ۵

بوستانِ حدیث

محمد اسحاق بھٹی رحمۃ اللہ علیہ

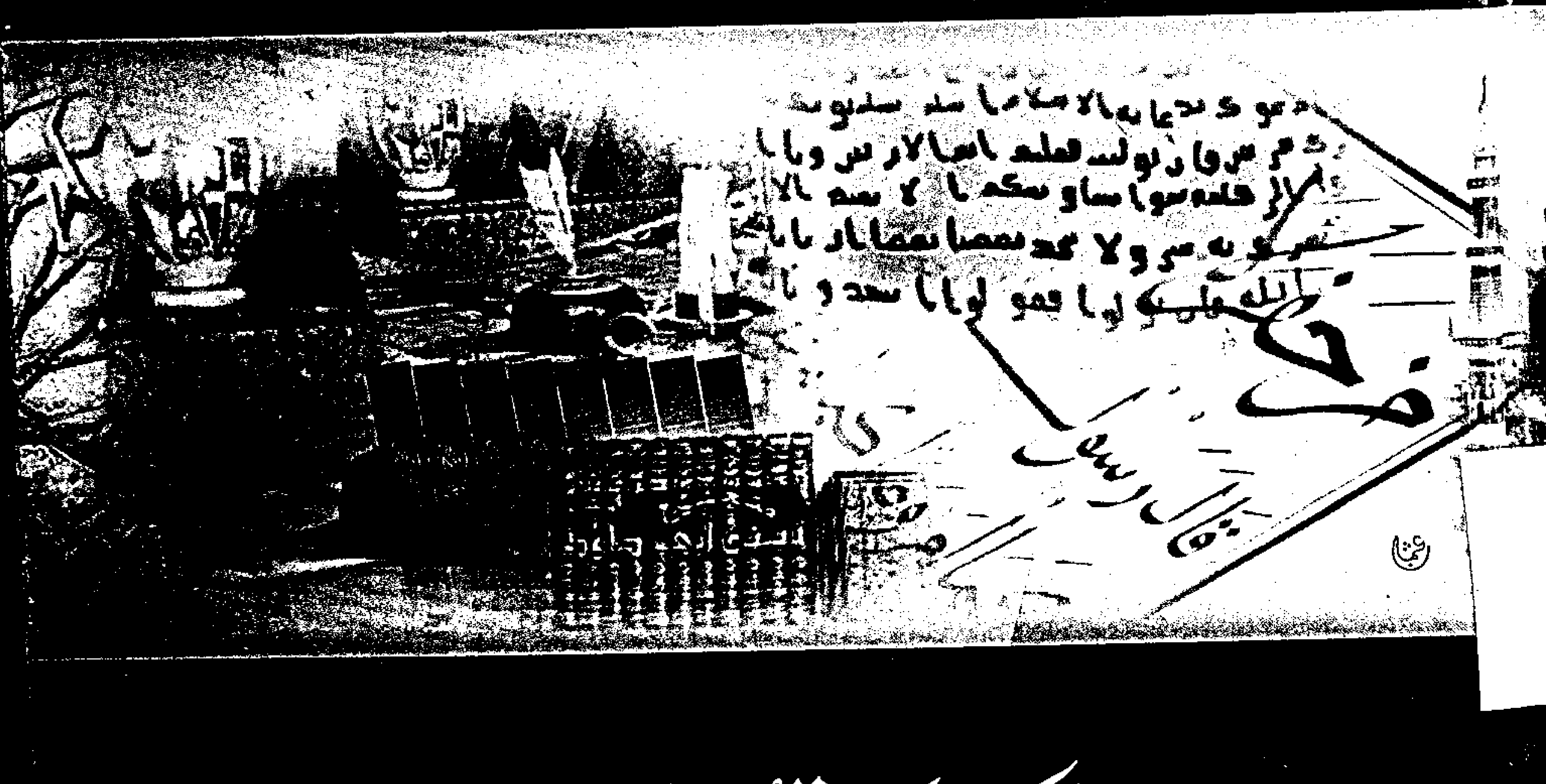

مکتبہ قدوسیہ

Marfat.com